جلد دوم

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن ○ لاہور

ناشر : سید حسین فاروق مودودی
ناظم ادارہ ترجمان القرآن، اچھرہ۔ لاہور

طابع : قاضی ظفر اقبال

مطبع : الحمرا آرٹ پرنٹرز۔ لاہور

اشاعتِ اوّل

ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۸ء ——— ۶۰۰۰

قیمت : [illegible]

قسم اوّل : ۔/[illegible] روپے

قسم دوم ۸۰ روپے

باہتمام : چودھری بشیر احمد خاں

کتابت : محمد صدیق خوشنویس۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاح

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِۦ ۚ ......

رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ

(النساء: ۱۶۳-۱۶۴)

"اے محمدؐ ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اُس کے بعد آنے والے نبیوں کی طرف بھیجی تھی . . . . . یہ سب رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حُجت باقی نہ رہے"

○

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ

(النحل: ۳۶)

"اور ہم نے ہر اُمّت میں ایک رسُول (یہ دعوت دینے کے لیے) بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت (کی بندگی) سے بچو"

○

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید : ۲۵)

"ہم نے اپنے رسولوں کو بیّنات کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان (معیارِ حق و باطل) نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔"

○

يٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۗ (یٰسٓ : ۱-۴)

"قرآنِ حکیم کی قسم، اے محمدؐ، تم یقیناً رسولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو۔"

○

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَاۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (الاعراف : ۱۵۸)

"اے محمدؐ، کہہ دو کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف اُس خدا کا بھیجا ہُوا رسُول ہُوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے۔"

○

وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ (الانعام : ۱۹)

"اور یہ قرآن میری طرف اس لیے بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے کہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے اُسے خبردار کر دُوں۔"

○

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنْفَكِّينَ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ رَسُولٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ (البیّنہ: ۱-۳)

"اہلِ کتاب اور مُشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے وہ (اپنے کُفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ اُن کے پاس دلیل روشن نہ آجاتے (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک ایسا رسُول جو (تمام آمیزشوں سے) پاک صحیفے پڑھ کر سُناتے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہُوئی ہوں۔"

○

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ۝ (الجمعہ: ۲)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اُمّیوں کے اندر ایک رسُول خود اُنہی میں سے اُٹھایا جو انہیں اس کی آیات سُناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔"

○

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ (النساء: ۶۴)

"ہم نے جو رسُول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے"

○

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء: ۸۰)

"جو رسُول کی اطاعت کرے اُس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی"۔

○

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ (الاحزاب: ۳۶)

"کسی ایمان لانے والے مرد اور کسی ایمان لانے والی عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسُول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اُسے اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسُول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا"

○

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ (النساء: ۱۰۵)

"اے نبیؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو

(راہِ راست) اللہ نے تم کو دکھائی ہے اُس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔"

○

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ (النمل: ۹۲)

"پھر جو ہدایت اختیار کرے وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اُس سے کہہ دو کہ میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں۔"

○

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ○ (بنی اسرائیل: ۹۰-۹۳)

"اور انھوں نے کہا "ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا نہ ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اُوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو

رُو در رُو ہمارے سامنے لے آتے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جاتے یا
تو آسمان پر چڑھ جاتے، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک تو ہمارے
اُوپر ایک ایسی تحریر نہ اُتار لاتے جسے ہم پڑھیں"۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
ان سے کہو، "پاک ہے میرا پروردگار، کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے
سوا اور بھی کچھ ہوں؟"

○

مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا
لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ (العنکبوت: ۴۸)

"اے نبی، تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے
لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے"۔

○

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ

(القصص: ۸۶)

"اور اے نبی، تم اس بات کے ہرگز اُمیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائیگی
یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی ہے (کہ یہ تم پر نازل ہوئی ہے)"۔

فہرست مضامین

باب - ۱

باب - ۲

باب — ۳

پیدائش سے آغازِ نبوّت تک ۹۳ تا ۱۲۶

باب — ۴

آغازِ رسالت اور خفیہ دعوت کے ابتدائی تین سال ۱۲۹ تا ۱۶۲

باب — ۵

دعوتِ حق کے لیے ہدایات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئیں ۱۶۵ تا ۱۸۹

باب — ۶

دعوتِ اسلامی کی حقیقی نوعیت ۱۹۱ تا ۲۸۵

فصل اوّل — توحید کی تعلیم اور شرک کی تردید ۱۹۲ تا ۲۲۹

فصل دوم - رسالتِ محمدیؐ پر ایمان کی دعوت ۲۳۰ تا ۲۹۲

فصل سوم ۔ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت ۲۹۳ تا ۳۲۲

فصل چہارم ۔ آخرت پر ایمان لانے کی دعوت ۳۲۳ تا ۳۸۷

فصل پنجم ۔ اخلاقی تعلیمات ۳۸۷ تا ۴۳۹

فصل ششم ۔ عالمگیر اُمتِ مُسلمہ کی تاسیس ۴۴۱ تا ۴۷۷

فصل ہفتم: نبی اور غیر نبی کے کام کا فرق ۴۷۷ تا ۴۸۴

باب ـــ ۷

دعوتِ عام کی اِبتدا ۴۹۳ تا ۵۱۲

باب — ۸

دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی تدبیریں ۵۱۵ تا ۵۵۹

باب — ۹

ہجرتِ حبشہ ۵۶۳ تا ۵۹۹

باب — ۱۰

۶ بعد بعثت سے ۱۰ بعد بعثت تک ۶۰۳ تا ۶۳۹

باب — ۱۱

اِسراء و معراج ۶۴۳ تا ۶۷۹

باب ۱۲

مکّی دَور کے آخری تین سال ۶۸۳ تا ۷۱۰

باب ۔ ۱۳

ہجرت اِلیٰ المدینہ ۷۱۲ تا ۷۴۸

باب ـ ۱۴

مکی دور پر ایک مجموعی نظر ۵۱ء تا ۶۳ء

حضورؐ کی عالی نسبی ۵۱ء ـــ آپؐ کا بنی اسماعیل میں سے ہونا ۵۲ء ـــ آپؐ کی شخصیت ۵۳ء ـــ نبوت سے پہلے کی زندگی ۵۴ء ـــ نبوت کے بعد آپؐ کے اوصافِ عالیہ کا ظہور ۵۵ء ... آپؐ کا مالی ایثار ۵۶ء ـــ آپؐ کا زبردست عزم ۵۷ء ـــ آپؐ کی بے نظیر شجاعت ۵۸ء ـــ آپؐ کی عالی ظرفی ۵۹ء ـــ آپؐ کے قول اور عمل میں مطابقت ۶۰ء ـــ آپؐ کا تمام تعصبات سے پاک ہونا ۶۱ء ـــ قرآن کی قوتِ تسخیر ۶۲ء ـــ حضورؐ پر ایمان لانے والوں کے اوصاف ۶۱ء ... انصارِ مدینہ کے اوصاف ۶۲ء۔

تصاویر

نقشہ جات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتاب کی پہلی جلد تمام تر اُن مضامین پر مشتمل تھی جو جناب نعیم صدیقی صاحب اور جناب عبدالوکیل علوی صاحب نے رسالت اور سیرتِ پاک سے تعلق رکھنے والے مختلف مباحث پر میری تحریروں سے نہایت خوبی کے ساتھ جمع اور مرتب کیے تھے۔ اس میں مجھے کسی حذف و اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

لیکن اِس دُوسری جلد کے لیے میرے جو مضامین اُنہوں نے جمع کیے تھے اُن کے درمیان جگہ جگہ ایسے خلا باقی رہ گئے تھے جن کی موجودگی میں یہ کسی طرح سیرت کی کتاب نہ بن سکتی تھی۔ اِس لیے مَیں نے اس میں بکثرت اضافے کرکے اِسے ایک مُسلسل اور مربُوط کتابِ سیرت بنا دیا ہے۔ یہ جلد ہجرت کے بیان پر ختم ہوئی ہے۔ آگے مدنی دَور شروع ہوتا ہے جو درحقیقت ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کی طاقت اور توفیق عطا فرمائے اور اِس کو اپنے بندوں کے لیے مُفید بنائے

ابُوالاعلیٰ

نقشۂ مکۂ مکرمہ
حجون
کوہِ قُعَیقِعان
یمن کا راستہ
حرم
المعلی
جنت
شعب علی
معابدہ
کوہِ ابو قبیس
کوہِ خندمہ
منیٰ کا راستہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط
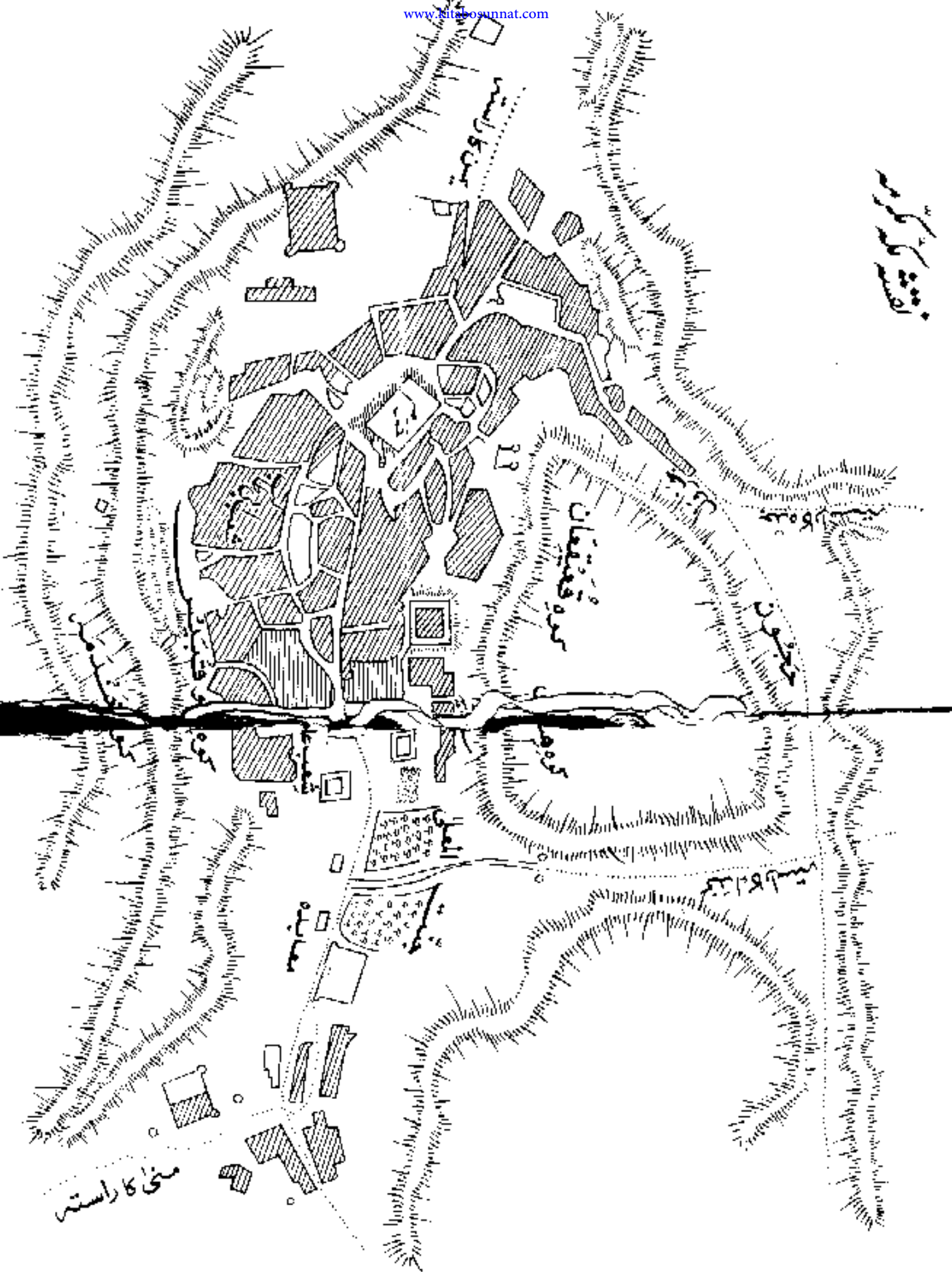
باب (۱)

قرآن اپنے لانے والے کو کس حیثیت میں پیش کرتا ہے؟

دنیا میں انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہمیشہ ایسے پاک نفوس پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے اپنی زبان اور اپنے عمل سے اُس کو حق و صداقت کا سیدھا راستہ دکھایا ہے لیکن انسان اکثر اُن کے اس احسان کا بدلہ ظلم کی شکل میں دیتا رہا ہے۔ ان پر ظلم صرف اُن کے مخالفوں ہی نے نہیں کیے کہ اُن کے پیغام سے بے رُخی برتی، ان کی صداقت سے انکار کیا، ان کی دعوت کو رد کیا یا انھیں تکلیفیں دے کر راہ حق سے پھیرنے کی کوشش کی، بلکہ اُن پر ظلم اُن کے عقیدت مندوں نے بھی کیا کہ اُن کے بعد اُن کی تعلیمات کو مسخ کیا، ان کی ہدایتوں کو بدل ڈالا، ان کی لائی ہوئی کتابوں میں تحریف کی اور خود ان کی شخصیتوں کو اپنی عجائب پسندی کا کھلونا بنا کر اُلوہیت اور خدائی کا رنگ دے دیا۔ پہلی قسم کا ظلم تو اُن نفوسِ قدسیہ کی زندگی تک، یا حد سے حد اس کے چند سال بعد تک ہی محدود رہا۔ مگر یہ دوسری قسم کا ظلم اُن کے بعد صدیوں تک ہوتا رہا اور بہت سے بزرگوں کے ساتھ اب تک ہوئے جا رہا ہے۔

دنیا میں آج تک جتنے داعیانِ حق مبعوث ہوتے ہیں سب نے اپنی زندگی اُن جھوٹے خداؤں کی خدائی ختم کرنے میں صرف کی ہے جنہیں انسان نے خدائے واحد کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا لیا تھا۔ لیکن ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ ان کے بعد ان کے پیروؤں نے جاہلانہ عقیدت کی بنا پر خود انہی کو خدا، یا خدائی میں خدا کا شریک بنا لیا اور وہ بھی اُن بتوں میں شامل کر لیے گئے جنہیں توڑنے میں انہوں نے اپنی تمام عمر کی محنتیں صرف کر دی تھیں۔

دراصل انسان اپنے آپ سے کچھ ایسا بدگمان ہے کہ اُسے انسانیت میں قدسی و ملکوتی صفات کے امکان اور وجود کا بہت کم یقین آتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو محض کمزوریوں اور پستیوں ہی کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ اُس کا ذہن اس حقیقتِ کبریٰ کے علم و اذعان سے عموماً خالی رہتا ہے کہ اس کالبدِ خاکی میں حق جل مجدہٗ نے وہ

قوتیں بھی ودیعت کی ہیں جو اس کو بشر ہونے اور بشری صفات سے متّصف رہنے کے باوجود عالمِ پاک میں ملائکہ مقرّبین سے بھی بلند درجہ تک پہنچا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس دنیا میں کسی انسان نے اپنے آپ کو خدا کے نمائندے کی حیثیّت سے پیش کیا ـــــ اس کے ہم جنسوں نے پہلے تو یہ دیکھ کر کہ یہ تو ہماری ہی طرح گوشت پوست کا انسان ہے، اُسے خدا رسیدہ ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اور جب بالآخر اُس کی ذات میں غیر معمولی محاسن کا جلوہ دیکھ کر سرِ عقیدت جُھکایا تو پھر کہا کہ جو ہستی ایسی غیر معمولی خوبیوں کی مالک ہو وہ ہرگز بشر نہیں ہو سکتی۔ پھر کسی گروہ نے اس کو خدا بنایا، کسی نے حُلول کا عقیدہ ایجاد کر کے یقین کر لیا کہ خدا نے اس کی شکل میں ظہور کیا تھا، کسی نے اس کے اندر خدائی صفات اور خداوندانہ اختیارات کا گمان کیا، اور کسی نے حکم لگا دیا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

مختلف اہلِ مذاہب کے تصوّرات اپنے بانیٔ مذہب کے متعلق

دُنیا کے کسی پیشوائے دین کی زندگی کو لے لو، تم دیکھو گے کہ اُس کی ذات پر سب سے زیادہ ظلم اس کے معتقدین ہی نے کیا ہے۔ انہوں نے اُس پر اپنے تخیّلات و اَوہام کے اتنے پردے ڈال دیے ہیں کہ اس کی شکل و صورت دیکھنا ہی بالکل محال ہو گیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ان کی محرّف کتابوں سے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اُس کی اصلی تعلیم کیا تھی، بلکہ ہم ان سے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ خود اصل میں کیا تھا۔ اس کی پیدائش میں اُعجوبگی، اس کی طفولیّت میں اُعجوبگی، اس کی جوانی اور بڑھاپے میں اُعجوبگی، اُس کی زندگی کی ہر ہر بات میں اُعجوبگی، اور اس کی موت تک میں اعجوبگی۔ بغرض ابتدا سے لے کر انتہا تک وہ ایک افسانہ ہی افسانہ نظر آتا ہے اور اُس کو اس شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ گویا تو وہ خود خدا تھا، یا خدا کا بیٹا تھا، یا خدا اُس میں حُلول کر گیا تھا، یا کم از کم وہ خدائی میں کسی حد تک شریک و سہیم تھا۔

بُدھ

مثال کے طور پر گوتم بُدھ کو دیکھو۔ بُدھ مذہب کے نہایت گہرے مطالعے سے صرف اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس اولوا العزم انسان نے برہمنیّت کے بہت سے نقائص کی اصلاح کی تھی اور خصوصیّت کے ساتھ اُن بے شمار ہستیوں کی خدائی کا بُطلان کیا تھا جن کو اُس عہد کے لوگوں نے اپنا معبود بنا لیا تھا۔ مگر اُس کے انتقال کو پوری ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ ویسالی کی کونسل میں اس کے پیرووں نے اس کی تمام تعلیمات کو بدل ڈالا، اصل سُوتروں کے بجائے نئے سُوتر بنا لیے اور اُصُول اور فروع میں اپنے آراء و افکار کے مطابق جس طرح چاہا تصرّف کر ڈالا۔ ایک طرف انہوں نے بودھ کے نام سے اپنے مذہب کے ایسے عقائد مقرر کر لیے جن میں خدا کا سرے سے وجود ہی نہ تھا، اور دوسری طرف بودھ کو عقلِ کل، مدارِ کائنات اور ایک ایسی ہستی قرار دے لیا جو ہر عہد میں دنیا کی اصلاح کے لیے بُدھ بن کر آیا کرتی ہے۔ اس کی پیدائش، زندگی اور گزشتہ و آئندہ جنموں کے

متعلق ایسے ایسے عجیب افسانے بنا لیے جن کو پڑھ کر پروفیسر ولسن جیسے محققین حیران ہو کر یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ تاریخ میں فی الواقع بُدھ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ تین چار صدی کے اندر ان افسانوں نے بُدھ میں اُلوہیت کا رنگ بھر دیا اور کنشک کے زمانے میں بُدھ مت کے اعیان و ائمہ کی ایک بہت بڑی کونسل نے جو کشمیر میں منعقد ہوئی تھی، فیصلہ کر دیا کہ بُدھ دراصل خدا کا مادّی ظہور تھا، یا بالفاظ دیگر خدا اُس کے جسم میں حلول کر گیا تھا۔

رام

یہی سلوک رام چندر جی کے ساتھ ہوا۔ راماین کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ راجہ رام چندر جی محض ایک انسان تھے۔ نیک دلی، انصاف، شجاعت، فیاضی، تواضع، حلم اور ایثار میں کمال کا مرتبہ تو انہیں ضرور حاصل تھا، مگر اُلوہیت کا شائبہ تک ان میں نہ تھا۔ لیکن بشریت اور ان اعلیٰ صفات کا اجتماع ایک ایسا معمّا ثابت ہوا کہ اہلِ ہند کی عقل اس کو حل نہ کر سکی۔ چنانچہ رام چندر کی وفات پر ایک زمانہ گزرنے کے بعد یہ عقیدہ تسلیم کر لیا گیا کہ اُن کے اندر وِشنو[1] نے حلول کیا تھا اور وہ ان ہستیوں میں سے ایک تھے جن کی شکل میں وشنو جی سنسار کی اصلاح کے لیے باوقاتِ مختلفہ ظہور کرتے رہتے ہیں۔

کرشن

سری کرشن اس معاملے میں ان دونوں سے زیادہ مظلوم ہیں۔ بھگوت گیتا تحریف و تنسیخ کے کئی عملوں سے نکل کر جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے اس کے عمیق مطالعہ سے کم از کم اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی ایک موحّد تھے اور انہوں نے ہستیِ باری تعالیٰ کے ہمہ گیر، قادرِ مطلق اور شدید القویٰ ہونے کا وعظ کہا تھا۔ لیکن مہابھارت، وشنو پران، بھاگوت پران وغیرہ کتابیں، اور خود گیتا اُن کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ ایک طرف وہ وشنو کے جسمانی مظہر، خالقِ موجودات اور مدبّرِ کائنات نظر آتے ہیں، اور دوسری طرف ایسی ایسی کمزوریاں ان کی طرف منسوب ہیں کہ انہیں خدا تو خدا، پاکیزہ اخلاق کا انسان بھی تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گیتا میں کرشن جی کے یہ اقوال ملتے ہیں:

---

[1] وشنو ہندوؤں کے موجودہ عقائد کے مطابق کائنات کی پرورش کرنے والے خدا یا دیوتا کا نام ہے۔ غالباً اصل میں یہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کا تصور تھا جسے بعد میں ایک مستقل شخصیت قرار دے لیا گیا۔ ہندوؤں میں بُت پرستی کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہر صفت کو انہوں نے ذاتِ حق سے الگ کر کے بجائے خود ایک خدا ٹھہرا لیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

" میں اس دنیا کا ماں باپ، سہارا اور بابا میں ہی ہوں۔ جو کچھ پاکیزہ یا جو کچھ جاننے کے قابل ہے وہ سب اوم اونکار[1]، رگ وید، یجر وید، سام وید بھی میں ہی ہوں۔ سب کا پالنے والا، مالک، گواہ، جائے قیام، جائے پناہ، باعثِ پیدائش، باعثِ خاتمہ، باعثِ قیام، خزانہ اور پیدائش کا لازوال بیج بھی میں ہی ہوں۔ اے ارجن، میں گرمی دیتا ہوں، میں پانی روکتا ہوں، میں برساتا ہوں، میں امرت ہوں اور موت، ست اور اَست[2] بھی میں ہی ہوں" (۹: ۱۷-۱۹)

" تمام دیوتا گن[3] اور مہرشی[4] میری پیدائش کو نہیں جانتے کیونکہ سب دیوتاؤں اور مہرشیوں کی ابتداء بہرحال مجھ ہی سے ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ میں پرتھوی[5] وغیرہ سب لوکوں[6] کا بڑا ایشور ہوں اور میرا جنم یعنی آغاز نہیں ہے، وہ ہی انسانوں میں موہ[7] سے آزاد ہو کر سب پاپوں سے چھوٹ جاتا ہے" (۱۰: ۲-۳)

" ہے گڈاکیش[8]! سب جانداروں میں رہنے والی آتما[9] میں ہوں۔ سب جانداروں کا آغاز، وسط اور انجام بھی میں ہی ہوں۔ بارہ آدتیوں[10] میں وشنو میں ہوں۔ تیجسویوں[11] میں کرنوں والا سورج، مرتوں میں مریچی[12] اور نکشتروں میں چندرما[13] بھی میں ہوں" (۱۰: ۲۰-۲۱)

" ایسا کوئی متحرک یا ساکن جاندار نہیں جو مجھ سے باہر ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں صرف اپنے ایک ہی حصے سے اس تمام جگت میں پھیلا ہوا ہوں" (۱۰: ۳۹-۴۲)

" ہے پانڈو، جو شخص اس بُدھی[14] کے ساتھ کرم کرتا[15] ہے کہ یہ سب کرم میرے یعنی پرمیشور کے ہیں، جو میرا بھروسہ رکھ کر اور سب تعلقات چھوڑ کر سب جانداروں کے بارے میں نروَیر[16] ہے وہ میرا بھگت مجھ میں مل جاتا ہے۔" (۱۱: ۵۵)

" میں سب جانداروں کا مالک ہوں اور پیدائش سے بالاتر ہوں۔ اگرچہ میرے آتم سروپ میں کبھی تغیر نہیں ہوتا[17] مگر پھر بھی میں اپنی پرکرتی (فطرت) میں قائم ہو کر اپنی مایا[18] سے جنم لیا کرتا ہوں۔

---

[1] واحد کارگزار [2] یعنی سچ اور جھوٹ [3] یعنی دیوتا لوگ [4] یعنی اولیاء [5] زمین [6] لوک یعنی جہان [7] یعنی لگاؤ، دنیا کی محبت۔ [8] یعنی نیند کو جیتنے والے، مُراد ارجن ہے۔ [9] یعنی تمام جانداروں کی رُوح [10] ہندوؤں کے تمام دیوتاؤں میں سے ۱۲ دیوتا جنہیں آدتیہ کہتے ہیں اور وشنو ان میں سب سے بڑا دیوتا ہے۔ ۱۲ آدتیہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اَدِتی کے بیٹے تھے۔ [11] تیجسوی یعنی نیّر۔ [12] ہندوؤں کی اصطلاح میں مرُت اُن ۴۹ دیوتاؤں کا نام ہے جو ہوا کا انتظام کرتے ہیں اور ان کے سردار کا نام مریچی ہے۔ [13] یعنی تاروں میں چاند۔ [14] بُدّھی یعنی فہم۔ [15] یعنی فعل، کام۔ [16] عداوت سے مُبرّا۔ [17] یعنی میری ذات میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ [18] مایا یعنی قدرت یا تدبیر۔ (جملہ حواشی از مؤلف)

"اے بھارت[1]، جب دھرم کا تنزل ہوتا ہے اور اَدھرم کا زور پھیل جاتا ہے تب میں خود ہی جنم لیا کرتا ہوں۔ نیکوں کی حفاظت اور بُروں کا ناش کرنے کے لیے اور یگ یگ[2] میں دھرم قائم کرنے کے لیے میں جنم لیا کرتا ہوں۔" (۴: ۷-۸)

اِن اقوال میں صاف طور پر گیتا کے کرشن نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے[3]۔ مگر دُوسری طرف بھاگوت پُران اُنہی کرشن جی کو اس شکل میں پیش کرتی ہے کہ وہ نہاتے ہوئی گوپیوں کے کپڑے چُھپا لیتے ہیں، اُن سے لُطف اندوز ہونے کے لیے اُتنے ہی جسم پیدا کر لیتے ہیں جتنی گوپیاں تھیں، اور جب شک رِشی سے راجہ پریکشت پُوچھتا ہے کہ خدا تو اوتار کی شکل میں اس لیے ظاہر ہوتا ہے کہ سچا دھرم پھیلائے، پھر یہ کیسا خدا ہے کہ دھرم کے تمام اصُولوں کے خلاف دُوسروں کی عورتوں سے جنسی تعلقات رکھتا ہے؟ تو رِشی کو یہ اعتراض رفع کرنے کے لیے اس حیلہ کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے کہ "خود دیوتا بھی بعض اوقات نیکی کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں، مگر اُن کے گناہ اُن کی ذات پر اُسی طرح اثر نہیں کرتے جس طرح آگ تمام چیزوں کو جلانے کے باوجود مورَدِ الزام نہیں ہو سکتی۔"

کوئی سلیم العقل آدمی یہ باور نہیں کر سکتا کہ کسی بلند پایہ معلّم دین کی زندگی ایسی ناپاک ہو سکتی ہے، اور نہ وہ یہی تصوّر کر سکتا ہے کہ کسی سچے مذہبی پیشوا نے فی الحقیقت اپنے آپ کو انسانوں کے اور کائنات کے رب کی حیثیت سے پیش کیا ہوگا۔ لیکن قرآن اور بائیبل کے تقابلی مطالعہ سے یہ حقیقت واضح طور پر ہمارے سامنے روشن ہو جاتی ہے کہ قوموں نے اپنے ذہنی انحطاط اور اخلاقی زوال کے دور میں کس طرح دنیا کے پاکیزہ ترین انسانوں کی سیرتوں کو ایک طرف گندگی سے گندی شکل میں ڈھالا ہے تاکہ خود اپنی کمزوریوں کے لیے وجہِ جواز پیدا کریں، اور دوسری طرف اُن کی شخصیتوں کے گرد کیسے کیسے وہمی افسانے جمع کر دیے ہیں۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہی سب کچھ کرشن جی کے ساتھ بھی ہُوا ہوگا اور اُن کی اصل تعلیم اور اصل شخصیت اُس سے بالکل مختلف ہوگی جیسی ہندوؤں کی

---

[1] بھارت یعنی نیک۔

[2] یگ یعنی زمانہ۔

[3] اگر گیتا خود اس بات کی مدّعی ہوتی کہ وہ خدا کی کتاب ہے اور کرشن اس کے پیش کرنے والے نبی ہیں تو مضائقہ نہ تھا۔ بلا تأمّل پیغمبرِ خدا کے قرار پا سکتے تھے، اور کرشن جی کی طرف خدائی کا دعویٰ منسوب نہ ہوتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کتاب خود اپنے آپ کو کرشن کے اُپدیش (وعظ) کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ پوری گیتا میں کہیں کوئی اشارہ تک بھی اس بات کی طرف نہیں ہے کہ وہ کلامِ الٰہی ہے جو وحی و الہام کے ذریعہ سے کرشن جی پر نازل ہُوا ہے۔ (جملہ حواشی از مؤلّف)

کتابیں اُسے پیش کرتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

جن بزرگوں کی نبوت معلوم و مسلّم ہے اُن میں سب سے بڑھ کر ظلم سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ ویسے ہی ایک انسان تھے جیسے سب انسان ہوا کرتے ہیں۔ بشریت کی تمام خصوصیتیں ان میں بھی اُسی طرح موجود تھیں جس طرح ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت و نبوت، اور اعجاز کی قوتیں عطا فرما کر ایک بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کے لیے مامور فرمایا تھا۔ لیکن اوّل تو اُن کی قوم نے اُن کو جھٹلایا اور پورے تین سال بھی ان کے وجودِ مسعود کو برداشت نہ کرسکی، یہاں تک کہ عین عالمِ شباب میں ان کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر جب وہ اُن کے بعد اُن کی عظمت کی قائل ہوئی تو اس قدر حد سے تجاوز کر گئی کہ ان کو خدا کا بیٹا بلکہ عین خدا بنا دیا، اور یہ عقیدہ اُن کی طرف منسوب کیا کہ خدا مسیحؑ کی شکل میں اس لیے نمودار ہوا تھا کہ صلیب پر چڑھ کر انسان کے گناہوں کا کفّارہ ادا کرے، کیونکہ انسان فطرۃً گناہگار تھا اور خود اپنے عمل سے اپنے لیے نجات حاصل نہ کر سکتا تھا۔ معاذ اللہ! ایک نبی صادق اپنے پروردگار پر اتنا بڑا بہتان کس طرح لگا سکتا تھا۔ مگر اس کے معتقدوں نے جوشِ عقیدت میں اُس پر یہ بہتان لگایا اور اس کی تعلیمات میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق اتنی تحریف کی کہ آج دنیا کی کسی کتاب میں سوائے قرآن کے مسیحؑ کی اصلی تعلیم اور خود ان کی حقیقت کا نشان نہیں ملتا۔ بائبل کے عہدِ جدید میں جو کتابیں اناجیلِ اربعہ کے نام سے موجود ہیں انہیں اٹھا کر دیکھ جاؤ، سب حلول، ابنیت اور عینیت کے فاسد تخیلات سے آلودہ ہیں۔ کہیں حضرت مریم کو بشارت ہوتی ہے کہ "تیرا بچہ خدا کا بیٹا کہلائے گا" (لوقا ۱: ۳۵)، کہیں خدا کی روح کبوتر کے مانند یسوع پر اُتر آتی ہے اور پکار کر کہتی ہے کہ "یہ میرا پیارا بیٹا ہے" (متی ۳: ۱۶-۱۷)، کہیں مسیحؑ خود کہتا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور تم مجھے قادرِ مطلق کے داہنی جانب بیٹھے ہوئے دیکھو گے (مرقس ۱۴: ۶۲)، کہیں روزِ جزا میں خدا کے بجائے مسیحؑ کو تختِ جلال پر بٹھایا جاتا ہے اور وہ سزا و جزا کے فرمان نافذ کرتا ہے (متی ۲۵: ۳۱-۴۶)، کہیں مسیحؑ کے منہ سے کہلوایا جاتا ہے کہ "باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں ہوں" (یوحنا ۱۰: ۳۸)۔ کہیں اُس راست گو انسان کی زبان سے یہ غلط الفاظ نکلوائے جاتے ہیں کہ "میں خدا میں سے نکل کر آیا ہوں" (یوحنا ۸: ۴۲)، کہیں اُس کو اور خدا کو بالکل ایک کر دیا جاتا ہے اور اس کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اُس نے باپ کو دیکھا" اور "باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے" (یوحنا ۱۴: ۹-۱۰)، کہیں خدا کی تمام چیزیں مسیحؑ کی طرف منتقل کر دی جاتی ہیں (یوحنا ۳: ۳۵) اور خدا اپنی خدائی کا سارا کاروبار مسیحؑ کے سپرد کر دیتا ہے (یوحنا ۵: ۲۰-۲۲)۔

ان مختلف قوموں نے اپنے پیشواؤں اور رہنماؤں پر جتنے بہتان و افترا کے ردّے چڑھائے ہیں اُن کی اصل وجہ وہی غلو ہے جس کا ہم نے ابتدا میں ذکر کیا ہے۔ پھر اس خرابی کو سب سے زیادہ جس چیز سے مدد ملی وہ یہ تھی کہ ان

بزرگوں کے بعد اکثر حالات میں تو ان کی ہدایات اور تعلیمات کو تحریری شکل میں قلم بند ہی نہ کیا گیا، اور بعض حالات میں اگر اس طرف توجہ کی بھی گئی تو اس کی حفاظت کا کوئی خاص اہتمام نہ کیا گیا۔ اس لیے تھوڑا زمانہ گزرنے کے بعد اس میں اتنی آمیزش اور تحریف و ترمیم ہو گئی کہ اصل و جعل میں امتیاز کرنا محال ہو گیا۔ اس طرح کسی واضح ہدایت کے موجود نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جتنا جتنا زمانہ گزرتا گیا حقیقت پر اوہام غالب آتے گئے اور چند صدیوں میں ساری حقیقت گم ہو گئی، صرف افسانے ہی افسانے باقی رہ گئے۔

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

دنیا کے تمام ہادیوں میں یہ خصوصیت صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کی تعلیم اور آپ کی شخصیت ۱۴ صدیوں سے بالکل اپنے حقیقی رنگ میں محفوظ ہے اور خدا کے فضل سے کچھ ایسا انتظام ہو گیا ہے کہ اب اس کا بدلنا غیر ممکن ہے۔ انسان کی اوہام پرستی اور اعجوبہ پسندی سے بعید نہ تھا کہ وہ اس برگزیدہ ہستی کو بھی، جو کمال کے سب سے اعلیٰ درجے پر پہنچی ہوئی تھی، افسانہ بنا کر الوہیت سے کسی نہ کسی طرح متصف کر ڈالتی اور پیروی کے بجائے محض ایک تحیر و استعجاب اور عبادت و پرستش کا موضوع بنا لیتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو بعثتِ انبیاء کے آخری مرحلہ میں ایک ایسا ہادی و رہنما بھیجنا منظور تھا جس کی ذات انسان کے لیے دائمی نمونۂ عمل اور عالمگیر سرچشمۂ ہدایت ہو۔ اس لیے اس نے محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اس ظلم سے محفوظ رکھا جو جاہل معتقدوں کے ہاتھوں دوسرے انبیاء اور ہادیانِ اقوام کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ اول تو آپ کے صحابہؓ و تابعینؒ اور بعد کے محدثین نے پچھلی امتوں کے برعکس اپنے نبی کی سیرت کو محفوظ رکھنے کا خود ہی غیر معمولی اہتمام کیا ہے جس کی وجہ سے ہم آپ کی شخصیت کو چودہ سو برس گزر جانے پر بھی آج تقریباً اتنے ہی قریب سے دیکھ سکتے ہیں جتنے قریب سے خود آپ کے عہد کے لوگ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اگر کتابوں کا وہ تمام ذخیرہ دنیا سے مٹ جاتا جو ائمۂ اسلام نے سالہا سال کی محنتوں سے مہیا کیا ہے، حدیث و سیر کا ایک ورق بھی دنیا میں نہ رہتا جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہو، اور صرف کتاب اللہ (قرآن) ہی باقی رہ جاتی تب بھی ہم اس کتاب سے ان تمام بنیادی سوالات کا جواب حاصل کر سکتے ہیں جو اس کے لانے والے کے متعلق ایک طالب علم کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے؟

رسول کی بشریت

قرآن مجید نے رسالت کے معاملہ میں سب سے پہلے جس مسئلہ کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ رسول کی بشریت ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے صدیوں کے معتقدات نے یہ ایک طے شدہ مسئلہ بنا دیا تھا کہ انسان کبھی اللہ کا رسول اور نائب نہیں بن سکتا، دنیا کی اصلاح کے لیے جب کبھی ضرورت ہوتی ہے خدا خود ہی انسان کی صورت

میں ظاہر ہُوا کرتا ہے، یا کسی فرشتے یا دیوتا کو بھیج دیتا ہے، اور یہ کہ جتنے بزرگ دُنیا میں اصلاح کے لیے آتے ہیں وُہ سب کے سب فوق البشر ہستی تھے۔ اِس عقیدے نے انسان کے ذہن میں اتنی گہری جڑیں پکڑلی تھیں کہ جب کبھی اللہ کا کوئی نیک بندہ لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے آتا تو سب سے پہلے لوگ حیرت سے پُوچھتے تھے، یہ کیسا نبی ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا، سوتا اور چلتا پھرتا ہے؟ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ ہماری طرح تمام عوارض اس کو بھی لاحق ہوتے ہیں؟ بیمار ہوتا ہے، تکلیف اور راحت میں مبتلا ہوتا ہے اور رنج و مسرت سے متاثر ہُوا کرتا ہے۔ اگر اللہ کو ہماری ہدایت مقصود ہوتی تو وہ ہم جیسا ایک کمزور انسان کیوں بھیجتا؟ کیا خدا خود نہیں آسکتا تھا؟ یہ سوالات ہر نبی کی بعثت پر ہوتے تھے اور اِنہی کو حجّت بنا کر لوگ انبیاء کا انکار کیا کرتے تھے۔ حضرت نوح علیہ السّلام جب اپنی قوم کی طرف پیغام لے کر آئے تو کہا گیا:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (المؤمنون۔ آیت ۲۴)

"یہ شخص اِس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تم ہی جیسا ایک انسان ہے جو تم پر فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ اگر خدا چاہتا تو فرشتوں کو اُتارتا۔ یہ انوکھی بات تو ہم نے اپنے بزرگوں سے کبھی سُنی ہی نہ تھی (کہ انسان خدا کا پیغمبر بن کر آئے)۔"

جب حضرت ہُود علیہ السّلام اپنی قوم کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تو ان پر بھی سب سے پہلے یہی اعتراض ہُوا:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (المؤمنون۔ آیات ۳۳، ۳۴)

"یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا۔ وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو بڑے ٹوٹے میں رہو گے۔"

جب حضرت مُوسیٰ اور ہارون علیہما السّلام فرعون کے پاس صداقت کا پیغام لے کر پہنچے تو ان کی بات ماننے سے بھی اسی بنا پر انکار کر دیا گیا:

اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا (المؤمنون۔ ۴۷)

"کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟"

چنانچہ ٹھیک یہی سوال اُس وقت بھی اُٹھا جب مکہ کے ایک اُمّی انسان نے چالیس برس تک خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد دفعتہً اعلان کیا کہ مَیں خدا کی طرف سے رسُول مقرر کیا گیا ہوں۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی کہ ایک شخص جو ہماری طرح ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک، اور جسم و جان رکھتا ہے اللہ کا رسُول کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ حیران ہو کر

پوچھتے تھے کہ

مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ - لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (الفرقان - آیات ۷ - ۸)

"یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس پر کوئی فرشتہ اترا کہ اس کے ساتھ رہ کر لوگوں کو ڈراتا؟ یا کم از کم اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتارا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس کے پھل یہ کھاتا۔"

یہ غلط فہمی چونکہ رسالت کے تسلیم کیے جانے میں سب سے زیادہ مانع ہو رہی تھی اس لیے قرآن مجید میں پورے زور کے ساتھ اس کی تردید کی گئی اور دلائل کے ساتھ بتایا گیا کہ انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی زیادہ موزوں ہو سکتا ہے، کیونکہ بعثت کا مقصود صرف تعلیم ہی دینا نہیں ہے بلکہ خود عمل کر کے دکھانا اور تقلید و پیروی کے لیے ایک نمونہ پیش کرنا بھی ہے، اور اس مقصد کے لیے اگر ایک فرشتہ یا اور کوئی فوق البشر ہستی بھیجی جائے جس میں بشری خصائص اور کمزوریاں موجود نہ ہوں، تو انسان کہہ سکتا ہے کہ ہم اس کی طرح کیونکر عمل کر سکتے ہیں جب کہ وہ ہماری طرح نفس اور نفسانی خواہشات ہی نہیں رکھتا اور اس کی فطرت میں وہ قوتیں ہی نہیں ہیں جو انسان کو گناہ کی طرف راغب کرتی ہیں۔

لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - آیت ۹۵)

"اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو البتہ ہم بھی ان پر آسمان سے کسی فرشتے کو رسول بنا کر اتارتے۔"

پھر صاف طور پر تصریح کی کہ اس سے پہلے جتنے انبیاء اور ہادیانِ برحق مختلف قوموں میں بھیجے گئے ہیں وہ سب ایسے ہی انسان تھے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی طرح کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے جس طرح ہر انسان کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے:-

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (انبیاء - آیات ۷ - ۸)

"ہم نے تم سے پہلے جن رسولوں کو بھیجا تھا وہ بھی آدمی ہی تھے جن پر ہم وحی نازل کرتے تھے۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔ ہم نے ان انبیاء کو ایسے جسم نہیں دیئے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ غیر فانی تھے۔"

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ

(الفرقان - آیت ۲۰)

" اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے تھے وہ سب کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے"

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (الرعد - آیت ۳۸)

" اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے رسُول بھیجے تھے اور ان کے لیے ہم نے بیویاں بھی پیدا کی تھیں اور اُن کو اولاد بھی دی تھی"

اس کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنے بشر ہونے کا صاف اعلان کریں تاکہ آپ کے بعد لوگ آپ کو بھی اُسی طرح اُلوہیت سے متصف نہ کرنے لگیں جس طرح آپ سے پہلے دوسرے انبیاء کو کر چکے تھے، چنانچہ قرآن مجید میں متعدد جگہ یہ آیت آئی ہے:-

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (الکہف، آیت ۱۱۰ حٰم السجدہ ۶)

" اے محمدؐ، کہہ دو کہ میں تو محض تم ہی جیسا ایک انسان ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے"

اِن تصریحات نے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے متعلق تمام فاسد عقائد کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ تمام انبیاء سابقین و بزرگانِ دین کی ذات سے بھی اِس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا۔

رسُول کی قوّت و قدرت

دوسری چیز جس کو نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے وہ نبی کی قوت و قدرت کا مسئلہ ہے۔ جہل و نادانی نے جب خدارسیدگی کو خدائی کا ہم معنی بنا دیا تو طبعاً اس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی پیدا ہو گیا کہ خدارسیدہ لوگوں میں غیر معمولی طاقتیں ہوتی ہیں۔ خدا کے کارخانے میں ان کو کچھ خاص اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جزا و سزا اِن کو دخل ہوتا ہے۔ غیب و شہادت سب کچھ اُن پر روشن ہوتا ہے۔ قسمتوں کے فیصلے اُن کی مرضی اور رائے سے اُلٹتے پلٹتے ہیں۔ نفع و ضرر پر اُن کو اقتدار ہوتا ہے۔ خیر و شر کے وہ مالک ہوتے ہیں۔ کائنات کی تمام قوتیں ان کی تابع فرمان ہوتی ہیں۔ اور وہ ایک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر اُن کی ظلمت و ضلالت کو دُور کر سکتے ہیں! ایسے ہی خیالات تھے جن کی بنا پر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا

كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا - أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (بنی اسرائیل۔ آیات ۹۰ تا ۹۳)

"انہوں نے کہا ہم تو تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین میں سے ایک چشمہ نہ نکال دو، یا تمہارے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور اس میں تم نہریں رواں کر دو، یا جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دو، یا اللہ اور ملائکہ کو ہمارے سامنے لا کھڑا کرو، یا تمہارے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ، اور تمہارے چڑھنے کا بھی اُس وقت تک ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تم ہمارے اوپر ایسی ایک تحریر نازل نہ کرو جسے ہم پڑھیں۔ اے محمدؐ، ان سے کہو، پاک ہے میرا رب، کیا میں ایک پیغمبر انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟"

خدارسیدگی اور بزرگی کے متعلق یہ جتنے غلط تصورات لوگوں میں پائے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تردید فرمائی اور صاف بتادیا کہ رسولؐ کا خدائی طاقتوں اور خدائی کاموں میں ذرّہ برابر کوئی حصّہ نہیں ہے چنانچہ فرمایا نبی ہمارے اذن کے بغیر دوسروں کو ضرر سے بچانا تو درکنار خود اپنے آپ سے بھی ضرر کو دفع کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔

إِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِن يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (الانعام۔ ۱۷)

"اور اے نبیؐ، اگر خدا تمہیں کوئی نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس نقصان کو دُور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تمہیں فائدہ پہنچانا چاہے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ (یونس۔ آیت ۴۹)

"اے محمدؐ، کہو میں تو اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتا سوائے اُس کے جو خدا چاہے۔"

اور فرمایا کہ نبیؐ کے پاس اللہ کے خزانوں کی کنجیاں نہیں ہیں، نہ وہ علمِ غیب رکھتا ہے اور نہ اس کو فوق العادت توتیں حاصل ہیں:-

قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (الانعام۔ آیت ۵۰)

"اے محمدؐ، کہو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا حال جانتا

ہُوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہُوں کہ میں فرشتہ ہُوں (یعنی انسانی کمزوریوں سے پاک ہوں)۔ میں تو صرف اُس چیز کی پیروی کرتا ہُوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔"

وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف۔ آیت ۱۸۸)

"اور اگر میں غیب جاننے والا ہوتا تو اپنے لیے بہت کچھ فائدے سمیٹ لیتا اور مجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک متنبّہ کرنے والا ہوں اور جو میری بات مان لیں ان کو خوشخبری دینے والا ہُوں۔"

اور فرمایا کہ حساب کتاب اور جزاء و سزا میں بھی نبی کا کچھ دخل نہیں۔ اس کا کام صرف پیغام پہنچانا اور سیدھی راہ دکھا دینا ہے۔ آگے محاسبہ اور مؤاخذہ کرنا اور لوگوں کو جزا و سزا دینا خدا کا کام ہے۔

قُلْ إِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ، مَا عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ۝ قُلْ لَّوْ أَنَّ عِنْدِيْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۝ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِالظّٰلِمِيْنَ۔ (الانعام۔ آیات ۵۷-۵۸)

"اے محمدؐ، ان لوگوں سے کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہُوں۔ اور تم نے اُسے جھٹلا دیا ہے۔ اب یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے کہ جس عذاب کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو وہ میں خود تمہارے اُوپر نازل کر دوں۔ فیصلہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی امرِ حق بیان کرتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ان سے کہو کہ اگر کہیں وہ عذاب میرے اختیار میں ہوتا جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، مگر اللہ ہی ظالموں سے نمٹنا خوب جانتا ہے۔"

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد۔ آیت ۴۰)

"اے نبیؐ تمہارا کام تو بس پیغام پہنچا دینا ہے۔ حساب لینا ہمارا کام ہے۔"

إِنَّآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَآ أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (الزمر۔ آیت ۴۱)

"اے نبیؐ، ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے لیے تم پر یہ کتاب حق کے ساتھ اُتاری ہے۔ اب جو کوئی ہدایت قبول کرتا ہے اپنے ہی لیے اچھا کرتا ہے۔ اور جو گمراہی میں پڑتا ہے اپنے ہی حق میں بُرا کرتا ہے۔ اور تم ان پر کوئی حوالہ دار نہیں ہو۔"

اور فرمایا لوگوں کے دلوں کو پھیر دینا اور جن لوگوں میں قبولِ حق کی آمادگی نہ ہو ان میں ایمان پیدا کر دینا نبی کے

بس کی بات نہیں ہے۔ وہ ہادی صرف اس معنی میں ہے کہ نصیحت اور تذکیر کا جو حق ہے اس کو وہ پورا پورا ادا کر دیتا ہے اور جو راستہ دیکھنا چاہے اُسے راستہ دکھا دیتا ہے۔

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ

(النمل۔ آیات ۸۰، ۸۱)

"تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں تک آواز پہنچا سکتے ہو جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر لوٹ جائیں۔ اور نہ تم اندھوں کو گمراہی سے نکال کر سیدھے راستے پر ڈال سکتے ہو۔ تم تو صرف انہی لوگوں کو سُنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں اور پھر سرِ اطاعت جھکا دیتے ہیں۔"

وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ إِنْ أَنتَ إِلَّا نَذِيرٌ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا (فاطر۔ آیات ۲۲-۲۴)

"تم قبر کے مُردوں کو سُنانے والے نہیں ہو، تم تو صرف آگاہ کر دینے والے ہو۔ اور ہم نے تم کو حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"[1]

---

[1] قرآن میں ایک اور مقام پر یہ بات نہایت واضح الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ - (القصص: ۵۶)

اے نبیؐ! تم جسے چاہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو ہدایت قبول کرنے والے ہیں۔

صحیحین کی روایت ہے کہ یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابُوطالب کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔ اُن کا جب آخری وقت آیا تو حضورؐ نے اپنی حد تک انتہائی کوشش کی کہ وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ پر ایمان لے آئیں تاکہ ان کا خاتمہ بالخیر ہو، مگر انہوں نے مِلّتِ عبدالمطّلب پر ہی جان دینے کو ترجیح دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ۔ لیکن محدثین و مفسرین کا یہ طریقہ معلوم و معروف ہے کہ ایک آیت عہدِ نبوی کے جس معاملہ پر چسپاں ہوتی ہو اُسے وہ آیت کی شانِ نزول کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس لیے اس روایت اور اس مضمون کی اُن دوسری روایات سے جو ترمذی اور مُسندِ احمد وغیرہ میں حضرات ابُوہریرہؓ، ابنِ عباسؓ، ابنِ عمرؓ وغیرہم سے مروی ہیں، لازماً یہی نتیجہ نہیں نکلتا کہ سورۂ قصص کی یہ آیت جناب ابوطالب کی وفات کے وقت نازل ہوئی تھی۔ بلکہ ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے مضمون کی

پھر یہ بھی صاف بتا دیا کہ نبیؐ کو جو کچھ قدر و عزت اور علوِ مرتبت حاصل ہے سب اس بنا پر ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے، اس کے احکام پر ٹھیک ٹھیک چلتا ہے، اور جو کچھ کلام اس پر نازل کیا جاتا ہے اسے جوں کا توں اللہ کے بندوں تک پہنچا دیتا ہے۔ ورنہ اگر وہ اطاعت سے مُنہ موڑے اور اللہ کے کلام میں اپنے دل سے گھڑ کر باتیں ملا دے تو اس کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے بلکہ وہ خدا کی پکڑ سے بچ بھی نہ سکے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ (البقرہ۔ آیت ۱۴۵)۔

"اور اے نبیؐ، اگر تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اُس علم کے باوجود جو تمہارے پاس آ گیا ہے، تو یقیناً اس صورت میں تم ظالم ہوگے۔"

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (البقرہ۔ آیت ۱۲۰)۔

"اور اگر اے نبیؐ، تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آیا ہے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو تمہیں اللہ کی سزا سے بچانے والا کوئی حامی اور مددگار نہ ہوگا۔"

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ (یونس۔ آیت ۱۵)

"اے محمدؐ، ان سے کہو، مجھ کو اس کلام میں اپنی طرف سے کچھ رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ میں تو صرف اُس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔"

۴۔ صداقت سب سے زیادہ اس موقع پر ظاہر ہوئی۔ اگرچہ حضورؐ کی دلی خواہش تو ہر بندۂ خدا کو راہِ راست پر لانے کی تھی، لیکن سب سے بڑھ کر اگر کسی شخص کا کفر پر جانا حضورؐ کو شاق ہو سکتا تھا، اور ذاتی محبت و تعلق کی بنا پر سب سے زیادہ کسی شخص کی ہدایت کے آپ آرزو مند ہو سکتے تھے تو وہ ابوطالب تھے۔ لیکن جب ان کو بھی ہدایت دینے پر آپؐ قادر نہ ہوئے تو یہ بات بالکل ظاہر ہو گئی کہ کسی کو ہدایت بخشنا اور کسی کو اس سے محروم رکھنا نبی کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ معاملہ بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اللہ کے ہاں سے یہ دولت کسی رشتہ داری و برادری کی بنا پر نہیں بلکہ آدمی کی قبولیت و استعداد اور مخلصانہ صداقت پسندی کی بنا پر عطا ہوتی ہے۔ (۱)

یہ باتیں اس لیے نہیں کہی گئی ہیں کہ معاذ اللہ رسول اکرمؐ سے کسی نافرمانی یا تحریف و تلبیس کا ادنیٰ سا اندیشہ بھی تھا۔ دراصل ان سے مقصود دنیا پر یہ حقیقت واضح کرنا تھا کہ نبیؐ کو بارگاہِ ربّ العزّت میں جو تقرّب حاصل ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ نبیؐ کی ذات سے اللہ کا کوئی رشتہ ہے، بلکہ اس کے مقرّب ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کا نہایت درجہ مطیع فرمان اور دل و جان سے اس کا بندہ ہے۔

حضورؐ جماعتِ انبیاء کے ایک فرد ہیں

تیسری چیز جس کا بارہا نہایت صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نئے نبی نہیں ہیں، بلکہ جماعتِ انبیاء کے ایک فرد اور اُس سلسلۂ نبوت کی ایک کڑی ہیں جو ابتدائے آفرینش سے لے کر آپ کی بعثت تک جاری رہا اور جس میں ہر قوم اور ہر زمانے کے انبیاء و رُسل شامل ہیں۔ قرآنِ حکیم نبوّت و رسالت کو کسی ایک ذات یا ایک ملک یا ایک قوم سے مخصوص نہیں کرتا۔ بلکہ وہ صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانے میں ایسے مقدس نفوس پیدا کیے ہیں جنہوں نے انسان کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دی ہے اور گمراہی کے بُرے نتائج سے ڈرایا ہے:

وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر۔ آیت ۲۴)

"کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں کوئی مُتنبّہ کرنے والا نہ آیا ہو۔"

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (النحل آیت ۳۶)

"اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا (اِس پیغام کے ساتھ کہ) اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے پرہیز کرو۔"

اور انہی پیغمبروں اور ڈرانے والوں میں سے ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے:

هَٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ (النجم۔ آیت ۵۶)

"یہ ایک ڈرانے والا ہے اگلے ڈرانے والوں میں سے۔"

إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (یٰسٓ۔ ۳)

"اے محمدؐ، یقیناً تم پیغمبروں میں سے ہو۔"

قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (الاحقاف۔ آیت ۹)۔

"اے محمدؐ، کہو میں کوئی نرالا رسول نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ برتا جائیگا اور تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ میں تو اُس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے اور میں

محض ایک پُرانے والا مُجِل صاف صاف ":

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۔ (آلِ عمران ۔ آیت ۱۴۴)

"محمدؐ کچھ نہیں ہیں مگر ایک رسُول اور اُن سے پہلے بھی رسُول گزر چکے ہیں"

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ رسُولِ عربیؐ کی دعوت وہی دعوت ہے جس کی طرف ابتدائے آفرینش سے ہر داعیٔ حق بلاتا رہا ہے، اور آپ اُسی دینِ فطرت کی تلقین کرتے ہیں جس کی تلقین ہمیشہ اللہ کے ہر نبی اور رسُول نے کی ہے ۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (البقرہ ۔ آیات ۱۳۶ - ۱۳۷)

"کہو، ہم ایمان لاتے اللہ پر اور اُس تعلیم پر جو ہماری طرف اُتاری گئی ہے اور اُس پر جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اُتاری گئی اور جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور دوسرے نبیوں کو اُن کے رب کی طرف سے دی گئی تھی ۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مطیعِ فرمان ہیں ۔ پس اگر یہ لوگ بھی اُسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو وہ سیدھے راستے پر ہیں"

قرآن مجید کی یہ تصریحات اس حقیقت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے تھے اور نہ پچھلے پیغمبروں میں سے کسی کی تکذیب یا کسی کے لائے ہوئے پیغام کی تردید کرنے کے لیے تشریف لائے تھے بلکہ آپؐ اس لیے بھیجے گئے تھے کہ اُسی سچے دین کو جو اوّل دن سے تمام قوموں کے پیغمبر پیش کرتے چلے آئے تھے، بعد کے لوگوں کی ملاوٹوں سے پاک کر کے پیش کر دیں ۔

حضورؐ کے مقاصدِ بعثت

اس طرح قرآن مجید اپنے لانے والے کی صحیح حیثیت واضح کرنے کے بعد اُن کاموں کی تفصیل بیان کرتا ہے جن کے لیے اللہ نے اُسے بھیجا تھا ۔ یہ کام بحیثیتِ مجموعی دو شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ایک شعبۂ تعلیمی، دوسرا شعبۂ عملی ۔

آپؐ کا تعلیمی کام

اس شعبے کے کام حسبِ ذیل ہیں:

(۱) تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفوس، اور تعلیم کتاب وحکمت ۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (آل عمران آیت ۱۶۴)۔

"درحقیقت ایمان لانے والوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اُس نے اُن کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا رسول اُٹھایا جو انہیں اُس کی آیات سُناتا ہے، اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور اُنہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔"

تلاوتِ آیات سے مُراد اللہ کے فرامین اور ارشادات جوں کے توں سُنا دینا ہے۔ تزکیہ سے مُراد یہ ہے کہ لوگوں کے اخلاق اور ان کی زندگی کو بُری صفات، بُری رسموں اور بُرے طریقوں سے پاک کیا جائے اور ان کے اندر اچھے اور صاف پاکیزہ اخلاق اور صحیح طریقوں کو نشوونما دیا جائے۔ تعلیم کتاب و حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کی کتاب کا صحیح منشا و مدعا سمجھایا جائے، ان کے اندر ایسی بصیرت پیدا کی جائے کہ وہ کتاب کی اصل رُوح تک پہنچ سکیں، اور انہیں وہ حکمت سکھائی جائے جس سے وہ اپنی زندگی کے تمام مختلف وسعت پذیر پہلوؤں کو کتاب اللہ کے مطابق ڈھالتے چلے جائیں۔

(۲) تکمیلِ دین

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

(المائدہ ۳)

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کے طریقے کو پسند کیا۔"

دوسرے الفاظ میں قرآن کے بھیجنے والے نے اُس کے لانے والے سے صرف اتنی ہی خدمت نہیں لی کہ وہ اُس کی آیات کی تلاوت کرے، نفوس کا تزکیہ کرے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے دے، بلکہ اُس نے اپنے اُسی نیک بندے کے ذریعے سے اِس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ جو آیات نوعِ انسانی تک بھیجنی تھیں وہ سب اُس کے واسطے سے بھیج دیں، جن خرابیوں سے انسانی زندگی کو پاک کرنا مقصود تھا وہ سب اس کے ہاتھوں سے دُور کر کے دکھا دیں۔ جن خوبیوں کا نشوونما جس شان کے ساتھ افراد اور سوسائٹی میں ہونا چاہیے تھا اُس کا بہترین نمونہ اسی کی رہنمائی میں پیش کرا دیا۔ اور کتاب و حکمت کی ایسی تعلیم اس کے ذریعے سے دلوا دی کہ آنے والے تمام زمانوں میں مقصودِ کتاب کے مطابق انسانی زندگی کی تشکیل و تعمیر کی جا سکتی ہے۔

(۳) اُن تمام اختلافات کی حقیقت واضح کر دینا جو اصل دین میں پچھلے انبیاء کی اُمتوں کے درمیان پیدا ہو گئے تھے، اور تمام پردوں کو ہٹا کر، تمام آمیزشوں کو چھانٹ کر، تمام اُلجھنوں کو صاف کر کے، اُس راہِ راست کو

پوری روشنی میں نمایاں کر دیا جس کی پیروی ہمیشہ سے خدا کی رضا کو پہنچنے کی ایک ہی راہ رہی ہے:

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (النحل آیات ۶۳-۶۴)

"بخدا کہ ہم نے (اے محمدؐ) تم سے پہلے مختلف امتوں کی طرف ہدایت بھیجی، مگر اس کے بعد شیطان نے اُن کے غلط اعمال کو اُن کے لیے خوشنما بنا دیا۔ چنانچہ آج وہی اُن کا سرپرست بنا ہوا ہے اور وہ دردناک عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔ اور ہم نے تم پر یہ کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ اُس حقیقت کو اُن کے سامنے واضح کر دو جس میں اُن کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے اور اس لیے کہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت بن کر اُن لوگوں کے لیے جو اس کی پیروی قبول کر لیں۔"

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (المائدہ۔ آیات ۱۵-۱۶)

"اے اہلِ کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسولؐ آگیا ہے جو تمہارے سامنے بہت سی اُن چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جنہیں تم کتاب میں سے چھپاتے تھے اور بہت سی باتوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ اُن لوگوں کو جو اس کی پسند کے مطابق چلتے ہیں امن و سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور انہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔"

(۴) نافرمانوں کو ڈرانا، فرمانبرداروں کو رحمتِ الٰہی کی خوشخبری دینا اور اللہ کے دین کی اشاعت کرنا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۝ وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا (الاحزاب۔ آیات ۴۵-۴۶)

"اے نبیؐ، ہم نے تم کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔"

آپؐ کا عملی کام

عملی زندگی اور اس کے معاملات کے سلسلے میں جو کام حضورؐ کے سپرد کیے گئے تھے وہ یہ ہیں:

(۱) نیکی کا حکم دینا، بُرائی سے روکنا، حرام و حلال کی حدُود قائم کرنا اور انسان کو خدا کے سوا دوسروں کی عائد کردہ پابندیوں سے آزاد اور ان کے لادے ہوئے بوجھوں سے ہلکا کرنا:

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنزِلَ مَعَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔

(الاعراف، آیت ۔ ۱۵۷)

"وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے اور اُن بندشوں کو کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو اُس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔"

(۲) بندگانِ خدا میں حق اور عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا:

إِنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا (النساء ۔ ۱۰۵)

"اے محمدؐ، ہم نے تم پر حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرو اور خیانت کرنے والوں کے وکیل نہ بنو۔"

(۳) اللہ کے دین کو اس طرح قائم کر دینا کہ انسانی زندگی کا پورا نظام اُسی کے تابع ہو اور دوسرے سب طریقے اُس کے مقابلے میں دب کر رہ جائیں:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الفتح ۔ ۲۸)

"وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے نبی کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پوری جنسِ دین پر غالب کر دے۔"

اس طرح نبی کے کام کا یہ شعبہ سیاست، عدالت، اصلاحِ اخلاق و تمدّن اور قیامِ تہذیبِ صالح کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو جاتا ہے۔

نبوّتِ محمدی کی عالمگیریّت اور ابدیّت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کام کسی ایک قوم یا ملک یا دور کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے عام ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

(سبا۔ آیت ۲۸)

"اے محمدؐ، ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (الاعراف۔ آیت ۱۵۸)

"اے محمدؐ، کہو اے انسانو، میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں، اُس خدا کا رسول، جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے، جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، جِلانے اور مارنے والا ہے پس ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول نبی اُمّی پر جو خدا اور اس کے فرامین پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی پیروی کرو، اُمید ہے کہ تم راہ راست پالوگے۔"

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام۔ آیت ۱۹)

"(اے محمدؐ، کہو) اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے سے تم کو متنبّہ کروں اور ہر اُس شخص کو جسے یہ پہنچے۔"

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ۔ (التکویر آیات ۲۷-۲۸)

"یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے تمام دُنیا والوں کے لیے، ہر اُس شخص کے لیے جو تم میں سے راست رَو بننا چاہے۔"

ختمِ نبوّت

نبوّتِ محمّدیؐ کی ایک اور خصوصیت قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اُس پر سلسلۂ نبوّت و رسالت ختم کر دیا گیا اور اس کے بعد دنیا کو پھر کسی نبی کی حاجت باقی نہ رہی:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔ (الاحزاب۔ ۴۰)

"محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں۔"

یہ درحقیقت لازمی نتیجہ ہے نبوّتِ محمّدیؐ کی عالم گیری اور ابدیّت اور تکمیلِ دین کا۔ چونکہ قرآن کے مذکورۂ بالا بیانات کی رُو سے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہے نہ کہ ایک قوم کے لیے،

اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے نہ کہ ایک زمانہ کے لیے، اور آپؐ کے ذریعہ وہ کام بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے جس کے لیے دنیا میں انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی، اس لیے یہ سراسر معقول بات ہے کہ آپؐ پر سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ اس مضمون کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین اسلوب کے ساتھ ایک حدیث میں واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میری مثال نبیوں میں ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک نہایت خوب صورت مکان بنایا اور تمام عمارت بنا کر صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ اب جو لوگوں نے اس کے گرد چکر لگایا تو وہ خالی جگہ انہیں کھٹکنے لگی اور وہ کہنے لگے کہ اگر یہ آخری اینٹ بھی رکھ دی جاتی تو مکان بالکل مکمل ہو جاتا۔ سو وہ آخری اینٹ جس کی جگہ نبوت کے محل میں باقی رہ گئی تھی میں ہی ہوں۔ اب میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس مثال سے ختمِ نبوت کی وجہ صاف سمجھ میں آجاتی ہے۔ جب دین کامل ہو چکا، آیاتِ الٰہی پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکیں، اوامر و نواہی، عقائد و عبادات، تمدن و معاشرت، حکومت و سیاست، غرض انسانی زندگی کے ہر شعبے کے متعلق پورے پورے احکام بیان کر دیے گئے، اور دنیا کے سامنے اللہ کا کلام اور اللہ کے رسولؐ کا اسوۂ حسنہ اس طرح پیش کر دیا گیا کہ ہر قسم کی تحریف و تبدیل سے وہ پاک ہے اور ہر عہد میں اس سے ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے، تو نبوت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ صرف تجدید و تذکیر کی ضرورت رہ گئی ہے جس کے لیے علمائے حق اور مومنین صادقین کی جماعت کافی ہے۔

حضورؐ کے اوصافِ حمیدہ

آخری سوال جو دریافت طلب رہ جاتا ہے یہ ہے کہ اس کتاب کا لانے والا ذاتی طور پر کس قسم کے اخلاق کا انسان تھا؟ اس سوال کے جواب میں قرآن مجید نے دوسری سابق الوقت کتابوں کی طرح اپنے لانے والے کی تعریف کے پل نہیں باندھے ہیں، نہ آپؐ کی تعریف کو ایک مستقل موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ البتہ آمدِ سخن میں محض اشارۃً آنحضرتؐ کی اخلاقی خصوصیات ظاہر کی ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وجودِ مسعود میں کمالِ انسانیت کے بہترین خصائص موجود تھے۔

(۱) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا اخلاق کے نہایت بلند مقام پر تھا:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (ن-۴)

"اور اے محمدؐ! یقیناً تم اخلاق کے بڑے بلند مرتبے پر ہو۔"

(۲) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا ایک ایسا راسخ العزم، مستقیم الارادہ اور اللہ پر ہر حال میں بھروسا کرنے والا انسان تھا کہ جس وقت اس کی ساری قوم اسے مٹا دینے پر آمادہ ہو گئی تھی اور وہ صرف ایک مددگار کے ساتھ ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا، اس سخت خطرے کے موقع پر بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے عزم پر قائم رہا:

إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ

إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ - آیت ۴۰)

"یاد کرو جب کہ کافروں نے اس کو نکال دیا تھا جبکہ وہ غار میں صرف ایک آدمی کے ساتھ تھا جبکہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔"

(۳) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا ایک نہایت فراخ حوصلہ اور دریا دل انسان تھا جس نے اپنے بدترین دشمنوں کے لیے بھی بخشش کی دعا کی اور آخر اللہ تعالیٰ کو اُسے اپنا یہ قطعی فیصلہ سنا دینا پڑا کہ وہ ان لوگوں کو نہیں بخشے گا:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (التوبہ - آیت ۸۰)

"چاہے تم اُن کے لیے معافی مانگو چاہے نہ مانگو، اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے معافی مانگو گے تب بھی اللہ اُن کو معاف نہ کرے گا۔"

(۴) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کا مزاج نہایت نرم تھا، وہ کبھی کسی کے ساتھ درشتی سے پیش نہیں آتا تھا اور اسی لیے دنیا اس کی گرویدہ ہو گئی تھی۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران - آیت ۱۵۹)

"یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان کے ساتھ نرم ہو ورنہ اگر تم زبان کے تیز اور دل کے سخت ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ کر الگ ہو جاتے۔"

(۵) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا بندگانِ خدا کو راہِ راست پر لانے کی سچی تڑپ دل میں رکھتا تھا اور ان کے گمراہی پر اصرار کرنے سے اس کی روح کو شدید رنج پہنچتا تھا حتیٰ کہ وہ ان کے غم میں گھلا جاتا تھا۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (الکہف)

"اے محمدؐ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ان کے پیچھے رنج و غم میں اپنی جان کھو دو گے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔"

(۶) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کو اپنی اُمّت سے بے حد محبت تھی۔ وہ ان کی بھلائی کا حریص تھا، اُن کے نقصان میں پڑنے سے کڑھتا تھا اور ان کے حق میں سراپا شفقت و رحمت تھا:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (التوبہ - ۱۲۸)

"تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے جسے ہر وہ چیز شاق گزرتی ہے جو

تمہیں نقصان پہنچانے والی ہو، جو تمہاری فلاح کا حریص ہے اور اہلِ ایمان کے ساتھ نہایت شفیق و رحیم ہے۔"

(۷) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا صرف اپنی قوم ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم کے لیے اللہ کی رحمت تھا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (الانبیاء۔ ۱۰۷)

"اے محمدؐ، ہم نے تم کو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

(۸) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا راتوں کو گھنٹوں اللہ کی عبادت کرتا اور خدا کی یاد میں کھڑا رہتا تھا:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ (المزمل۔ ۲۰)

"اے محمدؐ، تمہارا رب جانتا ہے کہ تم راتوں کو تقریباً دو تہائی حصے تک اور کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی حصے تک نماز میں کھڑے رہتے ہو۔"

(۹) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا ایک سچا انسان تھا، نہ کبھی اپنی زندگی میں راہِ حق سے بھٹکا، نہ فاسد خیالات سے متاثر ہوا اور نہ کبھی اس نے ایک لفظ خواہشِ نفس کی پیروی میں حق کے خلاف زبان سے نکالا:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (النجم۔ آیات ۲-۳)

"لوگو، تمہارا صاحب نہ کبھی سیدھی راہ سے بھٹکا اور نہ غلط خیالات سے بہکا اور نہ وہ خواہشِ نفس سے بولتا ہے۔"

(۱۰) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کی ذات تمام عالم کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ تھی اور اس کی پوری زندگی کمالِ اخلاق کا صحیح معیار تھی:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب۔ آیت ۲۱)

"تمہارے لیے رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے۔"

قرآن مجید کا تتبع کرنے سے صاحبِ قرآن کی بعض اور خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے، لیکن اس مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ جو کوئی قرآن کا مطالعہ کرے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ بخلاف دوسری موجودالوقت مذہبی کتابوں کے یہ کتاب اپنے لانے والے کو جس رنگ میں پیش کرتی ہے وہ کس قدر صاف، واضح اور آلودگی سے پاک ہے۔ اس میں نہ الوہیت کا کوئی شائبہ ہے، نہ تعریف و ثنا میں کوئی مبالغہ ہے، نہ غیر معمولی قوتیں آپؐ کی طرف منسوب کی گئی ہیں، نہ آپؐ کو خدا کے کاروبار میں شریک و سہیم بنایا گیا ہے، اور نہ آپؐ کو ایسی کمزوریوں سے متہم کیا گیا ہے جو ایک ہادی اور داعی الی الحق کی شان سے گری ہوئی ہوں۔ اگر اسلامی لٹریچر کی دوسری تمام کتابیں دنیا سے ناپید ہو جائیں اور صرف قرآن مجید ہی باقی رہ جاتے تب بھی رسولِ اکرمؐ کی شخصیت

کے متعلق کسی غلط فہمی، کسی شک و شبہ اور کسی لغزشِ عقیدت کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ ہم اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کتاب کا لانے والا ایک کامل انسان تھا، بہترین اخلاق سے متصف تھا، انبیاءِ سابقین کی تصدیق کرتا تھا، کسی نئے مذہب کا بانی نہ تھا، اور کسی فوق البشر حیثیت کا مدعی نہ تھا۔ اس کی دعوت تمام عالم کے لیے تھی، اُس کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے چند مقرر خدمات پر مامور کیا گیا تھا اور جب اُس نے ان خدمات کو پوری طرح انجام دے دیا تو نبوت کا سلسلہ اس کی ذات پر ختم ہو گیا۔[1] (۲)

---

[1] دراصل یہ مضمون ۱۹۲۷ء میں اخبار "الجمعیۃ" دہلی کے جیب نمبر کے لیے لکھا گیا تھا۔ پھر ۱۹۳۴ء میں اس کو دوبارہ ترجمان القرآن میں شائع کیا گیا، اور اس کے بعد تفہیمات جلد دوم میں شامل کر دیا گیا۔ اب اس کتاب میں درج کرتے وقت اس کے اندر بعض اضافے کر دیے گئے ہیں۔ (مؤلف)

حوالہ جات

(۱) تفہیم القرآن، جلد سوم۔ القصص۔ آیت ۴۹۔

(۲) تفہیمات، حصہ دوم، صفحات ۶ تا ۴۸۔

باب (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان

حضرت ابراہیم علیہ السلام

یہ بات تاریخی طور پر مسلّم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کی اُس شاخ سے تھا جو اُن کے بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ سے چلی ہے اور بنی اسماعیل کہلاتی ہے۔ حضورؐ کی سیرت سے اِس معاملہ کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ آپؐ کے ذکرِ مبارک کو حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے حالات سے ہی شروع ہونا چاہیے، کیونکہ اس کے بغیر یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ عراق کا یہ خاندان اندرونِ عرب کے ایک دُور دراز مقام، مکّہ کیسے پہنچا، یہاں قبلۂ اہلِ توحید کی بنا کیسے پڑی، اور عرب کے اکثر و بیشتر قبائل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا رشتہ تھا جس کی وجہ سے آپؐ اِس ملک میں ایک غیر معروف نہیں بلکہ خوب جانی بُوجھی شخصیت تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیمؑ عراق کے رہنے والے تھے۔ اُن کا وطن اُر، عراق کے نمرود خاندان کا دارالسلطنت تھا۔ ۲۱۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں، جو بالعموم محققین کے نزدیک حضرت ابراہیمؑ کے ظہور کا زمانہ سمجھا جاتا ہے، یہ ایک بہت بڑا مرکزِ تمدّن و تجارت تھا، اور اس کے ساتھ ساتھ اُس قوم کے شرک کا گڑھ بھی یہی تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اس قوم میں شرک کی مخالفت اور توحید کی دعوت کا آغاز کیا، تو ملک کی حکومت، ساری قوم، اُن کا اپنا خاندان، حتّٰی کہ اُن کا باپ بھی اُن کا دشمن ہوگیا، اور جب وہ سب اُن کو ڈرا دھمکا کر اِس کام سے باز رکھنے میں ناکام ہوگئے تو آخرکار انہوں نے متفق ہوکر آنجناب کو زندہ جلا دینے کے لیے آگ سے بھری ہُوئی ایک خندق میں پھینک دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور آپؐ اِس خندق سے زندہ و سلامت نکل آئے۔ یہ قصّہ تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں مذکور ہے (ملاحظہ ہو الانبیاء آیات ۶۸ - ۶۹ - العنکبوت، آیت ۲۴ - الصّٰفّٰت، ۹۷ - ۹۸) -

قرآن مجید کا بیان ہے کہ اِس کے بعد آپ اپنا وطن چھوڑ کر سرزمینِ شام و فلسطین کی طرف ہجرت کر گئے جو اُس زمانہ میں ارضِ کنعان کہلاتی تھی۔ اِس ہجرت میں اُن کے بھتیجے حضرت لوطؑ اُن کے ساتھ تھے کیونکہ وہی اُن کی قوم

میں سے ایمان لاتے تھے اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو بھی نبوّت سے سرفراز فرمایا۔ دوسری رفیق حضرت ابراہیمؑ کی بیوی سارہؓ تھیں جنہوں نے مرتے دم تک آپؑ کا ساتھ دیا۔ اس باب میں قرآن مجید کی تصریحات حسب ذیل ہیں:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ (الصّٰفّٰت ۹۷-۹۹)

"انہوں نے آپس میں کہا، اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دو۔ انہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے انہی کو نیچا دکھا دیا۔ اور ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں (یعنی ہجرت کرتا ہوں)، وہی میری رہنمائی فرمائے گا۔"

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ ... فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ ۘ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (العنکبوت ۲۴-۲۶)

"پھر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا اسے قتل کر دو یا جلا ڈالو۔ آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا ..... اس وقت لوطؑ نے اس کو (یعنی حضرت ابراہیمؑ کو) مانا اور ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہ زبردست اور حکیم ہے۔"

وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (الانبیاء ۷۱)

"اور ہم اُسے (یعنی حضرت ابراہیمؑ کو) اور لوطؑ کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں[1]۔"

وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (الانبیاء ۷۴)

"اور لوطؑ کو ہم نے حکم اور علم بخشا (یعنی نبوّت عطا کی)۔"

وَإِنَّ لُوطًا لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ (الصّٰفّٰت ۱۳۳)

"اور لوطؑ بھی اُن لوگوں میں سے تھا جو رسول بنائے گئے ہیں۔"

حضرت ابراہیمؑ کی اس ہجرت کے بعد ان کی قوم کا کیا انجام ہوا اس کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں نہیں آئی ہے، مگر سورۂ توبہ آیت ۷۰ میں اس کا ذکر بھی اُن قوموں میں کیا گیا ہے جو عذاب میں مبتلا کی گئیں۔

---

[1] برکت والی زمین اور بستیوں سے مراد شام و فلسطین کا علاقہ ہے جیسے سورۂ اعراف آیت ۱۳۷، بنی اسرائیل آیت ۱، اور الانبیاء آیت ۸۱ میں بھی اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے (تفہیم القرآن، جلد چہارم، سبا، حاشیہ ۲۷)۔

رہی یہ بات کہ ہجرت میں حضرت لوطؑ کے ساتھ حضرت سارہؓ بھی حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ تھیں، تو اس کی تصریح اگرچہ قرآن میں نہیں کی گئی ہے، لیکن قرآن کے بعض بیانات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابراہیمؑ شادی شدہ تھے اور ان کی اہلیہ ہجرت میں ان کے ساتھ شریک تھیں۔ مثلاً سورۂ صافات میں ہے کہ ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِينَ "میرے پروردگار مجھے صالح اولاد عطا فرما۔" یہ دعا ایک شادی شدہ آدمی ہی کرسکتا تھا اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ وطن سے ہجرت کرتے وقت یہ دعا کر رہا ہو۔ بائبل کے تاریخی بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس ہجرت میں حضرت سارہؓ شامل تھیں لیکن اس سلسلہ میں بائبل کے دوسرے بیانات بالکل بے سروپا ہیں۔ مثلاً وہ کہتی ہے کہ حضرت سارہ حضرت لوطؑ کی حقیقی بہن اور حضرت ابراہیمؑ کی سگی بھتیجی تھیں جن سے انہوں نے نکاح کیا تھا، (نیز) اس ہجرت میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کا باپ بھی شریک تھا (پیدائش، باب ۱۱۔ فقرات ۲۷ تا ۳۲)۔ حالانکہ صرف قرآن ہی نہیں تلمود بھی یہ شہادت دیتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر دعوت توحید کی پاداش میں جو مظالم کیے گئے تھے ان میں خود ان کا باپ بھی شریک تھا۔ (منتخبات تلمود از ایچ پولانو، لندن، صفحہ ۳۰ تا ۴۲) نیز یہ بات خدا کی کسی شریعت میں بھی جائز نہ تھی کہ کوئی شخص اپنی سگی بھتیجی سے شادی کرے، کجا کہ ایک نبی اس کا مرتکب ہو۔ (۱)

حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغی سرگرمیاں

حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انہوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں خلیفہ مقرر کیے۔ شرق اردن میں اپنے بھتیجے لوطؑ کو، شام و فلسطین میں اپنے چھوٹے بیٹے حضرت اسحٰقؑ کو، اور اندرون عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں، ایک حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب کے قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ ان کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے، اس لیے وہ اپنا سلسلہ انہی سے جوڑتے تھے۔[1] دوسرے

---

[1] چونکہ حضورؐ کے دور تک ڈھائی ہزار سال کے زمانے میں اولاد اسماعیلؑ کے مختلف خاندانوں نے اہل عرب کے دوسرے بہت سے خاندانوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کیے تھے، اس لیے جیسا کہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے، یہ دوسرے

حضرت اسحٰقؑ کی اولاد جن میں حضرات یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے تھے، اور حضرت یعقوبؑ کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا، انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت بھی اُن کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو اُن سے الگ رہے، مگر مذہباً ان کے متبع رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا اصل کام دنیا کو اللہ کی اطاعت کی طرف بلانا اور اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت کے مطابق انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام درست کرنا تھا۔ وہ خود اللہ کے مطیع تھے، اس کے دیے ہوئے علم کی پیروی کرتے تھے، دنیا میں اس علم کو پھیلاتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ سب انسان مالکِ کائنات کے مطیع ہو کر رہیں۔ یہی خدمت تھی جس کے لیے وہ دنیا کے امام و پیشوا بنائے گئے۔ اُن کے بعد یہ امامت کا منصب اُن کی نسل کی اُس شاخ کو ملا جو حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ سے چلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ اُسی میں انبیاء پیدا ہوتے رہے، اسی کو راہِ راست کا علم دیا گیا، اسی کے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ اس راہِ راست کی طرف اقوامِ عالم کی رہنمائی کرے، اور یہی وہ نعمت تھی جسے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بار بار اس نسل کے لوگوں کو یاد دلایا ہے۔ اس شاخ نے حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بیت المقدس کو اپنا مرکز قرار دیا۔ اس لیے جب تک یہ شاخ امامت کے منصب پر قائم رہی، بیت المقدس ہی دعوت الی اللہ کا مرکز اور خدا پرستوں کا قبلہ رہا۔ (۴)

حضرت اسماعیلؑ کی پیدائش

اولادِ ابراہیمؑ کی دوسری شاخ، بنی اسرائیل میں جو دوسرے عیوب پیدا ہو گئے اُن میں سے ایک عیب یہ بھی تھا کہ تاریخ کو مسخ کر کے ہر فخر کو وہ اپنے لیے مخصوص کرنے لگے، اور جن بھی دوسری قوموں سے تاریخ کے دوران میں ان کی کشمکش یا رقابت رہی اُن سب کا گند کالا کرنے کی انہوں نے پوری کوشش کی۔ بائیبل میں اس کی بہت سی مثالوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس کے نزدیک حضرت لوطؑ سرے سے پیغمبر ہی نہ تھے اور کسی دعوت کے کام پر حضرت ابراہیمؑ نے اُن کو مامور کر کے ارضِ سدوم میں نہیں بھیجا تھا، بلکہ دونوں چچا بھتیجے میں جھگڑا ہو گیا تھا اور چچا نے بھتیجے کو الگ کہیں اور جا بسنے کے لیے کہہ دیا تھا (پیدائش، باب ۱۳۔ فقرات ۵ تا ۱۲)۔ دوسری اس سے بھی زیادہ گھناؤنی مثال یہ ہے کہ بائیبل کی رُو سے جب قومِ لوطؑ پر عذاب آیا تو حضرت لوطؑ اپنی دو بیٹیوں کو لے کر وہاں سے نکل گئے

۴۔ خاندان بھی اِس مقدس خاندان کے ساتھ رشتہ داری کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اپنے نسب ناموں میں اس کا ذکر کرتے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

اور اپنے چچا کے پاس نہیں گئے جو ارضِ سُدُوم سے قریب ہی فلسطین کے شہر حبرُون میں رہتے تھے، بلکہ ایک غار میں جا کر رہنے لگے۔ وہاں معاذ اللہ ان کی دونوں بیٹیوں نے ان کو شراب پلا کر ان سے ہم آغوشی کی جس سے دونوں حاملہ ہو گئیں۔ ایک سے موآب پیدا ہُوا جو موآبیوں کا باپ ہے اور دوسری سے بن عمی پیدا ہُوا جو بنی عمّون کا باپ ہے (پیدائش، باب ۱۹، فقرات ۳۰ تا ۳۸)۔ یہ ڈھنگ ہے جس سے بنی اسرائیل نے موآبیوں اور عمّونیوں کے خلاف اپنے دل کا بغض نکالا ہے، کیونکہ بعد کی تاریخ میں ان قبیلوں سے اُن کی سخت کشمکش برپا رہی ہے۔

ایسا ہی معاملہ ان لوگوں نے بنی اسماعیل سے بھی کیا ہے۔ بائیبل میں وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ حضرت ہاجرہؑ، حضرت سارہؓ کی کنیز تھیں۔ حضرت سارہؓ نے یہ دیکھ کر کہ وہ بے اولاد ہیں، حضرت ابراہیمؑ سے کہا کہ آپ میری لونڈی کے پاس جائیں تاکہ میرا گھر کسی طرح آباد ہو۔ چنانچہ ان کے کہنے پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہؑ سے تمتع کیا اور ان سے حضرت اسماعیلؑ پیدا ہوئے (پیدائش، باب ۱۶۔ فقرات ۱ تا ۴۔ ۱۵۔ ۱۶)۔ حالانکہ بائیبل کی اِسی کتاب پیدائش کے باب ۱۲ فقرہ ۱۶ میں بتایا گیا ہے کہ اُس وقت کے فرعون نے بہت مال مویشی اور غلام اور کنیزیں حضرت ابراہیمؑ کو ہدیے میں دی تھیں جن میں سے ایک حضرت ہاجرہؑ بھی تھیں [1]۔ اس لیے حضرت ہاجرہؑ کو حضرت سارہؓ کی کنیز قرار دینا خود بائیبل کی رُو سے غلط ہے، اور ان سے تمتع کرنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ حضرت سارہؓ کی اجازت کے محتاج نہ تھے۔

پھر بائیبل بیان کرتی ہے کہ حضرت اسماعیلؑ فلسطین ہی میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ جب وہ ۱۴ برس کے تھے اُس وقت حضرت ابراہیمؑ کے ہاں حضرت سارہؓ سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے (پیدائش، باب ۱۶، فقرات ۱۶ تا ۲۴۔ اور باب ۲۱، فقرات ۱ تا ۵)۔ اس کے بعد بائیبل کہتی ہے:

"اور وہ لڑکا (یعنی حضرت اسحٰقؑ) بڑھا اور اُس کا دُودھ چھڑایا گیا اور اضحاق کے دُودھ چھڑانے کے دن ابرہام نے بڑی ضیافت کی۔ اور سارہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو اس کے ابراہام سے پیدا ہوا تھا ٹھٹھے مارتا ہے۔ تب اس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے بیٹے کو نکال دے کیونکہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحاق کے ساتھ وارث نہ ہوگا۔ پر ابراہام کو اس کے بیٹے کے باعث یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ تجھے اس لڑکے اور اپنی لونڈی کے باعث بُرا نہ لگے۔ جو کچھ

---

[1] حضرت ہاجرہؑ ایک قریہ کی رہنے والی تھیں جس کو اُمّ العرب یا اُمّ العریک کہتے ہیں۔ یہ شرقی مصر میں فرما یا الطینہ کے آگے بحر روم کے ساحل سے ۲۰ میل کے فاصلے پر واقع تھا اور فراعنہ کے زمانے میں یہاں ایک قلعہ بنا ہُوا تھا۔ آج کل اسے تل الفرما کہا جاتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلفؒ) * مرجوعۃ الخلیل

سارہ تجھ سے کہتی ہے تو اس کی بات مان ۔۔۔۔۔ تب ابراہام نے صبح اٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور اسے ہاجرہ کو دیا بلکہ اس کے کندھے پر دھر دیا اور لڑکے کو بھی اس کے ساتھ رخصت کر دیا۔ سو وہ چلی گئی اور بیرسبع کے بیابان میں آوارہ پھرنے لگی۔ اور جب مشک کا پانی ختم ہو گیا تو اس نے لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے مقابل ایک تیر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی اور کہنے لگی کہ میں اس لڑکے کا مرنا تو نہ دیکھوں۔ سو وہ اس کے مقابل بیٹھ گئی اور چلا چلا کر رونے لگی۔ اور خدا نے اس لڑکے کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور اس سے کہا اے ہاجرہ تجھ کو کیا ہوا؟ مت ڈر کیونکہ خدا نے اس جگہ سے جہاں لڑکا پڑا ہے اس کی آواز سن لی ہے۔ اٹھ اور لڑکے کو اٹھا اور اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کیونکہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ پھر خدا نے اس کی آنکھیں کھولیں اور اس نے پانی کا ایک کنواں دیکھا اور جا کر مشک کو پانی سے بھر لیا اور لڑکے کو پلایا اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑا ہوا اور بیابان میں رہنے لگا اور تیر انداز بنا۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا اور اس کی ماں نے ملک مصر سے اس کے لیے بیوی لی" (پیدائش۔ باب ۲۱۔ فقرات ۹ تا ۲۱)۔

یہ یہودی جھوٹی داستان اس لیے گھڑی گئی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کا عرب، اور مکہ اور کعبہ اور زمزم سے کوئی تعلق سرے سے ظاہر ہی نہ ہو، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ کے سفرِ عرب پر بالکل پردہ ڈال دینے، اور حضرت اسماعیلؑ کے ۱۴ برس تک فلسطین میں قیام اور اس کے بعد بالآخر بیابان فاران میں ان کے رہنے اور وہیں پانی کا کنواں برآمد ہونے اور مصر کی کسی عورت سے ان کی شادی ہونے کا ذکر اسلام کی تاریخ کے اس پورے باب پر خطِ نسخ پھیر دیتا ہے جس کا تعلق دینِ ابراہیمیؑ کے عربی مرکز سے ہے۔ بائیبل میں فاران کے بیابان کا جو ذکر مختلف مقامات پر کیا گیا ہے اس کی رو سے وہ فلسطین کے جنوب، وادی عزبہ کے مغرب، دشتِ سینا کے شمال اور مصر و بحرِ ادوم کے مشرق میں واقع تھا، عرب کے حجازی فاران سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا جس میں مکہ واقع ہے۔ اس پر مزید حضرت سارہؓ اور حضرت ابراہیمؑ کی جو گھناؤنی سیرت اس داستان میں پیش کی گئی ہے، اور جس میں ساتھ ساتھ خود اللہ تعالیٰ کو بھی ملوث کر دیا گیا ہے، اس سے خود بنی اسرائیل کے اخلاقی تصورات کی پستی ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں ایک پیغمبر (حضرت ابراہیمؑ) کی بیوی اور دوسرے پیغمبر (حضرت اسحاقؑ) کی والدہ اس صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں کہ وہ سوکن کے نوجوان بیٹے کا ہنسنا تک برداشت نہیں کرتیں اور شوہر کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ اسے اور اس کے لڑکے کو اپنی وراثت سے محروم کر کے گھر سے نکال دے۔ شوہر جو ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں اس شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں کہ وہ اپنے ۱۵-۱۶ برس کے بیٹے کو اس کی ماں سمیت صرف روٹی اور پانی کا ایک مشکیزہ دے کر بیابان میں چھوڑ دیتے ہیں اور پھر اس کی پروا نہیں کرتے کہ یہ مرتے ہیں یا جیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ

کی یہ شان ہمیں دکھائی جاتی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے جدِ امجد حضرت اسحٰق اور ان کی ماں کی خاطر حضرت ابراہیمؑ کو یہ ہدایت فرماتا ہے کہ اسحٰق کی ماں سوکناپے کے جلاپے کی بنا پر اُن سے جس ظلم کی فرمائش کر رہی ہیں اس کا وہ ارتکاب کر ڈالیں۔ یہ ساری داستان خود اپنی داخلی شہادت کی بنا پر جھوٹ کی ایک پوٹ ہے۔ تاریخ کے باعزت نام سے اس کو موسوم کرنا لفظ تاریخ کی توہین ہے۔

اس کے مقابلے میں صحیح تاریخ ہم کو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتی ہے جس کی تائید ہم ہزار برس کی متواتر روایات کرتی ہیں جو اہلِ عرب میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہی ہیں۔

قرآن مجید کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وطن سے ہجرت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ "میرے پروردگار مجھے صالح اولاد عطا فرما" (الصّٰفّٰت - ۱۰۰)۔ یہ دعا ایک طویل مدت گزرنے کے بعد پوری ہوئی جب کہ حضرت ابراہیمؑ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید ہی میں حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ "شکر ہے اُس خدا کا جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ عطا کیے" (ابراہیم - ۳۹)۔ ان دونوں صاحبزادوں کی پیدائش سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اُن کے پیدا ہونے کی بشارت دی تھی۔ پہلے حضرت اسماعیلؑ کی بشارت ان الفاظ میں دی گئی کہ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ "پس ہم نے اس کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی" (الصّٰفّٰت - ۱۰۱)۔ اور اس کے کئی سال بعد جب حضرت اسماعیلؑ جوانی کی عمر کے قریب پہنچ چکے تھے، دوسرے صاحبزادے کی بشارت یوں دی گئی وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ "اور فرشتوں نے اُن کو (یعنی حضرت ابراہیمؑ کو) ایک ذی علم لڑکے کی خوشخبری دی" (الذّٰریٰت - ۲۸)۔ یہ دوسری بشارت جب دی گئی تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ "کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ بھلا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت ہے جو تم دے رہے ہو" (الحجر - ۵۴)۔ اور حضرت سارہ کا بشارت سن کر یہ حال ہوا فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ "اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی بڑھیا بانجھ" (الذّٰریٰت - ۲۹)۔ بائیبل کے بیان سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ۸۶ سال کی عمر میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاں حضرت اسماعیلؑ اور سو سال کی عمر میں حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے تھے۔

دیکھئے کتاب پیدائش باب ۱۶ فقرہ ۱۶ اور باب ۲۱ فقرہ ۵۔

حضرت اسماعیلؑ کا مکہ میں آباد کیا جانا

اوپر کے بیان سے یہ بات تو معلوم ہو چکی کہ حضرت اسماعیلؑ اپنے والد ماجد کے پہلے بیٹے تھے جو بڑھاپے میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک ضعیف العمر باپ کے لیے بڑی عمر میں اولاد نصیب ہونا اس بات کا متقاضی تھا کہ وہ اس بچے کو دیکھ دیکھ کر جیتا

ہی نہیں بلکہ چودہ برس تک اکلوتا بھی تھا، سینے سے لگا کر رکھتا اور آنکھوں سے اُس کا اوجھل ہونا بھی گوارا نہ کرتا۔ مگر حضرت ابراہیمؑ پیغمبر تھے جن کے لیے سب سے مقدم چیز وہ دعوتِ حق تھی جس کی خاطر اُنہوں نے وطن میں جفائیں سہیں، ہجرت کی، دیارِ غیر کی برسوں خاک چھانتے پھرے، اور ہر جگہ خدا کا پیغام پہنچانے میں اپنی ساری طاقتیں اور محنتیں خرچ کر دیں۔ اس عزیز و محبوب بچے کی پیدائش کے بعد ان کو سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ عرب میں دعوتِ توحید کے اُس مرکز کی بنا ڈال دیں جہاں سے دُنیا میں آخری نبوت کا ظہور ہونا تھا اور جسے قیامت تک کے لیے اس دعوت کا مرکز رہنا تھا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی حضرت ابراہیمؑ کو اُس مقام کی نشاندہی کر دی تھی جہاں اس مرکز کی تعمیر مطلوب تھی، چنانچہ سورۂ حج میں ارشاد ہوا ہے کہ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ "یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اِس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی" (آیت ۲۶)۔ اِس ہدایت کے مطابق اللہ کے اُس عظیم بندے نے اپنے چھوٹے سے بچے کو جو ابھی دُودھ ہی پی رہا تھا، اُس کی حیرت انگیز صبر و توکّل رکھنے والی ماں کے ساتھ، ٹھیک اُس مقام پر لے جا کر بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جہاں آخرکار اُن کو خانۂ کعبہ تعمیر کرنا تھا۔

بخاری میں اِس واقعہ کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اِس روایت میں جس طرح ابن عباسؓ نے جگہ جگہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات نقل کیے ہیں اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں وہ حضورؐ سے سُن کر بیان کر رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہؑ اور ان کے بیٹے اسماعیلؑ کو، جبکہ وہ ابھی دُودھ پی رہے تھے، لے کر آئے اور ان کو ایک درخت کے نیچے اُس جگہ چھوڑ دیا جہاں بعد میں زمزم نکلا۔ مکّہ کی سنسان وادی میں اُس وقت کوئی ایک انسان بھی موجود نہ تھا اور نہ کہیں پانی پایا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے چمڑے کا ایک تھیلا جس میں کھجوریں تھیں، اور پانی کا ایک مشکیزہ حضرت ہاجرہ کو دیا اور واپس روانہ ہو گئے۔ وہ اُن کے پیچھے چلیں اور کہنے لگیں اے ابراہیمؑ کہاں جا رہے ہو؟ اور ہمیں اس سنسان بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑے جاتے ہو؟ یہ بات حضرت ہاجرہؓ نے کئی مرتبہ کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے پلٹ کر نہ دیکھا[1]۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ جواب میں انہوں نے بس

---

[1] پلٹ کر نہ دیکھنے کی وجہ بے دردی اور بے پروائی نہ تھی۔ حضرت ابراہیمؑ پیغمبرِ عظیم ہی سہی، بہرحال تھے تو انسان ہی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اتنا بڑا خطرہ مول لے رہے تھے کہ پہاڑوں کے درمیان ایک سنسان وادی میں اپنے دُودھ پیتے بچے اور اُس کی ماں کو چھوڑے جا رہے تھے۔ اُس وقت اُن کے دل پر جو کچھ گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ اُسی صورتِ حال کا تصوّر کر کے ہر شخص کر سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اگر وہ بیوی اور بچے کی طرف پلٹ کر دیکھتے تو ممکن ہے کہ دل بھر آتا اور ارادے میں تزلزل پیدا ہو جاتا۔ اِس لیے سینے پر پتھر رکھ کر چل پڑے اور جب پیچھے آنے والی بیوی نے بار بار پوچھا تو اس کی طرف دیکھے بغیر بس ہاں کہہ دیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

اتنا فرمایا کہ ہاں۔ اس پر وہ بولیں کہ اگر یہ بات ہے تو اللہ ہمیں ضائع نہیں فرمائے گا، اور پلٹ کر بیٹے کے پاس آ بیٹھیں۔

حضرت ابراہیمؑ جب پہاڑ کی اوٹ میں پہنچے جہاں سے یہ ماں بیٹے نظر نہ آتے تھے تو بیت اللہ کی طرف (یعنی اس جگہ کی طرف جہاں آخر کار انہیں بیت اللہ تعمیر کرنا تھا) رُخ کیا اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ "پروردگار، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے تاکہ اُسے پروردگار، یہ یہاں نماز قائم کریں، لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور انہیں کھانے کو پھل دے شاید کہ یہ شکر گزار بنیں" (ابراہیمؑ - ۳۷)۔ اِدھر اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ان کو دُودھ پلاتی رہیں اور مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں، جب پانی ختم ہو گیا تو انہیں اور بچے کو پیاس لگی شروع ہوئی۔ وہ بچے کو تڑپتا ہوا دیکھتی رہیں۔ آخر بچے کی حالت ان سے نہ دیکھی گئی اور وادی کی طرف یہ دیکھنے کے لیے چل پڑیں کہ کوئی آدمی نظر آتے، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ پھر صفا کی پہاڑی سے اُتر کر وادی کے بیچ میں آئیں اور اپنا بازو اُٹھا کر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ پھر مَروَہ کی پہاڑی پر چڑھ کر دیکھنے لگیں کہ کوئی آدمی نظر آتا ہے یا نہیں، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ یہ فعل انہوں نے سات مرتبہ (صفا اور مروہ کے درمیان) کیا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی وجہ سے لوگ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں[1]۔ آخری مرتبہ جب وہ مروہ کی پہاڑی پر چڑھیں تو انہوں نے ایک آواز سنی۔ اپنے آپ سے کہنے لگیں "چپ رہ" (یعنی شور مچانا بند کر اور غور سے سُننے لگیں۔ آواز پھر آئی۔ انہوں نے کہا "اے شخص، تُو نے اپنی آواز تو مجھے سُنا دی، کیا تیرے پاس میری فریاد رسی کے لیے کچھ ہے؟" یکایک انہوں نے زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ دیکھا (ابراہیم بن نافع اور ابن جُریج کی روایت میں ہے کہ جبریلؑ کو دیکھا)، کہ وہ اپنی ایڑی یا بازو سے زمین کھود رہے ہیں، یہاں تک کہ پانی نکل آیا۔ حضرت ہاجرہ لپ بھر بھر کر وہ پانی مشکیزہ میں بھرنے لگیں اور جیسے جیسے وہ پانی بھرتی گئیں پانی اُبل اُبل کر اُوپر آتا رہا۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ اسماعیلؑ کی ماں پر رحمت فرمائے، اگر وہ زمزم کو اسی حالت پر چھوڑ

---

[1] یہ اس واقعہ کا اہم ترین تاریخی ثبوت ہے کہ کعبہ کی تعمیر کے بعد جب سے حج کا سلسلہ حضرت ابراہیمؑ ہی کے زمانے میں شروع ہوا اُسی وقت سے آج تک سینکڑوں، پھر ہزاروں، پھر لاکھوں پھر کروڑوں انسان اس واقعہ کی یاد میں سَعی بین الصفا والمروہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ہزاروں برس کا متواتر عمل جو بلا انقطاع اُس وقت سے آج تک ہو رہا ہے، اس واقعہ کا ایسا ثبوت ہے جس سے بڑھ کر کسی تاریخی واقعہ کا ثبوت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اس کے برعکس بائیبل بیابانِ فاران کا جو واقعہ بیان کرتی ہے وہاں نہ پہلے کبھی اس طرح کی سعی ہوئی، نہ آج ہو رہی ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

دیتیں (یعنی چاروں طرف مٹی ڈال کر اسے گھیر لیتیں) تو زمزم بہتا ہوا چشمہ ہوتا۔" اس طرح حضرت ہاجرہ پانی پینے لگیں اور اپنے بچے کو دودھ پلانے لگیں۔ فرشتے نے ان سے کہا "ضائع ہونے کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ دونوں تعمیر کریں گے اور اللہ اس گھر کے لوگوں کو ضائع نہیں کرے گا۔" یہ حالت کچھ مدت رہی تھی کہ قبیلہ جرہم[1] کے کچھ لوگ کدا کی طرف سے آئے اور مکہ کے نشیبی حصے کی طرف ٹھہرے۔ وہاں انہوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ ایک مقام کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "یہ پرندہ تو پانی پر چکر لگا رہا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی اس وادی سے گزرے ہیں مگر یہاں کوئی پانی نہ تھا۔" پھر انہوں نے اپنے ایک دو آدمی بھیجے تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں پانی موجود ہے۔ انہوں نے واپس جا کر ان لوگوں کو اس کی خبر دی۔ وہ آئے تو حضرت اسماعیلؑ کی والدہ کو وہاں پایا۔ انہوں نے کہا کیا تم ہمیں اجازت دیتی ہو کہ ہم تمہارے پاس اتر جائیں؟ انہوں نے کہا ہاں، مگر پانی تمہارا نہیں بلکہ میرا ہے۔ انہوں نے یہ بات مان لی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس چیز کو اسماعیلؑ کی ماں کو منتظر پایا، اور وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ کچھ انسان یہاں آباد ہوں۔" چنانچہ وہ لوگ وہاں ٹھہر گئے اور اپنے خاندان والوں کو بھی وہاں بلا لیا یہاں تک کہ کئی خاندان وہاں بس گئے۔ حضرت اسماعیلؑ انہی لوگوں میں پلے بڑھے اور انہی سے عربی زبان سیکھی۔[2] جرہمیوں کو یہ لڑکا بہت پسند آیا اور وہ یہ چاہنے لگے کہ انہی کے ہاں اس لڑکے کی شادی ہو۔

بیٹے کی قربانی کا واقعہ

حضرت ابراہیمؑ اپنے پیارے بیٹے اور بیوی کو اس وادی میں چھوڑ کر ان سے بے پروا نہیں ہو گئے تھے بلکہ وقتاً فوقتاً خبر گیری کے لیے آتے اور کچھ مدت تک قیام فرماتے رہتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ اپنی بیوی اور شیرخوار بچے کو چھوڑتے وقت دعا مانگی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا "اے میرے رب، اس کو پرامن شہر بنا دے" ٹھیک اسی دعا کے مطابق وہی سنسان مقام اب ایک بستی بن چکا تھا اور یہ بات قرین قیاس ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس دوران میں اس جگہ بسنے والے جرہمیوں کے اندر اسلام کی تبلیغ بھی ضرور کی ہو گی۔ اس کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جو تاریخ انسانی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا، یعنی حضرت ابراہیمؑ اپنے بڑھاپے کی اولاد، اپنے پہلوٹھے اور لاڈلے بیٹے کو، ایسی حالت میں جبکہ وہ جوانی کی عمر کے قریب پہنچ رہا تھا، اپنے رب کا اشارہ پاتے ہی قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

---

[1] یہ یمن کے قدیم قحطانی عربوں کا ایک قبیلہ تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] عربی حضرت ابراہیمؑ کی زبان نہ تھی کیونکہ وہ عراق کے رہنے والے تھے اور پھر کنعان میں آباد ہو گئے تھے۔ حضرت ہاجرہ کی زبان بھی عربی نہ تھی کیونکہ وہ مصری تھیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۔ قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ فَلَمَّاۤ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۔ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۔ (الصّٰفّٰت - ۱۰۲ تا ۱۰۷)

"پھر جب وہ لڑکا اُس کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو (ایک روز) ابراہیمؑ نے کہا "بیٹا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب تُو بتا، تیرا کیا خیال ہے؟" اُس نے کہا "ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اُسے کر ڈالیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے صابر لوگوں میں پائیں گے۔" آخر کو جب ان دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ "اے ابراہیمؑ، تُو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی۔" اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اُس بچے کو چھڑا لیا۔"

یہ واقعہ مکہ[1] میں پیش آیا تھا اور حضرت ابراہیمؑ جس مقام پر بیٹے کو قربانی کے لیے لے گئے تھے وہ منیٰ کا مقام تھا جہاں آج تک اُسی تاریخ (۱۰ ذی الحجہ) کو قربانیاں کی جا رہی ہیں[2]۔ نیز یہ واقعہ اُس وقت پیش آیا تھا جب حضرت اسماعیلؑ کی عمر ۱۲-۱۳ سال سے زیادہ نہ تھی اور حضرت اسحٰقؑ ابھی پیدا نہ ہوئے تھے، کیونکہ اسی سورۂ صافات میں اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ "اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحٰقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے" (آیت ۱۱۲)۔

مذکورۂ بالا آیات میں چند امور تشریح طلب ہیں جن کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں:

(۱) حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں یہ نہیں دیکھا تھا کہ انہوں نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے بلکہ یہ دیکھا تھا کہ وہ

---

[1] قرآن مجید میں اس مقام کا نام بکّہ بھی آیا ہے (آل عمران: ۹۶)۔ لیکن ابن ہشام (جلد اول، صفحہ ۱۲۹) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کا قدیم نام نہیں ہے بلکہ بعد میں جب اسے قوم کی حیثیت حاصل ہو گئی تب اسے اس نام سے بھی پکارا جانے لگا۔ ابن ہشام کا قول ہے کہ مکہ کو بکہ اس لیے کہا گیا کہ اِنَّهَا تَبُكُّ اَعْنَاقَ الْجَبَابِرَةِ (وہ جباروں کی گردن توڑ دیتا ہے)۔ اس کے بعد وہ اس کی مزید تشریح یہ کرتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانہ میں مکہ کسی ظلم اور زیادتی کو برقرار نہیں رہنے دیتا تھا، اور جس نے بھی اس میں زیادتی کی اُسے اس شہر نے نکال پھینکا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضروری تھا کیونکہ مکہ میں اُس وقت آبادی ہو چکی تھی اور حضرت اسماعیلؑ کی والدہ ماجدہ بھی وہاں موجود تھیں۔ اسی وجہ سے آپ مکہ سے باہر منیٰ کی سنسان پہاڑیوں میں بیٹے کو لے گئے۔ (حاشیہ از مترجم)

اسے ذبح کر رہے ہیں لیکن اُس وقت اُنہوں نے خواب کا مطلب یہی سمجھا کہ اللہ تعالیٰ اُن کے صدقِ ایمانی کا امتحان لینے کے لیے بیٹے کی قربانی طلب فرما رہا ہے، اس لیے وہ ٹھنڈے دل سے اپنے لختِ جگر کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

(۲) صاحبزادے سے پوچھنے کا مقصد یہ نہ تھا کہ تو راضی ہو تو اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کروں ورنہ نہ کروں۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جس صالح اولاد کے عطا کیے جانے کی دُعا مانگی تھی وہ فی الواقع کس قدر صالح ہے؟ اگر وہ خود بھی اللہ کی خوشنودی پر جان دینے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دُعا مکمل طور پر قبول ہُوئی ہے اور بیٹا محض جسمانی حیثیت ہی سے ان کی اولاد نہیں ہے بلکہ اخلاقی و رُوحانی حیثیت سے بھی واقعی اُن کا سپوت ہے۔

(۳) حضرت اسماعیلؑ کا یہ کہنا کہ "جس چیز کا آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اُسے کر ڈالیے" یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اپنے پیغمبر باپ کے خواب کو اللہ کا حکم اور بمنزلہ وحی سمجھتے تھے۔ اگر ان کا یہ خیال صحیح نہ ہوتا تو حضرت ابراہیمؑ فرماتے کہ یہ محض خواب ہے حکم نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ بھی اِن آیات میں ان کے اس خیال کی تردید فرما دیتا۔ یہ بات منجملہ اُن دلائل کے ہے جن کی بنا پر اسلام میں نبی کے خواب کو بھی اقسامِ وحی مانا جاتا ہے۔

(۴) حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے چت نہیں لٹایا بلکہ پیشانی کے بل لٹایا تاکہ بچے کا منہ دیکھ کر پدرانہ شفقت ہاتھ میں لرزش نہ پیدا کر دے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ نیچے سے ہاتھ ڈال کر گلے پر چھری چلائیں۔

(۵) قبل اس کے کہ حضرت ابراہیمؑ بیٹے کو ذبح کرتے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "اے ابراہیمؑ تُو نے خواب سچ کر دکھایا" اس بنا پر بالکل بجا اور درست تھا کہ خواب میں یہ نہیں دکھایا گیا تھا کہ آپؑ نے بیٹے کو ذبح کر دیا ہے، بلکہ یہ دکھایا گیا تھا کہ آپ ایسا کر رہے ہیں۔ اس لیے جب آپ نے وہ بات پُوری کر دی جو خواب میں دکھائی گئی تھی تو ارشاد ہُوا کہ تم نے خواب سچ کر دکھایا اور اُس عظیم آزمائش میں پُورے اُتر گئے جس میں ہم نے تم کو ڈالا تھا۔ ہم اپنے نیک بندوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں جیسی تم کو دی ہے کہ تمہارے ہاتھ سے بیٹے کو قتل کرائے بغیر یہ ظاہر ہو کر رہے کہ تم سے کرا دیا کہ تم ہماری محبت میں اپنی اولاد تک کو قربان کر سکتے ہو۔

(۶) بڑی قربانی سے مراد وہ مینڈھا بھی ہے جو حضرت اسماعیلؑ کے فدیے میں ذبح کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے فرشتے نے ان کو لا کر دیا، اور وہ قربانی بھی ہے جو اُس وقت سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد تک حج کے زمانے میں کی جاتی رہی، اور پھر حضورؐ کے عہد سے آج تک حج اور عید الاضحیٰ کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمان

کر رہے ہیں

(۴) قربانی حضرت اسحٰق کی دی گئی تھی یا حضرت اسماعیل کی؟

جیسا کہ اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں بنی اسرائیل کی یہ عادت رہی ہے کہ ہر قابلِ فخر بات کو وہ اپنی نسل کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور دوسری نسلوں کے لیے ان کے ہاں یا تو جھوٹے الزامات ہیں، یا پھر کم از کم یہ کہ جو فخر ان کو حاصل ہوا ہو اُسے بھی چھین کر اپنے حساب میں لکھ لیں۔ اسی عادت کے مطابق بیٹے کی قربانی کے اس واقعہ کو بھی انہوں نے حضرت اسماعیلؑ کے بجائے حضرت اسحٰقؑ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بائبل کا بیان ہے:

"خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا اَے ابرہام . . . . تو اپنے بیٹے اضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے، ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا، سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔" (پیدائش باب ۲۲۔ فقرات ۱-۲)۔

اِس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کی قربانی مانگی تھی، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اِکلوتے تھے۔ حالانکہ خود بائبل ہی کے دوسرے بیانات سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحٰق اِکلوتے نہ تھے۔ اِس کے لیے ذرا بائبل ہی کی حسبِ ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں۔

"اور ابرام کی بیوی ساری کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور ساری نے ابرام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے۔ سو تو میری لونڈی کے پاس جا۔ شاید اُس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرام نے ساری کی بات مانی۔ اور ابرام کو ملک کنعان میں رہتے ہوئے دس برس ہو گئے تھے جب اُس کی بیوی ساری نے اپنی مصری لونڈی اُسے دی کہ اس کی بیوی بنے۔ اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی۔" (پیدائش ۱۶: ۱-۳)

"خدا کے فرشتے نے اُس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام اسماعیل رکھنا" (پیدائش۔ ۱۶: ۱۱)

"جب ابرام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔" (پیدائش ۱۶: ۱۶)

"اور خداوند نے ابراہام سے کہا کہ ساری جو تیری بیوی ہے . . . . اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا . . . . تو اس کا نام اضحاق رکھنا . . . . جو اگلے سال اسی وقتِ معین پر سارہ سے پیدا ہوگا . . . . تب ابراہام نے اپنے بیٹے اسماعیل اور گھر کے سب مردوں کو لیا۔ اور اُسی روز خدا کے حکم کے مطابق اُن کا ختنہ کیا۔ ابراہام ننانوے برس کا تھا جب اُس کا ختنہ ہوا۔ اور جب اسماعیلؑ کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا۔" (پیدائش ۱۷: ۱۵-۲۵)۔

"اور جب اُس کا بیٹا اضحاق اُس سے پیدا ہُوا تو ابرام سو برس کا تھا۔" (پیدائش ۲۱ : ۵)

اس سے بائیبل کی تضاد بیانی صاف کُھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۴ برس تک تنہا حضرت اسماعیلؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ حضرت اسحٰقؑ کی نہیں بلکہ حضرت اسماعیلؑ کی تھی۔ کیونکہ وہی اکلوتے تھے۔ اور اگر حضرت اسحٰقؑ کی قربانی مانگی گئی تھی تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

اس کے بعد ہم اسلامی روایات کو دیکھتے ہیں تو ان میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔

مفسّرین نے صحابہؓ و تابعین کی جو روایات نقل کی ہیں ان میں ایک گروہ کا قول یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحٰقؑ تھے، اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام ملتے ہیں:

حضرت عمرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس۔ حضرت ابوہریرہؓ۔ قتادہؒ۔ عکرمہؒ۔ حسن بصریؒ۔ سعید بن جبیرؒ۔ مجاہدؒ۔ شعبیؒ۔ مسروقؒ۔ مکحولؒ۔ زہریؒ۔ عطاءؒ۔ مقاتلؒ۔ سُدّیؒ۔ کعب احبارؒ۔ زیدؒ بن اسلم وغیرہم۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے، اور اس گروہ میں حسبِ ذیل بزرگوں کے نام نظر آتے ہیں:

حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ۔ حضرت ابوہریرہؓ۔ حضرت معاویہؓ۔ عکرمہؒ۔ مجاہدؒ۔ یوسف بن مہرانؒ۔ حسن بصریؒ۔ محمد بن کعب القرظیؒ۔ شعبیؒ۔ سعید بن المسیّبؒ۔ ضحاکؒ۔ محمد بن علی بن حسینؒ (امام محمد الباقرؒ)۔ ربیعؒ بن انس۔ احمدؒ بن حنبل وغیرہم۔

ان دونوں فہرستوں کا تقابل کیا جائے تو متعدد نام ان میں مشترک نظر آئیں گے۔ یعنی ایک ہی بزرگ سے دو مختلف قول منقول ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے عکرمہ یہ قول نقل کرتے ہیں کہ وہ صاحبزادے حضرت اسحٰقؑ تھے۔ مگر اُنہی سے عطاء بن ابی رباح یہ بات نقل کرتے ہیں کہ "یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اسحٰقؑ تھے۔ مگر یہودی جھوٹ کہتے ہیں۔" اسی طرح حضرت حسن بصری سے ایک روایت یہ ہے کہ وہ حضرت اسحٰقؑ کے ذبیح ہونے کے قائل تھے۔ مگر عمرو بن عُبید کہتے ہیں کہ حسن بصری کو اس امر میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے جس بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا وہ اسماعیل علیہ السلام تھے۔

اس اختلافِ روایات کا نتیجہ یہ ہُوا کہ علمائے اسلام میں سے بعض پُورے جزم و وثوق کے ساتھ حضرت اسحٰقؑ کے حق میں رائے دیتے ہیں۔ مثلاً ابن جریرؒ اور قاضی عیاضؒ۔ اور بعض قطعی طور پر حکم لگاتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسمٰعیلؑ ہی تھے۔ مثلاً ابن کثیرؒ۔ اور بعض مذبذب ہیں، مثلاً جلال الدین سیوطیؒ۔ لیکن اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک و شبہ سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

(۱) سورۂ صافات میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ نے ایک صالح بیٹے کی دعا کی تھی، اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اُن کو ایک حلیم (بُردبار) لڑکے کی بشارت دی تھی۔ فحوائے کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ دعا اُس وقت کی گئی تھی جب آپ بے اولاد تھے اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی تھی وہ آپ کا پہلوٹھا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی اسی سورہ کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے پھرنے کے قابل ہوا تو اُسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹھے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ تھے نہ کہ حضرت اسحٰقؑ۔ خود قرآن مجید میں صاحبزادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ (ابراہیم۔ ۳۹)

"شکر ہے اُس خدا کا جس نے بڑھاپے میں مجھ کو اسماعیل اور اسحٰق عطا کیے۔"

(۲) قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحٰق کی بشارت دی گئی ہے وہاں اُن کے لیے غلامِ علیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ ہیں (الذاریات آیت ۔ ۲۸) اور لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ (الحجر ۔ ۵۳)۔ مگر سورۂ صافات میں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے اُس کے لیے غلامِ حلیم (بُردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحبزادوں کی نمایاں صفات الگ الگ تھیں اور ذبح کا حکم غلامِ علیم کے لیے نہیں بلکہ غلامِ حلیم کے لیے تھا کیونکہ بیٹے کی قربانی کا واقعہ اسی بچے کے پیدا ہونے اور جوانی کے قریب پہنچنے کے بعد ہوا ہے اور دوسرے بچے کی پیدائش کی بشارت اس کے بعد دی گئی ہے۔

(۳) قرآن مجید میں حضرت اسحٰق کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوشخبری بھی دے دی گئی تھی کہ اُن کے ہاں یعقوبؑ جیسا بیٹا پیدا ہوگا۔ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (ہود۔ ۷۱)۔ اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو کہ اُس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا اُس کے متعلق اگر حضرت ابراہیمؑ کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اُسے ذبح کر رہے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے، کیونکہ اسے قربان کر دینے کے بعد اُس کے ہاں بیٹے (یعنی حضرت یعقوبؑ) کے پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ علامہ ابن جریر اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے یہ خواب حضرت ابراہیمؑ کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحٰقؑ کے ہاں حضرت یعقوبؑ پیدا ہو چکے ہوں۔ لیکن درحقیقت یہ اس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں کہ "جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑتے پھرنے کے قابل ہو گیا" تب یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اُس کے

سامنے آٹھ دس یا حد سے حد ۱۲-۱۳ برس کے بچے کی تصویر آتی ہے۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان اور صاحب اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں گے۔

(۴) اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ "ہم نے اُسے اسحٰق کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے" اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا، بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی، پھر جب وہ باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہُوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہُوا، پھر جب حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تب ان کو ایک اور بیٹے اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ یہ ترتیب واقعات قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحبزادے کو ذبح کرنے کا حکم ہُوا تھا وہ حضرت اسحٰقؑ نہ تھے بلکہ وہ اُن سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابن جریر اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ پہلے حضرت اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ اُن کے نبی ہونے کی خوشخبری دی گئی۔ لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کمزور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس سلسلۂ کلام میں یُوں نہ فرماتا "کہ ہم نے اُسے اسحٰقؑ کی بشارت دی، ایک نبی صالحین میں سے" بلکہ یُوں فرماتا کہ "ہم نے اس کو یہ بشارت دی کہ تمہارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے"۔

(۵) معتبر روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے فدیہ میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا اُس کے سینگ خانۂ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجاج بن یوسف نے حرم میں ابن زبیرؓ کا محاصرہ کیا اور خانۂ کعبہ کو مسمار کر دیا تو وہ سینگ بھی ضائع ہو گئے۔ ابن عباسؓ اور عامر شعبیؒ دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انہوں نے خود خانۂ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں (ابن کثیر)۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں بلکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا، اور حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اسی لیے تو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے تعمیر کردہ خانۂ کعبہ میں اُس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

(۶) یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منیٰ میں پیش آیا تھا۔ اور یہ صرف روایت ہی نہیں تھی بلکہ اُس وقت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک مناسکِ حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آرہا تھا کہ اُسی مقام منیٰ میں جا کر لوگ اُسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیمؑ نے قربانی کی تھی جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو آپ نے بھی اُس طریقے کو جاری رکھا، حتیٰ کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار سال کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیلؑ ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحٰق۔ حضرت اسحٰقؑ کی نسل میں

ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اُسے حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

یہ ایسے دلائل ہیں جن کو دیکھنے کے بعد یہ بات قابلِ تعجب نظر آتی ہے کہ خود اُمّتِ مُسلمہ میں حضرت اسحٰقؑ کے ذبیح ہونے کا خیال آخر پھیل کیسے گیا؟ یہودیوں نے اگر حضرت اسماعیلؑ کو اس شرف سے محروم کر کے اپنے دادا حضرت اسحٰقؑ کی طرف اِسے منسوب کرنے کی کوشش کی تو یہ ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن آخر مسلمانوں کے ایک گروہ کثیر نے اُن کی اِس دھاندلی کو کیسے قبول کر لیا؟ اِس سوال کا بہت شافی جواب علّامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے، مگر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ سارے اقوال (جو حضرت اسحٰقؑ کے ذبیح ہونے کے حق میں ہیں) کعب احبار سے منقول ہیں۔ یہ صاحب جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان ہوئے تو کبھی کبھی یہ یہود و نصاریٰ کی قدیم کتابوں کے مندرجات اُن کو سنایا کرتے تھے اور حضرت عمرؓ اُنہیں سُن لیا کرتے تھے۔ اس بنا پر دوسرے لوگ بھی ان کی باتیں سننے لگے اور سب رطب و یابس جو وہ بیان کیا کرتے تھے انہیں روایت کرنے لگے۔ حالانکہ اِس اُمّت کو اُن کے اِس ذخیرۂ معلومات میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت نہ تھی۔"

اِس سوال پر مزید روشنی محمد بن کعب قُرظی کی ایک روایت سے پڑتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاں یہ سوال چھڑا کہ ذبیح حضرت اسحٰقؑ تھے یا حضرت اسماعیلؑ؟ اُس وقت ایک صاحب بھی مجلس میں موجود تھے جو پہلے یہودی علماء میں سے تھے اور بعد میں سچے دل سے مسلمان ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے کہا "امیر المومنین! خدا کی قسم وہ اسماعیلؑ ہی تھے، اور یہودی اس بات کو جانتے ہیں، مگر وہ عربوں سے حسد کی بنا پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسحٰقؑ تھے۔" (ابن جریر)

ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا جاتے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل یہ یہودی پروپیگنڈا تھا جو مسلمانوں میں پھیل گیا۔ اور مسلمان چونکہ علمی معاملات میں ہمیشہ غیر متعصب رہے ہیں، اِس لیے اُن میں سے بہت سے لوگوں نے یہودیوں کے اِن بیانات کو، جو وہ قدیم صحیفوں کے حوالے سے تاریخی روایات کے بھیس میں پیش کرتے تھے، محض ایک علمی حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا اور یہ محسوس نہ کیا کہ اس میں علم کے بجائے تعصّب کار فرما ہے۔ (۲)

بنائے کعبہ

پہلے یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ زمزم کی برکت سے قبیلۂ جُرہُم کے مختلف خاندان آ کر حضرت ہاجرہؑ و اسماعیلؑ کے پاس بس گئے تھے اور مکہ ایک شہر بنتا جا رہا تھا۔ یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کی ملنساری کی وجہ سے اِن

آ آباد کاروں کے ساتھ دونوں ماں بیٹوں کے تعلقات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ حضرت اسماعیلؑ انہی کے درمیان پلے بڑھے تھے اور جب وہ جوان ہوئے تو اُن کے بہترین اخلاق اور عمدہ اوصاف کی وجہ سے جرہمیوں کی خود یہ خواہش تھی کہ اُن کی شادی انہی کے ہاں ہو۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ پہلے ایک لڑکی سے اُن کی شادی ہوئی، مگر حضرت ابراہیمؑ کو وہ بہو پسند نہ آئی اس لیے حضرت اسماعیلؑ نے اسے چھوڑ کر دوسری لڑکی سے شادی کی جسے حضرت ابراہیمؑ نے پسند فرمایا اور اسی سے ان کے ہاں بارہ لڑکے پیدا ہوئے۔ حضرت ہاجرہ کا انتقال بخاری کی اِس روایت کے مطابق اپنے بیٹے کی پہلی شادی کے بعد ہی ہو چکا تھا۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ اُس اصل کام کے لیے مکہ تشریف لائے جس کی خاطر انہوں نے تحقیق برس پہلے اپنی ذریّت کے اس حصے کو اس بے آب وگیاہ وادی میں لاکر بسایا تھا۔ بخاری میں ابن عباسؓ کی جس روایت کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے اس میں آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ ایک روز زمزم کے پاس درخت کے نیچے حضرت اسماعیل بیٹھے اپنے تیر بنا رہے تھے کہ یکایک حضرت ابراہیمؑ وہاں پہنچے۔ حضرت اسماعیلؑ انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور دونوں باپ بیٹے اسی طرح ملے جس طرح بیٹے اپنے باپوں سے اور باپ اپنے بیٹوں سے ملا کرتے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اسماعیل! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کے رب نے جس کام کا حکم دیا ہے آپ اسے ضرور کریں۔ حضرت ابراہیمؑ نے پوچھا تم اس میں میری مدد کرو گے؟ انہوں نے کہا جی ہاں، میں آپ کی مدد کروں گا۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے وادی کے اُس حصہ کی طرف اشارہ کیا جو اپنے گرد و پیش کی زمین سے کچھ اٹھا ہوا تھا اور فرمایا کہ اللہ نے مجھے یہاں ایک گھر بنانے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ دونوں باپ بیٹوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھائیں۔ حضرت اسماعیلؑ پتھر لاتے اور حضرت ابراہیمؑ ان کو نصب کرتے جاتے تھے۔ جب دیواریں کافی بلند ہو گئیں تو حضرت ابراہیمؑ وہ پتھر اٹھا لائے جو مقامِ ابراہیم کے نام سے مشہور ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر پتھر نصب کرنے شروع کر دیے اور دیواروں کو مزید بلند کر دیا۔ (۵)

عرب اور پوری دنیا میں کعبہ کی حیثیت

یہ عمارت محض ایک عبادت گاہ ہی نہ تھی، جیسے مسجدیں ہوا کرتی ہیں، بلکہ اوّل روز ہی سے اس کو دینِ اسلام کی عالمگیر تحریک کا مرکز، تبلیغ و اشاعت قرار دیا گیا تھا اور اس کی غرض یہ تھی کہ ایک خدا کو ماننے والے ہر جگہ سے کھنچ کھنچ کر یہاں جمع ہوا کریں، مل کر خدا کی عبادت کریں، اور اسلام کا پیغام لے کر پھر اپنے اپنے ملکوں کو واپس جائیں۔ یہی اجتماع تھا جس کا نام "حج" رکھا گیا۔ اِس کی پوری تفصیل کہ یہ مرکز کس طرح تعمیر ہوا، کن جذبات اور کن دعاؤں کے ساتھ دونوں باپ بیٹوں نے اس عمارت کی دیواریں اٹھائیں، اور کیسے حج کی ابتدا ہوئی، قرآن مجید میں یوں بیان کی گئی ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِينَ ـ فِيهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ إِبْرٰهِيمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ط (آل عمران: ۹۶-۹۷)

"یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی تھا جو مکہ[1] میں تعمیر ہوا۔ برکت والا گھر اور سارے جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت۔ اس میں (اللہ کی) کھلی کھلی نشانیاں ہیں۔ مقامِ ابراہیمؑ ہے۔ اور جو کوئی اس میں داخل ہو جاتا ہے، اس کو امن مل جاتا ہے۔"

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ط (العنکبوت۔ ۶۷)

"کیا لوگوں نے دیکھا نہیں کہ ہم نے کیسا پُرامن حرم بنایا ہے۔ حالانکہ اس کے گردوپیش لوگ اُچک لیے جاتے ہیں۔"

یعنی جب کہ عرب میں دو ہزار برس تک ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارتگری اور جنگ و جدل کا بازار گرم رہا، اس حرم میں ہمیشہ امن ہی رہا، حتّٰی کہ وحشی بدو تک اس کے حدود میں اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ پاتے تو اُس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتے۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ط وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرٰهِيمَ مُصَلًّى ط وَعَهِدْنَا إِلٰى إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ـ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ أَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۔۔۔۔۔ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ط رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ـ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ج إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ـ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ـ (البقرہ: ۱۲۵-۱۲۹)

"اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرکز و مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیمؑ کے مقامِ عبادت کو جائے نماز بنالو۔ اور ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو ہدایت کی کہ میرے گھر کو طواف کرنے

---

[1] واضح رہے کہ بیت المقدس خانۂ کعبہ کے ایک ہزار برس بعد حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں تعمیر ہوا تھا، اس لیے کعبہ ہی وہ مرکزِ توحید ہے جو دنیا میں سب سے پہلے تعمیر کیا گیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو، اور جب ابراہیمؑ نے دعا کی کہ پروردگار، اس جگہ کو ایک پُر امن شہر بنا دے اور یہاں کے باشندوں کو پھلوں کا رزق بہم پہنچا، جو بھی اُن میں سے اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے والا ہو .... اور جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (تو دعا کرتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار، ہماری اس کوشش کو قبول فرما، تو سب کچھ سننا اور جانتا ہے۔ پروردگار اور تو ہم دونوں کو اپنا مسلم (اطاعت گزار) بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو، اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہم پر عنایت کی نظر رکھ کہ تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔ پروردگار، اور تو ان لوگوں میں انہی کی قوم سے ایک ایسا رسول بھیجیو جو انہیں تیری آیات سنائے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق درست کرے، یقیناً تو بڑی قوت والا اور بڑا حکیم ہے۔"

وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَٰذَا ٱلْبَلَدَ ءَامِنًا وَٱجْنُبْنِى وَبَنِىَّ أَن نَّعْبُدَ ٱلْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ ٱلنَّاسِ ۖ فَمَن تَبِعَنِى فَإِنَّهُۥ مِنِّى ۖ وَمَنْ عَصَانِى فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔ رَّبَّنَآ إِنِّىٓ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِى بِوَادٍ غَيْرِ ذِى زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ ٱلْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجْعَلْ أَفْـِٔدَةً مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهْوِىٓ إِلَيْهِمْ وَٱرْزُقْهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۔ (ابراہیم: ۳۵-۳۷)

"اور جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی کہ پروردگار، اس شہر کو پُر امن شہر بنا دے اور مجھ کو اور میرے بچوں کو بت پرستی سے بچا۔ پروردگار، ان بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہ کیا ہے، سو جو کوئی میرے طریقے کی پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میرے طریقے سے پھر جائے تو یقیناً تو غفور اور رحیم ہے۔ پروردگار، میں نے اپنی نسل کے ایک حصّہ کو تیرے اس عزت والے گھر کے پاس اس بے آب و گیاہ وادی میں لا بسایا ہے تاکہ اے پروردگار یہ نماز قائم کریں۔ پس تو لوگوں کے دلوں میں ایسا شوق ڈال کہ وہ ان کی طرف کھنچ کھنچ کر آئیں اور ان کو پھلوں سے رزق پہنچا۔ اُمید ہے کہ یہ شکر گزار بنیں گے۔"

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَٰهِيمَ مَكَانَ ٱلْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِى شَيْـًٔا وَطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْقَآئِمِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ۔ وَأَذِّن فِى ٱلنَّاسِ بِٱلْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوا۟ مَنَٰفِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْلُومَٰتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلْأَنْعَٰمِ ۖ فَكُلُوا۟ مِنْهَا وَأَطْعِمُوا۟ ٱلْبَآئِسَ ٱلْفَقِيرَ ۔ (الحج: ۲۶-۲۸)

"اور جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اِس گھر کی جگہ مقرر کی اِس ہدایت کے ساتھ کہ کسی کو میرے ساتھ شریک نہ کرنا۔ اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا اور (حکم دیا کہ) لوگوں میں حج کی عام منادی کر دو کہ تمہارے پاس آئیں، خواہ پیدل آئیں یا ہر دُور دراز مقام سے دُبلی اونٹنیوں پر آئیں تاکہ یہاں آکر دیکھیں کہ اُن کے لیے کیسے کیسے (دینی و دُنیوی) منافع ہیں اور اِن چند مقرر دنوں میں اُن جانوروں پر جو اللہ نے اُن کو دیے ہوں، اللہ کا نام لیں (یعنی قربانی کریں)، اور اس میں سے خود بھی کھائیں اور تنگ دست و محتاج لوگوں کو بھی کھلائیں" (۵)

عہدِ جاہلیت میں کعبہ کی برکات

عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ ہی کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہُوا تھا۔ حج اور عمرے کے لیے سارا ملک اُس کی طرف کھنچ کر آتا تھا اور اِس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہو جاتا تھا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے، شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی نصیب ہوتی، اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام[1] مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا پورا ایک تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا تھا۔ بس یہی زمانہ ایسا تھا جس میں اُن کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت آتے جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے قلادوں کی موجودگی سے قافلوں کی نقل و حرکت میں بڑی مدد ملتی تھی، کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردن میں پٹے پڑے ہوتے انہیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں، اور کسی غارت گر قبیلے کو اُن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔ (۶)

حضرت اسماعیلؑ کی رسالت اور عرب میں اُس کے اثرات

اغلب یہ ہے کہ جس وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا اور اس گھر کو مرکز و مرجع قرار دے کر ہر سال اس کی طرف حج کرنے کا اذنِ عام لوگوں کو دیا، وہی وقت تھا جب حضرت اسماعیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے

---

[1] حرام مہینوں سے مُراد ہیں رجب عُمرے کے لیے، اور ذی القعدہ، ذی الحجہ اور مُحرّم حج کے لیے۔ ان مہینوں میں لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں، اور حج و عمرہ کے لیے جانے والوں کو راستے میں کوئی نہ چھیڑ سکتا تھا۔

(حاشیہ از مؤلف)

رسالت کے منصب پر سرفراز فرمایا تاکہ وہ عرب میں دینِ اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیں۔ قرآن مجید میں ان کے متعلق فرمایا گیا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِسْمٰعِيْلَ إِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۔ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا۔ (مریم: ۵۴-۵۵)

"اور اس کتاب میں اسماعیلؑ کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا اور رسول نبی[1] تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔"

اگرچہ تاریخ میں حضرت اسماعیلؑ کی زندگی کے حالات اور ان کی رسالت کے کام کی کچھ تفصیلات نہیں ملتیں، لیکن ان کی رسالت کے کامیاب ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ خانہ کعبہ کو تمام عرب میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ حج اور عمرے کے لیے عرب کے تمام اطراف و نواحی سے لوگ کھنچ کھنچ کر آتے رہے۔ مناسکِ حج تقریباً وہی رہے جو ابتدا میں مقرر کیے گئے تھے۔ صفا اور مروہ کی سعی اور ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ میں قربانی کا طریقہ بھی عربوں میں رائج رہا جو بلاشبہ حضرت ہاجرہ کی سعی اور حضرت ابراہیمؑ کی قربانی ہی کی یادگار تھا۔ حج اور عمرے کی خاطر چار مہینوں کی حرمت بھی تمام اہلِ عرب میں مسلّم رہی۔ اور دینِ ابراہیمی کے دوسرے بہت سے شعائر بھی عربوں میں مروج رہے، مثلاً ختنہ، غسلِ جنابت، جانوروں کو ذبح کرنے اور اونٹوں کو نحر کرنے کا طریقہ، مُردوں کو دفن کرنا، نکاح اور طلاق اور عدت وغیرہ کے سوگ، سگے ماموں، بیٹیوں، ماؤں اور بہنوں کو حرام سمجھنا، قصاص اور دیت اور قسامت کے احکام وغیرہ۔ اس کے علاوہ بعض حکمائے عرب وضو بھی کرتے تھے، بعض نماز بھی پڑھتے تھے جیسے قس بن ساعدۃ الایادی۔ حضرت ابوذرؓ بھی اسلام قبول کرنے سے تین سال پہلے ہی نماز پڑھنے لگے تھے، اگرچہ معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کی نماز تھی۔ اس کے علاوہ عربوں میں روزہ کا بھی ایک طریقہ رائج تھا۔ وہ اعتکاف بھی کرتے تھے، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جاہلیت میں ایک رات کے اعتکاف کی نذر مانی تھی۔ بہت سی چیزوں کو اہلِ عرب نیکی کا کام سمجھتے اور ان کی مدح کرتے تھے، مثلاً مہمان اور مسافر کی ضیافت، مساکین کی مدد کرنا اور صلہ رحمی کرنا۔ اگر حضرت اسماعیلؑ کی رسالت کو عرب میں غیر معمولی کامیابی حاصل نہ ہوئی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ ڈھائی ہزار برس جاہلیت کی تاریکی میں ڈوبے رہنے کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک اُن کے پھیلائے ہوئے دین کے آثار باقی اور تمام عرب میں جاری و ساری رہتے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کی اور اُن سے متاثر ہونے والوں کی تبلیغ ہی کا یہ اثر تھا کہ اہلِ عرب میں حضورؐ کی بعثت کے زمانے تک اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ تصورات پائے جاتے تھے جن کا

---

[1] یعنی ایسا نبی تھا جسے رسالت کا منصب عطا کیا گیا تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ کیا گیا ہے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ زخرف، آیت ۲۸، سورۂ عنکبوت، آیات ۱۶ تا ۲۷، سورۂ مومنون، آیات ۲۳ تا ۴۲ - سورۂ یونس، آیات ۷۱ تا ۹۲ - سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۷۷)۔

اور یہ بھی رسالتِ اسماعیلی کا اثر ہی تھا کہ بعثتِ محمدی کے وقت تک عرب میں ایسے لوگوں کا ایک گروہ موجود رہا جنہیں تاریخ میں حنفاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب کے مختلف قبائل میں جگہ جگہ پائے جاتے تھے۔ شرک سے انکار اور توحید کا اقرار کرتے تھے اور دینِ ابراہیمی کی پیروی کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے تفہیم القرآن، جلد چہارم میں صفحہ ۱۰۴ پر ایسے لوگوں کی فہرست درج کی ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے بعض کے حالات لکھتے ہیں:

النابغۃ الجعدی: یہ بنی عامر بن صعصعہ میں سے تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں دینِ ابراہیمی اور حنیفیت کا ذکر کیا کرتے تھے۔ روزے رکھتے اور استغفار کرتے تھے۔ ان کے زمانۂ جاہلیت کے کلام میں توحید اور حیات بعد موت اور جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں انہوں نے اسلام قبول کیا (الاستیعاب ج ۱، ص ۳۱۰)۔

صرمہ بن انس: یہ بنی عدی بن نجار میں سے تھے۔ جاہلیت کے زمانے میں درویشی اختیار کر لی تھی، بت پرستی چھوڑ دی تھی، غسلِ جنابت کرتے اور حائضہ سے پرہیز کرتے تھے۔ شراب اور ہر نشہ آور چیز کو ناپسند کرتے تھے۔ پہلے عیسائی ہونے کا ارادہ کیا، پھر رک گئے اور ایک مسجد سی بنا لی جس میں کسی جنبی یا حائضہ کو نہیں آنے دیتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں ربِّ ابراہیم کی عبادت کرتا ہوں اور دینِ ابراہیمی کا پیرو ہوں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

الحمد لله ربي لا شريك له

من لم يقلها فنفسه ظلما

"تعریف میرے رب اللہ کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ جو شخص اس کا قائل نہیں ہے وہ اپنے نفس پر آپ ظلم کرتا ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہ بہت بڈھے ہو چکے تھے۔ انہوں نے حاضر ہو کر اسلام قبول کیا (الاستیعاب، ج ۱، ص ۲۹۰۔ الاصابہ، ج ۲، ص ۱۸۰۔ ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۵۶)۔

عمرو بن عبسہ: یہ بنی سلیم میں سے تھے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اسلام سے پہلے انہوں نے بتوں کی پرستش چھوڑ دی تھی۔ امام احمد نے ان کا اپنا قول نقل کیا ہے کہ میں جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کو گمراہی پر سمجھتا تھا اور بتوں کے متعلق میرا خیال تھا کہ یہ کچھ نہیں ہیں۔ ان کا ایک اور قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ میرے دل میں یہ بات ڈال دی گئی تھی کہ بتوں کی پرستش باطل ہے۔ ایک شخص نے میری یہ باتیں سنیں تو کہا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو ایسی ہی

یانیں کہتا ہے۔ چنانچہ میں مکہ آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل کر آپ کی تعلیمات دریافت کیں اور آپ کی رسالت پر ایمان لے آیا (الاستیعاب، ج ۱، ص ۱۳۱-۳۴)۔

سب سے زیادہ سبق آموز قصہ زید بن عمرو بن نفیل کا ہے جو حضرت عمرؓ کے چچازاد بھائی اور حضرت سعیدؓ بن زید (حضرت عمرؓ کے بہنوئی اور صحابی از عشرۂ مبشرہ) کے والد تھے۔ یہ توحید کے عقیدے میں بہت سخت تھے بت پرستی اور مُردار اور خون اور بتوں پر کی چڑھائی قربانی کو حرام سمجھتے تھے بیٹیوں کے قتل کو بہت بُرا جانتے تھے اور ان کو بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہودیت اور نصرانیت کو بھی انہوں نے رد کر دیا تھا اور کہتے تھے کہ ہماری قوم کے شرک اور ان کے شرک میں آخر فرق ہی کیا ہے حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ کا بیان ہے کہ "میں نے زید بن عمرو کو دیکھا کہ وہ کعبہ کی دیوار کے سہارے بیٹھے تھے اور کہتے تھے کہ قریش کے لوگو، خدا کی قسم میں کسی ایسے جانور کا گوشت نہیں کھاؤں گا جو اللہ کے سوا کسی کے لیے ذبح کیا گیا ہو۔ خدا کی قسم دینِ ابراہیمؑ پر میرے سوا کوئی نہیں ہے۔" وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "خدایا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تیری عبادت کا کونسا طریقہ تجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو میں اُسی طرح تیری عبادت کرتا۔" پھر وہ اپنی ہتھیلی پر سر رکھ کر سجدہ کرتے۔ انہوں نے دینِ ابراہیمؑ کی تلاش میں شام کا سفر کیا مگر وہ نہ یہود میں ملا نہ نصاریٰ میں۔ اس پر انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "خدایا میں تجھے گواہ کرتا ہوں کہ میں دینِ ابراہیمؑ پر ہوں۔" آخرکار بلادِ لخم میں حضورؐ کی بعثت سے پانچ سال پہلے کسی نے انہیں قتل کر دیا۔ ان کا چچا اور ماں جایا بھائی خطاب ان کو دینِ آبائی سے پھر جانے پر سخت تنگ کرتا تھا حتیٰ کہ اس نے انہیں مکہ سے نکل جانے پر مجبور کر دیا اور قریش کے شہداروں کو ان کے پیچھے لگا دیا کہ اسے شہر میں نہ گھسنے دو۔ زمانۂ اسلام میں حضرت عمرؓ اور حضرت سعیدؓ بن زید نے حضورؐ سے عرض کیا کہ زید کے خیالات آپ کو معلوم ہیں، کیا ہم ان کے لیے دعائے مغفرت کریں؟ آپ نے فرمایا "ہاں قیامت کے روز وہ تنہا ایک اُمت کی حیثیت سے اٹھیں گے۔" (الاستیعاب، ج ۲، ص ۵۳۵۔ الاصابہ، ج ۱، ص ۵۶۹۔ ابنِ ہشام، ج ۱، ص ۲۴۰-۲۴۹)۔

تاہم عام اہلِ عرب جس شرک میں مبتلا تھے اس کی نوعیت ان کے اُس تلبیہ سے معلوم ہوتی ہے جو وہ حج کے

لہ اصل میں زید کی ماں پہلے نفیل بن عبد العزّیٰ کے نکاح میں تھی جس سے حضرت عمرؓ کا باپ خطابؓ پیدا ہوا پھر نفیل کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے عمرو نے اپنی سوتیلی ماں (یعنی خطاب کی ماں) سے نکاح کر لیا جس سے زید پیدا ہوئے اس طرح زید خطاب کے بھتیجے بھی تھے اور ماں جائے بھائی بھی۔ زمانۂ جاہلیت میں سوتیلی ماں سے نکاح کا طریقہ عام طور پر رائج تھا جسے آگے قرآن نے حرام کیا (الاغانی جلد ۳، ص ۱۲۳)۔

(حاشیہ از مؤلف)

موقع پر کرتے تھے۔ اُن کا تلبیہ یہ تھا:

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ إِلَّا شَرِيكًا هُوَ لَكَ، تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ۔

"میں حاضر ہوں میرے اللہ میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں، کوئی تیرا شریک نہیں سوائے اُس شریک کے جو تیرا ہی ہے، تو اُس کا بھی مالک ہے اور ہر اُس چیز کا بھی مالک جس کا وہ مالک ہے۔"

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے بہت سے مفروضہ خداؤں کو معبود ماننے کے باوجود ایک رب اعلیٰ کی حیثیت سے اللہ کو مانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کے تمام معبود اُس بزرگ و برتر ہستی کے بندے اور مملوک ہیں۔ اِس کو رسالت اسماعیلی کے اثرات کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انتہائی جاہلیت اور بدترین شرک میں ڈوب کر بھی اللہ کے بارے میں اُن کے اندر یہ عقیدہ موجود تھا۔

حضرت اسماعیلؑ کے بعد خانہ کعبہ کی تولیت

حضرت اسماعیلؑ جب تک زندہ رہے، خانہ کعبہ کی تولیت انہی کے ہاتھ میں رہی اور ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے نابت متولی ہوئے۔ لیکن نابت کی وفات کے بعد جرہم کے لوگ، جو مکہ میں حضرت ہاجرہ کے وقت سے بسے ہوئے تھے، اِس گھر کی تولیت پر قابض ہو گئے کیونکہ اولادِ اسماعیلؑ کی تعداد کم تھی، اور مکہ میں جرہمیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ اُن کے ساتھ عمالیق کی ایک شاخ قطورا اور بنی قیطورا بھی ایک مدت تک مکہ کی عملداری میں شریک رہی۔ شہر کے بالائی حصوں سے جو آتا اس سے جرہم عشر وصول کرتے، اور نشیبی علاقوں (اجیاد) کی طرف سے آنے والوں کو عمالیق عشر دینے پر مجبور کرتے۔ حتیٰ کہ کچھ مدت تک کعبہ کی تولیت بھی عمالیق ہی کے قبضہ میں رہی مگر بالآخر جرہم نے لڑ کر ان کو مکہ سے نکال دیا اور پھر وہی اس کے بعد صدیوں تک کعبہ اور مکہ پر قابض رہے (مروج الذہب، مسعودی، ج ۲، ص ۵۰۔ ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۱۸)۔ ان لوگوں میں رفتہ رفتہ اتنا بگاڑ پیدا ہو گیا کہ انہوں نے مکہ کی حرمت کو پامال کرنا شروع کر دیا۔ کعبہ میں جو مال ہدیۃً دیا جاتا تھا اسے ناجائز طور پر کھانے لگے۔ زیارت کے لیے آنے والوں کو ستانے لگے۔ یہاں تک کہ ان میں سے جب کسی کو زنا کے لیے کوئی جگہ نہ ملتی تو وہ خانہ کعبہ میں جا کر یہ گناہ کرتا تھا۔ اُسی زمانے کا یہ واقعہ ہے کہ ایک شخص اِساف نے ایک عورت نائلہ کے ساتھ کعبہ میں فعلِ حرام کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو مسخ کر دیا۔ کچھ مدت تک تو یہ واقعہ نشانِ عبرت بنا رہا، مگر ایک مدت بعد ان دونوں کے بت بنا کر ایک کو صفا پر اور دوسرے کو مروہ پر رکھ کر ان کی عبادت کی جانے لگی۔ یہ اُس تنزل کی انتہا تھی جس میں خانہ کعبہ کے متولی مبتلا ہو گئے تھے۔

آخرکار جب جرہمیوں کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو بنی کنانہ میں سے بنی بکر بن عبد مناۃ اور بنی خزاعہ میں سے

غُبشان نے مل کر اُن سے جنگ کی اور اُن کو مکّہ سے نکال دیا۔ چلتے ہوئے یہ لوگ کعبہ کا خزانہ زمزم میں ڈال کر اور پھر زمزم کو بند کر کے اُس کا نشان تک مٹا گئے اور اپنے اصل وطن یمن کا راستہ لیا۔ ان کے بعد کعبہ کی تولیت بنی خزاعہ کی اُس شاخ کے قبضے میں آگئی جو غُبشان کے نام سے موسُوم ہے۔ تین چار سو برس تک وہی اس مقدس گھر کے متولّی رہے اور اُنہی کے زمانہ میں خانۂ کعبہ ایک پُورا بُت خانہ بن گیا۔ اِس کی ابتدا اِس طرح ہُوئی کہ اِس قبیلے کا سردار عَمرو بن لُحَیّ اپنی دولت اور داد و دہش کی وجہ سے خزاعہ کا شاہِ بے تاج بنا ہُوا تھا اور جو بدعت بھی وہ نکالتا پُورا قبیلہ بے چُون و چرا اس کی پیروی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ شام گیا اور اُس نے وہاں کے عمالیق کو بُتوں کی پرستش کرتے دیکھا۔ اُسے یہ چیز بہت پسند آئی، وہاں سے ہُبَل نامی ایک بُت لے آیا اور کعبہ میں اسے نصب کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس پر مزید بُتوں کا اضافہ ہوتا چلا گیا۔ انہی میں حضرت ابراہیمؑ و اسماعیل اور حضرت مریمؑ کے بُت بھی شامل تھے۔ حضرت مریمؑ کا بُت غالباً اس لیے رکھا گیا تھا کہ عیسائی عرب بھی کعبہ کی طرف رجُوع کریں۔ بخاری، کتاب الانبیاء میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ کعبہ میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں بھی تھیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی صورت اِس شکل میں بنی تھی کہ دونوں کے ہاتھوں میں اَزلام (پانسے) تھے۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ بَحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام کی بدعتیں بھی عَمرو بن لُحَیّ کی ایجاد کردہ تھیں جن کی تردید سورۂ مائدہ آیت ۱۰۳ میں کی گئی ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ دینِ ابراہیمی کے پیروؤں میں بُت پرستی کا آغاز اسی شخص نے کیا تھا۔ ابنِ اسحٰق کا بیان ہے کہ مکّہ کو چھوڑ چھوڑ کر جو لوگ عرب کے مختلف حصّوں میں جانے پر مجبور ہوتے تھے وہ اپنے ساتھ مکّہ کا ایک پتھر لے کر چلے جاتے اور پھر جہاں بھی مقیم ہوتے وہاں اسے نصب کر کے اس کا طواف کرنے لگتے۔

(ابن ہشام ج ۱، ص ۷۹-۸۰)

کعبہ کی تولیت پر خزاعہ کا قبضہ اُس وقت ختم ہُوا جب قریش میں سے قُصَیّ بن کلاب نے اُسے اپنے خزاعی خُسر سے حاصل کیا، جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

اولادِ اسماعیل علیہ السلام

عرب کے علماء اَنساب اور بائبل کا متفقہ بیان یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے۔ مگر جب مکّہ پر جُرہم کا قبضہ ہو گیا تو اولادِ اسماعیلؑ کا بہت تھوڑا حصّہ اِس شہر میں بسا رہ گیا، باقی سب عرب کے مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے۔ تاریخ اس باب میں خاموش ہے کہ ان بارہ بیٹوں کی اولاد کہاں کہاں گئی اور کون کون سے قبائل ان کی نسل سے پیدا ہوئے۔ البتہ عرب کے علمُ الانساب میں جو چیز محفوظ اور متفق علیہ ہے اور جس میں کوئی اختلاف نہیں ہے وہ یہ ہے کہ عدنان حضرت اسماعیلؑ کے بڑے بیٹے نابِت کی اولاد میں سے تھا۔ عدنان سے پہلے حضرت اسماعیلؑ تک کتنی پشتیں گزریں، اس میں سخت اختلاف ہے، اور عدنان سے اُوپر کا کوئی شجرۂ نسب محفوظ نہیں ہے۔ عُروہ

بن زبیرؓ کا قول ہے کہ ہمیں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو عدنان اور حضرت اسماعیلؑ کے درمیان کا نسب نامہ جانتا ہو۔ ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ، دونوں کہتے ہیں کہ عدنان سے اُوپر کا نسب نامہ جو لوگ بیان کرتے ہیں وہ جھوٹ بولتے ہیں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ نسب نامہ صرف عدنان تک بیان کرنا چاہیے۔ طبقات ابن سعد اور بلاذری کی انساب الاشراف میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ منقول ہے کہ آپ معد بن عدنان بن اُدد تک نسب بیان کرنے کے بعد فرماتے کذب النسابون "آگے کا نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں"۔ لیکن اُوپر کا شجرۂ نسب محفوظ نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عدنان کا اولادِ اسماعیلؑ میں سے ہونا کسی درجہ میں بھی مشکوک ہے۔ تمام اہلِ عرب اس بات پر متفق تھے کہ عدنان بنی اسماعیل میں سے تھا، اور اہلِ عرب کا اس پر بالکل متفق ہونا اس کے صحیح ہونے کا ناقابلِ انکار ثبوت ہے، کیونکہ عرب کے لوگ نسب کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور ان کے لیے کسی کے نسب پر متفق ہو جانا اُس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک اُن کے ہاں نسلاً بعد نسلٍ اس کے بارے میں متواتر روایات موجود نہ ہوں۔

رسُولِ اکرمؐ کا نسب نامہ اور قبائلِ عرب سے آپؐ کا رشتہ

عدنان کے بعد تمام اُن قبائلِ عرب کا نسب نامہ محفوظ ہے جو اولادِ عدنان میں سے ہیں اور اس میں علمائے انساب کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم یہاں پہلے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب درج کرتے ہیں، اس کے بعد یہ بتائیں گے کہ کس کس پُشت پر عرب کے کون کون سے قبائل آپ کے ساتھ نسب میں شریک ہو جاتے ہیں۔ حضورؐ کا شجرۂ نسب یہ ہے:

مُحمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بن عبداللہ، بن عبدالمطلب، بن ہاشم، بن عبدِ مناف، بن قُصَیّ بن کلاب، بن مُرّہ، بن کَعب، بن لُؤیّ، بن غالب، بن فِہر، بن مالک، بن النّضر، بن کنانہ، بن خُزَیمہ، بن مُدرکہ، بن اَلیاس[1]، بن مُضر، بن نِزار، بن مَعد، بن عدنان۔

اِس سلسلۂ نسب میں ہر پُشت کے جدِّ اعلیٰ پر عرب کے حسبِ ذیل قبائل حضورؐ کے ہم نسب ہوتے چلے جاتے ہیں:

عدنان پر اُس کے دوسرے بیٹے عَکّ کی اولاد جو یمن جا کر بس گئی اور اَشعریوں میں (جو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا قبیلہ تھا) اُس کے شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے۔

مَعد پر بنی قُضاعہ اور بنی اِیاد۔

---

[1] بعض مصنفین نے اِس نام کا تلفظ اِلیاس لکھا ہے لیکن سُہیلی نے روض الانف میں اَلیاس ہی کو صحیح قرار دیا ہے۔ بلاذری نے بھی انساب الاشراف میں اس نام کا یہی تلفظ لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

نزار پر بنی انمار، خثعم اور بجیلہ، تمام قبائل ربیعہ (جن میں بنی بکر بن وائل، تغلب اور عبدیلہ وغیرہ شامل ہیں)،
بنی عبدالقیس، عنترہ اور نمر بن قاسط۔

مضر پر تمام قبائل قیس (سُلیم، مازن، فزارہ، عبس، اشجع، مرّہ، ذبیان، غطفان، عقیل، قشیر، جشم، ثقیف،
باہلہ، بنی سعد بن بکر اور تمام بنی ہوازن وغیرہ)۔ حضورؐ کی رضاعی والدہ حلیمہ بنی سعد بن بکر میں سے تھیں۔

الیاس پر بنی تمیم، بنی ضبہ، مزینہ، خزاعہ، اسلم، عکل، تیم وغیرہ۔

مدرکہ پر ہذیل۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسی قبیلہ سے تھے۔

خزیمہ پر بنی اسد، قارہ اور تمام بنی الہون بن خزیمہ۔

کنانہ پر بنی عبد مناۃ (جن میں بنی بکر اور بنی ضمرہ شامل ہیں)، بنی مالک، بنی ملکان یا ملکان اور بنی غدال وغیرہ
بنی فراس اور بنی جذیمہ بھی اولاد کنانہ میں سے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ کا قبیلہ غفار بنی ملکان میں سے تھا۔

قریش

علمائے انساب کا ایک گروہ اِس بات کا قائل ہے کہ النضر بن کنانہ ہی کا لقب قریش تھا لیکن محققین کہتے ہیں کہ قریش دراصل النضر کے پوتے اور مالک بن النضر کے بیٹے فہر کا لقب تھا۔ جو لوگ اُس کی اولاد ہیں وہ قریش میں شامل ہیں اور جو اُس کی اولاد نہیں ہیں وُہ قریش میں سے نہیں ہیں[1]۔

اب حضورؐ کے نسب نامہ کی طرف پھر رجوع کیجیے اور دیکھیے کہ قریش کے کون کون سے خاندان کس پُشت میں حضورؐ کے ساتھ نسب میں شریک ہوتے ہیں۔

فہر پر بنی محارب، اور بنی الحارث۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح بنی الحارث کی ایک شاخ سے تھے۔

غالب بن فہر پر بنی تیم الأدرم۔

---

[1] قریش کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک معنی پراگندہ ہونے کے بعد جمع ہونے کے ہیں۔ مگر اس معنی کے لحاظ سے قریش قصی بن کلاب ہی کا لقب ہو سکتا ہے کیونکہ اُسی کے زمانے میں قریش کے تمام خاندان مکہ میں جمع ہوئے۔ دُوسرے معنی کسب و تجارت کے ہیں جو قریش کا پیشہ تھا۔ تیسرے معنی تفتیش کے ہیں۔ اس لحاظ سے قریش نضر بن کنانہ کا لقب قرار پاتا ہے، کیونکہ اُس کے متعلق عرب کی روایات میں یہ منقول ہے کہ وہ حاجتمند لوگوں کی حاجات کا تجسس کرتا تھا اور اُن کی مدد کیا کرتا تھا۔ ایک اور معنی یہ ہیں کہ قریش سمندر کے ایک بڑے جانور کا نام ہے جو ہر چیز کو کھا جاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ قریش بن بدر بنی نضر بن کنانہ میں سے ایک شخص تھا جو اپنے قبیلے کے قافلوں کے لیے بدرقے اور رسد رسانی کا انتظام کرتا تھا۔ اِس لیے عرب اس قبیلے کے قافلہ کو دیکھ کر کہتے تھے کہ قریش کا قافلہ آگیا۔ یہ مختلف اقوال ہیں۔ مگر تحقیق یہی ہے کہ قریش بنی فہر کا لقب ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

لؤی بن غالب پر بنی عامر۔ اسی خاندان کی ایک شاخ سے فاطمہ بنت زائدہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی والدہ تھیں۔ اسی خاندان کی ایک دوسری شاخ سے سُہیل بن عمرو تھے جنہوں نے کفر کی حالت میں صلحِ حدیبیہ کی شرائط طے کی تھیں اور اپنے بیٹے ابوجندل پر سخت ظلم ڈھائے تھے۔ پھر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اور حضورؐ کی وفات کے بعد جب مکہ میں ارتداد کا میلان اُبھرنے لگا تو یہی اُس کو روکنے کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ اسی خاندان کی ایک اور شاخ سے اُمّ المومنین حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

کعب[1] بن لؤی پر بنی عدی، بنی جُمَح اور بنی سَہم۔ حضرت عمرؓ بنی عدی کے ایک خاندان سے تھے۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون بنی جمح میں سے تھے۔ اور حضرت عمروؓ بن عاص کا تعلق بنو سہم کے ایک خاندان سے تھا۔

مُرّہ بن کعب پر بنی تیم اور بنی مخزوم۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بنی تیم میں سے تھے۔ حضرت طلحہؓ بھی اسی خاندان سے تھے۔ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ اور اُن کے پہلے شوہر حضرت ابوسلمہؓ بنی مخزوم میں سے تھے اور اسی خاندان کا ایک فرد ابوجہل تھا۔ حضرت عمرؓ کی ماں حَنتمہ بنت ہشام اسی خاندان سے تھی اور اس رشتے سے ابوجہل بن ہشام اُن کا ماموں ہوتا تھا۔ حضرت اَرقمؓ، جن کا دارِ ارقم حضورؐ کی دعوتِ رسالت کے دَور میں بڑی اہمیت رکھتا تھا، وہ بھی مخزومی تھے۔ اسی خاندان کی ایک شاخ سے حضرت خالد بن ولیدؓ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی دادی فاطمہ بنت عمرو بھی مخزومیہ تھیں جن سے حضورؐ کے والد اور آپؐ کے چچا ابوطالب اور زُبیر پیدا ہوئے۔

کلاب بن مُرّہ پر بنی زُہرہ۔ حضورؐ کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف بنی زُہرہ ہی میں سے تھے۔ حضرت حمزہؓ کی والدہ ہالہ بنت اُہَیب بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور وہ حضورؐ کی والدہ بی بی آمنہ کی چچا زاد بہن تھیں۔

قُصَیّ بن کلاب پر بنی عبدالعُزّٰی، بنی عبدالدار اور بنی عبد بن قصی (یا عبدِ قُصَی)۔ اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ، حضرت زُبیرؓ بن العوام، وَرقہ بن نوفل اور حضرت حکیمؓ بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) سب بنی عبدالعزّٰی میں سے تھے۔ حضورؐ کی نانی بَرّہ بنی عبدالدار میں سے تھیں اور اسی خاندان کی ایک شاخ سے حضرت مصعبؓ بن عُمیر کا تعلق تھا۔

عبدِمَناف بن قُصَیّ پر بنی المُطّلِب، بنی عبدِشمس اور بنی نوفل۔ تمام بنی اُمیّہ عبدشمس کی اولاد تھے۔ اس

---

[1] یہ شخص عرب میں بڑا عظیم القدر تھا۔ واقعۂ فیل سے پہلے عرب کے لوگ اسی کی وفات کے وقت سے تاریخوں کا حساب کرتے تھے۔ اسی نے یوم العروبہ (جمعہ) کو اپنی قوم کے اجتماع کا دن مقرر کیا تھا جس میں یہ لوگوں کو مکارمِ اخلاق کی تلقین کیا کرتا تھا۔ ابن اثیر۔ بلاذری۔ (حاشیہ از مؤلف)

خاندان کی ایک شاخ سے مشہور دشمنِ اسلام عُقبہ بن ابی مُعَیط تھا، دوسری شاخ سے اُمّ جمیل (ابولہب کی بیوی، حمّالۃ الحطب) ، ابوسفیان اور اُن کی بیٹی اُمّ المومنین حضرت اُمّ حبیبہؓ تھیں۔ تیسری شاخ سے امیرالمومنین حضرت عثمانؓ بن عفان تھے، اور چوتھی شاخ سے مروان کا باپ حکم۔ عبدشمس کی اولاد ہی میں سے مشہور دشمنِ اسلام عُتبہ اور شَیبہ بھی تھے۔ عُتبہ کی بیٹی ہند (ابوسفیان کی بیوی) اور بیٹے حضرت ابوحُذیفہؓ تھے۔ بنی نوفل میں سے حضرت جُبیر بن مُطعِم تھے۔ اور بنی المطّلب وہ خاندان تھا جس نے زمانۂ رسالت سے پہلے بھی ہر تنگی و ترشی میں بنی ہاشم کا ساتھ دیا اور زمانۂ رسالت کے بعد بھی وہ بنی ہاشم کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت میں سینہ سپر رہا۔ مُطّلب کو اس کی خوبصورتی کی بنا پر قمر کہا جاتا تھا۔

ہاشم بن عبدمناف پر تمام بنی ہاشم۔ ہاشم کی ایک بیوی بنی قُضاعہ سے تھی۔ نَضلہ بن ہاشم اور شِفاء بنت ہاشم اسی بیوی سے تھے۔ ان کی دوسری بیوی بنی مازن سے تھی جس سے خالدہ بنت ہاشم اور ضعیفہ بنت ہاشم پیدا ہوئیں۔ تیسری بیوی بنو خزاعہ سے تھی جس سے اسد بن ہاشم پیدا ہوا۔ چوتھی بیوی مدینے کی ہند بنت عمرو بن ثعلبہ خزرجیہ تھی جس سے ایک بیٹی حَیّہ پیدا ہوئی اور ایک بیٹا ابوصیفی۔ پانچویں بیوی بھی مدینہ کے ایک اور خزرجی خاندان بنی النجّار میں سے تھیں جن کا نام سلمٰی بنت عمرو تھا۔ یہی عبدالمطّلب اور ان کی ایک بہن رُقیّہ کی ماں تھیں۔ اس طرح پہلے ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رشتہ داری اہلِ مدینہ سے قائم ہو چکی تھی۔

عبدالمطّلب پر تمام بنی عبدالمطّلب۔ ان کی ایک بیوی فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بنی مخزوم میں سے تھیں جن سے حضورؐ کے والد ماجد عبداللہ، اور دو چچا ابوطالب اور زُبیر، اور پانچ پھوپھیاں بَرّہ، اُمّ الحکیم البیضاء، عاتکہ، اُمَیمہ اور اَروٰی پیدا ہوئیں۔ حضرت ابوسلمہؓ اور ابوسَبرہ بَرّہ کے بیٹے تھے۔ اُمّ الحکیم البیضاء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نانی تھیں۔ اُمَیمہ حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور اُمّ المومنین حضرت زینبؓ کی والدہ تھیں۔ عاتکہ کے بیٹے زُہیر بن ابی اُمیّہ اور عبداللہ بن ابی اُمیّہ مخزومی تھے۔ عبدالمطّلب کی دوسری بیوی ہالہ بنت اُہَیب بنی زُہرہ میں سے تھیں اور حضورؐ کی والدہ بی بی آمنہ کی چچازاد بہن تھیں۔ ان سے حضورؐ کے تین چچا حضرت حمزہؓ، مُقَوّم اور حَجل پیدا ہوئے۔ آپ کی پھوپھی حضرت صفیّہ بھی اسی بیوی کے بطن سے تھیں جن کے صاحبزادے حضرت زُبیرؓ بن العوام تھے۔ حضرت زبیرؓ کے والد عوّام بن خُوَیلد حضرت خدیجہؓ کے بھائی تھے۔ عبدالمطّلب کی تیسری بیوی نُتَیلہ بنت جناب بنی النَّمِر بن قاسط میں سے تھی جس سے حضرت عباسؓ اور ضِرار پیدا ہوئے۔ ان کی ایک اور بیوی سَمراء بنت جُندُب بنی بکر بن ہوازن میں سے تھی جس سے حارث بن عبدالمطّلب پیدا ہوا۔ ان کی ایک اور بیوی لُبنٰی بنت ہاجرہ بنی خزاعہ میں سے تھی جس سے ابولہب پیدا ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نسب نامے اور قبائلِ عرب کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ آپ کے

تعلق کی ان تفصیلات پر نگاہ ڈالنے سے چند باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔

اوّل، یہ کہ دنیا کے کسی ایک مذہب کے پیشوا اور کسی ایک دنیوی نظام کے بانی کے متعلق بھی تاریخ میں اتنی معلومات موجود نہیں ہیں جن سے اس قدر تفصیل کے ساتھ اس کے حسب نسب اور اس کی اصل نسل کا پتہ چلتا ہو جتنی تفصیل کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چلتا ہے۔ اس لیے دنیا کے اکابر رجال میں حضورؐ کی شخصیت وہ واحد شخصیت ہے جو تاریخ کی پوری روشنی میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

دوم یہ کہ حضورؐ کے سوا کسی بڑے مذہبی یا دنیوی رہنما کے متعلق ہمیں اتنی تفصیل کے ساتھ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اپنے معاشرے میں اُس کی جڑیں کتنی گہری اور کتنی دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اہلِ عرب کے لیے آپؐ کوئی غیر معروف شخص نہیں تھے، بلکہ جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک پورے عرب میں پھیلے ہوئے سینکڑوں قبائل کو معلوم تھا کہ آپؐ کس خاندان کے فرد ہیں اور اُس خاندان کے ساتھ اُن کا اپنا نسبی رشتہ کیا ہے۔

سوم یہ کہ قریش کے جتنے خاندان مکہ اور اس کے اطراف میں آباد تھے اُن میں سے کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس سے آپؐ کا کسی نہ کسی طرح کی رشتہ داری کا تعلق نہ ہو۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ:

لَمْ يَكُنْ بَطْنٌ مِنْ قُرَيْشٍ إِلَّا وَلَهُ فِيهِ قَرَابَةٌ۔

"قریش کے ہر خاندان سے آپؐ کا کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور تھا۔"

قریش کا مکہ میں جمع ہونا اور کعبہ کی تولیت حاصل کرنا

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ مکہ پر جُرہم کے تسلّط کے بعد اولادِ اسماعیلؑ عرب کے مختلف خطّوں میں منتشر ہو گئی تھی۔ یہی کیفیت بنی خُزاعہ کی ایک شاخ غُبشان کی تولیتِ کعبہ کے دَور میں بھی رہی۔ بنی اسماعیلؑ کی دوسری شاخوں کی طرح قریش بھی بنی کنانہ کی مختلف بستیوں میں بکھرے ہوئے تھے اور ان کا بہت تھوڑا حصّہ مکہ میں آباد تھا۔ سنہ ۴۴۰ء کے لگ بھگ زمانے میں قُصَیّ بن کِلاب کے ہاتھوں یہ صورتِ حال ختم ہوئی اور مکہ قریش کے قبضہ میں اور خانۂ کعبہ اُن کی تولیت میں آ گیا۔

اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ قُصَیّ کا باپ کِلاب بن مُرّہ جب مرگیا تو اس کی ماں فاطمہ بنت سعد جو اَزد شنوءہ

---

[1] ابنِ کثیر کی روایت ہے کہ کعب بن لؤَیّ (قُصَیّ کے پردادا) کی موت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے درمیان ۵۶۰ برس کا فصل ہے۔ اس لحاظ سے شاید غالب بن فہر حضرت مسیحؑ کا ہم عصر تھا۔ ابن کثیر ہی نے سُہیلی اور دوسرے ائمہ کے حوالہ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ مَعد بن عدنان کا زمانہ وہ تھا جب بخت نَصَّر یروشلم کو تباہ کرکے اور یہودیوں کو قید کرکے بابل لے گیا۔ یہ حضرت مسیحؑ سے ۵۸۶ سال قبل کا واقعہ ہے۔ بلاذری نے مَعد بن عدنان کو بخت نصّر کا ہمعصر بتایا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

یں سے تھی، بنی قُضاعہ کے ایک شخص رَبیعہ بن حَرام کے ساتھ نکاح کر کے شام چلی گئی اور وہاں اِس دوسرے شوہر سے اس کے ہاں ایک اور لڑکا رِزاح بن رَبیعہ پیدا ہُوا جب قُصَیّ جوان ہُوا تو ایک مرتبہ بنی قضاعہ میں سے ایک شخص سے اس کی لڑائی ہوگئی اور اس نے قُصَیّ کو طعنہ دیا کہ تو ؔ ہمارے ہاں پل کر ہم ہی پر بَغرّاتا ہے، اپنے لوگوں میں کیوں نہیں جاتا ؟ اس پر قُصَیّ نے اپنی ماں سے پُوچھا کہ مَیں کون ہُوں ؟ اُس نے بتایا کہ تُو کِلاب کا بیٹا اور قبیلۂ قریش کا فرزند ہے اور تیری قوم بیت الحرام کے پاس شہر مکّہ اور اس کے گردو نواح میں رہتی ہے۔ تب قُصَیّ نے اصرار کیا کہ مَیں اپنے لوگوں میں جاؤں گا۔ چنانچہ جب حج کا زمانہ آیا تو وہ بنی قضاعہ کے حاجیوں کے ساتھ مکّہ پہنچ گیا۔ یہاں اُس کا حقیقی بھائی زُہرہ، جو کِلاب کی وفات کے وقت جوان تھا، پہلے سے آباد تھا۔ وہ اسی کے پاس پہنچ گیا اور اُس نے حُلَیل بن حُبْشِیَّۃ خُزَاعی سے (جو اُس وقت کعبہ کا متولّی اور مکّہ کا صاحب امر تھا) اُس کی لڑکی حُبّیٰ کا رشتہ مانگا جسے اُس نے قُصَیّ کی شرافتِ نسبی اور شاندار شخصیت دیکھ کر بخوشی قبول کر لیا۔ اس کے بعد کعبہ کی تَولیّت اور مکّہ کی سرداری کس طرح اُس کے قبضہ میں آئی، اِس باب میں روایات مختلف ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ حُلَیل نے خود وصیّت کر دی تھی کہ اُس کے بعد قُصَیّ ولایتِ کعبہ کا اہل ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حُلَیل کے مرنے کے بعد قُصَیّ نے دعویٰ کیا کہ مَیں دوسروں سے بڑھ کر اِس منصب کا اہل ہوں، اور جب بنی خُزاعہ اور بنی بکر نے نہ مانا تو اُس نے اپنے ماں جائے بھائی رِزاح اور بنی کنانہ اور قضاعہ کو مدد کے لیے بُلا لیا، اور مکّہ کے اطراف میں قریش کے جو لوگ آباد تھے اُن کو بھی جمع کر لیا اور بزورِ خُزاعہ اور بنی بکر کو مکّہ سے نکال دیا۔ بعد میں جب فریقین نے یَعْمَر بن عَوف کو جو بنی عبد مَناۃ بن کنانہ میں سے تھا، پنچ بنایا تو اس نے فیصلہ دیا کہ خُزاعہ کے مقابلہ میں قُصَیّ ولایتِ کعبہ کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ وہ اور اُس کا خاندان قطعی اور صریح طور پر آلِ اسماعیلؑ میں سے ہے۔

خُزاعہ کے قضیہ سے فارغ ہو کر قُصَیّ نے بنی الغَوث بن مُرّ کے معاملہ کی طرف توجّہ کی جو صُوفہ کہلاتے تھے اور جُرہُم و خُزاعہ کے زمانے سے انہوں نے یہ منصب سنبھال رکھا تھا کہ حج کے موقع پر عَرفات سے اِفاضہ ان کی اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ منیٰ بھی ان کی اجازت ہی سے لوگ جا سکتے تھے۔ اور پھر منیٰ سے لوگ اُس وقت تک اپنے گھروں کو روانہ نہ ہو سکتے تھے جب تک کہ صُوفہ پہلے رَمیِ جمار نہ کر لیں۔ اُن کے بعد ہی دوسرے حاجی رَمی کر کے روانہ ہو سکتے تھے۔ ایک طویل مدّت کے عمل سے یہ بھی گویا ایک دین بن گیا تھا جس کی پیروی لازم سمجھی جاتی تھی۔ قُصَیّ نے حج کے موقع پر صُوفہ سے جنگ کی اور انہیں اس منصب سے بے دخل کیا (ابن ہشام)۔

اس طرح جب قُصَیّ نے کعبہ کی تَولیّت اور مکّہ کی سرداری حاصل کر لی تو اُس نے فِہر کی ساری اولاد کو (جو قُرَیش کہلاتی تھی) عرب کے مختلف حصّوں سے مکّہ میں جمع کر لیا اور مکّہ کو اُن کے درمیان بانٹ کر شہر کے ایک ایک حصّہ میں ایک ایک خاندان کو آباد کر دیا[1]۔ اِسی بنا پر قریش اُسے مُجَمِّع (جمع کرنے والا) کہتے ہیں۔ چنانچہ

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیے

حذافہ بن غانم عدوی کہتا ہے:

أَبُوكُمْ قُصَيٌّ كَانَ يُدْعَى مُجَمِّعًا
بِهِ جَمَّعَ اللّٰهُ الْقَبَائِلَ مِنْ فِهْرِ

"تمہارا باپ قصیّ مجمّع کہلاتا تھا۔ اسی کے ذریعہ سے اللہ نے فہر کے قبائل کو جمع کیا۔"

مکہ کی شہری ریاست اور حج کا انتظام

قصیّ کی انہی خدمات کی بنا پر اُس کو تمام قبائل قُریش نے اپنا سردار مان لیا۔ قریش کے کسی گھرانے میں جو لڑکی بھی جوان ہوتی اُسے قمیص قصیّ کے گھر ہی میں پہنائی جاتی۔ جو نکاح بھی ہوتا قصیّ کے گھر میں ہوتا۔ کوئی اہم معاملہ پیش آتا، یا کسی قبیلے سے جنگ کی نوبت آتی تو اسی گھر میں سب گھرانوں کے سردار مشورے کے لیے جمع ہوتے۔ اسی وجہ سے یہ گھر دار النّدوہ کہلاتا تھا اور اس کا ایک دروازہ حرم کی طرف کھلتا تھا۔ جنگ کے موقع پر قصیّ ہی کی اولاد میں سے کسی کو علمبردار بنایا جاتا۔ اِس منصب کا نام اللّواء تھا۔ حج کے سارے انتظامات بھی قصیّ کے ہاتھ میں تھے۔ ان میں سے ایک کام السِّقایہ تھا، یعنی حاجیوں کو پانی پلانا۔ دوسرا الرِّفادہ تھا، یعنی حاجیوں کو کھانا کھلانے کا بندوبست جس کے لیے قریش کے سارے گھرانے چندہ اکٹھا کر کے قصیّ کو دیتے تھے اور وہ حج سے واپسی تک تمام اُن حاجیوں کے لیے کھانے کا انتظام کرتا تھا جو اپنے کھانے کا خود انتظام نہ کر سکتے۔ تیسرا الحِجابہ تھا، یعنی خانۂ کعبہ کی کلید برداری اور زائرین کے لیے کعبہ کو کھولنا اور بند کرنا۔

قصیّ اپنی زندگی میں مکہ کی ریاست کا بلاشرکتِ غیرے مالک رہا۔ جب اس کا آخر وقت آیا تو اُس نے یہ دیکھ کر کہ اس کا بیٹا عبدِ مناف پہلے ہی عرب میں ناموری حاصل کر چکا ہے اور اس کا شرف تسلیم کیا جانے لگا ہے، مکہ کی ریاست کے تمام مناصب (ندوہ، حجابہ، سقایہ، رفادہ اور لواء) اپنے دوسرے بیٹے عبد الدار کو دے دیے۔ قصیّ کی وفات کے بعد ایک مدت تک اس کے فیصلے کا احترام کیا گیا، لیکن پھر کسی وقت اس کی اولاد میں اِن مناصب کی تقسیم پر

(حاشیہ صفحہ سابق)

[1] قصیّ نے مکہ کو قریش کے خاندانوں کے درمیان اس طرح تقسیم کیا تھا کہ حرم کے آس پاس کے علاقے اور دونوں طرف کے پہاڑوں کی گھاٹیوں اور بلندیوں میں بنی کعب بن لؤی کی مختلف شاخوں کو آباد کیا جن میں بنی عدی، بنی جمح، بنی سہم، بنی تیم، بنی مخزوم، بنی زہرہ، بنی عبد العزّیٰ، بنی عبد الدار، بنی المطّلب، بنی ہاشم، بنی عبد شمس اور بنی نوفل شامل تھے۔ ان کو قریش البطاح کہا جاتا تھا، یعنی یہ مکہ کے اندرونی حصے میں رہنے والے اور اصل اہلِ حرم تھے۔
کعب سے اوپر فہر کی اولاد کے خاندان (بنی محارب، بنی الحارث، بنی تیم الادرم، بنی عامر بن لؤی وغیرہ) قریش الظّواہر تھے اور ان کو مکہ کا بیرونی حصہ دیا گیا تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

جھگڑا ہو گیا، جس میں قریش کے کچھ گھرانے بنی عبدالدار کے ساتھ اور کچھ بنی عبدِ مناف کے ساتھ ہو گئے[1]۔ قریب تھا کہ یہ جھگڑا طول کھینچ جاتا، لیکن خانہ جنگی تک نوبت پہنچنے سے پہلے آپس ہی میں تصفیہ ہو گیا جس کے تحت حجابہ، لواء اور ندوہ بنی عبدالدار کے پاس رہے، اور سقایہ اور رفادہ بنی عبدِ مناف کو دے دیے گئے۔ آلِ عبدِ مناف نے آپس کے مشورے سے یہ دونوں منصب ہاشم کو دے دیے[2]۔

ہاشم

ہاشم کا اصل نام عمرو تھا۔ "ہاشم" کا لقب اسے اُس وقت دیا گیا جب مکہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا، اور اُس نے شام سے غلّہ لا کر روٹیاں پکوائیں اور بہت سے اُونٹ کٹوا کر سالن تیار کرایا اور روٹیوں کو اس میں چُور کر لوگوں کو اس کا ثرید (مالیدہ) کھلایا۔ ہَشم کے معنی توڑنے اور کُچلنے کے ہیں۔ روٹیاں توڑ کر سالن میں مالیدہ تیار کرانے کی وجہ سے اُس کو ہاشم کہا جانے لگا۔ رفادہ اور سقایہ کا منصب ہاتھ میں آنے کے بعد ہاشم کا قاعدہ یہ تھا کہ جب حج کا زمانہ آتا تو وہ قریش کے لوگوں کو جمع کر کے کہتا "یہ اللہ کے پڑوسی اور اس کے گھر کے لوگ اِس زمانے میں زیارت کے لیے تمہارے پاس آتے ہیں۔ یہ اللہ کے مہمان ہیں، اور سب سے زیادہ ضیافت کے حقدار اللہ ہی کے مہمان ہوتے ہیں۔ اللہ نے تم کو یہ خصوصیت بخشی ہے اور اسی کی بدولت تمہیں عزّت دی ہے اور تمہاری ایسی حفاظت کی ہے جیسی کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کی نہیں کرتا۔ لہٰذا اس کے مہمانوں اور زائروں کا اکرام کرو جو گرد آلود اور پراگندہ حال ہر دُور دراز علاقے سے دُبلی اُونٹنیوں پر، جو سُوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں، آ رہے ہیں۔ اُن کے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔ اُن میں جوئیں پڑ گئی ہیں۔ اُن کا زادِ راہ ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا ان کو کھانا کھلاؤ اور پانی پلاؤ"۔ اس پر قریش کے سارے خاندانوں سے چندہ آتا اور خود ہاشم زرِ کثیر اپنے پاس سے خرچ کرتا۔ پھر چمڑے کے بڑے بڑے حوضوں میں مکہ کے سارے کنووں سے (کیونکہ زمزم کو تو جُرہُم بند کر گئے تھے اور اس کا نشان تک باقی نہ تھا) پانی لا لا کر ان میں

---

[1] قریش کے جن خاندانوں نے بنی عبدِ مناف کا ساتھ دیا وہ بنو اسد بن عبدالعُزّٰی، بنو زُہرہ بن کلاب، بنو تَیم بن مُرّہ، اور بنو الحارث بن فِہر تھے، اور اس جتھے کا سردار عبدِ شمس تھا۔ اور جن خاندانوں نے بنی عبدالدار کا ساتھ دیا وہ بنو مخزوم، بنو سَہم، بنو جُمح اور بنو عَدِی تھے۔ ان کا سردار عامر بن ہاشم تھا۔ بنی عامر بن لُؤیّ اور بنی مُحارب بن فِہر اس جھگڑے میں غیر جانبدار رہے۔

[2] رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے دستِ مبارک پر مکہ فتح ہونے تک یہ مناصب اُسی طرح قائم رہے جس طرح یہ اُس مصالحت کے موقع پر دونوں خاندانوں میں تقسیم کیے گئے تھے۔ فتح کے بعد حضوؐر نے حجابہ اور سقایہ کے سوا باقی سب کو منسوخ کر دیا۔ حجابہ آج تک بنی عبدالدار کی ایک شاخ شَیبہ بن عثمان کے ہاتھ میں چلی آ رہی ہے۔ البتہ سقایہ جو آخر کار حضرت عباس بن عبدالمطلب کے ہاتھ میں آئی ایک مدّت تک بنی عباس کے ہاتھ میں رہی، پھر پہلے عباسی خلیفہ نے اسے خود چھوڑ دیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

حاجیوں کے لیے بھیرا جاتا۔ روٹیاں اور سالن پکا کر ان کا ثرید بنایا جاتا۔ روٹی اور دودھ کا ملیدا بھی بنایا جاتا۔ ستّو اور کھجوریں وغیرہ فراہم کی جاتیں اور حاجیوں کے منیٰ سے رخصت ہونے تک اُن کی ضیافت کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسی چیز نے ہاشم کو عرب کے تمام قبائل میں مقبول بنا دیا تھا کیونکہ ان سب کو ہر سال حج میں اُس کی اِس فیاضانہ خدمت سے استفادے کا موقع ملتا تھا۔ (ح)

قریش کی تجارت اور ان کی ترقی

قریش کی وہ تجارت جس کا ذکر سورۂ قریش میں رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (گرمی اور جاڑے کے سفروں) کے نام سے اللہ کے ایک فضل کے طور پر کیا گیا ہے، اس کا خیال بھی سب سے پہلے ہاشم ہی کے ذہن میں پیدا ہُوا۔ اُس نے اپنے تینوں بھائیوں، عبدِ شمس، مُطّلب اور نوفل کو ساتھ ملا کر یہ منصوبہ بنایا کہ اُس بین الاقوامی تجارت میں حصّہ لیا جائے جو عرب کے راستے بلادِ مشرق اور شام و مصر کے درمیان ہوتی تھی، اور ساتھ ساتھ اہلِ عرب کی ضروریات کا سامان بھی خرید کر لایا جائے تاکہ راستے کے قبائل اُن سے مال خریدیں، اور مکّے کی منڈی میں اندرونِ ملک کے تجار خریداری کے لیے آنے لگیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران کی ساسانی حکومت اُس بین الاقوامی تجارت پر اپنا تسلّط قائم کر چکی تھی جو شمالی علاقوں اور خلیج فارس کے راستوں سے رُومی سلطنت اور بلادِ مشرق کے درمیان ہوتی تھی۔ اِسی وجہ سے جنوبی عرب سے بحرِ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ جو تجارتی راستہ شام و مصر کی طرف جاتا تھا اُس کا کاروبار بہت چمک اُٹھا تھا۔ عرب کے دوسرے تجارتی قافلوں کی بہ نسبت قریش کو یہ سہولت حاصل تھی کہ راستے کے تمام قبائل بیتُ اللہ کے خُدّام ہونے کی حیثیت سے ان کا احترام کرتے تھے۔ حج کے زمانے میں نہایت فیاضی کے ساتھ حاجیوں کی جو خدمت قریش کے لوگ کرتے تھے اس کی بنا پر سب اُن کے احسان مند تھے۔ اُنہیں اِس امر کا کوئی خطرہ نہ تھا کہ راستے میں کہیں ان کے قافلوں پر ڈاکہ مارا جائے گا۔ راستے کے قبائل اُن سے رہگزر کے وہ بھاری ٹیکس بھی وصُول نہ کر سکتے تھے جو دوسرے قافلوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ ہاشم نے اِنہی تمام پہلوؤں کو دیکھ کر تجارت کی اسکیم بنائی اور اپنی اس سکیم میں اپنے تینوں بھائیوں کو شامل کیا۔ شام کے غسّانی بادشاہ سے ہاشم نے، حبش کے بادشاہ سے عبدِ شمس نے، یمنی اُمراء سے مُطّلب نے اور عراق و فارس کی حکومتوں سے نوفل نے تجارتی مراعات حاصل کیں[1]۔ اِس طرح اِن لوگوں کی تجارت بڑی تیزی سے ترقی کرتی چلی گئی۔ اِسی بنا پر یہ چاروں بھائی مُتّجِرِین (تجارت پیشہ) کے نام سے مشہور ہو گئے، اور جو روابط

[1] طبری کا بیان ہے کہ ہاشم نے قیصرِ رُوم اور تمام و غسّان کے بادشاہوں سے، عبدِ شمس نے حبش کے بادشاہ نجاشی سے، نوفل نے شاہانِ فارس سے، اور مُطّلب نے شاہانِ حِمیر سے تجارتی مراعات اور سفر میں حفاظت کے پروانے حاصل کیے تھے۔ ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ قیصرِ روم کے ہاں ہاشم کو خاص اعزاز حاصل تھا اور وہ کاروبار کے سلسلے میں اَنقرہ تک جاتا تھا (حاشیہ از مؤلف)۔

انہوں نے گردو پیش کے قبائل اور ریاستوں سے قائم کیے تھے اُن کی بنا پر ان کو اصحاب الایلاف بھی کہا جاتا تھا جس کے لفظی معنی تو "الفت پیدا کرنے والوں" کے ہیں، لیکن اصطلاحاً ایلاف سے مراد ایسا دوستانہ تعلق تھا جس کی بنا پر راستے سے گزرنے کا امن اور دوست قبیلے کے علاقے میں منزل کرنے کا امن حاصل ہو۔ یہ حلیف (Alliance) سے مختلف نوعیت کا معاہدہ ہوتا تھا۔

اس کاروبار کی وجہ سے قریش کے لوگوں کو شام، مصر، عراق، ایران، یمن، اور حبش کے ممالک سے تعلقات کے وہ مواقع حاصل ہوئے، اور مختلف ملکوں کی ثقافت و تہذیب سے براہ راست سابقہ پیش آنے کے باعث اُن کا معیار دانش و بینش اتنا بلند ہوتا چلا گیا کہ عرب کا کوئی دوسرا قبیلہ اُن کی ٹکر کا نہ رہا۔ مال و دولت کے اعتبار سے بھی وہ عرب میں سب پر فائق ہو گئے اور مکّہ جزیرۃ العرب کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ اِن بین الاقوامی تعلقات کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہُوا کہ عراق سے یہ لوگ وہ رسم الخط لے کر آئے جو بعد میں قرآن مجید لکھنے کے لیے استعمال ہُوا۔ عرب کے کسی دوسرے قبیلے میں اتنے پڑھے لکھے لوگ نہ تھے جتنے قریش میں تھے۔ انہی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا تھا کہ قریش قادۃ الناس۔ "قریش لوگوں کے لیڈر ہیں" (مسند احمد، مرویاتِ عَمرو بن العاص)۔ اور حضرت علیؓ کی روایت بیہقی میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

کان ھٰذا الامر فی حِمْیَرَ فنزعہ اللہ منھم وجعلہ فی قریش۔

"پہلے عرب کی سرداری قبیلۂ حِمْیَر والوں کو حاصل تھی، پھر اللہ تعالیٰ نے اُن سے سلب کر کے قریش کو دے دی۔"

قریش اسی طرح ترقی پر ترقی کرتے چلے جا رہے تھے کہ مکّہ پر ابرہہ کی چڑھائی کا واقعہ پیش آگیا۔ اگر اُس وقت ابرہہ اِس شہرِ مقدّس کو فتح کرنے اور کعبے کو ڈھا دینے میں کامیاب ہو جاتا تو عرب میں قریش ہی کی نہیں خود کعبہ کی دھاک بھی ختم ہو جاتی۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب کا یہ عقیدہ متزلزل ہو جاتا کہ یہ گھر واقعی بیت اللہ ہے۔ قریش کو اس گھر کے خادم ہونے کی حیثیت سے جو احترام پورے ملک میں حاصل تھا وہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ حبشیوں کی پیش قدمی کے بعد رُومی سلطنت آگے بڑھ کر شام اور مکّے کے درمیان کا تجارتی راستہ بھی اپنے قبضے میں لے لیتی، اور قریش اُس سے زیادہ خستہ حالی میں مبتلا ہو جاتے جس میں وہ قُصَی بن کلاب سے پہلے مبتلا تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا یہ کرشمہ دکھایا کہ پرندوں کے لشکروں نے سنگریزے مار مار کر ابرہہ کی لائی ہُوئی ۶۰ ہزار حبشی فوج کو تباہ و برباد کر دیا، اور مکّے سے یمن تک سارے راستے میں جگہ جگہ اس تباہ شدہ فوج کے آدمی گر گر کر مرتے چلے گئے تو کعبے کے بیت اللہ ہونے پر تمام اہلِ عرب کا ایمان پہلے سے بدرجہا زیادہ مضبوط ہو گیا اور اس کے ساتھ قریش کی دھاک بھی ملک بھر میں پہلے سے زیادہ بیٹھ گئی۔ اب عربوں کو یقین ہو گیا کہ ان

لوگوں پر اللہ کا فضلِ خاص ہے۔ وہ بے کھٹکے عرب کے ہر حصے میں جاتے اور اپنے تجارتی قافلے لے کر ہر علاقے سے گزرتے۔ کسی کی یہ جرأت نہ تھی کہ اُن کو چھیڑتا۔ اُنہیں چھیڑنا تو درکنار، اُن کی امان میں کوئی غیر قریشی بھی ہوتا تو اس سے کوئی تعرّض نہ کیا جاتا۔ (۸)

عبدالمطّلب بن ہاشم

ہاشم اپنے تجارتی سفروں کے سلسلے میں اکثر شام جاتے ہوئے مدینے ٹھہرا کرتا تھا، اور وہاں قبیلہ خزرج کی ایک عورت سے وہ پہلے ہی شادی کر چکا تھا جس سے اس کے دو بچے حیّہ (لڑکی) اور ابو عُتبہ (لڑکا) پیدا ہوئے تھے۔ ایک اور سفر میں اس نے خزرج ہی کے ایک خاندان بنی نجار کی ایک نوجوان عورت سلمیٰ بنت عمرو بن زید کو بازار میں ایک اونچے مقام پر بیٹھے دیکھا جو حکم دیتی جا رہی تھی کہ اُس کے لیے کیا خریدا جائے اور اُس کی طرف سے کیا بیچا جائے۔ ہاشم کو اس کے حسن و جمال اور اس کی شان و شوکت اور ذکاوت و ذہانت نے بہت متاثر کیا اور اُس نے شادی کی درخواست اُس سے کر دی۔ وہ کسی سے اِس شرط کے بغیر شادی کے لیے تیار نہ تھی کہ وہ اپنی مرضی کی مختار ہوگی اور کسی شخص کو پسند نہ کرے گی تو علیحدگی اختیار کر لے گی۔ ہاشم نے اس کی شرط مان لی اور اس نے ہاشم کی خاندانی شرافت اور ذاتی وجاہت کو دیکھ کر اس کا پیغام قبول کر لیا۔ مدینے ہی میں دونوں کی شادی ہوئی اور یہیں اِس خاتون کے بطن سے حضورؐ کے دادا عبدالمطّلب تقریباً ۵۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ اِسی سفر میں ہاشم جب غزہ پہنچا تو بیمار ہو گیا اور وہیں اس کی وفات ہو گئی۔ اِس طرح عبدالمطّلب جوانی کی عمر کے قریب پہنچنے تک اپنی ماں کے پاس مدینے ہی میں رہے۔ ہاشم نے مرتے وقت وصیت کی کہ اُس کے بعد اُس کا بھائی مطّلب اُس کی جگہ سقایہ اور رفادہ کا متولّی ہوگا اور وہی اس کے اہل و عیال اور اس کی جائداد کی دیکھ بھال کرے گا۔ اُس وقت سے بنی ہاشم اور بنی المطّلب یک جان و دو قالب ہو گئے اور آخر تک رہے۔ اس کے برعکس بنی عبد شمس (جن میں بنی اُمیّہ تھے) اور بنی نوفل ایک دوسرے کے حلیف بنے اور بعد تک رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت میں جب قریش کے سب قبیلوں نے آپ کا مقاطعہ کیا اور شعبِ ابی طالب میں آپ کو محصور کیا تو بنی ہاشم کے ساتھ بنی المطّلب بھی اِس محصوری میں آپؐ کے ساتھ شامل ہوئے تھے، بخلاف اس کے بنی نوفل اور بنی عبد شمس نے مخالفین کا ساتھ دیا۔

عبدالمطّلب (جن کا اصل نام شَیبہ تھا اور اپنی خوبیوں کے باعث شیبۃ الحمد بھی کہلاتے تھے) مدینہ میں پرورش پا رہے تھے کہ ایک مرتبہ ثابت بن مُنذر (جو حضرت حسانؓ بن ثابت کا باپ تھا) مکّے گیا اور مطّلب سے ملا جس کے ساتھ اس کا پہلے سے میل جول تھا۔ دورانِ گفتگو میں اُس نے کہا کہ تم کہیں اپنے بھتیجے شیبہ کو دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے۔ بڑا شاندار شخصیت اور خوبرو جوان اٹھا ہے۔ یہ حالات سُن کر مطّلب بے تاب ہو گیا اور جا کر بھتیجے کو اپنے

ساتھ اُونٹ پر بٹھا کر لے آیا۔ قریش کے لوگوں نے اِس نوجوان لڑکے کو مُطّلب کے ساتھ آتے دیکھا تو کہنے لگے یہ عبدُالمطّلب (مُطّلب کا غلام) ہے۔ مُطّلب نے لوگوں کو ڈانٹا بھی کہ یہ میرے بھائی ہاشم کا لڑکا شیبہ ہے، میرا غلام نہیں ہے، مگر عبدالمطلب کا نام کچھ ایسا مشہور ہُوا کہ اصلی نام اس کے نیچے دب کر رہ گیا۔ کچھ مدّت کے بعد مُطّلب ایک تجارتی سفر کے سلسلے میں یمن گیا اور وہیں مر گیا۔ عبدالمُطّلب اُس کے جانشین ہُوئے اور سِقایہ و رِفادہ کے دونوں منصب اُن کو مِل گئے۔ ابنِ سعد اُن کی تعریف میں کہتا ہے کہ "وہ قریش میں سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ تنومند سب سے زیادہ سنجیدہ و بُردبار، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ اُن برائیوں سے دُور تھے جو مَردوں کو بگاڑنے والی ہوتی ہیں"۔ ابنِ ہشام کا قول ہے کہ "ان کو اپنی قوم میں عزّت وشَرَف کا وہ مرتبہ حاصل ہُوا جس تک اِن کے آباء میں سے کوئی نہ پہنچا تھا۔ اُن کی قوم اُن سے محبّت کرتی تھی اور لوگوں میں وہ بڑی منزلت رکھتے تھے"۔ ابنِ اثیر کا بیان ہے کہ "عبدالمطّلب بھی ماہِ رمضان میں ہر سال غارِ حِرا میں جا کر تَحَنُّث (عبادت) کیا کرتے تھے اور پُورے مہینے مساکین کو کھانا کِھلاتے رہتے تھے"۔

طبری، ابنِ اثیر اور بَلاذُری نے لکھا ہے کہ عبدالمطّلب کے چچا نَوفَل نے ہاشم کے چھوڑے ہُوئے ترکہ میں سے ایک حصّہ غصب کر لیا تھا۔ عبدالمطّلب نے پہلے قریش کے بڑے بڑے لوگوں سے شکایت کی، مگر سب نے چچا اور بھتیجے کے جھگڑے میں دخل دینے سے انکار کر دیا۔ پھر عبدالمطّلب نے اپنی ننھیال (مدینہ کے بنی عَدِی بن نجّار) کو مدد کے لیے بُلایا۔ اس پر ان کا ماموں ابو سعید بن عَدَس ۸۰ آدمی لے کر مکّہ پہنچ گیا اور اس نے زبردستی نَوفَل سے اپنے بھانجے کا حق دِلوایا۔ اس کے بعد نوفل بھی بنی ہاشم کے خلاف بنی عبدِ شمس سے مل گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ رسالت تک بنی نَوفَل اُسی جتھے میں شامل رہے جو بنی ہاشم کا مخالف اور بنی عبدِ شمس کا ساتھی تھا۔ عبدالمطّلب نے جب یہ دیکھا کہ بنی نَوفَل ان کے مخالف جتھے سے جا ملے ہیں تو انہوں نے خُزاعہ کے سرداروں سے بات چیت کی اور اُن کے ساتھ حِلف (اتّحاد و نصرتِ باہمی) کا معاہدہ کر لیا اور کعبہ میں جا کر انہوں نے باقاعدہ معاہدہ کی تحریر لکھی۔ ابنِ سعد اور بلاذری کا بیان اس سے ذرا مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ بنی خُزاعہ نے عبدالمطّلب سے خود درخواست کر کے باہمی دوستی و معاونت کا معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدہ میں بنی المطّلب اور بنی ہاشم، دونوں خاندان شریک ہُوئے اور بنی عبدِ شمس اور بنی نَوفَل اس سے الگ رہے۔ یہ معاہدہ دارالندوہ میں لکھا گیا اور کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا۔ اس کے مُطابق عبدالمطّلب نے اپنی اولاد کو وصیّت کی تھی کہ بنی خُزاعہ کے ساتھ ہمیشہ دوستی نباہنا۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ صلحِ حُدَیبیہ کے موقع پر جب شرائطِ معاہدہ میں سے ایک شرط یہ طے ہُوئی کہ قبائلِ عرب میں سے جو چاہے فریقین میں سے کسی ایک کے ساتھ شریک ہو جائے تو خُزاعہ نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔

عبدالمطلب کا زمزم کو از سرِ نو برآمد کرنا

یہ فخر بھی جناب عبدالمطلب ہی کو حاصل ہُوا کہ زمزم جسے جرہم بند کر کے اس کا نشان تک مٹا گئے تھے اُن کے ہاتھوں برآمد ہُوا۔ محمد بن اسحاق نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ خواب میں جناب عبدالمطلب کو زمزم کا مقام بتایا گیا اور انہیں ہدایت کی گئی کہ اس جگہ کو کھود کر یہ مقدس کنواں برآمد کریں۔ اُس وقت اُن کا کوئی بیٹا حارث کے سوا نہ تھا۔ اسی کو لے کر وہ کدال پھاوڑا لیے ہوئے وہاں پہنچے اور کھدائی شروع کر دی۔ جب پانی نمودار ہُوا تو عبدالمطلب نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اِس سے قریش کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ زمزم نکل آیا ہے۔ وہ سب اکٹھے ہو گئے اور کہنے لگے کہ "اے عبدالمطلب یہ تو ہمارے باپ اسماعیلؑ کا کنواں ہے اور اس میں ہمارا بھی حق ہے، ہمیں اس میں اپنے ساتھ شریک کر و" انہوں نے جواب دیا "مَیں یہ نہیں کر سکتا۔ یہ خاص طور پر مجھے دیا گیا ہے، تم میں سے کسی کو نہیں دیا گیا"۔ وہ جھگڑے پر آمادہ ہو گئے۔ عبدالمطلب نے کہا "اچھا تو کسی کو حَکم بنا لو"۔ انہوں نے بنی سعید بن ہذیم کی کاہنہ کا نام تجویز کیا جو شام کے بالائی علاقوں میں رہتی تھی۔ عبدالمطلب نے یہ بات مان لی اور اپنے چند ساتھیوں کو لے کر وہ بنی اُمیّہ اور قبائلِ قریش میں سے ہر قبیلے کے کچھ لوگوں کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک بے آب و گیاہ بیابان آیا جہاں عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں کا پانی ختم ہو گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ ہم پیاس سے مر جائیں گے۔ انہوں نے اپنے ہم سفر دوسرے اہلِ قریش سے پانی مانگا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ یہاں پانی کا دُور دُور کہیں نام و نشان نہیں ہے، ہم اگر پانی میں تمہیں شریک کریں تو ہم بھی اسی ہلاکت میں مبتلا ہو جائیں گے جس کا تمہیں خطرہ ہے۔ آخر کار عبدالمطلب نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ابھی جب تک ہاتھ پاؤں میں کچھ جان ہے۔ آؤ، ہم میں سے ہر ایک اپنے لیے ایک گڑھا کھود لے اور جو جو مرتا جائے اس کو اسی گڑھے میں دفن کیا جاتا رہے۔ چنانچہ ہر ایک نے گڑھا کھود لیا اور سب موت کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ پھر عبدالمطلب نے ساتھیوں سے کہا کہ ہم نے اپنے آپ کو یونہی موت کے حوالے کر دیا۔ آؤ ہمت کر کے چلیں، شاید کہیں ہمیں پانی مل جائے۔ یہ کہہ کر سب کوچ کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ جب عبدالمطلب نے اپنے اُونٹ کو اٹھایا اور اس کا پاؤں زمین پر پڑا تو یکایک اس کے نیچے سے میٹھے پانی کا ایک چشمہ نکل آیا۔ اس پر عبدالمطلب اور ان کے ساتھیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اُتر کر خوب پانی پیا اور اپنے مشکیزے پانی سے بھر لیے۔ پھر عبدالمطلب نے اُن دوسرے اہلِ قریش کو جنہوں نے پانی دینے سے انکار کیا تھا، پکارا اور کہا آؤ، اللہ نے ہمیں پانی دے دیا ہے، تم بھی پیو اور پانی بھر لو۔ چنانچہ وہ آئے، سب پانی سے سیراب ہوئے اور پھر کہا کہ "اے عبدالمطلب، خدا ہی نے ہمارے خلاف تمہارے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ خدا کی قسم اب ہم زمزم کے معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں گے جس خدا نے تمہیں اس بیابان میں پانی دیا ہے اُسی خدا نے زمزم بھی تمہیں عطا کیا ہے۔ اب اپنے پانی کی طرف بخیر و خوبی

واپس چلو۔ اِس طرح سب اُس کاہنہ کے پاس جانے کے بجائے بیچ ہی سے واپس ہو گئے۔

یہ سقایہ کا منصب، جس میں اب سب سے اہم زمزم کی سقایت تھی، زندگی بھر عبدالمطلب کے پاس رہا۔ ان کے بعد یہ ان کے بیٹے ابوطالب کو ملا۔ مگر ابوطالب اپنی فیاضی کے باعث اپنی مالی استطاعت سے بہت بڑھ کر حاجیوں کو پانی، شربت، دودھ وغیرہ پلانے میں خرچ کرنے لگے، جس کی وجہ سے انہیں کئی مرتبہ اپنے بھائی عباس سے قرض لینا پڑا اور اُسے ادا نہ کر سکے۔ آخر کار حضرت عباس نے شرط لگائی کہ اب اگر آپ ادا نہ کر سکیں گے تو سقایت کا منصب آپ کو میرے لیے چھوڑ دینا ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ سقایت حضرت عباس کو مل گئی۔ یہ زمانۂ قبلِ اسلام کی بات ہے۔ زمانۂ اسلام میں بھی یہ منصب بنی عباس ہی میں رہا۔

عبداللہ بن عبدالمطلب

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ زمزم کی کھدائی کے وقت جب عبدالمطلب نے دیکھا کہ ان کے ساتھ صرف ان کا ایک بیٹا ہے اور قریش سارے گھیر کر آگئے ہیں، تو انہوں نے نذر مانی کہ اللہ مجھے دس بیٹے عطا کرے جو میری حمایت کے لیے کھڑے ہو سکیں، تو ان میں سے ایک کو کعبہ کے پاس اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گا۔ اللہ نے ان کی یہ دعا پوری کی اور ۱۰ بیٹے ان کو دے دیے اور وہ جوانی کی عمر کو پہنچ گئے۔ آخر کار ایک روز عبدالمطلب نے سب کو جمع کیا اور اپنی نذر کا ان سے ذکر کیا۔ سب نے کہا اللہ سے جو نذر آپ نے مانی ہے اُسے پورا کیجیے۔ اس پر عبدالمطلب سب بیٹوں کو لے کر کعبہ میں ہُبَل نامی بُت کے پاس گئے جہاں فال نکالی جاتی تھی،[1] اور فال اس بات کے لیے نکلوائی کہ ان دس میں سے کس بیٹے کو قربان کریں۔ اس میں نام جناب عبداللہ کا نکلا جو عبدالمطلب کے سب سے خوبصورت اور باپ کے سب سے زیادہ پیارے بیٹے تھے۔[2] عبدالمطلب بلا تکلف عبداللہ کا ہاتھ پکڑ کر اور

---

[1] ابن ہشام نے اس کا بڑا دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ کعبہ میں ہُبَل کا بُت اُس کنوئیں پر نصب تھا جس میں کعبہ کے لیے نذر کیے ہوئے ہدایا رکھے جاتے تھے۔ اُس کے پاس سات قِداح (پانسے یا فال نکالنے کے تیر) رکھے رہتے تھے جن پر مخصوص الفاظ لکھے ہوتے تھے اور ان کے ذریعہ سے فال نکالی جاتی تھی۔ فال نکلوانے والا صاحبِ القداح کے پاس جاتا، ۱۰۰ درہم اور ایک اونٹ نذر کرتا اور جس مقصد کے لیے فال نکلوانا چاہتا وہ بیان کرتا۔ صاحبِ القداح جب پانسے ڈالنے لگتا تو وہ شخص دعا مانگتا کہ اے ہمارے معبود، یہ فلاں بن فلاں تجھ سے فیصلہ چاہتا ہے اس لیے اس کے حق میں جو ٹھیک بات ہو اس کا فیصلہ کر دے۔ عبدالمطلب نے بھی اسی طریقے کے مطابق فال نکلوائی تھی۔ (حاشیہ از مرتب)

[2] یہ بات بعض سیرت نگاروں نے غلط لکھی ہے کہ جناب عبداللہ عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ سُہیلی نے لکھا ہے کہ ان سے بہت چھوٹے حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ تھے۔ حضرت حمزہؓ کی عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً

چھری لے کر اساف و نائلہ کی طرف لے چلے تاکہ وہاں اُن کو ذبح کردیں۔ قریش کے لوگ یہ دیکھ کر اپنی اپنی مجلسوں سے دوڑ پڑے اور کہنے لگے "عبدالمطلب، یہ کیا کرتے ہو، اگر تم نے ایسا کیا تو آئے دن کوئی نہ کوئی اپنے بیٹے کو لاکر ذبح کرنے لگے گا۔ چلو، حجاز کی فلاں عرّافہ (سیانی) کے پاس چلو، اور جو وہ کہے وہی کرو، ممکن ہے کہ وہ اِس مشکل کا کوئی حل بتادے" اِس تجویز کے مطابق یہ لوگ مدینے پہنچے اور وہاں معلوم ہُوا کہ وہ آج کل خیبر میں ہے۔ وہاں جاکر اس سے ماجرا بیان کیا۔ اس نے کہا تمہارے ہاں آدمی کی دیّت کیا ہوتی ہے؟ لوگوں نے کہا ۱۰ اونٹ۔ وہ بولی واپس جاؤ اور اب فال اس بات پر نکالو کہ عبداللہ کو قربان کیا جائے یا دس اونٹوں کو، اگر پھر لڑکے کے نام کی فال نکلے تو دس اُونٹ اَور بڑھاؤ اور پھر فال نکالو۔ اس طرح دس دس اونٹ بڑھا بڑھا کر فال نکالتے چلے جاؤ جب اُونٹوں پر فال نکل آئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تمہارا رب بیٹے کے بجائے اتنے اونٹوں کی قربانی پر راضی ہے۔ عرّافہ کی یہ بات قبول کر کے سب لوگ پلٹے اور فال نکالنی شروع کی۔ ۱۰۔ ۲۰۔ ۳۰ حتیٰ کہ ۹۰ تک فال عبداللہ ہی کے نام کی نکلتی رہی۔ آخر ۱۰۰ اونٹ پر پہنچ کر فال اونٹوں پر نکلی۔ قریش کے لوگوں نے کہا اب تو تمہارے رب کی رضا معلوم ہوگئی عبداللہ کو چھوڑ کر اونٹ ذبح کر دو۔ مگر عبدالمطّلب نہ مانے اور انہوں نے کہا کہ میں تین دفعہ فال نکلواؤں گا۔ چنانچہ تین مرتبہ پانسہ ڈالا گیا اور ہر مرتبہ اونٹوں ہی پر پانسہ پڑا۔ تب عبدالمطّلب نے ۱۰۰ اونٹ ذبح کیے اور اذنِ عام دے دیا کہ آدمی، جانور، حتیٰ کہ درندے بھی جتنا چاہیں گوشت لے لیں۔

اس طرح ایک مرتبہ پھر آلِ ابراہیمؑ میں قربانی کا وہ واقعہ دُہرایا گیا جو مکّہ میں اِس مبارک خاندان کی آبادی کے آغاز کے موقع پر پیش آیا تھا۔ اگرچہ رُوح اور معنی کے اعتبار سے دونوں واقعات میں بڑا فرق ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے کارخانے کی حکمتیں عجیب ہیں۔ پہلے اِس خاندان کے اُس فردِ اوّل کی قربانی کسی اور طرح مانگی گئی تھی جسے عرب میں دینِ اسلام کی دعوت کا آغاز کرنا تھا۔ اب اُس آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے والد کی قربانی

۳۔ سال زیادہ تھی۔ اور حضرت عباس آپؐ سے عمر میں تین سال بڑے تھے۔ حضرت عباس کی اپنی روایت یہ ہے کہ جب حضورؐ پیدا ہوتے تو میں تین سال کا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ گھر کی عورتیں مجھے حضورؐ کے پاس لائیں اور کہا "بھائی کو پیار کرو"۔ چنانچہ میں نے آپ کو پیار کیا۔ روض الاُنُف۔ (حاشیہ از مؤلف)

[1] سُہیلی نے اس عورت کا نام قُطْبیہ لکھا ہے اور وہ مدینے کے پاس حجر نامی بستی میں رہتی تھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] اس سے معلوم ہُوا کہ عرب میں پہلے آدمی کی دیّت ۱۰ اُونٹ تھی۔ اس واقعہ کے بعد اہلِ عرب نے ۱۰۰ اُونٹ ہی کو مستقل طور پر آدمی کا خونبہا قرار دے دیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

کسی اور طرح مانگی گئی جسے تمام عالمِ انسانی میں اُسی دعوت کو پھیلانا تھا پہلی قربانی کا فدیہ ایک مینڈھا تھا، اور دوسری کا فدیہ ۱۰۰ اونٹ۔

جناب عبداللہ کی شادی

جناب عبداللہ ۲۵ سال کے تھے جب ان کے والد نے ان کی شادی بنی زُہرہ بن کلاب کے سردار وہب بن عبدِمناف کی صاحبزادی آمنہ خاتون سے کر دی، جو اپنی قوم کی بہترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ چند مہینے کی ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد جب کہ بی بی آمنہ حاملہ تھیں، وہ ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ فلسطین کے شہر غزّہ گئے۔ وہاں سے پلٹ کر جب مدینہ پہنچے تو بیمار ہو گئے۔ ساتھیوں سے کہا کہ تم مکّہ واپس جاؤ اور میں اپنی دادی کے خاندان بنی عدی بن نجار میں ٹھیرتا ہوں۔ ایک مہینہ وہاں ٹھیرے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور دارالنابغۃ الجعدی میں دفن کر دیے گئے۔ ساتھیوں نے مکّہ پہنچ کر جب عبدالمطّلب کو ان کی بیماری کا حال سُنایا تو انہوں نے فوراً اپنے بڑے بیٹے حارث کو مدینے بھیجا۔ مگر اس کے پہنچنے سے پہلے جناب عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔

یہ صحیح ترین روایت ہے جسے عموماً اہلِ علم نے تسلیم کیا ہے۔ ورنہ کسی روایت میں یہ ہے کہ ان کا انتقال اُس وقت ہُوا جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ۲۸ مہینے کے تھے۔ کسی میں سات مہینے، اور کسی میں دو مہینے بھی بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن مُعتبر اور مُسَلّم یہی ہے کہ حضُور ابھی بطنِ مادر ہی میں تھے کہ آپؐ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ اِسی چیز کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے کہ:

اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ۝

"اُسے نبی، کیا ہم نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا؟" (۹)

فہرست حوالہ جات باب (۲)

۱ — اضافہ از مؤلف

۲ — تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۲۳ -

۳ — اضافہ از مؤلف

۴ — تفہیم القرآن، جلد چہارم، الصّٰفّٰت، حاشیہ ۶۰ -

۵ — خطبات، صفحات ۲۶۵ تا ۲۶۶ -

۶ تفہیم القرآن، جلد اوّل، المائدہ، حاشیہ ۱۱۳ -

۷ اضافہ از مؤلف

۸ تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سُورۂ قریش -

۹ اضافہ از مؤلف

باب (۳)

پیدائش سے آغازِ نبوّت تک

ولادتِ مبارکہ

آخرکار وہ وقت آپہنچا جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذرّیت کے ایک حصّہ کو مکّہ کی بے آب و گیاہ وادی میں لاکر بسایا تھا اور جس کے لیے خانۂ کعبہ کی تعمیر کے وقت انہوں نے اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ نے دُعا مانگی تھی کہ:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۔ (البقرہ ۔۱۲۹)

"اے ہمارے رب، اور تو ان لوگوں میں خود انہی کی قوم سے ایک ایسا رسُول اُٹھائیو جو انہیں تیری آیات سُنائے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔"

اِس مبارک ساعت کے آنے سے تھوڑی مدّت پہلے اَبرہہ ۶۰ ہزار فوج لے کر اپنی تقدیر سے لڑنے آیا تھا مگر وہ ۶۰ ہزار نہیں، ۶۰ لاکھ بھی لاتا تو اس کا وہی انجام ہوتا جو ہُوا۔ جہاں اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا منصُوبہ کام کر رہا ہو کہ اس مقام پر وہ ہستی وجود میں لائی جائے جو دنیا کی تاریخ بدل ڈالنے والی تھی، جو تمام نبوّتوں کی آخری اور سب سے بڑی نبوّت تھی اور جس کے لیے ڈھائی ہزار برس پہلے سے تیاری کی جا رہی تھی، وہاں کوئی بڑی سے بڑی انسانی طاقت بھی اللہ کی طاقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

محدّثین اور مؤرّخین کا اِس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ اصحاب الفیل کا واقعہ (یعنی مکّہ پر اَبرہہ کا حملہ) مُحرّم میں پیش آیا تھا اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیدائش ربیع الاوّل میں ہُوئی۔ ولادت پیر کے روز ہُوئی تھی، یہ بات خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک اعرابی کے سوال پر بیان فرمائی ہے (صحیح مسلم بروایت قتادہ)۔ ربیع الاوّل کی تاریخ کون سی تھی؟ اِس میں اختلاف ہے۔ لیکن ابن ابی شیبہ نے حضرت عبد اللہ بن عبّاس اور حضرت جابر بن عبد اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آپ ۱۲ ربیع الاوّل کو پیدا ہُوئے تھے۔ اِسی کی تصریح محمد بن اسحاق

نے کی ہے اور جمہور اہلِ علم میں یہی تاریخ مشہور ہے۔ واقعۂ فیل اور حضورؐ کی پیدائش میں فصل کتنا تھا؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ مگر مشہور ترین قول یہ ہے کہ آپؐ اس واقعہ کے ۵۰ دن بعد پیدا ہوئے۔ شمسی اور قمری مہینوں اور سالوں کے درمیان مطابقت ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اس لیے قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ پیدائش کا شمسی سال اور مہینہ کونسا تھا۔ عموماً آپؐ کا سنہ پیدائش سنہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء بیان کیا جاتا ہے۔ سُہَیلی نے روض الانف میں ۲۰ اپریل (نیسان) تاریخ بتائی ہے، مگر سال کا ذکر نہیں کیا۔ بعض اہلِ تحقیق نے اسے ۲۳ اپریل ۵۷۱ء کے مطابق قرار دیا ہے۔ محمود پاشا فلکی نے ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تاریخ ولادت قرار دی ہے اور اسے ۹ ربیع الاول بروز دوشنبہ کے مطابق بتایا ہے۔ کوسان ورپرسفال (Caussin De Perceval) اپنی کتاب تاریخ عرب میں ۲۰ اگست ۵۷۰ء تاریخ پیدائش متعین کرتا ہے۔ حِتّی (Hitti) کہتا ہے کہ آپؐ ۵۷۱ء یا اس کے لگ بھگ زمانے میں پیدا ہوئے۔ اور بعض مستشرقین ۲ سال پیچھے جا کر ۵۶۹ء آپؐ کا سال پیدائش بیان کرتے ہیں۔ ولادت مبارکہ کا وقت معتبر روایات میں صبح صادق بیان کیا گیا ہے۔

بشارات اور اسمِ گرامی

معتبر روایات میں آیا ہے کہ زمانۂ حمل میں بی بی آمنہ نے خواب میں دیکھا کہ ان کے اندر سے ایک نُور نکلا ہے جس سے شام کے محلات تک روشن ہو گئے ہیں۔ ایک اور مرتبہ خواب میں ان سے کہا گیا کہ تمہارے پیٹ میں اس اُمت کا سردار ہے، جب وہ پیدا ہو تو اس کا نام محمدؐ رکھنا۔ ابنِ سعد نے ایک روایت نقل کی ہے کہ خواب میں آپؐ کا نام احمدؐ رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی[1]۔ ممکن ہے کہ یہ دونام دو مختلف خوابوں میں بتائے گئے ہوں، کیونکہ

---

[1] لفظ محمدؐ تو پہلے بھی عرب میں شاذ و نادر بعض لوگوں کا نام تھا، مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ پہلے کسی کا نام احمد ہو۔ اس کی وجہ جس کو ہم نے تفہیم القرآن جلد پنجم، سورۂ صف، حاشیہ ۸ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ ہے کہ اہلِ کتاب کے ذریعے اہلِ عرب کو کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ ایک نبی اور آنے والا ہے جس کا نام محمدؐ ہو گا اور وہ بنی اسماعیل میں سے ہو گا۔ یہ باتیں سُن کر پچھلے بعض لوگوں نے اپنے بیٹوں کے نام محمدؐ رکھے تھے تاکہ شاید وہی نبی ہو جائے۔ قاضی عیاض نے ایسے لوگوں کی تعداد جن کے نام حضورؐ سے پہلے محمدؐ تھے ۶ بتائی ہے، ابن خالویہ اور سُہیلی نے تین، اور عبدان المروزی نے چار، لیکن حافظ ابنِ حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ میں نے تلاش و جستجو سے ۱۵ ایسے اشخاص کے نام معلوم کیے ہیں۔ پھر اصابہ میں انہوں نے بتایا ہے کہ ان میں سے بعض نے حضورؐ کا زمانہ پایا اور اسلام بھی قبول کیا۔ محمد بن عدی بن ربیعہ کے حالات میں وہ لکھتے ہیں کہ ان سے پُوچھا گیا کہ جاہلیت میں آپ کے والد نے آپ کا نام محمدؐ کیسے رکھ دیا؟ انہوں نے کہا کہ ہم شام میں سفر کر رہے تھے۔ ایک دَیر (عیسائی خانقاہ) پر پہنچے تو صاحبِ دَیر نے کہا کہ تمہاری قوم میں ایک نبی آنے والا ہے جو آخری نبی ہو گا۔ ہم نے پُوچھا کہ اس کا نام کیا ہو گا۔ اس نے کہا محمدؐ۔ اس کے بعد ہمارے ہاں جو لڑکا بھی پیدا ہوا اس کا نام محمدؐ رکھا گیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

حضورؐ کے یہ دونوں ہی نام احادیث سے ثابت ہیں۔ بکثرت روایات میں بی بی آمنہ کا یہ بیان بھی نقل ہوا ہے کہ جب آپؐ پیدا ہوئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے اندر سے ایک نور نکلا ہے جس سے مشرق و مغرب روشن ہوگئے ہیں۔ بیہقی اور ابن عبدالبر نے عثمان بن ابی العاص الثقفی کی ماں کا بیان نقل کیا ہے کہ حضورؐ کی ولادت کے وقت وہ بی بی آمنہ کے پاس موجود تھی، اُس وقت جدھر نظر جاتی تھی نور ہی نور نظر آتا تھا۔ ولادت کے وقت دایہ کی خدمت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی والدہ شفاء بنت عوف بن عبدالحارث زُہری نے انجام دی۔

پیدائش کے ساتویں روز جناب عبدالمطلب نے آپؐ کا عقیقہ[1] کیا اور قریش کے لوگوں کو کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کے بعد لوگوں نے پوچھا "اے عبدالمطلب، آپ نے اپنے جس بیٹے کے لیے ہماری یہ ضیافت کی ہے اس کا نام کیا رکھا ہے؟" انہوں نے کہا میں نے اس کا نام محمدؐ رکھا ہے۔ لوگ کہنے لگے آپ نے اپنے خاندان کے مروجہ لوگوں کے ناموں سے مختلف نام کیسے رکھ دیا؟ عبدالمطلب نے کہا میں چاہتا ہوں کہ آسمان میں اللہ اور زمین میں خلق اس کی تعریف کرے۔

غربت سے زندگی کی ابتدا

جناب عبداللہ شادی کے وقت نوجوان ہی تھے اور اپنے کاروبار کی انہوں نے ابتدا ہی کی تھی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ اس لیے وہ اپنے یتیم بچے اور اپنی بیوہ کے لیے کوئی بڑی دولت چھوڑ کر نہ جا سکے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ انہوں نے پانچ اُونٹ، بکریوں کا ایک ریوڑ، اور ایک لونڈی ترکہ میں چھوڑی[2] تھی۔ لونڈی وہی اُمّ ایمنؓ تھیں جنہوں نے بڑی محبت سے حضورؐ کو پالا۔ ان کا اصل نام برکہ تھا اور حبشی الاصل تھیں۔ بعد میں حضورؐ نے ان کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہؓ سے کیا جن سے اُسامہؓ بن زیدؓ پیدا ہوئے۔

حیاتِ طیبہ کی اسی غریبانہ زندگی کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے کہ:

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنَىٰ (الضحیٰ۔ ۸)

"اور اللہ نے تم کو غریب پایا پھر غنی کر دیا۔"

رضاعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً چند روز تک ابولہب کی لونڈی ثُوَیبہ کا دودھ پیا۔ بخاری و مسلم میں ہے کہ اُسی کا دودھ حضرت ابوسلمہؓ (اُمّ المومنین اُمّ سلمہؓ کے پہلے شوہر) نے بھی پیا تھا۔ ابن سعد اور ابن ہشام

---

[1] یہ عقیقہ بھی بقایائے دین ابراہیمی میں سے تھا جو زمانۂ جاہلیت میں بھی اہل عرب کے ہاں جاری رہا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] ایک روایت یہ بھی ہے کہ ترکہ میں صرف ایک اونٹ تھا اور ایک لونڈی۔ (حاشیہ از مؤلف)

کا بیان ہے کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن جحش (اُمّ المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی) نے بھی اُسی کا دُودھ پیا تھا۔ اس لیے یہ حضرات حضورؐ کے رضاعی بھائی تھے۔ اسی خدمت کے صلہ میں حضورؐ جوان ہونے کے بعد ہمیشہ ثُوَیبَہ کے ساتھ حُسنِ سلوک فرماتے رہتے تھے اور حضورؐ کی شادی ہونے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی اس کی تکریم اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرتی تھیں۔ پھر حضرت خدیجہ نے چاہا کہ اسے خرید کر آزاد کر دیں مگر ابولہب نے انکار کیا بعد میں اس نے خود ہی اُسے آزاد کر دیا۔ ہجرت کے بعد بھی آپؐ مدینہ سے اس کے لیے کپڑا اور خرچ بھیجا کرتے تھے۔ سنہ ۷ھ میں آپؐ کو اس کی وفات کی خبر ملی تو آپؐ نے اس کے بیٹے مَسرُوح کا حال دریافت کیا جس نے آپؐ کے ساتھ اس کا دودھ پیا تھا۔ معلوم ہُوا کہ وہ بھی مر گیا اور اس کا دنیا میں کوئی باقی نہ رہا۔

حلیمہ سعدیہ

شُرفائے مکہ کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کو دُودھ پلانے کے لیے صحرائی علاقوں کے اچھے قبائل میں بھیج دیتے تھے تاکہ عمدہ آب و ہوا میں پرورش پائیں اور خالص عربی بھی سیکھ لیں۔ اس غرض کے لیے باہر کے قبیلوں کی عورتیں وقتاً فوقتاً مکّہ آتی تھیں اور سرداروں کے بچّے لے جاتی تھیں جن سے ان کو معقول معاوضے ملتے تھے اور بعد میں بھی حُسنِ سلوک کی توقع ہوتی تھی۔ اسی سلسلہ میں حضورؐ کی ولادت کے کچھ مدّت بعد بنی سَعد بن بَکر (قبیلہ ہَوازِن کی ایک شاخ) کی کچھ عورتیں بچّے لینے کے لیے مکہ گئیں جن میں حلیمہ بنت ابی ذُؤیب بھی اپنے شوہر حارِث بن عبداللہ کے ساتھ شامل تھیں۔ ابن ہشام نے حلیمہ کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ ہم بہت خستہ حال تھے۔ ہمارا علاقہ قحط زدہ تھا۔ دوسری عورتوں کی بہ نسبت ہماری حالت زیادہ ہی خراب تھی۔ ہماری گدھی اس قدر کمزور تھی کہ قافلے کے پیچھے رہ جاتی تھی۔ ہماری اُونٹنی بھی ذرا دُودھ نہ دیتی تھی۔ میری چھاتیوں میں بھی دُودھ اتنا کم تھا کہ میرے بچّے کا پیٹ نہ بھر سکتا تھا۔ رات بھر روتا رہتا تھا اور ہم بھی نہ سو سکتے تھے۔ مکہ پہنچے تو کوئی عورت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لینے پر راضی نہ ہُوئی۔ ہر ایک کہتی تھی کہ یتیم ہے۔ باپ ہوتا تو ہم اس سے کچھ حُسنِ سلوک کی امید رکھتے۔ بیوہ ماں اور دادا سے معلوم نہیں کچھ ملے یا نہ ملے۔ دوسری سب عورتوں نے دوسرے بچّے لے لیے اور مجھے کوئی بچّہ نہ ملا۔ جب سب واپس چلنے کے لیے تیار ہوئیں تو میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں خالی ہاتھ جانا پسند نہیں کرتی۔ جا کر اُسی یتیم بچّے کو لیے لیتی ہُوں۔ شوہر نے کہا کیا مضائقہ ہے اگر تُو ایسا کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اُسی میں ہمیں برکت دے دے۔ چنانچہ میں گئی اور صرف اس لیے اُس بچّے کو لے لیا کہ کوئی اور بچّہ مجھے نہ ملا تھا۔ اپنے پڑاؤ پر پہنچ کر اُس بچّے کے مُنہ میں اپنی چھاتی دی تو اتنا دُودھ اُترا کہ وہ بھی سیر ہو گیا اور اُس کے دُودھ شریک بھائی نے بھی (جس کا نام عبداللہ تھا) خُوب پیٹ بھر کر پی لیا۔ پھر میرے شوہر نے اونٹنی کا دُودھ نچوڑنا شروع کیا تو اُس نے اتنا دُودھ دیا کہ ہم دونوں اچھی طرح سیر ہو گئے اور رات ہم نے بڑے آرام سے گزاری۔ صبح میرے شوہر نے کہا خدا کی قسم، حلیمہ، تُو نے تو بڑا ہی

مُبارک بچّہ لیا ہے۔

حلیمہ کہتی ہیں کہ واپسی کے سفر میں ہماری گدھی کی شان ہی کچھ اور تھی۔ قافلے کے سارے گدھوں کو اُس نے پیچھے چھوڑ دیا۔ میری ساتھی عورتیں کہنے لگیں کہ حلیمہ، کیا یہ تیری وہی گدھی ہے جس پر تو ہمارے ساتھ آئی تھی؟ میں نے کہا ہاں۔ وہ بولیں، واللہ، اس کی تو حالت ہی بدلی ہوئی ہے۔ ہم وطن واپس پہنچے تو زمین پر شاید ہی کوئی علاقہ اُس وقت اتنا اُجاڑ ہو جتنا ہمارا تھا مگر میری بکریاں جہاں جاتیں پیٹ بھر کر چارہ کھاتیں اور خوب دُودھ دیتیں۔ اِس طرح ہم روز بروز اُس بچّے کی برکتیں زیادہ ہی دیکھتے رہے۔ دو سال گزرے اور دُودھ چھڑانے کا وقت آیا تو وہ بچّہ سارے قبیلے کے بچّوں سے زیادہ تندرست و توانا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے چار برس کا ہو۔ ہم اسے مکّہ اس کی ماں کے پاس واپس لے گئے، مگر ہمارا جی چاہتا تھا کہ وہ ہمارے پاس کچھ مدّت اور رہے۔ میں نے اُس کی ماں سے کہا کہ میرے اس بیٹے کو میرے پاس ابھی اور رہنے دو تاکہ یہ خوب پل کر تنومند ہو جائے، مجھے اندیشہ ہے کہ مکّہ کی خراب آب و ہوا اس کی صحت پر بُرا اثر نہ ڈالے۔ غرض میں نے اتنا اصرار کیا کہ وہ اسے پھر میرے ساتھ بھیجنے پر راضی ہو گئیں۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ اس طرح حضورؐ دو سال اور حلیمہؓ کے ہاں رہے۔ مگر ابنِ اسحاق کی روایت اس سے مختلف ہے جو ہم آگے نقل کرتے ہیں۔

شقِ صدر

حلیمہ کا بیان ہے کہ واپس آکر ہم ابھی دو تین ہی مہینے رہے تھے کہ ایک روز وہ بچّہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ ہمارے گھروں کے پیچھے ہماری بکریوں میں تھا۔ اتنے میں اُس کا بھائی دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ میرے اُس قریشی بھائی کے پاس دو سفید پوش آدمی آئے اور انہوں نے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔ میں اور میرا شوہر دونوں بھاگتے ہوئے گئے تو دیکھا کہ وہ بچہ کھڑا ہے اور اُس کا رنگ فق ہے۔ اُس کے باپ نے اُسے چمٹا لیا اور پوچھا بیٹا تجھے کیا ہو گیا؟ اُس نے کہا دو آدمی سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے۔ مجھے لٹا کر میرا پیٹ چاک کیا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر پھینک دی اور پیٹ کو پھر ویسا ہی کر دیا جیسا وہ تھا۔ دوسری روایت میں یہ ہے کہ وہ میرے پیٹ میں کوئی چیز تلاش کرتے رہے، معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی؟[1] حلیمہ کہتی ہیں کہ ہم اُسے گھر واپس لاتے تو میرے شوہر نے کہا، حلیمہ، مجھے ڈر ہے کہ اس بچّے کو کچھ ہو نہ جائے، بہتر یہی ہے کہ اسے اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ ہم اسے

---

[1] واضح رہے کہ یہ شقِ صدر کا واقعہ اسرارِ الٰہی میں سے ہے جس کی کُنہ کو انسان نہیں پہنچ سکتا۔ انبیاء علیہم السّلام کے ساتھ ایسے عجیب واقعات بے شمار پیش آتے ہیں جن کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ لیکن توجیہ کا ممکن نہ ہونا اس کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ان کا انکار کر دیا جائے۔ (حاشیہ از مؤلف)

اُس کی ماں کے پاس گھر لے گئے۔ انہوں نے کہا "انّا، تم کیسے اِس کو واپس لے آئیں، تم تو اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے بڑی حریص تھیں؟" میں نے کہا "اللہ نے اب بچّے کو خوب پال کر بڑا کر دیا ہے اور میری جو ذمہ داری تھی وہ میں نے پوری کر دی ہے۔ اب مجھے اندیشہ ہے کہ اسے کچھ حوادث پیش نہ آ جائیں"۔ بی بی آمنہ نے کہا "اصل بات کیا ہے، مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ"۔ حلیمہؓ نے ان کے اصرار پر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ انہوں نے کہا "کیا تمہیں اس بچّے کے معاملہ میں شیطان کا خوف ہے؟" حلیمہؓ نے کہا "ہاں"۔ انہوں نے کہا "خدا کی قسم، شیطان کے لیے اس پر کوئی راہ نہیں، میرے اِس بچّے کی بڑی شان ہے"۔ پھر بی بی آمنہ نے حلیمہؓ کو زمانۂ حمل کے واقعات اور پیدائش کے وقت کے حالات بتائے۔

بچپن میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اِس قیامِ صحرا کی وجہ سے آپ کی عربی زبان نہایت فصیح ہو گئی تھی، کیونکہ آپ قریشی تھے اور بنی سعد میں آپ نے بچپن گزارا تھا جن کی زبان ٹھیٹھ عربی تھی۔ اِسی بنا پر آپ فرمایا کرتے تھے:

اَنَا اَعْرَبُکُمْ، انا قرشی و استرضعت فی بنی سعد بن بکر۔

"میں تم میں سب سے زیادہ عربی داں ہوں، میں قریشی ہوں اور بنی سعد بن بکر میں میری رضاعت کا زمانہ گزرا ہے"۔

حلیمہ کے ساتھ بھی ثُویبہ کی طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہمیشہ نہایت محبت اور احسان کا برتاؤ فرماتے رہے۔ حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کی شادی ہونے کے بعد ایک مرتبہ وہ آئیں اور انہوں نے شکایت کی کہ ہمارے علاقہ میں سخت قحط ہے اور مویشی مر گئے ہیں۔ آپؐ نے ان کو ۴۰ بکریاں اور سامان سے لدا ہُوا ایک اونٹ مرحمت فرمایا۔ ابن سعد نے محمد بن منکدر کی روایت نقل کی ہے کہ ایک عورت نے حضورؐ کے پاس حاضر ہونے کی اجازت مانگی جس نے بچپن میں آپ کو دُودھ پلایا تھا۔ وہ آئی تو آپؐ میری ماں، میری ماں کہتے ہُوئے اُٹھے اور اپنی چادر بچھا کر اسے بٹھایا۔ فتح مکہ کے موقع پر حلیمہ کی بہن حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہُوئی اور آپؐ کو حلیمہ کے انتقال کی خبر دی تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ پھر آپؐ نے اس کو دو سو درہم اور کپڑے دیے اور سواری کے لیے کجاوے سمیت ایک اونٹ عطا فرمایا۔ غزوۂ ہوازن کے موقع پر جو لوگ قید ہو کر آئے تھے ان میں حلیمہ کی وہ لڑکی شیماؓ بھی شامل تھی جو بچپن میں حضورؐ کو گود میں لیے پھرتی تھی۔ آپؐ نے اسے پہچان لیا، بہت مہربانی کے ساتھ اس سے پیش آئے اور عزّت کے ساتھ اس کے خاندان والوں کے پاس بھیج دیا۔ ہوازن کے وفد نے جب آپؐ سے رحم کی درخواست کی اور کہا کہ ان قیدیوں میں آپؐ کی خالائیں بھی ہیں، آپؐ کی انّائیں بھی ہیں جنہوں نے بچپن میں آپؐ کو گودوں میں کھلایا ہے تو آپؐ نے فرمایا جو میرا اور بنی عبدالمطلب کا حصّہ ہے وہ میں نے چھوڑا۔ انصار

نے کہا جو ہمارا حصہ ہے وہ ہم نے اللہ اور رسُول کے لیے چھوڑ دیا۔ اس طرح ۶ ہزار قیدی رہا کر دیے گئے اور جو مال ان کو واپس دیا گیا اس کی قیمت ۵ کروڑ درہم تھی۔ حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی اِس خاندان کا خاص لحاظ رکھتے اور اس سے حُسنِ سلوک اور تکریم کے ساتھ پیش آتے رہے۔[1]

والدہ ماجدہ کا انتقال

ابن سعد اور ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ آپؐ ۶ سال کے تھے، اور ابنِ حزم اور ابن القیم کا بیان ہے کہ ابھی آپؐ کا ساتواں سال پُورا نہ ہُوا تھا کہ بی بی آمنہ آپؐ کی پردادی (جناب عبدالمطلب کی والدہ) کے خاندان بنی عدی بن نجّار سے ملانے کے لیے آپؐ کو اُمّ ایمن کے ساتھ مدینے لے گئیں اور ایک مہینہ وہاں رہیں۔ انہوں نے وہ مکان آپؐ کو دکھایا جہاں آپؐ کے والد جناب عبداللہ کا انتقال ہُوا تھا، وہ جگہ دکھائی جہاں وہ مدفون تھے۔ اِس سفر کے واقعات آپؐ کو بعد میں اچھی طرح یاد رہے۔ ہجرت کے بعد جب آپؐ مدینہ تشریف لے گئے تو آپؐ اپنے اصحاب کو اس پہلے سفرِ مدینہ کے حالات سناتے تھے جو آپؐ نے اِس چھوٹی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ کیا تھا۔ بنی عدی بن نجّار کی گڑھی کو دیکھ کر آپؐ فوراً اسے پہچان گئے۔ فرمایا یہاں میں انصار کی ایک لڑکی اُنَیسہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور اپنے دادا کی ننھیال کے لڑکوں کے ساتھ یہاں اُترنے والے پرندوں کو اُڑایا کرتا تھا۔ دارُ النّابغہ کو دیکھ کر فرمایا یہاں مَیں اپنی والدہ کے ساتھ اُترا تھا اور اسی گھر میں میرے والد کی قبر ہے۔ مَیں نے بنی عدی بن نجّار کے کنویں میں تیراکی کی خوب مشق کر لی تھی۔

اس کے بعد جب آپؐ کی والدہ صاحبہ آپؐ کو لے کر مکہ روانہ ہوئیں تو ابواء کے مقام پر ان کا انتقال ہو گیا اور وہیں وہ دفن ہُوئیں۔ اُمّ ایمن حضورؐ کو لے کر مکہ واپس پہنچیں۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضورؐ کو وہ جگہ بھی یاد تھی جہاں آپؐ کی والدہ دفن ہُوئی تھیں۔ چنانچہ عُمرۂ حُدَیبیہ کے موقع پر جب آپؐ ابواء پر سے گزرے

---

[1] حلیمہ کے متعلق ابن کثیر کا بیان ہے کہ حضورؐ کی بعثت سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ مگر استیعاب میں ابن عبدالبر نے عطاء بن یسار کی روایت درج کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعی ماں حلیمہ جنگِ حنین کے موقع پر آئیں تو حضورؐ ان کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور اپنی چادر بچھا کر انہیں اس پر بٹھایا۔ نیز انہوں نے لکھا ہے کہ حلیمہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہے، اور اُن سے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے روایت نقل کی ہے۔ حافظ ابو یعلیٰ اور ابن حبّان نے عبداللہ بن جعفرؓ کے حوالہ سے حلیمہ کی روایت بیان کی ہے۔ اِصابہ میں حافظ ابن حجرؒ نے حلیمہ کے شوہر حارث کے متعلق ابن اسحٰق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ مکہ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لائے۔ مگر ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ حارث کے بیٹے عبداللہ کا قصہ ہے جو حضورؐ کے رضاعی بھائی تھے۔ اِصابہ میں شیماء کے متعلق بھی ابن حجرؒ نے تصریح کی ہے کہ وہ مسلمان ہو گئی تھیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

تو فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَذِنَ لِمُحَمَّدٍ فِي زِيَارَةِ قَبْرِ أُمِّهٖ ۔

"اللہ نے محمدؐ کو اپنی ماں کی قبر پر جانے کی اجازت دے دی ہے "

پھر آپؐ وہاں تشریف لے گئے، قبر کو درست کیا اور بے اختیار رو دیئے۔ آپؐ کو دیکھ کر مسلمان بھی رونے لگے۔ عرض کیا گیا کہ آپؐ تو رونے سے منع فرماتے ہیں۔ فرمایا:

أَدْرَكَتْنِي رَحْمَتُهَا فَبَكَيْتُ ۔

"اُن کی مامتا مجھے یاد آگئی اور میں رو دیا"

اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر حضورؐ کے تشریف لے جانے اور آپؐ کے اُوپر رقّت طاری ہونے کا ذکر متعدد احادیث میں بھی آیا ہے جو مسند احمد، بیہقی اور طبقات ابنِ سعد میں حضرت بُریدہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہوئی ہیں۔

جناب عبدالمطّلب کی کفالت میں

بی بی آمنہ کے بعد حضورؐ کے دادا جناب عبدالمطّلب نے آپؐ کو اپنے ساتھ رکھا اور اپنی تمام اولاد سے بڑھ کر آپؐ کو چاہا۔ وہ آپؐ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ آپؐ جس وقت چاہتے ان کے پاس چلے جاتے تھے خواہ وہ تخلیہ میں ہوں یا سوتے ہوئے ہوں، حالانکہ ان کی دوسری اولاد ان کی ہیبت کی وجہ سے یہ جرأت نہ کر سکتی تھی۔ وہ اُس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے جب تک آپ اس میں شریک نہ ہوں اور کبھی کبھی کھانے کے وقت آپ کو گود میں بٹھا لیتے تھے۔ کعبہ کی دیوار کے سایہ میں ان کے لیے ایک فرش بچھایا جاتا تھا جس پر ان کے ادب کی وجہ سے ان کی اولاد میں سے کوئی نہ بیٹھتا تھا بلکہ سب اس کے اردگرد بیٹھا کرتے تھے۔ مگر حضورؐ جو اس وقت ایک خوب تنومند لڑکے تھے آکر سیدھے اُسی فرش پر بیٹھ جاتے تھے۔ آپؐ کے چچا آپ کو ہٹانا چاہتے تو عبدالمطّلب کہتے "میرے بیٹے کو چھوڑ دو، خدا کی قسم اس کی شان ہی کچھ اور ہے میں اُمید رکھتا ہوں کہ یہ ایسے بلند مرتبے پر پہنچے گا جس پر اس سے پہلے کوئی عرب نہیں پہنچا" بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطّلب کہتے اس کا مزاج شاہانہ ہے، پھر وہ آپؐ کو اپنے پاس بٹھا کر آپؐ کی پیٹھ اور سر پر ہاتھ پھیرتے، آپ کا منہ چومتے اور آپؐ کی حرکات و سکنات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ قبیلۂ بنی مُدلج، جو قیافہ شناسی میں مشہور تھا، اُس کے چند لوگوں نے عبدالمطّلب سے کہا کہ اس بچّے کی خاص حفاظت کرنا کیونکہ ہم نے کوئی نشانِ قدم ایسا نہیں دیکھا جو مقامِ ابراہیمؑ پر حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے نشانِ قدم سے اس قدر مشابہت رکھتا ہو جیسی اس بچّے کا نشانِ قدم رکھتا ہے۔ اِس موقع پر ابو طالب موجود تھے۔ عبدالمطّلب نے ان سے کہا کہ جو

بات یہ لوگ کہہ رہے ہیں اسے غور سے سنو اور اس کی حفاظت کرو۔

لیکن دادا کی یہ شفقت بھی حضورؐ کو زیادہ دیر تک حاصل نہ رہی۔ آپ آٹھ سال کے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ ابنِ سعد اور حافظ سخاوی نے اُمّ ایمن کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ جب ان کا انتقال ہو رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے سرہانے کھڑے رو رہے ہیں۔ بعد کے زمانے میں جب حضورؐ سے پوچھا گیا کیا آپ کو اپنے دادا صاحب کی وفات یاد ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا ہاں، میں اس وقت آٹھ برس کا تھا۔

جنابِ ابُوطالب کی کفالت میں

عبدالمطلب کی وفات کے بعد بعض روایات کی رُو سے اُن کی وصیت کے مطابق، اور بعض دوسری روایات کے مطابق بطورِ خود ابُوطالب نے حضورؐ کو اپنی کفالت میں لے لیا۔ ان کا اصل نام عبدِمناف تھا، مگر اپنے بڑے بیٹے طالب کی وجہ سے ان کی کنیت ابُوطالب اتنی مشہور ہوئی کہ اصل نام اس کے نیچے دب گیا۔ یہ لڑکا حضورؐ کا تقریباً ہم عمر تھا اور اس کو حضورؐ سے بے انتہا محبت تھی۔ جنگِ بدر میں جب قریش کے لوگ بنی ہاشم کو مجبور کر کے لڑنے کے لیے لے گئے تو ان میں طالب بھی تھا، لیکن اس نے جنگ میں کوئی حصہ نہ لیا اور بعد میں نہ مقتولوں میں اس کا کہیں پتہ چلا نہ زخمیوں میں، اور نہ وہ مکہ واپس پہنچا۔ پھر کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں چلا گیا۔

ابوطالب حضورؐ کے حقیقی چچا تھے۔ انہوں نے آپؐ کو خود اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر عزیز رکھا۔ اپنے پاس سُلاتے تھے۔ جہاں جاتے ساتھ لے جاتے تھے۔ کھانے کے وقت کوشش کرتے تھے کہ پہلے آپ آ کر شریک ہوں تب دوسرے کھانا شروع کریں۔ واقدی نے مختلف سندوں کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ابوطالب کے اہل و عیال اگر حضورؐ کے بغیر کھانا کھاتے خواہ الگ الگ کھائیں یا مل کر، کسی کا پیٹ نہ بھرتا۔ اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ کھاتے تو سب کا پیٹ بھر کر بھی کھانا بچ رہتا۔ آپؐ کی یہ برکت دیکھ کر ابُوطالب نے قاعدہ بنا لیا کہ جب سب کھانے کے لیے بیٹھتے تو وہ کہتے کہ ٹھہر جاؤ جب تک میرا بیٹا نہ آ جائے۔ پھر جب حضورؐ آ جاتے تو کھانا شروع کیا جاتا، اور ابوطالب کہتے کہ بیٹے تم بڑے مبارک ہو۔ کھانے پر حسبِ قاعدہ جب بچے چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے تو حضورؐ ہاتھ روک کر بیٹھ جاتے۔ ابُوطالب یہ حالت دیکھ کر آپؐ کے لیے الگ کھانا نکال کر دینے لگے۔ ابُوطالب کے لیے الگ مسند بچھائی جاتی تھی جس پر کوئی اور نہ بیٹھتا تھا، مگر حضورؐ ان کے ساتھ ہی جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اس پر ابوطالب کہا کرتے کہ "رَبیعہ کے خدا کی قسم، میرے اِس بھتیجے پر سرداری سجتی ہے۔"

حضورؐ کا بکریاں چَرانا

غالباً یہ اسی دَور کا واقعہ ہو گا کہ آپؐ نے چچا کی کمزور مالی حالت اور کثیر العیالی کو دیکھ کر خود کچھ کمانے کی فکر کی ہو گی۔ بچپن میں جب آپ اپنی رضاعی والدہ کے ہاں تھے تو اپنے دُودھ شریک بھائی بہنوں کے ساتھ ان کے گھر

کی بکریاں چرایا کرتے تھے یہی کام ہوش سنبھال کر آپؐ نے مکہ میں اُجرت پر کرنا شروع کر دیا۔ حدیث میں عُبید بن عُمیر کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ لوگوں نے عرض کیا کیا آپؐ نے بھی چرائی ہیں؟ فرمایا ہاں۔ دوسری روایت بخاری کتاب الاجارہ میں حضرت ابوہریرہؓ کی ہے جس میں اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا میں اہلِ مکہ کی بکریاں کچھ قراریط پر چرایا کرتا تھا۱۔ (قراریط قیراط کی جمع ہے جو ایک دینار کے دسویں یا بیسویں حصے کو کہتے تھے)۔ ابو سلمہؓ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیلو کے درختوں میں سے گزرے تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کے جو پھل سیاہ ہوگئے ہوں وہ توڑو کیونکہ جب میں بکریاں چرایا تھا اُس زمانے میں یہی پھل توڑا کرتا تھا۔ (ابن سعد طبع لیدن ص ۸۰–۸۱)

ابتدائے عُمر سے آپؐ کی غیر معمولی شخصیت کا اظہار

اُوپر حضورؐ کی پیدائش کے وقت سے ۱۰–۱۲ برس کی عُمر تک کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں اُن سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ بچپن ہی سے جن لوگوں کو آپؐ سے سابقہ پیش آ رہا تھا اُن کے ذہن پر یہ نقش ثبت ہوتا چلا گیا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہے جو ان کے درمیان پیدا ہُوئی ہے صرف یہی نہیں کہ آپؐ کی ذات سے عجیب عجیب برکات کا ظہور ہو رہا تھا، بلکہ آپؐ کی عادات و خصائل عام بچّوں سے بالکل مختلف تھیں، اور آپؐ کے بشرے سے بھی آپؐ کی شخصیت کا غیر معمولی پن نمایاں ہو رہا تھا۔

بیہقی اور ابن جریر نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میرے اندر دو مرتبہ سے زیادہ کبھی اُن کاموں سے دلچسپی پیدا نہیں ہُوئی جو اہلِ جاہلیت کیا کرتے تھے، اور دونوں مرتبہ اللہ عزوجل نے مجھے ان سے محفوظ رکھا اور اس کے بعد پھر میرے دل میں ان کا خیال تک نہ آیا۔ ایک روز میں نے اُس لڑکے سے جو میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا، کہا کہ تو ذرا میری بکریوں کی دیکھ بھال کر تاکہ میں مکہ میں جا کر رات کی اُن دلچسپیوں میں حصہ لوں جن میں دوسرے لڑکے حصّہ لیتے ہیں۔ وہ راضی ہو گیا چنانچہ میں شہر کی طرف چلا اور میں نے پہلے ہی گھر میں گانے بجانے کی آوازیں سُنیں۔ میں نے پُوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ فلاں اور فلاں کی شادی ہے۔ میں بیٹھ گیا اور لگا یک

۱۔ ابن ماجہ نے سُوید بن سعید کے حوالہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں: کنت ارعاھا لاھل مکۃ بالقراریط "میں اہلِ مکہ کی بکریاں کچھ قراریط کے بدلے چرایا کرتا تھا" یہ روایت بخاری کی روایت کے یہ معنی متعین کر دیتی ہے کہ آپؐ اُجرت پر اہلِ مکہ کی بکریاں چراتے تھے لیکن ابراہیم الحربیؒ نے دعوٰی کیا ہے کہ قراریط سے مراد نقدی رقم نہیں بلکہ یہ اَجیاد کے قریب ایک مقام تھا جہاں آپ بکریاں چراتے تھے۔ اسی کی تائید ابن الجوزی اور علّامہ عینیؒ نے کی ہے لیکن اوّل تو مکہ کے جغرافیہ میں کسی مقام کا نام قراریط ہونا ثابت نہیں ہے۔ دوسرے اُجرت پر بکریاں چرانا کوئی عیب نہیں ہے کہ اس سے حضورؐ کا دامن صاف کرنے کے لیے یہ تکلف کیا جائے۔ (حاشیہ از مُرتّب)

مجھے نیند آگئی یہاں تک کہ دن نکل آیا اور سورج کی گرمی سے میری آنکھ کھلی۔ میں واپس گیا تو میرے ساتھی نے حال پوچھا۔ میں نے اسے ماجرا سُنا دیا۔ دوسری رات میں نے اپنے ساتھی سے پھر وہی بات کہی اور اس نے مان لی۔ میں مکہ میں داخل ہُوا تو وہی گانا بجانا پھر ہو رہا تھا۔ میں یہ تماشا دیکھنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر سو گیا اور دن نکلنے تک سویا رہا۔ واپس جا کر میں نے اپنے ساتھی کو بتا دیا کہ آج بھی میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کے بعد میرے اندر اس طرح کی کسی چیز کی طرف میلان ہی پیدا نہ ہُوا۔

ابن سعد نے اُمّ ایمن کی روایت نقل کی ہے کہ بُوانہ ایک بُت تھا جس کی زیارت کے لیے قریش کے لوگ جایا کرتے تھے، وہاں نذریں اور نیازیں چڑھاتے تھے، پورے ایک دن اس کے استھان میں اعتکاف کیا جاتا تھا اور پھر قربانی کر کے سر منڈوائے جاتے تھے۔ ابوطالب بھی اس طریقے کے مطابق اپنے خاندان کے ساتھ وہاں جایا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، جو اس وقت ایک نوخیز لڑکے تھے، آپؐ سے بھی کہا جاتا تھا کہ آپ سب کے ساتھ چلیں۔ مگر ہر سال یہی جھگڑا ہوتا تھا کہ آپؐ ساتھ جانے سے انکار کر دیتے اور اس پر آپؐ کے چچا اور پھوپھیاں سخت ناراض ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپؐ گھر کے بڑوں کی اس ملامت اور فضیحتے سے تنگ آکر اس تہوار کے موقع پر چلے گئے اور بڑی دیر تک کہیں غائب رہے حتیٰ کہ سب گھر والے آپؐ کے لیے پریشان ہو گئے۔ واپس آئے تو سخت خوفزدہ تھے اور چہرے کا رنگ فق تھا۔ پھوپھیاں آپ کو دیکھ کر لپکیں اور پوچھا: "تجھے یہ کیا ہو گیا؟" آپؐ نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ مجھے کچھ ہو نہ جائے۔ پھوپھیوں نے کہا: "اللہ تجھے کبھی شیطان کے شر میں مبتلا نہ کرے گا جب کہ تیرے اندر ایسی اور ایسی خوبیاں ہیں۔" آپؐ نے کہا جب کبھی میں اس بُت خانے میں کسی بُت کی طرف جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی گورے رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ "اے محمدؐ، دُور رہو، اسے مت چھونا۔"

اُمّ ایمن کہتی ہیں کہ اس کے بعد آپؐ کبھی اس تہوار میں نہیں گئے۔

ابن ہشام نے ابن اسحٰق کا بیان نقل کیا ہے کہ مکہ میں قبیلۂ لِہْب (اَزْدِ شَنُوْءَہ کی ایک شاخ) سے تعلق رکھنے والا ایک ماہرِ علمِ قیافہ آیا کرتا تھا اور جب کبھی وہ آتا، قریش کے لوگ اپنے اپنے بچوں کو اس کے پاس لے جاتے تھے تاکہ وہ ان کے قیافے سے ان کے متعلق کچھ بتائے۔ ایک مرتبہ جب وہ آیا تو ابوطالب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے بچوں کے ساتھ اس کے پاس لے گئے۔ اس نے آپؐ کو دیکھا اور پھر کسی اور طرف مشغول ہو گیا۔ اُدھر سے فارغ ہو کر اس نے کہا اُس لڑکے کو لاؤ جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا۔ ابوطالب نے جب دیکھا کہ وہ آپؐ کو دیکھنے کے لیے بڑی بے تابی کا اظہار کر رہا ہے تو انہوں نے آپؐ کو غائب کر دیا۔ اس نے کہا اسے میرے پاس لاؤ، خدا کی قسم وہ بہت بڑا آدمی بننے والا ہے۔

محمد بن اسحٰق کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک روز قریش کے لڑکوں کے ساتھ

کھیلتے ہوئے میں بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا اور سب لڑکوں نے پتھر اٹھانے کے لیے اپنی اپنی ازار (تہبند) اتار کر گلے میں باندھ رکھی تھی جس سے سب ننگے ہو جاتے تھے۔ میں نے جو ایسا کیا تو یکایک مجھ پر ایک زور کا گھونسا پڑا اور مجھ سے کسی نے کہا کہ "اپنی ازار باندھو" چنانچہ میں نے اپنی ازار باندھ لی۔ اس طرح لڑکپن ہی میں آپ کو عریانی سے روک دیا گیا۔ اسی سے ملتی جلتی صورت اُس وقت پیش آئی جب ۳۵ عام الفیل میں (جبکہ حضورؐ ۳۵ سال کے تھے اور آپؐ کے نبوت پر سرفراز ہونے میں ابھی پانچ سال باقی تھے) قریش نے از سرِ نو کعبہ کی تعمیر شروع کی اس موقع پر قریش کے سب لوگ اپنی اپنی ازاریں گلے میں باندھے پتھر ڈھو ڈھو کر لا رہے تھے اور بڑے چھوٹے کسی کو برہنگی کا احساس تک نہ تھا۔ حضرت عباسؓ نے حضورؐ سے کہا آپؐ بھی ایسا کریں۔ مگر آپؐ نے ایسا کیا ہی تھا کہ آپ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور نظریں آسمان پر جم گئیں پھر آپؐ نے فرمایا "میری ازار" چنانچہ وہ باندھ دی گئی تب آپ اُٹھے۔ یہ واقعہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے صحیحین میں نقل ہوا ہے۔ عبدالرزاق، طبرانی اور حاکم نے ابوالطفیل سے روایت نقل کی ہے کہ غیب سے آواز آئی "اے محمدؐ اپنا ستر چھپاؤ" مگر کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضورؐ اُس وقت بالکل برہنہ ہو گئے تھے بلکہ اس سے قبل کہ ازار برہنگی کی حد تک اٹھتی بے ہوشی آپ پر طاری ہو گئی۔

بُت پرستی سے نفرت

بچپن ہی سے آپ کو شرک و بُت پرستی اور اس کے تمام مظاہر و لوازم سے سخت نفرت تھی، اور قبل نبوت کی زندگی میں آپؐ کا دامن کبھی اس کے غبار تک سے آلودہ نہیں ہوا۔ بخاری ابواب المناقب میں حدیث زید بن عمرو بن نُفیل کے زیرِ عنوان حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے بتوں کے چڑھاوے کا کھانا اور اُن کے لیے قربان کیے ہوئے جانور کا گوشت پیش کیا گیا تو آپؐ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا۔ مسند احمد میں حضرت عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک پڑوسی نے بیان کیا کہ ایک روز میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت خدیجہؓ سے یہ فرماتے سنا کہ ای خدیجۃ، واللہ لا اعبد اللات والعزّٰی، واللہ لا اعبد ابداً "اے خدیجہ، خدا کی قسم میں ہرگز لات اور عزّٰی کی عبادت نہ کروں گا، خدا کی قسم میں کبھی ان کی عبادت نہ کروں گا" جواب میں حضرت خدیجہؓ کہہ رہی تھیں کہ "چھوڑیے لات کو اور چھوڑیے عزّٰی کو" اس واقعہ کو بیان کر کے اُس پڑوسی نے حضرت عروہ کو بتایا کہ اُس زمانے میں قریش کے لوگ رات کو سونے سے پہلے ان بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حضورؐ کی ابتدائی زندگی کے تاثرات کا ذکر ہو گا۔

سفرِ شام اور بحیری راہب کا واقعہ

ایک مرتبہ ابوطالب ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام جانے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اس وقت

۱۲ سال تھی۔[1] جب ابوطالب چلنے لگے تو حضورؐ اُن سے لپٹ گئے اور (ابن سعد کی روایت کے مطابق) آپؐ نے اُن سے کہا "چچا جان، آپ مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہیں، میری نہ ماں ہے نہ باپ جو میری دیکھ بھال کرے"۔ اس پر ابوطالب کا دل پگھل گیا اور انہوں نے کہا "خدا کی قسم مَیں نہ اسے جُدا کروں گا نہ اس سے جدا ہوں گا۔ یہ میرے ساتھ جائے گا"۔ یہ قافلہ جب شام کے علاقے میں بُصریٰ پہنچا اور بَحیرٰی (یا بَحیرا) راہب کے صومعے کے پاس ٹھہرا تو اپنے معمول کے خلاف وہ باہر نکل آیا، حالانکہ وہ کبھی کسی قافلے کے لیے اپنے صَومعے سے نہ نکلتا تھا۔ اس نے اِس سارے قافلے کے لیے کھانا پکوایا اور دعوت دی کہ سب لوگ کھانے کے لیے آئیں، کوئی پیچھے نہ رہے۔ دعوت کے وقت سب قافلے والے گئے، مگر حضورؐ کو آپ کی کم سنی کے باعث اپنے پڑاؤ میں چھوڑ گئے۔ بحیرٰی نے کہا کیا سب لوگ آگئے ہیں؟ لوگوں نے کہا بس ایک کم سن لڑکا ہے جسے ہم اپنے سامان کے ساتھ پڑاؤ میں چھوڑ آئے ہیں۔ اُس نے کہا نہیں اسے بھی بلاؤ۔ قریش میں سے ایک آدمی نے کہا لات اور عُزّیٰ کی قسم، یہ ہمارے لیے بُری بات ہوگی کہ محمدؐ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہو۔ چنانچہ وہ گیا اور آپؐ کو لے آیا۔ آپؐ کے آنے کے بعد بحیرٰی آپؐ کو بڑے غور سے دیکھتا رہا اور آپؐ کے بُشرے کا جائزہ لیتا رہا۔ کھانے کے بعد وہ آپؐ کے پاس آیا اور کہا "میاں لڑکے، مَیں تم کو لات و عُزّیٰ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ جو کچھ مَیں پوچھوں اس کا جواب دو"۔ حضورؐ نے فرمایا "مجھے لات و عُزّیٰ کی قسم نہ دو، مَیں اُن سے بڑھ کر کسی چیز سے بُغض نہیں رکھتا"۔ اس نے کہا "اچھا تو اللہ کے واسطے مجھے اُن باتوں کا جواب دو جو مَیں پوچھوں"۔ آپؐ نے فرمایا جو چاہو پوچھو۔ اس کے بعد اس نے آپؐ سے حالات، آپؐ کی نیند، آپؐ کی ہیئت اور دوسرے اُمور کے متعلق دریافت کیا اور آپؐ جواب دیتے رہے۔ پھر وہ آپؐ کے گرد پھر کر آپؐ کے پیچھے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے بعد ابوطالب سے اس نے پوچھا کہ یہ آپ کا کون ہے؟ انہوں نے کہا میرا بیٹا ہے۔ بحیرٰی نے کہا اس لڑکے کا باپ زندہ نہیں ہوسکتا۔ ابوطالب نے کہا یہ میرا بھتیجا ہے۔ اس نے کہا اس کے باپ کو کیا ہوا؟ ابوطالب نے جواب دیا یہ ابھی بطنِ مادر میں تھا کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ اُس نے کہا تم نے سچ کہا۔ پھر بحیرٰی نے کہا "اپنے بھتیجے کو اپنے وطن واپس لے جاؤ اور یہودیوں سے اس کو بچاؤ۔ واللہ، اگر انہوں نے اس کو دیکھ کر وہ باتیں پہچان لیں جو مَیں نے پہچانی ہیں تو وہ اس کے ساتھ کوئی شرارت کریں گے، کیونکہ تمہارا یہ بھتیجا بڑی عظیم شخصیت کا مالک ہے"۔ چنانچہ ابوطالب نے جلدی جلدی اپنا تجارتی کام انجام دیا اور آپؐ کو لے کر واپس چلے گئے۔

یہ واقعہ ہے جس پر مستشرقین نے بہت سے قیاسات کی عمارت اٹھائی ہے اور آں حضورؐ کو جو رسول ہونے

---

[1] طبری وغیرہ نے ۹ سال عمر بتائی ہے اور ابن عبدالبرّ نے ۱۳ سال، مگر اکثریت کا قول ۱۲ سال ہی کا ہے اور یہی صحیح ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کے بعد آپؐ سے ظاہر ہوتے، عیسائی راہبوں سے حاصل کردہ معلومات قرار دیا ہے۔ اس پر مزید خود ہمارے ہاں کی بعض روایات بھی ایسی ہیں جو ایک حد تک ان قیاسات کو تقویت پہنچاتی ہیں۔ درحقیقت یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ ایک زاہد مرتاض آدمی، جس نے مجاہدوں سے اپنی روحانی قوتوں کو نشوونما دیا ہو، کچھ غیر معمولی برکات کے آثار دیکھ کر محسوس کرلے کہ اس قافلے میں کوئی عظیم شخصیت موجود ہے، اور آپؐ کو دیکھ کر اسے اپنے اندازوں کی تصدیق ہوگئی ہو۔ نیز اُس نے اس خیال سے کہ یہودی ایک حاسد قوم ہیں اور عرب کے اُمّیوں میں کسی عظیم شخصیت کے ظہور کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر اس کے درپے آزار ہوسکتے ہیں، ابوطالب کو ان سے بچانے کا مشورہ دیا ہو۔ لیکن یہ بات قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ اُس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ آپؐ ہی وہ ہونے والے نبی ہیں جن کے آنے کی خبر پچھلی کتابوں میں دی گئی ہے۔ کیونکہ پیشین گوئیوں سے یہ تو ضرور معلوم تھا کہ ایک نبی آنے والے ہیں اور ان کا نام محمدؐ ہوگا لیکن تعیّن کے ساتھ یہ معلوم کرلینا ممکن نہ تھا کہ حضورؐ ہی وہ نبی ہیں۔

اِس سلسلے میں جو روایات ہمارے محدثین اور اہلِ سِیَر نے نقل کی ہیں ان پر ہم ایک مجموعی نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترمذی، بیہقی (فی الدلائل)، ابنِ عساکر، حاکم، ابونُعیم، ابوبکر الخرائطی اور ابن ابی شَیبہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ بحیریٰ نے حضورؐ کا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہ سیّد المرسلین ہیں، یہ سیّد العٰلمین ہیں، ان کو اللہ عنقریب رحمۃٌ للعٰلمین بنا کر مبعوث فرمانے والا ہے"۔ اُس سے پوچھا گیا (اور ترمذی وغیرہ بعض محدثین کی روایت میں ہے کہ قریش کے شیوخ نے اس سے پوچھا) کہ تمہیں اِس کا علم کیسے ہوا؟ اُس نے کہا جب تم سامنے سے آرہے تھے تو ہر شجر و حجر سجدہ ریز تھا اور یہ ایک نبی کے سوا کسی کے لیے سجدہ ریز نہیں ہوتے۔ اور میں اِن کو اُس مُہرِ نبوت سے بھی پہچانتا ہوں جو ان کی پُشت پر دونوں شانوں کے درمیان ہے، اور ہم ان کا ذکر اپنی کتابوں میں پاتے ہیں۔ پھر اس نے ابوطالب سے کہا کہ یہودیوں سے ان کو خطرہ ہے اس لیے انہیں واپس بھیج دو۔ ابن ابی شیبہ نے ابوموسیٰ اشعریؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ ذکر بھی ہے کہ جب حضورؐ صومعے کی طرف آرہے تھے تو ایک بادل آپؐ پر سایہ کررہا تھا۔ اس کے بعد انہی روایات میں سے بعض میں یہ ہے کہ اُس کے اِصرار پر ابوطالب نے حضورؐ کو ابوبکرؓ اور بلالؓ کے ساتھ واپس مکّہ بھیج دیا۔ حالانکہ ابوبکرؓ اس وقت ۱۰ سال کے ہوں گے اور بلالؓ ان سے بھی چھوٹے۔ ایک بارہ سال کے لڑکے کو اُس سے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ حفاظت کے لیے بھیجنا اوّل تو بجائے خود عجیب ہے، دوسرے بلالؓ کا بھیجا جانا اس سے بھی عجیب تر ہے، کیونکہ اُس وقت بنی عبدالمطلب سے اُن کا کوئی واسطہ نہ تھا کہ ابوطالب اُن سے کوئی خدمت لے سکتے۔ اِسی سفر کے متعلق یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ سات رُومی حضورؐ کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے اور بحیریٰ کے صومعے پر پہنچے۔ بحیریٰ نے پوچھا کس لیے آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ یہ نبی اِس مہینے اِدھر آنے والا ہے، اس لیے ہر طرف آدمی دوڑا دیے گئے ہیں، اور ہم یہاں آئے ہیں۔ بحیریٰ نے کہا تمہارا

کیا خیال ہے، جس کام کے کرنے کا اللہ نے فیصلہ کر لیا ہو اُسے کوئی شخص روک سکتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ اس کے بعد وہ اپنے ارادے سے باز آ گئے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ابھی حضورؐ ۱۲ برس ہی کے تھے کہ آپؐ کو خود بھی اور قریش کے لوگوں کو بھی اور رُوم تک کے ارباب اقتدار کو بھی یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آپؐ نبی ہونے والے ہیں۔

پھر اس واقعہ کے ۱۳ برس بعد ۲۵ سال کی عمر میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہؓ کا مال تجارت لیکر شام گئے تو ابو سعید نیشا پوری کی کتاب شرف المصطفیٰ کے حوالہ سے حافظ ابن حجر اصابہ میں نقل کرتے ہیں کہ بحیرا سے آپؐ کی دوبارہ ملاقات ہوئی اور اس موقع پر اس نے کہا اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد انک رسول اللہ النبی الامی الذی بشر بہ عیسیٰ ابن مریم "میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ کے رسُول ہیں، وہ نبی امی جن کی بشارت عیسیٰ ابن مریمؑ نے دی تھی"۔ اسی بنا پر ابن مَنْدَہ اور ابو نُعَیم نے بحیری کو صحابہؓ میں شمار کیا ہے، اور حافظ ذہبیؒ نے تجرید الصحابہؓ میں لکھا ہے کہ وہ آپؐ کی بعثت سے پہلے آپؐ پر ایمان لایا تھا۔

اسی دوسرے سفر شام کے سلسلے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بُصریٰ میں حضورؐ ایک درخت کے نیچے ٹھیرے جو نسطُورا راہب کے صَومعے کے پاس تھا۔ نسطُورا باہر نکل کر آیا اور اُس نے حضرت خدیجہؓ کے غلام مَیسَرہ سے، جو حضورؐ کے ساتھ تھا، دریافت کیا کہ اس درخت کے نیچے کون ٹھیرا ہے؟ اُس نے کہا "قریش، اہل حرم میں سے ایک شخص"۔ واقدی اور ابن اسحٰق کی روایت ہے کہ اس پر نسطُورا بولا کہ اس درخت کے نیچے عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آج تک (یعنی تقریباً ۶ سو برس تک) نبی کے سوا کوئی نہیں ٹھیرا۔ ابو سعید نے شرف المصطفیٰ میں اس کے بعد یہ اضافہ کیا ہے کہ پھر نسطُورا آپؐ کے پاس آیا، آپؐ کا سر اور آپؐ کے قدم چُومے اور کہا کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسُول، وہ نبی اُمّی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ نے دی تھی اور کہا تھا کہ میرے بعد اس درخت کے نیچے نبی امّی ہاشمی العربی المکی صاحب الحوض والشفاعۃ اور صاحب لواء الحمد کے سوا کوئی نہیں ٹھیرے گا"۔ مَیسَرہ نے اس کے اس قول کو ذہن نشین کر لیا۔ اس کے بعد حضورؐ بُصریٰ کے بازار میں خرید و فروخت کے لیے نکلے۔ اس موقع پر ایک شخص سے قیمت کے معاملہ میں آپؐ کا اختلاف ہو گیا۔ اس شخص نے کہا لات اور عُزّیٰ کی قسم کھائیے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے تو کبھی ان کی قسم نہیں کھائی۔ اس پر اُس نے کہا پھر میں آپ ہی کی بات مانتا ہوں۔ اور الگ لے جا کر مَیسَرہؓ سے کہا "یہ نبی ہیں، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یہ وہی ہیں جن کا ذکر ہمارے احبار اپنی کتابوں میں پاتے ہیں"۔ مَیسَرہ نے یہ بات بھی ذہن نشین کر لی۔

ابو نُعَیم کی روایت ہے کہ اس سفر میں مَیسَرہ نے دیکھا کہ دو فرشتے آپؐ پر سایہ کیے رہتے ہیں۔ جب یہ

قافلہ مکہ پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ حضرت خدیجہؓ اُس وقت اپنے بالاخانے پر تھیں۔ انہوں نے بھی دیکھا کہ حضورؐ اپنے اُونٹ پر چلے آ رہے ہیں اور دو فرشتے آپ پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ ابونعیم کے سوا دُوسروں نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے ساتھ کی دُوسری عورتوں کو بھی یہ منظر دکھایا اور وہ اس پر تعجب کرنے لگیں۔ پھر جب مَیسَرہ حضرت خدیجہؓ کے پاس آیا تو انہوں نے اُسے بتایا کہ میں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ اُس نے کہا کہ میں تو شام سے یہی کچھ دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس کے بعد اُس نے اُن کو وہ باتیں بھی سُنائیں جو نسطورا سے اُس نے سُنی تھیں اور وہ واقعہ بھی بیان کیا جو شام کے ایک تاجر کے ساتھ مال کی قیمت پر اختلاف کے سلسلے میں پیش آیا تھا۔

ان روایات کو اگر تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نبوّت سے ۱۵ سال پہلے حضورؐ کو پھر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آپؐ نبی ہونے والے ہیں۔ مَیسَرہ اور حضرت خدیجہؓ اور ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی قریش کی متعدد خواتین کو بھی اس کا علم ہو چکا تھا۔ اور قریش کے جس قافلے کے ساتھ آپؐ شام گئے تھے وہ بھی اور مکہ کے لوگ بھی اس بات سے بے خبر نہ رہے ہوں گے کہ فرشتے آپؐ پر سایہ کر رہے ہیں، کیونکہ جب مَیسَرہ اور حضرت خدیجہؓ اور دوسری خواتین ان کو دیکھ رہی تھیں تو دوسرے لوگوں سے یہ منظر کیسے مخفی رہتا؟

ہمارے نزدیک یہ ساری باتیں اگرچہ اکابر اہلِ علم و روایت سے منقول ہیں مگر کئی وجوہ سے ناقابلِ قبول ہیں۔ اوّل تو یہ صریح قرآن کے خلاف پڑتی ہیں جس میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

وَمَا كُنتَ تَرْجُوا أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ (القصص - ۸۶)

"اور تم ہرگز اس کے امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی۔"

مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (الشوریٰ - ۵۲)

"تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔"

یہ آیات اس باب میں بالکل قطعی الثبوت ہیں کہ نبوّت کے منصب پر سرفراز ہونے سے پہلے آپؐ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ آپؐ نبی بنائے جانے والے ہیں، حالانکہ اگر ۱۲ برس کی عمر ہی میں آپؐ کو یہ معلوم ہو چکا ہوتا اور ۲۵ سال کی عمر میں اس کی مزید تصدیق ہو گئی ہوتی، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ اپنے اُوپر کتاب کے نزول کی اُمید نہ رکھتے اور اس خیال سے خالی الذہن ہوتے کہ آپؐ کو ایک وقت اپنے اُوپر ایمان لانے کی دعوت لوگوں کو دینی ہوگی۔

قرآن مجید کے بعد یہ روایات اُن صحیح ترین روایات کے بھی خلاف پڑتی ہیں جو حضورؐ پر پہلی وحی کے نزول اور اُس پر آپؐ کی کیفیت اور حضرت خدیجہؓ سے آپؐ کی گفتگو کے متعلق منقول ہوئی ہیں۔ اُس وقت آپ پر جو کیفیت طاری

ہوتی وہ کیسے طاری ہوتی اگر آپ ۴۰ برس سے یہ جانتے ہوتے کہ آپ نبی ہونے والے ہیں؟ اس حالت میں تو نزولِ وحی آپ کی عین توقع کے مطابق ہوتا پھر حضرت خدیجہؓ نے آپ سے حرا کا واقعہ سننے کے بعد جو کچھ کہا وہ ایسی حالت میں ہرگز نہ کہتیں جبکہ انہیں ۱۵ برس سے یہ معلوم ہوتا کہ آپ نبی ہونے والے ہیں۔ اس صورت میں تو وہ یہ فرماتیں کہ یہ وہی کچھ پیش آیا ہے جس کی ہم پہلے سے توقع رکھتے تھے۔

اسی طرح یہ روایات اُس پوری تاریخ کے خلاف پڑتی ہیں جو کثیر اور متواتر روایات کی رُو سے آپ کے اعلانِ نبوت کے بعد مکہ میں پیش آئی۔ اگر قریش کے لوگ ۱۲ سال سے یہ جانتے ہوئے ہوتے کہ آپ نبی ہونے والے ہیں تو آپ کا اعلانِ نبوت اُن کی توقعات کے خلاف نہ ہوتا اور اس پر اُن کا ردِعمل بھی اُس سے بہت مختلف ہوتا جو بالکل ایک خلافِ توقع معاملہ پیش آنے سے ہوا۔

حربِ فجار

اب ہم پھر تاریخی سلسلۂ واقعات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ حضور ﷺ ۱۵ سال کے تھے جب حربِ فجار واقع ہوئی[1]۔ ابن اسحٰق، ابن سعد، بلاذری اور ابن جریر طبری کا بیان ہے کہ یہ جنگ سنہ ۲۰ عام الفیل[2] میں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے آپ کی عمر اس وقت ۲۰ سال ہونی چاہیے۔ اس میں ایک فریق بنی کنانہ تھے (جن میں قریش بھی شامل تھے) اور دوسری طرف قیس عیلان تھے (جن میں ثقیف اور ہوازن وغیرہ شامل تھے)۔ جنگ اِس بات پر چھڑی تھی کہ بنی ہوازن میں سے عُروۃُ الرَّحّال نامی ایک سردار نے نعمان بن منذر کے تجارتی قافلہ کو اپنی امان میں بازارِ عکاظ لے جانے کے لیے مُجوّز بنا کر دی تھی۔ بنی کنانہ کے ایک سردار بَرّاض بن قیس نے کہا کیا تو کنانہ کے مقابلہ میں بھی اس کو امان دے رہا ہے؟ اُس نے کہا "ہاں اور تمام دنیا کے مقابلے میں بھی"۔ اِس پر براض کو تاؤ آگیا اور اس نے تیمن کے بالائی علاقہ میں تیمن کے مقام پر عروہ کو قتل کر دیا۔ قریش

---

[1] علامہ ابو نصر اسماعیل الجوہری کی صحاح میں ہے کہ اس سے پہلے تین مرتبہ حربِ فجار ہو چکی تھی۔ یہ چوتھی حربِ فجار تھی جس میں حضور ﷺ نے حصہ لیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ جنگ شوال ۲۰ عام الفیل میں ہوئی تھی۔ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ قریش نے اس جنگ کو فجار کے نام سے اس لیے موسوم کیا کہ یہ ماہِ حرام میں ہوئی تھی۔ اور ماہِ حرام میں لڑنا چونکہ فجور ہے اِس بنا پر قریش نے کہا قد فجرنا "ہم نے فجور کا ارتکاب کیا ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چاروں لڑائیاں جو حرام مہینوں میں ہوئیں "حربِ فجار" کہلائیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] عام الفیل سے مراد ہے ہاتھیوں کا سال یعنی جس سال اصحاب الفیل نے مکہ پر حملہ کیا تھا۔ یہ ایسا غیر معمولی واقعہ تھا کہ اس کے بعد اہلِ عرب اسی سال سے تاریخوں کا حساب کرنے لگے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

ابھی عکاظ کے بازار ہی میں تھے کہ اُن کو اس کی خبر پہنچ گئی اس لیے وہ فوراً حَرَم کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ حدودِ حرم میں داخل ہوتے، ہوازن نے اُن کو جا لیا اور دن بھر لڑائی ہوتی رہی۔ رات کو قریش حَرَم کے حُدُود میں پہنچ گئے اور ہوازن رُک گئے۔ اس کے بعد چند روز تک لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے بعض لڑائیوں میں صرف اِس حد تک شریک ہُوئے کہ جو تیر دشمن کی طرف سے آتے تھے اُنھیں اٹھا کر آپ اپنے چچاؤں کو دے دیا کرتے تھے۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ بعد میں حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ مَیں اس میں اِتنا حصّہ بھی نہ لیتا تو اچھا ہوتا۔ سُہیلی نے لکھا ہے کہ آپؐ اس جنگ میں اپنے چچاؤں کے ساتھ گئے ضرور تھے مگر آپؐ نے لڑائی میں عملاً کوئی حصّہ نہ لیا۔

اِس ایک واقعہ کے سوا غزواتِ نبویؐ سے پہلے آپؐ نے کبھی کسی جنگ میں شرکت نہ کی اور نہ آپؐ کو کسی قسم کا جنگی تجربہ حاصل ہُوا۔ اِس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا دامن جاہلیت کی لڑائیوں سے پاک رہا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دورِ نبوّت کے غزوات میں آپؐ سے جو عظیم قائدانہ صلاحیتیں ظاہر ہوئیں وہ سراسر خداداد تھیں۔ آپؐ پیشہ ور سپہ سالار نہیں بلکہ پیدائشی سپہ سالار تھے۔

حِلفُ الفُضُول

حضورؐ ۱۴ سال کے تھے جب قُریش کے چند قبائل نے ایک مُعَاہدہ کیا جس کو حِلفُ الفضول کہا جاتا ہے۔ اسے لفظ "فُضُول" سے تعبیر کرنے کی وجہ ابنِ اثیر نے نہایہ میں یہ بیان کی ہے کہ جُرہُم کے زمانے میں بھی ایسا ہی ایک حِلف (مُعَاہدہ) ہُوا تھا جس کے طے کرنے والے سب آدمیوں کے نام فَضْل تھے، اس لیے اسے حِلفُ الفُضُول کہا گیا تھا۔ لیکن صحیح وجہ وہ ہے جسے حافظ ابنِ کثیرؒ نے حُمَیدی کے حوالہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادوں محمد اور عبدالرحمٰن سے نقل کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَیں عبداللہ بن جُدعان کے گھر میں ایک ایسے حِلف (مُعاہدہ) میں شریک ہُوا جس میں شرکت کی اگر مجھے اسلام کے زمانے میں بھی دعوت دی جاتی تو مَیں اسے پسند کرتا۔" پھر اس معاہدہ کی تشریح آپؐ نے یہ فرمائی: تحالفوا ان یردّوا الفضول علیٰ اھلھا والّا یعزّ ظالم مظلوما۔ "انہوں نے اس بات پر باہم معاہدہ کیا کہ فضول کو اس کے حقداروں کی طرف پلٹائیں گے اور ظالم مظلوم پر زیادتی نہ کرنے پائے گا۔" (البدایہ والنہایہ، جلد ۲، ص ۲۹۱) "فضول کو اُس کے حقداروں کی طرف پلٹانے" کا مطلب یہ ہے کہ جو فضل کسی ظالم نے زبردستی صاحبِ حق سے چھینا ہو اُسے واپس دلوایا جائے۔ اور ظالم کو اس کے ظُلم پر قائم نہ رہنے دیا جائے۔ ابنِ سعد نے اِس معاہدے کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے باہم طے کیا کہ ہم مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اُس کا حق اُسے دلوا کر رہیں گے۔ ابنِ ہشام نے معاہدے کی تفصیل یہ بیان کی ہے کہ مکّہ میں شہر کے کسی باشندے یا باہر سے کسی آنے والے پر

کوئی ظلم نہ ہونے دیں گے اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی مدد کریں گے۔ ابن سعد نے اس معاہدے کی تاریخ ذی القعدہ عام الفیل لکھی ہے۔

اس کا سبب یہ ہوا کہ زبید (یمن کے ایک قبیلے) کا ایک شخص کچھ تجارتی سامان لے کر مکہ آیا اور اس سے مکہ کے ایک سردار عاص بن وائل نے مال خرید لیا مگر قیمت نہ دی۔ اُس نے بنی عبدالدار، بنی مخزوم، بنی جمح، بنی سہم، بنی عدی میں سے ایک ایک کے پاس جا کر فریاد کی مگر سب نے اُسے جھڑک دیا اور عاص بن وائل سہمی کے مقابلے میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ سب طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد وہ صبح کے وقت کوہ ابوقبیس پر چڑھ گیا اور اس نے بلند آواز سے آلِ فہر کو پکار کر اپنی مظلومیت سے آگاہ کیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زبیر بن عبدالمطلب اُٹھے اور انہوں نے کہا کہ یہ معاملہ اس طرح نہیں چھوڑا جا سکتا پھر انہوں نے بنی ہاشم، بنی المطلب، بنی اسد بن عبدالعزّٰی، بنی زہرہ اور بنی تیم کو عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع کیا (جو حضرت عائشہؓ کا چچا زاد بھائی تھا) اور وہاں سب نے عہد کیا کہ مکہ میں شہر کا یا باہر کا جو شخص بھی مظلوم ہوگا اس کی مدد کریں گے اور ظالم سے اُس کا حق دلوا کر چھوڑیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد سب مل کر عاص کے پاس گئے اور اس سے زبیدی کا سامان واپس لے کر دیا۔

محمد بن اسحاق نے امام زہری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں عبداللہ بن جدعان کے ہاں ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا کہ اگر مجھے سرخ اونٹ بھی اس کے بدلے ملتے تو میں اسے چھوڑ کر انہیں قبول نہ کرتا اور اگر آج دورِ اسلام میں بھی ایسے کسی معاہدے کی طرف دعوت دی جاتے تو میں اسے قبول کروں گا۔

حضرت خدیجہؓ کے ساتھ تجارت میں شرکت

۲۰ اور ۲۵ سال کی عمر کے درمیان حضورؐ کے وہ جوہر ساری قوم پر (اور قوم سے مراد یہاں آپؐ کا قبیلۂ قریش ہے) عیاں ہوتے چلے گئے جو بچپن سے اب تک ایک محدود دائرہ میں معلوم و معروف تھے۔ آپؐ کی شرافت، دیانت و امانت، صداقت شعاری، حسنِ اخلاق، نیک نفسی، سنجیدگی و دانشمندی، ضبطِ نفس اور حلم و وقار، عالی حوصلگی اور بلند شان، غرض ایک ایک خوبی نمایاں ہونے لگی جس کی وجہ سے آپؐ کا غیر معمولی احترام اور اعتماد اور نفوذ و اثر لوگوں میں قائم ہوتا چلا گیا۔ یہی زمانہ ہے جب حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کے ساتھ تجارتی شرکت کا معاملہ کیا۔

حضرت خدیجہؓ قریش میں اپنی عفت اور پاکیزہ سیرت کی بنا پر طاہرہ کے لقب سے معروف تھیں۔ پورے قبیلے میں ان کی دانائی اور فہم و فراست اور اخلاق و اوصاف کے لحاظ سے ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو حسن و جمال کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ قریش کی کوئی عورت اُن سے زیادہ مالدار نہ تھی۔ بسا اوقات قریش کا آدھا قافلۂ تجارت صرف ان کے مال پر مشتمل ہوتا تھا۔ پہلے ان کی شادی ابوہالہ بن زرارہ تمیمی سے ہوئی تھی جس سے دو لڑکے ہند اور

ہالہ پیدا ہوئے اور عہدِ رسالت میں دونوں مسلمان ہو گئے۔ ابوہالہ کی وفات کے بعد اُن کی شادی عُتیق بن عابد المخزومی سے ہوئی جس سے اُن کی صاحبزادی ہند پیدا ہوئیں اور عہدِ نبوت میں وہ بھی مسلمان ہو گئیں[1]۔ اِس دوسرے شوہر کی وفات کے بعد وہ بیوہ ہی رہیں۔ قریش کے بہت سے سرداروں نے چاہا کہ وہ اُن میں سے کسی کے ساتھ شادی کر لیں، مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ اپنے مال سے وہ تجارت کرتی تھیں اور کسی نہ کسی شخص سے معاملہ کر لیتی تھیں کہ وہ ان کی طرف سے تجارتی قافلوں میں جاتے اور مقرر حصہ لے لے۔

اُنہیں جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق اور امانت اور بلند اخلاق کا حال معلوم ہُوا تو انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ میرا مالِ تجارت شام لے جائیں، مَیں دوسروں کو جتنا حصہ دیتی ہُوں، آپ کو اس سے زیادہ دُوں گی۔ یہ ابنِ اسحاق کی روایت ہے۔

دوسری روایت جو ابنِ سعد نے نُفَیسہ بنت مُنیَہ سے نقل کی ہے اور جس کی مزید تفصیل زُرقانی نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ ابو طالب نے حضورؐ سے کہا "بھتیجے مَیں مالدار آدمی نہیں ہُوں، ہمارے حالات خراب ہو رہے ہیں، اور ہمارے پاس کوئی مالِ تجارت بھی نہیں ہے۔ یہ قافلہ جو تمہاری قوم شام کی طرف بھیج رہی ہے اس کے چلنے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس میں خدیجہؓ بھی اپنا مال بعض لوگوں کے ہاتھ تجارت کے لیے بھیجنا چاہتی ہیں۔ اگر تم ان کے پاس جاؤ تو وہ تمہیں دوسروں پر ترجیح دیں گی۔ کیونکہ انہیں تمہاری پاکیزہ سیرت کا حال معلوم ہے۔" حضورؐ نے فرمایا شاید خدیجہؓ مجھے خود اس کام کے لیے کہلوائیں گی۔ ابو طالب نے کہا مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ کسی دوسرے کو منتخب نہ کر لیں۔ چچا بھتیجے کی یہ گفتگو حضرت خدیجہؓ تک پہنچ گئی، مگر حضورؐ کا اندازہ بالکل صحیح نکلا، کیونکہ وہ پہلے ہی حضورؐ کو وہ پیغام بھیج چکی تھیں جس کا ذکر اوپر ابنِ اسحاق کے حوالے سے کیا جا چکا ہے۔

طبقات ابن سعد میں ایک روایت یہ بھی ہے جو محمد بن عُقیل سے مروی ہے کہ ابو طالب نے حضرت خدیجہؓ سے جا کر کہا کہ اَے خدیجہؓ کیا تم پسند کرو گی کہ اپنی تجارت کے لیے کسی اور کی خدمات حاصل کرنے کے بجائے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے معاملہ کر لو۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ آپ اگر کسی دُور کے ناپسندیدہ آدمی کے لیے بھی فرماتے تو میں مان لیتی۔ آپ تو ایسے شخص کے لیے کہہ رہے ہیں جو حبیب قریب ہے۔

غرض حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کا تجارتی معاملہ طے ہو گیا اور انہوں نے اپنے غلام مَیسرہ کو آپ کے ساتھ اس تجارتی سفر پر شام بھیج دیا۔ یہ سفر ۱۵ یا ۱۶ ذی الحجہ ۲۵ عام الفیل کو شروع ہُوا۔ راستے میں مَیسرہ نے حضورؐ کے اخلاق، عادات اور خصائل کی وہ خوبیاں دیکھیں جن سے وہ آپ کا گرویدہ ہو گیا۔ واپس آکر اُس نے حضرت خدیجہؓ کو تفصیل کے ساتھ بتایا

---

[1] بعض لوگوں نے اس کے برعکس عُتیق کو اُن کا پہلا شوہر اور ابو ہالہ کو دوسرا شوہر بیان کیا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کہ اُس نے آپ کو کیسا پایا ہے۔ تجارت میں بھی حضورؐ نہایت کامیاب رہے۔ ابن سعد نے نُفیسہ بنت مُنیہ[3] کا بیان نقل کیا ہے کہ پہلے جتنا کچھ منافع کما کر دوسرے لوگ حضرت خدیجہؓ کو لا کر دیتے تھے آپؐ نے اس سے دُگنا منافع لا کر دیا اور حضرت خدیجہؓ نے بھی آپؐ کو جتنا دینے کا وعدہ کیا تھا اُس سے دوگنا دیا[1]۔

آپؐ کا حضرت خدیجہؓ سے نکاح

میسرہ جو مکّہ سے شام تک اور واپسی پر مکّہ تک کے طویل سفر میں شب و روز آپؐ کے ساتھ رہا تھا اور ہر پہلو سے آپؐ کی زندگی کو دیکھ کر آپ کا بندۂ بے دام بن چکا تھا، اس سے آپؐ کے حالات سُن کر حضرت خدیجہؓ نے آپؐ سے شادی کا عزم کر لیا۔ اگرچہ پہلے بھی وہ آپؐ سے ناواقف نہ تھیں اور قریش میں آپؐ کے جو محاسن معلوم عوام ہوتے جا رہے تھے اُن کا چرچا وہ سُن چکی تھیں۔ لیکن اب انہوں نے طے کر لیا کہ حضورؐ سے بہتر شوہر اُنہیں کوئی نہیں مل سکتا۔ نکاح کا معاملہ کس طرح طے ہُوا اِس کے متعلق کچھ روایات میں اختلاف ہے۔

ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود حضورؐ سے براہِ راست بات کی اور کہا کہ اے ابن عم آپ سے میری قرابت بھی ہے اور میں آپؐ کی امانت و صداقت اور حسنِ خُلق اور شرافتِ نسبی اور دیگر صفاتِ حمیدہ کی وجہ سے بھی یہ چاہتی ہوں کہ آپ سے شادی کر لوں۔

دوسری روایت ابن سعد کی ہے جو انہوں نے نُفیسہ بنت مُنیہؓ سے نقل کی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ حضرت خدیجہؓ نے نکاح کی خواہش ظاہر کرنے سے پہلے مجھے آپؐ کے پاس بھیجا تاکہ آپؐ کی مرضی معلوم کر لوں۔ میں نے جا کر آپؐ سے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" فرمایا "میرے پاس کیا رکھا ہے کہ میں شادی کروں؟" میں نے کہا "اس کا انتظام ہو گیا ہے، اور آپؐ کو ایک ایسی جگہ شادی کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے جہاں جمال بھی

---

[1] اِس ایک سفر کے علاوہ حضورؐ کے متعدد دوسرے تجارتی سفروں کا حال بھی حدیث و سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے جن کے دوران میں آپؐ کو عرب کے بہت سے علاقوں کو بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا۔ حاکم نے مُستدرک میں جُرَش (یمن کے ایک مشہور مقام) کی طرف آپؐ کے دو سفروں کا ذکر کیا ہے اور امام ذہبیؒ نے اس کی توثیق کی ہے۔ مُسند احمد میں ذکر ہے کہ بحرین سے عبدالقیس کا وفد جب آیا تو آپؐ نے وہاں کے ایک ایک مقام کا نام لے کر اس کا حال پوچھا۔ لوگوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں تمہارے ملک میں خوب پھرا ہُوں (مُسند، جلد ۳، ص ۲۰۶)۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اُس زمانے میں بحرین عرب کے پُورے مشرقی ساحل کا نام تھا، نہ کہ اُس جزیرے کا جسے اب بحرین کہا جاتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ (حضرت زُبیرؓ کی والدہ) حضرت خدیجہؓ کی بھاوج تھیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

[3] بعض مصنفین نے بنت اُمیّہ لکھا ہے لیکن صحیح بنت مُنیہ ہی ہے۔ یہ فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

ہے، مال بھی ہے، شرف بھی ہے اور قابلیت بھی۔ کیا آپ اسے قبول کریں گے؟ فرمایا وہ کون ہے؟ میں نے کہا خدیجہ۔ فرمایا میری ان سے شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ میں نے کہا اسے آپ میرے اوپر چھوڑ دیں۔ آپؐ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو میں تیار ہوں۔

اس کے بعد حضرت خدیجہؓ نے پیغام بھیجا کہ فلاں فلاں وقت آجائیے۔ اور اپنے چچا عَمرو بن اَسد کو کہلا بھیجا کہ آکر میری شادی کر دیں (حضرت خدیجہؓ کے والد خُویلد کا انتقال ہو چکا تھا)۔ اس طرح اُدھر سے عَمرو بن اسد اور اِدھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچاؤں حضرت حمزہ اور ابو طالب کو لے کر پہنچ گئے اور شادی[1] ہو گئی۔ عقد کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ اور رؤسائے مُضَر اور سردارانِ قریش شریک تھے۔ مہر میں حضورؐ نے ۲۰ اونٹ دیئے[2]۔ ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ یہ شادی سفرِ شام سے حضورؐ کی واپسی کے دو مہینے ۲۵ دن بعد ہوئی۔ حضورؐ کی عمر اس وقت ۲۵ سال تھی اور حضرت خدیجہؓ ۴۰ سال کی تھیں[3]۔

حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کی اولاد

حضورؐ کی ساری اولاد ماسوائے حضرت ابراہیمؓ کے (جو ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے) حضرت خدیجہؓ ہی سے تھی۔ ان میں سے دو صاحبزادے تھے اور چار صاحبزادیاں (۱) القاسم جن کی نسبت سے آپ ابوالقاسمؐ کہلاتے تھے (۲) عبداللہؓ جن کو طیّب اور طاہر بھی کہا جاتا تھا۔ (۳) حضرت زینبؓ (۴) حضرت رُقیّہؓ (۵) حضرت اُمِّ کلثومؓ (۶) حضرت فاطمہؓ۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے کون کس سے بڑا تھا لیکن یہ معلوم ہے کہ حضرت زینبؓ اُس وقت پیدا ہوئیں جب حضورؐ کی عمر ۳۰ سال تھی (الاصابہ)۔ اور حضرت فاطمہؓ کی ولادت اُس وقت ہوئی جب آپؐ ۴۱ سال کے تھے (شرح مواہب)۔ نیز یہ بھی تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلی ہجرت حبشہ جو ۵ بعد بعثت میں ہوئی اس میں حضرت رُقیّہؓ اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ گئی تھیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت زینبؓ سے ایک دو سال ہی چھوٹی ہوں گی تب ہی تو ۵ بعد بعثت میں شادی شدہ تھیں۔ (۱)

---

[1] ابن سعد نے لکھا ہے کہ ہماری تحقیق میں وہ تمام روایات غلط ہیں جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا نکاح ان کے باپ خُویلد نے پڑھایا تھا۔ اور اس سے بھی زیادہ واہی تباہی روایت یہ ہے کہ خُویلد کو شراب پلائی گئی اور نشے کی حالت میں اُس نے نکاح پڑھا دیا اور ہوش میں آنے کے بعد وہ سخت ناراض ہوا۔ ہمارے نزدیک اہلِ علم سے جو بات ثابت اور محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ خُویلد حربِ فجار سے پہلے مر چکا تھا اور حضرت خدیجہؓ کا نکاح ان کے چچا عَمرو بن اسد نے کیا تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے مہر میں ۴۰۰ دینار دیئے اور بعض میں ۵۰۰ درہم کا ذکر ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[3] ملاحظہ ہو [illegible]

ایک گروہ کی قبیح جسارت

بعض لوگ خدا سے بالکل بے خوف ہو کر بے تکلف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہؓ تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضورؐ کی اپنی صلب سے نہ تھیں بلکہ گیلڑ تھیں۔ حالانکہ یہ صریح قرآن کا انکار ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ "اے نبیؐ اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو" (الاحزاب۔ آیت ۵۹)۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ حضورؐ کی ایک نہیں بلکہ کئی بیٹیاں تھیں۔ اور یہ بات تاریخ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ ماریہ قبطیہؓ کے سوا حضورؐ کی باقی ازواج میں سے کسی کی کوئی اولاد آپؐ کی صلب سے نہ تھی۔ لہٰذا لامحالہ یہ بیٹیاں حضرت خدیجہؓ ہی کے بطن سے تھیں۔ یہ لوگ تعصب میں اندھے ہو کر یہ بھی نہیں سوچتے کہ اولادِ رسولؐ کے نسب سے انکار کر کے وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اس کی کیسی سخت جواب دہی انہیں آخرت میں کرنی ہوگی۔ تمام معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہؓ ہی نہ تھیں بلکہ تین اور بیٹیاں بھی تھیں۔ حضورؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحٰق حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

"ابراہیم کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد انہی کے بطن سے پیدا ہوئی اور ان کے نام یہ ہیں: قاسمؓ، طاہرؓ و طیبؓ[1]، اور زینبؓ، اور رقیہؓ، اور ام کلثومؓ اور فاطمہؓ۔ (سیرت ابن ہشام، جلد اول، ص ۲۰۲)۔ مشہور ماہر علم الانساب ہشام بن محمد بن السائب کلبی نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ مکہ میں نبوت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے پہلے قاسمؓ پیدا ہوئے، پھر زینبؓ، پھر رقیہؓ، پھر فاطمہؓ، پھر ام کلثومؓ۔ اور نبوت کے بعد عبداللہؓ پیدا ہوئے جن کو طیب و طاہر کہا گیا۔ ان سب کی والدہ حضرت خدیجہؓ تھیں (طبقات ابن سعد، جلد اول، ص ۱۳۳)۔ ابن حزم نے جوامع السیرۃ میں لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی چار لڑکیاں تھیں، سب سے بڑی حضرت زینبؓ، ان سے چھوٹی حضرت رقیہؓ، ان سے چھوٹی فاطمہؓ، اور ان سے چھوٹی ام کلثوم (ص ۳۸ تا ۳۹)۔ طبری، ابن سعد، ابوجعفر محمد بن حبیب صاحب کتاب المحبر اور ابن عبدالبر صاحب کتاب الاستیعاب، متعدد حوالوں سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت خدیجہؓ کے دو شوہر گزر چکے تھے۔ ایک ابو ہالہ تمیمی جن سے ان کے ہاں ہند اور ہالہ پیدا ہوئے۔ دوسرے عتیق بن عابد مخزومی جن سے ان کے ہاں ایک لڑکی ہند نامی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ان کا نکاح

---

[1] ابن القیمؒ نے زاد المعاد میں، سہیلی نے روض الانف میں اور ابن قتیبہ نے المعارف میں لکھا ہے کہ طاہر و طیب دو الگ بچے نہ تھے بلکہ یہ حضرت عبداللہ بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے القاب تھے۔ (حاشیہ از مرتب)

حضورؐ سے ہُوا اور تمام علمائے انساب متفق ہیں کہ آپؐ کی صُلب سے ان کے ہاں وہ چاروں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کے نام اوپر مذکور ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو طبری، جلد ۲، ص ۱۱ - طبقات ابن سعد، جلد ۸، ص ۴۰ تا ۱۲ - کتاب المحبّر ص ۸، ۷، ۹، ۲۰، ۷، ۴۵ - الاستیعاب، جلد ۲، ص ۸۰۱ تا ۸۰۲ - ان تمام بیانات کو قرآن مجید کی یہ تصریح قطعی الثبوت بنا دیتی ہے کہ حضورؐ کی ایک ہی صاحبزادی نہ تھیں بلکہ کئی صاحبزادیاں تھیں۔ (۲)

اِزدواجی زندگی

اگرچہ حضورؐ کی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر میں ۱۵ سال کا فرق تھا، لیکن دونوں کے درمیان اتنی محبت تھی کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپؐ تمام عمر ان کو یاد کرتے رہے۔ بخاری میں حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ آپؐ فرماتے تھے: خیر نسائها مریم و خیر نسائها خدیجة۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اپنی اُمّت کی بہترین عورت مریم تھیں اور اس اُمّت کی بہترین عورت خدیجہؓ ہیں۔ لیکن مسلم میں یہ روایت وکیع کے حوالہ سے آئی ہے اور اسے بیان کرتے ہوئے وکیع نے آسمان و زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضورؐ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وکیع نے یا جن لوگوں سے یہ روایت اُن کو پہنچی تھی انہوں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ دُنیا کی بہترین خواتین یہ دو ہیں۔

بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بیویوں میں سے کسی پر مجھے اتنا رشک نہیں آتا تھا جتنا حضرت خدیجہؓ پر آتا تھا، حالانکہ آپؐ سے میری شادی ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اکثر آپؐ کو اُن کا ذکر کرتے سُنتی تھی، اور جب کبھی آپؐ کوئی بکری ذبح فرماتے تو اس میں سے ضرور حضرت خدیجہؓ کی ملنے والیوں کو ہدیہ بھیجتے تھے۔ بخاری کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت خدیجہؓ کی بہن حضرت ہالہ بنت خویلد آئیں اور انہوں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضورؐ ان کی آواز سُن کر تڑپ گئے اور فرمایا اَللّٰھُمَّ ھَالَہ (خدایا یہ ہالہ ہوں) کیونکہ ان کی آواز حضرت خدیجہؓ سے مشابہ محسوس ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس پر مَیں جل گئی اور مَیں نے کہا "آپ قریش کی ایک بُڑھی عورت کو اتنا یاد کرتے ہیں جسے انتقال کیے

لے بیہقی نے مُصعب بن عبداللہ الزُّبیری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سب سے بڑے لڑکے قاسمؓ تھے، پھر صاحبزادی زینبؓ، پھر صاحبزادے عبداللہؓ، پھر اُمّ کلثومؓ، پھر فاطمہؓ، پھر رُقیّہؓ۔ یُونس بن بُکیر نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے ہاں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے دو صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں پیدا ہوئیں، القاسمؓ، عبداللہؓ، فاطمہؓ، اُمّ کلثومؓ، زینبؓ اور رُقیّہؓ۔ عبدالرزاق نے اپنی کتاب المُصنّف میں ابن جُریج کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کے ہاں دو لڑکے عبداللہؓ اور قاسمؓ پیدا ہوئے اور چار لڑکیاں جن میں حضرت زینبؓ سب سے بڑی اور حضرت فاطمہؓ سب سے چھوٹی تھیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

مدت گزر گئی اور اللہ نے آپ کو اُس سے اچھی بیوی دے دی"۔ مسند احمد اور طبرانی کی روایت میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ میری اِس بات پر حضورؐ کو غصہ آگیا اور میں نے آپ کو ناراض دیکھ کر عرض کیا کہ قسم ہے اُس خدا کی جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں آئندہ کبھی اُن کا ذکر بھلائی کے سوا کسی طرح نہ کروں گی۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد ابوالعاص بھی گرفتار ہو کر آئے تھے۔ حضورؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے (جو اُس وقت مکہ میں تھیں) اُن کو چھڑانے کے لیے ایک فدیہ بھیجا جس میں حضرت خدیجہؓ کا وہ ہار بھی تھا جو انہوں نے ابوالعاص سے اُن کی شادی کے وقت زمانۂ جاہلیت میں دیا تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر حضورؐ پر رقت طاری ہو گئی اور آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو زینبؓ کے قیدی کو ویسے ہی چھوڑ دو اور اس کا فدیہ واپس کر دو۔ سب لوگ اس پر راضی ہو گئے اور ابوالعاص فدیہ کے بغیر چھوڑ دیے گئے۔ بلاذری نے انساب الاشراف میں حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک کالے رنگ کی عورت حضورؐ کے پاس حاضر ہوئی تو آپؐ نے بڑی مسرت کے ساتھ اس کا استقبال فرمایا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا کہ اس عورت کی آمد پر آپ کے اس قدر خوش ہونے کی کیا وجہ تھی؟ فرمایا یہ اکثر خدیجہؓ کے پاس آیا کرتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی گہری محبت تھی جو ان کی وفات کے بعد بھی عمر بھر آپ کے دل میں تازہ رہی۔

۱۵ سال حضرت خدیجہؓ نبوت سے پہلے اور دس سال نبوت کے بعد آپؐ کی بیوی رہیں۔ نبوت کے دسویں سال ان کا انتقال ہوا جبکہ آپؐ پچاس سال کے تھے اور وہ ۶۵ سال کی تھیں۔ لیکن آپؐ نے اپنی ساری جوانی انہی ایک سن رسیدہ بیوی کے ساتھ گزار دی، اور کسی دوسری عورت کا خیال تک نہ کیا، حالانکہ اُس وقت اہل عرب میں کسی شخص کا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا کسی درجہ میں بھی معیوب نہ تھا اور نہ بیویاں ہی اس میں مانع ہوتی تھیں۔ خود حضرت خدیجہؓ کے خاندان سمیت، قریش کے تمام ہی خاندانوں میں ایک ایک شخص کی کئی کئی بیویاں ہونے کی بے شمار مثالیں موجود تھیں۔ اس کے باوجود آپؐ کا پچاس برس کی عمر تک ایک ایسی بیوی پر قانع رہنا جن کی عمر ۶۵ سال کی ہو چکی تھی اُن تمام معترضین کے لیے عملاً ایک منہ توڑ جواب ہے جو عمرِ شریف کے آخری دس سالوں میں حضورؐ کی کثرتِ ازدواج کو معاذ اللہ نفس پرستی پر محمول کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہم بحث کریں گے کہ عمر کے آخری دور میں وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر آپؐ نے متعدد نکاح کیے۔

خوشحالی کا دور اور آپؐ کے اخلاقی فضائل کا نمایاں ہونا

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد حضورؐ کی مفلسی کا دور ختم ہو گیا۔ پہلے وہ دوسروں کے ذریعہ سے تجارت کرتی تھیں جس میں ان کو نفع کم ملتا تھا کیونکہ دوسرے لوگ جس اخلاقی حالت میں مبتلا تھے اُس میں یہ امر کم متوقع ہو سکتا تھا کہ وہ غیر کے مال میں پڑ کر دیانت داری اور خیر خواہی سے کام لیں گے۔ مگر جب ان کی تجارت رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم جیسے امین اور فرزانہ شخص کے ہاتھ میں آئی جو فطری خیر خواہی کے ساتھ شوہر ہونے کے باعث بھی اپنی اہلیہ کے حق میں کمال درجہ کے خیر خواہ تھے، تو آپؐ کی تجارت چمک اُٹھی اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پُورا ہُوا :

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَأَغْنَىٰ (الضحیٰ - ۸)

"اور اللہ نے آپؐ کو غریب پایا پھر غنی کر دیا۔"

اِس دَور میں آپؐ کی صداقت و امانت، معاملات میں انتہائی راستبازی، سخاوت اور جود و کرم بھلائی بیکسوں کی مدد، غربا پروری، اور روا داری و فرزانگی کے وہ اوصاف تمام قریش اور گرد و نواح کے قبائل پر عیاں ہو گئے جو پہلے اپنے ظہور کے مواقع نہ پانے کی وجہ سے مخفی تھے۔ اب معاشرے میں بھی آپؐ کا مرتبہ محض اخلاقی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مادی حیثیت سے بھی اتنا بلند ہو گیا کہ آپؐ کا شمار سردارانِ قریش میں ہونے لگا۔ آپؐ کے اُوپر لوگوں کا اتنا اعتماد قائم ہو گیا کہ وہ اپنی قیمتی امانتیں آپؐ کے پاس رکھوانے لگے حتیٰ کہ یہ سلسلہ اُس وقت بھی جاری رہا جب اعلانِ نبوّت کے بعد مکّہ کے عوام و خواص آپؐ کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ اِس دشمنی کے باوجود وہ اپنی امانتیں آپ ہی کی حفاظت میں دیتے رہے اور ہجرت کے وقت آپؐ کو اپنے پیچھے صرف اِس لیے حضرت علیؓ کو چھوڑنا پڑا کہ ہر ایک کی امانت اسے واپس کر کے آئیں۔ یہ اِس بات کی کھُلی علامت تھی کہ نبوّت سے پہلے ہی نہیں، نبوّت کے بعد بھی دشمنانِ اسلام کے دلوں میں آپؐ کی دیانت و امانت کا نقش بیٹھا ہُوا تھا، اور وہ اپنے درمیان آپؐ کو سب سے زیادہ قابلِ اعتماد آدمی سمجھتے تھے۔

تجارتی معاملات میں آپؐ اِس قدر کھرے تھے کہ ایک صاحب جو زمانۂ جاہلیت میں آپؐ کے شریکِ تجارت رہ چکے تھے وہ بتاتے ہیں کہ آپ بہترین شریک تھے کبھی دھوکا نہ دیا کبھی کوئی چالبازی نہ کی، اور کبھی جھگڑا نہ کیا۔ ان صاحب کا نام مختلف روایتوں میں مختلف آیا ہے۔ ابنِ عبدالبرّ نے استیعاب میں قیس بن السائب بن عُوَیمر مخزومی لکھا ہے مُسندِ احمد کی کسی روایت میں سائب بن عبداللہ المخزومی بیان کیا گیا ہے اور کسی میں سائب بن ابی السائب المخزومی (کتاب الادب، باب فی کراہیۃ المراء) میں ان کا نام سائب ہی بیان کیا گیا ہے اور خود ان کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا تو لوگ میری تعریف کرنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہُوں۔ مَیں نے عرض کیا "میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ نے سچ فرمایا۔ آپ میرے شریکِ تجارت تھے لیکن ہمیشہ معاملہ صاف رکھا، نہ کبھی دھوکا دیا، نہ جھگڑا کیا" ابوداؤد ہی میں ایک اور صاحب عبداللہ بن ابی الحمساء کی روایت ہے کہ ایک دفعہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خرید و فروخت کا معاملہ کیا کچھ معاملہ طے ہُوا تھا اور کچھ باقی تھا۔ مَیں نے کہا کہ مَیں ابھی اِسی جگہ آ کر آپ سے پھر ملوں گا۔ اس کے بعد میں بھُول گیا تین دن گزر جانے کے بعد مجھے یاد آیا اور مَیں اُس جگہ پہنچا دیکھا

کہ آپؐ وہاں موجود ہیں۔ آپؐ نے فرمایا "اے جوان! تم نے مجھے بڑی تکلیف دی، تین دن سے میں یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" (کتاب الادب، باب فی العدۃ) (۴)

زید بن حارثہ کا واقعہ

سب سے زیادہ جو واقعہ آپؐ کے بلند ترین اخلاق کی شہادت دیتا ہے وہ حضرت زید بن حارثہ کا ہے۔ یہ قبیلۂ کلب کے ایک شخص حارثہ بن شرحبیل (یا شراحیل) کے بیٹے تھے اور ان کی ماں سُعدیٰ بنت ثعلبہ قبیلہ طے کی شاخ بنی معن سے تھیں۔ جب یہ آٹھ سال کے بچے تھے اُس وقت ان کی ماں انہیں اپنے میکے لے گئیں۔ وہاں بنی قین بن جسر کے لوگوں نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ جن آدمیوں کو وہ پکڑ لے گئے ان میں حضرت زیدؓ بھی تھے۔ پھر انہوں نے طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں لے جا کر ان کو بیچ دیا۔ خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انہوں نے مکہ لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں انہیں نذر کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح ہوا تو حضورؐ نے اُن کے ہاں زیدؓ کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپؐ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپؐ نے انہیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اُس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہنچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نبی بنانے والا تھا۔ اُس وقت حضرت زیدؓ کی عمر ۱۵ سال تھی۔ کچھ مدت بعد اُن کے باپ اور چچا کو پتہ چلا کہ ہمارا بچہ مکہ میں ہے۔ وہ انہیں تلاش کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپؐ جو فدیہ چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں، آپ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ تمہارے پاس جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہو اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔" انہوں نے کہا یہ تو آپؐ نے انصاف سے بھی بڑھ کر درست بات فرمائی ہے۔ آپؐ بچے کو بلا کر پوچھ لیجیے۔ حضورؐ نے زیدؓ کو بلایا اور اُن سے کہا ان دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا "جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا۔" آپؐ نے فرمایا "اچھا تم ان کو بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمہیں پوری آزادی ہے، چاہو تو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو تو میرے ساتھ رہو۔" انہوں نے جواب دیا "میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔" ان کے باپ اور چچا نے کہا "زید، کیا تُو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟" انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے اس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں ان کا تجربہ کر لینے کے بعد اب میں دنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔" زیدؓ کا یہ جواب سن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضورؐ نے اُسی وقت زیدؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ "آپ سب لوگ گواہ رہیں، آج سے زید

میرا بیٹا ہے، یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے"۔ اسی بنا پر لوگ ان کو زید بن محمدؐ کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوّت سے پہلے کے ہیں حضورؐ جب منصب نبوّت پر سرفراز ہوئے اُس وقت حضرت زیدؓ کو آپؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے ۱۵ سال گزر چکے تھے اور ایمان لانے کے وقت ان کی عمر ۳۰ سال تھی۔ (۴)

حضرت علیؓ حضورؐ کی سرپرستی میں

اِس زمانہ میں حضورؐ نے اپنے چچا ابوطالب کے اُن احسانات کو بھی یاد رکھا جو بچپن سے جوانی تک انہوں نے آپؐ پر کیے تھے۔ ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جب مکّہ اور اس کے اطراف میں شدید گرانی رُونما تھی، آپؐ کو خیال آیا کہ میرے چچا کی مالی حالت کمزور ہے اور وہ کثیر العیال آدمی ہیں۔ ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ چنانچہ آپ اپنے دوسرے چچا حضرت عباسؓ کے پاس گئے جو مالدار آدمی تھے اور اُن سے کہا کہ آپ کے بھائی کا کنبہ بڑا ہے، مالی حالت اچھی نہیں ہے، اور لوگ جس شدید گرانی کی حالت میں مبتلا ہیں وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں چلیے، ہم ان کا بار ہلکا کرنے کے لیے ان سے بات کریں اور ان کے ایک بیٹے کو آپ اپنی کفالت میں لے لیں اور ایک کو میں لیے لیتا ہوں"۔ حضرت عباسؓ اس بات پر راضی ہو گئے اور دونوں چچا بھتیجوں نے ابوطالب کے پاس جا کر مدعا بیان کیا۔ انہوں نے کہا عقیل اور بقول ابن ہشام طالب کو میرے لیے چھوڑ دو، باقی جس کو تم میں سے جو لینا چاہے لے لے۔ اس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو اپنے ہاں لے گئے اور حضرت عباسؓ نے حضرت جعفرؓ کو لے لیا۔ حضرت علیؓ اُن میں سب سے چھوٹے تھے۔ حضرت جعفرؓ اُن سے دس برس بڑے، حضرت عقیلؓ اُن سے دس برس بڑے اور طالب اُن سے بھی دس برس بڑے تھے۔ ان کے علاوہ ابوطالب کے دوسرے بچّے بھی تھے۔

اس طرح حضرت علیؓ بچپن ہی میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش میں آ گئے تھے اور حضورؐ نے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی عمر اُس وقت ۴-۵ برس سے زیادہ نہ تھی۔

کعبہ کی تعمیرِ نَو

حضورؐ ۳۵ سال کے تھے اور نبوّت میں ابھی پانچ سال باقی تھے کہ قریش نے کعبہ کو از سرِ نَو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کی عمارت بہت بوسیدہ ہو گئی تھی، سیلابوں نے اس کو منہدم ہونے کے قریب پہنچا دیا تھا، دیواریں بھی نیچی تھیں، اُوپر کوئی چھت بھی نہ تھی، اور تعمیر اِس طرح ہُوئی تھی کہ بس پتھر پر پتھر رکھے ہُوئے تھے، کسی چیز سے ان کو جوڑا نہیں گیا تھا۔ دروازہ بھی زمین کے برابر تھا۔ کعبہ کا خزانہ اُس وقت ایک کنوئیں میں تھا جو عمارت کے اندر بنا ہُوا تھا۔ بعض لوگ دیواریں پھاند کر وہاں پہنچ جاتے اور چوری کر لیتے تھے۔ چنانچہ تعمیرِ جدید کا فیصلہ ہو

سے پہلے بنی ملیح کے ایک غلام دُوَیک نے کعبہ کا مال چُرا لیا تھا، یا چوروں نے مال لے کر دُوَیک کے پاس رکھوا دیا تھا اور اُسی کے پاس سے وہ برآمد ہُوا تھا[1]۔ اِن وجوہ سے قریش کے لوگ چاہتے تھے کہ بلند اور پختہ عمارت بنا کر اوپر چھت ڈال دیں۔ اسی زمانہ میں ایک رُومی تاجر کے جہاز کو سمندر کی موجوں اور طوفانی ہواؤں نے بقولِ ابن اسحٰق جدّہ کے بندرگاہ پر، اور بقولِ ابن سعد شُعَیبہ پر (جو جدّہ سے پہلے حجاز کا بندرگاہ تھا) لا کر پٹخ دیا جس سے اس کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ اُس میں باقوم نامی ایک رُومی معمار بھی تھا، اور مکّہ میں ایک قبطی نجّار لکڑی کا کام کرنے کے لیے بھی موجود تھا۔ جہاز ٹوٹنے کی خبر سُن کر ولید بن مُغیرہ قریش کے چند آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور جہاز کی لکڑیاں خرید لیں۔ باقوم سے بات چیت کر کے اِن لوگوں نے اس کو بھی راضی کر لیا کہ تعمیرِ کعبہ کا کام وہ انجام دے۔ اس کے بعد بنی مخزوم میں سے ایک شخص ابو وہب بن عَمرو بن عائذ (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے والد کا ماموں تھا) اُٹھا اور اس نے کعبہ کا ایک پتھر نکال کر اس کی جگہ واپس رکھا اور پھر قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے کہا "اے قریش کے لوگو، اِس کی تعمیر میں اپنی حلال کی کمائی لگانا۔ اس میں زنا کاری کی کمائی، سُود کی کمائی، یا کسی شخص پر ظلم کر کے حاصل کی ہوئی کمائی داخل نہ ہونے پائے۔" ایک اور روایت میں اُس کے الفاظ یہ ہیں کہ "اِس گھر کی تعمیر میں کوئی ایسا مال نہ لگاؤ جو تم نے غصب کر کے، یا قطع رحمی کر کے، یا کسی ذمّہ کو جو تمہارے اور کسی دوسرے انسان کے درمیان ہو توڑ کر حاصل کیا ہو۔" لیکن قریش کے لوگ کعبہ کو منہدم کرتے ہُوئے ڈر رہے تھے۔ آخر کار ولید بن مُغیرہ نے سابق عمارت کو ڈھانے کے لیے کُدال ہاتھ میں لی اور کہا "اے اللہ، ہم دین سے منحرف نہیں ہو رہے ہیں۔ ہم خیر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے" (یعنی کسی بُری نیّت سے تیرے گھر کو نہیں ڈھا رہے ہیں)۔ یہ کہہ کر اُس نے کعبہ کے ایک حصہ پر ضرب لگائی اور پھر رُک گیا۔ رات بھر سب لوگ اس انتظار میں رہے کہ ولید پر کوئی آفت آتی ہے یا نہیں۔ اگر آفت آ جائے تو ہم کام روک دیں گے اور جو پتھر اکھڑا ہے اُسے اُسی کی جگہ پر لگا دیں گے۔ اور اگر کوئی آفت نہ آئے تو کام جاری رکھیں گے۔ صبح جب ولید پر اس فعل کا کوئی وبال نہ ٹوٹا تو عمارت کو منہدم کرنے کا کام مختلف سمتوں سے مختلف قبیلوں نے اپنے اپنے ذمّہ لیا اور بیت اللہ کی بنیادوں تک دیواریں توڑ دی گئیں۔ پھر سارے قبیلوں کے لوگ پتھر اُٹھا اُٹھا کر لانے اور عمارت

---

[1] ابن اثیر نے لکھا ہے کہ چوری کا شُبہ دراصل تین آدمیوں پر تھا جن میں سے ایک ابو لہب بھی تھا لیکن مال چونکہ دُوَیک کے قبضہ سے برآمد ہُوا تھا اس لیے اسی کو سزا دی گئی۔ (جلد ۲۔ ص ۲۷-۲۸) (حاشیہ از مؤلف)

[2] یہ ابن اسحٰق کا بیان ہے۔ مُوسیٰ بن عُقبہ نے مَغازی میں اِسے ولید بن مُغیرہ کا قول لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

تعمیر کرنے میں شریک ہوئے[1]۔ جب اُس مقام تک پہنچ گئے جہاں حَجَرِ اَسوَد نصب کیا جاتا تھا تو ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اُسے حاصل ہو۔ اس پر اتنا جھگڑا ہُوا کہ آپس میں لڑائی تک کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ چار پانچ روز یہی جھگڑا چلتا رہا۔ آخر ایک روز حَرَم میں سب مشورہ کے لیے جمع ہُوئے۔ بنی مَخزُوم میں سے ایک شخص ابو اُمَیّہ بن المُغیرہ (ولید بن مُغیرہ کے بھائی ہنے) جو اُس وقت سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا، اُٹھ کر تجویز پیش کی کہ "اَے قُریش کے لوگو، اپنے اِس اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے اِس بات پر اتفاق کر لو کہ سب سے پہلے جو شخص اِس مسجد کے دروازے[2] سے داخل ہو وہ اس کا فیصلہ کر دے"۔ اس تجویز کو سب نے مان لیا۔ اب خدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ سب سے پہلے داخل ہونے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ لوگوں نے آپؐ کو دیکھتے ہی کہا ھٰذَا الاَمِیْنُ، رَضِیْنَا، ھٰذَا مُحَمَّدٌ "یہ امین ہیں۔ ہم راضی ہو گئے۔ یہ تو محمدؐ ہیں"۔ مُسنَد احمد کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے آپؐ کو دیکھتے ہی کہا اتاکم الامین "تمہارے پاس امین آ گیا"۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معلُوم ہُوا کہ اب اِس قضیہ کا فیصلہ آپؐ کو کرنا ہے تو آپؐ نے فرمایا ایک کپڑا لاؤ۔ لوگ کپڑا لے آئے۔ آپؐ نے حجرِ اَسوَد کو اُس کپڑے پر رکھ دیا۔ پھر فرمایا ہر قبیلہ ایک ایک طرف سے اِس کپڑے کو پکڑ لے اور سب مل کر حجرِ اسود کو اُٹھائیں۔ جب پتھر اُس مقام تک پہنچ گیا جہاں اس کو لگانا تھا تو آپؐ نے اُسے اپنے ہاتھ سے وہاں لگا دیا۔

یہ نبوّت سے صرف پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اُس وقت ساری قوم نے بالاتفاق حضُورؐ کے امین ہونے کی شہادت دی تھی۔ اور ساری قوم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ آپؐ کس قدر دانشمند انسان ہیں کہ اِتنے

---

[1] اِس نئی تعمیر کے موقع پر سامان کی کمی کے باعث کعبہ کے ایک حصّے کو باہر چھوڑ دیا گیا اور اُس کے گرد دیوار کھینچ دی گئی تاکہ معلوم ہوتا رہے کہ یہ کعبہ کا ایک حصّہ ہے۔ اِس کو حِجر بھی کہتے ہیں اور حَطیم بھی۔ اِسی جگہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السّلام مدفون تھے (ابن ہشام)۔ ابنِ سعد نے لکھا ہے کہ قریش نے بیت اللہ کا دروازہ اتنا بلند کیا جتنا اب ہے۔ وہ پیر اور جمعرات کو دروازہ کھولتے اور حاجب دروازے پر کھڑے رہتے۔ چڑھنے والا جب سیڑھیاں چڑھ کر اندر جانے لگتا تو جس کو وہ داخل ہونے دینا چاہتے اُسے داخل کر لیتے اور جسے داخل نہ ہونے دینا چاہتے اسے دھکا دے کر گرا دیتے تھے۔ (حاشیہ از مؤلّف)

[2] دروازے سے مراد باب بنی شَیبَہ ہے۔ ایک روایت میں اس کا قول یہ ہے کہ جو شخص سب سے پہلے باب الصفا سے داخل ہو وہ اس کا فیصلہ کرے۔ موسیٰ بن عقبہ کا قول ہے کہ یہ مشورہ خود ولید نے دیا تھا۔ لیکن الفاکہی اور واقدی اور ابنِ اسحٰق ابو اُمیّہ کا نام لیتے ہیں۔ (حاشیہ از مؤلّف)

خطرناک قضیے کو بہترین طریقے سے حل کر کے آپؐ نے اپنی قوم کو خانہ جنگی سے بچا لیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ صرف یہی ایک موقع نہ تھا جبکہ حضورؐ نے قریش کے ایک قضیے کا فیصلہ کیا ہو، بلکہ نبوت سے قبل اکثر لوگ اپنے معاملات کا تصفیہ کرانے کے لیے آپؐ سے رجوع کرتے تھے۔

نبوت سے پہلے حضورؐ کو قریب سے جاننے والے

نبوت سے قبل جن لوگوں کو سب سے زیادہ قریب سے آپؐ کی زندگی دیکھنے اور آپؐ کے حالات جاننے کا موقع ملا تھا اُن میں کچھ تو آپؐ کے اپنے گھر کے لوگ تھے، یعنی حضرت خدیجہؓ جو ۱۵ سال سے آپؐ کی زوجۂ محترمہ تھیں، حضرت علیؓ جنہوں نے بچپن سے آپؐ کے گھر میں پرورش پائی تھی، حضرت زید بن حارثہؓ جنہوں نے ماں باپ کو چھوڑ کر آپؐ کے ساتھ رہنا قبول کیا تھا اور آپؐ نے ان کو بیٹا بنا لیا تھا، اور حضرت اُمِّ ایمنؓ جنہوں نے بچپن سے آپؐ کو پالا تھا اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے ہمیشہ آپؐ کے ساتھ رہی تھیں، جنہیں حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ "میری ماں کے بعد یہ میری ماں ہیں"، اور جن کو آپؐ یا اُمّہ (اے میری ماں) کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ گھر سے باہر کے متعدد اصحاب ایسے تھے جنہیں آپؐ کی ہم نشینی کا شرف حاصل تھا اور جو ایک مدت سے آپؐ کی صحبت میں بیٹھا کرتے تھے۔

ان میں سب سے زیادہ آپؐ کے قریبی دوست حضرت ابوبکرؓ تھے۔ ابن مندہ نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ یہ ۱۸ سال کی عمر سے حضورؐ کی صحبت میں بیٹھتے تھے جبکہ حضورؐ کی عمر ۲۰ سال تھی۔ اُس وقت سے دونوں کے درمیان دوستی چلی آرہی تھی، کیونکہ مکہ میں کوئی دو آدمی ایسے نہ تھے جن کا مزاج، عادات، خصائل اور اخلاق ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ ہوں جتنے حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے تھے۔ جاہلیت کے زمانہ میں یہ بڑے ذی وجاہت اور رؤسائے قوم میں سے ایک رئیس تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ اپنے اخلاق کی وجہ سے لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے جاہلیت میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ قریش نے دیت کے معاملات ان کے سپرد کر رکھے تھے، جس دیت کا بار یہ قبول کر لیتے، سارا قبیلہ اسے اُٹھانے پر راضی ہو جاتا اور جس بار کو کوئی دوسرا قبول کرتا تو لوگ اس کی توثیق سے انکار کر دیتے تھے۔ انساب کے معاملہ میں قریش کے لوگ سب سے زیادہ ان کے علم پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کا جو اخلاقی اثر نہ صرف قریش میں، بلکہ آس پاس کے قبائل تک میں تھا اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب مکہ میں مسلمانوں پر مظالم کی انتہا ہو گئی تو حضرت ابوبکرؓ بھی ہجرت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک دن یا دو دن کی مسافت طے کی تھی کہ احابیش[1] کا سردار

---

[1] احابیش تین قبیلوں کا مجموعہ تھا جن میں بنو الحارث بن عبد مناۃ بن کنانہ، بنی الہون بن خزیمہ بن مدرکہ (یعنی عضل و قارہ)،

ابن الدُّغُنّہ راستے میں ملا۔ اُس نے پوچھا ابوبکرؓ، تم کہاں جا رہے ہو؟ اُنہوں نے کہا "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، سخت اذیتیں دی ہیں اور میری زندگی تنگ کر دی ہے۔" اُس نے کہا "کیوں؟ خدا کی قسم تم تو معاشرہ کی زینت ہو، مصیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہو، نیک کام کرتے ہو، غریبوں کی مدد کرتے ہو۔ چلو میں تم کو پناہ دیتا ہوں۔" پھر وہ انہیں لے کر مکہ میں آیا اور اُس نے اعلان کیا کہ "میں نے ابن ابی قحافہ کو اپنی پناہ دی ہے۔ اب کوئی ان سے بھلائی کے سوا کسی اور طرح تعرض نہ کرے۔"

دوسرے صاحب حضرت صُہیبؓ بن سنان رُومی تھے۔ اصل میں بنی نمر بن قاسط میں سے تھے جن کا علاقہ ایران کی حکومت میں موصل کے قریب واقع تھا۔ بچپن میں رُوم و ایران کی ایک لڑائی کے موقع پر گرفتار ہوتے اور ایک مدت تک رُومیوں کی غلامی میں رہنے کے بعد فروخت ہوتے ہوتے مکہ پہنچے جہاں عبداللہ بن جُدعان نے ان کو خرید لیا۔ ابن جُدعان چونکہ حضرت ابوبکرؓ کا قریبی رشتہ دار تھا اس لیے اُن کے توسّط سے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعارف ہوئے اور آپؐ سے مانوس ہو کر اکثر آپؐ کی صحبت میں بیٹھنے لگے۔ ان کا مرتبہ یہ تھا کہ جب حضرت عمرؓ کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے وصیت کی کہ جب تک شوریٰ کسی ایک خلیفہ پر متفق نہ ہو جائے یہی مسجدِ نبویؐ میں نماز پڑھاتے رہیں۔

تیسرے حضرت عمّار بن یاسرؓ تھے جن کا اپنا قول بیہقیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کا حال مجھ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ میں آپؐ کا ہم نشیں، دوست، اور آپؐ سے بہت مانوس تھا۔ حضرت صہیبؓ اور یہ ایک ساتھ ایمان لائے۔

چوتھے حضرت حکیم بن حِزام تھے۔ قریش کے معزز رؤسا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ رِفادہ کا منصب ان کے سپرد تھا۔ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ عمر اُن کی حضورؐ سے پانچ سال زیادہ تھی۔ مُسنَد احمد میں عِراک بن مالک کی روایت ہے کہ ان سے خود حضرت حکیم نے بیان کیا کہ جاہلیت کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھ کو سب سے زیادہ محبت تھی۔ زُبیر بن بَکّار کہتے ہیں کہ نبوت کے بعد بھی حضورؐ کے ساتھ ان کی محبت جُوں کی تُوں قائم رہی، اگرچہ ایمان وہ فتحِ مکہ کے بعد لائے۔

پانچویں صاحب اَزدِ شنُوءَہ کے قبیلے سے تعلق رکھنے والے ضِماد بن ثَعلبہ تھے۔ طبابت و جرّاحی کا پیشہ کرتے تھے۔ ابن عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ وہ جاہلیت کے زمانہ میں حضورؐ کے دوست تھے۔ مُسنَد احمد میں ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ زمانۂ نبوت میں جب یہ مکّہ میں آئے تو لوگوں نے انہیں بتایا کہ حضورؐ مجنون ہو گئے ہیں۔ وہ سیدھے آپؐ کے پاس پہنچے اور کہا مجھے بتائیے، آپ کو کیا تکلیف ہے۔ میں آپ کا علاج کر دوں گا۔ حضورؐ نے جواب میں ان کو چند مؤثر جملے سنائے جو آپؐ خطبۂ مسنونہ میں شامل ہیں

م۔ اور قریش کے قبائل، اور خزاعہ میں سے بنو المُصطَلِق شامل تھے۔ انہوں نے مل کر مکہ کے زیریں علاقہ میں اُحبُش نامی ایک وادی کے اندر باہم دوستی اور امداد و باہمی کا معاہدہ کیا تھا، اِس وجہ سے یہ احابیش کہلاتے تھے (حاشیہ از مؤلف)

لے یہ تقریباً وہی صفات ہیں جو نزولِ وحی کے بعد حضرت خدیجہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کی تھیں (حاشیہ از مؤلف)

اُنہیں سُن کر یہ مسلمان ہو گئے۔

پھر کچھ لوگ وہ تھے جو قریبی رشتہ داری کی وجہ سے آپؐ کو خوب جانتے تھے اور جن سے آپؐ کی زندگی کا کوئی پہلو چھپا ہوا نہ تھا۔ مثلاً حضرت عثمانؓ بن عفّان، جو آپؐ کی پھوپھی اُمِّ حکیم البیضاء کے نواسے تھے حضرت زبیرؓ بن العوّام، جو آپؐ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے بیٹے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عُمیرؓ بن ابی وقّاص جو حضورؐ کی والدہ ماجدہ کے رشتہ دار تھے۔ حضرت ابوسلمہؓ جو آپؐ کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی۔ حضرت عبداللہؓ بن جحش جو آپؐ کی پھوپھی اُمیمہ کے بیٹے تھے۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب جو آپؐ کے چچا زاد بھائی تھے۔

یہ لوگ سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے ہیں اور ان کا اسلام لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر ان کے دلوں پر آپؐ کے فضائلِ اخلاق کا نقش پہلے ہی اِس طرح ثبت ہو چکا تھا کہ انہیں آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر لینے میں کوئی تامّل نہ ہُوا۔ اِس ایمان کو رشتہ داری یا دوستی یا ذاتی محبّت پر محمول نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان چیزوں کی بنا پر کوئی شخص کسی کی خاطر اپنا دین تبدیل نہیں کیا کرتا۔

حُلیۂ شریف

زمانۂ قبلِ نبوت کے حالات کو ختم کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا حُلیۂ شریف بھی بیان کر دیا جائے، کیونکہ آدمی کی شخصیت سے اُس کے حُلیے کا بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ بخاری، مُسلم، مُسندِ احمد، ترمذی، نسائی، بیہقی، حاکم، دارقُطنی وغیرہ کتبِ حدیث میں حضرت علیؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت انسؓ، حضرت براءؓ بن عازب، حضرت جابرؓ بن سَمُرہ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت عبداللہؓ بن بُسر، حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ اور بعض دوسرے صحابۂ کرام سے اِس سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں، ان کو جمع کر کے ہم مجموعی طور پر آپؐ کا حُلیۂ مبارک یہاں بیان کرتے ہیں۔

آپؐ کا قد نہ بہت لمبا تھا نہ ٹھنگنا، بلکہ متوسط قامت سے کچھ نکلتا ہُوا تھا، اور کسی مجمع میں آپؐ ہوتے تو نمایاں نظر آتے تھے۔ چہرہ نہ لمبوترا تھا نہ بالکل گول، بلکہ کچھ گولائی لیے ہوئے تھا۔ رنگ نہ گندمی تھا نہ سُرخ نہ بالکل سفید، بلکہ گورا سُرخی مائل اور روشن تھا۔ سر بڑا تھا۔ سینہ چوڑا تھا اور دونوں شانوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ جسم گٹھا ہُوا تھا مگر موٹا نہ تھا۔ جوڑ بند بہت مضبوط تھے۔ بازو بھرے ہوئے اور پنڈلیاں جسم سے متناسب تھیں۔ بازوؤں اور پنڈلیوں پر ہلکے ہلکے بال تھے۔ باقی جسم بالوں سے

ملہ حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر کے بیٹے۔ (حاشیہ از مؤلف)

صاف تھا اور سینے پر بالوں کی ایک لکیر سی ناف تک جاتی تھی۔ سر اور داڑھی کے بال گھنے تھے۔ بالوں میں نہ حبشیوں کی طرح گھونگھریالا پن تھا، نہ بالکل سیدھے تھے، بلکہ ہلکا سا گھونگھر تھا۔ آخر عمر تک سر اور داڑھی میں مشکل سے ۲۰ بال سفید ہوئے تھے اور وہ بھی اُس وقت نمایاں ہوتے تھے جب آپؐ نے تیل نہ لگایا ہوتا تھا۔ سر کے بال کبھی نصف کان تک، کبھی کان کی لَو تک اور کبھی اس سے بھی نیچے تک لمبے رکھتے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بہت خوبصورت تھیں، سُرمہ لگائے بغیر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سُرمہ لگائے ہوئے ہیں۔ آنکھوں کے ڈھیلوں میں ہلکے ہلکے سُرخ ڈورے سے تھے۔ پلکیں گھنی اور لمبی تھیں، بھویں ایک دوسری سے الگ تھیں یا ملی ہوئی نہ تھیں۔ منہ بڑا تھا۔ عربوں میں اسی کو خوبصورتی سمجھا جاتا تھا اور چھوٹے منہ کو پسند نہ کیا جاتا تھا۔ ایڑیاں ہلکی تھیں اور ہاتھ پاؤں کی انگلیاں لمبی اور بھاری تھیں۔ پاؤں کی بیچ کی انگلی انگوٹھے سے کچھ نکلتی ہوئی تھی۔ ہتھیلیاں اور تلوے بھرے بھرے تھے۔ پہلی نظر میں جو دیکھتا مرعوب ہو جاتا تھا، مگر جس قدر آپ سے قریب ہوتا اتنا ہی آپؐ کی نرم مزاجی اور حُسنِ اخلاق سے متاثر ہو کر آپؐ سے مانوس ہو جاتا تھا۔ چلتے تھے تو قدم جما کر اس طرح چلتے تھے جیسے گہرائی میں اُتر رہے ہوں یا چڑھائی پر چڑھ رہے ہوں۔ کسی طرف متوجہ ہوتے تو پوری طرح ہوتے اور کسی طرف سے رُخ پھیرتے تو پوری طرح پھیرتے تھے، دُزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے یا صرف گردن موڑ کر دیکھنے کی عادت نہ تھی۔ چہرے پر تبسم طاری رہتا۔ کبھی ہنستے تو ٹھٹھا مار کر نہ ہنستے تھے۔ جسمانی طاقت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ رکانہ نے جو قریش کا سب سے زیادہ طاقتور پہلوان سمجھا جاتا تھا، جسے کبھی کوئی نہ پچھاڑ سکا تھا، آپؐ سے کشتی لڑی اور آپؐ نے اسے پچھاڑ کر بے بس کر دیا۔ وہ پھر اُٹھ کر مقابلہ پر آیا۔ آپؐ نے پھر اُسے پچھاڑ دیا۔ اُس نے کہا "اے محمدؐ، تعجب ہے، تم مجھے پچھاڑ دیتے ہو" اُس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ نے نہ کبھی ورزشیں کیں نہ پہلوانی کی، پھر بھی آپؐ نے اسے دو دفعہ پچھاڑ کر حیران کر دیا (بعد میں یہ صاحب بھی مسلمان ہو گئے تھے رضی اللہ عنہ)۔ حضورؐ کے لڑکپن کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن جُدعان کے ہاں ایک دعوت کے موقع پر ابوجہل آپؐ سے اُلجھ پڑا۔ وہ بھی تقریباً آپؐ کے برابر ہی کا لڑکا تھا۔ آپؐ نے اُٹھا کر اُسے اس طرح پٹخا کہ اس کا گھٹنا زخمی ہو گیا اور اس زخم کا اثر عمر بھر اس کے گھٹنے پر باقی رہا۔ ابنِ ہشام نے لکھا ہے کہ جنگِ بدر میں جب ابوجہل مارا گیا تو حضورؐ نے فرمایا اس کی لاش مقتولوں میں تلاش کی جائے اور اس کے گھٹنے کو دیکھا جائے، اس پر ایک زخم کا نشان ہو گا۔ چنانچہ جب اس کی لاش ملی تو نشان وہاں موجود تھا، پھر آپؐ نے خود یہ قصہ بیان فرمایا کہ اسے یہ زخم کیسے لگا تھا۔

اِس تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضورؐ صرف حُسنِ اخلاق ہی کا مجسمہ نہ تھے بلکہ مردانہ حُسن اور جوانمردی کا بھی بہترین نمونہ تھے۔ (۵)

حوالہ جات باب (۴)

① — اضافہ از مؤلف
② — تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب حاشیہ ۱۱ ۔
③ — اضافہ از مؤلف
④ — تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۶۸ ۔
⑤ — اضافہ از مؤلف

(بسلسلہ حاشیہ ۳ صفحہ ۱۱۴)

نکاح کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمروں کے بارے میں مشہور و مقبول روایت یہی ہے کہ اس وقت حضورؐ کی عمر ۲۵ سال تھی اور حضرت خدیجہؓ کی ۴۰ سال۔ لیکن شاذ روایات میں حضورؐ کی عمر ۲۱-۲۹-۳۰ اور ۳۷ سال اور حضرت خدیجہؓ کی عمر ۲۵-۲۸-۳۰-۳۵ اور ۴۵ سال تک بیان کی گئی ہے۔ اکثر اہل علم نے ان کو قبول نہیں کیا ہے، مگر بعض حضرات نے اس بنا پر حضرت خدیجہؓ کی عمر کے بارے میں ۴۰ سے ۳۰ سال تک کی روایات کو ترجیح دی ہے کہ ان کے نزدیک ۴۰ سال کی خاتون کے ہاں ۶ بچے پیدا ہونے ممکن نہیں ہیں، کیونکہ اوسطاً اگر ہر بچے کے درمیان ڈیڑھ سال کا فرق بھی ہو تو آخری بچہ ۴۹ سال کی عمر میں پیدا ہونا چاہیے، اور اگر ان روایات کو بھی ملحوظ رکھا جائے جن میں بعثت کے بعد حضرت خدیجہؓ کے ہاں اولاد ہونے کا ذکر کیا گیا ہے تو ان کی عمر اس وقت ۵۵ سال ہونی چاہیے، جو بعید از امکان ہے۔

ہمارے نزدیک یہ رائے علمی حیثیت سے درست نہیں ہے۔ طب النساء کے فن میں (Gynaecology) ایک مستند کتاب ہے جس کو اس فن کے دس استادوں نے ڈاکٹر اسٹینلے کلیٹن (Stanley G. Clayton) کے زیر ہدایت مرتب کیا ہے۔ اس کے بارھویں ایڈیشن میں اس مسئلے پر حسب ذیل تحقیقی رائے ظاہر کی گئی ہے:

"۴۵ اور ۵۰ سال کی عمر میں حیض بالعموم بند ہو جاتا ہے، لیکن بعض اوقات سن ایاس ۵۵ سال کی عمر تک، بلکہ اس سے بھی زیادہ دیر تک مؤخر ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض حالات میں ۳۵-۴۰ سال بلکہ اس سے بھی کم عمر میں واقع ہو جاتا ہے۔ عورت جلدی بالغ ہو جائے تو سن ایاس دیر میں رونما ہوتا ہے، اور حیض کی آمد دیر سے شروع ہو تو اکثر وہ جلدی بند ہو جاتا ہے۔" (صفحہ ۱۰۱)

اس تحقیقی رائے کی بنا پر یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے ہاں ۵۵-۶۰ سال کی عمر تک بچے پیدا ہوتے رہے ہوں۔ روایات میں بیان ہوا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ولادت اس وقت ہوئی تھی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ۴۱ سال اور سیدہ خدیجہؓ کی ۵۶ سال تھی۔

باب (۴)

آغازِ رسالت اور خفیہ دعوت کے ابتدائی تین سال

بعثت سے قبل انبیاء کا ذہنی سفر

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اُس کی نوعیت عام انسانی علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی۔ ان کے پاس نزولِ وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعۂ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے کو حاصل نہ ہو۔ چنانچہ حضورؐ سے فرمایا گیا:

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ۔ (الشوریٰ۔۵۲)

"آپ پہلے تو کچھ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔"

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔ (الضحیٰ۔۷)

"اور اللہ تعالیٰ نے تم کو ناواقفِ راہ پایا، پھر تمہیں راستہ بتایا۔"

عقلی معرفت سے الہامی ایمان تک

اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے اُنہی عام ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں، ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے، وحی آکر جو کچھ کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر اُن کا دل گواہی دیتا تھا، اب اُنہی کے متعلق وحی یقینی اور قطعی شہادت دے دیتی تھی کہ وہ حق ہیں اور اُنہی صداقتوں کا مشاہدہ اُنہیں کرا دیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے وثوق سے دُنیا کے سامنے اُن کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورہ ہُود میں بار بار بتکرار بیان کیا گیا ہے۔

چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً۔ (آیت۔۱۷)

"پھر کیا وہ شخص جو پہلے اپنے رب کی طرف سے ایک دلیلِ روشن پر تھا یعنی عقلی و فطری

ہدایت پر) ، اُس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اس کے پاس آگیا (یعنی قرآن)، اور اُس سے پہلے مُوسیٰ کی کتاب بھی رہنما اور رحمت کے طور پر موجود تھی۔ (کیا وہ اِس صداقت کے بارے میں شک کر سکتا ہے؟)"

پھر اس کے بعد یہی مضمون حضرت نوحؑ کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰىنِیْ رَحْمَۃً مِّنْ عِنْدِہٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْکُمْ اَنُلْزِمُکُمُوْھَا وَاَنْتُمْ لَھَا کٰرِھُوْنَ ۔ (آیت - ۲۸)

"اے میری قوم کے لوگو! غور تو کرو، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا اور اس کے بعد اُس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت (وحی و نبوّت) سے بھی نوازا، اور وہ چیز تم کو نظر نہیں آئی، تو اب کیا ہم زبردستی اُسے تمہارے سر چپک دیں؟"

پھر اسی مضمون کو آیت ۶۳ میں حضرت صالحؑ اور آیت ۸۸ میں حضرت شعیبؑ دُہراتے ہیں۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعہ سے حقیقت کا براہِ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم السلام مشاہدے اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کر کے (جسے اُوپر کی آیات میں "بَیِّنَۃٍ مِّنْ الرَّبِّ" سے تعبیر کیا گیا ہے) توحید اور معاد کی حقیقتوں تک پہنچ جاتے تھے۔ اور ان کی یہ رسائی وہبی نہیں بلکہ کسبی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انہیں علم وحی عطا کرتا تھا اور یہ چیز کسبی نہیں بلکہ وہبی ہوتی تھی۔

یہ مشاہدۂ آثار اور غور و فکر اور عقلِ عام (Common Sense) کا استعمال اُن قیاس آرائیوں اور اُس خرص و تخمین (Speculation) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے جس کا ارتکاب فلاسفر کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید ہر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے آثار دیکھو اور اُن سے صحیح نتیجہ اخذ کرو۔ اِس طرح آیاتِ الٰہی کے مشاہدے سے ایک غیر متعصب طالبِ حق حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔ (۱)

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانۂ قبلِ نبوّت کے جو حالات ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نبی ہونے سے پہلے ہی شرک سے پاک اور توحید کے قائل تھے۔ آپؐ نے ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی اپنی قوم کے مُشرکانہ عقائد کو قبول نہیں کیا، اس کی مُشرکانہ عبادات میں حصّہ نہیں لیا، تُوں اور بُت پرستی سے ہمیشہ بیزار رہے، اور بُتوں پر جو قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں ان سے اجتناب فرماتے رہے۔ زمانۂ قبلِ نبوّت میں آپؐ کا حال اپنی قوم کے ان حُنفاء سے ملتا جُلتا تھا جن کا ذکر ہم اِس جلد کے دوسرے باب میں کر چکے ہیں۔ جاہلیّت کے زمانہ میں جُرہُم اور خُزاعہ نے دینِ ابراہیمی میں جتنی تحریفات کی تھیں ان میں سے کسی کو

آپؐ نے نبوت سے پہلے بھی کبھی قبول نہیں کیا۔ اِسی طرح قریش نے اپنے دَور میں جن تحریفات کا اضافہ کیا، ان سے بھی آپؐ مجتنب رہے۔ مثال کے طور پر قریش نے اپنے لیے کچھ ایسے امتیازات قائم کر لیے تھے جن سے وہ دوسرے عربوں کے مقابلہ میں اپنی فضیلت جتانا چاہتے تھے۔ ابن ہشام اور ابن سعد کا بیان ہے کہ انہوں نے حج کے موقع پر عَرَفہ جانا اور وہاں سے اِفاضہ کرنا چھوڑ دیا تھا، صرف مُزدَلِفہ تک جا کر پلٹ آتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اہلِ حرم ہیں اور ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ عام حاجیوں کی طرح حرم سے باہر جا کر وقوفِ عَرَفہ کریں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو حرم سے باہر کے لوگوں اور ہمارے درمیان کوئی فرق نہ رہے گا اور ہماری حیثیت گر جائے گی۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ عرفہ جانا اور وہاں ٹھیرنا اور پھر وہاں سے مزدلفہ اور منٰی کی طرف پلٹنا اُن مشاعرِ حج میں سے ہے جو دینِ ابراہیمی میں شامل ہیں۔ رفتہ رفتہ ان امتیازات میں حرم سے باہر کے رہنے والے وہ قبائل بھی شریک ہو گئے جن سے قریش کی رشتہ داریاں تھیں، جیسے بنی کنانہ، اور خُزاعہ اور بنی عامر بن صَعصَعَہ۔ حتٰی کہ جو قبائل قریش کے حلیف تھے ان کی شان بھی عام عربوں سے اُونچی ہو گئی اور انہوں نے بھی عَرَفہ جانا چھوڑ دیا۔ لیکن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت سے پہلے ہی اس بدعت کو رَدّ کر دیا تھا۔ جُبَیر بن مُطعِم سے ابن اِسحاق کی روایت ہے کہ میں نے نزولِ وحی سے پہلے حضورؐ کو عام عربوں کے ساتھ وقوفِ عَرَفہ کرتے دیکھا ہے۔

قریش کو رائج کردہ بدعتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ حرم سے باہر کا رہنے والا اگر حج یا عُمرے کے لیے آتے تو وہ باہر سے لایا ہُوا نہ کھانا کھا سکتا ہے نہ باہر کے کپڑوں میں طواف کر سکتا ہے۔ کھانا وہ حرم کا کھائے اور کپڑا اگر حرم کا نہ ملے تو برہنہ طواف کرے۔ اگر اس نے بیرونی کپڑوں میں طواف کر لیا ہو تو اسے چاہیے کہ ان کپڑوں کو پھینک دے، نہ خود ان کو پہنے اور نہ کوئی ان کو ہاتھ لگائے۔ اہلِ عرب نے اس بدعت کو بے چون و چرا دین کی حیثیت سے قبول کر لیا اور اس طرح برہنہ طواف نے رواج پایا۔ حضورؐ نبوّت سے پہلے بھی اِن بدعتوں کو غلط سمجھتے تھے۔ (۲)

حضورؐ کا دَورِ بعثت

مُحدِّثین نے آغازِ وحی کا قصہ اپنی اپنی سندوں کے ساتھ امام زُہری سے، اور انہوں نے حضرت عُروَہ بن زُبیر سے اور انہوں نے اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ:

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا رویائے صادقہ (اور بعض روایات میں ہے اچھے) خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپؐ جو خواب بھی دیکھتے وہ ایسا ہوتا کہ جیسے آپ دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپؐ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی

لہ بیہقی کی روایت ہے کہ یہ کیفیت نزولِ وحی سے ۶ مہینے پہلے شروع ہو گئی تھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

کئی شب و روز غارِ حراء میں رہ کر عبادت کرنے لگے[1]۔ حضرت عائشہؓ نے تَحَنُّث کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی تشریح امام زُہری نے تَعَبُّد سے کی ہے۔ یہ کسی طرح کی عبادت تھی جو آپ کرتے تھے، کیونکہ اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ کو عبادت کا طریقہ نہیں بتایا گیا تھا۔ آپ کھانے پینے کا سامان گھر سے لے جا کر وہاں چند روز گزارتے پھر حضرت خدیجہؓ کے پاس آتے اور وہ مزید چند روز کے لیے سامان آپؐ کے لیے مہیا کر دیتی تھیں۔ (۴)

غارِ حراء میں خلوت گزینی کی وجہ

اس دور میں جن وجوہ سے آپؐ مکہ کی آبادی کو چھوڑ کر سنسان پہاڑیوں کے درمیان حراء کے غار میں خلوت گزیں ہوتے تھے اس کے وجوہ پر کچھ روشنی سورۂ الم نشرح کی اس آیت سے پڑتی ہے:

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (آیات ۲-۳)

"اور ہم نے تم پر سے وہ بھاری بوجھ اُتار دیا جو تمہاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔"

اس آیت میں وِزر کے معنی بھاری بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپؐ کی حسّاس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپؐ کے سامنے بُت پُوجے جا رہے تھے۔ شرک اور مشرکانہ اوہام و رسُوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرت میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا۔ زور داروں کی زیادتیوں سے بے زور پس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سَو سَو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرُو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پُشت پر کوئی مضبوط جتّھا نہ ہو۔ یہ حالات دیکھ دیکھ کر آپؐ کُڑھتے تھے مگر اس بگاڑ کو دُور کرنے کی کوئی صورت آپؐ کو نظر نہ آتی تھی۔ یہی فکر آپؐ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارِ گراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپؐ

---

[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ کیفیت کے بعد آپؐ اور زیادہ خلوت پسند ہو گئے تھے۔ ورنہ آپؐ کی خلوت پسندی اس سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ ابن ہشام اور طبری کی روایت کے مطابق ابن اسحاق اور عبداللہ بن زُبیر نے عُبَید بن عُمیر اللَّیثی سے نقل کیا ہے کہ آپؐ ہر سال ایک مہینہ حراء میں گزارتے۔ چند روز کا سامانِ خوراک لے کر جاتے، پھر واپس آکر پہلے کعبہ کے سات طواف کرتے اور اس کے بعد گھر سے مزید چند روز کا سامان لے جاتے تھے۔ نیز اُن کا بیان ہے کہ اس اعتکاف اور تحنُّث کے زمانے میں آپ مساکین کو کثرت سے کھانا کھلاتے تھے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ حضورؐ نے حراء میں جا جا کر قیام فرمانے کا یہ سلسلہ کب سے شروع کیا تھا۔ تاہم یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ عمل چند سال سے جاری تھا۔

(حاشیہ از مؤلف)

کے اُوپر سے اُتار دیا اور نبوّت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپؐ کو معلوم ہو گیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا قفل کھولا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اِس رہنمائی نے آپؐ کے ذہن کا سارا بوجھ ہلکا کر دیا اور آپؐ پُوری طرح مطمئن ہو گئے کہ اِس ذریعہ سے آپؐ نہ صرف عرب بلکہ پُوری نوعِ انسانی کو اُن خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔ (۴)

سچّے خواب

جیسا کہ حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتداء سچّے خوابوں سے ہُوئی تھی (بخاری و مسلم)۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی زمانۂ نبوّت کے ہر دَور میں جاری رہا ہے، چنانچہ احادیث میں آپؐ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپؐ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی آپؐ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے (الفتح آیت ۲۷)۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، فلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے، یا مجھے یہ بتایا گیا ہے یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اِس سے منع کیا گیا ہے۔ احادیثِ قُدسیہ زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔ (۵)

اِبتداءِ وحی

جب آپؐ کی عمر چالیس سال ۶ مہینے کی ہو چکی[1] تو ایک روز ماہِ رمضان میں یکایک آپؐ پر غارِ حرا میں وحی نازل ہُوئی اور فرشتے نے نمودار ہو کر آپؐ کے سامنے آکر آپؐ سے کہا پڑھو۔[2] بخاری میں کئی جگہ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے نقل ہُوا ہے۔ وہ خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد بیان کرتی ہیں کہ مَیں نے کہا "مَیں تو پڑھا

---

[1] عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ۴۰ سال کی عمر میں حضورؐ نبوّت سے سرفراز فرمائے گئے تھے لیکن آپؐ کی ولادت ۹ ربیع الاوّل سنہ عام الفیل میں ہُوئی۔ اور نبوّت آپؐ کو رمضان سنہ ۴۱ عام الفیل میں عطا ہوئی۔ اس لیے آغازِ نبوّت کے وقت عمر مبارک ٹھیک ۴۰ سال چھ مہینے تھی۔ (حاشیہ از مولف)

[2] عبداللہ بن زبیرؓ اور ابن اسحاق نے عُبَید بن عُمیر اللّیثی سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا خواب میں جبریلؑ نے آکر ایک ریشمی کپڑے میں لکھی ہُوئی تحریر مجھے دکھائی جس میں سُورۂ علق کی ابتدائی آیات لکھی ہُوئی تھیں اور مجھ سے کہا پڑھو۔ مَیں نے کہا مَیں پڑھا ہُوا نہیں ہُوں، پھر انہوں نے مجھے اس طرح بھینچا کہ مَیں سمجھا کہ میری جان نکل جائے گی پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھو اور اِقْرَأْ سے مَالَمْ یَعْلَمْ تک مجھے پڑھوایا۔ جب مَیں نیند سے بیدار ہُوا تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ تحریر میرے سینہ میں لکھی ہُوئی ہے (طبری، ابن ہشام، سہیلی)۔ ابن کثیر اِس روایت کو نقل کر کے کہتے ہیں کہ یہ گویا تمہید تھی اُس معاملہ کی جو جاگنے کے بعد بیداری میں پیش آیا، جس کا ذکر حضرت عائشہ والی حدیث میں آیا ہے۔ (حاشیہ از مولف)

پڑھا نہیں ہوں"۔ اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا، یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ مَیں نے کہا "مَیں تو پڑھا ہُوا نہیں ہُوں"۔ اُس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ مَیں نے پھر کہا "مَیں پڑھا ہُوا نہیں ہوں"۔[1] اُس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوتِ برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اُس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا) یہاں تک کہ مَا لَمْ يَعْلَمْ (جسے وہ نہ جانتا تھا) تک پہنچ گیا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کانپتے لرزتے ہُوئے وہاں سے پلٹے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر کہا "مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ"۔ چنانچہ آپ کو اُڑھا دیا گیا۔ جب آپؐ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دُور ہوگئی تو آپؐ نے فرمایا "اَے خدیجہؓ، یہ مجھے کیا ہوگیا ہے"۔ پھر سارا قصّہ آپؐ نے اُن کو سُنایا اور کہا "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے"۔[1] انہوں نے کہا "ہرگز نہیں، آپؐ خوش ہو جائیے۔ خدا کی قسم آپؐ کو اللہ تعالیٰ کبھی رُسوا نہ کرے گا۔[2] آپ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ امانتیں ادا کرتے ہیں) بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں، نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں (اور ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ آپؐ کے اخلاق کریمانہ ہیں)"۔ پھر وہ حضورؐ کو ساتھ لے کر وَرَقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو اُن کے چچا زاد بھائی تھے، زمانۂ جاہلیت میں بُت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہوگئے تھے، عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے، بہت بُڑھے اور نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے اُن سے کہا بھائی جان، ذرا اپنے بھتیجے کا قصّہ سُنیے[3]

---

[1] اس خوف کے بہت سے وجوہ عُلماء نے بیان کیے ہیں جن کی تعداد ۱۲ تک پہنچتی ہے، مگر ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ نبوت کے بارِ گراں کا تصوّر کر کے حضورؐ لرز رہے تھے اور آپؐ کو بار بار خیال آتا تھا کہ مَیں اتنا بڑا بوجھ کیسے اُٹھا سکوں گا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ اپنے آپ کو کوئی بڑی ہستی نہ سمجھتے تھے اور کوئی ایسا اِدّعا آپؐ کے ذہن میں نہ تھا کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہی ہونا چاہیے اور کوئی زعم آپ کو نہ تھا کہ میں ہی یہ عظیم کام انجام دینے کی قوت و اہلیت رکھتا ہوں۔ (حاشیہ از مؤلّف)

[2] ایک روایت میں الفاظ ہیں "اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو رنج میں مبتلا نہ کرے گا"۔ (حاشیہ از مؤلّف)

[3] حضورؐ کو اُن کا بھتیجا اس لیے کہا کہ ان کی تیسری پُشت میں عبدالعزّیٰ حضورؐ کی چوتھی پُشت میں عبدِمَناف کا بھائی تھا۔ (حاشیہ از مؤلّف)

(ابو نعیم کی روایت میں ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود سارا قصہ ورقہ کو سنایا)۔ ورقہ نے حضورؐ سے کہا بھتیجے تم کو کیا نظر آیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ ورقہ نے کہا "یہ وہی ناموس (عالَمِ بالا سے وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا۔[1] کاش میں آپؐ کے زمانۂ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اُس وقت زندہ رہوں جب آپؐ کی قوم آپؐ کو نکالے گی"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" ورقہ نے کہا ہاں، کبھی ایسا نہیں ہُوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لاتے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپؐ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپؐ کی پُرزور مدد کروں گا۔" مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔ (۶)

اس واقعہ سے کیا نتائج نکلتے ہیں؟

یہ قصہ خود اپنے مُنہ سے بول رہا ہے کہ فرشتے کی آمد سے ایک لمحہ پہلے تک بھی رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اِس بات سے خالی الذہن تھے کہ آپ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ اس چیز کا طالب یا مُتوقّع ہونا تو درکنار، آپؐ کے وہم وگمان میں بھی یہ نہ تھا کہ ایسا کوئی معاملہ آپؐ کے ساتھ پیش آئے گا۔ وحی کا نزول اور فرشتے کا اِس طرح سامنے آنا آپؐ کے لیے اچانک ایک حادثہ تھا جس کا پہلا تأثر آپؐ کے اوپر وہی ہُوا جو ایک بے خبر انسان پر اتنے بڑے ایک حادثہ کے پیش آنے سے فطری طور پر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپؐ اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو مکّہ کے لوگوں نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے مگر ان میں کوئی یہ کہنے والا نہ تھا کہ ہم کو تو پہلے ہی یہ خطرہ تھا کہ آپؐ کوئی دعویٰ کرنے والے ہیں کیونکہ آپؐ ایک مدت سے نبی بننے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اِس قصے سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبوت سے پہلے آپؐ کی زندگی کیسی پاکیزہ تھی اور آپؐ کا کردار کتنا بلند تھا۔ حضرت خدیجہؓ کوئی کم سن خاتون نہ تھیں بلکہ اِس واقعہ کے وقت ان کی عمر ۵۵ سال تھی اور پندرہ سال سے وہ حضورؐ کی شریکِ زندگی تھیں۔ بیوی سے شوہر کی کوئی کمزوری چھپی نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اِس طویل ازدواجی زندگی میں آپؐ کو اِتنا عالی مرتبہ انسان پایا تھا کہ جب حضورؐ نے اُن کو غارِ حرا میں پیش آنے والا واقعہ سُنایا تو بلا تأمّل انہوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ فی الواقع اللہ کا فرشتہ ہی آپؐ کے پاس وحی لے کر آیا تھا۔ اِسی طرح ورقہ بن نوفل بھی مکّہ کے ایک بوڑھے باشندے تھے، بچپن سے حضورؐ کی زندگی دیکھتے چلے آ رہے تھے، اور پندرہ سال کی قریبی رشتہ داری کی بنا پر تو وہ آپؐ کے حالات سے اور بھی زیادہ گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے بھی جب یہ واقعہ سُنا تو اسے کوئی وسوسہ نہیں سمجھا بلکہ سُنتے ہی بول اُٹھے کہ یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السّلام پر نازل ہُوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک بھی آپؐ اتنے بلند پایہ انسان تھے کہ آپؐ کا

[1] حضرت عیسیٰؑ کے بجائے حضرت موسیٰؑ کا ذکر غالباً اس لیے کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے تو نبوت کی بشارت پیدائش سے بھی پہلے دے دی گئی تھی، البتہ حضرت موسیٰؑ کو نبوت اسی طرح اچانک ملی جس طرح حضورؐ کو دی گئی۔ (حاشیہ از مؤلف)

نبوت کے منصب پر سرفراز ہونا کوئی قابلِ تعجب امر نہ تھا۔(۷)

صورت واقعہ کا تجزیہ

نزولِ وحی کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اچانک اِس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا تھا۔ آپؐ کو اس سے پہلے کبھی یہ گمان بھی نہ گزرا تھا کہ آپؐ نبی بنائے جانے والے ہیں۔ نہ اِس کی کوئی خواہش آپؐ کے دل کے کسی گوشے میں موجود تھی۔ نہ اس کے لیے کوئی تیاری آپؐ پہلے سے کر رہے تھے اور نہ اِس کے متوقع تھے کہ ایک فرشتہ اُوپر سے پیغام لے کر آئے گا۔ آپؐ خلوت میں بیٹھ بیٹھ کر مراقبہ اور عبادت ضرور فرماتے تھے۔ لیکن نبی بنائے جانے کا کوئی تصوّر آپؐ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا۔ اِس حالت میں جب یکایک غارِ حِراء کی اُس تنہائی میں فرشتہ آیا تو آپؐ کے اوپر اِس پہلے عظیم اور غیر معمولی تجربے سے وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو لامحالہ ایسے حالات میں ایک بشر پر طاری ہونی چاہیے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ کیسا ہی عظیم الشان بشر ہو۔ یہ گھبراہٹ بسیط نہیں بلکہ مرکب نوعیت کی تھی۔ طرح طرح کے سوالات حضورؐ کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے جنہوں نے طبعِ مبارک کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیا واقعی میں نبی ہی بنایا گیا ہوں؟ کہیں مجھے کسی سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا ہے؟ یہ بارِ عظیم آخر میں کیسے اُٹھاؤں گا؟ لوگوں سے کیسے کہوں کہ میں تمہاری طرف نبی مقرر ہوا ہوں؟ لوگ میری بات کیسے مان لیں گے؟ آج تک جس معاشرے میں عزت کے ساتھ رہا ہوں۔ اب اسی معاشرے کے لوگ میرا مذاق اڑائیں گے اور مجھے دیوانہ کہیں گے۔ اِس جاہلیت کے ماحول سے آخر میں کیسے لڑ سکوں گا؟ غرض اس طرح کے نہ معلوم کتنے سوالات ہوں گے جو آپؐ کو پریشان کر رہے ہوں گے۔

اسی وجہ سے جب آپؐ گھر پہنچے تو کانپ رہے تھے۔ جاتے ہی فرمایا کہ "مجھے اُڑھا دو، مجھے اُڑھا دو" گھر والوں نے آپؐ کو اُڑھا دیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ذرا دِل ٹھیرا تو سیّدہ خدیجہؓ رضی اللہ عنہ کو سارا واقعہ سنایا اور فرمایا:

لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي "مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔"

۷ے بے نظیر شخصیت کے مالک ہونے پر بھی وہ ذات عجب و خود پسندی سے اس درجہ خالی تھی کہ جب آپؐ نبوت کے منصبِ عظیم پر یکایک مامور کر دیئے گئے اُس وقت بھی کافی دیر تک آپؐ کو یہ اطمینان نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے تنہا ایک میں ہی اس قابل ہوں کہ اِس منصب کے لیے ربّ کائنات کی نگاہِ انتخاب میرے اُوپر پڑے۔(۸)

انہوں نے آپؐ کو اطمینان دلایا کہ:

کلا واللّٰہ ما یخزنک اللّٰہ ابداً - انک لتصل الرحم وتصدق الحدیث وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔

"ہرگز نہیں، خدا کی قسم! آپؐ کو اللہ کبھی رنج نہیں دے گا۔ آپ تو رشتہ داروں کے کام آتے ہیں، سچ بولتے ہیں، بیکسوں کی مدد کرتے ہیں، نادار کی دستگیری کرتے ہیں، مہمان کی تواضع کرتے ہیں، اور تمام نیک کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔"

پھر وہ ورقہ بن نوفل کے پاس آپ کو لے گئیں، کیونکہ وہ اہل کتاب میں سے تھے اور انبیائے سابقین کے حالات سے باخبر تھے۔ انہوں نے حضورؐ سے کیفیت سُن کر بلا تامل تصدیق کی کہ "یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر آیا تھا۔" اس لیے کہ وہ بچپن سے جوانی تک آپؐ کی انتہائی پاکیزہ سیرت سے خوب واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ یہاں پہلے سے نبوت کے دعوے کی کسی تیاری کا شائبہ تک نہیں پایا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں کو جب انہوں نے اس واقعہ سے ملایا کہ یکایک غیب سے ایک ہستی آکر ایسے شخص کو ان حالات میں وہ پیغام دیتی ہے جو عین تعلیمات انبیاء کے مطابق ہے تو انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ ضرور سچی نبوت ہے۔ (۹)

اگر پہلے سے شوقِ نبوت ہوتا

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مراقبے کر کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے، تو غارِ حرا والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اُچھل پڑتے اور بڑے دم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اُتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھہرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غارِ حرا کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی امیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے؟

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے۔ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ بات آئی ہوتی کہ میاں نبوت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہؓ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو، جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو اب پیری کی دکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں لیکن

وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں، اس کی بنا پر انہیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آ سکتا، نہ اللہ اُس کو کسی بُری آزمائش میں ڈال سکتا ہے، اُس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر حقیقت ہے۔ اور یہی معاملہ ورقہ بن نوفل کا بھی تھا۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضورؐ کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادرِ نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنع سے تمیز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑے ہونے کی وجہ سے آپؐ کی پوری زندگی بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے بھی آپؐ کی زبان سے حِرا کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتا تھا کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار اُس کے حصول کا تصور تک اُس کے حاشیہ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پورے ہوش و حواس کی حالت میں علانیہ اس تجربے سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کو دو اور دو چار کی طرح بلا ادنیٰ تامل اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ یہاں کوئی فریبِ نفس یا شیطانی کرشمہ نہیں ہے بلکہ اس سچے انسان نے اپنے کسی ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے۔

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا بیّن ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیلِ نبوت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے[1]۔ (10)

پہلی وحی کا مضمون

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی جو بھیجی گئی تھی وہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات پر مشتمل تھی جس میں حضورؐ سے یہ فرمایا گیا تھا کہ:

"پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یہ نزولِ وحی کا پہلا تجربہ تھا جو اچانک حضورؐ کو پیش آیا تھا۔ اس پیغام میں آپؐ کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ آپؐ کس کارِ عظیم پر مامور ہوئے ہیں، اور آگے کیا کچھ آپؐ کو کرنا ہے۔ بلکہ ایک ابتدائی تعارف کرا کے آپؐ کو کچھ مدت کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا تاکہ آپؐ کی طبیعت پر جو شدید بار اس پہلے تجربے سے پڑا ہے اُس کا اثر دور ہو جائے، اور

---

[1] مثلاً سورۂ یونس کی آیت قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ . . . الخ
نیز سورۂ شوریٰ کی آیت مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ . . . الخ (حاشیہ از مرتب)

آپ ذہنی طور پر آئندہ وحی وصول کرنے اور نبوت کے فرائض سنبھالنے کے لیے تیار ہو جائیں۔[۱]

مضمونِ وحی کی تشریح

یہ پہلی وحی جو حضور پر نازل ہوئی اس کا ایک ایک لفظ غور طلب ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ (العلق۔ آیت ۱)

"پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔"

فرشتے نے جب حضورؐ سے کہا کہ پڑھو، تو حضورؐ نے جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے نے وحی کے یہ الفاظ لکھی ہوئی صورت میں آپؐ کے سامنے پیش کیے تھے اور آنہیں پڑھنے کے لیے کہا تھا کیونکہ اگر فرشتے کی بات کا مطلب یہ ہوتا کہ جس طرح میں بولتا ہوں آپ اسی طرح پڑھتے جائیں تو حضورؐ کو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ ہوتی کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔

"اپنے رب کے نام کے ساتھ پڑھو" یعنی اپنے رب کا نام لے کر پڑھو، یا بالفاظ دیگر بسم اللہ کہو اور پڑھو۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وحی کے آنے سے پہلے ہی صرف اللہ تعالیٰ کو اپنا رب جانتے اور مانتے تھے۔ اسی لیے یہ کہنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی کہ آپؐ کا رب کون ہے بلکہ یہ کہا گیا کہ اپنے رب کا نام لے کر پڑھو یعنی جس رب کو تم جانتے ہو اسی کا نام لے کر پڑھو۔

"جس نے پیدا کیا" یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس نے کس کو پیدا کیا۔ اس سے خود بخود یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس رب کا نام لے کر پڑھو جو خالق ہے، جس نے ساری کائنات کو اور اس کی ہر چیز کو پیدا کیا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (آیت ۲)

"جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔"

کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس حقیر حالت سے اس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اسے پورا انسان بنایا۔ عَلَق جمع ہے عَلَقَہ کی جس کے معنی جمے ہوئے خون کے ہیں۔ یہ وہ ابتدائی حالت ہے جو استقرار حمل کے بعد چند دنوں میں رونما ہوتی ہے، پھر وہ گوشت کی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بعد بتدریج اس میں انسانی صورت بننے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔[۲]

---

[۱] اس وقفہ کے بعد جب دوبارہ نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیتیں نازل کی گئیں اور ان میں پہلی مرتبہ آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ آپ اٹھیں اور خلقِ خدا کو اس روش کے انجام سے ڈرائیں جس پر وہ چل رہی ہے۔ اس سلسلے میں تفصیل آگے آئے گی۔ (حاشیہ از مرتب)

[۲] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، الحج، آیت ۵، حواشی ۵ تا ۷۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (آیات ۳-۴)

"پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔"

یعنی یہ اُس کا انتہائی کرم ہے کہ اِس حقیر ترین حالت سے ابتدا کر کے اس نے انسان کو صاحبِ علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت ہے، اور صرف صاحبِ علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم کے استعمال سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت، ترقی، اور نسلاً بعد نسلٍ اُس کے بقا اور تحفظ کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور پر انسان کو قلم اور کتابت کے فن کا یہ علم نہ دیتا تو انسان کی علمی قابلیت ٹھٹھر کر رہ جاتی اور اسے نشوونما پانے، پھیلنے اور ایک نسل کے علوم دوسری نسل تک پہنچنے اور آگے مزید ترقی کرتے چلے جانے کا موقع ہی نہ ملتا۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (آیت ۵)

"انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔"

یعنی انسان اصل میں بالکل بے علم تھا، اسے جو کچھ بھی علم حاصل ہُوا اللہ کے دینے سے حاصل ہُوا۔ اللہ ہی نے جس مرحلے پر انسان کے لیے علم کے جو دروازے کھولنے چاہے وہ اُس پر کھلتے چلے گئے۔ یہی بات ہے جو آیۃ الکرسی میں اس طرح فرمائی گئی ہے کہ:

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔ (البقرہ۔ ۲۵۵)

"اور لوگ اس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اُس کے جو وہ خود چاہے۔"

جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہ تھیں، اللہ تعالیٰ ہی نے جب چاہا اُن کا علم اُسے دیا بغیر اس کے کہ انسان یہ محسوس کرتا کہ یہ علم اللہ اسے دے رہا ہے۔

یہاں تک وہ آیات ہیں جو سب سے پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا تجربہ اتنا سخت تھا کہ حضورؐ اس سے زیادہ کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔ اس لیے اُس وقت صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا گیا کہ وہ رب جس کو آپ پہلے سے جانتے اور مانتے ہیں، آپ سے براہِ راست مخاطب ہے، اُس کی طرف سے آپؐ پر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، اور آپؐ کو اُس نے اپنا نبی بنا لیا ہے۔ اس کے ایک مدت بعد سُورۃ مدّثّر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں آپؐ کو بتایا گیا کہ نبوّت پر مامور ہونے کے بعد اب آپؐ کو کام کیا کرنا ہے[1]۔ (۴)

---

[1] اِس موقع پر یہ جاننا فائدے سے خالی نہ ہو گا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل علیہ السّلام کو صرف دو مرتبہ ان کی اصلی صورت میں دیکھا ہے، ورنہ وہ ہمیشہ انسانی شکل میں آپؐ کے سامنے آیا کرتے تھے، جیسا کہ بخاری کتاب التوحید میں حضرت عائشہؓ

نزولِ وحی کی ابتدا کب ہوئی؟

یہ اوّلین وحی جو سورۂ علق کی پہلی پانچ آیتوں پر مشتمل ہے، کب نازل ہوئی؟ اس کے بارے میں اہلِ روایت کے مختلف اقوال ہیں۔ ابن عبدالبرّ اور مسعودی نے کہا ہے کہ حضورؐ کی بعثت ۸ ربیع الاوّل سنہ ۴۱ عام الفیل کو ہوئی، اور ابن القیم نے زاد المعاد میں اس کو قول الاکثرین کہا ہے۔ لیکن جن لوگوں کا یہ قول ہے انہوں نے غالباً بعثت کی ابتداء اُس وقت سے قرار دی ہے جب آپؐ کو بروایتِ بیہقی نزولِ وحی سے ۶ مہینے پہلے سچّے خواب نظر آنے شروع ہوئے تھے۔ رہا نزولِ وحی تو اس باب میں قرآن مجید کا بیان صاف ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ: ۱۸۵) "رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا"۔ اس صریح نصِ قرآنی کے خلاف ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا قول معتبر نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رمضان کی وہ کونسی تاریخ تھی جب نزولِ قرآن کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس باب میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ بعض لوگ ۸ رمضان بتاتے ہیں۔ ابن سعد نے ایک جگہ ۱۲، اور دوسری جگہ امام محمد الباقرؒ کے حوالے سے ۱۷ رمضان تاریخ لکھی ہے۔ بلاذری نے بھی امام محمد الباقرؒ کی اس روایت کو نقل کیا ہے، اور مزید برآں حضرت عائشہؓ سے بھی یہی تاریخ روایت کی ہے۔ طبری و ابن اثیر نے ابو قلابہ الجرمی کے حوالے سے ۱۸ رمضان، اور بعض اور لوگوں نے ۱۹ رمضان تاریخ بیان کی ہے۔ واثلہؓ بن الاسقع، جابرؓ بن عبداللہ اور ابو الجلد کی روایت ۲۴ رمضان کی ہے۔ لیکن قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ "ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا"۔

م۔ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے، اور مسلم کتاب الایمان میں حضرت عائشہؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ پہلی مرتبہ وہ آسمان کے مشرقی کنارے سے نمودار ہوئے (جسے سورۂ نجم میں اُفُقِ الاعلیٰ اور سورۂ تکویر میں اُفُقِ مبین کہا گیا ہے) اور رفتہ رفتہ حضورؐ کی طرف بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ آپؐ کے اوپر آ کر فضا میں معلّق ہو گئے۔ پھر وہ آپ کی طرف جھکے اور اس قدر قریب آ گئے کہ آپؐ کے اور ان کے درمیان صرف دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ [illegible] (بخاری)۔ خود حضورؐ کا ارشاد ہے کہ میں نے ان کو اس صورت میں دیکھا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کیا ہے اور ان کی عظیم ہستی سے آسمان و زمین کے درمیان کی ساری فضا بھر گئی تھی (مسلم)۔ دوسری مرتبہ آپؐ نے ان کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا۔ مسند احمد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "میں نے جبریلؑ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا، اُن کے چھ سو بازو تھے"۔

(تفہیم القرآن، جلد پنجم، النجم، خلاصہ حواشی ۵-۷، ۱۰-۱۱، ۱۴)

اور علمائے اُمّت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کوئی ایک طاق رات شب قدر ہے، بلکہ ان میں بھی زیادہ تر لوگ ستائیسویں رات کو شب قدر کہتے ہیں۔ (۱۳)

تاریخ نزولِ قرآن کے بارے میں معتبر احادیث

اس معاملہ میں جو معتبر احادیث منقول ہوئی ہیں انہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا وہ ستائیسویں یا انتیسویں رات ہے (ابوداؤد طیالسی)۔ دوسری روایت حضرت ابوہریرہؓ سے یہ ہے کہ وہ رمضان کی آخری رات ہے (مسند احمد)

حضرت اُبَیّ بن کعب سے زِرّ بن حُبَیش نے شب قدر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے حلفاً کہا اور استثناء نہ کیا کہ وہ ستائیسویں رات ہے (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان)۔

حضرت ابوذرؓ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ، حضرت حذیفہؓ اور اصحابِؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بہت سے لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے (ابن ابی شیبہ)۔

حضرت عُبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات ہے، اکیسویں، یا تئیسویں، یا پچیسویں، یا ستائیسویں، یا انتیسویں، یا آخری (مسند احمد)۔

حضرت عبداللہؓ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو، جب مہینہ ختم ہونے میں ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن باقی، یا پانچ دن باقی (بخاری)۔ اکثر اہلِ علم نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضورؐ کی مراد طاق راتوں سے تھی۔

حضرت ابوبکرہؓ کی روایت ہے کہ ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن، یا پانچ دن، یا تین دن، یا آخری رات۔ مراد یہ تھی کہ ان تاریخوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو (ترمذی، نسائی)۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات میں تلاش کرو (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی)۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تا زیست رمضان کی آخری دس راتوں میں اعتکاف فرمایا ہے۔

اس معاملہ میں جو روایات حضرت معاویہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں ان کی بنا پر علمائے سلف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی کو شب قدر سمجھتی ہے۔ (۱۴)

نبوت کے بعد پہلا فرض، نماز

طبری نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی چیز جو اقرار توحید اور بتوں سے براءت کے بعد شرائع اسلام میں سے فرض کی گئی وہ نماز تھی۔ ابن ہشام نے بھی محمد بن اسحٰق کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ سب سے پہلے حضورؐ پر جو چیز فرض کی گئی وہ نماز تھی اور وہ ابتدا میں دو دو رکعت تھی۔ امام احمدؒ نے ابن لہیعہ کی روایت حضرت زیدؓ بن حارثہ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہونے کے بعد جبریلؑ آپؐ کے پاس آئے اور انہوں نے آپؐ کو وضو کی تعلیم دی۔ ابن ماجہ اور طبرانی (فی الاوسط) میں بھی یہ واقعہ کچھ سندوں کے اختلاف کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ اس کی تشریح ابن اسحٰق کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ حضورؐ مکہ کے بالائی حصہ میں تھے جبریلؑ بہترین صورت اور بہترین خوشبو کے ساتھ آپؐ کے سامنے ظاہر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اے محمدؐ، اللہ نے آپؐ کو سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ آپؐ جن و انس کی طرف میرے رسول ہیں اس لیے آپؐ قول لا الٰہ الا اللہ کی طرف اُن کو دعوت دیں۔ پھر انہوں نے زمین پر پاؤں مارا جس سے پانی کا ایک چشمہ اُبل پڑا اور انہوں نے وضو کیا تاکہ آپؐ نماز کے لیے پاک ہونے کا طریقہ سیکھ لیں۔ پھر آپؐ سے کہا کہ اب آپؐ وضو کریں۔ پھر جبریلؑ نے حضورؐ کے ساتھ دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ پڑھیں۔ اس کے بعد حضورؐ حضرت خدیجہؓ کو وہاں لائے اور وضو کرایا اور دو رکعتیں ان کے ساتھ پڑھیں۔ ابن ہشام، ابن جریر اور ابن کثیرؒ نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

امام احمدؒ، ابن ماجہ اور طبرانی (فی الاوسط) وغیرہم نے اُسامہؓ بن زیدؓ سے اور انہوں نے اپنے والد حضرت زیدؓ بن حارثہ سے نقل کیا ہے کہ حضورؐ پر وحی آنے کے بعد پہلا کام یہ ہوا کہ جبریلؑ نے آکر آپؐ کو وضو کا طریقہ بتایا پھر جبریلؑ نماز کے لیے کھڑے ہوگئے اور آپؐ سے کہا کہ آپؐ اُن کے ساتھ نماز پڑھیں۔ پھر حضورؐ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا۔ وہ خوشی کے مارے مدہوش ہوگئیں۔ پھر حضورؐ نے اُن کو اُسی طرح وضو کرنے کے لیے کہا اور اُن کو ساتھ لے کر اُسی طرح نماز پڑھی جس طرح آپؐ نے جبریلؑ کے ساتھ پڑھی تھی۔ پس یہ پہلا فرض تھا جو نزولِ اقرأ کے بعد مقرر کیا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ اُسی رات کی صبح کا واقعہ ہے جس رات اِقْرَأْ نازل ہوئی۔ اس کے بعد حضورؐ اور حضرت خدیجہؓ خفیہ طریقہ سے نماز پڑھتے رہے۔

پہلے چار مسلمان

یہ بات متفق علیہ ہے کہ سب سے پہلی مسلمان حضرت خدیجہؓ تھیں۔ اس کے بعد اس امر میں اختلاف ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ میں سے کون سب سے پہلے اسلام لایا۔ بہرحال یہ بالاتفاق تسلیم کیا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد اوّلین اسلام لانے والے یہی تین حضرات تھے[1]۔

---

[1] تاریخ و سیرت کی کتابوں میں انہی ابتدائی چار مسلمانوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ حضورؐ کی چار صاحبزادیاں

حضرت علیؓ کے متعلق حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں ابن اسحٰق کی روایت اور بلاذری نے واقدی کی روایت نقل کی ہے کہ جب حضورؐ اور حضرت خدیجہؓ نے خفیہ طریقے سے نماز پڑھنی شروع کی تو اس کے ایک دن بعد حضرت علیؓ نے ان کو حالتِ نماز میں دیکھ لیا۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا "یہ اللہ کا دین ہے جس کو اس نے اپنے لیے پسند فرمایا ہے اور جس کے ساتھ اس نے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ لہٰذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کو مانو اور اس کی عبادت کرو اور لات و عزّیٰ کا انکار کر دو"۔ حضرت علیؓ جو اُس وقت دس سال کے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یہ ایسی بات ہے جو آج سے پہلے میں نے کبھی نہ سُنی تھی، میں فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک اپنے والد سے نہ پوچھ لوں۔ حضورؐ اُس وقت یہ نہ چاہتے تھے کہ آپؐ کا راز قبل از وقت ظاہر ہو جائے، اس لیے آپؐ نے فرمایا اگر تم قبول نہیں کرتے تو اس بات کو مخفی رکھو۔ اُس رات حضرت علیؓ نے توقّف کیا۔ پھر اللہ نے ان کے دل میں اسلام ڈال دیا اور صبح اُنھوں نے حاضر ہو کر پوچھا کہ کل آپؐ نے میرے سامنے کیا بات پیش فرمائی تھی؟ حضورؐ نے فرمایا یہ کہ "تم گواہی دو کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور لات و عزّیٰ کا انکار کرو، اور اللہ کے سوا دوسرے شریکوں سے قطع تعلق کر لو"۔ حضرت علیؓ نے فوراً اسے قبول کر لیا، لیکن ابو طالب کے خوف سے اپنا اسلام مخفی رکھا۔ البتہ وہ بھی حضورؐ کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔

امام احمد، ابن جریر طبری اور ابن عبدالبرؒ نے عفیف کندیؓ (اشعثؓ بن قیس کے ماں جائے اور چچا زاد بھائی) کا بیان نقل کیا ہے کہ عباسؓ بن عبدالمطّلب میرے پُرانے دوست تھے اور اکثر یمن آ کر عطر خریدتے اور حج کے زمانے میں فروخت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایامِ حج میں جب میں اُن سے مِنیٰ میں ملا تو میں نے دیکھا کہ ایک شاندار مرد آیا اور اس نے خوب اچھی طرح وضو کیا، پھر وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ایک عورت آئی اور اس نے بھی وضو کیا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک لڑکا جو ابھی بلوغ کی عمر سے کم تھا آیا اور اس نے بھی وضو کیا اور پہلے شخص کے پہلو میں نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا "اے عباس یہ کیا دین ہے، اسے تو میں نہیں جانتا"۔ عباس نے کہا "یہ میرے بھائی کے بیٹے محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطّلب ہیں، ان کا دعویٰ ہے

۲۔ اُس وقت ہوشمندی کی عمر کو پہنچ چکی تھیں وہ اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ ایمان لائی ہوں گی۔ حضرت زینبؓ کی عمر حضورؐ کے منصبِ نبوّت پر سرفراز ہونے کے وقت ۱۰ سال کی تھی۔ حضرت اُمِّ کلثومؓ اور حضرت رقیہؓ کی عمر بھی اتنی تھی کہ دعوتِ عام کے آغاز سے پہلے حضورؐ نے اُن کی شادیاں ابولہب کے لڑکوں سے کر دی تھیں۔ البتہ حضرت فاطمہؓ نبوّت کے ایک سال بعد پیدا ہوئی تھیں اور انھوں نے آنکھیں ہی اسلام کی گود میں کھولی تھیں۔ اس لیے ہمارے نزدیک پہلی تین صاحبزادیوں کا شمار ابتدائی مسلمانوں میں کیا جانا چاہیے، اور حضرت فاطمہؓ کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ انھوں نے ہوش ہی ایک مُسلِمہ و مومنہ کی حیثیت سے سنبھالا۔ (حاشیہ از مؤلف)

کہ اللہ نے اِن کو رسُول بنا کر بھیجا ہے (اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ "اِن کا دعویٰ ہے کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے ان کے لیے فتح ہو جائیں گے)۔ اور یہ دوسرا میرا بھتیجا علیؓ بن ابی طالب ہے جس نے ان کے دین میں ان کی پیروی اختیار کی ہے اور یہ ان کی بیوی خدیجہؓ بنت خویلد ہیں اور انہوں نے بھی ان کے دین میں ان کی پیروی کی ہے"۔ بعد میں جب عفیف کندیؓ خود مسلمان ہوئے تو وہ حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ کاش اُس وقت میں اُن میں کا چوتھا ہوتا۔

ابن ہشام اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ بعد میں کسی وقت ابُو طالب نے بھی حضرت علیؓ کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ پوچھا بیٹا یہ کیا دین ہے جس پر تو چل رہا ہے؟ انہوں نے کہا "ابّا جان، میں اللہ اور اس کے رسُول (محمد صلی اللہ علیہ وسلّم) پر ایمان لایا ہُوں اور ان کی تصدیق کی ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی ہے"۔ ابو طالب نے کہا "وہ تمہیں بھلائی کے سوا کسی چیز کی طرف دعوت نہ دیں گے۔ تم ان کے ساتھ لگے رہو"۔ ابن کثیر نے ابو طالب کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں "اپنے چچازاد بھائی کا ساتھ دو اور اُن کی مدد کرو"۔

حضرت ابُو بکرؓ کے متعلق زُرقانی نے شرح مواہب میں لکھا ہے کہ وہ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام کے ہاں بیٹھے ہُوئے تھے۔ اتنے میں حضرت حکیم کی لونڈی اُن کے پاس آئی اور اُس نے کہا کہ آپ کی پھوپھی آج کہہ رہی تھیں کہ اُن کے شوہر حضرت مُوسیٰ کی طرح نبی ہیں جنہیں اللہ نے بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت ابُو بکرؓ سیدھے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس پہنچے اور یہ معلوم کرتے ہی کہ اُس لونڈی کا بیان صحیح تھا، بلا تامّل ایمان لے آئے۔ ابن اسحٰق نے عبداللہ بن الحُصین التمیمی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں نے جس کے سامنے بھی اسلام پیش کیا اُس نے کچھ نہ کچھ تردّد کیا اور سوچا، مگر ابو بکرؓ سے جونہی میں نے اس کا ذکر کیا انہوں نے کوئی تردّد نہ کیا اور تسلیم کرنے میں ذرا سی دیر بھی نہیں لگائی۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ کے متعلق کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے کہ وہ کیسے ایمان لائے۔ مگر وہ ۱۵ سال سے حضورؐ کے ساتھ آپ کے گھر کے ایک فرد کی طرح رہتے تھے۔ ضرور ہے کہ حضورؐ اور حضرت خدیجہؓ کو انہوں نے بھی نماز پڑھتے دیکھا ہوگا اور یہی اُن کے اسلام لانے کا سبب بنا ہوگا۔

اِن واقعات سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ حضورؐ ابتدا میں پوشیدہ طریقے سے کام کر رہے تھے، لیکن آپ کے اور حضرت خدیجہؓ کے قریبی رشتہ داروں کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آپ دینِ آبائی کے خلاف ایک دوسرا دین پیش کر رہے ہیں، اللہ کی طرف سے نبی مقرر ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں، اور آپ کے اِس دعوے کو نہ صرف یہ کہ آپ کے اہلِ خانہ اور کم از کم ایک دوست نے مان لیا ہے، بلکہ اس کے مطابق عبادت بھی دوسرے طریقے پر شروع کر دی ہے۔ تاہم چونکہ یہ علم دشمنوں کو نہیں بلکہ آپ کے خیر خواہوں اور آپ سے گہری محبت رکھنے والوں کو ہُوا تھا، اِس لیے انہوں نے اُس پردے کو پڑا رہنے دیا جو آغاز میں حضورؐ ڈالے رکھنا چاہتے تھے۔

اور اس بات کا کوئی چرچا نہ کیا گیا کہ قبل از وقت مخالفت شروع ہو جاتی۔

کیا ابتدائی تین سالوں میں حضرت اسرافیلؑ آپؐ کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے تھے؟

ابن جریر نے اپنی تاریخ میں، اور ابن سعد نے طبقات میں اور قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں اور زرقانی نے شرح مواہب میں مشہور تابعی امام شعبی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ نبوت کے بعد ابتدائی تین سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت اسرافیل کو تعلیم کے لیے لگا دیا گیا تھا۔ وہ وحی نہیں لاتے تھے کیونکہ وحی لانا صرف جبریل علیہ السلام کا کام تھا، البتہ وہ وحی کے سوا کسی اور طریقے سے حضورؐ کو علوم کی تعلیم دیتے تھے[1]۔ امام احمد بن حنبل اور یعقوب بن سفیان الحافظ اور بیہقی نے بھی امام شعبی کی اس روایت کو نقل کیا ہے، اور ان تک اس کی سند صحیح ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ خود شعبی کو یہ خبر کس ذریعہ سے پہنچی، کیونکہ انہوں نے حضورؐ تک اس کی سند بیان نہیں کی ہے۔ ابن سعد اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ واقدی نے اس کی صحت سے قطعی انکار کیا ہے اور حتمی طور پر یہ کہا ہے کہ حضورؐ کے ساتھ جبریلؑ کے سوا کوئی دوسرا فرشتہ نہیں لگایا گیا۔

یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا نہ قطعی انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ قطعی اقرار۔ انکار اس لیے مشکل ہے کہ شعبی ایک ثقہ محدث ہیں اور ان کی مرسل روایت بھی ایسی کمزور نہیں ہو سکتی کہ اسے بالکل رد کر دیا جائے لیکن اس کو ایک یقینی واقعہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے ایسی مضبوط بھی نہیں ہے کہ اسے ضرور تسلیم ہی کر لیا جائے۔ تاہم یہ امر بعید از امکان نہیں ہے کہ نبوت کے بعد حضورؐ کے اقوال اور اعمال میں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق علم و دانش کا جو ہمہ گیر اور اتھاہ خزانہ ہمیں ملتا ہے، جس سے حدیث و سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں، اور جس کی کوئی نظیر کسی دوسرے انسان کے اقوال و اعمال میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی نہیں ملتی، وہ ضرور غیب سے آپ پر القا ہوتے ہوں گے، اور کیا عجب کہ اس خزانے کو آپؐ کے سینے میں بھر دینے کی خدمت اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام سے لی ہو۔

فترۃ الوحی

پہلی وحی نازل ہونے کے بعد ایک مدت تک جبریل علیہ السلام کوئی وحی نہ لاتے اور اس پر آپؐ کا رنج و غم اتنا ہی بڑھتا چلا گیا جتنی یہ مدت طویل ہوتی گئی، حتیٰ کہ آپ بے خودی کے عالم میں کبھی ثبیر (مکے کے ایک پہاڑ) اور کبھی حراء پر جا کر ارادہ فرماتے تھے کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں۔ اس حالت میں جب کہ آپؐ کسی پہاڑ کے کنارے کا رخ کر رہے تھے، آپؐ نے آسمان سے ایک آواز سنی اور آپ ٹھیر گئے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو جبریلؑ آسمان و زمین کے

---

[1] ممکن ہے کہ یہ طریقہ خواب ہو، یا دل میں القا ہو، یا بالمشافہ تلقین ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

درمیان کرسی پر بیٹھے نظر آتے اور انہوں نے کہا کہ "اے محمد آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں"۔ ابن سعد نے اس کا قصہ حضرت عبداللہ بن عباس سے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر اور عبدالرزاق نے اپنی المصنف میں امام زہری سے نقل کیا ہے۔ بخاری و مسلم اور مسند احمد میں بھی اس کی تفصیلات مذکور ہیں۔ (۱۵)

امام زہری کی روایت یہ ہے:

"ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا اور اس زمانے میں آپ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کبھی آپ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ سے کہتے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، اس سے آپ کے دل کو سکون ہو جاتا تھا، اور وہ اضطراب کی کیفیت دور ہو جاتی تھی"۔ (ابن جریر)

اس کے بعد امام زہری حضرت جابر بن عبداللہ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فترۃ الوحی (وحی بند رہنے کے زمانے) کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا: "ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا، یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی۔ سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا، اور گھر پہنچ کر میں نے کہا مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف (یا کمبل) اڑھا دیا۔ اس وقت اللہ نے وحی نازل کی یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ۔ پھر لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا"۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد، ابن جریر) (۱۶)

سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات کا نزول

اس طرح فترۃ الوحی کا زمانہ ختم ہوا اور سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات نازل ہوئیں جن میں حضورؐ کو منصب رسالت پر مامور کرنے کے ساتھ ضروری ہدایات دی گئیں جو اس منصب کے فرائض ادا کرنے کے لیے درکار تھیں۔ یہاں اس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات صرف یہ ظاہر کرتی تھیں کہ آپ پر نزول وحی کا آغاز ہو گیا ہے اور آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی بنا دیے گئے ہیں۔ اب سورۂ مدثر کی ان آیات میں آپ کو نبوت کے ساتھ ساتھ فریضۂ رسالت بھی سونپ دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ آپ اٹھ کر اس فرض کو ادا کرنا شروع کر دیں۔ ان آیات کے متعلق بعض روایات میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہی قرآن مجید کی اولین آیات ہیں چنانچہ بخاری، مسلم، ترمذی، اور مسند احمد وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے اس کی صراحت منقول ہوئی ہے لیکن امت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مسلم ہے کہ سب سے پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ

سے مَا لَمْ يَعْلَمْ تک پانچ آیات نازل ہوئی تھیں۔ اس کے بعد بقول ابن اثیر زمانۂ فترۃ (وحی بند رہنے کا زمانہ) سورۂ مدثر کی ان آیات کے نزول تک رہا پھر اس کے بعد وحی کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو گیا خود حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے امام زہری نے یہ بات نقل کی ہے کہ ان آیات کے نزول سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی فرشتے کو آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے دیکھا تھا جو حرا میں آپ کے پاس آیا تھا۔ یہ روایت ہم اوپر بخاری و مسلم وغیرہ کے حوالہ سے درج کر چکے ہیں۔ (۱۷)

وہ ہدایات جو اس سورہ میں دی گئیں

اب سورۂ مدثر کی ان آیات کو ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان میں کیا ہدایات دی گئی تھیں:

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ (آیت ۱)

"اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے۔"

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ایہا الرسول یا یا ایہا النبی کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے یا ایہا المدثر کہہ کر کیوں مخاطب کیا گیا ہے؟ چونکہ حضورؐ یکایک جبریل علیہ السلام کو آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے دیکھ کر ہیبت زدہ ہو گئے تھے اور اسی حالت میں گھر پہنچ کر آپ نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا تھا کہ مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو یا ایہا المدثر کہہ کر خطاب فرمایا۔ اس لطیف طرزِ خطاب سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اے میرے پیارے بندے، تم اوڑھ لپیٹ کر لیٹ کہاں گئے، تم پر تو ایک کارِ عظیم کا بار ڈالا گیا ہے جسے انجام دینے کے لیے تمہیں پورے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

قُمْ فَأَنْذِرْ۔ (آیت ۲)

"اٹھو اور خبردار کرو۔"

یہ اسی نوعیت کا حکم ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت کے منصب پر مامور کرتے ہوئے دیا گیا تھا کہ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ "اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراؤ قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے۔" (نوح - ۱)۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور تمہارے گرد و پیش خدا کے جو بندے خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ان کو چونکا دو۔ انہیں اس انجام سے ڈراؤ جس سے یقیناً وہ دوچار ہوں گے اگر اسی حالت میں مبتلا رہے۔ انہیں خبردار کر دو کہ وہ کسی اندھیر نگری میں نہیں بستے ہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی کوئی باز پرس نہ ہو۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (آیت ۳)

"اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔"

یہ ایک نبی کا اوّلین کام ہے جسے اس دنیا میں اُسے انجام دینا ہوتا ہے۔ اُس کا پہلا کام ہی یہ ہے کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں اُن سب کی نفی کر دے اور ہانکے پکارے دُنیا بھر میں یہ اعلان کر دے کہ اِس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمۂ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اذان کی ابتدا ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان اللہ اکبر کہہ کر داخل ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرتا ہے تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرۂ تکبیر آج ساری دُنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ نمایاں امتیازی شعار ہے، کیونکہ اِس اُمت کے نبیؐ نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع کیا تھا۔

اِس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے جیسا کہ اِن آیات کی شانِ نزول سے معلوم ہو چکا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو رسالت کا عظیم الشان فریضہ انجام دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا، اور یہ بات ظاہر تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اُٹھنے کا آپؐ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ شرک کا گڑھ تھا۔ بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام عربوں کی طرح مشرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکّہ معظّمہ مشرکینِ عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہُوا تھا اور قریش کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تنِ تنہا اُٹھنا اور شرک کے مقابلے میں توحید کا عَلَم لیکر دنیا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ اِسی لیے "اُٹھو اور خبردار کرو" کے بعد فوراً ہی یہ فرمایا کہ "اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو"۔ اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ جو ہولناک طاقتیں اِس کام میں تمہیں مزاحم نظر آتی ہیں اُن کی ذرا پروا نہ کرو، اور صاف صاف کہہ دو کہ میرا رب اُن سب سے بڑا ہے جو میری اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمّت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی کی جا سکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہُوا ہو وہ اللہ کی خاطر اکیلا ساری دُنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرّہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (آیت ۴)

"اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔"

یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور رُوح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ رُوح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا، اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اِس لیے آپؐ کو ہدایت فرمائی

گئی کہ آپ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوعِ انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو "طہارت" کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیل جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم ان الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اجلے کپڑے بھی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا دار انسان ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت میل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے متنفر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہوم اس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو۔ تمہارا لباس صاف ستھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو، مگر اس میں فخر و غرور، ریا اور نمائش، ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اولین چیز ہے جو آدمی کی شخصیت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، متکبر اور برخود غلط لوگوں کے لباس، چھچھورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدقوارہ اور آوارہ منش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ان سب لوگوں سے فطرۃً مختلف ہوتا ہے، اس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک شریف اور شائستہ انسان ہے جو نفس کی کسی برائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابن عباسؓ، ابراہیم نخعیؒ، شعبیؒ، عطاءؒ، مجاہدؒ، قتادہؒ، سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ اور دوسرے اکابر مفسرین رحمہم اللہ نے اس آیت

کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فُلَانٌ طَاهِرُ الثِّيَابِ اور فُلَانٌ طَاهِرُ الذَّيْلِ "فلاں شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے" اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں فُلَانٌ دَنِسُ الثِّيَابِ "اس شخص کے کپڑے گندے ہیں" اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بدمعاملہ آدمی ہے، اس کے قول و قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (آیت ۵)

"اور گندگی سے دور رہو"

گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے۔ خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو، یا اخلاق و اعمال کی، یا جسم و لباس اور رہن سہن کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے گردوپیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حرف نہ رکھ سکے کہ جن برائیوں سے تم لوگوں کو روک رہے ہو، ان میں سے کسی کا کوئی شائبہ تمہاری اپنی زندگی میں بھی پایا جاتا ہے۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (آیت ۶)

"اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے"

ان الفاظ کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں ان کا ترجمہ کر کے پورا مطلب ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جس پر بھی احسان کرو بے غرضانہ کرو۔ تمہاری عطا اور بخشش اور سخاوت اور حسن سلوک محض اللہ کے لیے ہو۔ اس میں کوئی شائبہ اس خواہش کا نہ ہو کہ احسان کے بدلے میں تمہیں کسی قسم کے دنیوی فوائد حاصل ہوں۔ بالفاظ دیگر اللہ کے لیے احسان کرو، فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوئی احسان نہ کرو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نبوت کا جو کام تم کر رہے ہو یہ اگرچہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ تمہاری بدولت خلق خدا کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احسان لوگوں پر نہ جتاؤ اور اس کا کوئی فائدہ اپنی ذات کے لیے حاصل نہ کرو۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ تم اگرچہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو، مگر اپنی نگاہ میں اپنے عمل کو کبھی بڑا عمل نہ سمجھو اور کبھی یہ خیال تمہارے دل میں نہ آئے کہ نبوت کا یہ فریضہ انجام دے کر اور اس کام میں جان لڑا کر تم اپنے رب پر کوئی احسان کر رہے ہو۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (آیت ۷)

"اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو"

یعنی یہ کام جو تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں سخت مصائب اور مشکلات اور تکلیفوں سے تمہیں سابقہ پیش آئے گا۔ تمہاری اپنی قوم تمہاری دشمن ہو جائے گی۔ سارا عرب تمہارے خلاف

صف آرا ہو جائے گا۔ مگر جو کچھ بھی اس راہ میں پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اُس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا۔ اُس سے باز رکھنے کے لیے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی، محبت، ہر چیز تمہارے راستے میں حائل ہو گی۔ ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنا۔

یہ تھیں وہ اوّلین ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُول کو اُس وقت دی تھیں جب اُس نے آپؐ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپؐ اٹھ کر رسالت کے کام کا آغاز فرمائیں۔ کوئی شخص اگر ان چھوٹے چھوٹے فقروں پر اور ان کے معانی پر غور کرے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ ایک نبی کو نبوّت کا کام شروع کرتے وقت اس سے بہتر کوئی ہدایات نہیں دی جا سکتی تھیں۔ ان میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپؐ کو کام کیا کرنا ہے، اور یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ یہ کام کس نیت، کس ذہنیت اور کس طرزِ فکر کے ساتھ انجام دینا ہے، اور اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا کہ اس کام میں آپؐ کو کن حالات سے سابقہ پیش آئے گا اور ان کا مقابلہ آپؐ کو کس طرح کرنا ہو گا۔ آج جو لوگ تعصّب میں اندھے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ صرعٔ کے دَوروں میں یہ کلام رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زبان پر جاری ہو جایا کرتا تھا وہ ذرا آنکھیں کھول کر ان فقروں کو دیکھیں اور خود سوچیں کہ یہ صرع کے کسی دَورے میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں یا ایک خدا کی ہدایات ہیں جو رسالت کے کام پر مامور کرتے ہوئے وہ اپنے بندے کو دے رہا ہے۔ (۱۸)

وحی اخذ کرنے کی مشق

جیسا کہ ہم پہلے حضرت جابرؓ بن عبداللہ کے حوالہ سے نقل کر چکے ہیں، سُورۂ مدّثّر کے بعد حضورؐ پر پے در پے وحی کا نزُول شروع ہو گیا، مگر ابتدائی زمانے میں آپؐ کو نزولِ وحی کے وقت یہ دقّت پیش آتی تھی کہ کبھی آپؐ بھول جانے کے اندیشے سے اس کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے، اور کبھی دورانِ نزول ہی میں کسی بات کا مطلب پوچھنے لگتے تھے۔ اس لیے اس دَور میں یہ بھی ضروری تھا کہ آپؐ کو وحی اخذ کرنے کا طریقہ اچھی طرح سکھا دیا جائے۔ سُورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۖ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ (آیت ۱۱۴)

"پس بالا و برتر ہے اللہ، بادشاہِ حقیقی۔ اور دیکھو (اے نبیؐ) قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو جب تک تمہاری طرف اس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے اور دعا کرو کہ اے میرے پروردگار مجھے مزید علم عطا فرما۔"

انداز کلام صاف بتا رہا ہے کہ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ پر تقریر ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد رخصت ہوتے

ہوئے فرشتہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بات پر خبردار کرتا ہے جو وحی نازل کرنے کے دوران میں اُس کے مشاہدے میں آئی۔ بیچ میں ٹوکنا مناسب نہ سمجھا گیا اس لیے پیغام کی ترسیل مکمل کرنے کے بعد اُس نے حضور کو اُس بات پر متنبہ کیا۔ بات کیا تھی جس پر یہ تنبیہ کی گئی؟ اسے خود تنبیہ کے الفاظ ہی ظاہر کر رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا پیغام وصول کرنے کے دوران میں اُسے یاد کرنے اور زبان سے دُہرانے کی کوشش فرما رہے ہوں گے۔ اِس کوشش کی وجہ سے آپ کی توجہ بار بار ہٹ جاتی ہوگی۔ سلسلۂ اخذِ وحی میں خلل واقع ہو رہا ہوگا۔ پیغام کی سماعت پر توجہ پوری طرح مرکوز نہ ہو رہی ہوگی۔ اِس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ آپ کو پیغامِ وحی وصول کرنے کا صحیح طریقہ سمجھایا جائے اور بیچ بیچ میں یاد کرنے کی کوشش جو آپ کرتے ہیں اس سے منع کر دیا جائے۔

سُورۂ قیامہ کے نزول کے موقع پر بھی یہی صورت پیش آئی تھی، اس لیے سلسلۂ کلام کو توڑ کر آپ کو ٹوکا گیا کہ لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۔ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۔ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۔ "اِسے یاد کرنے کی جلدی میں اپنی زبان کو بار بار حرکت نہ دو، اِسے یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے، لہٰذا جب ہم اِسے سُنا رہے ہوں تو غور سے سُنتے رہو، پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔"[1]
سُورۂ اعلیٰ میں بھی آپ کو اطمینان دلایا گیا کہ ہم اسے آپ کو پڑھوا دیں گے اور آپ پھر بھولیں گے نہیں سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ[2] بعد میں جب آپ کو پیغاماتِ وحی وصول کرنے کی اچھی مہارت حاصل ہو گئی تو اس طرح کی کیفیات

---

[1] سُورۂ قیامہ کے اندر یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ آنے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ معتبر روایات میں اس کی یہی وجہ بیان ہوئی ہے۔ مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور دوسرے محدثین نے متعدد سندوں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب حضورؐ پر قرآن نازل ہوتا تھا تو آپ اس خوف سے کہ کہیں کوئی چیز بھول نہ جائیں جبریل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ وحی کے الفاظ دُہراتے جاتے تھے اس پر فرمایا لَا تُحَرِّكْ ۔۔۔ یہی بات شعبی، ابن زید، ضحاک، حسن بصری، قتادہ، مجاہد اور دوسرے بہت سے اکابر مفسرین سے منقول ہے۔ (18)

[2] حاکم نے حضرت سعد بن ابی وقاص سے اور ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے الفاظ کو اس خوف سے دُہراتے جاتے تھے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ مجاہد اور کلبی کہتے ہیں کہ جبریل وحی سنا کر فارغ نہ ہوتے تھے کہ حضورؐ بھول جانے کے اندیشے سے ابتدائی حصہ دُہرانے لگتے تھے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا کہ وحی کے نزول کے وقت آپ خاموشی سے سُنتے رہیں، ہم آپ کو اسے پڑھوا دیں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے آپ کو یاد ہو جائے گی۔ اس بات کا کوئی اندیشہ آپ نہ کریں کہ اس کا کوئی لفظ آپ بھول جائیں گے۔ (19)

آپ پر طاری ہوتی بند ہو گئیں۔ اسی وجہ سے بعد کی سورتوں میں ایسی کوئی تشبیہ ہمیں نہیں ملتی۔ (۴)

خفیہ تبلیغ کا تین سالہ دور

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تبلیغِ رسالت کی جو حکمت سکھائی تھی اس کے مطابق آپؐ نے اپنا کام چھوٹتے ہی اعلانِ نبوت کر دینے اور لوگوں کو دعوتِ عام دینے سے نہیں کیا بلکہ ابتدائی تین سال تک آپ خفیہ طریقے سے اسلام کو اُن سعید رُوحوں تک پہنچاتے رہے جو محض دلیل و برہان اور تفہیم و تذکیر سے توحید کو قبول کر کے اور شرک چھوڑ دینے پر آمادہ ہو سکتی تھیں، اور اس کے ساتھ جن پر یہ اعتماد بھی کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس تحریک کو اُس وقت تک راز میں رکھیں گی جب تک اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہادیٔ برحق اعلانِ عام اور واشگاف دعوت الی اللہ شروع کر دینے کا فیصلہ نہ فرمائیں۔ اِس کام میں سب سے زیادہ حضرت ابوبکر[1] رضی اللہ عنہ کے اثرات کارگر ثابت ہوئے۔ اِس کی وجہ طبری اور ابنِ ہشام نے یہ لکھی ہے کہ وہ نہایت ملنسار، خوش خلق اور اپنی قوم میں اپنی خوبیوں کی وجہ سے بہت مقبول و محبوب تھے۔ قریش میں کوئی شخص اُن سے زیادہ انساب کا علم نہ رکھتا تھا اور نہ اُن سے زیادہ کوئی یہ جانتا تھا کہ قریش میں اچھے اور بُرے کون ہیں اور کس کے کیا اوصاف ہیں۔ تجارت پیشہ تھے اور اپنے حُسنِ معاملہ کے لیے مشہور تھے۔ ان کی قوم کے لوگ ان کے علم، ان کی تجارت اور ان کے عمدہ برتاؤ کی وجہ سے بکثرت ان سے ملتے اور ان کے پاس آ کر بیٹھتے تھے۔ اِس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے جن جن لوگوں پر اعتماد کیا ان تک دعوت پہنچائی اور ایک اچھی خاصی تعداد ان کی تبلیغ سے متأثر ہو کر مسلمان ہو گئی۔ پھر جو جو مسلمان ہوتا گیا وہ آگے اپنے حلقۂ احباب میں نیک رُوحوں کو تلاش کر کر کے اندر ہی اندر اسلام پھیلاتا گیا۔ اُس زمانہ میں مُسلمان چھپ چھپ کر مکہ کی سنسان گھاٹیوں میں نماز پڑھتے تھے تاکہ کسی کو ان کی تبدیلیٔ دین کا پتہ نہ چل سکے۔

دارِ ارقم میں مرکزِ تبلیغ و اجتماع کا قیام

ڈھائی سال سے کچھ زیادہ مدت ہی گزری تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس سے اندیشہ ہُوا کہ کہیں کفارِ مکہ سے قبل از وقت تصادم شروع نہ ہو جائے۔ ابنِ اسحٰق کا بیان ہے کہ ایک روز مسلمان مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کے ایک گروہ نے انہیں دیکھ لیا اور ان کو سخت سُست کہنا شروع کیا۔ بات بڑھتے بڑھتے لڑائی تک پہنچ گئی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک شخص کو اُونٹ کی ہڈی کھینچ ماری جس سے اُس کا سر پھٹ گیا۔

---

[1] آپ کا اصل نام عبداللہ بن عثمان تھا لیکن ابوبکرؓ آپ کی کنیت اِس قدر مشہور ہوئی کہ اصل نام اس کے پیچھے چھپ گیا۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ ان کو پاکیزہ خصلتوں میں آگے (بکار = پیش پیش ہونے) کی وجہ سے ابوبکر کہا جاتا تھا۔ جاہلیت ہی میں وہ اس نام سے مشہور ہو چکے تھے۔ (حاشیہ از مؤلف)

ابن جریر اور ابن ہشام نے اس واقعہ کو مختصراً بیان کیا ہے، مگر حافظ اُموی نے اپنی مغازی میں اس کی پوری تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ وہ شخص جس کا سر پھٹا تھا وہ بنی تیم کا عبداللہ بن خطل تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے بلا تاخیر حضرت ارقم بن ابی ارقم کے مکان کو، جو صفا کے قریب واقع تھا، مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت و تبلیغ کا مرکز بنا دیا تاکہ مسلمان یہیں جمع ہو کر نماز بھی پڑھیں اور جو جو لوگ خفیہ طریقے سے مسلمان ہوتے جائیں وہ یہاں آتے رہیں۔ اسلام کی تاریخ میں اس دارِ ارقم کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ تین سال کی خفیہ دعوت کا دَور ختم ہونے اور علانیہ دعوتِ عام شروع ہو جانے کے بعد بھی یہ مسلمانوں کا مرکز رہا۔ اسی میں حضورؐ تشریف فرما رہتے تھے، یہیں آکر مسلمان آپؐ کے پاس جمع ہوتے تھے، اور شعبِ ابی طالب کی محصوری تک (جس کا ذکر ہم آگے کریں گے) اسی کو دعوتِ اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔

تین سال کی خفیہ دعوت میں کتنا کام ہوا

اب قبل اس کے کہ ہم علانیہ دعوت کے دَور پر کلام شروع کریں، ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ خفیہ دعوت کے اس تین سالہ دَور میں کتنا کام ہوا تھا، قریش کے کن کن قبیلوں کے کون کون اور کتنے لوگ مسلمان ہو چکے تھے، اور قریش سے باہر کے لوگوں اور موالی[1] اور غلاموں اور لونڈیوں میں سے کس کس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ذیل میں ہم ان کی وہ فہرست دیتے ہیں جو بڑی تلاش و تجسّس کے بعد ہم نے جمع کی ہے، کیونکہ ان کی پوری فہرست کسی جگہ بھی یکجا نہیں ملتی۔

بنی ہاشم میں سے : (۱) جعفرؓ بن ابی طالب

(۲) اُن کی بیوی اسماءؓ بنت عُمَیس خثعمیہ[2] (یہ غیر قریش میں سے تھیں)

(۳) صفیہؓ بنت عبدالمطّلب (حضورؐ کی پھوپھی اور حضرت زبیرؓ کی والدہ)۔

(۴) اَروٰیؓ بنت عبدالمطّلب (طُلَیبؓ بن عُمیر کی والدہ اور حضورؐ کی پھوپھی)۔

بنی المطّلب میں سے : (۵) عُبَیدہؓ بن الحارث بن مُطّلب

بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے : (۶) ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ

---

[1] موالی جمع ہے مولیٰ کی۔ مولیٰ اس غلام کو کہتے تھے جسے اس کے مالک نے آزاد کر دیا ہو، مگر آزاد ہونے کے بعد بھی وہ اپنے سابق آقا سے وابستہ رہتا تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] خواتین کا ذکر ہم زیادہ تر ان کے شوہروں یا بیٹوں کے ساتھ کریں گے۔ البتہ کہیں کہیں ان کا ذکر اُن کے اپنے خاندان کی نسبت سے بھی کر دیں گے۔ (حاشیہ از مؤلف)

(۷) اُن کی بیوی سہلہؓ بنت سُہیل بن عمرو

بنی اُمیّہ میں سے:
(۸) عثمانؓ بن عفان
(۹) اُن کی والدہ اَروَیٰ بنت کُریز
(۱۰) خالدؓ بن سعید بن العاص بن اُمیّہ (ابواحیحہ ان کے باپ سعید کی کُنیت تھی)
(۱۱) اُن کی بیوی اُمَیْنہؓ بنت خلف الخزاعیہ (بعض نے اُن کا نام اُمَینہ لکھا ہے)۔
(۱۲) اُمّ حبیبہؓ بنت ابی سُفیان (پہلے عُبَیداللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں۔ بعد میں ان کو اُمّ المومنین بننے کا شرف حاصل ہُوا)۔

حلفائے بنی اُمیّہ میں سے:
(۱۳) عبداللہؓ بن جحش بن رئاب
(۱۴) ابواحمدؓ بن جحش
(۱۵) عبیداللہ بن جحش[1]

یہ بنی غنم بن دُودان میں سے تھے۔ حضورؐ کی پھوپھی اُمَیمہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے اور اُمّ المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی تھے۔

بنی تیم میں سے:
(۱۶) اَسماءؓ بنت ابی بکرؓ
(۱۷) اُمّ رُومانؓ (حضرت ابوبکرؓ کی اہلیہ اور حضرت عائشہؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی والدہ)۔
(۱۸) طلحہؓ بن عبیداللہ
(۱۹) اُن کی والدہ صعبہؓ بنت الحضرمی
(۲۰) حارثؓ بن خالد

حلفائے بنی تیم میں سے:
(۲۱) صُہَیبؓ بن سنان الرُّومی

بنی اَسد بن عبدالعزّیٰ میں سے:
(۲۲) زبیرؓ بن العوام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی)۔
(۲۳) خالدؓ بن حزام (حکیم بن حزام کے بھائی اور حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے)۔
(۲۴) اَسوَدؓ بن نوفل
(۲۵) عمروؓ بن اُمیّہ

بنی عبدالعزّیٰ بن قُصَیّ میں سے: (۲۶) یزیدؓ بن زمعہ بن الاسود

بنی زُہرہ میں سے:
(۲۷) عبدالرحمٰنؓ بن عوف
(۲۸) اُن کی والدہ شِفاءؓ بنت عوف۔

---

[1] اس شخص نے اپنی بیوی حضرت اُمّ حبیبہؓ کے ساتھ حبش کی طرف ہجرت کی، پھر وہاں عیسائی ہو کر مر گیا۔ (حاشیہ از مرتب)

(۲۹) سعدؓ بن ابی وقاص (ابو وقاص کا اصل نام مالک بن اُہیب تھا)

(۳۰) ان کے بھائی عُمیرؓ بن ابی وقاص

(۳۱) ان کے بھائی عامرؓ بن ابی وقاص

(۳۲) مُطّلبؓ بن اَزہر (عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے چچا زاد بھائی)۔

(۳۳) ان کی بیوی رَملہؓ بنت ابی عوف سَہمیہ

(۳۴) طُلَیبؓ بن اَزہر

(۳۵) عبداللہؓ بن شہاب (یہ ننہیال کی طرف سے امام زُہری کے جد تھے)۔

حُلفائے بنی زُہرہ میں سے: (۳۶) عبداللہؓ بن مسعود (یہ قبیلہ ہُذیل میں سے تھے اور مکّہ میں بنی زُہرہ کے حلیف کی حیثیت سے رہتے تھے)۔

(۳۷) عُتبہؓ بن مسعود (برادر عبداللہؓ بن مسعود)

(۳۸) مِقدادؓ بن عَمرو الکندی (اسود بن عبدیغوث زُہری نے ان کو اپنا حلیف اور مُتبنّٰی بنا رکھا تھا)۔

(۳۹) خبّابؓ بن الارتّ

(۴۰) شُرَحبیلؓ بن حَسَنہ الکندی

(۴۱) جابرؓ بن حَسنہ (شُرَحبیلؓ بن حسنہ کے بھائی)

(۴۲) جُنادہؓ بن حَسنہ (” ” ” ”)

بنی عَدی میں سے: (۴۳) سعیدؓ بن زید بن عَمرو بن نُفَیل (حضرت عمرؓ کے بہنوئی اور چچا زاد بھائی)۔

(۴۴) ان کی بیوی فاطمہؓ بنت الخطّاب (حضرت عمرؓ کی بہن)۔

(۴۵) زیدؓ بن الخطّاب (حضرت عمرؓ کے بڑے بھائی)

(۴۶) عامرؓ بن ربیعہ العَنزی (حلیف بنی عدی۔ خطّاب نے ان کو بیٹا بنا رکھا تھا۔ ان کی کنیت ابو عبداللہ العنزی تھی)۔

(۴۷) ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حَثمہ

(۴۸) مَعمرؓ بن عبداللہ بن نَضلہ

(۴۹) نُعیمؓ بن عبداللہ النّحّام

(۵۰) عَدیؓ بن نَضلہ

(۵۱) عُروہؓ بن ابی اُثاثہ (عمرو بن العاص کے ماں جائے بھائی)۔

(۵۲) مسعودؓ بن سُوید بن حارِثہ بن نَضلہ

حلفائے بنی عدی میں سے: (۵۳) واقدؓ بن عبداللہ (ان کو عمر بن خطاب نے حلیف اور متبنّیٰ بنا رکھا تھا)۔

(۵۴) خالدؓ بن بُکَیر بن عبد یالیل اللیثی

(۵۵) ایاسؓ " "

(۵۶) عامرؓ " "

(۵۷) عاقلؓ " "

بنی عبدالدار میں سے: (۵۸) مُصعَبؓ بن عُمیر

(۵۹) ابوالرومؓ بن عُمیر (مُصعَبؓ بن عُمیر کے بھائی)۔

(۶۰) فِراسؓ بن النضر

(۶۱) جَہمؓ بن قیس

بنی جُمح میں سے: (۶۲) عثمانؓ بن مظعون

(۶۳) ان کے بھائی قدامہؓ بن مظعون

(۶۴) ان کے بھائی عبداللہؓ بن مظعون

(۶۵) سائبؓ بن عثمانؓ بن مظعون

(۶۶) مَعمرؓ بن الحارث بن مَعمر

(۶۷) ان کے بھائی حاطبؓ بن الحارث

(۶۸) ان کی بیوی فاطمہؓ بنت مُجلّل العامریہ

(۶۹) معمرؓ کے بھائی حطّابؓ بن الحارث

(۷۰) ان کی بیوی فُکَیہہؓ بنت یسار

(۷۱) سُفیانؓ بن مَعمر

(۷۲) نُبَیہؓ بن عثمان

بنی سَہم میں سے: (۷۳) عبداللہؓ بن حُذافہ

(۷۴) خُنَیسؓ بن حُذافہ (حضرت عمرؓ کے داماد، ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پہلے شوہر)۔

(۷۵) ہشامؓ بن العاص بن وائل

(۷۶) حارثؓ بن قیس

(۷۷) ان کے بیٹے بشیرؓ بن حارث

(۷۸) ان کے دوسرے بیٹے معمرؓ بن حارث

(۷۹) قیسؓ بن حذافہ (عبداللہؓ بن حذافہ کے بھائی)۔

(۸۰) ابو قیسؓ بن الحارث

(۸۱) عبداللہؓ بن الحارث

(۸۲) سائبؓ بن الحارث

(۸۳) حجاجؓ بن الحارث

(۸۴) بشرؓ بن الحارث

(۸۵) سعیدؓ بن الحارث

حلفائے بنی سہم میں سے:

(۸۶) عمیرؓ بن رئاب

(۸۷) محمیہؓ بن الجزءؓ (یہ حضرت عباسؓ کی بیوی ام الفضلؓ کے ماں جائے بھائی تھے)۔

بنی مخزوم میں سے:

(۸۸) ابو سلمہ عبداللہؓ بن عبدالاسد (حضورؐ کے پھوپھی زاد اور رضاعی بھائی۔ ام المومنین ام سلمہؓ کے پہلے شوہر)۔

(۸۹) ان کی بیوی ام سلمہؓ (یہ اور ان کے شوہر ابو سلمہؓ ابوجہل کے قریبی رشتہ دار تھے)۔

(۹۰) ارقمؓ بن ابی الارقم (جن کے دار ارقم کا پہلے ذکر ہو چکا ہے)۔

(۹۱) عیاشؓ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی۔ حضرت خالدؓ بن ولید کے چچا زاد بھائی)۔

(۹۲) ان کی بیوی اسماءؓ بنت سلامہ تمیمیہ

(۹۳) ولیدؓ بن ولید بن مغیرہ

(۹۴) ہشامؓ بن ابی حذیفہ

(۹۵) سلمہؓ بن ہشام

(۹۶) ہاشمؓ بن ابی حذیفہ

(۹۷) ہبارؓ بن سفیان

(۹۸) ان کے بھائی عبداللہؓ بن سفیان

حلفائے بنی مخزوم میں سے:

(۹۹) یاسرؓ (عمارؓ بن یاسر کے والد)

(۱۰۰) عمارؓ بن یاسر

(۱۰۱) اُن کے بھائی عبداللہؓ بن یاسر

بنی عامر بن لؤی میں سے:

(۱۰۲) ابو سبرہؓ بن ابی رُہم (حضورؐ کی پھوپھی برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے)۔

(۱۰۳) ان کی بیوی اُمّ کلثومؓ بنت سُہیل بن عمرو (ابو جندلؓ کی بہن)۔

(۱۰۴) عبداللہؓ بن سُہیل بن عمرو

(۱۰۵) حاطبؓ بن عمرو (سُہیل بن عمرو کے بھائی)

(۱۰۶) سَلیطؓ بن عمرو (سُہیل بن عمرو کے بھائی۔ اِصابہ میں ان کو سُہیل بن عمرو کا بھتیجا لکھا ہے)۔

(۱۰۷) سَکرانؓ بن عمرو (سُہیل بن عمرو کے بھائی۔ یہ اُمّ المومنین حضرت سَودہؓ بنت زَمعہ کے پہلے شوہر تھے)۔

(۱۰۸) ان کی بیوی سَودہؓ بنت زَمعہ[1] (جو سکرانؓ کی وفات کے بعد اُمّ المومنین بنیں)۔

(۱۰۹) سَلیطؓ بن عمرو کی بیوی یَقَظہؓ بنت عَلقمہ (اِصابہ میں اُمّ یقظہ لکھا ہے اور ابن سعد نے فاطمہ بنت علقمہ ان کا نام بتایا ہے)۔

(۱۱۰) مالکؓ بن زَمعہ (حضرت سَودہؓ کے بھائی)۔

(۱۱۱) ابن اُمّ مکتومؓ

بنی فِہر بن مالک میں سے:

(۱۱۲) ابو عُبیدہؓ بن الجراح

(۱۱۳) سُہیلؓ بن بَیضاء

(۱۱۴) سعدؓ بن قیس

(۱۱۵) عَمروؓ بن الحارث بن زُہیر

(۱۱۶) عثمانؓ بن عبد غنم بن زُہیر (حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے پھوپھی زاد بھائی)۔

(۱۱۷) حارثؓ بن سعد

بنی عبد قُصَیّ میں سے:

(۱۱۸) طُلَیبؓ بن عُمیر (حضورؐ کی پھوپھی اَروٰی بنت عبدالمطلب کے بیٹے)۔

یہ وہ لوگ تھے جو قریش کے بڑے بڑے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک اچھی خاصی تعداد موالی

---

[1] اِس نام کا تلفّظ زَمعہ بھی کیا گیا ہے اور زَمَعہ بھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

غلاموں اور لونڈیوں کی بھی تھی جنہوں نے خفیہ دعوت کے اِن تین سالوں میں اسلام قبول کیا۔ ان کے نام یہ ہیں:-

(۱۹) اُمّ اَیمنؓ برکہ بنت ثعلبہ جنہوں نے بچپن سے حضورؐ کو گود میں پالا تھا۔

(۲۰) زِنّیرہؓ رُومیہ عمرو بن المُؤمّل کی آزاد کردہ لونڈی۔

(۲۱) بلالؓ بن رباح۔ یہ اُمیّہ بن خلف کے غلام تھے۔

(۲۲) اُن کی والدہ حمامہؓ

(۲۳) ابو فکیہہؓ یسار الجہنی صفوان بن اُمیّہ کے آزاد کردہ غلام۔

(۲۴) لُبَینہؓ، مُؤمّل بن حبیب کی لونڈی

(۲۵) اُمّ عُبَیسؓ، بنی تیم بن مُرّہ یا بنی زُہرہ کی لونڈی (پہلا قول زبیر بن بکّار کا ہے اور دوسرا بلاذری کا)۔

(۲۶) عامرؓ بن فُہَیرہ، طُفَیل بن عبداللہ کے غلام

(۲۷) سُمیّہؓ (حضرت عمّارؓ بن یاسر کی والدہ اور ابو حذیفہ بن مُغیرہ مخزومی کی لونڈی)۔

اِن کے علاوہ غیر قریش میں سے جن لوگوں نے مکّہ کے اِس ابتدائی دَور میں اسلام قبول کیا وہ یہ تھے:

(۲۸) مِحجَنؓ بن الاَدرع الاسلمی

(۲۹) مسعودؓ بن ربیعہ بن عَمرو۔ یہ بنی الھَون بن خُزَیمہ کے قبیلہ قارہ سے تھے۔

اِس طرح ابتدائی چار مسلمانوں کے ساتھ اِن ۲۹ کے ملنے سے اُن لوگوں کی کُل تعداد ۳۳ بن جاتی ہے جو حضورؐ کی دعوتِ عام شروع ہونے سے پہلے آپ پر ایمان لا کر جماعتِ مسلمین میں شامل ہو چکے تھے[1]۔ یہ وہ صحیح الفکر اور سلیم الفطرت لوگ تھے جنہوں نے محض دلیل اور افہام و تفہیم سے شرک کی بُرائی کو سمجھا، توحید کی حقیقت کو مانا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسُول تسلیم کیا، قرآن کو کلامِ الٰہی کی حیثیت سے اپنے لیے سرچشمۂ ہدایت

---

[1] ابو تمام ابن عبدالبر نے، اور اُسد الغابہ میں ابن اثیر نے لکھا ہے: "کہا جاتا ہے کہ حضرت عباسؓ کی بیوی اُمّ الفضلؓ پہلی عورت تھیں جو حضرت خدیجہؓ کے بعد مسلمان ہوئیں"۔ یہ قول اگر صحیح ہے تو اس ابتدائی دَور کے مسلمانوں کی تعداد ۳۴ ہو جاتی ہے۔ اِن خاتون کا اصل نام لُبابہ بنت الحارث تھا۔ یہ اُمّ المومنین حضرت میمونہؓ کی بہن، حضرت خالدؓ بن ولید کی خالہ، اور حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی بیوی اسماء بنت عُمَیس کی ماں جائی بہن تھیں۔ ہم نے فہرست میں ان کا نام اس لیے درج نہیں کیا کہ "کہا جاتا ہے" کے کمزور الفاظ میں اسے بیان کیا گیا ہے۔

(حاشیہ از مؤلف)

قرار دیا، اور آخرت کی زندگی کو یقینی حقیقت سمجھا۔ اتنے مخلص اور دینی فہم رکھنے والے کارکن تیار کر لینے کے بعد حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے علی الاعلان دعوتِ اسلام کا کام شروع فرمایا۔ (٢١)

حوالہ جات باب ۴

(۱) ـــــــ رسائل و مسائل حصہ اول، ص ۴۹

(۲) ـــــــ اضافہ از مؤلف

(۳) ـــــــ تفہیم القرآن جلد ششم، دیباچہ سورۂ علق۔

(۴) ـــــــ 〃 〃 〃 〃، الم نشرح، حاشیہ ۲۔

(۵) ـــــــ 〃 〃 جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۸۳۔

(۶) ـــــــ 〃 〃 جلد ششم، دیباچہ سورۂ علق۔

(۷) ـــــــ تفہیم القرآن جلد ششم، دیباچہ سورہ العلق۔

(۸) ـــــــ رسائل و مسائل حصہ سوم، ص ۲۳۲۔

(۹) ـــــــ 〃 〃 حصہ سوم، ص ۲۲۹ تا ۲۳۲۔

(۱۰) ـــــــ تفہیم القرآن، جلد سوم، القصص، حاشیہ ۱۰۹۔

(۱۱) ـــــــ 〃 〃، جلد ششم، دیباچہ سورۂ مدثر

(۱۲) ـــــــ 〃 〃، جلد ششم، العلق، حواشی ۱ تا ۶۔

(۱۳) ـــــــ اضافہ از مؤلف

(۱۴) ـــــــ تفہیم القرآن، جلد ششم، القدر، حاشیہ ۱

(۱۵) ـــــــ اضافہ از مؤلف

(۱۶) ـــــــ تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۂ مدثر

(۱۷) ـــــــ اضافہ از مؤلف

(۱۸) ـــــــ تفہیم القرآن، جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۱۱۔

(۱۹) ـــــــ 〃 〃، جلد ششم، الاعلیٰ، حاشیہ ۷۔

(۲۰) ـــــــ 〃 〃، جلد سوم، طٰہٰ، حاشیہ ۹۱۔ جلد ششم، القیامہ، حاشیہ ۱۱۔ الاعلیٰ، حاشیہ ۷۔

(۲۱) ـــــــ اضافہ از مؤلف

باب (۵)

دعوتِ حق کے لیے ھدایات جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئیں

مخفیہ تبلیغ کے ابتدائی ۳ برسوں کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ اب دعوتِ عام کے دس سالہ مکی دور کی تاریخ بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی میں دو چیزیں اچھی طرح واضح کر دی جائیں جن سے بعد کے پیش آنے والے واقعات بہتر طور پر سمجھے جا سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کارِ رسالت انجام دینے کے لیے کیا ہدایات دی گئی تھیں جو اتنی کارگر تھیں کہ انہوں نے دلوں اور روحوں کو مسخر کر کے چھوڑا، دماغوں کی ٹیڑھ نکال کر چھوڑی، اور ایک اُجڈ قوم کو بدل کر رکھ دیا۔

دوسرے یہ کہ اسلامی دعوت کی حقیقی نوعیت کیا تھی جس کی وجہ سے آپؐ کے خلاف عداوت کا وہ طوفان اُٹھا جو عرب میں محض شرک سے انکار اور توحید کا اقرار کرنے والوں کے خلاف کبھی نہ اُٹھا تھا، مگر یہ دعوت کیسی زبردست قوت کے ساتھ پیش کی گئی تھی کہ اس نے جاہلیت کے علمبرداروں کو آخر کار بے بس کر دیا۔

اس باب میں ہم صرف پہلے موضوع سے بحث کریں گے اور دوسرے موضوع پر بعد کے باب اور اس کی فصلوں میں کلام کیا جائے گا۔

(۱)

ابتدائے دعوت کے متعلق اجمالی بیان

اللہ تعالیٰ نے عرب کے مشہور مرکزی شہر مکہ میں اپنے ایک بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلے (قریش) سے دعوت کی ابتدا کریں۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں۔

ایک، پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کس طرز

پر کام کریں۔

دوسرے، حقیقتِ نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں اُن غلط فہمیوں کی مجمل تردید جو گرد و پیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے اُن کا رویّہ غلط ہو رہا تھا۔

تیسرے، صحیح رویّہ کی طرف دعوت اور ہدایتِ الٰہی کے اُن بنیادی اصولِ اخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح و سعادت ہے۔

شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائے دعوت کی مناسبت سے چند چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل ہوتے تھے جن کی زبان نہایت شستہ، نہایت شیریں اور نہایت پُر اثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھی، تاکہ دلوں میں یہ بول تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود اُن کے ترنّم کی وجہ سے اُن کی طرف متوجہ ہوں اور زبانیں اِن کے حُسنِ تناسُب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر انہیں دُہرانے لگیں۔ پھر ان میں مقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جا رہی تھیں عالمگیر صداقتیں، مگر ان کے لیے دلائل و شواہد اور مثالیں اُس قریب ترین ماحول سے لی گئی تھیں جس سے مخاطب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ اُنہی کی تاریخ، اُنہی کی روایات، اُنہی کے روز مرّہ مشاہدے میں آنے والے آثار اور اُنہی کی اعتقادی و اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

دعوت کا یہ ابتدائی مرحلہ تقریباً چار پانچ سال تک جاری رہا جن میں پہلے تین سال خفیہ دعوت کے تھے، اور اس مرحلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی تبلیغ کا ردِّ عمل تین صورتوں میں ظاہر ہُوا:

۱۔ چند صالح آدمی اِس دعوت کو قبول کر کے اُمّتِ مُسلمہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔

۲۔ ایک کثیر تعداد جہالت یا خود غرضی کی بنا پر یا باپ دادا کے دین کی محبت کے باعث مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔

۳۔ مکّہ اور قریش کی حدود سے نکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقے میں پہنچنے لگی۔

یہاں سے اِس دعوت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اِس مرحلے میں اسلام کی اِس تحریک اور پُرانی جاہلیت کے درمیان ایک سخت جاں گُسل کشمکش برپا ہُوئی جس کا سلسلہ آٹھ نو سال تک چلتا رہا۔ نہ صرف مکّے میں، نہ صرف قبیلۂ قریش میں بلکہ عرب کے بیشتر حصّوں میں بھی جو لوگ پُرانی جاہلیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے وہ اس تحریک کو بزورِ مٹا دینے پر تُل گئے۔ انہوں نے اسے دبانے کے لیے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ جھوٹا پروپیگنڈا کیا، الزامات اور شبہات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی، عوام الناس کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے اندازیاں کیں، ناواقف لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی بات سُننے سے روکنے کی کوششیں کیں، اسلام قبول کرنے والوں پر نہایت وحشیانہ ظلم و ستم

ڈھاتے، ان کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کیا، اور ان کو اتنا تنگ کیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ دو دفعہ اپنے
گھر چھوڑ کر حبش کی طرف ہجرت کر جانے پر مجبور ہوئے اور بالآخر تیسری مرتبہ ان سب کو مدینے کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔
لیکن اِس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ مکّے میں کوئی خاندان اور کوئی گھر ایسا نہ رہا
جس کے کسی نہ کسی فرد نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔ بیشتر مخالفینِ اسلام کی دشمنی میں شدت اور تلخی کی وجہ یہی تھی کہ
اُن کے اپنے بھائی بھتیجے، بیٹے، داماد، بیٹیاں، بہنیں اور بہنوئی دعوتِ اسلام کے نہ صرف پیرو بلکہ جاں نثار حامی
ہو گئے تھے اور ان کے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے ہی ان سے برسرِ پیکار ہونے کو تیار تھے۔ پھر لطف یہ ہے کہ جو
لوگ پُرانی جاہلیت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اِس نوخیز تحریک کی طرف آ رہے تھے وہ پہلے بھی اپنے معاشرے کے
بہترین لوگ سمجھے جاتے تھے، اور اِس تحریک میں شامل ہونے کے بعد وہ اتنے راست باز اور ایسے پاکیزہ اخلاق کے
انسان بن جاتے تھے کہ دُنیا اُس دعوت کی برتری محسوس کیے بغیر نہ رہ سکتی تھی جو ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی
تھی اور اُنہیں یہ کچھ بنا رہی تھی۔

اِس طویل اور شدید کشمکش کے دوران میں اللہ تعالیٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبی پر ایسے
پُرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تُند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں
میں ایک طرف اہلِ ایمان کو ان کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقویٰ
اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگیِ سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے
وعدوں اور جنّت کی بشارتوں سے ان کی ہمّت بندھائی گئی، انہیں صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی
راہ میں جدوجہد کرنے پر اُبھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ ان میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر
مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دوسری
طرف مخالفین اور راہِ راست سے مُنہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والوں کو اُن قوموں کے انجام سے
ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے، اُن تباہ شُدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جن کے کھنڈروں پر
سے شب و روز اپنے سفروں میں اُن کا گزر ہوتا تھا، توحید اور آخرت کی دلیلیں اُن کھلی کھلی نشانیوں سے دی
گئیں جو رات دن زمین اور آسمان میں اُن کی آنکھوں کے سامنے نمایاں تھیں اور جن کو وہ خود اپنی زندگی میں بھی ہر
وقت دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، شرک اور دعوائے خود مختاری اور انکارِ آخرت اور تقلیدِ آبائی کی غلطیاں ایسے
بیّن دلائل سے واضح کی گئیں جو دل کو لگتے اور دماغ میں اُتر جانے والے تھے۔ پھر ان کے ایک ایک شبہ کو رفع
کیا گیا، ایک ایک اعتراض کا معقول جواب دیا گیا، ایک ایک اُلجھن جس میں وہ خود پڑے ہوئے تھے یا دوسروں
کو اُلجھانے کی کوشش کرتے تھے، صاف کی گئی، اور ہر طرف سے گھیر کر جاہلیت کو ایسا تنگ پکڑا گیا کہ عقل و خِرد کی

دُنیا میں اُس کے لیے ٹھہرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ پھر اُن کو خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذاب کا خوف دلایا گیا۔ اُن کے بُرے اخلاق اور غلط طرزِ زندگی اور جاہلانہ رُسوم اور حق دشمنی اور مومن آزاری پر انہیں ملامت کی گئی، اور اخلاق و تمدّن کے وہ بڑے بڑے بنیادی اصُول اُن کے سامنے پیش کیے گئے جن پر ہمیشہ سے خدا کی پسندیدہ صالح تہذیبوں کی تعمیر ہوتی چلی آرہی ہے۔

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جدوجہد اور مزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِ عمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوّع بڑھتا گیا۔ (۲)

دعوتِ اسلامی کے اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو مفصّل ہدایات دی گئیں اُن پر غور کرنے سے آدمی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ مکّہ کے شدید مخالفانہ دَور میں کس عظیم اخلاقی طاقت نے اسلامی تبلیغ کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ صاف کیا اور کس مؤثر ترین تعلیم نے اس تبلیغ سے متاثر ہونے والوں کو خدا کی راہ میں ہر قوت سے ٹکرا جانے اور ہر مصیبت جھیل جانے پر آمادہ کر دیا۔ ذیل میں ہم ان ہدایات میں سے ایک ایک کو بیان کرتے ہیں۔

دعوت میں حکمت و موعظت کا لحاظ

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل آیت ۱۲۵)

"اے نبی، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ"

اس میں بتایا گیا ہے کہ دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہییں۔ ایک حکمت۔ دوسرے عمدہ نصیحت۔

حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دُھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے، پہلے اُس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے۔ بُرائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے، بلکہ انسان کی فطرت میں اُن کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اُسے بھی اُبھارا جائے، اور اُن کے بُرے نتائج کا خوف دلایا جائے۔ ہدایت اور عملِ صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ اُن کی طرف رغبت اور

شوق بھی پیدا کیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے دلسوزی اور خیرخواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اُسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے۔ بلکہ اُسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اُس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اُس کی بھلائی چاہتا ہے۔ بحث و گفتگو کی نوعیت مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود حریف مقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اُتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گمراہی میں زیادہ دور نہ نکل جائے۔ (۳)

دعوتِ حق کے لیے ٹھنڈا اور سنجیدہ اُسلوب

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل ۵۳-۵۴)

"اور اے محمدؐ، میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ تمہارا رب تمہارے حال سے زیادہ واقف ہے، وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے دے۔ اور اے نبیؐ ہم نے تم کو لوگوں پر حوالہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔"

یعنی اہلِ ایمان کفار اور مشرکین سے اور اپنے دین کے مخالفین سے گفتگو اور مباحثے میں تیز کلامی اور مبالغے اور غلو سے کام نہ لیں۔ مخالفین خواہ کیسی ہی ناگوار باتیں کریں مسلمانوں کو بہر حال نہ تو کوئی بات خلافِ حق زبان سے نکالنی چاہیے اور نہ غصے میں آپے سے باہر ہو کر بیہودگی کا جواب بیہودگی سے دینا چاہیے۔ انہیں ٹھنڈے دل سے وہی بات کہنی چاہیے جو جچی تلی ہو، برحق ہو اور اُن کی دعوت کے وقار کے مطابق ہو۔

اور جب کبھی تمہیں مخالفین کی بات کا جواب دیتے وقت غصے کی آگ اپنے اندر بھڑکتی محسوس ہو اور طبیعت بے اختیار جوش میں آتی نظر آئے تو فوراً یہ سمجھ لو کہ یہ شیطان ہے جو تمہیں اُکسا رہا ہے تاکہ دعوتِ دین کا کام خراب ہو۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اپنے مخالفین کی طرح اصلاح کا کام چھوڑ کر اسی جھگڑے اور فساد میں لگ جاؤ جس میں وہ نوعِ انسانی کو مشغول رکھنا چاہتا ہے۔

اور اہلِ ایمان کی زبان پر کبھی ایسے دعوے بھی نہ آنے چاہییں کہ ہم جنتی ہیں اور فلاں شخص یا گروہ دوزخی ہے۔ اس کا فیصلہ تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ خود نبی کا کام صرف دعوت دینا ہے۔ لوگوں کی قسمتیں اس کے ہاتھ میں نہیں دے دی گئی ہیں کہ وہ کسی کے حق میں رحمت کا اور کسی کے حق میں عذاب کا فیصلہ صادر کر دے۔ (۴)

داعی کا منصب اور اس کی ذمہ داری

• قَدْ جَآءَكُم بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ عَمِىَ فَعَلَيْهَا ۚ وَمَآ أَنَا۠ عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ۝ (الانعام ۔ ۱۰۴)

"دیکھو، تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں۔ اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا۔ میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں۔"

• "میں تم پر پاسبان نہیں ہوں" یعنی میرا کام صرف اتنا ہے کہ اس روشنی کو تمہارے سامنے پیش کر دوں جو تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے۔ اس کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھنا یا نہ دیکھنا تمہارا اپنا کام ہے۔ میرے سپرد یہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جنہوں نے خود آنکھیں بند کر رکھی ہیں ان کی آنکھیں زبردستی کھولوں اور جو کچھ وہ نہیں دیکھتے وہ انہیں دکھا کر ہی چھوڑوں۔ (۵)

اتَّبِعْ مَآ أُوحِىَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝ وَلَوْ شَآءَ اللَّهُ مَآ أَشْرَكُوا۟ ۗ وَمَا جَعَلْنَٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ وَمَآ أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ ۔

(الانعام: ۱۰۶ ۔ ۱۰۷)

"اے نبیؐ! اس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ یہ لوگ شرک نہ کریں) تو یہ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو۔"

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلّغ بنایا گیا ہے کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمہیں ان کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کر دو اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو۔ اور نہ تمہاری ذمہ داری و جواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقۂ نبوت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا کیا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔

اگر فی الواقع حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دُنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لیے صحیح طریقِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھا دی گئی ہے اس کے اُجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو، اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو خواہ وہ دُنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں۔ اور جو اسے قبول نہ کریں اُن کے پیچھے نہ پڑو، جس انجامِ بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مُصر ہیں اس کی طرف جانے کے لیے اُنہیں چھوڑ دو۔ (۶)

تبلیغ کا آسان طریقہ

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ، فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى - (الاعلیٰ ۸، ۹)

"اور اے نبی! ہم تم کو آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں، پس نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو۔"

یعنی اے نبی! ہم تبلیغِ دین کے معاملہ میں تم کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سُناؤ اور اندھوں کو راہ دکھاؤ۔ بلکہ آسان طریقہ تمہارے لیے میسر کیے دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ نصیحت کرو جہاں تمہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کون اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے اور کون نہیں ہے؟ تو ظاہر ہے کہ اس کا پتہ تبلیغ عام ہی سے چل سکتا ہے۔ اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے مگر اس سے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے بندوں میں سے اُن لوگوں کو تلاش کیا جائے جو اس سے فائدہ اُٹھا کر راہِ راست اختیار کر لیں۔ یہی لوگ تمہاری نگاہِ التفات کے مستحق ہیں اور انہی کی تعلیم و تربیت پر تمہیں توجہ صرف کرنی چاہیے۔ ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے جن کے متعلق تجربہ سے تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت قبول نہیں کرنا چاہتے۔ (۷)

تبلیغِ اسلام کے نقطۂ نظر سے اصل اہمیت کن لوگوں کی ہے

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ، مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ - (الانعام - ۵۲)

"اور اُسے نبی جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں انہیں اپنے سے دُور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار اُن پر نہیں۔ پھر بھی تم انہیں دُور پھینکو گے تو ظالم ہو گے۔"

جو لوگ ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے تھے اُن میں بکثرت ایسے بھی تھے جو غریب یا محنت پیشہ تھے۔ قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر منجملہ دوسرے اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپ کے گرد و پیش ہماری قوم کے غلام، موالی اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اس شخص کو ساتھی بھی کیسے کیسے "معزز" لوگ ملے ہیں، بلالؓ، عمارؓ، صُہَیبؓ، خبابؓ، بس یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان ایسے ملے ہیں جن کو برگزیدہ کیا جا سکتا تھا! پھر وہ ایمان لانے والوں کی خستہ حالی کا مذاق اُڑانے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان میں سے جس کسی سے کبھی کوئی اخلاقی کمزوری ایمان لانے سے پہلے ظاہر ہوئی تھی اس پر حرف گیریاں کرتے اور کہتے تھے کہ فلاں جو کل تک یہ تھا اور فلاں جس نے یہ کیا تھا آج وہ بھی اس "برگزیدہ گروہ" میں شامل ہے۔ چنانچہ اسی سُورہ انعام کی آیت ۵۳ میں اُن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "کیا یہی ہیں وہ لوگ جن پر ہمارے درمیان اللہ کا فضل و کرم ہُوا ہے؟" انہی باتوں کا جواب اِس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ طالبِ حق بن کر تمہارے پاس آتے ہیں انہیں ان بڑے بڑے لوگوں کی خاطر اپنے سے دُور نہ پھینکو۔ اسلام لانے سے پہلے کوئی کسی غلطی کا مرتکب ہُوا بھی تھا تو اس کی ذمہ داری تم پر تو عائد نہیں ہوتی۔ (۸)

حضرت ابن اُمِّ مکتومؓ کا واقعہ

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مکہ معظمہ کے چند بڑے سردار بیٹھے ہُوئے تھے اور حضورؐ ان کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔[1] اتنے میں ابن اُمِّ مکتوم نامی ایک نابینا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور انہوں نے آپؐ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضورؐ کو اُن کا

---

[1] حضورؐ کی مجلس میں جو لوگ اُس وقت بیٹھے تھے مختلف روایات میں اُن کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اس فہرست میں ہمیں عُتبہ، شَیبہ، ابوجہل، اُمیّہ بن خَلَف، اُبَیّ بن خلف جیسے بدترین دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کشمکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپؐ کے ہاں اُن کی آمد و رفت اور آپؐ کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

یہ مداخلت ناگوار ہوئی اور آپؐ نے اُن سے بے رُخی برتی۔ اِس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سُورۂ عَبَس نازل ہُوئی ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۔ (آیات ۱-۲)

"وہ ترش رُو ہُوا اور بے رُخی برتی اِس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آگیا۔"

بظاہر کلام کے آغاز کا اندازِ بیان دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بے رُخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجہ کرنے کی بنا پر اِس سُورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پُوری سُورت پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عتاب کفارِ قریش کے اُن سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے تکبُّر اور ہٹ دھرمی اور صداقت سے بے نیازی کی بنا پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضورؐ کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ اُس طریقے کی خامی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتدا میں آپ اختیار فرما رہے تھے۔ آپ کا ایک نابینا سے بے رُخی برتنا اور سردارانِ قریش کی طرف توجہ کرنا کچھ اِس بنا پر نہ تھا کہ آپ بڑے لوگوں کو معزز اور ایک بیچارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ یہ کوئی کج خلقی آپ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ بلکہ معاملہ کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا میلان اِس طرف ہوتا ہے کہ قوم کے بااثر لوگ اس کی دعوت قبول کر لیں تاکہ کام آسان ہو جائے، ورنہ عام بے اثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔ قریب قریب یہی طرزِ عمل دعوت کی ابتدا میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرک سراسر اخلاص اور دعوتِ حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اِس دعوت کے نقطۂ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالبِ حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اِس لیے آپ اسلام کی تعلیمات تو علی الاعلان سب کو سُنائیں، مگر آپ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپ اِسے اُن مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ اُن کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو اُن کی ضرورت ہے۔ اِسی سلسلے میں آگے فرمایا:

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۔ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۔ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۔ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۔ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۔ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۔ وَهُوَ يَخْشٰى ۔ فَاَنْتَ عَنْهُ

تَدَلّٰی۔ کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَہٗ۔ (آیات ۳ تا ۱۲)

"اے نبیؐ، تمہیں کیا خبر، شاید کہ وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اُس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمّہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک نصیحت ہے، جس کا جی چاہے اسے قبول کرے۔"

یہی وہ اصل نکتہ ہے جسے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تبلیغِ دین کے معاملہ میں اس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا اور اسی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابنِ اُمِّ مکتوم کے ساتھ آپؐ کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپؐ کو بتایا کہ داعیِ حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف بتا رہی ہے کہ وُہ طالبِ حق ہے، اس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کر کے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اِس لیے وہ راہِ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کا رویّہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اُسے راہِ راست بتائی جائے۔ اِن دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سُدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اِس متاعِ گراں مایہ کا سرے سے قدر دان ہی نہیں ہے۔ پہلی قسم کا آدمی خواہ اندھا ہو، لنگڑا ہو، لُولا ہو، فقیرِ بے نوا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہرحال داعیِ حق کے لیے وہی قیمتی آدمی ہے۔ اُسی کی طرف اُسے توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اِس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اِصلاح ہے، اور اِس شخص کا حال یہ بتا رہا ہے کہ اُسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کرے گا۔ رہا دوسری قسم کا آدمی، تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی با اثر ہو، اس کے پیچھے پڑنے کی داعیِ حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اُس کی رَوِش علانیہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سُدھرنا نہیں چاہتا، اِس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ وہ اگر نہ سُدھرنا چاہے تو نہ سُدھرے، نقصان اُس کا اپنا ہو گا، داعیِ حق پر اس کی کوئی ذمّہ داری نہیں۔

جن نابینا کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد مشہور صحابی حضرت ابنِ اُمِّ مکتومؓ ہیں۔ حافظ ابنِ عبد البرّ نے الاستیعاب میں اور حافظ ابنِ حجرؒ نے الاصابہ میں بیان کیا ہے کہ یہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کی ماں اُمِّ مکتوم اور حضرت خدیجہؓ کے والد خُویلد آپس میں بہن بھائی تھے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کا یہ رشتہ

معلوم ہو جانے کے بعد اس شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپؐ نے ان کو غریب یا کم حیثیت آدمی سمجھ کر ان سے بے رُخی برتی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی تھی، کیونکہ یہ حضورؐ کے برادر نسبتی تھے، خاندانی آدمی تھے، کوئی گرے پڑے آدمی نہ تھے۔ اصل وجہ جس کی بنا پر آپؐ نے ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کیا، لفظ اَعمٰی (نابینا) سے معلوم ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی بے اعتنائی کے سبب کی حیثیت سے خود بیان فرما دیا ہے یعنی حضورؐ کا خیال یہ تھا کہ میں اس وقت جن لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں ان میں سے کوئی ایک آدمی بھی ہدایت پا لے تو اسلام کی تقویت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے۔ بخلاف اس کے ابنِ مکتومؓ ایک نابینا آدمی ہیں اپنی معذوری کے باعث یہ اسلام کے لیے اُس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جس قدر ان سرداروں میں سے کوئی مسلمان ہو کر مفید ہو سکتا ہے، اس لیے ان کو اس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں اسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں۔ (۹)

حکمتِ تبلیغ

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (العنکبوت۔ آیت ۴۶)

"اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے۔"

یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی سپرٹ میں ہونا چاہیے تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مبلغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار دے اور اسے راہِ راست پر لائے۔ اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مقصد اپنے مدِ مقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے، بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ بڑھ نہ جائے، اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفا پا جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہلِ کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے، مگر یہ اہلِ کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ تبلیغِ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے مثلاً:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (النحل۔ آیت ۱۲۵)

"دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔"

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۔ (حٰم السجدہ۔ آیت ۳۴)

" بھلائی اور بُرائی یکساں نہیں ہیں (مخالفین کے حملوں کی) مدافعت ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے گرمجوش دوست ہے "

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۔ (المومنون۔ آیت ۹۶)

" تم بدی کو اچھے ہی طریقے سے دفع کرو ہمیں معلوم ہے جو باتیں وہ (تمہارے خلاف) بناتے ہیں " (۱۰)

دعوتِ حق کے لیے صحیح طریق کار

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۔ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۔ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۔ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ۔ (الاعراف۔ آیات ۱۹۹ تا ۲۰۲)

" اے نبیؐ، نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ الجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو، وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے (کہ ان کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے)۔ رہے اُن کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند، تو وہ انہیں ان کی کج روی میں کھینچے لیے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے "۔

ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں اور مقصود صرف حضورؐ ہی کو تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ حضورؐ کے ذریعہ سے اُن سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضورؐ کے قائم مقام بن کر دنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اٹھیں۔ ان نکات کو سلسلہ وار دیکھنا چاہیے:

(۱) داعیٔ حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خو، متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامۃ الناس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اُسے شدید

سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے۔ مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی، اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگذر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گیری، درشتی، ترش روئی، تلخ گفتاری اور منتقمانہ اشتعال طبع اس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے، بنتا نہیں ہے۔ اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ "غضب اور رضا، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں، جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں، جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔" اور اسی چیز کی ہدایت آپ ان لوگوں کو دیتے تھے جنہیں آپ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا یعنی "جہاں تم جاؤ وہاں تمہاری آمد لوگوں کے لیے مژدۂ جانفزا ہو نہ کہ باعث نفرت، اور لوگوں کے لیے تم سہولت کے موجب بنو نہ کہ تنگی و سختی کے۔" اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ۔ یعنی "یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو، ورنہ اگر تم درشت خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔" (آل عمران، ع ۱۷)

(۲) دعوتِ حق کی کامیابی کا گر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف یعنی ان سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے جنہیں بالعموم سارے ہی انسان جانتے ہیں یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقل عام (Common Sense) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعیِ حق کی اپیل عوام و خواص سب کو متاثر کرتی ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ آپ نکال لیتی ہے۔ ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا کرتے ہیں وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ عام انسان، خواہ وہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں، تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفین حق سے پھرتے اور داعیِ حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ آخرکار میدانِ مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے ذاتی مفاد نظامِ باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہوں، یا پھر جن کے دلوں میں تقلیدِ اسلاف اور جاہلانہ تعصبات نے کسی روشنی کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر آپ کے بعد تھوڑی ہی مدت میں اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں پر اس طرح پھیل گیا کہ کہیں ۹۰ فی صدی اور کہیں

۸۰ اور ۹۰ فی صدی باشندے مسلمان ہو گئے۔

(۳) اس دعوت کے کام میں یہ بات یقیناً ضروری ہے کہ طالبینِ خیر کو معروف کی تلقین کی جائے اتنی ہی یہ بات بھی ضروری ہے کہ جاہلوں سے نہ اُلجھا جائے خواہ وہ اُلجھنے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ داعی کو اس معاملہ میں سخت محتاط ہونا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف اُن لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔ اور جب کوئی شخص جہالت پر اُتر آئے اور حجت بازی، جھگڑالو پن اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس جھگڑے میں اُلجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعتِ دعوت اور اصلاحِ نفوس میں خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جاتی ہے۔

(۴) اوپر نمبر ۳ میں جو ہدایت دی گئی ہے اسی کے سلسلہ میں مزید ہدایت یہ ہے کہ جب کبھی داعیِ حق جاہلین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نزغِ شیطانی (یعنی شیطان کی اُکساہٹ) ہے اور اسی وقت اُسے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اُس سے دعوتِ حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوتِ حق کا کام بہرحال ٹھنڈے دل ہی سے ہو سکتا ہے اور وہی قدم صحیح اُٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر، خوب سوچ سمجھ کر اُٹھایا جائے۔ لیکن شیطان، جو اس کام کو فروغ پاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعیِ حق پر طرح طرح کے حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعیِ حق کو اُکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے، اکثر بڑی بڑی پُرفریب تاویلوں اور مذہبی اصطلاحوں کے غلاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے، لیکن اس کی تہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے آخری دو آیتوں میں فرمایا کہ جو لوگ متقی (یعنی خدا ترس اور بدی سے بچنے کے خواہشمند) ہیں وہ تو اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی بُرے خیال کی کھٹک محسوس کرتے ہی فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس موقع پر دعوتِ دین کا مفاد کس طرزِ عمل کے اختیار کرنے میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے کام میں نفسانیت کی لاگ لگی ہوئی ہے اور اس وجہ سے جن کا شیاطین کے ساتھ بھائی چارہ کا تعلق ہے، تو وہ شیطانی تحریک کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے اور اس سے مغلوب ہو کر غلط راہ پر چل نکلتے ہیں۔ پھر جس جس وادی میں شیطان چاہتا ہے انہیں لیے پھرتا ہے اور کہیں جا کر اُن کے قدم نہیں رُکتے۔ مخالف کی ہر گالی کے جواب میں ان کے پاس ایک گالی اور ہر چال کے جواب میں اس سے بڑھ کر ایک چال موجود ہوتی ہے۔

اِس ارشاد کا ایک عمومی محمل بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اہلِ تقویٰ کا طریقہ بالعموم اپنی زندگی میں غیر متقی لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ بُرائی سے بچیں اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ بُرے خیال کا ایک ذرا سا غُبار بھی اُن کے دل کو چھو جاتا ہے تو اُنہیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہونے لگتی ہے جیسی کھٹک اُنگلی میں پھانس چُبھ جانے یا آنکھ میں کسی تنکے کے گر جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بُرے خیالات، بُری خواہشات اور بُری نیتوں کے خوگر نہیں ہوتے، اِس وجہ سے یہ چیزیں اُن کے لیے اُسی طرح خلافِ مزاج ہوتی ہیں جس طرح اُنگلی کے لیے پھانس، یا آنکھ کے لیے ذرّہ، یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کے لیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ یا گندگی کی ایک چھینٹ۔ پھر جب یہ کھٹک انہیں محسوس ہو جاتی ہے تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کا ضمیر بیدار ہو کر اس غبار کو اپنے اُوپر سے جھاڑ دینے میں لگ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں، نہ بدی سے بچنا چاہتے ہیں، اور جن کی شیطان سے لاگ لگی ہوئی ہوتی ہے اُن کے نفس میں بُرے خیالات، بُرے ارادے، بُرے مقاصد پکتے رہتے ہیں اور وہ اِن گندی چیزوں سے کوئی اُپراہٹ اپنے اندر محسوس نہیں کرتے، بالکل اُسی طرح جیسے کسی دیگچی میں سُؤر کا گوشت پک رہا ہو اور وہ بے خبر ہو کہ اس کے اندر کیا پک رہا ہے، یا جیسے کسی بھنگی کا جسم اور اس کے کپڑے غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہوں اور اسے کچھ احساس نہ ہو کہ وہ کن چیزوں میں آلودہ ہے۔ (۱۱)

سخت مخالفانہ ماحول میں دعوت الی اللہ

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

(حٰم السجدہ آیت ۳۳)

"اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں۔"

اِس سے پہلے کی آیات میں اہلِ ایمان کو تسکین دی گئی تھی اور ان کی ہمت بندھائی گئی تھی۔ اُس کے بعد اِس آیت میں اُن کو اِس اصل کام کی طرف رغبت دلائی گئی ہے جس کے لیے وہ مسلمان ہوئے تھے۔ پچھلی آیات میں اُن کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہو جانا اور اس راستے کو اختیار کر لینے کے بعد پھر اس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنت کا مستحق بناتی ہے۔ اب اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ آگے کا درجہ، جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اوپر مصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ میں مسلمان ہوں۔ اِس ارشاد کی

پوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص مسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اسے یکایک یہ محسوس ہوتا تھا کہ گویا اس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اور اِس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی اُس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ اِن حالات میں فرمایا گیا ہے کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کر لینا اور اس سے نہ ہٹنا بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ مَیں مسلمان ہُوں، اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی بندگی کی طرف خلق خدا کو دعوت دے، اور اس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اِس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی گنجائش نہ ملے۔ (۱۴)

بدی کا مقابلہ بہترین نیکی سے کرنا

آگے چل کر فرمایا:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ‎(آیت ۳۴)

"اے نبیؐ! نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔"

اِس ارشاد کی پُوری معنویت سمجھنے کے لیے بھی وہ حالات نگاہ میں رہنے چاہییں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو، اور آپؐ کے واسطے سے آپ کے پیروؤں کو، یہ ہدایت دی گئی تھی۔ صورتِ حال یہ تھی کہ دعوتِ حق کا مقابلہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخت جارحانہ مخالفت سے کیا جا رہا تھا۔ ہر طرح کے ہتھکنڈے آپؐ کو بدنام کرنے اور آپؐ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے۔ طرح طرح کے الزامات آپؐ پر چسپاں کیے جا رہے تھے۔ اور مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے والوں کی ایک فوج کی فوج آپؐ کے خلاف دلوں میں وسوسے ڈالتی پھر رہی تھی۔ ہر قسم کی اذیتیں آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو دی جا رہی تھیں، جن سے تنگ آکر مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ پھر آپؐ کی تبلیغ کو روک دینے کے لیے پروگرام یہ بنایا گیا تھا کہ ہُلّڑ مچانے والوں کا ایک گروہ ہر وقت آپؐ کی تاک میں لگا رہے اور جب بھی آپؐ دعوتِ حق کے لیے زبان کھولیں، اِتنا شور برپا کر دیا جائے کہ کوئی آپؐ کی بات نہ سُن سکے۔ یہ ایسے ہمت شکن حالات تھے جن میں بظاہر دعوت کے تمام راستے مسدُود نظر آتے تھے۔ اُس وقت مخالفتوں کا زور توڑنے کے لیے یہ نسخہ حضورؐ کو بتایا گیا۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ یعنی بظاہر تمہارے مخالفین بدی کا کیسا ہی خوفناک طوفان اُٹھا لائے ہوں جس کے مقابلے میں نیکی بالکل عاجز اور بے بس محسوس ہوتی ہو، لیکن بدی بجائے خود اپنے اندر وہ کمزوری رکھتی ہے جو آخر کار اس کا بھٹہ بٹھا دیتی ہے کیونکہ انسان جب تک انسان ہے اُس کی فطرت بدی سے نفرت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بدی کے ساتھی ہی نہیں، خود اُس کے علمبردار تک اپنے دلوں میں جانتے ہیں کہ وہ جھوٹے ہیں، ظالم ہیں، اور اپنی اغراض کے لیے ہٹ دھرمی کر رہے ہیں۔ یہ چیز دوسروں کے دلوں میں اُن کا وقار پیدا کرنا تو درکنار، انہیں خود اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور اُن کے اپنے دلوں میں ایک چور بیٹھ جاتا ہے جو ہر مخالفانہ اقدام کے وقت اُن کے عزم و ہمت پر اندر سے چھاپا مارتا رہتا ہے۔ اِس بدی کے مقابلے میں اگر وہی نیکی جو بالکل عاجز و بے بس نظر آتی ہے، مسلسل کام کرتی چلی جائے، تو آخر کار وہ غالب آکر رہتی ہے کیونکہ اوّل تو نیکی میں بجائے خود ایک طاقت ہے جو دلوں کو مسخر کرتی ہے، اور آدمی خواہ کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اپنے دل میں اُس کی قدر محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر جب نیکی اور بدی آمنے سامنے مصروفِ پیکار ہوں اور کھل کر دونوں کے جوہر پوری طرح نمایاں ہو کر منظرِ عام پر آئیں، تو ایسی حالت میں ایک مدت کی کشمکش کے بعد کم ہی لوگ ایسے باقی رہ سکتے ہیں جو بدی سے متنفر اور نیکی کے گرویدہ نہ ہو جائیں۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں بلکہ اُس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ بُرائی کرے اور تم اس کو معاف کر دو، یہ محض نیکی ہے۔ اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے بُرا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔

اس کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ بدترین دشمن بھی آخر کار جگری دوست بن جائے گا، اس لیے کہ یہی انسانی فطرت ہے۔ گالی کے جواب میں آپ خاموش رہ جائیں، بے شک یہ ایک نیکی ہو گی، مگر گالی دینے والے کی زبان بند نہ کر سکے گی۔ لیکن اگر آپ گالی کے جواب میں دعائے خیر کریں تو بڑے سے بڑا بے حیا مخالف بھی شرمندہ ہو کر رہ جائے گا اور مشکل ہی سے کبھی اس کی زبان آپ کے خلاف بدکلامی کے لیے کھل سکے گی۔ کوئی شخص آپ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیتا ہو اور آپ اس کی زیادتیاں برداشت کرتے چلے جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرارتوں پر اور زیادہ دلیر ہو جائے۔ لیکن اگر کسی موقع پر اسے نقصان پہنچ رہا ہو اور آپ اسے بچا لیں تو وہ آپ کے قدموں میں آ رہے گا، کیونکہ کوئی شرارت مشکل ہی سے اِس نیکی کے مقابلے میں کھڑی رہ سکتی ہے۔ تاہم اس قاعدۂ کلیہ کو اِس معنی میں لینا درست نہیں ہے کہ اِس اعلیٰ درجے کی نیکی سے لازماً ہر دشمن جگری دوست ہی بن جائے گا۔ دُنیا میں ایسے خبیث النفس لوگ بھی ہوتے ہیں کہ آپ اُن کی زیادتیوں سے درگزر کرنے اور اُن کی بُرائی کا جواب بھلائی سے دینے میں خواہ کتنا ہی کمال کر دکھائیں، اُن کے نیشِ عقرب کا زہر ذرہ برابر بھی

کم نہیں ہوتا لیکن اس طرح کے شرِ مجسم انسان قریب قریب اتنے ہی کم پائے جاتے ہیں جتنے خیرِ مجسم انسان کمیاب ہیں۔ (۱۳)

دعوتِ حق میں صبر کی اہمیت

پھر ارشاد ہوا:

وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ (آیت ۳۵)

"یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر اُن لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔"

یعنی یہ نسخہ ہے تو بڑا کارگر، مگر اسے استعمال کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔ اس کے لیے بڑا عزم، بڑا حوصلہ، بڑی قوتِ برداشت اور اپنے نفس پر بہت بڑا قابو درکار ہے۔ وقتی طور پر ایک آدمی کسی بدی کے مقابلے میں بڑی نیکی برت سکتا ہے، یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن جہاں کسی شخص کو سالہا سال تک اُن باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر لڑنا پڑے جو اخلاق کی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کرتے ہوں، اور پھر طاقت اور اختیارات کے نشے میں بھی بدمست ہو رہے ہوں، وہاں بدی کا مقابلہ نیکی سے اور پھر بھی اعلیٰ درجے کی نیکی سے کرتے چلے جانا، اور کبھی ایک مرتبہ بھی ضبط کی باگیں ہاتھ سے نہ چھوڑنا کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو ٹھنڈے دل سے حق کی سربلندی کے لیے کام کرنے کا پختہ عزم کر چکا ہو، جس نے پوری طرح اپنے نفس کو عقل و شعور کے تابع کر لیا ہو، جس کے اندر نیکی و راستی ایسی گہری جڑیں پکڑ چکی ہو کہ مخالفین کی کوئی شرارت و خباثت بھی اسے اس کے مقام بلند سے نیچے اتار لانے اور یہ صبر کر دیکھنے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہو۔

اور یہ جو فرمایا کہ "یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر اُن لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں"، تو یہ قانونِ فطرت ہے۔ بڑے ہی بلند مرتبے کا انسان ان صفات سے متصف ہوا کرتا ہے، اور جو شخص یہ صفات رکھتا ہو اسے دنیا کی کوئی طاقت بھی کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ گھٹیا درجے کے لوگ اپنی کمینہ چالوں، ذلیل ہتھکنڈوں، اور رکیک حرکتوں سے اُس کو شکست دے دیں۔ (۱۴)

شیطان کی اشتعال انگیزی سے خدا کی پناہ

آخر میں فرمایا:

وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ (آیت ۳۶)

"اور اگر تم شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ محسوس کرو تو اللہ کی پناہ مانگ لو۔"

شیطان کو سخت تشویش لاحق ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں کمینگی کا مقابلہ شرافت کے ساتھ اور بدی کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح ایک ہی مرتبہ سہی، حق کے لیے لڑنے والوں اور خصوصاً اُن کے سربرآوردہ لوگوں، اور سب سے بڑھ کر اُن کے رہنما سے کوئی ایسی غلطی کروا دے جس کی بنا پر عامۃ الناس سے یہ کہا جا سکے کہ دیکھیے صاحب، برائی یک طرفہ نہیں ہے، ایک طرف سے اگر گھٹیا حرکتیں کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف کے لوگ بھی کچھ بہت اُونچے درجے کے انسان نہیں ہیں، فلاں رکیک حرکت تو آخر انہوں نے بھی کی ہے۔ عامۃ الناس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ٹھیک انصاف کے ساتھ ایک طرف کی زیادتیوں اور دوسری طرف کی جوابی کارروائی کے درمیان موازنہ کر سکیں۔ وہ جب تک یہ دیکھتے رہتے ہیں کہ مخالفین ہر طرح کی ذلیل حرکتیں کر رہے ہیں، مگر یہ لوگ شائستگی و شرافت اور نیکی و راستبازی کے راستے سے ذرا نہیں ہٹتے، اُس وقت تک وہ اُن کا گہرا اثر قبول کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کہیں اُن کی طرف سے کوئی بیجا حرکت، یا اُن کے مرتبے سے گری ہوئی کوئی حرکت سرزد ہو جائے، خواہ وہ کسی بڑی ہی زیادتی کے جواب ہی میں کیوں نہ ہو، تو اُن کی نگاہ میں دونوں برابر ہو جاتے ہیں، اور مخالفین کو بھی ایک سخت بات کا جواب ہزار گالیوں سے دینے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا کہ شیطان کے فریب سے چوکنے رہو۔ وہ بڑا دردمند اور خیر خواہ بن کر تمہیں اشتعال دلائے گا کہ فلاں زیادتی تو ہرگز برداشت نہ کی جانی چاہیے، اور فلاں بات کا تو منہ توڑ جواب دیا جانا چاہیے، اور اس حملے کے جواب میں تو لڑ جانا چاہیے، ورنہ تمہیں بزدل سمجھا جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ ایسے ہر موقع پر جب تمہیں اپنے اندر اس طرح کا کوئی نامناسب اشتعال محسوس ہو تو خبردار ہو جاؤ کہ یہ شیطان کی اکساہٹ ہے جو غصہ دلا کر تم سے کوئی غلطی کرانا چاہتا ہے۔ اور خبردار ہو جانے کے بعد اس زعم میں نہ مبتلا ہو جاؤ کہ میں اپنے مزاج پر بڑا قابو رکھتا ہوں، شیطان مجھ سے کوئی غلطی نہیں کرا سکتا۔ یہ اپنی قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادی کا زعم شیطان کا دوسرا اور زیادہ خطرناک فریب ہوگا۔ اس کے بجائے تم کو خدا سے پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی توفیق دے اور حفاظت کرے تو آدمی غلطیوں سے بچ سکتا ہے۔

اس مقام کی بہترین تفسیر وہ واقعہ ہے جو امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ حضرت ابوبکرؓ خاموشی کے ساتھ اس کی گالیاں سنتے رہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دیکھ کر مسکراتے رہے۔ آخر کار جناب صدیقؓ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور انہوں نے بھی جواب میں ایک سخت بات کہہ دی۔ اُن کی زبان سے وہ بات نکلتے ہی حضورؐ پر شدید انقباض طاری ہوا جو چہرۂ مبارک پر نمایاں ہونے لگا اور آپ فوراً اٹھ کر تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی اٹھ کر آپ کے پیچھے ہو لیے اور راستہ میں عرض کیا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ مجھے گالیاں دیتا

رہا اور آپ خاموش مسکراتے رہے، مگر جب میں نے اسے جواب دیا تو آپ ناراض ہو گئے، فرمایا جب تک تم خاموش تھے، ایک فرشتہ تمہارے ساتھ رہا اور تمہاری طرف سے اس کو جواب دیتا رہا، مگر جب تم بول پڑے تو فرشتے کی جگہ شیطان آ گیا۔ میں شیطان کے ساتھ تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔" (۱۵)

داعیِ حق کا اپنے کام میں بے غرض ہونا

دعوتِ حق میں داعی کا ہر ذاتی غرض سے پاک ہونا اس کے مخلص اور راستباز ہونے کی ایک نہایت اہم اور صریح دلیل ہے۔ قرآن پاک میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ نبی دعوت الی اللہ کا جو کام کر رہا ہے اس سے خود اس کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے، بلکہ وہ صرف خلق خدا کی بھلائی کے لیے اس کام میں اپنی جان کھپا رہا ہے۔ سورۂ انعام میں فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰي لِلْعٰلَمِيْنَ (آیت ۹۰)

"اے نبی، کہہ دو کہ میں اس (تبلیغ و ہدایت کے کام) پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لیے۔"

سورۂ یوسف میں فرمایا:

وَمَا تَسْـَٔــلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (آیت ۱۰۴)

"اور اے نبی، تم اس کام پر ان سے کوئی اجر نہیں مانگ رہے ہو۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے۔"

اس خطاب کا رُخ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، مگر اصل مخاطب کفار کا مجمع ہے اور اس کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اللہ کے بندو، غور کرو، تمہاری یہ ہٹ دھرمی کس قدر بے جا ہے۔ اگر پیغمبر نے اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے دعوت و تبلیغ کا یہ کام جاری کیا ہوتا، یا اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی چاہا ہوتا تو بے شک تمہارے لیے یہ کہنے کا موقع تھا کہ ہم اس مطلبی آدمی کی بات کیوں مانیں۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ یہ شخص بے غرض ہے، تمہاری اور دنیا بھر کی بھلائی کے لیے نصیحت کر رہا ہے اور اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد پوشیدہ نہیں ہے۔ پھر اس کا مقابلہ اس ہٹ دھرمی کے ساتھ کرنے میں آخر کیا معقولیت ہے؟ جو انسان سب کے بھلے کے لیے ایک بات بے غرضی کے ساتھ پیش کرے اس سے کسی کو خواہ مخواہ کیوں ضد ہو؟ کھلے دل سے اس کی بات سنو، دل کو لگتی ہو تو مانو، نہ لگتی ہو تو نہ مانو۔ (۱۶)

سورۂ مومنون میں فرمایا:

اَمْ تَسْـَٔــلُهُمْ خَرْجًا فَخَــرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ڰ وَّهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ - (آیت ۷۲)

"اے نبی، کیا تم اُن سے کچھ مانگ رہے ہو؟ تمہارے لیے تمہارے رب کا دیا ہی بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے۔"

یعنی کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ آپ پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آپ یہ سارے پاپڑ اس لیے بیل رہے ہیں کہ کوئی نفسانی غرض آپ کے پیشِ نظر ہے۔ اچھی خاصی تجارت چمک رہی تھی، اب افلاس میں مبتلا ہو گئے۔ قوم میں عزت کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ ہر شخص ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ اب گالیاں اور پتھر کھا رہے ہیں، بلکہ جان تک کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ چین سے اپنے بیوی بچوں میں ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے، اب ایک ایسی سخت کشمکش میں پڑ گئے ہیں جو کسی دم قرار نہیں لینے دیتی۔ اس پر مزید یہ کہ بات وہ لے کر اٹھے ہیں جس کی بدولت سارا ملک دشمن ہو گیا ہے، حتیٰ کہ خود اپنے بھائی بند خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک خود غرض آدمی کے کرنے کا کام ہے؟ خود غرض آدمی اپنی قوم اور قبیلے کے تعصبات کا علمبردار بن کر جوڑ توڑ سے سرداری حاصل کرنے کی کوشش کرتا، نہ کہ وہ بات لے کر اٹھتا جو صرف یہی نہیں کہ تمام قومی تعصبات کے خلاف ایک چیلنج ہے، بلکہ سرے سے اُس چیز کی جڑ ہی کاٹے دے رہی ہے جس پر مشرکین عرب میں اُس کے قبیلے (قریش) کی چودھراہٹ قائم ہے۔ (۱۷)

سورۂ سبا میں فرمایا:

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔ (آیت ۴۷)

"اے نبی، کہو کہ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تمہارے ہی لیے ہے۔ میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔"

پہلے فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تمہی کو مبارک رہے۔ دوسرے یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو وہ تمہاری اپنی بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ الزام لگانے والے جو چاہیں الزام لگاتے رہیں، مگر اللہ سب کچھ جانتا ہے، وہ گواہ ہے کہ میں ایک بے غرض انسان ہوں، یہ کام اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔ (۱۸)

سورۂ ص میں فرمایا:

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ۔ (آیت ۸۶)

"اے نبی، کہہ دو کہ میں تم سے کسی قسم کا اجر نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹی آدمیوں میں سے ہوں۔"

یعنی میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے جھوٹے دعوے لے کر اٹھ کھڑے ہوتے

ہیں اور وہ کچھ بن بیٹھتے ہیں جو وہ نہیں ہوتے۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے محض کفارِ مکہ کی اطلاع کے لیے نہیں کہلوائی گئی ہے، بلکہ اس کے پیچھے حضورؐ کی وہ پوری زندگی شہادت کے طور پر موجود ہے جو نبوت سے پہلے اُنہی کفار کے درمیان چالیس برس تک گزر چکی تھی۔ مکے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بناوٹی آدمی نہیں ہیں۔ پوری قوم میں کسی شخص نے کبھی ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سُنی تھی جس سے یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہوتی کہ وہ کچھ بننا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ (۱۹)

سُورۂ طُور اور سُورۂ القلم میں فرمایا:

اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (طور، آیت ۴۰، القلم، آیت ۴۶)۔

"اے نبیؐ، کیا تم ان سے کوئی اجر مانگ رہے ہو کہ یہ زبردستی پڑی ہوئی چٹی کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں؟"

سوال کا اصل رُخ حضورؐ کی طرف نہیں بلکہ کُفار کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رسُول تم سے کوئی غرض رکھتا اور اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے یہ ساری دَوڑ دُھوپ کر رہا ہوتا تو اُس سے تمہارے بھاگنے کی کم از کم ایک معقول وجہ تو ہوتی۔ مگر تم خود جانتے ہو کہ وہ اپنی اِس دعوت میں بالکل بے غرض ہے اور محض تمہاری بھلائی کے لیے اپنی جان کھپا رہا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم اُس کی بات ٹھنڈے دل سے سُننے تک کے روادار نہیں ہو؟ اِس سوال میں ایک لطیف تعریض بھی ہے۔ ساری دُنیا کے بناوٹی پیشواؤں اور مذہبی آستانوں کے مجاوروں کی طرح عرب میں بھی مُشرکین کے پیشوا اور پنڈت اور پروہت کُھلا کُھلا مذہبی کاروبار چلا رہے تھے۔ اس پر یہ سوال اُن کے سامنے رکھ دیا گیا کہ ایک طرف یہ مذہب کے تاجر ہیں جو عَلانیہ تم سے نذریں اور نیازیں اور ہر مذہبی خدمت کی اُجرتیں طلب کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ایک شخص کامل بے غرضی کے ساتھ، بلکہ اپنے تجارتی کاروبار کو برباد کر کے تمہیں نہایت معقول دلائل سے دین کا سیدھا راستہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب یہ صریح بے عقلی نہیں تو اور کیا ہے کہ تم اِس سے بھاگتے اور اُن کی طرف دوڑتے ہو؟ (۲۰)

اس سلسلے میں صرف ایک آیت ایسی ہے جس کے بارے میں کچھ بحث پیدا ہوتی ہے، اور وہ یہ ہے:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى (الشوریٰ۔ آیت ۲۳)

"اے نبیؐ، کہو کہ میں اِس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا بجز قرابت کی محبت کے"

اِس آیت میں لفظ قُربیٰ جو استعمال ہوا ہے اس کے معنی میں مفسّرین کے درمیان بڑا اختلاف ہو گیا ہے۔ ایک گروہ نے اس کو قرابت (رشتہ داری) کے معنی میں لیا ہے اور آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، مگر یہ ضرور چاہتا ہوں کہ تم لوگ (یعنی اہلِ قریش) کم از کم اُس رشتہ داری کا

تو لحاظ کرو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے لیکن اگر تم نہیں مانتے تو یہ ستم تو نہ کرو کہ سارے عرب میں سب سے بڑھ کر تم ہی میری دشمنی پر تُل گئے ہو۔" یہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر ہے جسے بکثرت راویوں کے حوالہ سے امام احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر، طبرانی، بیہقی اور ابن سعد وغیرہم نے نقل کیا ہے، اور یہی تفسیر مجاہد، عکرمہ، قتادہ، سُدّی، ابو مالک، عبدالرحمن بن زید بن اسلم، ضحاک، عطاء بن دینار اور دوسرے اکابر مفسّرین نے بھی بیان کی ہے۔

دوسرا گروہ "قُربیٰ" کو قرب اور تقرّب کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تمہارے اندر اللہ کے قرب کی چاہت پیدا ہو جائے" یعنی تم ٹھیک ہو جاؤ، بس یہی میرا اجر ہے۔ یہ تفسیر حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے، اور ایک قول قتادہ سے بھی اس کی تائید میں نقل ہوا ہے، بلکہ طبرانی کی ایک روایت میں ابن عباسؓ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔ خود قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر یہی مضمون ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الفرقان۔ ۵۷)

"ان سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔"

تیسرا گروہ "قُربیٰ" کو اقارب (رشتہ داروں) کے معنی میں لیتا ہے، اور آیت کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ "میں تم سے اس کام پر کوئی اجر اس کے سوا نہیں چاہتا کہ تم میرے اقارب سے محبت کرو۔" پھر اس گروہ کے بعض حضرات اقارب سے تمام بنی عبدالمطلب مُراد لیتے ہیں، اور بعض اسے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد تک محدود رکھتے ہیں۔ یہ تفسیر سعید بن جُبیر اور عَمرو بن شُعیب سے منقول ہے، اور بعض روایات میں یہی تفسیر ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ بن حسین (زین العابدین) کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن متعدد وجوہ سے یہ تفسیر کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اوّل تو جس وقت مکّہ معظمہ میں سورۃ شوریٰ نازل ہوئی ہے اُس وقت حضرت علیؓ و فاطمہؓ کی شادی تک نہیں ہوئی تھی، اولاد کا کیا سوال۔ اور بنی عبدالمطلب میں سب کے سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، بلکہ اُن میں سے بعض کھُلّم کھُلّا دشمنوں کے ساتھی تھے، اور ابولہب کی عداوت کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار صرف بنی عبدالمطلب ہی نہ تھے۔ آپؐ کی والدۂ ماجدہ، آپؐ کے والد ماجد اور آپؐ کی زوجۂ محترمہ کے واسطے سے قریش کے تمام گھرانوں میں آپؐ کی رشتہ داریاں تھیں۔ اور ان سب گھرانوں میں آپؐ کے بہترین صحابی بھی تھے اور بدترین دشمن بھی۔ آخر حضورؐ کے لیے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ان سب اقرباء میں سے آپ صرف بنی عبدالمطلب کو اپنا رشتہ دار قرار دے کر اس

مطالبۂ محبت کو اُنہی کے لیے مخصوص رکھتے۔ تیسری بات، جو ان سب سے زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ ایک نبی جس بلند مقام پر کھڑا ہو کر دعوت الی اللہ کی پکار بلند کرتا ہے، اُس مقام سے اِس کارِ عظیم پر یہ اجر مانگنا کہ تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، اتنی گری ہوئی بات ہے کہ کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ نے اپنے نبی کو یہ بات سکھائی ہوگی اور نبی نے قریش کے لوگوں میں کھڑے ہو کر یہ بات کہی ہوگی۔ قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو قصے آئے ہیں اُن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی اُٹھ کر اپنی قوم سے کہتا ہے کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ رب العٰلمین کے ذمہ ہے (یونس ۷۲۔ ہود ۲۹-۵۱۔ الشعراء ۱۰۹-۱۲۷-۱۴۵-۱۶۴-۱۸۰)۔ سورۂ یٰسین میں نبی کی صداقت جانچنے کا معیار یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی دعوت میں بے غرض ہوتا ہے (آیت ۲۱)۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قرآن پاک میں بار بار یہ کہلوایا گیا ہے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں جیسا کہ اوپر ہم نے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد یہ کہنے کا آخر کیا موقع ہے کہ میں اللہ کی طرف بلانے کا جو کام کر رہا ہوں اس کے عوض تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرو، پھر یہ بات اور بھی زیادہ بے موقع نظر آتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اِس تقریر کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اوپر سے ساری تقریر اُنہی سے خطاب کرتے ہوئے ہوتی چلی آ رہی ہے، اور آگے بھی روئے سخن اُنہی کی طرف ہے۔ اِس سلسلۂ کلام میں مخالفین سے کسی نوعیت کا اجر طلب کرنے کا آخر سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اجر تو اُن لوگوں سے مانگا جاتا ہے جن کی نگاہ میں اُس کام کی کوئی قدر ہو جو کسی شخص نے اُن کے لیے انجام دیا ہو۔ کفار حضورؐ کے اِس کام کی کون سی قدر کر رہے تھے کہ آپ اُن سے یہ بات فرماتے کہ یہ خدمت جو میں نے تمہاری انجام دی ہے اس پر تم میرے رشتہ داروں سے محبت کرنا۔ وہ تو اُلٹا اسے جرم سمجھ رہے تھے اور اُس کی بنا پر آپ کی جان کے درپے تھے۔ (۲۱)

آغازِ دعوت میں عقیدۂ آخرت پر زیادہ زور دینا

مکۂ معظمہ میں جب اوّل اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔ دوسری یہ کہ آپ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔ تیسری یہ کہ اِس دُنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں تمام اوّلین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اُسی جسم کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر اُنہوں نے دُنیا میں کام کیا تھا، پھر اُن کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اِس محاسبہ میں جو لوگ مومن و صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔

ان میں سے پہلی بات اگرچہ اہلِ مکہ کو سخت ناگوار تھی، لیکن بہرحال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے، اُس کے ربِّ اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسرے جن جن کو وہ معبود قرار دیتے

ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں، اس لیے جھگڑا صرف اس امر میں تھا کہ خدائی کی صفات و اختیارات اور اُلوہیت کی ذات میں اُن معبودوں کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔

دوسری بات کو ماننے کے لیے لوگ تیار نہ تھے، مگر اس سے انکار کرنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی حضورؐ نے دعوائے رسالت سے پہلے اُنہی کے درمیان گزاری تھی، اُس میں اُنہوں نے کبھی آپ کو جھوٹا یا فریب کار یا نفسانی اغراض کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرنے والا نہ پایا تھا۔ وہ خود آپ کی دانائی و فرزانگی، سلامت روی اور اخلاق کی بلندی کے قائل و معترف تھے۔ اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انہیں دوسروں کو باور کرانا تو درکنار اپنی جگہ خود بھی یہ باور کرنے میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی کہ حضورؐ سارے معاملات میں تو راستباز ہیں مگر صرف رسالت کے دعوے میں معاذ اللہ جھوٹے ہیں۔

اس طرح پہلی دو باتیں اہل مکہ کے لیے اصل اتنی زیادہ اُلجھن کی موجب نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔ اُس کو جب اُن کے سامنے پیش کیا گیا تو اُنہوں نے سب سے زیادہ اُسی کا مذاق اڑایا، اسی پر سب سے بڑھ کر حیرانی اور تعجب کا اظہار کیا اور اُسے بالکل بعید از عقل و امکان سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابل تصور ہونے کے چرچے شروع کر دیے۔ مگر اسلام کی راہ پر اُن کو لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ اُن کے ذہن میں اُتارا جاتا، کیونکہ اس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملہ میں ان کا طرز فکر سنجیدہ ہو سکتا، خیر و شر کے معاملہ میں ان کا معیار اقدار بدل سکتا اور وہ دنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اُس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام ان کو چلانا چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ معظمہ کے ابتدائی دور کی سورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صرف کیا گیا ہے، البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیے گئے ہیں جن سے توحید کا تصور بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے اور بیچ بیچ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصراً دے دیے گئے ہیں۔ (۴۲)

فہرست حوالہ جات باب (۵)

(۱) اضافہ از مؤلف

(۲) تفہیم القرآن، جلد اوّل، خلاصہ مقدمہ

(۳) 〃 〃 ، جلد دوم، النحل، حواشی ۱۲۲-۱۲۳

(۴) 〃 〃 〃 〃 ، بنی اسرائیل، خلاصہ حواشی ۵۵ تا ۶۱

(۵) 〃 〃 ، جلد اوّل، الانعام، حاشیہ ۶۹

(۶) 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۷۱

(۷) 〃 〃 ، جلد ششم، الاعلیٰ، حاشیہ ۱۰

(۸) 〃 〃 ، جلد اوّل، الانعام، خلاصہ حواشی ۳۴-۳۵

(۹) 〃 〃 ، جلد ششم، عبس، خلاصہ دیباچہ و حواشی ۱-۲

(۱۰) 〃 〃 ، جلد سوم، العنکبوت، حاشیہ ۸۱

(۱۱) 〃 〃 ، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ۱۵۰

(۱۲) 〃 〃 ، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ ۳۶

(۱۳) 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۳۷

(۱۴) 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۳۸-۳۹

(۱۵) 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۴۰

(۱۶) 〃 〃 ، جلد دوم، یوسف، حاشیہ ۳۷

(۱۷) 〃 〃 ، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ۷۰

(۱۸) 〃 〃 ، جلد چہارم، سبا، حواشی ۴۸-۴۹

(۱۹) 〃 〃 〃 ، صٓ، حاشیہ ۲۷

(۲۰) 〃 〃 ، جلد پنجم، الطور، حاشیہ ۳۱

(۲۱) 〃 〃 ، جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۴۱

(۲۲) 〃 〃 ، جلد ششم، دیباچہ سورۃ النبا

باب (۲)

دعوتِ اسلامی کی حقیقی نوعیت

مشرکین کی عداوت کے اسباب اور ان کی ناکامی کے وجوہ

اب ہمیں اس بحث کے دوسرے حصے کو لینا ہے جو گذشتہ باب میں چھیڑی گئی تھی پچھلے باب میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ حضورؐ کو اور آپؐ کے ذریعہ سے آپؐ کے ساتھیوں کو اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے کیا ہدایات دی گئی تھیں تاکہ وہ جاہلیت کے علمبرداروں کی مخالفت کا مقابلہ اخلاق کے ہتھیاروں سے کریں، دلوں کو حکمت، حالی ظرفی، اور صبر و تحمل سے مسخر کریں، ہٹ دھرمی تعصب اور ضد کی چٹانوں کو معقول اور دل لگتے دلائل سے توڑ کر دعوتِ حق کو آگے بڑھانے کے لیے راستہ نکالیں، اور انسانوں کے جھرمٹ میں سے اُن لوگوں کو چھانٹ چھانٹ کر اپنے ساتھ ملاتے جائیں جن کے اندر حق پسندی و حق پرستی کا جوہر پایا جاتا ہو۔

اس کے بعد اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو دعوت لے کر اُٹھے تھے اس کی حقیقی نوعیت کیا تھی، اس کے امتیازی اوصاف کیا تھے، وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر سب سے پہلے قریش اور پھر عرب کے دوسرے لوگ اس کی مخالفت پر تل گئے، اور پھر اس دعوت میں وہ کیا قوت تھی جس نے بالآخر تمام مخالفین کو بے بس کر کے وہ عظیم کامیابی حاصل کی جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔

یہ بحث چونکہ بڑی تفصیل چاہتی ہے، اس لیے ہم سات فصلوں میں اسے بیان کریں گے،

(۱) توحید کی تعلیم اور شرک کی تردید۔

(۲) رسالتِ محمدیہ پر ایمان کی دعوت۔

(۳) قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت۔

(۴) آخرت پر ایمان کی دعوت۔

(۵) اخلاقی تعلیمات۔

(۶) عالمگیر دعوت عملی کی اساس۔

(۷) نبی اور غیر نبی کے طریقِ کار کا فرق ۔

فصلِ اوّل

توحید کی تعلیم اور شرک کی تردید

دعوتِ اسلامی کے نکات میں سے اوّلین، سب سے اہم اور بنیادی نکتہ توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال تھا۔ اگرچہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خود بھی نبوّت سے قبل توحید کے قائل اور شرک کے منکر تھے، اور آپؐ کے معاصرین میں بھی اور آپؐ کے زمانے سے پہلے گزرے ہوئے اہلِ عرب میں بھی اِس عقیدے کے لوگ پائے جاتے تھے مگر بہت فرق ہے اِس بات میں کہ کوئی شخص اقرارِ توحید و انکارِ شرک کا محض عقیدہ رکھتا ہو، یا زیادہ سے زیادہ بس اُس کا اظہار کر دینے پر اکتفا کرتا ہو، اور اِس بات میں کہ کوئی شخص لوگوں کے اندر اِس عقیدے کو پھیلانے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور عام دعوت دے کہ لوگ شرک چھوڑ دیں اور توحید کو تسلیم کر لیں۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر جو چیز اُس سادہ سے عقیدے اور اِس عملی تبلیغ و دعوت کے درمیان فرقِ عظیم پیدا کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اِس کام کا بیڑا اُٹھائے وہ بار بار بڑے زور دار دلائل کے ساتھ شرک کے ایک ایک پہلو کی تردید کرے اور نہایت مفصّل طریقے سے خدا کی محض وحدانیت ہی بدلائل ثابت نہ کرے بلکہ اِس وحدانیت کے معنی و مفہوم اور اس کو ماننے کے مُقتضیات بھی بیان کر کے لوگوں کو پیہم دعوت دے کہ وہ اِس تفصیل کے ساتھ اللہ کی توحید پر ایمان لائیں۔

یہی کام تھا جو منصبِ رسالت پر مامُور ہونے کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے کیا اور یہی کفّار سے آپ کی نزاع کا پہلا سبب بنا کیونکہ اِس کا ہر جُزو اُن کے عقائد، تعصّبات اور صدیوں کے جمے ہُوئے تصوّرات سے ٹکراتا تھا۔

توحید کی صاف صاف اور بے لاگ تعلیم

عرب کے مُشرک معاشرے میں اصل مسئلہ اللہ تعالیٰ کے وجود کو نہیں بلکہ اُس کی وحدانیت کو تسلیم کرانے کا تھا۔ مشرکین اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے۔ وہ اُسی کو اپنا اور ساری کائنات کا خالق مانتے تھے۔ اُنہیں اُس کے رب اور الٰہ ہونے سے بھی انکار نہ تھا، اور اُس کی عبادت کے بھی وہ مخالف نہ تھے۔ البتہ جس گمراہی

میں وہ مبتلا تھے وہ یہ تھی کہ وہ اُلوہیت اور رُبوبیت کو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ دوسرے بہت سے الٰہوں کو بھی خدائی میں شریک ٹھیراتے تھے اور اللہ کی عبادت کے ساتھ اُن کی عبادت کے بھی قائل تھے ①۔ اِس معاملہ میں ان کی شدت کا حال یہ تھا کہ:

وَإِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْآنِ وَحْدَهُ وَلَّوْا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ نُفُورًا ۔ (بنی اسرائیل: ۴۶)

"اور اُسے نبی، جب تم قرآن میں اپنے ایک ہی رب کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ موڑ کر پلٹ جاتے ہیں"

یعنی انہیں یہ بات سخت ناگوار ہوتی ہے کہ تم بس اللہ ہی کو رب قرار دیتے ہو، اُن کے بنائے ہوئے دوسرے ارباب کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ اُن کو یہ "وہابیت" ایک آن پسند نہیں آتی کہ آدمی بس اللہ ہی اللہ کی رٹ لگائے چلا جائے۔ نہ بزرگوں کے تصرفات کا کوئی ذکر، نہ آستانوں کی فیض رسانی کا کوئی اعتراف۔ نہ اُن شخصیتوں کی خدمت میں کوئی خراج تحسین، جن پر اُن کے خیال میں، اللہ نے اپنی خدائی کے اختیارات بانٹ رکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ عجیب شخص ہے جس کے نزدیک علم غیب ہے تو اللہ کو، قدرت ہے تو اللہ کی، تصرفات و اختیارات ہیں تو بس ایک اللہ ہی کے۔ آخر یہ ہمارے آستانوں والے بھی کوئی چیز ہیں یا نہیں، جن کے ہاں سے ہمیں اولاد ملتی ہے، بیماروں کو شفا نصیب ہوتی ہے، کاروبار چمکتے ہیں اور منہ مانگی مرادیں بر آتی ہیں! ②

دوسری جگہ قرآن میں اُن کی توحید سے بیزاری اور شرک میں اُن کے استغراق کا حال اِس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِن دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ (الزمر: ۴۵)

"اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں اور جب اُس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھل اُٹھتے ہیں"

یہ بات قریب قریب ساری دُنیا کے مشرکانہ ذوق رکھنے والوں میں مشترک ہے۔ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ اکیلے اللہ کا ذکر کیجیے تو ان کے چہرے بگڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص ضرور بزرگوں اور اولیاء کو نہیں مانتا، جبھی تو بس اللہ ہی اللہ کی باتیں کیے جاتا ہے۔ اور اگر دوسروں کا ذکر کیا جائے تو ان کے دلوں کی کلی کھل جاتی ہے اور بشاشت سے ان کے چہرے دمکنے لگتے ہیں۔ اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کو اصل میں دلچسپی اور محبت کس سے ہے ③۔

إِنَّهُمْ كَانُوا إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُو آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ ۝ (الصّٰفّٰت: ۳۵-۳۶)

"ان کا حال یہ تھا کہ جب ان سے کہا جاتا " اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے" تو گھمنڈ میں آجاتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک دیوانے شاعر کی خاطر اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟"

اُن کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت اعتراض تھا کہ:

أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ۝ (ص: ۵)

"کیا اس شخص نے سارے خداؤں کی جگہ بس ایک ہی خدا قرار دے دیا؟ یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے"

اس معاشرے اور ان خیالات کے لوگوں میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُٹھ کر بار بار اور تکرار اور پُورے زور کے ساتھ اعلان کیا کہ اللہ ہی ایک الٰہ اور رب ہے، اور کسی دوسرے کا اُلوہیت و رُبوبیت میں کوئی حصّہ نہیں:

إِنَّمَا إِلَٰهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ: ۹۸)

"تمہارا خدا تو بس وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ ہر چیز پر اس کا علم وسیع ہے"

بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ (الانبیاء-۵۶)

"بلکہ تمہارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور جس نے اُن کو پیدا کیا ہے"

إِنَّ إِلَٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ۝ رَّبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ۝ (الصّٰفّٰت ۴ تا ۵)

"درحقیقت تمہارا خدا صرف ایک ہے، آسمانوں اور زمین کا اور اُن کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب اور سارے مشرقوں کا رب"

یعنی جو کائنات کا مالک و فرمانروا (رب) ہے وہی انسانوں کا خدا (الٰہ اور معبود) ہے، اور وہی درحقیقت معبود ہو سکتا ہے، اور اُسی کو معبود ہونا چاہیے۔ یہ بات قطعی غلط ہے کہ کائنات اور تم سمیت کائنات کی ہر چیز کا رب (یعنی مالک اور حاکم اور مربّی اور پروردگار) تو کوئی ہو اور الٰہ (عبادت کا مستحق) کوئی اور ہو جائے"

قُلْ إِنَّمَا أَنَا مُنذِرٌ ۖ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ ۝ قُلْ هُوَ نَبَأٌ عَظِيمٌ ۝ أَنتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَ ۝ (ص: ۶۵ تا ۶۸)

"اے نبی، کہو کہ میں تو بس خبردار کر دینے والا ہوں۔ اور کوئی خدا اُس ایک اللہ کے سوا نہیں جو سب پر غالب ہے، جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا رب ہے، بڑا زبردست اور بڑا درگزر کرنے والا ہے۔ اے نبی، کہو کہ یہ ایک بڑی خبر ہے جس سے تم منہ موڑ رہے ہو"

وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ (النحل: ۵۱)

"اور اللہ نے فرمایا ہے کہ دو الٰہ (خدا اور معبود) نہ بنالو، خدا تو بس وہ ایک ہی ہے، لہٰذا تم مجھی سے ڈرو"

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (الزخرف - ۸۴)

"اور وہی ایک آسمان میں بھی خدا ہے اور زمین میں بھی خدا اور وہی حکیم اور علیم ہے"

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۘ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ۚ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○ (القصص - ۸۸)

"اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہ پکارو۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ ہر چیز ہلاک ہو جانے والی ہے اُس کی ذات کے سوا۔ فرمانروائی اُسی کی ہے اور اُسی کی طرف تم سب پلٹائے جانے والے ہو"

مشرکین نے حضورؐ سے پوچھا کہ جس رب کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کا نسب ہمیں بتاؤ، وہ کس چیز سے بنا ہوا ہے، کس سے اُس نے دُنیا کی وراثت پائی ہے، اور کون اس کے بعد یہ وراثت پائے گا؟ اس کے جواب میں توحید کی ایسی واضح، جامع اور مختصر تعریف بیان کی گئی جو دلوں میں تیر کی طرح پیوست ہو جانے والی تھی، جس کے ساتھ شرک کا مشائبہ تک دماغ میں جگہ نہ پا سکتا تھا، جس کا ایک ایک لفظ توحید کے تصور کو نکھار کر پیش کر رہا تھا، اور اس کے ساتھ کمال یہ تھا کہ چار مختصر اور بلیغ فقروں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کسی سُننے والے کے بس میں یہ نہ تھا کہ اسے اپنے حافظہ سے نکال دے اور وہ زبانوں پر چڑھے بغیر رہ جائے۔ ارشاد ہُوا :

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ○ اللَّهُ الصَّمَدُ ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ○ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ○ (الاخلاص)

"اے نبی، کہو وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اُس کا ہمسر نہیں ہے"

پہلے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ میرے جس رب کے متعلق تم مجھ سے پوچھتے ہو، اور جس کو میں ربِ واحد ماننا اور منوانا چاہتا ہوں، وہ کوئی نیا اور نرالا اور میرا اپنا گھڑا ہُوا رب نہیں ہے، بلکہ وہی ہے جس کو تم خود اپنی زبان میں اللہ کہتے ہو، جس کے اس گھر (کعبہ) کو بیت اللہ کہتے ہو، جس سے ابرہہ کے حملہ کے وقت تم نے ابھی چالیس پینتالیس برس پہلے دُعائیں مانگی تھیں کہ وہ تم کو بچالے اور اُس وقت اپنے دوسرے سب الٰہوں کو تم بھول گئے تھے، جس کے متعلق تم خود مانتے ہو کہ تمہارا اور زمین و آسمان کا اور دُنیا کی ہر چیز کا خالق وہی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے متعلق فرمایا گیا کہ وہ اَحَد ہے۔ ہر عرب اِس بات کو جانتا تھا کہ یہاں اللہ کو واحد کہنے کے بجائے اَحَد کہنے کے معنی کیا ہیں۔ واحد (ایک) کا لفظ عربی زبان میں ہر اُس چیز کے لیے بولتے ہیں جو کسی خاص حیثیت سے ایک ہو، خواہ دوسری بے شمار حیثیتوں سے اُس کے اندر طرح طرح کی کثرتیں پائی جاتی ہوں۔ مثلاً ایک گھر، ایک آدمی، ایک خاندان، ایک قوم، ایک ملک، ایک دنیا۔ اس کے برعکس اَحَد کے لفظ کو صفت کے طور پر کسی ہستی کے لیے بولنا عربی زبان میں کسی کی وحدانیت بیان کرنے کے لیے ایک غیر معمولی استعمال تھا جس کی کوئی نظیر سُورۂ اخلاص کے نزول سے پہلے لغتِ عرب کے استعمالات میں نہیں پائی جاتی تھی[1]۔ پس اللہ کو اَحَد کہنا خود یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ ہر لحاظ سے یکتا و یگانہ ہے۔ وہ خداؤں کی کسی جنس کا فرد نہیں ہے کہ اس کے ہم جنس دوسرے افراد بھی خدا ہوں، بلکہ وجود میں وہ فرد فرید اور خدائی میں وہ بالکل اکیلا ہے۔ اس کے اندر کسی حیثیت سے بھی کوئی کثرت نہیں ہے۔ وہ اجزا سے مرکّب وجود نہیں ہے جو قابلِ تجزیہ و تقسیم ہو، جو کوئی شکل و صورت رکھتا ہو، جو کسی جگہ میں رہتا ہو، جس سے کوئی چیز نکلتی ہو یا کوئی چیز اس کے اندر داخل ہوتی ہو، جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضاء ہوں، جس کی کوئی سمت اور جہت ہو، اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیّر و تبدّل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے پاک اور منزّہ وہ ایک ہی ذاتِ خداوندی ہے جو ہر لحاظ سے اَحَد ہے۔ اور جب وہ اَحَد ہے تو اُلُوہیت اور رُبُوبیت میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ اُس کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں کوئی اس کا حصّہ دار نہیں ہو سکتا۔ موجوداتِ عالم میں سے کوئی اس کے مشابہ اور مُماثل نہیں ہو سکتا۔

پھر فرمایا کہ وہ الصّمد ہے۔ لفظ صَمَد عربی میں کثرت سے مستعمل تھا اور ہر عرب اس کے معنی جانتا تھا۔ وہ ہر اُس شخص کے لیے بولا جاتا تھا جو دوسروں کا محتاج نہ ہو اور لوگ جس کی طرف اپنی حاجات میں رجوع کرتے ہوں۔ جو دوسروں سے برتر ہو اور کوئی اُس سے بالاتر نہ ہو۔ جس کی اطاعت کی جاتی ہو اور جس کے بغیر کسی معاملہ کا فیصلہ نہ کیا جاتا ہو۔ جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔ جو بے عیب ہو۔ جس پر کوئی آفت نہ آتی ہو۔ جو اپنی مرضی سے جو چاہے فیصلہ کرے اور کوئی اس کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا نہ ہو۔ اور جو سرداری کی صفات میں کامل

---

[1] واضح رہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے تنہا لفظ واحد کہیں استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا لفظ لگا کر اللہ کے ایک ہونے کی حیثیت کو دنیا کی دوسری اشیاء میں سے کسی کے ایک ہونے کی حیثیت سے الگ کر دیا گیا ہے، مثلاً اِلٰھًا وَّاحِدًا یا اَللہُ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ۔ لیکن سُورۂ اخلاص میں لفظ اَحَدٌ اللہ کے لیے مطلقاً بلا کسی وصف استعمال کیا گیا ہے اور یہ استعمال ذاتِ الٰہی کے لیے خاص ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

ہو۔ پھر یہ لفظ ایسی چیز کے لیے بھی بولا جاتا تھا جو ٹھوس ہو، جس میں کوئی خول اور جھول نہ ہو، جس سے نہ کوئی چیز نکلتی ہو اور نہ جس کے اندر کوئی چیز داخل ہوتی ہو، جو دائم اور بلند و بالا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے محض صَمَد نہیں بلکہ اَلصَّمَد کا لفظ استعمال کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ دوسری تمام ہستیاں اور اشیاء تو کسی ایک لحاظ سے صَمَد ہیں اور دوسرے بہت سے لحاظوں سے صَمَد نہیں ہیں، مگر ہر لحاظ سے کامل طور پر الصَّمَد صرف اللہ ہی ہے۔

پھر فرمایا کہ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ یہ فقرہ اُن تمام مشرکانہ خیالات کی جڑ کاٹ دیتا تھا جن کی بنا پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ خداؤں کی بھی کوئی جنس ہے جس میں اُسی طرح توالد و تناسل کا سلسلہ چلتا ہے جس طرح انسانوں میں چلتا ہے۔ اس تصوّر کی بیخ کنی کرکے لوگوں کو بتا دیا گیا کہ وہی اکیلا خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ نہ اس سے پہلے کوئی خدا تھا جس سے وہ پیدا ہُوا ہو اور نہ اس کے بعد کوئی خدا ہے یا ہو سکتا ہے جو اُس سے پیدا ہو۔

آخر میں ارشاد ہُوا کہ کوئی اُس کا کُفُو نہیں ہے۔ کُفُو کے معنی ہیں نظیر، مُشابہ، مُماثِل، ہم رتبہ، ہمسر، مساوی۔ یہ فقرہ ارشاد فرما کر لوگوں کو بتا دیا گیا کہ ساری کائنات میں کوئی نہیں ہے، نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے جو اللہ کے مانند، یا اس کا ہم مرتبہ ہو، یا اپنی صفات، افعال اور اختیارات میں اس سے کسی طرح کی مشابہت رکھتا ہو۔

توحید کے دلائل

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مُشرک معاشرے کے سامنے توحید کے اس صاف اور خالص تصوّر کو پیش کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ بڑے مضبوط اور ناقابلِ انکار دلائل کے ساتھ اسے ثابت بھی کیا۔

(۱) تمام انبیاء توحید کی تعلیم دیتے تھے

اِس سلسلے میں ایک نہایت وزنی دلیل یہ تھی کہ آپ سے پہلے جتنے انبیاء بھی دنیا میں آئے ان سب نے توحید ہی کی تعلیم دی تھی اور شرک سے منع کیا تھا۔ چنانچہ قرآن میں پہلے مجموعی طور پر تمام انبیاء کے متعلق فرمایا گیا کہ:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ۔ (النحل: ۳۶)

"ہم نے ہر اُمّت میں ایک رسُول بھیجا اِس تعلیم کے ساتھ کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت[1] کی بندگی سے بچو۔"

---

[1] علمِ تفسیر کے مشہور امام ابن جریر طبری نے طاغوت کی تشریح یہ کی ہے: "ہر وہ ہستی جو اللہ کے مقابلے میں سرکشی کرے اور اللہ کے سوا جس کی بندگی کی جائے، خواہ بندگی کرنے والا اُس کے جبر سے مجبور ہو کر اس کی بندگی کرے یا اپنی رضا و رغبت سے ایسا کرے، وہ طاغوت ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا شیطان یا بُت یا اور کوئی چیز۔" (جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۳، صفحہ ۱۳) (حاشیہ از مؤلف)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔

(الانبیآء: ۲۵)

"اور اُسے نبیؐ ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا جس کی طرف ہم نے یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے لہٰذا تم لوگ میری ہی بندگی کرو۔"

اور پچھلی تمام اُمتوں کے متعلق بتایا گیا کہ:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَةِ۔ (البیّنۃ: ۵)

"اور اُن کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین کو اُس کے لیے خالص کر کے، بالکل یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ یہی نہایت صحیح و درست دین ہے۔"

پھر ایک ایک نبی کے متعلق بتایا کہ اس کی تعلیم یہی تھی۔ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ میں سے ہر ایک اپنی قوم کو سب سے پہلے یہی تلقین کرتے ہیں کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔" (الاعراف ۵۹-۶۵-۷۳-۸۵۔ ہود ۵۰-۶۱-۸۴۔ المومنون ۲۳-۳۲)۔ حضرت یعقوبؑ مرتے وقت اپنی اولاد سے پوچھتے ہیں کہ میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ "ہم اُس ایک ہی خدا کی بندگی کریں گے جو آپؑ کا اور آپؑ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحٰقؑ کا معبود رہا ہے۔" (البقرہ-۱۳۳) حضرت یوسفؑ اپنے قید خانے کے ساتھیوں سے کہتے ہیں:

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (یوسف: ۳۹-۴۰)

"اے قید خانے کے ساتھیو، بہت سے متفرق رب اچھے ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اُس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اُس کا حکم ہے کہ خود اُس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

حضرت موسیٰ پر پہلی وحی یہی نازل ہوئی کہ :

إِنَّنِيْٓ أَنَا اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ (طٰہٰ : ۱۴)

"میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں، پس تو میری ہی عبادت کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔"

پھر جب بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کی تو حضرت موسیٰ ان پر سخت غضبناک ہوئے اور ان کے بنائے ہوئے معبود کو جلا کر خاک کر ڈالا اور فرمایا :

إِنَّمَآ إِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۔ (طٰہٰ : ۹۸)

"تمہارا حقیقی معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے بار بار کہا :

إِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ (آلِ عمران ۵۱، مریم ۳۶، الزخرف ۶۴)

"درحقیقت اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، پس تم اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔"

يٰبَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ إِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوٰىهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝ (المائدہ : ۷۲)

"اے بنی اسرائیل، اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کیا اُس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔"

مشرکینِ قریش کے لیے خصوصاً اور مشرکینِ عرب کے لیے عموماً سب سے زیادہ زبردست دلیل وہ تھی جو قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے سے پیش کی گئی، کیونکہ تمام مشرکینِ عرب اُن کو اپنا پیشوا تسلیم کرتے تھے، اپنے دین کو اُن کا دین قرار دیتے تھے، اور قریش کا تو سارا فخر و ناز اور نفوذ و اثر ہی اُن سے نسبی تعلق اور اُن کے تعمیر کردہ بیت اللہ کی مجاوری پر تھا۔ قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ قریش اور اہلِ عرب کو بتایا گیا کہ نمرود کی سلطنت (عراق) سے تمہارے باپ اور پیشوا کا نکلنا اسی جھگڑے کی بنا پر تو ہوا تھا کہ اُن کا باپ اور اُن کی قوم اور اُن کے ملک کی حکومت، سب کے سب مشرک تھے۔ انہوں نے اِس شرک کی کھلم کھلا تردید کی، قوم کو توحید کی علی الاعلان دعوت دی، بتوں کو توڑا اور اس کی پاداش میں اُن کو آگ سے بھرے ہوئے الاؤ میں پھینک دیا گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے زندہ و سلامت نکال دیا۔ آخر کار وہ ملک چھوڑ کر ارضِ کنعان کی طرف نکل گئے، پھر مکہ پہنچ کر یہ خانۂ کعبہ اسی لیے بنایا کہ یہاں خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت

ذکی جاتے، اور اپنی اولاد کے لیے دُعا کی کہ وہ بُت پرستی کی گمراہی میں مبتلا نہ ہو۔ اِس قصّے کی تفصیلات
قرآن میں مختلف مقامات پر جیسے پُر زور اور اثر انگیز طریقے سے بیان کی گئی ہیں اُن کو پڑھ کر آدمی اندازہ کر
سکتا ہے کہ جب مکّہ میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے انہیں سُنایا ہوگا تو قریش اور عام مشرکین کس طرح ہِل کر
رہ گئے ہوں گے۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم یہاں صرف آیات کا ترجمہ درج کرتے ہیں:

"اور ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جبکہ اُس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا کیا آپ بتوں کو خدا بناتے
ہیں؟ مَیں تو آپ کو اور آپ کی قوم کو کھُلی گمراہی میں پاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابراہیمؑ نے کہا اے میری قوم
کے لوگو، مَیں اُن سب سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھیراتے ہو۔ مَیں نے تو یکسُو ہو کر اپنا
رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور مَیں ہرگز شرک کرنے والوں میں
سے نہیں ہوں۔ اُس کی قوم اُس سے جھگڑنے لگی۔ اُس نے کہا کیا تم اللہ کے معاملہ میں مجھ
سے جھگڑتے ہو حالانکہ اس نے مجھے صحیح راہ دکھا دی ہے؟ اور مَیں تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں
سے نہیں ڈرتا، ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے، میرے رب کا علم ہر چیز پر حاوی
ہے، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر مَیں تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جبکہ
تم اللہ کے ساتھ اُن چیزوں کو شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے (شریکِ خدا ہونے کے)
لیے اُس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ پھر بتاؤ، اگر تم کچھ علم رکھتے ہو کہ ہم دونوں فریقوں
میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے؟" (الانعام۔ ۷۴ تا ۸۱)

"اور اَے محمدؐ، اِس کتاب میں ابراہیمؑ کا ذکر کرو، بے شک وہ ایک راست باز انسان اور نبی
تھا (انہیں) اُس موقع کا حال سناؤ جب اُس نے اپنے باپ سے کہا ابّاجان، آپ کیوں اُن چیزوں
کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سُنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں۔ ابّاجان، میرے
پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں، مَیں آپ کو سیدھا راستہ
بتاؤں گا ابّاجان، آپ شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابّاجان، مجھے ڈر ہے
کہ کہیں آپ رحمان کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔ باپ نے کہا
ابراہیم، کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو مَیں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ بس تو
ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔ ابراہیمؑ نے کہا سلام ہے آپ کو، مَیں اپنے رب سے دُعا
کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے، میرا رب مجھ پر بہت مہربان ہے۔ مَیں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا
ہوں اور اُن ہستیوں کو بھی جنہیں آپ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ مَیں تو اپنے رب ہی کو

پکاروں گا، اُمید ہے کہ مَیں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔" (مریم - ۴۱ تا ۴۸)

▪ اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دُعا کرنا صرف اُس وعدے کی بنا پر تھا جو اُس نے اُس سے کیا تھا۔ مگر جب اُس پر یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اُس سے بَری الذمّہ ہو گیا۔" (التوبہ - ۱۱۴)

▪ اِس سے پہلے ہم نے ابراہیمؑ کو اُس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اُس کو خوب جانتے تھے۔ یاد کرو وہ موقع جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ داداکو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ اُس نے کہا تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟ اُس نے کہا نہیں بلکہ تمہارا رب اصل میں وہی آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے اُن کو پیدا کیا ہے، اور مَیں اِس پر تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔ اور خدا کی قسم مَیں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔ چنانچہ اُس نے اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف اُن کے بڑے کو چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ (اُن لوگوں نے آ کر اپنے بتوں کا یہ حال دیکھا تو) بولے کہ یہ کس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ۔ (بعض لوگ) کہنے لگے کہ ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سُنا تھا جسے ابراہیم کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں (کہ اس کے ساتھ کیا کیا جاتا ہے)۔ (ابراہیمؑ کے آنے پر) لوگوں نے کہا، ابراہیمؑ کیا تُو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ اس نے کہا بلکہ یہ ان کے اِس سردار کا کیا دھرا ہے، اِنہی سے پُوچھ لو اگر یہ کچھ بولتے ہیں۔ یہ بات سُن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے کہ واقعی تم خود ہی ظالم ہو (کہ ان بے بس خداؤں کو پُوج رہے ہو) پھر اُن کی مت پلٹ گئی اور کہنے لگے کہ تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔ ابراہیمؑ نے کہا اچھا تو تم اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نہ کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ تُف ہے تم پر اور تمہارے اِن معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پُوجا کر رہے ہو۔ انہوں نے کہا جلا دو اِس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے۔ ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیمؑ پر۔ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ بُرائی کریں مگر ہم نے اُنہی کو ناکام و نامراد کر دیا۔" (الانبیاء - ۵۱ تا ۷۰)

▪ اور اِنہیں ابراہیمؑ کا قصہ سناؤ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ تم کن چیزوں

کی عبادت کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا یہ کچھ بُت ہیں جن کی ہم پُوجا کرتے ہیں اور انہی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں۔ اس نے کہا کیا یہ تمہاری سُنتے ہیں جب تم انہیں پُکارتے ہو؟ یا یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ اُنہوں نے جواب دیا (یہ سب کچھ تو ہم نہیں جانتے) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کبھی تم نے (آنکھیں کھول کر) دیکھا بھی کہ یہ چیزیں ہیں کیا جن کی بندگی تم اور تمہارے پچھلے باپ دادا بجا لاتے رہے میرے تو یہ سب دشمن ہیں بجز رب العلمین کے جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے، جو مجھے موت دیگا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا، اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرمائے گا۔" (الشعراء-۶۹ تا ۸۲)

"اور ہم نے ابراہیمؑ کو بھیجا جب اس نے اپنی قوم سے کہا اللہ کی بندگی کرو اور اُسی سے ڈرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ کو چھوڑ کر جنہیں تم پُوج رہے ہو وہ تو محض بُت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اُسی کی بندگی کرو اور اُس کا شکر ادا کرو، اُسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ . . . . . تو اُس کی قوم کا جواب اِس کے سوا کچھ نہ تھا کہ قتل کر دو یا جلا ڈالو اِس کو مگر اللہ نے اس کو آگ سے بچا لیا۔ یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لیے۔ اور ابراہیمؑ نے کہا کہ تم لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بُتوں کو دُنیا میں تو آپس کی محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار کروگے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے، آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ پھر لُوطؑ نے ابراہیمؑ کو مانا اور ابراہیمؑ نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہُوں، وہی زبردست اور حکیم ہے۔" (العنکبوت ۱۶ تا ۲۶)

"اور نوحؑ ہی کے طریقے پر چلنے والا ابراہیمؑ تھا۔ جب وہ اپنے رب کے حضور بِکھوٹ سے پاک دل لے کر آیا۔ جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ کن چیزوں کی عبادت تم کر رہے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹے گھڑے ہوئے معبود چاہتے ہو؟ آخر رب العلمین کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے؟ پھر اُس نے تاروں کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور (قوم کے لوگوں سے) کہا میری طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ وہ لوگ (اُسے چھوڑ کر اپنے میلے میں) چلے گئے۔ اُن کے پیچھے وہ چپکے سے ان کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا "آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں؟ آپ کو کیا ہو گیا بولتے بھی نہیں؟" اس کے بعد وہ اُن پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں۔ (واپس آ کر قوم کے) لوگ بھاگے بھاگے

اُس کے پاس آئے۔ اُس نے کہا کیا تم اپنی ہی تراشی ہوئی چیزوں کو پوجتے ہو؟ حالانکہ اللہ ہی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور اُن چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو۔ اُنہوں نے کہا اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔ اُنہوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی مگر ہم نے اُنہی کو نیچا دکھا دیا۔ اور ابراہیمؑ نے کہا میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں (یعنی ہجرت کرتا ہوں) وہی میری رہنمائی کرے گا۔" (الصّٰفّٰت ۔ ۹۳ تا ۹۹)۔

حضرت ابراہیمؑ کو ملک کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا کیونکہ وہ رب ہونے کا مدعی تھا اور آپؑ اللہ کے سوا کسی کو رب ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اُس سے اُن کی جو گفتگو ہوئی اُسے قرآن اس طرح نقل کرتا ہے:۔

"جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے تو اس نے کہا کہ زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا، اچھا تو اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سُن کر وہ کافر ششدر رہ گیا۔" (البقرہ ۔ ۲۵۸)

اس طرح جب شرک کی مخالفت اور توحید کی دعوت کے باعث حضرت ابراہیمؑ کے لیے وطن کی سرزمین تنگ ہوگئی اور وہ اپنا ملک، اپنی قوم، اپنے خاندان، حتیٰ کہ اپنے باپ کو بھی چھوڑ کر ہجرت کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو چلتے ہوئے انہوں نے اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والوں نے صاف صاف اپنی قوم سے کہہ دیا کہ:

"ہم تم سے اور تمہارے اِن معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اکیلے اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔" (الممتحنہ ۔ ۴)

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید میں یہ بھی بتایا گیا کہ حضرت ابراہیمؑ نے مکہ آکر جب اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی جگہ پر اس خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تو یہ اس لیے نہ تھی کہ اسے بُت خانہ اور مشرکین کا تیرتھ بنایا جائے اور یہاں غیر اللہ کی عبادت ہو اور غیر اللہ کے لیے قربانیاں کی جائیں۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۔ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۔ (الحج: ۲۶ تا ۲۸)

"اور یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے اِس گھر (خانۂ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اِس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا اور لوگوں کو حج کے لیے اذنِ عام دے دینا کہ وہ تمہارے پاس ہر دُور دراز مقام سے پیدل اور اونٹوں پر سوار آئیں تاکہ وہ فائدے دیکھیں جو یہاں اُن کے لیے ہیں اور چند مقرر دنوں میں اُن جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے انھیں بخشے ہیں۔"

نیز قرآن میں لوگوں کو یہ بھی یاد دلایا گیا کہ مکہ کی آبادی اور اپنی آئندہ نسل کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے جو دُعا مانگی تھی وہ کیا تھی :

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (ابراہیم : ۳۵-۳۶)

"اَے میرے رب، اِس شہر کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پرستش کریں۔ اَے میرے رب، اِن بتوں نے بہتیرے لوگوں کو گمراہی میں ڈالا ہے پس جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو تُو درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔"

حضرت ابراہیمؑ کی یہ مثال قریش اور مشرکینِ عرب کے مذہب کی کمر توڑ دینے والی تھی جس پر وہ جھلا تو سکتے تھے، مگر اُس کا انکار نہ کر سکتے تھے، کیونکہ ان کے ہاں پہلے سے یہ بات مُسلّم تھی کہ حضرت ابراہیمؑ مشرک و بُت پرست نہ تھے، کعبہ اُنھوں نے صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا تھا اور شرک اُن کے بہت بعد اہلِ عرب میں شروع ہُوا۔ اُن کے ہاں روایات میں یہ بات تک محفوظ تھی کہ مکہ میں شرک کب شروع ہُوا اور کون سا بُت کب، کہاں سے، کون لایا۔ اِسی لیے قرآن نے بانگِ پُکار ہے لوگوں کو دعوت دی کہ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ "پس یکسو ہو کر ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرو، اور وہ مُشرکین میں سے نہ تھا" (آلِ عمران - ۹۵) - اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ "ابراہیم سے نسبت رکھنے کے سب سے زیادہ حقدار وہ لوگ ہیں جنہوں نے اُس کے طریقے کی پیروی کی اور یہ نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ماننے والے ہیں۔ اللہ ایمان لانے والوں ہی کا حامی و ناصر ہے۔" (آلِ عمران - ۶۸)

(۲) مشرکین کے اپنے نفس کی شہادت سے استدلال

توحید کے لیے دوسری زبردست دلیل یہ پیش کی گئی کہ مشرکین پر جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور انہیں موت یا تباہی سامنے کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو وہ اپنے سب بناوٹی معبودوں کو بھول جاتے ہیں اور صرف اللہ تعالیٰ سے مدد کی دعا مانگنے لگتے ہیں۔ قرآن مجید میں اُن کی اِس کیفیت کو نہایت مؤثر طریقے سے بیان کر کے انہیں یہ احساس دلایا گیا کہ تمہارے اپنے نفس میں شرک کے باطل اور توحید کے برحق ہونے کی شہادت موجود ہے جو آزمائش کے وقت علانیہ اُبھر آتی ہے اور وہ وقت گزر جانے کے بعد تم اُس پر غفلت کا پردہ ڈال دیتے ہو۔ (۴)

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۔ (الانعام: ۴۰-۴۱)

"اے نبیؐ، اِن سے کہو، ذرا غور کر کے بتاؤ، اگر کبھی اللہ کا عذاب تم پر آ جاتا ہے یا آخری گھڑی تمہارے اُوپر آ جاتی ہے تو کیا اللہ کے سوا تم کسی اور کو پکارتے ہو؟ بولو اگر تم (اپنے شرک میں) سچے ہو۔ بلکہ اُس وقت تم اللہ ہی کو پکارتے ہو، پھر اگر وہ چاہتا ہے تو اُس مصیبت کو ٹال دیتا ہے جس سے بچانے کے لیے تم دعا کر رہے تھے اور اُس وقت تم اُن کو بھول جاتے ہو جنہیں تم (خدائی میں) شریک کرتے تھے۔"

"ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ کو اِسی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی جب مکہ معظمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر فتح ہو گیا تو عکرمہ جدہ کی طرف بھاگے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حبش کی راہ لی۔ راستہ میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرے میں پڑ گئی۔ اوّل اوّل تو دیوی اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا۔ مگر جب طوفان کی شدت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کے سوا کسی کو پکارنے کا نہیں ہے وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں۔ اُس وقت عکرمہ کی آنکھیں کھلیں اور اُن کے دل نے آواز دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو؟ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا وہ نیک بندہ ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے اور ہم خواہ مخواہ اُس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عکرمہ کی زندگی میں فیصلہ کن لمحہ تھا۔ اُنہوں نے اُسی وقت خدا سے عہد کیا کہ اگر میں اِس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے

اس عہد کو توڑ دیا گیا اور بعد میں آکر نہ صرف مسلمان ہوتے بلکہ اپنی بقیہ عمر اسلام کے لیے جہاد کرتے گزار دی۔" (۵)

یہ استدلال قرآن مجید میں جگہ جگہ کیا گیا ہے طوالت سے بچنے کے لیے یہاں ہم صرف آیات کا ترجمہ درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:۔

"وہ اللہ ہی ہے جو تم کو زمین اور سمندر میں چلاتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں سوار ہو کر بادِ موافق پر فرحاں و شاداں سفر کر رہے ہوتے ہو اور پھر یکایک بادِ مخالف کا زور ہوتا ہے اور ہر طرف سے موجوں کے تھپیڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس بلا سے بچا لیا تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔" (یونس: ۲۲-۲۳)

"تمہارا حقیقی رب تو وہ ہے جو سمندر میں تمہاری کشتی چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے حال پر نہایت مہربان ہے۔ اور جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں۔ مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم منہ پھیر جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔" (بنی اسرائیل ۶۶-۶۷)

"اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتے ہیں پھر جب وہ کچھ اپنی رحمت کا ذائقہ انہیں چکھا دیتا ہے تو یکایک ان میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہیں (یعنی دوسری ہستیوں کی نذریں اور نیازیں چڑھانی شروع کر دیتے ہیں) تاکہ ہمارے کیے ہوئے احسان کی ناشکری کریں۔" (الروم۔ ۳۲-۳۳)۔ (۶)

"اور جب انسان پر کوئی آفت آتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کر کے اسے پکارتا ہے، پھر جب اس کا رب اپنی نعمت سے اس کو نواز دیتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس پر وہ پہلے پکار رہا تھا اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو ہمسر ٹھیرانے لگتا ہے، تاکہ اس کی راہ سے گمراہ کرے۔" (الزمر۔ ۸)

یعنی خود گمراہ ہونے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو بھی یہ کہہ کہہ کر گمراہ کرتا ہے کہ جو آفت مجھ پر آئی تھی وہ فلاں حضرت، یا فلاں بزرگ، یا فلاں دیوی یا دیوتا کے صدقے میں ٹل گئی۔

اِس سے دوسرے بہت سے لوگ بھی اُن معبودانِ غیراللہ کے معتقد ہو جاتے ہیں اور ہر جاہل اپنے اِسی طرح کے تجربات بیان کر کر کے عوام کی اِس گمراہی کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ (۷)

یہ مشرکین کی دُکھتی ہوئی رگ تھی جس کو قرآن مجید میں جگہ جگہ چھیڑ کر اُن کے اندر سوئے ہوئے احساسِ توحید کو جگایا گیا۔ عرب کی زمین آفات سے بھری ہوئی تھی۔ ملک کی عام بدامنی ہر شخص کے لیے خطرات سے پُر تھی۔ بیماریوں میں دُور دُور تک کہیں دوا اور علاج کا انتظام نہ تھا۔ صحرا کی خوفناک طوفانی آندھیوں میں لوگوں کے حواس باختہ ہو جاتے تھے۔ اِن حالات میں ہر مشرک کو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی کسی ایسی مصیبت سے سابقہ پیش آجاتا تھا جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر اللہ وحدہٗ لاشریک کے آگے دُعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اِس وقت اُس ذاتِ پاک کے سوا کوئی اُس کی مدد نہیں کر سکتا۔ خصوصاً بحری سفروں میں تو اِس طرح کے مواقع اکثر پیش آتے رہتے تھے۔ خود قریش پر اَبرہہ کے حملے کے وقت یہی کیفیت گزر چکی تھی کہ سارے بناوٹی خداؤں کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کو انہوں نے مدد کے لیے پکارا تھا اور نزولِ قرآن کے زمانے میں بہت سے وہ لوگ زندہ موجود تھے جو اِس واقعہ کے عینی شاہد تھے۔ اِسی کی طرف سورۂ فیل میں اُن کو توجہ دلائی گئی کہ اُس وقت تمہارے اصلی اور حقیقی رب کے سوا اور کون تھا جس نے ۶۰ ہزار حملہ آور دشمن کا قلع قمع کر کے تمہیں تباہی سے بچا لیا؟ اور اِسی کی طرف سورۂ قریش میں اُن کو توجہ دلائی گئی کہ اُس خدائے بزرگ و برتر کی بندگی کرو جس کے گھر کی پناہ میں آ کر تم تباہی سے محفوظ ہوئے اور تم کو عرب میں یہ امن، یہ بے خوفی اور یہ خوشحالی نصیب ہوئی۔ اِس نعمت کا دینے والا وہی اللہ ہے، نہ کہ وہ معبود جنہیں تم نے اُس کے گھر میں جمع کر رکھا ہے اور جن کے متعلق تم خود جانتے ہو کہ وہ تمہیں تباہ ہونے سے نہ بچا سکتے تھے۔

(۳) نظامِ کائنات سے استدلال

اُوپر کی دو دلیلوں کے ساتھ قرآن مجید میں جگہ جگہ بڑی تفصیل کے ساتھ کائنات کے پُورے نظام سے اِس بات پر نہایت پُرزور دلائل پیش کیے گئے کہ اِس سارے عالمِ ہست و بُود کا خدا ایک ہی ہے اور ایک ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں بھی ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف آیات کے ترجمے نقل کرنے پر اکتفا کریں گے:

"لوگو، بندگی کرو اپنے اُس رب کی جس نے تم کو اور اُن سب لوگوں کو پیدا کیا ہے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، توقع ہے کہ تم دوسروں کی بندگی کے انجام سے بچ جاؤ گے۔ وہ رب جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اِس سے ہر طرح کی پیداوار نکالی کہ تمہارے لیے رزق بنے۔ لیکن تم جانتے بوجھتے دوسروں کو اللہ کا مدِّمقابل

نہ ٹھیراؤ۔" (البقرہ: ۲۱-۲۲)

"اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر یکایک تم بشر ہو کہ (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔ اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں علم رکھنے والوں کے لیے۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن کو سونا اور اُس کے فضل (رزق) کو تلاش کرنا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو (غور سے بات کو) سنتے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی کی چمک دکھاتا ہے خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی، اور آسمان سے پانی برساتا ہے اور اُس کے ذریعہ سے زمین کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے۔ اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جونہی کہ اس نے تمہیں زمین سے پکارا، بس ایک ہی پکار میں تم اچانک نکل آؤ گے۔ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اس کے بندے ہیں، سب اُسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی اُس کا اعادہ کرے گا اور یہ اُس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ آسمانوں اور زمین میں اُس کی صفت سب سے برتر ہے اور وہ زبردست اور حکیم ہے۔" (الروم: ۲۰ تا ۲۷)

"درحقیقت تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا پھر عرش (کائنات کے تخت سلطنت) پر جلوہ فرما ہوا۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا آتا ہے۔ جس نے سورج اور چاند اور تاروں کو پیدا کیا۔ سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ خبردار رہو، خلق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا۔ بڑا بابرکت ہے اللہ، سارے جہانوں کا مالک و پروردگار۔" (الاعراف: ۵۴)

"پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے زمین سے اُگنے والی چیزوں میں بھی، اور تمہارے اپنے نفوس (یعنی نوعِ انسانی) میں بھی، اور اُن چیزوں میں بھی جن کو لوگ نہیں جانتے۔ اور لوگوں کے لیے ایک نشانی رات ہے جس کے اُوپر سے ہم دن کو ہٹا دیتے ہیں تو ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علم رکھنے والے کا باندھا ہُوا

حساب سے ہے۔ اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ چاند کو جا لے، اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔ اور لوگوں کے لیے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی (کشتی نوحؑ) میں سوار کر دیا اور (بعد میں) ویسی ہی کشتیاں اور پیدا کر دیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں، پھر کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ ہو اور نہ یہ کسی طرح بچائے جا سکیں۔ بس ہماری ہی رحمت ہے جو انہیں پار لگاتی ہے اور ایک وقت خاص تک زندگی سے متمتع ہونے کا موقع دیتی ہے" (یٰسین ۳۹ تا ۴۴)۔

• اس کا کام تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے پس پاک ہے وہ جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا مکمل اقتدار ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو" (یٰسین: ۸۲-۸۳)۔

• اے محمدؐ، کہو کیا اللہ کے سوا میں کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ ہر چیز کا رب تو وہی ہے" (الانعام۔ ۱۶۴)۔

• زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کہاں (مرکر) وہ سونپا جاتا ہے۔ سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے" (ہود۔ ۶)۔

• وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے، اور جو کچھ آسمانوں سے اترتا ہے اور جو کچھ ان میں چڑھتا ہے۔ اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی تم ہو، اور جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات رجوع کیے جاتے ہیں۔ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور وہ دلوں کے حال تک خوب جانتا ہے" (الحدید۔ ۴ تا ۶)۔

• وہ آسمان سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے پھر اس کی روداد اوپر اس کے حضور ایک ایسے دن میں جاتی ہے جس کی مقدار تمہارے حساب سے ایک ہزار برس ہے۔ وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، زبردست اور رحیم۔ جس نے ہر چیز جو بنائی خوب ہی بنائی۔ اور انسان کی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی، پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے جاری کی جو حقیر پانی کی طرح

کا ہے" (السجدہ ۵۔ تا ۹)۔

"دانے اور گٹھلی کو (زمین کی تہوں میں) پھاڑنے والا اللہ ہی ہے۔ وہی زندہ کو مُردہ میں سے نکالتا ہے اور وہی مُردہ کو زندہ میں سے نکالنے والا ہے۔ یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے، پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟ پردۂ شب کو چاک کرکے وہی صبح نکالتا ہے، اور رات کو اُس نے سکون کا وقت بنایا ہے اور اُس نے سورج اور چاند کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا ہے۔ یہ سب اس زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں تمہارے لیے راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ دیکھو، ہم نے نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تم کو ایک متنفّس سے پیدا کیا، پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک اُس کے سونپے جانے کی جگہ۔ یہ نشانیاں ہم نے واضح کر دی ہیں اُن لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہیں"
(الانعام: ۹۵ تا ۹۸)۔

"اُسے نبیؐ، ان سے کہو کون تمہارے معاملہ میں اللہ کے فیصلے کو رد کر دینے کا کچھ بھی اختیار رکھتا ہے اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے یا نفع بخشنا چاہے؟" (الفتح ۔ ۱۱)۔

"اور اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالنا چاہے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے۔ اور اگر وہ تیرے حق میں بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل کو پھیر دینے والا بھی کوئی نہیں" (یونس ۔ ۱۰۷)

"اللہ جس رحمت کا راستہ بھی لوگوں کے لیے کھول دے اُسے کوئی روک دینے والا نہیں اور جسے وہ بند کر دے اُسے اللہ کے بعد پھر کھول دینے والا بھی کوئی نہیں ۔۔۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو تمہیں آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہو؟ کوئی خدا اس کے سوا نہیں، پھر تم کہاں سے دھوکا کھا رہے ہو؟ (فاطر: ۲۔۳)

"اُسے نبیؐ، ان سے پوچھو کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے اور کون ہے وہ جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دی جا سکتی؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو۔ وہ ضرور کہیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ کہو پھر کہاں سے تم دھوکا کھا رہے ہو؟" (المومنون ۹)

"اللہ حکومت کر رہا ہے اور کوئی اس کے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے والا نہیں ہے" (الرعد ۔ ۴۱)

"اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان کا نظام بگڑ

جاتا پس پاک ہے اللہ عرش کا مالک، اُن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کے لیے کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔ کیا اِن لوگوں نے اُس کے سوا دوسرے خدا بنا رکھے ہیں؟ اِن سے کہو لاؤ اپنی دلیل" (الانبیاء: ۲۲ تا ۲۴)۔

"اللہ نے کسی کو اپنی اولاد نہیں بنایا ہے اور نہ اس کے ساتھ دوسرا کوئی خدا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی خلق کو لے کر الگ ہو جاتا اور پھر وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ پاک ہے اللہ اُن باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں" (المومنون۔ ۹۱)۔

"اے نبیؐ، اِن سے کہو اگر اُس کے ساتھ دوسرے خدا بھی ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ مالکِ عرش کے مقام پر پہنچنے کی ضرور کوشش کرتے۔ پاک ہے وہ اور بہت بالا و برتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ کہہ رہے ہیں" (بنی اسرائیل: ۴۲۔۴۳)۔

یہ اُن بہت سی آیات میں سے چند ہیں جن میں توحید کے ایسے مضبوط دلائل دیئے گئے ہیں کہ کوئی شخص ذرا سی عقل بھی رکھتا ہو تو یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ زمین سے آسمانوں تک اِس کائنات کا عظیم الشان نظام ایک خدا کے بغیر نہیں چل سکتا۔ اُسی کے بناتے یہ بنا ہے اور اسی کے چلائے یہ چل رہا ہے۔ اِس میں جو حکمت، جو علم، جو قدرت، جو شانِ رحمت و ربوبیت، جو ضبط و نظم اور باقاعدگی اور کائنات کی بے حد و حساب اشیاء میں جو ہم آہنگی و مناسبت پائی جاتی ہے، وہ صاف بتا رہی ہے کہ یہ سب کچھ ایک خدا کی خدائی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اِس میں کسی دوسرے کے پاس ذرّہ برابر بھی خداوندانہ اختیارات کے ہونے کا کوئی امکان نہیں، ورنہ یہ نظام اِس باقاعدگی کے ساتھ اور اِتنی حکمتوں اور مناسبتوں کے ساتھ کبھی نہ چل سکتا۔ اب ظاہر ہے کہ جب خالق بھی وہ ہے، رازق بھی وہ، نفع و نقصان پہنچانے کا مختار بھی وہ، اور سارے اختیارات کا مالک بھی وہ، تو دوسرے کون ہیں جن کو معبود ہونے کا حق پہنچتا ہو؟ اور اُس کی خلق میں کسی دوسرے کا حکم کیسے چل سکتا ہے؟ انسان اگر کسی کی بندگی کرتا ہے تو یہی سمجھ کر کرتا ہے کہ وہ کسی قسم کے اختیارات رکھتا ہے اور اُس کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت حاصل ہے۔ مگر جب اسے معلوم ہو جاتے کہ اُسے کوئی قدرت و اختیار حاصل نہیں ہے تو کوئی شخص اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ اُس کی بندگی بجالاتے۔

(۴) شرک کی تردید کے دلائل

جس قوت کے ساتھ قرآن میں توحید کو ثابت کیا گیا، اُسی قوت کے ساتھ شرک کی تردید میں ایسے دلائل دیئے گئے جو اُس کو بالکل پاش پاش کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہاں بھی ہم صرف آیات کے تراجم درج کریں گے۔

"آگاہ رہو، آسمان کے بسنے والے ہوں یا زمین کے، سب اللہ کے مملوک ہیں۔ اور جو لوگ

اللہ کے سوا کچھ دوسرے شریکوں کو پکار رہے ہیں وہ نرے وہم و گمان کی پیروی اور محض قیاس آرائی کر رہے ہیں" (یونس ۔ ۶۶) ۔

"اُس کو چھوڑ کر جن کی تم بندگی کر رہے ہو وہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں ۔ اللہ نے اُن کے (معبود یا شریک خدائی ہونے) کی کوئی سند نازل نہیں کی" (یوسف ۔ ۴۰) ۔

"پس تم اُن معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہو جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں یہ تو (بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے) اُسی طرح پوجا پاٹ کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے ان کے باپ دادا کرتے تھے" (ہود ۔ ۱۰۹) ۔

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اُس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے ۔ کیا یہ (باپ دادا ہی کی تقلید کرتے رہیں گے) خواہ شیطان اُن کو بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب ہی کی طرف بلاتا رہا ہو؟ (لقمان ۔ ۲۱) ۔

"کیا اس سے پہلے ہم نے کوئی کتاب ان کو دی تھی جس کی سند (اپنی ملائکہ پرستی کے لیے) یہ اپنے پاس رکھتے ہوں؟ نہیں، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں ۔ اسی طرح، اے محمدؐ، تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی متنبہ کرنے والا بھیجا، اس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں ۔ ہر نبی نے اُن سے پوچھا کیا تم اُسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ اُس راستے سے زیادہ صحیح راستہ میں تمہیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس دین کی طرف بلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو اس کے ہم منکر ہیں" (الزخرف ۔ ۲۱ تا ۲۴) ۔

"اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن کی بندگی کر رہے ہیں جن کے (معبود ہونے کی) اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے اور نہ اِن کے پاس (اُن کے خدائی میں حصہ دار اور عبادت کے مستحق ہونے کا) کوئی علم ہے" (الحج ۔ ۷۱) ۔

اِن آیات اور ایسی ہی دوسری آیات میں صاف صاف یہ بتا دیا گیا کہ مشرکین کے پاس دوسروں کو خدا کا شریک اور عبادت کا مستحق ٹھیرانے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے ۔ وہ صرف باپ دادا کی اندھی تقلید کر رہے

ہیں اور اپنی جگہ محض قیاس و گمان سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ فلاں فلاں ہستیوں کو خدائی کے اختیارات میں سے کوئی حصہ ملا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ اُن کی مُرادیں بر لاتی ہیں، حالانکہ خدا نے کبھی کسی ذریعہ سے انہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ میں نے اپنے اختیارات کا فلاں حصہ فلاں ہستی کو دے دیا ہے، نہ ان کے پاس براہِ راست اس کا کوئی علم ہے کہ فلاں حضرت یا بزرگ یا دیوی یا دیوتا کو خدائی کے اختیارات میں سے یہ یہ اختیارات حاصل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن میں پے در پے شرک کے غلط اور بے حقیقت ہونے کے دلائل بھی دیئے گئے :-

"بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے وہ خوشنما باغ اُگائے جن کے درختوں کا اُگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ یہی لوگ راہِ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔ اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں (کھاری اور میٹھے) کے درمیان پردے حائل کر دیئے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں بلکہ ان میں سے اکثر لوگ بے علم ہیں۔ کون ہے جو بے بس کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اُسے پکارے؟ اور کون اُس کی تکلیف کو دُور کرتا ہے؟ اور کون تمہیں زمین کا خلیفہ بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (یہ کام کرنے والا) ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو۔ کون ہے جو تم کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ دکھاتا ہے؟ اور کون ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) سے آگے خوشخبری لے کر بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (یہ کام کرتا) ہے؟ اللہ بہت بالاتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ کون تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اُس کا اعادہ کرتا ہے؟ اور کون تمہیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں حصہ دار) ہے؟ اے نبیؐ، ان سے کہو کہ لاؤ اپنی دلیل اگر تم (اپنے شرک میں) سچے ہو۔"

(النمل، ۶۰ تا ۶۴)۔

"نہایت مبارک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ دنیا جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والا ہو۔ وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے، جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے، جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے، جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اُس کی ایک تقدیر مقرر کر دی۔ لوگوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، جو اپنے لیے کسی نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ مار سکتے

ہیں نہ جِلا سکتے ہیں نہ مرے ہُوئے کو پھر اُٹھا سکتے ہیں" (الفرقان - ۱-۳) -

سُورۂ نحل میں آیت ۳ سے ۱۷ تک اللہ تعالیٰ کی تخلیق کے بہت سے کرشمے بیان کرنے کے بعد فرمایا:

"پھر کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے، دونوں یکساں ہیں؟ کیا تم ہوش میں نہیں آتے؟ (آیت: ۱۷) -

"اے نبیؐ، ان سے پوچھو آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ کہو اللہ پھر ان سے کہو کیا اُس کو چھوڑ کر تم نے دوسروں کو اپنا کارساز ٹھیرا لیا جو خود اپنے نفع و نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے؟ ان سے کہو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہُوا کرتے ہیں؟ کیا روشنی اور تاریکیاں یکساں ہوتی ہیں؟ ان لوگوں نے جن کو اللہ کا شریک ٹھیرا رکھا ہے کیا اُنہوں نے بھی کچھ اللہ کی طرح پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے لیے تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا؟ ان سے کہو اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ یکتا ہے سب پر غالب" (الرعد - ۱۶) -

"اے نبیؐ، ان سے کہو کبھی تم نے دیکھا بھی ہے اپنے اُن شریکوں کو جنہیں تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو؟ مجھے بتاؤ اُنہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں میں اُن کی کوئی شرکت ہے؟ یا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس کی بنا پر یہ (اپنے شرک کے لیے) کوئی صاف سند رکھتے ہوں؟ کچھ نہیں، بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے کو محض فریب کے جھانسے دیے جا رہے ہیں" (فاطر - ۴۰) -

"اور اگر تم ان سے پُوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے - ان سے کہو، پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ تمہاری دیویاں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو مجھے اس کے پہنچائے ہوئے نقصان سے بچا لیں گی؟ یا اللہ مجھ پر مہربانی کرنا چاہے تو کیا یہ اُس کی رحمت کو روک دیں گی؟ (اگر وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسا کر سکتی ہیں تو) ان سے کہہ دو کہ میرے لیے بس اللہ ہی کافی ہے، بھروسہ کرنے والے اسی پر بھروسہ کرتے ہیں" (الزمر - ۳۸) -

مشرکین کہتے تھے کہ ہمارے معبُود اللہ کے ہاں ہمارے لیے ذریعۂ تقرّب اور ہماری سفارش کرنے والے ہیں، اس لیے ہم اُن کی عبادت کرتے ہیں، ان سے دُعائیں مانگتے ہیں، ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں، تاکہ وہ ہمارے پُشتیبان ہوں، ہمیں نفع پہنچائیں اور نقصان سے بچائیں - اُن کے اس خیال کی بھی مفصل تردید قرآن میں کی گئی -

"یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں - اے نبیؐ، ان سے کہو کیا تم اللہ کو اُس چیز کی خبر دیتے

رب ہے جو جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں؟ پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں" (یونس۔ ۱۸)۔

"اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ اپنے دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم تو اُن کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں۔ اللہ یقیناً اُن کے درمیان اُن تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا اور منکرِ حق ہو" (الزمر۔۳)۔

"ان لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ اور خدا بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے پُشتیبان ہوں۔ کوئی پُشتیبان نہ ہوگا۔ وہ سب اُن کی عبادت کا انکار کریں گے اور (آخرت میں) اُلٹے اِن کے مخالف بن جائیں گے" (مریم۔ ۸۱۔ ۸۲)۔

"ان لوگوں نے اللہ کے سوا کچھ دوسرے خدا بنا رکھے ہیں اور یہ اُمید رکھتے ہیں کہ اِن کی مدد کی جائیگی۔ وہ اِن کی کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ لوگ اُلٹے اُن کے لیے حاضر باش لشکر بنے ہوئے ہیں (جن کی بدولت اُن کی خدائی چل رہی ہے)" (یٰسین ۷۴۔ ۷۵)۔

"کون ہے جو اللہ کے ہاں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟" (البقرہ ۲۵۵)۔

"اے نبی! (ان مشرکوں سے) کہو کہ پکار دیکھو اُن کو جنہیں تم اللہ کے سوا اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو۔ وہ ذرہ برابر کسی چیز کے مالک نہیں ہیں، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں (نہ زمین و آسمان کی خدائی میں ان کی کوئی شرکت ہے)، اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے۔ اور اللہ کے ہاں شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی سوائے اُس کے جسے (شفاعت کرنے اور جس کے حق میں شفاعت کرنے کی) اللہ نے اجازت دی ہو" (سبا: ۲۲۔۲۳)۔

"اور اس شخص سے زیادہ بہکا ہوا انسان اور کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر اُن کو پکارے جو قیامت تک اُسے کوئی جواب نہیں دے سکتے بلکہ وہ اِس سے بھی بے خبر ہیں کہ یہ لوگ اُن سے دُعا مانگ رہے ہیں، اور جب لوگ حشر میں جمع کیے جائیں گے اس وقت وہ اپنے پکارنے والوں کے دشمن اور ان کی عبادت کے منکر ہوں گے" (الاحقاف: ۵۔ ۶)۔

"اللہ ہی کو پکارنا برحق ہے۔ رہیں وہ دوسری ہستیاں جنہیں اُس کو چھوڑ کر یہ پکار رہے ہیں وہ اِن کی دعاؤں کا کوئی جواب نہیں دے سکتیں۔ انہیں پکارنا تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص ہاتھ پھیلا کر پانی سے درخواست کرے کہ تو میرے منہ تک پہنچ جا، حالانکہ پانی اُس تک پہنچنے والا نہیں۔ بس ایسی

طرح کافروں کی دعائیں بھی کچھ نہیں ہیں مگر ایک تیر بے ہدف" (الرعد - ۱۴)۔

"جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ کچھ علم رکھتے" (العنکبوت - ۴۱)۔

"لوگو، ایک مثال دی جاتی ہے ذرا اُسے غور سے سنو۔ اللہ کو چھوڑ کر جن کو تم پکارتے ہو انہوں نے ایک مکھی بھی پیدا نہیں کی ہے چاہے وہ سب مل کر ایسا کرنا چاہیں۔ بلکہ اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر پہچانی ہی نہیں جیسا کہ اس کی قدر پہچاننے کا حق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوت والا اور زبردست تو اللہ ہی ہے" (الحج : ۷۳-۷۴)۔

"کیا یہ لوگ اُن کو خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں جو کسی چیز کو بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں؟ جو نہ ان کی مدد کرتے ہیں نہ آپ اپنی مدد کرنے پر قادر ہیں" (الاعراف ۱۹۱-۱۹۲)۔

سورۂ نحل میں آیت ۶۵ سے ۷۲ تک انسان پر اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اس کی نعمتوں کو بیان کرنے کے بعد ارشاد ہُوا:

"تو کیا لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی) باطل کو مانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احسان کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کرتے ہیں جن کے اختیار میں نہ آسمانوں سے ان کو کوئی رزق دینا ہے نہ زمین سے اور نہ وہ یہ کام کر ہی سکتے ہیں" (النحل : ۷۲-۷۳)۔

"کیا اللہ کو چھوڑ کر ان لوگوں نے کچھ ہستیوں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ ان سے کہو کیا وہ شفاعت کریں گے خواہ اُن کے اختیار میں کچھ بھی نہ ہو اور وہ سمجھتے بھی نہ ہوں؟ کہو شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک وہی ہے پھر اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو" (الزُّمر : ۴۳-۴۴)۔

"تمہارے گردوپیش بہت سی بستیوں کو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ ہم نے آیات بھیج کر طرح طرح سے اُن کو سمجھایا کہ شاید یہ پلٹ آئیں۔ پھر کیوں نہ اُن ہستیوں نے اُن کی مدد کی جنہیں اللہ کو چھوڑ کر اُنہوں نے تقرّب الی اللہ کا ذریعہ سمجھتے ہوئے معبود بنا لیا تھا؟ بلکہ (عذاب آنے کے وقت) وہ اُن سے گُم ہو گئے اور یہ تھا اُن کے جھوٹ اور اُن بناوٹی عقیدوں کا انجام جو انھوں نے گھڑ رکھے تھے" (الاحقاف - ۲۷-۲۸)۔

سُورۂ فاطر میں آیت ۱ سے ۱۳ تک اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے بیان کرنے کے بعد فرمایا:

"وہی اللہ (جس کے یہ سارے کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اُسی کی ہے۔ اسے چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ پرکاہ کے برابر بھی کسی چیز کے مالک نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری دُعائیں سُن نہیں سکتے، اور سُن بھی لیں تو تمہیں اُن کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے" (فاطر: ۱۳-۱۴)۔

"اللہ ہی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔ رہے وہ جن کو (یہ مشرکین) اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ نہیں کرتے۔ درحقیقت اللہ ہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے" (المؤمن: ۲۰)۔

پھر لوگوں کو بتایا گیا کہ جو کوئی عزت (کسی پشتیبان طاقت کی مدد) چاہتا ہو اسے کوئی سفارشی اور ذریعۂ تقرب إلی اللہ تلاش کرنے اور اس کے آگے دُعائیں اور التجائیں اور نذر و نیاز پیش کرنے کی حاجت نہیں۔ اس کا ذریعہ صرف ایک ہے:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۔ (فاطر: ۱۰)

"جو کوئی عزت چاہتا ہو تو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔ اُس کی طرف جو چیز اُوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے اور نیک عمل اُسے چڑھاتا ہے۔"

مشرکین اللہ کے لیے اولاد بھی تجویز کرتے تھے اور ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے اور ان کی عبادت بجالاتے تھے۔ اس پر قرآن میں بڑی سخت تنقید کرکے اس عقیدے کی لغویت ثابت کی گئی:

"اِن لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک بنا دیا حالانکہ اس نے انہیں پیدا کیا ہے، اور انہوں نے اُس کے لیے بے جانے بوجھے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر دیں۔ پاک ہے وہ اور بالاتر ہے اُن باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔ وہ تو آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کی کوئی اولاد کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس کی کوئی شریکِ زندگی ہی نہیں ہے۔ اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی خدا اس کے سوا نہیں، ہر چیز کا خالق، لہٰذا تم اُسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے" (الانعام: ۱۰۰-۱۰۲)۔

"یہ کہتے ہیں کہ رحمان اولاد رکھتا ہے۔ سبحان اللہ، وہ (یعنی فرشتے) تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔ اُس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ جو کچھ

اُن کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے سوائے اُس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور کہیں اُن میں سے کوئی کہہ بیٹھے کہ اللہ کے سوا میں بھی خدا یا معبود ہوں تو اس کو ہم جہنم کی سزا دیں۔ ایسی ہی جزا ہم ظالموں کو دیا کرتے ہیں" (الانبیاء: ۲۶ تا ۲۹)۔

"ان لوگوں نے اللہ کے بندوں میں سے بعض کو اس کا جزء بنا ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کھلا احسان فراموش ہے۔ کیا اپنی مخلوقات میں سے اُس نے خود تو بیٹیاں لیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟ اور حال یہ ہے کہ جس اولاد کو یہ لوگ اُس خدائے رحمان کی طرف منسوب کرتے ہیں اُس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اُس کے منہ پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔ کیا اللہ کے حصے میں وہ اولاد آئی جو زیوروں میں پالی جاتی ہے اور بحث و حجت میں اپنا مدعا پوری طرح ادا بھی نہیں کر سکتی؟ اور ملائکہ کو جو رحمان کے بندے ہیں انہوں نے عورتیں قرار دے لیا۔ کیا اُن کے جسم کی ساخت انہوں نے دیکھی ہے؟ ان کی شہادت لی جائے گی اور ان کو اس کی جواب دہی کرنی ہوگی" (الزخرف: ۱۵-۱۹)۔

"پھر ذرا ان سے پوچھو کیا (ان کے دل کو یہ بات لگتی ہے کہ) تمہارے رب کے لیے تو ہوں بیٹیاں اور ان کے لیے ہوں بیٹے؟ کیا ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا ہے اور یہ آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں؟ خوب سُن رکھو، دراصل یہ لوگ اپنی من گھڑت سے یہ بات کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے اور فی الواقع یہ جھوٹے ہیں۔ کیا اللہ نے بیٹوں کے بجائے بیٹیاں اپنے لیے پسند کر لیں؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ کیسے حکم لگا رہے ہو؟ کیا تمہیں ہوش نہیں آتا؟ یا پھر تمہارے پاس اپنی ان باتوں کے لیے کوئی صاف سند ہے تو لاؤ اپنی وہ کتاب (جس میں یہ لکھا ہو) اگر تم سچے ہو" (الصّٰفّٰت: ۱۴۹ تا ۱۵۷)۔

"تم نے کبھی اس لات اور عُزّٰی اور تیسری ایک اور دیوی مَنات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا؟ کیا بیٹے تمہارے لیے ہیں اور بیٹیاں اللہ کے لیے؟ یہ تو بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی (جس میں اس نے خود کہا ہو کہ یہ میری بیٹیاں ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ محض وہم و گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور خواہشاتِ نفس کے مرید بنے ہوئے ہیں، حالانکہ اُن کے رب کی طرف سے اُن کے پاس ہدایت آ چکی ہے" (النجم: ۱۹ تا ۲۳)۔

شرک کے ایک ایک پہلو کی تردید کرتے ہوئے مشرکین کو قرآن میں یہ بھی بتایا گیا کہ تمہارے معبودوں کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تم اُن کے آگے نذر و نیاز چڑھاتے اور پرستش کے مراسم بجالاتے رہو اور ان سے دعائیں مانگتے رہو کہ وہ دنیا میں تمہارے کام بناتے رہیں۔ تمہارا کوئی معبود بھی ایسا نہیں ہے جو تمہیں یہ ہدایت دیتا ہو کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے صحیح اصول کون سے ہیں اور غلط کون سے، کونسا طریقہ برحق ہے اور کونسا باطل۔ حالانکہ عبادت کا مستحق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ جو اپنے بندوں اور پرستاروں کی رہنمائی بھی کرتا ہو:

"ان سے پوچھو تمہارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ ان سے کہو وہ تو صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ پھر کیا وہ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے پیروی کا زیادہ حق دار ہے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے؟ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ درحقیقت ان میں سے اکثر لوگ گمان و قیاس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا" (یونس - ۳۶)۔

اس طرح دلائل سے شرک کا پوری طرح قلع قمع کر کے لوگوں کو صاف صاف خبردار کر دیا گیا کہ شرک وہ گناہ ہے جس کی معافی خدا کے ہاں کبھی نہیں ہو سکتی جب تک آدمی اس سے توبہ نہ کرے، اور اس گناہ کے ساتھ آدمی اپنے زعم میں خواہ کتنے ہی نیک اعمال کرتا رہے وہ سب ضائع ہو جائیں گے:

"اللہ اس بات کو ہرگز معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا جائے۔ اس کے سوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔ اللہ کے ساتھ جس نے کسی اور کو شریک ٹھیرایا اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ گھڑا اور بڑے سخت گناہ کی بات کی" (النساء - ۴۸)۔

"اے محمدؐ، ان سے کہو: پھر کیا اے نادانو، تم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کرنے کے لیے مجھ سے کہتے ہو؟ حالانکہ تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے تمام نبیوں کی طرف یہ وحی بھیجی گئی تھی کہ اگر تم نے شرک کیا تو تمہارا سارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم نامراد ہو کر رہو گے۔ لہٰذا تم اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں شامل ہو" (الزمر - ۶۴-۶۶)۔

(۵) توحید کے تقاضے

توحید کو حق اور شرک کو ہر لحاظ سے باطل ثابت کرنے کے ساتھ قرآن میں یہ بھی کھول کھول کر بیان کر دیا گیا کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کو رب اور معبود ماننے کے بعد لازم کیا آتا ہے:

(۱) اس سے لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت اور پرستش نہ کی جائے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۔ (الذاریات: ۵۶)

"میں نے جن اور انسانوں کو کسی اور کی عبادت کے لیے نہیں بلکہ، اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔"

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ[1] (حٰمٓ السجدہ: ۳۷)۔

"نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو بلکہ اُس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر تم واقع تم اُسی کی عبادت کرنے والے ہو۔"

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ ۔ (الزمر: ۲-۳)

"اے محمدؐ! ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف برحق نازل کی ہے لہٰذا تم اللہ ہی کی عبادت کرو دین کو اس کے لیے خالص کر کے۔ خبردار رہو دین خالص اللہ ہی کا حق ہے۔"

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۔ (المومن - ۶۶)

"کہہ دو کہ مجھے اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ اُن کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر پکارتے ہو۔"

(۲) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگی جائے، کسی کو فوق الفطری (Super Natural) طور پر حاجت روا اور کارساز سمجھ کر اُس سے اپنی حاجات میں مدد نہ مانگی جائے:[2]

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۔ (الفاتحہ)

"(اے اللہ) تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔"

---

[1] یہ آیت سجدہ ہے۔ اسے پڑھ کر سجدہ کر لیا جائے۔

[2] ایک مدد وہ ہے جو دنیا کے مادی قوانین کے تحت ایک شخص کسی دوسرے شخص یا چیز یا ادارے سے مانگتا ہے۔ یہ توحید کے خلاف نہیں ہے۔ توحید کے خلاف یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ وہ غیبی طور پر جاری دعائیں سنتا ہے اور یہ خیال کرتے ہوئے اس سے مدد مانگی جائے کہ عالم اسباب پر اُس کی حکمرانی ہے یا حکمرانی میں اُس کا کوئی حصہ ہے اور عالم مادی اسباب سے بالاتر طریقے پر وہ ہماری حاجتیں پوری کر سکتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۔ (یونس ۔ ۱۰۶)

"اور اللہ کے سوا کسی اور کو (مدد کے لیے) نہ پکارو جو نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔"

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ (القصص ۔ ۸۸)

"اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو (مدد کے لیے) نہ پکارو۔ کوئی حقیقی معبود اُس کے سوا نہیں ہے۔"

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۔ (المومن ۔ ۶۰)

"اور تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آکر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں وہ ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔"[1]

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۔ (البقرہ ۔ ۱۸۶)

"اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو ان سے کہو میں قریب ہی ہوں[2]، دعا مانگنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا کا جواب دیتا ہوں[3]۔"

(۳) اِس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا عالم الغیب کسی کو نہ مانا جائے کسی دوسرے کے متعلق یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ کائنات کی تمام پوشیدہ اور ظاہر حقیقتوں کو جانتا ہے اور ماضی سے مستقبل تک ہر چیز کا اُسے علم ہے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ (النمل ۔ ۶۵)

"کہو، آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اُن میں سے کوئی بھی غیب کا علم اللہ کے سوا نہیں رکھتا۔"

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ

---

[1] اِس آیت سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ دعا اور عبادت کی حقیقت ایک ہی ہے جو شخص کسی سے دعا مانگتا ہے وہ درحقیقت اس کی عبادت کرتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] یعنی مجھ سے دعا مانگنے کے لیے کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں براہِ راست دعا سنتا ہوں (حاشیہ از مؤلف)

[3] جواب سے مراد الٹا جواب نہیں ہے جو دعا مانگنے والا بھی سُنے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمام درخواستوں پر جوابی کارروائی میں ہی کرتا ہوں۔ (حاشیہ از مؤلف)

مُّبِيْنٍ ۔ (الانعام - ۵۹)

"اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خشکی اور سمندر میں جو کچھ ہے اُسے وہی جانتا ہے۔ کسی درخت کا ایک پتہ بھی جھڑتا ہے تو وہ اسے جانتا ہے۔ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں اور نہ کوئی خشک و تر ایسا ہے جو ایک واضح دفتر میں درج نہ ہو۔"

(۴) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے نام پر یا کسی آستانے پر کوئی جانور ذبح یا قربان نہ کیا جائے، اور ہر ایسا جانور حرام ہو جسے ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام نہ لیا جائے، یا اللہ کے ساتھ کسی اور کا بھی نام لیا جائے۔ قرآن میں ۴ مقامات پر صاف صاف الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو وہ حرام ہے (البقرہ: ۱۷۳ - المائدہ: ۳ - الانعام: ۱۴۵ - النحل: ۱۱۵)۔ سورۃ مائدہ میں یہ بھی تصریح ہے کہ غیر اللہ کے لیے نذر کے طور پر قربانیاں چڑھانے کے لیے جو آستانے مشرکین نے بنا رکھے تھے ان پر ذبح کیا ہوا جانور بھی حرام ہے (آیت ۳)۔ پھر سورۃ انعام میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا:

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ (آیت: ۱۱۸)

"پس کھاؤ اُس جانور کے گوشت میں سے جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا گیا ہو۔"

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ (آیت: ۱۲۱)

"اور نہ کھاؤ کسی ایسے جانور کے گوشت کو جس پر ذبح کے وقت اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، کیونکہ یہ فسق ہے۔"

(۵) اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جو خدا ساری کائنات کی حاکمیت و اقتدار کا لاشریک مالک ہے اسی خدا کی حاکمیت اور اُسی کے اقتدارِ اعلیٰ کو جملہ انسانی معاملات (اخلاق، تہذیب، تمدّن، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون، عدالت اور صلح و جنگ وغیرہ) میں بھی تسلیم کیا جائے۔ اُسی کا قانون، قانون ہو، کسی دوسرے کو اس کے مقابلے میں قانون سازی کا اختیار نہ ہو۔ اسی کا حرام کیا ہوا حرام اور اسی کا حلال کیا ہوا حلال ہو، کسی کو یہ حق نہ ہو کہ بطورِ خود حلال و حرام تجویز کرے۔ انسان بحیثیت فرد اور بحیثیت جماعت نہ خود مختار بن کر اپنی مرضی چلائے، اور نہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کی مرضی کا قانون و قاعدہ تسلیم کرے۔ انسانی معاملات میں فیصلہ کا اختیار اللہ کو ہو نہ کہ بندوں کو۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ (الشوریٰ - ۱۰)

"تمہارے درمیان جس چیز میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔"

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ - ۲۱)

"کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والی

ایسی شریعت مقرر کر دی ہے جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا ہے؟

"اس آیت کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں شریکوں سے مُراد وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے ہیں، جن کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، جن کے آگے پوجا پاٹ کے مراسم ادا کرتے ہیں، بلکہ لامحالہ ان سے مُراد وہ انسان ہیں جن کو لوگوں نے شریک فی الحکم ٹھیرا لیا ہے، جن کے سکھائے ہوئے افکار و عقائد اور نظریات اور فلسفوں پر لوگ ایمان لاتے ہیں، جن کی دی ہوئی قدروں کو مانتے ہیں، جن کے پیش کیے ہوئے اخلاقی اصولوں اور تہذیب و ثقافت کے معیاروں کو قبول کرتے ہیں، اور جن کے مقرر کیے ہوئے قوانین اور طریقوں اور رواجات کو اپنے مذہبی مراسم، اور عبادات میں، اپنی شخصی زندگی میں، اپنی معاشرت میں، اپنے تمدّن میں، اپنے کاروبار اور لین دین میں، اپنی عدالتوں اور اپنی سیاست اور حکومت میں اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ گویا یہی وہ شریعت ہے جس کی پیروی اُن کو کرنی چاہیے۔" (۸)

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۔ (التوبہ ۳۱)

انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو ایک خدا کے سوا کسی کی بندگی کا حکم نہیں دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں۔ پاک ہے وہ اُس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

"حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عدیؓ بن حاتم، جو پہلے عیسائی تھے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر مسلمان ہوئے تو انہوں نے منجملہ اور سوالات کے ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ اس آیت میں ہم پر اپنے علماء اور درویشوں کو خدا بنا لینے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کی اصلیت کیا ہے۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو کچھ وہ حرام قرار دیتے ہیں اسے تم حرام مان لیتے ہو اور جو کچھ وہ حلال قرار دیتے ہیں اُسے حلال مان لیتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا یہ تو ضرور ہم کرتے رہے ہیں۔ فرمایا بس یہی ان کو خدا مان لینا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی سند کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کے لیے جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزعم خود متمکن ہوتے ہیں اور جو اُن کے اس حق شریعت سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ اُنہیں خدا بناتے ہیں۔" (۹)

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۭ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ۔ (یونس۔ ۵۹)

"اے نبیؐ، ان سے کہو تم نے کبھی سوچا بھی کہ جو سامانِ رزق اللہ نے تمہارے لیے نازل کیا تھا اس میں سے تم نے خود ہی کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھیرا لیا؟ ان سے پوچھو کیا اللہ نے تم کو اس کی اجازت دی

تمہی یا تم اللہ پر افترا کر رہے ہو؟

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ۔ (النحل - ۱۱۶)

" اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگاتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے "

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۔ ۔ ۔ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔ ۔ ۔ هُمُ الْفَاسِقُونَ (المائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷)

" اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں ۔ ۔ ۔ وہی ظالم ہیں ۔ ۔ ۔ وہی فاسق ہیں "

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (الجاثیہ - ۲۳)

" پھر تم نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا (یعنی خود مختار بن گیا اور اپنے نفس کی بندگی کرنے لگا) ۔ "

اِس طرح وہ توحید جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے تھے اُس کا تقاضا صرف یہی نہ تھا کہ لوگ خدائے واحد کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، کسی سے دُعا نہ مانگیں، کسی کے لیے قربانیاں نہ کریں، بلکہ یہ بھی تھا کہ لوگ اپنے تمام رسمی اور رواجی قاعدوں، اور تمام خود ساختہ یا دوسروں کے بنائے ہوئے قوانین اور ضوابط کو چھوڑ کر صرف ایک اللہ کو قانون دینے والا مانیں اور اسی کے بھیجے ہوئے قانون کی پیروی کریں۔ اس معاملہ میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی کوئی استثناء نہ تھا۔ آپ کو بھی یہ حکم تھا کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کا اتباع کریں اور اپنی مرضی سے خود کسی چیز کو حلال یا حرام نہ کریں۔

اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۔ (الانعام - ۱۰۶)

" اے محمدؐ، پیروی کرو اُس چیز کی جو بذریعہ وحی تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے بھیجی گئی ہے "

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۔ (التحریم - ۱)

" اے نبیؐ، تم کیوں اُس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہے؟ "

یہ گویا ایک ہمہ گیر انقلاب کی دعوت تھی جو صرف مذہب ہی کو نہیں بلکہ پورے نظامِ زندگی کو بدل ڈالنا

چاہتی تھی۔ اس سے مشرکینِ عرب میں تو کھلبلی مچنی ہی تھی، مگر خاص طور پر قریش کے مفاد پر اس کی جو شدید ضرب پڑتی تھی اُس پر وہ تلملا اُٹھے، کیونکہ خود ان کے قبیلے اور ان کے اپنے شہر سے اس دعوت کے اُٹھنے میں اُن کو اپنی صریح تباہی نظر آتی تھی۔ (۱۰)

قریش کی مخالفت کی بڑی اور بنیادی وجہ

قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے کہ قریش کے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کرنے میں جو خطرہ نظر آتا تھا وہ یہ تھا:

وَقَالُوْا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا۔ (القصص۔ ۵۷)

"وہ کہتے ہیں اگر ہم تمہارے ساتھ اس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے۔"

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قریش کے کفر و انکار کا سب سے اہم بنیادی سبب یہی تھا۔ اس بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ تاریخی طور پر اُس زمانے میں قریش کی پوزیشن کیا تھی جس پر ضرب پڑنے کا انہیں اندیشہ تھا۔

قریش کو ابتداءً جس چیز نے عرب میں اہمیت دی وہ یہ تھی کہ ان کا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ہونا انسابِ عرب کی رُو سے بالکل ثابت تھا اور اس بنا پر اُن کا خاندان عربوں کی نگاہ میں پیرزادوں کا خاندان تھا۔ پھر جب قصیّ بن کلاب کے حُسنِ تدبیر سے یہ لوگ کعبہ کے متولی ہو گئے اور مکہ ان کا مسکن بن گیا تو ان کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ ہو گئی۔ اس لیے کہ اب وہ عرب کے سب سے بڑے تیرتھ[1] کے مجاور تھے، تمام قبائلِ عرب میں ان کو مذہبی پیشوائی کا مقام حاصل تھا اور حج کی وجہ سے عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو اُن سے تعلقات نہ رکھتا ہو۔ اس مرکزی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر قریش نے بتدریج تجارتی ترقی شروع کی اور خوش قسمتی سے روم و ایران کی سیاسی کشمکش نے ان کو بین الاقوامی تجارت میں ایک اہم مقام عطا کر دیا۔ اس زمانے میں روم و یونان اور مصر و شام کی جتنی تجارت بھی چین، ہندوستان، انڈونیشیا اور مشرقی افریقہ کے ساتھ تھی اُس کے سارے ناکے ایران نے روک دیے تھے۔ آخری راستہ بحرِ احمر کا رہ گیا تھا۔ سو یمن پر ایران کے قبضہ نے اسے بھی روک دیا۔ اس کے بعد کوئی صورت اس تجارت کو جاری رکھنے کے لیے اس کے سوا نہیں رہ گئی تھی کہ عرب کے تاجر ایک طرف رومی مقبوضات کا مال بحرِ عرب اور خلیج فارس کے بندرگاہوں پر پہنچائیں اور دوسری طرف انہی بندرگاہوں سے مشرقی اموالِ تجارت لے کر رومی مقبوضات میں پہنچیں۔ اس صورتِ حال نے مکہ کو بین الاقوامی تجارت کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔ اُس وقت قریش ہی تھے جنہیں اس کاروبار کا اجارہ حاصل تھا لیکن عرب کی

[1] مراد یہ ہے کہ قریش نے اللہ کے مقدس گھر کو ایک بت خانے اور تیرتھ کی شکل دے رکھی تھی۔

طوائف الملوکی کے ماحول میں یہ تجارتی نقل و حرکت اِس کے بغیر نہ ہو سکتی تھی کہ تجارتی شاہراہیں جن قبائل کے علاقوں سے گزرتی تھیں ان کے ساتھ قریش کے گہرے تعلقات ہوں۔ سردارانِ قریش اِس غرض کے لیے صرف اپنے مذہبی اثر پر اکتفا نہ کر سکتے تھے۔ اِس کے لیے انہوں نے تمام قبائل کے ساتھ معاہدات کر رکھے تھے۔ تجارتی منافع میں سے بھی وہ اُن کو حصّہ دیتے تھے۔ شیوخِ قبائل اور با اثر سرداروں کو تحائف و ہدایا سے بھی خوش رکھتے تھے۔ اور سودی کاروبار کا بھی ایک جال انہوں نے پھیلا رکھا تھا جس میں قریب قریب تمام ہمسایہ قبائل کے تجّار اور سردار جکڑے ہوئے تھے۔

اِن حالات میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوتِ توحید اُٹھی تو دینِ آبائی کے تعصّب سے بھی بڑھ کر جو چیز قریش کے لیے اُس کے خلاف وجہِ اشتعال بنی وہ یہ تھی کہ اِس دعوت کی بدولت اُنہیں اپنا مفاد خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ معقول دلائل اور حجّتوں سے شرک و بُت پرستی غلط اور توحید صحیح بھی ہو تو اُس کو چھوڑنا اور اسے قبول کر لینا ہمارے لیے تباہ کُن ہے۔ ایسا کرتے ہی تمام عرب ہمارے خلاف بھڑک اُٹھے گا۔ ہمیں کعبہ کی تولیت سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ بُت پرست قبائل کے ساتھ ہمارے وہ تمام معاہدانہ تعلقات ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے ہمارے تجارتی قافلے رات دن عرب کے مختلف حصّوں سے گزرتے ہیں۔ اِس طرح یہ دین ہمارے مذہبی رسوخ و اثر کا بھی خاتمہ کر دے گا اور ہماری معاشی خوشحالی کا بھی۔ بلکہ بعید نہیں کہ تمام قبائلِ عرب ہمیں سرے سے مکّہ ہی چھوڑ دینے پر مجبور کر دیں۔

یہاں پہنچ کر دنیا پرستوں کی بے بصیرتی کا عجیب نقشہ انسان کے سامنے آتا ہے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بار بار انھیں یقین دلاتے تھے کہ یہ کلمہ جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اسے مان لو تو عرب و عجم تمہارے تابع ہو جائیں گے۔ مگر اُنہیں اِس میں اپنی موت نظر آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو دولت، اثر، رسُوخ ہمیں آج حاصل ہے یہ بھی اِس دعوت کو ماننے سے ختم ہو جائے گا۔ گویا کہ عرب و عجم ہمارے تابع ہوں۔ اُن کو اندیشہ تھا کہ یہ کلمہ قبول کرتے ہی ہم اِس سرزمین میں ایسے بے یار و مددگار ہو جائیں گے کہ چیل کوّے جس طرح گوشت لپک لے جاتے ہیں اُسی طرح ہم اِس سرزمین سے اُچک لیے جائیں گے اور ہمارا کہیں ٹھکانا نہ رہے گا۔ اُن کی کوتاہ نظری وہ وقت نہ دیکھ سکتی تھی جب چند ہی سال بعد تمام عرب محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے ماتحت ایک مرکزی سلطنت کا تابع فرمان ہونے والا تھا، پھر اُسی نسل کی زندگی میں ایران، عراق، شام، مصر، سب ایک ایک کر کے اِس سلطنت کے زیرِ نگیں ہو جانے والے تھے، اور اِس قول پر ایک صدی گزرنے سے بھی پہلے قریش ہی کے خلفاء سندھ سے لے کر اسپین تک اور قفقاز سے لے کر یمن کے سواحل تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصّے پر حکمرانی کرنے والے تھے۔

اُن کے اس عُذر پر قرآن کا جواب

قرآن مجید میں ان کے اس عُذر کا جو مفصل جواب اسی سُورۂ قصص میں دیا گیا ہے اسے دیکھیے کہ وہ کتنا اثر انگیز تھا۔ فرمایا:

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ـ (القصص۔ ۵۷)

"کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے ایک پُر امن حرم کو ان کے لیے ایک جائے قیام بنا دیا جس کی طرف ہر طرح کے ثمرات کھچے چلے آتے ہیں، ہماری طرف سے رزق کے طور پر؟ مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے عذر کا پہلا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حرم جس کے امن و امان اور جس کی مرکزیت کی بدولت آج تم اس قابل ہوئے ہو کہ دنیا بھر کا مالِ تجارت اس وادیٔ غیر ذی زرع میں چلا آ رہا ہے، کیا اس کو یہ امن اور یہ مرکزیت کا مقام تمہاری کسی تدبیر نے دیا ہے؟ ڈھائی ہزار برس پہلے چٹیل پہاڑوں کے درمیان اس بے آب و گیاہ وادی میں ایک اللہ کا بندہ اپنی بیوی اور ایک شیر خوار بچے کو لے کر آیا تھا۔ اس نے یہاں پتھروں پر پتھر رکھ کر ایک حُجرہ تعمیر کر دیا اور پُکار دیا کہ اللہ نے اسے حرم بنایا ہے آؤ اس گھر کی طرف اور اس کا طواف کرو۔ اب یہ اللہ کی دی ہوئی برکت نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ صدیوں سے یہ جگہ عرب کا مرکز بنی ہوئی ہے، سخت بدامنی کے ماحول میں ملک کا صرف یہی گوشہ ایسا ہے جہاں امن میسر ہے، اس کو عرب کا بچہ بچہ احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اور ہر سال ہزارہا انسان اس کے طواف کے لیے چلے آتے ہیں۔ اسی نعمت کا ثمرہ تو ہے کہ تم عرب کے سردار بنے ہوئے ہو اور دُنیا کی تجارت کا ایک بڑا حصہ تمہارے قبضے میں ہے۔ اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس خدا نے یہ نعمت تمہیں بخشی ہے، اس سے منحرف اور باغی ہو کر تو تم پھلو پھولو گے، مگر اس کے دین کی پیروی اختیار کرتے ہی برباد ہو جاؤ گے؟

پھر فرمایا:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۢ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۭ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ـ (القصص۔ ۵۸)

"اور کتنی ہی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے۔ سو دیکھ لو، وہ اُن کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں اُن کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے۔ آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔"

یہ اُن کے عذر کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مال و دولت اور خوشحالی پر تم اترائے پھرتے ہو اور جس کے کھوئے جانے کے خطرے سے تم باطل پر جمنا اور حق سے منہ موڑنا چاہتے ہو، یہی چیز کبھی عاد اور ثمود اور سبا اور مدین اور قوم لوط کے لوگوں کو بھی حاصل تھی۔ پھر کیا یہ چیز ان کو تباہی سے بچا سکی؟ آخر معیارِ زندگی کی بلندی ہی تو ایک مقصود نہیں ہے کہ آدمی حق و باطل سے بے نیاز ہو کر بس اُسی کے پیچھے پڑا رہے اور راہِ راست کو صرف اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دے کہ ایسا کرنے سے یہ گوہرِ مقصود ہاتھ سے جانے کا خطرہ ہے۔ کیا تمہارے پاس اس کی کوئی ضمانت ہے کہ جن گمراہیوں اور بدکاریوں نے پچھلی خوشحال قوموں کو تباہ کیا اُنہی پر اصرار کر کے تم بچے رہ جاؤ گے اور اُن کی طرح تمہاری شامت کبھی نہ آئے گی؟

آگے فرمایا:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۔ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۔ (القصص ۔۵۹)

"اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ اُن کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دے جو اُن کو ہماری آیات سناتے۔ اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے، جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہو جاتے۔"

یہ اُن کے عذر کا تیسرا جواب ہے۔ پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں ان کے لوگ ظالم ہو چکے تھے، مگر خدا نے ان کو تباہ کرنے سے پہلے اپنے رسول بھیج کر انہیں متنبّہ کیا، اور جب ان کی تنبیہ پر بھی وہ اپنی کج روی سے باز نہ آئے تو انہیں ہلاک کر دیا۔ یہی معاملہ اب تمہیں درپیش ہے۔ تم بھی ظالم ہو چکے ہو، اور ایک رسول تمہیں بھی متنبّہ کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ اب تم کفر و انکار کی روش اختیار کر کے اپنے عیش اور اپنی خوشحالی کو بچاؤ گے نہیں بلکہ اُلٹا خطرے میں ڈالو گے۔ جس تباہی کا تمہیں اندیشہ ہے وہ ایمان سے نہیں بلکہ انکار کرنے سے آئے گی۔

اس کے بعد ارشاد ہوا:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۔ (القصص آیت ۶۰-۶۱)

"تم لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی زندگی کا سامان اور اس کی زینت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ اس سے بہتر اور باقی تر ہے۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟ بھلا وہ شخص جس سے ہم نے اچھا وعدہ کیا ہو اور وہ اسے پانے والا ہو کبھی اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے

جسے ہم نے صرف حیاتِ دنیا کا سروسامان دے دیا ہو اور پھر وہ قیامت کے روز سزا کے لیے پیش کیا جانے والا ہو؟"

یہ ان کے عذر کا چوتھا جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے پہلے دو باتیں اچھی طرح ذہن نشین ہو جانی چاہییں۔

اوّل یہ کہ دُنیا کی موجودہ زندگی، جس کی مقدار کسی کے لیے بھی چند سالوں سے زیادہ نہیں ہوتی، محض ایک سفر کا عارضی مرحلہ ہے۔ اصل زندگی جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، آگے آنی ہے۔ موجودہ عارضی زندگی میں انسان خواہ کتنا ہی سروسامان جمع کر لے اور چند سال کیسے ہی عیش کے ساتھ بسر کر لے، بہرحال اسے ختم ہونا ہے اور یہاں کا سب سروسامان آدمی کو یونہی چھوڑ کر اٹھ جانا ہے۔ اس عیش کے مقابلے میں ایک عقل مند اس کو ترجیح دے گا کہ یہاں چند سال مصیبتیں بھگت لے، مگر یہاں سے وہ بھلائیاں کما کر لے جائے جو بعد کی دائمی زندگی میں اس کے لیے ہمیشگی کی موجب بنیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کا دین انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ وہ اِس دنیا کی متاعِ حیات سے استفادہ نہ کرے اور اس کی زینت کو خواہ مخواہ لات ہی مار دے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ دُنیا پر آخرت کو ترجیح دے، کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی، اور دنیا کا عیش کم تر ہے اور آخرت کا عیش بہتر۔ اس لیے دنیا کی وہ متاع اور زینت تو آدمی کو ضرور حاصل کرنی چاہیے جو آخرت کی باقی رہنے والی زندگی میں سُرخرو کرے، یا کم از کم یہ کہ اسے وہاں کے ابدی خسارے میں مبتلا نہ کرے۔ لیکن جہاں معاملہ مقابلے کا آپڑے، یعنی دُنیا کی کامیابی اور آخرت کی کامیابی ایک دوسرے کی ضد ہو جائیں، وہاں دینِ حق کا مطالبہ انسان سے یہ ہے، اور یہی عقلِ سلیم کا مطالبہ بھی ہے کہ آدمی دنیا کو آخرت پر قربان کر دے اور اِس دنیا کی عارضی متاع و زینت کی خاطر وہ راہ ہرگز اختیار نہ کرے جس سے ہمیشہ کے لیے اس کی عاقبت خراب ہوتی ہو۔

اِن دو باتوں کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ اللہ اوپر کے فقروں میں کفارِ مکہ سے کیا فرما رہا ہے۔ وہ یہ نہیں فرماتا کہ تم اپنی تجارت لپیٹ دو، اپنے کاروبار ختم کر دو، اور ہمارے پیغمبر کو مان کر فقیر ہو جاؤ۔ بلکہ وہ یہ فرماتا ہے کہ یہ دنیا کی دولت جس پر تم ریجھے ہوئے ہو، بہت تھوڑی دولت ہے اور بہت تھوڑے دنوں کے لیے تم اس کا فائدہ اِس حیاتِ دنیا میں اٹھا سکتے ہو۔ اس کے برعکس اللہ کے ہاں جو کچھ ہے وہ اس کی بہ نسبت کم و کیف (Quantity اور Quality) میں بھی بہتر ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا بھی ہے۔ اس لیے تم سخت حماقت کرو گے اگر اس عارضی زندگی کی محدود نعمتوں سے متمتع ہونے کی خاطر وہ روش اختیار کرو جس کا نتیجہ آخرت کے دائمی خسارے کی شکل میں تمہیں بھگتنا پڑے۔ تم خود مقابلہ کر کے دیکھ لو کہ کامیاب آیا وہ شخص ہے

جو محنت و جانفشانی کے ساتھ اپنے رب کی خدمت بجا لاتے اور پھر ہمیشہ کے لیے اس کے انعام سے سرفراز ہو، یا وہ شخص جو گرفتار ہو کر مجرم کی حیثیت سے خدا کی عدالت میں پیش کیا جانے والا ہو اور گرفتاری سے پہلے محض چند روز حرام کی دولت سے مزے لوٹ لینے کا اس کو موقع مل جائے؟

آخر میں فرمایا:

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ۔ (القصص ۶۲)

"اور (بھول نہ جائیں یہ لوگ) اُس دن کو جب کہ وہ ان کو پکارے گا، کہاں ہیں میرے وہ شریک جن کا تم گمان رکھتے تھے۔"

یہ تقریر بھی اسی چوتھے جواب کے سلسلے میں ہے، اور اس کا تعلق اُوپر کی آیت کے آخری فقرے سے ہے۔ اس میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ محض اپنے دنیوی مفاد کی خاطر شرک و بت پرستی اور انکارِ نبوت کی جس گمراہی پر یہ لوگ اصرار کر رہے ہیں، آخرت کی ابدی زندگی میں اس کا کیسا بُرا نتیجہ انہیں دیکھنا پڑے گا۔ اس سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ فرض کرو دنیا میں تم پر کوئی آفت نہ بھی آئے، اور یہاں کی مختصر سی زندگی میں تم حیاتِ دُنیا کی متاع و زینت سے خوب بہرہ اندوز بھی ہو لو، تب بھی اگر آخرت میں اس کا انجام یہی کچھ ہونا ہے تو خود سوچ لو کہ یہ نفع کا سودا ہے جو تم کر رہے ہو یا سراسر خسارے کا سودا؟ (۱۱)

فصل دوم

رسالتِ محمدی پر ایمان کی دعوت

دعوتِ اسلامی کا دوسرا اہم نکتہ یہ تھا کہ لوگ اللہ وحدہٗ لاشریک کو واحد معبود اور واحد حاکم و مقتدرِ اعلیٰ ماننے کے بعد یہ تسلیم کریں کہ رسول ہی وہ ایک مستند و معتبر پیغامبر ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ انسانوں کو ہدایت دیتا ہے، احکام دیتا ہے، عبادت کا صحیح طریقہ بتاتا ہے، صحیح عقائد کی تعلیم دیتا ہے، اخلاق اور اعمال کے صحیح اور غلط اصولوں اور طریقوں کی تمیز سکھاتا ہے، اور اپنے وہ قوانین بھیجتا ہے جن کی پیروی لوگوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں کرنی چاہیے۔ اس لیے اللہ کی توحید پر ایمان لانے کے بعد لوگوں کے لیے یہ لازم ہے

کہ وہ رسُول کی رسالت پر ایمان لائیں۔ اُس کو مرضیِ الٰہی کا واحد نمائندہ مانیں، سب کی پیروی چھوڑ کر اُس کی پیروی اختیار کریں، اور سب کی اطاعت ترک کر کے اُن احکام و ہدایات کی اطاعت کریں جو رسُول اپنے بھیجنے والے خدائے واحد کی طرف سے دے۔ اس طرح یہ رسالت کا عقیدہ اُس عظیم انقلاب کو عملی شکل دے رہا تھا جو اللہ کی توحید تسلیم کرا کے اسلام انسانی زندگی میں برپا کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ جب توحید کو مان کر انسان اِس بات کا قائل ہو جاتے کہ اب اُسے اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرنی ہے اور اُسی کی ہدایت پر چلنا ہے، تو فوراً ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے اِس عقیدے کو عمل میں کیسے لاتے؟ کس ذریعہ سے اس کو یہ معلوم ہو کہ اللہ کی بندگی و عبادت کا صحیح طریقہ کیا ہے اور اُس کی وہ ہدایت کیا ہے جس کی اب اُسے پیروی کرنی چاہیے؟ قرآن نے بتایا کہ وہ ذریعہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو اپنا رسُول بنا کر اُس کو اُن چیزوں کا علم دیتا ہے جن پر عمل کرنا اُس کی مرضی کے مطابق ہے، اور اُس کی بندگی بجا لانے کے لیے کوئی عملی صورت اِس کے سوا نہیں ہے کہ رسُول کی رسالت مان کر اُس کی پیروی و اطاعت کی جائے۔ یوں تمام مختلف عقائد و افکار، اوہام و تخیلات، مذاہب و ادیان، رسُوم و قوانین، اور ارباب متفرقین کی پیروی و اطاعت میں بٹی ہوئی انسانیت ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہے اور وہ دین عملاً قائم ہو جاتا ہے جس پر نوعِ انسانی کو مجتمع کرنا اسلام کی دعوت کا مقصود ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن مجید کی تعلیمات کو حسبِ ذیل ترتیب کے ساتھ اگر دیکھا جائے تو بات پُوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

اِبتدائے آفرینش میں انبیاءؑ کی بعثت کا اعلان

نبوّت کے متعلق پہلی بات جو قرآن میں بتائی گئی وہ یہ تھی کہ زمین پر نوعِ انسانی کے آغاز ہی کے وقت اولادِ آدمؑ کو خبردار کر دیا گیا تھا کہ رسُولوں کے ذریعہ سے جو ہدایت اُن کو بھیجی جائے گی اُس کی پیروی اُنہیں کرنی ہو گی:

يٰبَنِىٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِىْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ - وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ - (الاعراف: ۳۵-۳۶)

"اے بنی آدم، اگر تمہارے پاس خود تمہی میں سے (یعنی انسانوں میں سے) ایسے رسُول آئیں جو تمہیں میری آیات سُنا رہے ہوں، تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنے رویّے کی اصلاح کرے گا اس کے لیے خوف اور رنج کا کوئی موقع نہیں ہے۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو جُھٹلائیں گے اور ان کے

مقابلے میں سرکشی برتیں گے وہی اہلِ دوزخ ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

رسولوں کو ماننے یا نہ ماننے پر انسان کی فلاح و خسران کا انحصار

یہی بات سورۂ بقرہ آیات ۳۸ - ۳۹ اور سورۂ طٰہٰ آیات ۱۲۳-۱۲۴ میں بیان کی گئی جہاں زمین پر آدم و حوا علیہما السلام کے اتارے جانے کا ذکر آیا ہے۔ اس میں صرف یہی خبر نہیں دی گئی تھی کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے رسول بھیجے جائیں گے بلکہ یہ بھی متنبّہ کر دیا گیا تھا کہ ان کی فلاح و خسران کا انحصار اسی بات پر ہوگا کہ وہ رسولوں کی ہدایت کو قبول کر کے تقویٰ اور صلاح کی راہ اختیار کرتے ہیں یا نہیں۔ نہ کریں گے تو دنیا میں بھی سزا پائیں گے اور جہنم کا عذاب بھی مول لیں گے۔ چنانچہ جگہ جگہ دنیا میں قوموں پر عذاب آنے کی وجہ یہی بیان کی گئی کہ انہوں نے اپنے ہاں آنے والے رسولوں کی بات ماننے سے انکار کیا تھا۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا:

أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَمَا كَانَ لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِن وَاقٍ ۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۔ (المؤمن: ۲۱-۲۲)

"اور کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اُن لوگوں کا انجام انہیں نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں؟ وہ اِن سے (یعنی قریش سے) زیادہ طاقت ور تھے اور ان سے زیادہ زبردست آثار زمین میں چھوڑ گئے۔ پھر اللہ نے اُن کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور ان کو اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ یہ اُن کا انجام اس لیے ہوا کہ ان کے پاس رسول بیّنات[1] لے کر آتے تھے مگر انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر کار اللہ نے انہیں پکڑ لیا۔ یقیناً وہ بڑی قوت والا اور سزا دینے میں بہت سخت ہے۔"

قریب قریب یہی بات سورۂ فاطر آیات ۲۵-۲۶ اور سورۂ تغابن آیات ۵-۶ میں بیان کی گئی ہے، اور قرآن اُن قوموں کے قصّوں سے بھرا ہوا ہے جنہوں نے اپنے اپنے عہد کے رسولوں کی تکذیب کی اور آخر کار

---

[1] بیّنات سے مراد تین چیزیں ہیں (۱) ایسی نمایاں علامات اور نشانیاں جو ان کے مامور من اللہ ہونے پر شاہد تھیں (۲) ایسی روشن دلیلیں جو ان کی پیش کردہ تعلیمات کے حق ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں (۳) زندگی کے مسائل و معاملات کے متعلق ایسی واضح ہدایات جنہیں دیکھ کر ہر معقول آدمی یہ جان سکتا تھا کہ ایسی پاکیزہ تعلیم کوئی جھوٹا خود غرض آدمی نہیں دے سکتا۔ (حاشیہ از مؤلف)

دنیا ہی میں اُن پر عذاب آ گیا۔

پھر آخرت کے متعلق بتایا گیا کہ وہاں انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت بس اس بنیاد پر قائم ہو گی کہ تمہارے پاس رسول بھیج کر تمہیں حق اور باطل کا فرق، اور سیدھا راستہ صاف صاف بتا دیا گیا تھا، اِس کے باوجود تم نے اُن کو نہ مانا اور ان کی اطاعت نہ کی، اس لیے اب تم عذابِ جہنم کے مستحق ہو۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَّالنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ..... رُّسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى ٱللَّهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ ٱلرُّسُلِ (النساء:۱۶۳، ۱۶۵)

"اے محمدؐ، ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اُس کے بعد آنے والے نبیوں کی طرف بھیجی تھی..... یہ سب رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ اُن کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے۔"

یعنی ان سب پیغمبروں کا کام یہ تھا کہ جو لوگ ان کی لائی ہوئی تعلیم پر ایمان لا کر اپنے طرزِ فکر و عمل کو اس کے مطابق درست کر لیں، ان کو فلاح و سعادت کی خوشخبری سُنا دیں، اور جو نہ ایمان لائیں نہ فکر و عمل کی غلط راہوں پر چلنا چھوڑیں اُن کو انجامِ بد سے ڈرا دیں۔ اور ان سب پیغمبروں کو بھیجنے کی غرض یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے راہِ حق صاف صاف بتا کر نوعِ انسانی پر حجت تمام کر دینا چاہتا تھا تاکہ آخرت کی عدالت میں کوئی کافر و مجرم یہ عذر نہ پیش کر سکے کہ ہم کو حقیقت بتانے کا تو کوئی انتظام کیا نہیں گیا اور اب ہم بے خبری میں پکڑے جا رہے ہیں۔

آخرت کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں خبردار کر دیا گیا کہ منکرین اور مخالفینِ رسالت کے تمام اعمال (جن کو وہ اپنے نزدیک نیک سمجھ کر کرتے رہے) وہاں ضائع ہو جائیں گے اور جب ان لوگوں کو جہنم میں داخل کیا جائے گا تو ان سے کہا جائے گا کہ تم پر رسولوں کے ذریعہ سے حجت تمام ہو چکی تھی، اس لیے اب جو سزا تم بھگت رہے ہو اس کے تم فی الواقع مستحق ہو۔

إِنَّ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ وَصَدُّوا۟ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ وَشَآقُّوا۟ ٱلرَّسُولَ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ ٱلْهُدَىٰ لَن يَضُرُّوا۟ ٱللَّهَ شَيْـًٔا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَٰلَهُمْ۔ (محمد-۳۲)

جن لوگوں نے ماننے سے انکار کیا[1] اور اللہ کی راہ سے روکا[2] اور رسول سے جھگڑا کیا جبکہ

---

[1] یعنی رسول کو اور اس کی لائی ہوئی تعلیم کو ماننے سے انکار کیا۔ (حاشیہ از مؤلف) [2] اصل میں صَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللهِ کے

راہِ راست اُن پر واضح ہو چکی تھی، وہ اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ ہی ان کا سب کیا کرایا غارت کر دے گا۔"

اِس موقع پر اللہ تعالیٰ اُن سے پُوچھے گا:

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۔ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ (الانعام: ۱۳۰-۱۳۱)۔

"اے گروہِ جن و انس، کیا تمہارے پاس خود تم ہی میں سے وہ رسُول نہ آتے تھے جو تم کو میری آیات سُناتے تھے اور اِس دن کے انجام سے ڈراتے تھے؟ وہ کہیں گے کہ "ہم اپنے خلاف خود شہادت دیتے ہیں"۔ دُنیا کی زندگی نے اُن کو دھوکے میں ڈال رکھا تھا (مگر آخرت میں) وہ اپنے اُوپر خود گواہی دیں گے کہ وہ کافر ہیں۔ (یہ شہادت ان سے اس لیے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ) تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جبکہ اُن کے بسنے والے (حق سے) بے خبر ہوں۔"

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۔ قَالُوْا بَلٰي قَدْ جَاۗءَنَا نَذِيْرٌ ڶ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ښ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۔ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۔ فَاعْتَرَفُوْا

الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ صَدّ کا لفظ عربی زبان میں لازم اور متعدّی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اِس لیے اِن الفاظ کے معنی یہ بھی ہیں کہ خود اللہ کا راستہ اختیار کرنے سے باز رہے۔ اور یہ معنی بھی ہیں کہ انھوں نے دوسروں کو اس راہ پر آنے سے روکا۔ روکنے کی بھی کئی صُورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زبردستی کسی کو ایمان لانے سے روک دے۔ دوسرے یہ کہ ایمان لانے والوں پر ایسا ظلم و ستم ڈھائے کہ ان کا ایمان پر قائم رہنا اور دوسروں کا ایسے خوفناک حالات میں ایمان لانا مشکل ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے دین اور اس کے پیش کرنے والے رسُول کے خلاف لوگوں کو بہکائے اور ایسے وسوسے دلوں میں ڈالے کہ لوگ بدگمان ہو کر خدا کے راستے پر آنے سے رُک جائیں۔ اِس کے علاوہ ہر کافر معاشرہ خدا کے راستے میں ایک سنگِ گراں ہے کیونکہ وہ اپنی تعلیم و تربیت، اپنے اجتماعی نظام، اپنے رسم و رواج اور اپنے تعصّبات سے دینِ حق کے پھیلنے میں شدید رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ (حاشیہ از مرتّب)

بِذَنۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (الملک ۸ تا ۱۱)

"جب بھی کوئی انبوہ جہنم میں ڈالا جائے گا اُس کے کارندے اُن لوگوں سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی نذیر (خبردار کرنے والا) نہیں آیا تھا؟ [1] وہ جواب دیں گے "ہاں نذیر آیا تھا مگر ہم نے اُسے جھٹلایا اور کہا اللہ نے کچھ نازل نہیں کیا ہے اور تم بڑی گمراہی میں مبتلا ہو" پھر وہ کہیں گے "کاش ہم سُنتے یا عقل سے کام لیتے تو آج اِس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں شامل نہ ہوتے" اِس طرح وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے لعنت ہے ان دوزخیوں پر۔

اِسی سے ملتا جلتا مضمون سُورۃ زُمر آیات ۷۱-۷۲ میں بیان ہُوا ہے۔ اِس سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام میں رسالت کی اہمیت اتنی بڑی ہے کہ اسی کے ماننے یا نہ ماننے پر دُنیا سے آخرت تک انسان کی نیک بختی یا بدبختی کا دارومدار ہے۔

تمام قوموں میں انبیاء آئے اور سب کی دعوت ایک ہی تھی

قرآن میں یہ بھی بتایا گیا کہ آغازِ آفرینش سے تمام قوموں میں انبیاء آتے رہے ہیں۔ اُن سب کا دین ایک تھا، سب کی دعوت بھی ایک تھی، سب کی بعثت کا مقصد بھی ایک تھا، اور اُن سب کا مطالبہ یہ تھا کہ لوگ اللہ کی نافرمانی سے بچیں اور اُن کی اطاعت کریں۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر-۲۴)

"کوئی اُمّت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔"

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (الرعد-۷)

"ہر قوم کے لیے ایک ہادی تھا۔"

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ (الشعراء-۲۰۸)۔

"ہم نے کوئی بستی ایسی ہلاک نہیں کی جس میں خبردار کرنے والے نہ آئے ہوں۔"

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

---

[1] اس سوال کی نوعیت یہ نہ ہوگی کہ جہنم کے کارندے اُن سے یہ پوچھنا چاہتے ہوں کہ تمہارے پاس کوئی نذیر آیا تھا یا نہیں بلکہ اس سے مقصود ان کو اس بات کا قائل کرنا ہوگا کہ انہیں جہنم میں ڈال کر اُن سے بے انصافی نہیں کی جا رہی ہے، اِس لیے وہ خود اُن کی زبان سے یہ اقرار کرانا چاہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بے خبر نہیں رکھا تھا، ان کے پاس انبیاء بھیجے گئے تھے مگر انھوں نے اُن کی بات نہ مانی اس لیے جو سزا انہیں دی جا رہی ہے اس کے وہ مستحق ہیں۔ (حاشیہ از مرتب)

(النحل: ۳۶)

"اور ہم نے ہر اُمّت میں ایک رسُول (یہ دعوت دینے کے لیے) بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک قرآن مجید میں نبی پر نبی کا نام لے کر بیان کیا گیا کہ ہر ایک نے اپنی قوم سے یہی کہا کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ "اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو" (ملاحظہ ہو آل عمران: ۵۰۔ الشعراء: ۱۰۸۔ ۱۱۰۔ ۱۲۶۔ ۱۳۱۔ ۱۴۴۔ ۱۵۰۔ ۱۶۳۔ ۱۷۹۔ الزخرف: ۶۳۔ نوحؑ: ۳)۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد

پھر بتایا گیا کہ سب انبیاء کی بعثت کا مقصد یہ تھا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۔ (الحدید ۔ ۲۵)

"ہم نے اپنے رسُولوں کو بیّنات کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان (معیارِ حق و باطل) نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔"

"انصاف پر قائم ہوں" یعنی اپنے ساتھ انصاف، اپنے خدا کے ساتھ انصاف، ہر اُس انسان کے ساتھ انصاف جس سے اُن کا معاملہ پیش آئے، اپنے معاشرے میں انصاف، اپنے بین دین میں انصاف، اپنی تہذیب و تمدّن میں انصاف، اپنی سیاست و حکومت میں انصاف، اپنی عدالت میں انصاف، اپنے بین الاقوامی تعلقات میں انصاف، غرض انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے زندگی کے ہر شعبے اور پہلو میں انصاف کا قیام اُن سب کی بعثت کا مقصد تھا۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت

نبوّت و رسالت کی تاریخ اور اُس کی حقیقت کے اِس پس منظر میں پہلے قریش کو، پھر اہلِ عرب کو، پھر ساری دُنیا کو یہ بتایا گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اُنہی رسُولوں میں سے ہیں جو پہلے بھیجے جاتے رہے ہیں، وہی دین لے کر آئے ہیں جو ابتدائے آفرینش سے تمام رسُولوں کا دین تھا، اُسی دین کو تمام آمیزشوں اور آلائشوں سے پاک کر کے اُس کی اصل خالص صورت میں پیش کرنے کے لیے آئے ہیں، اور اب خدا کا دین، اُس کی شریعت، اُس کا قانون، اُس کا حکم وہ ہے جو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خدا کی بھیجی ہوئی وحی کی بنا پر آپؐ پیش کر رہے ہیں۔ آپؐ کی اطاعت خدا کی اطاعت اور آپؐ کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔ لہٰذا لوگوں کو محض اِس بات پر ہی ایمان نہیں لانا چاہیے کہ آپؐ خدا کے رسُول ہیں، بلکہ ایمان لانے کے بعد ہر ایک کی اطاعت

و پیروی چھوڑ کر بے چون و چرا آپ کی اطاعت و پیروی ہی کرنی چاہیے، کیونکہ آپ کی ہدایت سے انحراف عین اُس خدا کی اطاعت سے انحراف ہے جس نے آپؐ کو رسُول بنا کر بھیجا ہے۔

حضُورؐ کی بعثت سے پہلے اہلِ عرب خود ایک نبی مانگ رہے تھے

قبل اس کے کہ اُوپر کے بیانات کی تفصیل پیش کی جائے، یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اہلِ عرب اپنے گردوپیش کے عیسائیوں اور یہودیوں اور دوسرے ادیانِ سابقہ کے پیرووں کی گری ہُوئی اخلاقی حالت اور اُن کی بدکرداریاں دیکھ دیکھ کر خود یہ کہتے تھے کہ اگر ہمارے پاس وہ چیز آئی ہوتی جو اِن قوموں کے پاس آئی تھی (یعنی رسالت اور خدا کی بھیجی ہُوئی ہدایت)، تو ہم اِن سب سے بہتر اُمت بن کر دکھا دیتے۔ یہ بات قرآن مجید میں ڈنکے کی چوٹ کہی گئی ہے اور منکرین میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو اِس امرِ واقعہ کا انکار کرتا:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝ اِسْتِكْبَارًا فِى الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر: ۴۲-۴۳)

"یہ لوگ (یعنی قریش اور اہلِ عرب) کڑی کڑی قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی خبردار کرنے والا (یعنی رسُول) اِن کے ہاں آگیا ہوتا تو یہ دُنیا کی ہر دوسری قوم سے زیادہ راست رو ہوتے۔ مگر جب خبردار کرنے والا ان کے ہاں آگیا تو دُاس کی آمد نے، اِن کے اندر حق سے فرار کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہ کیا۔ یہ زمین میں اور زیادہ استکبار کرنے لگے اور بُری بُری چالیں (اُس کو زک دینے کے لیے) چلنے لگے، حالانکہ بُری چالیں اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں۔"

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۝ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الصّٰفّٰت: ۱۶۷ تا ۱۷۰)۔

"یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس وہ "ذکر" (اللہ کا پیغامِ نصیحت) ہوتا جو پچھلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے چیدہ بندے ہوتے (مگر جب وہ آگیا) تو انہوں نے اس کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اب عنقریب انہیں اس کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔"

اس سے معلوم ہُوا کہ رسُول کی آمد اُن کی مُنہ مانگی مراد تھی، مگر جب وہ نعمت میسّر آگئی تو وہ مخالفت، ضد اور ہٹ دھرمی پر اُتر آئے۔

حضُورؐ انبیاءؑ میں سے ہیں اور آپؐ کا ذریعہ علم وہی وحی ہے جو تمام انبیاءؑ کا تھا

اِن حقائق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ حضُورؐ کی رسالت کا تعارف قرآن نے کس طرح کرایا اور آپؐ کی کیا

حیثیت پیش کی۔

يٰسٓ، وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ، اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ
(یٰسٓ: ۱تا۴)

"قرآنِ حکیم کی قسم، اے محمدؐ تم یقیناً رسُولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو۔"
یعنی تم رسُولوں میں سے ہو اور تمہاری رسالت کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ یہ حکمت سے لبریز قرآن تم پیش کر رہے ہو۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا۔ (الشوریٰ: ۷)

"اور اسی طرح ہم نے (اے محمدؐ) یہ قرآنِ عربی تمہاری طرف وحی کیا ہے تاکہ تم بستیوں کے مرکز (مکّہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو۔"

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ (الفرقان۔۱)

"بڑی برکت والا ہے وہ جس نے یہ فرقان (حق و باطل کا فرق بتانے والا کلام) اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ دُنیا جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والا ہو۔"

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الاعراف۔ ۱۵۸)

"اے محمدؐ، کہہ دو کہ اے انسانو، میں تم سب کی طرف اُس خدا کا بھیجا ہُوا رسُول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے۔"

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ، وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ، وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (النساء۔۱۶۳)

"اے محمدؐ، ہم نے تمہاری طرف اُسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوحؑ اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی۔ ہم نے ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ، عیسیٰؑ، ایوبؑ، یُونسؑ، ہارونؑ اور سُلیمانؑ کی طرف وحی بھیجی اور ہم نے داؤدؑ کو زبُور دی۔"

آپؐ کی بعثت کے مقاصد

اگرچہ آپؐ کی بعثت کا مقصد وہی تھا جو تمام انبیاء کی بعثت کا مقصد ہم اِس سے پہلے سورۂ حدید، آیت ۲۵ کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں۔ مگر قرآن مجید میں خصوصیت کے ساتھ آپؐ کو رسُول مقرر کرنے کے

مقاصد پوری وضاحت کے ساتھ قریش اور اہلِ عرب کے سامنے بیان کیے گئے جن کو ہم سلسلہ وار نقل کرتے ہیں:

آپؐ کی نبوت ابدی اور عالمگیر ہے

آپؐ کسی ایک قوم کے لیے نہیں اور اپنے زمانے کے تمام انسانوں کے لیے بھی نہیں بلکہ قیامت تک ان سب لوگوں کے لیے رسول ہیں جن تک آپ کا پیغام پہنچے:

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۔ (الانعام: ۱۹)

"اور یہ قرآن میری طرف اس لیے بذریعۂ وحی بھیجا گیا ہے کہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے اُسے خبردار کر دوں۔"

آپؐ تمام تحریفات سے پاک خالص دین پیش کرنے والے ہیں

آپؐ اپنے سے پہلے آتے ہوئے انبیاء کی لائی ہوئی تعلیمات کی تردید نہیں بلکہ ان کی تصدیق کرنے والے ہیں، اور آپؐ کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ پچھلے انبیاء کی تعلیمات میں جو آمیزشیں بعد کے زمانوں میں کر دی گئی تھیں اُن سب کو چھانٹ کر اُس اصل دین کو اپنی خالص صورت میں پیش کر دیں جو ابتدائے آفرینش سے نوعِ انسانی کے لیے خدا کا مقرر کردہ ایک ہی دینِ حق تھا۔

یہ بات کہ آپؐ پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تردید کرنے والے نہیں بلکہ تصدیق کرنے والے ہیں، قرآن میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ ‎(الصّٰفّٰت - ۳۷)

"بلکہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) حق لے کر آئے اور انہوں نے (خدا کے بھیجے ہوئے تمام) رسولوں کی تصدیق کی۔"

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ‎(یونس - ۳۷)

"اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو خدا (کی وحی) کے بغیر خود گھڑ لی جائے۔ بلکہ یہ تو جو کچھ اِس سے پہلے آیا ہوا تھا اُس کی تصدیق اور الکتاب (یعنی خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہر کتاب) کی تفصیل ہے۔ اِس کے ربّ العٰلمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شک نہیں۔"

* کتاب کی تفصیل سے مراد یہ ہے کہ تمام وہ اصولی تعلیمات و ہدایات جو خدا کی کتابوں میں پہلے آئی تھیں ان سب کا لبِّ لباب اِس کتاب میں آگیا ہے، بلکہ اِس میں اُن کو زیادہ مفصّل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات بھی قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان کی گئی کہ پچھلی کتابوں کے جو لوگ وارث ہوئے تھے انھوں نے اپنی

طرف سے اُن میں بہت سی باتیں تبدیل یا داخل کر دی تھیں، اس لیے حضورؐ کا یہ کام بھی ہے کہ ان کو الگ کر کے خدا کی شریعت میں جو اصل حرام ہے اسے حرام اور جو اصل حلال ہے اُسے حلال کریں:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (البقرہ - ۷۹)

"پس ہلاکت اور تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو خود اپنے ہاتھوں سے ایک کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے"

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ - (آل عمران - ۷۸)

"ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا اُلٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی اور وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں"

اِس بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ تمام آمیزشوں سے پاک، خالص دینِ حق کی تعلیم پیش کریں، اور جو کچھ اُس میں حرام ہے اُسی کو حرام اور جو کچھ اُس میں حلال ہے اُسی کو حلال قرار دیں۔

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ - رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ - (البینہ: ۱-۳)

"اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے وہ (اپنے کفر سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ اُن کے پاس دلیلِ روشن نہ آجاتی (یعنی) اللہ کی طرف سے ایک ایسا رسول جو (تمام آمیزشوں سے) پاک صحیفے پڑھ کر سناتے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں"

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ - (الاعراف - ۱۵۷)

"(یہ رسول نبیِّ اُمّی) اُن کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے منع کرتا ہے۔ اُن کے لیے پاک

چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے (یعنی اُن کے بطورِ خود ٹھیرائے ہُوئے حلال و حرام کو منسوخ کرتا ہے) اور اُن پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے اور وہ بندشیں کھولتا ہے (جو اُن کے فقیہوں اور مذہبی پیشواؤں کی موشگافیوں اور اُن کے جاہل عوام کے رسوم اور توہمات کی بدولت) اُن پر مسلط تھے۔"

احکامِ الٰہی کی قولاً و عملاً تشریح اور تزکیۂ نفوس

آپ کے سپرد صرف یہی کام نہیں کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ جو علم آپ کو دیا جائے اُسے لوگوں تک پہنچا دیں بلکہ یہ کام بھی کیا گیا ہے کہ خود اللہ ہی کی طرف سے اُن احکام کا جو مطلب آپ کو بتا یا جائے اس کے مطابق اپنے قول اور عمل سے دین کے عقائد، احکام، ہدایات اور قوانین کی توضیح کریں اور اُسی کے مطابق لوگوں کی تعلیم و تربیت کرکے اُن کی بگڑی ہوئی زندگی کو سنواریں:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (القیامۃ: ۱۷ تا ۱۹)

"اِس قرآن کو تمہیں یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے لہٰذا، اے نبیؐ، جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو تم اس کی قرأت کو سُنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمّہ ہے۔"

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل-۴۴)

"اور اے نبیؐ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے سامنے اُس تعلیم کی توضیح کرتے جاؤ جو اُن کے لیے نازل کی گئی ہے[1]۔"

---

[1] یہ ارشاد فرما کر اللہ تعالیٰ نے وہ حکمت بیان کردی جس کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ "ذکر" کے ساتھ ایک انسان کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ ذکر تو فرشتوں کے ذریعہ سے بھیجا جا سکتا تھا اور براہِ راست چھاپ کر ہر انسان تک اسے پہنچا دینا بھی اللہ کی قدرت سے دُور نہ تھا۔ مگر اس سے اصل مقصد پُورا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ ضروری تھا کہ ایک قابل ترین انسان اسے لے کر آئے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئے اُنہیں اُس کا پُورا مطلب سمجھائے جنہیں کچھ شک ہو اُن کا شک رفع کرے۔ جنہیں کوئی اعتراض ہو اُن کے اعتراض کا جواب دے۔ جو نہ مانیں اور مخالفت و مزاحمت کریں ان کے مقابلے میں وہ رویّہ برت کر دکھائے جو اِس ذکر کے لانے والے کے شایانِ شان ہو اور جو مان لیں اُنہیں زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے، ان کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے اور اُن کو تربیت دے کر ساری دنیا کے سامنے ایک ایسا مثالی معاشرہ بنا کر دکھا دے جس کا اجتماعی نظام اس "ذکر" کے منشا کی شرح ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (الجمعہ ۲)

" وہ اللہ ہی ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسُول خود انہی میں سے اُٹھایا جو انہیں اس کی آیات سُناتا ہے، اُن کی زندگی سنوارتا ہے۔ اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالانکہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے "

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (الحدید: ۹)

" وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلّم) پر صاف صاف آیات نازل کرتا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لائے "

دینِ حق کو پُورے نظامِ زندگی پر غالب کر دینا

آپؐ کی بعثت کا آخری مقصد اُس دین و ہدایت کو تمام اقسام کی اطاعتوں اور زندگی کے تمام طریقوں پر غالب کر دینا ہے جسے آپؐ خدا کی طرف سے لائے ہیں۔ اِس مقصد کی صراحت قرآن میں تین مقامات پر کی گئی۔ سُورۂ توبہ اور الصّف میں فرمایا: وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ وہ اُسے پُوری جنسِ دین پر غالب کر دے[1]۔ خواہ مُشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو "

---

[1] آیت میں اَلدِّین کا لفظ استعمال ہُوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے "جنسِ دین" کیا ہے۔ دین کا لفظ عربی زبان میں اُس نظامِ زندگی یا طریقِ زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سَنَد اور مُطاع تسلیم کر کے اُس کا اِتّباع کیا جائے۔ پس بعثتِ رسول کی غرض اِس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دینِ حق کو خدا کی طرف سے اُس کا رسُول لے کر آیا ہے اُسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسُول کی بعثت کبھی اِس غرض کے لیے نہیں ہُوئی ہے کہ جو نظامِ زندگی اللہ کے سوا دوسروں کو سَند اور مُطاع مان کر چل رہا ہو، رسُول کا لایا ہُوا دین اُس کا تابع اور مغلوب بن کر اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے، بلکہ رسُول تو بادشاہِ ارض و سما کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظامِ حق کو سب طریقوں اور نظاموں پر غالب کرنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظامِ زندگی دنیا میں رہے بھی تو اُسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیہ ادا کرنے کی صورت میں ذمّیوں کا نظامِ زندگی رہتا ہے۔ (حاشیہ از مترجم)

(التوبہ: آیت ۳۳ الصف آیت ۹) یہی مضمون سُورۂ فتح میں بیان کرکے فرمایا گیا ہے "اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے" (آیت ۲۸)۔

حضورؐ پر ایمان اور آپؐ کی اطاعت کا حکم

انہی مقاصد کے عین مطابق لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ آپؐ پر ایمان لائیں، آپؐ کی پیروی کریں، آپؐ کی اطاعت کریں اور ایسے سب لوگوں کی اطاعت چھوڑ دیں جو اللہ سے غافل اور حدِ بندگی سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

(التغابن: ۸)۔

"پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسُول پر اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے"۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (الاعراف۔۱۵۸)

"پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے بھیجے ہُوئے نبیِ اُمّی پر جو اللہ اور اس کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہے اور پیروی اختیار کرو اُس کی تاکہ تمہیں راہِ راست مل جائے"۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ (الاعراف۔۳)

"پیروی کرو اُس ہدایت کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے بھیجی گئی ہے اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو"۔

لے یعنی تم کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو علم تمہیں درکار ہے، اور اپنے مذہب، اخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدّن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصُولوں کے تم محتاج ہو اُن سب کے لیے تمہیں صرف اُس ہدایت کی پیروی کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسُول کے ذریعہ سے بھیجی ہے۔ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا اور اپنے آپ کو اُس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریق کار ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔ یہاں "اولیاء" (سرپرستوں) کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے اُسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے۔ (حاشیہ از مولف)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء۔۶۴)

"ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اُس کی اطاعت کی جائے"[1]

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (النساء۔۸۰)

"جو رسول کی اطاعت کرے اس نے دراصل اللہ کی اطاعت کی۔"

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر۔۷)۔

"جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روک دے اس سے رک جاؤ۔"

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (النور: ۵۲)

"اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اور اللہ سے ڈرے اور اُس کی نافرمانی سے بچے، ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔"

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۔ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (الاحزاب ۳۶)۔

"کسی ایمان لانے والے مرد یا کسی ایمان لانے والی عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ سریح گمراہی میں پڑ گیا۔"

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف: ۲۸)۔

"اور کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور

---

[1] یعنی خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اُس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف اُنہی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہ نہ کیا تو پھر اُس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ (حاشیہ از مؤلف)

جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کی اور جس کا طریقِ کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔"

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (الشعراء: ۱۵۱-۱۵۲)۔

"اور اُن بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے"

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۔

(آل عمران: ۳۲)

"اے نبیؐ، کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ (اس بات کو قبول کرنے سے) منہ موڑیں تو اللہ ایسے کافروں کو پسند نہیں کرتا۔"

اب قانون وہ ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دیا ہے

اسی طرح حضورؐ کی رسالت کے اعلان اور آپؐ کی اطاعت و پیروی کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ اب خدا کا قانون وہ ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دیا گیا ہے۔ کسی کو اس میں آپ سے نزاع کا حق نہیں ہے۔ اُس کے خلاف جو کچھ ہے جاہلیت اور طاغوت کی بندگی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے مقرر کردہ حاکم ہیں جن کا کام یہ ہے کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق کریں۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

(الجاثیہ - ۱۸)

"پھر (بنی اسرائیل کے بعد) اے نبیؐ، ہم نے تم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کر دیا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور اُن لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔"

لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ۗ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ

؎ یعنی اپنے اُن اُمراء و رؤسا اور ان رہنماؤں اور حاکموں کی اطاعت چھوڑ دو جن کی قیادت میں تمہارا یہ فاسد نظامِ زندگی چل رہا ہے۔ یہ حد سے گزرے ہوئے لوگ ہیں۔ اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شترِ بے مہار بن چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں سے کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ یہ جس نظام کو چلائیں گے اس میں بگاڑ ہی پھیلے گا۔ تمہارے لیے فلاح کی کوئی صورت اگر ہے تو صرف یہ کہ اپنے اندر خدا ترسی پیدا کرو اور مفسدوں کی اطاعت چھوڑ کر اللہ کے نبی کی اطاعت کرو۔ (حاشیہ از مؤلف)

إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ۔ (الحج - ۶۷)

" ہر اُمّت کے لیے ہم نے ایک طریقِ عبادت (یا طریقِ بندگی) مقرر کیا ہے جس کی وہ پیروی کرتی ہے پس اے محمدؐ! اس معاملہ میں وہ تم سے جھگڑا نہ کریں[1]۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو۔"

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ الْكِتَٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ اللَّهُ ۔ (النساء - ۱۰۵)

" اے نبیؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو (راہِ راست) اللہ نے تم کو دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔"

قرآن مجید میں جگہ جگہ انسانی معاشرے کے لیے جو قواعد بیان کیے گئے اُن کے لیے " حدود اللہ" کے الفاظ استعمال فرمائے گئے یعنی یہ وہ حدیں ہیں جن کے اندر رہنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ پھر کہیں سختی کے ساتھ متنبّہ کیا گیا کہ ان سرحدوں کے قریب نہ پھٹکنا، کہیں فرمایا گیا کہ ان سے تجاوز کرنے والے ظالم ہیں، کہیں ارشاد ہوا کہ ان سے تجاوز کرنے والے اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں، اور کہیں خبردار کیا گیا کہ تجاوز کرنے والوں کے لیے نارِ جہنم یا عذابِ الیم ہے۔ (ملاحظہ ہو البقرہ، آیات ۱۸۷ - ۲۲۹ - ۲۳۰ - النساء ۱۳ - ۱۴ - المجادلہ ۴ - الطلاق - ۱ التوبہ ۹۷)

اس سے معلوم ہوگیا کہ اُس قانون کی اہمیت کیا ہے جو حضورؐ کے ذریعہ سے انسانوں کو دیا گیا ہے اور پھر صاف صاف خبردار کر دیا گیا کہ :

أَفَحُكْمَ الْجَٰهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۔ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ

(المائدہ - ۵۰)

" تو پھر کیا یہ لوگ جاہلیت[2] کا فیصلہ چاہتے ہیں حالانکہ جو لوگ (اللہ پر) یقین رکھتے ہیں ان کے لیے اللہ سے بہتر حکم کس کا ہو سکتا ہے؟"

يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوٓا إِلَى الطَّٰغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓا أَن يَكْفُرُوا بِهِۦ وَيُرِيدُ

---

[1] یعنی جس طرح پہلی اُمّتوں کے انبیاء اپنے دور کے لیے ایک منسک (طریقِ عبادت و بندگی) لاتے تھے اسی طرح اِس دور کی اُمّت کے لیے تم ایک منسک لائے ہو۔ اب کسی کو تم سے نزاع کا حق نہیں ہے، کیونکہ اس دور کے لیے اللہ کا منظور کردہ منسک یہی ہے جو تم لاتے ہو۔ (حاشیہ از مرتب)

[2] جاہلیت کا لفظ اسلام کے مقابلہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ اس کی طرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے، جاہلیت کا طریقہ ہے۔ (حاشیہ از مرتب)

الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (النساء - ۶۰)

"وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف رجوع کریں[۱] حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ وہ گمراہی میں دُور نکل جائیں۔"

دین کے معاملہ میں کسی مُصالحت و مُداہنت کی گنجائش نہیں

اطاعت و اتباعِ رسُول کے اِس صاف صاف حکم کے ساتھ لوگوں کو خبردار کر دیا گیا کہ خدا کے دین کے معاملہ میں کوئی مصالحت و مداہنت نہیں ہو سکتی۔ کسی عقیدے، کسی اصُول، کسی ضابطے اور قاعدے اور کسی حکم کے اندر کسی کی خاطر ادنیٰ سا ردّ و بدل بھی نہیں ہو سکتا۔ جس کو ماننا ہو وہ اُس پورے دین کو مانے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں، اور جسے نہ ماننا ہو وہ نہ مانے۔ مانے گا تو اپنا ہی بھلا کرے گا، نہ مانے گا تو اپنا ہی نقصان کرے گا۔ یہاں کسی سودے بازی اور لین دین پر سمجھوتے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ - وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم: ۸-۹)

"پس اے نبیؐ، جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو وہ بھی مداہنت کریں (یعنی تم اسلام کی تبلیغ میں کچھ ڈھیل اختیار کرو تو یہ بھی تمہاری مخالفت میں کچھ نرمی اختیار کر لیں، یا تم اِن کی گمراہیوں کی رعایت کر کے اپنے دین میں کچھ ترمیم کر لو تو یہ تمہارے ساتھ مصالحت کر لیں)۔"

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ - قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ (یونس - ۱۵)

"اور جب انھیں ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو جو لوگ (آخرت میں) ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اِس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ، یا اِس میں کچھ ترمیم کرو۔[۲]

---

[۱] یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانونِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہو اور نہ اللہ کی کتاب اور اُس کے رسُول کی ہدایت کو آخری سند مانتا ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

[۲] مشرکین کا یہ قول اوّل تو اِس مفروضے پر مبنی تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ خدا کی طرف

اَے محمدؐ، اِن سے کہو مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدّل کر لوں میں تو بس اُس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔"

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف: ۲۹)

"اور کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔"

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (النمل - ۹۲)

"پھر جو ہدایت اختیار کرے وہ اپنے ہی بھلے کے لیے ہدایت اختیار کرے گا اور جو گمراہ ہو اس سے کہہ دو کہ میں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں۔"

قریش اور مشرکین عرب کا ردِّ عمل

اِس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دعوتِ اسلامی کا دوسرا نکتہ یعنی لوگوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرانا اور اُن کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ عقائد و عبادات سے لے کر

سے نہیں ہے بلکہ اُن کے اپنے دماغ کی تصنیف ہے اور اس کو خدا کی طرف منسوب کر کے انہوں نے صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ ان کی بات کا وزن بڑھ جاتے۔ دوسرے اُن کا مطلب یہ تھا کہ یہ تم نے توحید اور آخرت اور اخلاقی پابندیوں کی بحث کیا چھیڑ دی؟ اگر رہنمائی کے لیے اُٹھے ہو تو کوئی ایسی چیز پیش کرو جس سے قوم کا بھلا ہو اور اس کی دنیا بنتی نظر آئے۔ تاہم اگر تم اپنی اس دعوت کو بالکل نہیں بدلنا چاہتے تو کم از کم اس میں کچھ لچک ہی پیدا کرو تاکہ ہمارے اور تمہارے درمیان کم و بیش پر مصالحت ہو سکے۔ کچھ ہم تمہاری مانیں کچھ تم ہماری مان لو۔ تمہاری توحید میں کچھ ہمارے شرک کے لیے، تمہاری خدا پرستی میں کچھ ہماری نفس پرستی اور دنیا پرستی کے لیے، اور تمہارے عقیدۂ آخرت میں کچھ ہماری ان اُمیدوں کے لیے بھی گنجائش نکلنی چاہیے کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کرتے رہیں، آخرت میں ہماری کسی نہ کسی طرح نجات ضرور ہو جائے گی۔ پھر تمہارے یہ قطعی اور حتمی اخلاقی اصول بھی ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہیں۔ ان میں کچھ ہمارے تعصبات کے لیے، کچھ ہمارے رسم و رواج کے لیے، کچھ ہماری شخصی اور قومی اغراض کے لیے، اور کچھ ہماری خواہشاتِ نفس کے لیے بھی جگہ نکلنی چاہیے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ دین کے مطالبات کا مناسب دائرہ ہماری اور تمہاری رضامندی سے طے ہو جائے اور اس میں ہم خدا کا حق ادا کر دیا کریں۔ اس کے بعد ہمیں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جس جس طرح اپنی دنیا کے کام چلانا چاہتے ہیں چلائیں۔ مگر تم یہ غضب کر رہے ہو کہ پوری زندگی کو اور سارے معاملات کو توحید و آخرت کے عقیدے اور شریعت کے ضابطہ میں کَس دینا چاہتے ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

زندگی کے ہر شعبے تک تمام معاملات میں آپ کی مکمل اطاعت و پیروی قبول کر لیں، اپنے اندر کیا اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی اہمیت یہ تھی کہ دین اس کے بغیر عملاً قائم نہ ہو سکتا تھا، اور رسول پر ایمان اور بالفعل اُس کی اطاعت کے بغیر محض خدا کی توحید کو تسلیم کر لینا لاحاصل تھا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو انسان محسوس کر سکتا ہے کہ اللہ کی توحید کو مان لینا قریش اور عام مشرکین عرب کے لیے جتنا مشکل تھا، اس سے بہت زیادہ مشکل رسالت کو ماننا تھا۔ اوّل تو یہی بات اُن کے لیے کچھ آسان نہ تھی کہ جو شخص چالیس برس تک اُن کے ہاں عام انسانوں کی طرح رہا بسا تھا اس کے متعلق وہ یہ باور کر لیں کہ یکایک وہ اللہ کا رسول مقرر ہو گیا ہے اور اس کے پاس وحی آنے لگی ہے۔ پھر جو لوگ صدیوں سے بے لگام آزادی کے عادی تھے، ان کے لیے اب ایک شخص کی بے چون و چرا اطاعت اور اپنی پوری زندگی میں اُس کے دیئے ہوئے قانون کی پیروی قبول کر لینا بھی کچھ کم دشوار نہ تھا۔ اور اس سے زیادہ سخت دشواری اُن سرداروں کے لیے تھی جو اب تک اپنے قبیلوں اور گروہوں کے صاحب امر بنے ہوئے تھے، اُن مذہبی پیشواؤں کے لیے تھی جو ملک بھر میں شرک کے بڑے بڑے مراکز کا کاروبار چلا رہے تھے، اُن کاہنوں کے لیے تھی جو غیب دانی کے مدعی تھے اور جن کی طرف اپنی گم شدہ چیزوں کے پتے پوچھنے اور اپنے مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لیے لوگ رجوع کرتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے یہ رسالت گویا کھلا کھلا پیغام موت تھی جسے قبول کرنا تو درکنار، ٹھنڈے دل سے سننا بھی اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔ غرض ہر وہ شخص جس کا مفاد پرانے جاہلیت کے نظام کی برقراری سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ تھا، اُس کے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو مان لیں اور یہ تسلیم کر کے اُن کے تابع فرمان بن جائیں کہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں وہ خداوند ارض و سما کی طرف سے ہے تو پھر معاشرے میں اُس کا چراغ کسی طرح نہ جل سکے گا۔ اس وجہ سے یہ سارے ہی لوگ اپنے [illegible] کے پیچھے اس بات پر تل گئے کہ رسالت کی اس دعوت کو کسی طرح نہ چلنے دیں کیونکہ [illegible] عام انسانوں کی طرح ایک [illegible] اور ایک [illegible] الذین [illegible] اطاعت [illegible] اور [illegible] کے بجائے مطیع بن کر رہنا پڑے گا۔

ایک طرف یہ دشواریاں تھیں تو دوسری طرف ایک اور دشواری اور بڑی سخت دشواری اُن کے لیے یہ تھی کہ رسالت کا دعویٰ لے کر اُن کے درمیان ایک ایسا شخص اٹھا تھا جو ان کی قوم کا بہترین آدمی تھا، جس کی اخلاقی فضیلت کو ساری قوم مانتی تھی، جس کو پانچ ہی سال پہلے ساری قوم نے بالاتفاق امین کہا تھا، جس نے اپنی رسالت کا دعویٰ پیش کرنے سے عین پہلے کوہ صفا پر چڑھ کر جب پوچھا تھا کہ

"اگر میں تمہیں خبر دُوں کہ پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہے تو کیا تم میری بات مانو گے؟" تو سب نے کہا تھا کہ "ہاں، ہم مان لیں گے کیونکہ ہمیں تم سے کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں ہُوا ہے"۔ اِس کے بعد ان کے لیے اُسی شخص کو جھوٹا قرار دینا، اور لوگوں کو بھی اِس بات کا قائل کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا کہ جو عمر بھر دنیا کے کسی معاملہ میں جو شخص کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا وہ اتنا بڑا "جھوٹ" لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا ہے کہ خدا نے اُسے رسُول مقرر کیا ہے اور خدا کا کلام اس پر نازل ہوتا ہے۔

اس کے متعلق قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (الانعام - ۳۳)۔

"اے محمدؐ، ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں"۔

یہ اِس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات سنانی شروع نہ کی تھیں، آپ کی قوم کے سب لوگ آپ کو امین اور صادق سمجھتے تھے اور آپ کی راستبازی پر مکمل اعتماد رکھتے تھے۔ انہوں نے آپ کو جھٹلایا اُس وقت جب آپؐ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا اور اِس دوسرے دَور میں بھی کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو۔ آپؐ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپؐ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپؐ دنیا کے کسی معاملہ میں کبھی جھوٹ بولنے کے مرتکب ہُوئے ہیں۔ جتنی بھی انہوں نے آپ کی تکذیب کی نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپؐ کا سب سے بڑا دشمن ابو جہل تھا، اور حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ خود اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اِنَّا لَا نُكَذِّبُكَ وَلٰكِنْ نُكَذِّبُ مَا جِئْتَ بِهٖ "ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے، مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اُسے جھوٹ قرار دیتے ہیں"[1]۔ جنگ بدر کے موقع پر اَخنس بن شریق نے تخلیہ میں ابو جہل سے پوچھا کہ "یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا موجود نہیں ہے، سچ بتاؤ کہ محمدؐ کو تم جھوٹا سمجھتے ہو یا سچا؟" اُس نے جواب دیا "خدا کی قسم محمدؐ ایک سچا آدمی ہے، عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ مگر جب لِواء اور حجابت اور سقایت اور نبوّت سب کچھ بنی قُصَیّ ہی کے حصے میں آجائے تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا؟"[2] اسی بنا پر اِس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو

---

[1] یہ روایت امام سفیان ثوری اور حاکم نے حضرت علیؓ سے نقل کی ہے (حاشیہ از مؤلف)

[2] یہ روایت ابن جریرؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے۔ اَخنس بن شریق بنی زُہرہؓ کا حلیف تھا ... ذکر کیا جا رہا ہے، بنی زُہرہ

تسلی دیتے رہا ہے کہ تکذیب دراصل تمہاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے، اور جب ہم تحمل و بُردباری کے ساتھ اُسے برداشت کیے جا رہے ہیں اور ڈھیل پر ڈھیل دیے جاتے ہیں تو تم کیوں مضطرب ہوتے ہو؟

اعتراضات الزامات اور عجیب عجیب مطالبات

اِس دُہری مشکل سے دوچار ہونے کے بعد قریش اور دُوسرے مشرکین کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ حضورؐ کی رسالت کو نہ ماننے کے لیے طرح طرح کے اعتراضات کریں، مختلف اور متضاد الزامات آپ پر لگائیں، اور عجیب عجیب معجزات دکھانے کا آپ سے مطالبہ کریں۔ لیکن جیسا کہ توحید کے معاملہ میں آپ نے دیکھا کہ شرک کی تردید اور وحدانیتِ خدا وندی کے اِثبات کے لیے ایسے زبردست دلائل پیش کیے گئے تھے جن سے کسی معقول آدمی کے لیے اِن حقائق کا انکار کرنے کی گنجائش نہیں رہی تھی، ٹھیک اُسی طرح رسالت کے خلاف بھی مشرکین کے اِن تمام حربوں کا مقابلہ ایسے مدلّل طریقے سے کیا گیا کہ جس کے دماغ میں بھی کچھ عقل تھی وہ دل میں قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا، خواہ ضد اور ہٹ دھرمی سے وہ مخالفت کرتا رہا ہے۔ (۱۴)

حضورؐ کے انسان ہونے پر اعتراض

ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ ہم ایک ایسے شخص کو خدا کا رسول کیسے مان لیں جو ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے؟ کھاتا ہے، پیتا ہے، بال بچے رکھتا ہے، اور دنیا داری کے وہ سب کام کرتا ہے جو دوسرے انسان کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کے اِس اعتراض کو نقل کر کے مختلف مقامات پر اس کے جوابات دیئے گئے۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِينَ ظَلَمُوا هَلْ هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ (الانبیاء-۳)

"اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے؟"

یہ سرگوشیاں کفارِ مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار آپس میں بیٹھ بیٹھ کر کیا کرتے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرنے کی بڑی فکر لاحق تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص بہرحال نبی تو ہو نہیں

• نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ننہیالی خاندان کا حلیف تھا۔ اگرچہ جنگ میں قریش کے ساتھ آیا تھا، مگر ابن ہشام کا بیان ہے کہ اس نے اور بنی زہرہ نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

سکتا، کیونکہ ہم ہی جیسا انسان ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جو اس کو ہم سے ممتاز کرتی ہو اور ہماری بہ نسبت اس کو خدا سے ایک غیر معمولی تعلق کا مستحق بناتی ہو؟ البتہ اس شخص کی باتوں میں اور اس کی شخصیت میں ایک جادو ضرور ہے کہ جو بھی اس کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو نہ اس کی سنو اور نہ اس سے میل جول رکھو، کیونکہ اس کی باتیں سننا اور اس کے قریب جانا گویا آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنسنا ہے۔" (۱۳)

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۔ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۔ (الفرقان ۷-۸)

"اور وہ کہتے ہیں "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا گیا ہوتا، یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی حاصل کرتا۔" اور ظالم کہتے ہیں "تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔"

اُن کا مطلب یہ تھا کہ اوّل تو انسان کا رسول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہو۔ تاہم اگر آدمی ہی رسول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دُنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا، نہ یہ کہ ایک ایسا عام آدمی خداوندِ عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہو۔ بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لاتے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اُس کے اندر کوئی غیر معمولی پن نہ پایا جاتا ہو۔ بالفاظ دیگر، اُن کی رائے میں رسول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ عجوبہ دکھانے یا ٹھاٹھ باٹھ سے دھونس جمانے کے لیے تھی۔

پھر وہ کہتے تھے کہ اگر آدمی ہی کو نبی بنایا گیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات، ورنہ ابھی خدا کا عذاب برپا دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوت کا جلیل القدر منصب

عطا کر کے بس یونہی اکیلا چھوڑ دیتے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور پتھر کھاتا پھرے۔ بدرجۂ آخر اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسُول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسول ہمارے معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔ نہ خرچ کے لیے مال میسر، نہ پھل کھانے کو کوئی باغ نصیب، اور دعویٰ یہ کہ ہم اللہ رب العالمین کے پیغمبر ہیں۔

یہ باتیں بنا کر آخر کار وہ کہتے تھے کہ یہ شخص سحر زدہ ہے، یعنی کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے اور اسی کی وجہ سے یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اُوپر ان کا جو قول منقول ہوا ہے اس میں وہ آپ کو ساحر کہتے تھے، اور یہاں وہ آپ کو مسحور قرار دیتے ہیں۔ اس پر ایک اور ردّا شاعر ہونے کی تہمت کا بھی تھا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ (۱۴)

اِس اعتراض کا جواب

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ط (الرعد: ۳۸)

"تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسُول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا"

یہ اُس اعتراض کا جواب ہے جو وہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے کہ یہ اچھا نبی ہے جو بیوی بچے رکھتا ہے۔ بھلا پیغمبروں کو بھی خواہشاتِ نفسانی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ فرمایا گیا کہ پہلے جو رسُول بھیجے گئے تھے آخر وہ بھی تو بیوی بچے رکھتے تھے۔ حضرت نوحؑ کو تم خود پیغمبر مانتے ہو۔ اگر وہ بال بچوں والے نہ ہوتے تو تم اُن کی نسل سے کیسے پیدا ہوتے؟ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا پیغمبر ہونا تو تمہارے نزدیک مسلّم ہے۔ انہی سے تو تم اپنا نسب ملاتے ہو۔ پھر وہ بال بچوں والے نہ ہوتے تو تم کہاں سے بنی اسماعیل بن جاتے۔ (۱۵)

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ (الانبیاء: ۷-۸)

"اور اے نبی، تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو۔ اُن رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں، اور نہ وہ سدا جینے والے تھے"

یعنی یہ یہودی، جو آج اسلام کی دشمنی میں تمہارے ہم نوا ہیں اور تم کو مخالفت کے داؤ پیچ سکھایا کرتے ہیں، انہی سے پوچھ لو کہ موسیٰؑ اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کون تھے؟ انسان تھے یا

کوئی اور مخلوق؟ (۱۶)

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَت تَّأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوا أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا فَكَفَرُوا وَتَوَلَّوا ۚ وَّاسْتَغْنَى اللَّهُ ۚ وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۔ (التغابن: ۵-۶)

"کیا تمہیں اُن لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اِس سے پہلے کفر کیا اور پھر اپنے شامتِ اعمال کا مزہ چکھ لیا؟ اور آگے (آخرت میں) اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اِس انجام کے مستحق وہ اِس لیے ہوئے کہ اُن کے پاس اُن کے رسول کھلی کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے، مگر انھوں نے کہا "کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟" اِس طرح انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا، تب اللہ بھی اُن سے بے پروا ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود۔"

یعنی انبیاء ایسی صریح علامات اور نشانیاں لے کر آتے تھے جو اُن کے مامور من اللہ ہونے کی کھلی کھلی شہادت دیتی تھیں۔ وہ جو بات بھی پیش کرتے تھے نہایت معقول اور روشن دلیلوں کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ اُن کی تعلیم میں کوئی اِبہام نہ تھا، بلکہ وہ صاف صاف بتاتے تھے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا؟ کس راہ پر انسان کو چلنا چاہیے اور کس راہ پر نہ چلنا چاہیے؟ لیکن لوگوں نے یہ کہہ کر اُن کی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ "کیا اب انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟" اور یہی چیز اُن کی تباہی کی موجب ہوئی۔ کیونکہ نوعِ انسانی کو دنیا میں صحیح راہِ عمل اِس کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی تھی کہ اِس کا خالق اُسے صحیح علم دے، اور خالق کی طرف سے علم دیئے جانے کی عملی صورت اِس کے سوا کچھ نہ ہو سکتی تھی کہ وہ انسانوں ہی میں سے بعض افراد کو علم عطا کر کے دوسروں تک اُسے پہنچانے کی خدمت سپرد کرے۔ اِس غرض کے لیے اس نے انبیاء کو بیّنات کے ساتھ بھیجا تاکہ لوگوں کے لیے اُن کے برحق ہونے میں شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ رہے۔ مگر انھوں نے سرے سے یہی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ بشر خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اُن کے لیے ہدایت پانے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اِس معاملہ میں گمراہ انسانوں کی جہالت و نادانی کا یہ عجیب کرشمہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ بشر کی رہنمائی قبول کرنے میں تو انھوں نے کبھی تامل نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ خود انسانوں ہی کی رہنمائی میں لکڑی اور پتھر کے بتوں تک کو انھوں نے معبود بنا لیا، خود انسانوں کو خدا اور خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا تک مان لیا، اور گمراہ کن لیڈروں کی اندھی پیروی میں ایسے عجیب مسلک اختیار کر لیے جنھوں نے انسانی تہذیب و تمدن اور اخلاق کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ مگر جب خدا اس کے

رسول اُن کے پاس حق لے کر آئے اور انہوں نے ہر ذاتی غرض سے بالاتر ہو کر بے لاگ سچائی ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے کہا "کیا اب بشر ہمیں ہدایت دینے لگے"؟ اس کے معنی یہ تھے کہ بشر اگر گمراہ کرے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر وہ راہِ راست دکھاتا ہے تو اس کی رہنمائی قابلِ قبول نہیں ہے۔

پس جب انہوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے استغناء برتا تو پھر اللہ کو بھی اس کی کچھ پروا نہ رہی کہ وہ کس گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ اللہ کی کوئی غرض ان سے اٹکی ہوئی نہ تھی کہ وہ اُسے خدا مانیں گے تو وہ خدا رہے گا ورنہ خدائی کا تخت اُس سے چھن جائے گا۔ وہ نہ اُن کی عبادت کا محتاج تھا، نہ ان کی حمد و ثنا کا۔ وہ تو اُن کی اپنی بھلائی کے لیے اُنہیں راہِ راست دکھانا چاہتا تھا مگر جب وہ اس سے منہ پھیر گئے تو اللہ بھی ان سے بے پروا ہو گیا۔ پھر نہ اُس نے اُن کو ہدایت دی، نہ اُن کی حفاظت اپنے ذمہ لی، نہ اُن کو ہلاکت میں پڑنے سے بچایا اور نہ انہیں اپنے اوپر تباہی لانے سے روکا، کیونکہ وہ خود اس کی ہدایت اور ولایت کے طالب نہ تھے۔ (۱۰)

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ۔ قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ مَلَكًا رَسُولًا ۔ (بنی اسرائیل: ۹۴-۹۵)

"لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے اُن کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر اُن کے اِسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟" ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے آرام سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو اُن کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔"

یعنی پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آ کر خدا کا پیغام سُنا دیا کرے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اُس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح کرے۔ اُسے انسانی احوال پر اُس پیغام کے اصولوں کا انطباق کرنا ہوتا ہے۔ اُسے خود اپنی زندگی میں اُن اصولوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اُسے اُن بے شمار مختلف انسانوں کے ذہن کی گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں جو اُس کا پیغام سُننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُسے ماننے والوں کی تنظیم اور تربیت کرنی ہوتی ہے تاکہ اُس پیغام کی تعلیمات کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے۔ اُسے انکار اور مخالفت و مزاحمت کرنے والوں کے مقابلہ میں جدوجہد کرنی ہوتی ہے تاکہ بگاڑ کی حمایت کرنے والی طاقتوں کو نیچا دکھایا جائے اور وہ اصلاح عمل میں آ سکے جس کے لیے خدا نے اپنا پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سارے کام جب کہ انسانوں ہی کے درمیان کرنے کے ہیں تو ان کے لیے انسان نہیں تو اور کون بھیجا جاتا؟ فرشتہ تو زیادہ سے زیادہ بس یہی کرتا کہ آتا اور پیغام پہنچا کر چلا جاتا۔

انسانوں میں انسان کی طرح رہ کر انسان کے سے کام کرتا اور پھر انسانی زندگی میں مشیّتِ الٰہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھا دیتا کسی فرشتے کے بس کا کام نہ تھا اس کے لیے تو ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا۔ (۱۸)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف - ۱۰۹)

"اے محمدؐ، تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب انہی بستیوں کے رہنے والے انسان تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔"

یہاں ایک بہت بڑے مضمون کو ایک ہی جملے میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کو اگر کسی تفصیلی عبارت میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے:

"اے نبیؐ، یہ لوگ تمہاری بات کی طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ جو شخص کل اُن کے شہر میں پیدا ہوا اور انہی کے درمیان بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہوا اس کے متعلق ہم یہ کیسے مان لیں کہ یکایک ایک روز خدا نے اسے اپنا پیغمبر مقرر کر دیا۔ لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے جس سے آج دنیا میں پہلی مرتبہ انہی کو سابقہ پیش آیا ہو۔ اس سے پہلے بھی خدا اپنے نبی بھیج چکا ہے اور وہ بھی سب انسان ہی تھے پھر یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ اچانک ایک اجنبی شخص کسی شہر میں نمودار ہو گیا ہو اور اُس نے کہا ہو کہ میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ بلکہ جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اٹھائے گئے وہ سب اپنی اپنی بستیوں ہی کے رہنے والوں میں سے تھے۔ مسیحؑ، موسٰیؑ، ابراہیمؑ، نوح علیہم السلام آخر کون تھے؟ انہی شہروں میں سے اُٹھے تھے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے یا کہیں اور سے آ گئے تھے؟" (۱۹)

اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ (یونس - ۲)

"کیا لوگوں کے لیے یہ بات بڑی عجیب ہو گئی کہ ہم نے خود انہی میں سے ایک آدمی کی طرف وحی بھیجی کہ لوگوں کو خبردار کر دے اور ایمان لانے والوں کو بشارت دے دے کہ اُن کے لیے ان کے رب کے ہاں سچی عزت و سرفرازی ہے؟ (کیا یہی وہ بات ہے جس پر) منکرین نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے؟"

یعنی آخر اس میں تعجب کی بات کیا ہے؟ انسانوں کو ہوشیار کرنے کے لیے انسان مقرر نہ کیا جاتا تو کیا فرشتہ یا جن یا حیوان مقرر کیا جاتا؟ اور اگر انسان حقیقت سے غافل ہو کر غلط طریقے سے زندگی بسر کر رہے ہوں تو تعجب کے قابل بات یہ ہے کہ اُن کا خالق و پروردگار انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے

یا یہ کہ وہ ان کی ہدایت و رہنمائی کا کوئی انتظام کرے؛ اور خدا کی طرف سے عزت و سرفرازی اُن کے لیے ہونی چاہیے جو اُسے مان لیں یا اُن کے لیے جو اُسے رد کردیں؛ پس تعجب کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ آخر وہ بات کیا ہے جس پر وہ تعجب کر رہے ہیں۔

رہا اُن کا اُس خبردار کرنے والے کو ساحر قرار دینا تو اُنھیں سوچنا چاہیے کہ یہ تہمت اُس پر چسپاں بھی ہوتی ہے یا نہیں؛ صرف یہ بات کہ کوئی شخص اعلیٰ درجہ کی خطابت سے کام لے کر دلوں اور دماغوں کو مسخر کر رہا ہے، اُس پر یہ الزام عائد کردینے کے لیے تو کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ جادوگری کر رہا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ اِس خطابت میں وہ بات کیا کہتا ہے، کس غرض کے لیے قوتِ تقریر استعمال کر رہا ہے، اور جو اثرات اس کی تقریر سے ایمان لانے والوں کی زندگی پر مترتب ہو رہے ہیں وہ کس نوعیت کے ہیں۔ جو خطیب کسی ناجائز غرض سے جادو بیانی کی طاقت استعمال کرتا ہے وہ تو ایک منہ پھٹ، بے لگام، غیر ذمہ دار مقرر ہوتا ہے۔ حق اور صداقت سے بے نیاز ہو کر ہر وہ بات کہہ ڈالتا ہے جو بس سننے والوں کو متاثر کر دے، خواہ بجائے خود وہ کتنی ہی جھوٹی، مبالغہ آمیز اور غیر منصفانہ ہو۔ اس کی باتوں میں حکمت کے بجائے عوام فریبی ہوتی ہے۔ کسی منظم فکر کے بجائے تناقض اور ناہمواری ہوتی ہے۔ اعتدال کے بجائے بے اعتدالی ہوا کرتی ہے۔ وہ تو محض اپنا سکہ جمانے کے لیے زبان درازی کرتا ہے یا پھر لوگوں کو لڑانے اور ایک گروہ کو دوسرے کے مقابلے میں اُبھارنے کے لیے خطابت کی شراب پلاتا ہے۔ اُس کے اثر سے لوگوں میں نہ کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ ان کی زندگیوں میں کوئی مفید تغیر رونما ہوتا ہے، نہ کوئی صالح فکر یا صالح عملی حالت وجود میں آتی ہے، بلکہ لوگ پہلے سے بدتر صفات کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ مگر یہاں تم دیکھ رہے ہو کہ پیغمبر جو کلام پیش کر رہا ہے اُس میں حکمت ہے، ایک متناسب نظامِ فکر ہے، غایت درجے کا اعتدال اور حق و صداقت کا سخت التزام ہے، لفظ لفظ جچا تلا اور بات بات کانٹے کی تول پوری ہے۔ اُس کی خطابت میں تم خلقِ خدا کی اصلاح کے سوا کسی دوسری غرض کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس میں اُس کی اپنی ذاتی یا خاندانی یا قومی یا کسی قسم کی دنیوی غرض کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ لوگ جس غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اُس کے بُرے نتائج سے ان کو خبردار کر دے اور انھیں اُس طریقے کی طرف بلائے جس میں اُن کا اپنا بھلا ہے۔ پھر اس کی تقریر سے جو اثرات مترتب ہو رہے ہیں وہ بھی جادو بیان قسم کے خطیبوں کی خطابت کے اثرات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں جس نے بھی اُس کا اثر قبول کیا ہے اُس کی زندگی سنور گئی ہے، وہ پہلے سے زیادہ بہتر اخلاق کا انسان بن گیا ہے اور اس کے طرزِ عمل میں خیر و صلاح کی شان نمایاں ہوگئی ہے۔ اب تم ہی سوچ لو کیا جادوگر ایسی ہی باتیں کہتے ہیں اور ان کا جادو ایسے ہی نتائج پیدا کرتا ہے؟ (۴۰)

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا - (بنی اسرائیل-۵۵)

"اور ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض سے بڑھ کر مرتبے دیے، اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی۔"

جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے اس میں داؤد علیہ السلام کو کتاب (زبور) دینے کا الگ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ بادشاہ تھے اور اس کے باوجود پیغمبر تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین جس وجہ سے آپ کی پیغمبری اور خدا رسیدگی ماننے سے انکار کرتے تھے وہ ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ تھی کہ آپ عام انسانوں کی طرح بیوی بچے رکھتے تھے، کھاتے پیتے تھے، بازاروں میں چل پھر کر خرید و فروخت کرتے تھے، اور وہ سارے ہی کام کرتے تھے جو کوئی دنیا دار آدمی اپنی انسانی حاجات کے لیے کیا کرتا ہے۔ کفارِ مکہ کا کہنا یہ تھا کہ تم تو ایک دنیا دار آدمی ہو، تمہیں خدا رسیدگی سے کیا تعلق؟ پہنچے ہوئے لوگ تو وہ ہوتے ہیں جنہیں اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں ہوتا، بس ایک گوشے میں بیٹھے اللہ کی یاد میں غرق رہتے ہیں۔ وہ کہاں اور گھر کے آٹے دال کی فکریں کہاں! اس پر بتایا جا رہا ہے کہ ایک پوری بادشاہت کے انتظام سے بڑھ کر دنیا داری اور کیا ہوگی مگر اس کے باوجود داؤد کو نبوت اور کتاب سے سرفراز کیا گیا۔ (۴۱)

قُلْ مَا كُنتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ - (الاحقاف-۹)

"(اے نبی! ان لوگوں سے) کہو، میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اور نہ یہ جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، میں تو بس اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔"

اس ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو مکے کے لوگ اس پر طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو بال بچے رکھتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جس میں یہ عام انسانوں سے مختلف ہو اور ہم یہ سمجھیں کہ خاص طور پر اسی شخص کو خدا نے اپنا رسول بنایا ہے۔ پھر وہ کہتے تھے کہ اگر اس شخص کو خدا نے رسول بنایا ہوتا تو وہ اس کی اردل میں کوئی فرشتہ بھیجتا جو اعلان کرتا کہ یہ خدا کا رسول ہے اور ہر اس شخص پر خدا کا کوڑا برسا دیتا جو اس کی شان میں کوئی ذرا سی گستاخی کر بیٹھتا۔ یہ آخر کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اپنا رسول مقرر کرے اور پھر اسے یونہی مکے کی گلیوں میں پھرنے اور ہر طرح کی زیادتیاں سہنے کے لیے بے سہارا چھوڑ دے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی ہوتا کہ خدا اپنے رسول کے لیے ایک شاندار محل اور ایک لہلہاتا ہوا باغ ہی پیدا کر دیتا۔ یہ تو نہ ہوتا کہ اس کے رسول کی بیوی کا مال جب ختم ہو جائے تو اسے فاقوں کی نوبت آ جائے اور طائف جانے کے لیے اسے سواری تک میسر نہ ہو۔ پھر وہ لوگ آپ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں آپ سے پوچھتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی شخص کا رسولِ خدا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ فوق البشری طاقتوں کا مالک ہو۔ اس کے

ایک اشارے سے پہاڑ ٹل جائیں اور ریگ زار دیکھتے دیکھتے کشت زاروں میں تبدیل ہو جائیں۔ اس کو تمام ماکان وما یکون کا علم ہو اور پردۂ غیب میں چھپی ہوئی ہر چیز اس پر روشن ہو۔

ان باتوں کے جواب میں فرمایا کہ ان سے کہو "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں"۔ یعنی میرا رسول بنایا جانا دنیا کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہے کہ تمہیں یہ سمجھنے میں پریشانی لاحق ہو کہ رسول کیسا ہوتا ہے اور کیسا نہیں ہوتا۔ مجھ سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں اور میں ان سے مختلف نہیں ہوں۔ آخر دنیا میں کب کوئی رسول ایسا آیا ہے جو بال بچے نہ رکھتا ہو؟ کھاتا پیتا نہ ہو؟ یا عام انسانوں کی سی زندگی بسر نہ کرتا ہو؟ کس رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ آتا ہے جو اس کی رسالت کا اعلان کرتا ہو اور اس کے آگے آگے ہاتھ میں کوڑا لیے پھرتا ہو؟ کس رسول کے لیے باغ اور محلات پیدا کیے گئے اور کس نے خدا کی طرف بلانے میں وہ سختیاں نہیں جھیلیں جو میں جھیل رہا ہوں؟ کون سا رسول ایسا گزرا ہے جو اپنے اختیار سے کوئی معجزہ دکھا سکتا ہو یا اپنے علم سے سب کچھ جانتا ہو؟ پھر یہ نرالے معیار میری ہی رسالت کو پرکھنے کے لیے تم کہاں سے لیے چلے آ رہے ہو؟

پھر اس کے بعد ان کے جواب میں یہ بھی کہا گیا کہ "میں نہیں جانتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ کیا، میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے بھیجی جاتی ہے"۔ یعنی میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ماضی، حال، مستقبل سب مجھ پر روشن ہوں اور دنیا کی ہر چیز کا مجھے علم ہو۔ تمہارا مستقبل تو درکنار، مجھے تو اپنا مستقبل بھی معلوم نہیں ہے جس چیز کا وحی کے ذریعے سے مجھے علم دے دیا جاتا ہے بس اس کو میں جانتا ہوں۔ اُس سے زائد کوئی علم رکھنے کا میں نے کب دعویٰ کیا ہے اور کونسا رسول ایسے علم کا مالک کبھی دنیا میں گزرا ہے کہ تم میری رسالت کو جانچنے کے لیے میری غیب دانی کا امتحان لیتے پھرتے ہو۔ رسول کا یہ کام کب سے ہو گیا کہ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے پتے بتائے، یا یہ بتائے کہ حاملہ عورت لڑکا جنے گی یا لڑکی، یا یہ بتائے کہ مریض اچھا ہو جائے گا یا مر جائے گا؟

دوسرا اعتراض کہ حضورؐ ہی کیوں نبی بنائے گئے

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا، اور انسانوں ہی میں سے کسی کو بھیجنا تھا تو کیا محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہمارے درمیان اس کام کے لیے اُس کو ملے؟ مکے اور طائف کے بڑے بڑے لوگ مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی کو اس کے لیے منتخب نہ کیا گیا؟ ان کا کہنا یہ تھا کہ:

ءَ اُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا (ص-۸)

"کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر ذکر (خدا کا پیغام نصیحت) نازل کیا گیا؟"

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ (الزُّخرُف : ۳۱-۳۲)

"اور وہ کہتے ہیں" یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟" کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں اُن کی گزر بسر کے ذرائع تو ہم نے اُن کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے، تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اُس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔"

دونوں شہروں سے مراد مکہ اور طائف ہیں۔ کفار کا کہنا یہ تھا کہ اگر واقعی خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا اور وہ اُس پر اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اس غرض کے لیے منتخب کرتا۔ رسول بنانے کے لیے اللہ میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو یتیم پیدا ہوا، جس کے حصے میں کوئی میراث نہ آئی، جس نے بکریاں چرا کر جوانی گزار دی، جو اب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کر کے، اور جو کسی قبیلے کا شیخ یا کسی خانوادے کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا مکہ میں وَلید بن مُغیرہ اور عُتبہ بن ربیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طائف میں عُروہ بن مسعود، حَبیب بن عَمرو، کِنانہ بن عبد عَمرو، اور ابن عبد یالیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا اُن لوگوں کا استدلال۔ پہلے تو وہ یہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کوئی بشر بھی رسُول ہو سکتا ہے۔ مگر جب قرآن مجید میں پے در پے دلائل دے کر ان کے اس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا، اور اُن سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسُول ہو کر آتے رہے ہیں، اور انسانوں کی ہدایت کے لیے بشر ہی رسُول ہو سکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسُول بھی دُنیا میں آئے ہیں وہ یکایک آسمان سے نہیں اُتر آتے تھے بلکہ انہی انسانی بستیوں میں پیدا ہوتے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بال بچوں والے تھے اور کھانے پینے سے مُبرا نہ تھے، تو انھوں نے دوسرا پینترا بدلا کہ اچھا، بشر ہی رسول سہی، مگر وہ کوئی بڑا آدمی تو ہونا چاہیے۔ مالدار ہو، با اثر ہو، بڑے جتھے والا ہو، لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اِس مرتبے کے لیے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟ اِس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے چند مختصر الفاظ میں بہت سی اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں:

پہلی بات یہ کہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنا اِن کے سپرد کب سے ہو گیا؟ کیا یہ طے کرنا اِن کا کام ہے

کہ اللہ اپنی رحمت سے کس کو نوازے اور کس کو نہ نوازے؟ (یہاں رب کی رحمت سے مراد اس کی رحمتِ عام ہے جس میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے)۔

دوسری بات یہ کہ نبوت تو خیر بہت بڑی چیز ہے، دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو عام ذرائع ہیں، ان کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے، کسی اور کے حوالے نہیں کر دی۔ ہم کسی کو حسین اور کسی کو بدصورت، کسی کو خوش آواز اور کسی کو بدآواز، کسی کو تندرست اور کسی کو اپاہج یا اندھا یا گونگا یا بہرا، کسی کو امیرزادہ اور کسی کو فقیرزادہ، کسی کو ترقی یافتہ قوم کا فرد اور کسی کو غلام یا پس ماندہ قوم کا فرد پیدا کرتے ہیں۔ اس پیدائشی قسمت میں کوئی ذرہ برابر بھی دخل نہیں دے سکتا۔ جس کو ہم نے جو کچھ بنا دیا ہے وہی کچھ بننے پر وہ مجبور ہے۔ اور ان مختلف پیدائشی حالتوں کا جو اثر بھی کسی کی تقدیر پر پڑتا ہے، اُسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان رزق، طاقت، عزت، شہرت، دولت، حکومت وغیرہ کی تقسیم بھی ہم ہی کر رہے ہیں۔ جس کو ہماری طرف سے اقبال نصیب ہوتا ہے اسے کوئی گرا نہیں سکتا، اور جس پر ہماری طرف سے ادبار آجاتا ہے اُسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ہمارے فیصلوں کے مقابلے میں انسانوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس عالمگیر خدائی نظام میں یہ لوگ کہاں فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کائنات کا مالک کسے اپنا نبی بنائے اور کسے نہ بنائے۔

تیسری بات یہ کہ اس خدائی انتظام میں یہ مستقل قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سب کچھ ایک ہی کو، یا سب کچھ سب کو نہ دے دیا جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ہر طرف تمہیں بندوں کے درمیان ہر پہلو میں تفاوت ہی تفاوت نظر آئے گا۔ کسی کو ہم نے کوئی چیز دی ہے تو دوسری کسی چیز سے اُس کو محروم کر دیا ہے، اور وہ کسی اور کو عطا کر دی ہے۔ یہ اس حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے کہ کوئی انسان دوسرے سے بے نیاز نہ ہو، بلکہ ہر ایک کسی نہ کسی معاملہ میں دوسرے کا محتاج رہے۔ اب یہ کیسا احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں سمایا ہے کہ جسے ہم نے ریاست اور وجاہت دی ہے اُسی کو نبوت بھی دے دی جائے؟ کیا اسی طرح تم یہ بھی کہو گے کہ عقل، علم، دولت، حسن، طاقت، اقتدار اور دوسرے تمام کمالات ایک ہی آدمی میں جمع کر دیے جائیں اور جس کو ایک چیز نہیں ملی ہے اُسے دوسری بھی کوئی چیز نہ دی جائے؟

آخری فقرے میں رب کی رحمت سے مراد اُس کی رحمتِ خاص، یعنی نبوت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جن رئیسوں کو اُن کی دولت و وجاہت اور مشیخت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو، وہ اُس دولت کے قابل نہیں ہیں جو محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دی گئی ہے۔ یہ دولت اُس دولت سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ درجے کی ہے اور اس کے لیے موزونیت کا معیار کچھ اور ہے۔ تم نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ

تمہارا ہر چودھری اور سیٹھ نبی بننے کا اہل ہے تو یہ تمہارے اپنے ذہن کی پستی ہے۔ اللہ سے اس نادانی کی توقع کیوں رکھتے ہو؟ (۴۳)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۔ (المؤمن ۵۶)

"حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند و حجت کے بغیر، جو اُن کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیات میں جھگڑے کر رہے ہیں اُن کے دلوں میں کبر بھرا ہوا ہے، مگر وہ اُس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ گھمنڈ رکھتے ہیں۔ بس اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔"

یعنی ان لوگوں کی بے دلیل مخالفت اور ان کی غیر معقول کج بحثیوں کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کی آیات میں جو سچائیاں اور خیر و صلاح کی باتیں اُن کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے یہ نیک نیتی کے ساتھ اُن کو سمجھنے کی خاطر بحثیں کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے اس رویّے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا غرورِ نفس یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ان کے ہوتے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشوائی و رہنمائی تسلیم کر لی جائے اور بالآخر ایک روز انہیں خود بھی اُس شخص کی قیادت ماننی پڑے جس کے مقابلے میں یہ اپنے آپ کو سرداری کا زیادہ حقدار سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کسی طرح نہ چلنے پائے، اور اس مقصد کے لیے انہیں کوئی ذلیل سے ذلیل حربہ استعمال کرنے میں بھی تامّل نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ نے بڑا بنایا ہے وہی بڑا بن کر رہے گا اور یہ چھوٹے لوگ اپنی بڑائی قائم رکھنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ سب آخرکار ناکام ہو جائیں گی۔ (۴۴)

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ (النحل۔ آیت ۲)

"وہ اِس روح (یعنی وحی نبوت) کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے فرشتوں کے ذریعے نازل فرماتا ہے۔"

یہ کفار کے اُن اعتراضات کا جواب ہے جو وہ حضورؐ پر کرتے تھے کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا تو کیا بس محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی اس کام کے لیے رہ گئے تھے؟ مکے اور طائف کے سارے بڑے بڑے سردار مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی پر بھی نگاہ نہ پڑ سکی؟ اس طرح کے بیہودہ اعتراضات کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، اور یہی متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے کہ خدا اپنے کام کو خود جانتا ہے، تم سے مشورہ لینے کی اُسے حاجت نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے آپ ہی اپنے کام کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ (۴۵)

یہ اعتراض کہ اگر یہ حق ہوتا تو قوم کے بڑے لوگ ایمان لاتے

مشرکین کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں وہ اگر حق ہوتا تو سب سے پہلے قوم کے بڑے لوگ ایمان لاتے، نہ کہ چند ناسمجھ نوجوان، چند غلام اور چند غریب آدمی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۔ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ۔ (الاحقاف۔ آیت ۱۱)

"جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا وہ ایمان لانے والوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ حق ہوتا تو یہ لوگ اس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جا سکتے تھے۔" چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پرانا جھوٹ ہے۔"

یہ اُن دلائل میں سے ایک ہے جو قریش کے سردار عوام الناس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بہکانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ قرآن برحق ہوتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک صحیح بات کی طرف دعوت دے رہے ہوتے تو قوم کے سردار اور شیوخ اور معززین آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چند ناتجربہ کار لڑکے اور چند ادنیٰ درجے کے غلام تو ایک معقول بات کو مان لیں اور قوم کے بڑے بڑے لوگ جو دانا اور جہاندیدہ ہیں، اور جن کی عقل و تدبیر پر آج تک قوم اعتماد کرتی رہی ہے، اس کو رد کر دیں؟ اس پُرفریب استدلال سے وہ عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ اس نئی دعوت میں ضرور کچھ خرابی ہے، اسی لیے تو قوم کے اکابر اس کو نہیں مان رہے ہیں، لہٰذا تم لوگ بھی اس سے دُور بھاگو۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو حق و باطل کا معیار قرار دے رکھا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جس ہدایت کو یہ قبول نہ کریں وہ ضرور ضلالت ہونی چاہیے۔ مگر اسے کھلم کھلا ضلالت کہنے کی ہمت نہیں رکھتے، کیونکہ اس سے پہلے بھی انبیاء علیہم السلام یہی تعلیمات پیش کرتے رہے ہیں، اور تمام کتب آسمانی جو اہل کتاب کے پاس موجود ہیں انہی عقائد اور انہی ہدایات سے بھری پڑی ہیں۔ اس لیے یہ اسے "پرانا جھوٹ" کہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ سب لوگ بھی دانائی سے محروم تھے جو ہزارہا برس سے ان حقائق کو پیش کرتے اور مانتے چلے آ رہے ہیں، اور تمام دانائی صرف ان کے حصے میں آگئی ہے۔ (۲۶)

ابن عباس کی روایت کے مطابق قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صہیبؓ اور عمارؓ اور خبابؓ اور ابن مسعودؓ جیسے غریب لوگ جو تمہاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں، ان کے

ساتھ تو ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تمہاری مجلس میں آسکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔
قیصر روم، ہرقل کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ملا اور اس نے ابوسفیان کو بلا کر آپؐ کے متعلق چند سوالات کیے تو ابوسفیان نے ان کا جواب دیتے ہوئے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ بھی کہ تَبِعَهُ مِنَّا الضُّعَفَاءُ وَالْمَسَاكِينُ "اس شخص کی پیروی ہمارے کمزور اور مسکین لوگوں نے قبول کی ہے"۔ گویا ان لوگوں کا طرزِ فکر یہ تھا کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ رہے چھوٹے لوگ، تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں۔ اس لیے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا اسے رد کر دینا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔ ٹھیک یہی بات حضرت نوحؑ سے ان کی قوم کے سرداروں نے کہی تھی کہ کیا "ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے"؟ اور سورۂ ہود آیت ۲۷ میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تیری پیروی صرف اُن لوگوں نے بے سمجھے بوجھے کی ہے جو ہمارے ہاں کے اراذل ہیں"۔ (۲۷)

یہ الزام کہ حضورؐ اپنی بڑائی چاہتے ہیں

تتمّہ میں ذکر آیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سردارانِ قریش کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو حاضرین نے منجملہ دوسرے اعتراضات کے یہ بھی کہا کہ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ "یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کی جا رہی ہے" یعنی دراصل یہ دعوت اس لیے دی جا رہی ہے کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع فرمان بن جائیں اور یہ ہم پر حکم چلائیں۔ (۲۸)

ظاہر ہے کہ یہ محض ایک الزام تھا جس کی کوئی بنیاد بدگمانی کے سوا نہ تھی۔ اس لیے اس کا کوئی جواب دینے کے بجائے قرآن مجید میں یہ بتایا گیا کہ قدیم زمانے میں بھی جو اللہ کا بندہ اصلاحِ خلق کے لیے اٹھا اس پر یہی الزام لگا دیا گیا۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ سے فرعون کے درباریوں نے کہا أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ "اے موسیٰ، کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور زمین میں بڑائی تم دونوں بھائیوں کی قائم ہو جائے"؟ (یونس۔ ۷۸) یہی بات حضرت نوحؑ سے اُن کی قوم کے سرداروں نے کہی تھی کہ

مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيدُ أَن يَتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ (المؤمنون۔ ۲۴)

"یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر برتری حاصل کرے"۔

مخالفینِ حق کا ایک قدیم ترین حربہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اصلاح کے لیے کوشش کرنے اٹھے اس پر فوراً یہ الزام چسپاں کر دیتے ہیں کہ کچھ نہیں، بس یہ اقتدار کا بھوکا ہے۔ یہی الزام فرعون نے حضرت موسیٰ اور

بادشاہوں پر لگایا تھا کہ تم اس لیے اُٹھے ہو کہ تمہیں ملک میں بڑائی حاصل ہو جائے۔ یہی الزام حضرت عیسیٰؑ پر لگایا گیا کہ یہ شخص یہودیوں کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ اور اسی کا شبہہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سردارانِ قریش ظاہر کرتے تھے، چنانچہ کئی مرتبہ انہوں نے آپ سے یہ سودا کرنے کی کوشش کی کہ اگر اقتدار کے طالب ہو تو "اپنی تبلیغ چھوڑ کر" حزبِ اقتدار" میں شامل ہو جاؤ، ہم تمہیں بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ ساری عمر دنیا اور اس کے مادی فائدوں اور اس کی شان و شوکت ہی کے لیے اپنی جان کھپاتے رہتے ہیں اُن کے لیے یہ تصور کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے کہ اسی دنیا میں کوئی انسان خلوص، نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ خلقِ انسانیت کی خاطر بھی اپنی جان کھپا سکتا ہے۔ وہ خود چونکہ اپنا اثر و اقتدار جمانے کے لیے دلفریب نعرے اور اصلاح کے جھوٹے وعدے شب و روز استعمال کرتے رہتے ہیں، اس لیے یہ مکاری و فریب کاری ان کی نگاہ میں بالکل ایک فطری چیز ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اصلاح کا نام مکر و فریب کے سوا کبھی صداقت اور خلوص کے ساتھ لیا ہی نہیں جا سکتا، یہ نام جو بھی لیتا ہے ضرور وہ اُن کا اپنا "ہم جنس" ہی ہوگا۔ اور لطف یہ ہے کہ مصلحین کے خلاف "اقتدار کی بھوک" کا یہ الزام ہمیشہ برسرِ اقتدار لوگ اور ان کے خوشامدی حاشیہ نشین ہی استعمال کرتے رہے ہیں۔ گویا خود انہیں اور ان کے آقایانِ نامدار کو جو اقتدار حاصل ہے وہ تو ان کا پیدائشی حق ہے، اس کے حاصل کرنے اور اس پر قابض رہنے میں وہ کسی الزام کے مستحق نہیں ہیں۔ البتہ نہایت قابلِ ملامت ہے وہ جس کے لیے یہ "غذا" پیدائشی حق نہ تھی اور اب یہ لوگ اس کے اندر اس چیز کی "بھوک" محسوس کر رہے ہیں۔

اس جگہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو شخص بھی رائج الوقت نظامِ زندگی کی خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے اُٹھے گا اور اس کے مقابلے میں اصلاحی نظریہ و نظام پیش کرے گا اس کے لیے بہرحال یہ بات ناگزیر ہوگی کہ اصلاح کی راہ میں جو طاقتیں بھی سدِّ راہ ہوں انہیں ہٹانے کی کوشش کرے اور ان طاقتوں کو برسرِ اقتدار لائے جو اصلاحی نظریہ و نظام کو عملاً نافذ کر سکیں۔ نیز ایسے شخص کی دعوت جب بھی کامیاب ہوگی اس کا فطری نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ لوگوں کا مقتدا و پیشوا بن جائے گا اور نئے نظام میں اقتدار کی باگیں یا تو اس کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہوں گی، یا اس کے حامیوں اور پیروؤں کے ہاتھ ان پر قابض ہوں گے۔ آخر انبیاء اور مصلحینِ عالم میں سے کون ہے جس کی کوششوں کا مقصد اپنی دعوت کو عملاً نافذ کرنا نہ تھا؟ اور کون ہے جس کی دعوت کی کامیابی نے فی الواقع اس کو پیشوا نہیں بنا دیا؟ پھر کیا یہ امر واقعی کسی پر یہ الزام چسپاں کر دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ دراصل اقتدار کا بھوکا تھا اور اس کی اصل غرض وہی پیشوائی تھی جو اس نے حاصل کر لی؟ ظاہر ہے کہ بدطینت دشمنانِ حق کے سوا اس سوال کا جواب کوئی بھی اثبات میں نہ دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اقتدار کے بجائے خود مطلوب ہونے اور کسی مقصدِ خیر کے لیے مطلوب ہونے میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اتنا ہی بڑا فرق جتنا ڈاکو کے خنجر اور ڈاکٹر کے نشتر میں ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اس بنا پر ڈاکو اور ڈاکٹر کو ایک کر دے کہ دونوں بالارادہ جسم چیرتے ہیں اور نتیجہ میں مال دونوں کے ہاتھ آتا ہے، تو یہ اس کے اپنے ہی دماغ یا دل کا قصور ہے۔ ورنہ دونوں کی نیت، دونوں کے طریقِ کار، اور دونوں کے مجموعی کردار میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ کوئی صاحبِ عقل آدمی ڈاکو کو ڈاکو اور ڈاکٹر کو ڈاکٹر سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ (۳۰)

یہی معاملہ حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ ان کی قوم کے سرداروں نے بھی اپنے عوام کو مخاطب کر کے کہا:

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۔ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۔ (المؤمنون: ۳۳-۳۴)

"یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ جو کچھ تم کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو تم گھاٹے ہی میں رہو گے۔"

سردارانِ قوم کو جب خطرہ ہوا کہ عوام پیغمبر کی پاکیزہ شخصیت اور دل لگتی باتوں سے متاثر ہو جائیں گے اور ان کے متاثر ہو جانے کے بعد ہماری سرداری پھر کس پر چلے گی، تو انہوں نے یہ تقریریں کر کر کے عام لوگوں کو بہکانا شروع کیا۔ وہ کہتے تھے کہ "یہ خدا کی طرف سے پیغمبری ویغمبری کچھ نہیں ہے، محض اقتدار کی بھوک ہے جو اس شخص سے یہ باتیں کرا رہی ہے۔ بھائیو، ذرا غور تو کرو کہ آخر یہ شخص تم سے کس چیز میں مختلف ہے؟ ویسا ہی گوشت پوست کا آدمی ہے جیسے تم ہو۔ کوئی فرق اس میں اور تم میں نہیں ہے۔ پھر یہ کیوں بڑا بنے اور تم اس کے فرمان کی اطاعت کیوں کرو؟" ان تقریروں میں یہ بات گویا بلا نزاع تسلیم شدہ تھی کہ بشر ہونے کے باوجود ہم جو تمہارے سردار ہیں تو ہمیں تو ہونا ہی چاہیے۔ ہمارے گوشت پوست اور کھانے پینے کی نوعیت کی طرف دیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ زیرِ بحث ہماری سرداری نہیں ہے کیونکہ وہ تو آپ سے آپ قائم اور مسلّم ہے، البتہ زیرِ بحث یہ نئی سرداری ہے جو اب قائم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی بات سردارانِ قومِ نوحؑ کی بات سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی جن کے نزدیک قابلِ الزام اگر کوئی چیز تھی تو "اقتدار کی وہ بھوک" تھی جو کسی نئے آنے والے کے اندر محسوس ہو، یا جس کے ہونے کا شبہہ کیا جا سکے۔ رہا ان کا اپنا پیٹ، تو وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار بہرحال اس کی فطری خوراک ہے جس سے اگر وہ بدہضمی کی حد تک بھی بھر جائے تو قابلِ اعتراض نہیں۔ (۳۱)

آپ پر یہ الزام کہ آپ کاہن ہیں اور شیاطین آپ پر نازل ہوتے ہیں۔

کفارِ مکہ آپ پر یہ الزام بھی لگاتے تھے کہ آپ کاہن ہیں، اور یہ قرآن جو آپ پیش کر رہے ہیں اسے فرشتے نہیں بلکہ شیاطین آپ پر نازل کرتے ہیں۔ اس کا ذکر قرآن میں متعدد مقامات پر کیا گیا اور اس کا جواب دیا گیا۔

فَذَكِّرْ فَمَا أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ۔ (الطور ـ ۲۹)

"پس اے نبی، تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون"

"کاہن" عربی زبان میں جوتشی، غیب گو اور سیانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ ایک مستقل پیشہ تھا۔ کاہنوں کا دعویٰ تھا، اور ان کے بارے میں ضعیف الاعتقاد لوگ بھی یہ سمجھتے تھے کہ وہ ستارہ شناس ہیں، یا ارواح اور شیاطین اور جنوں سے اُن کا خاص تعلق ہے جس کی بدولت وہ غیب کی خبریں معلوم کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز اگر کھوئی جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کہاں پڑی ہے۔ کسی کے ہاں چوری ہو جائے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ چور کون ہے۔ کوئی اپنی قسمت پوچھے تو وہ بتا سکتے ہیں کہ اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اِنہی اغراض کے لیے لوگ اُن کے پاس جاتے تھے اور وہ کچھ نذر نیاز لے کر انہیں غیب کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی بسا اوقات بستیوں میں آواز لگاتے پھرتے تھے تاکہ لوگ اُن کی طرف رجوع کریں۔ ان کی ایک خاص وضع قطع ہوتی تھی جس سے وہ الگ پہچانے جاتے تھے۔ ان کی زبان بھی عام بول چال سے مختلف ہوتی تھی۔ وہ مُقفّٰی اور مُسجّع فقرے خاص لہجے میں ذرا ترنم کے ساتھ بولتے تھے اور بالعموم ایسے گول مول الفاظ استعمال کرتے تھے جن سے ہر شخص اپنے مطلب کی بات نکال لے۔ قریش کے سرداروں نے عوام کو فریب دینے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کاہن ہونے کا الزام صرف اس بنا پر لگا دیا کہ آپ اُن حقائق کی خبر دے رہے تھے جو لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہیں، اور آپ کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا کی طرف سے ایک فرشتہ آکر آپ پر وحی نازل کرتا ہے، اور خدا کا جو کلام آپ پیش فرما رہے تھے وہ بھی مُقفّٰی تھا۔ لیکن عرب میں کوئی شخص بھی اُن کے اِس الزام سے دھوکا نہ کھا سکتا تھا۔ اس لیے کہ کاہنوں کے پیشے اور اُن کی وضع قطع اور ان کی زبان اور ان کے کاروبار سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کیا کام کرتے ہیں، کس غرض کے لیے لوگ ان کے پاس جاتے ہیں، کیا باتیں وہ ان کو بتاتے ہیں، ان کے مسجع فقرے کیسے ہوتے ہیں، اور کن مضامین پر وہ مشتمل ہوتے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی کاہن کا سرے سے یہ کام ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ قوم میں جو عقائد رائج الوقت تھے ان کے خلاف ایک عقیدہ لے کر اٹھتا اور شب و روز اس کی تبلیغ میں اپنی جان کھپاتا اور اس کی خاطر ساری قوم کی دشمنی مول لیتا۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہانت کا یہ الزام برائے نام بھی کوئی مناسبت نہ رکھتا تھا کہ یہ پھبتی آپ پر چسپاں ہو سکتی اور عرب

کا کوئی کُند ذہن سے کُند ذہن آدمی بھی اس سے دھوکا کھا جاتا۔ اسی بنا پر اُن کے اس الزام کی تردید میں کوئی دلیل پیش کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت محسوس نہ کی گئی، کیونکہ یہ آپ اپنی ہی تردید تھا۔ بس یہ فرمانے پر اکتفا کیا گیا کہ اے نبی، تم ان کے الزامات کی پروا کیے بغیر بندگانِ خدا کو غفلت سے چونکانے اور حقیقت سے خبردار کرنے کا کام کیے چلے جاؤ، کیونکہ نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون۔ (۴۳)

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ۝ (التکویر: ۲۵-۲۶)

"اور یہ کسی شیطانِ مردود کا قول نہیں ہے، پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟"

یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی شیطان آ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ باتیں پھونک دیتا ہے۔ شیطان کا آخر یہ کام کب ہو سکتا ہے کہ وہ انسان کو شرک اور بُت پرستی اور دہریت و الحاد سے ہٹا کر خدا پرستی اور توحید کی تعلیم دے۔ انسان کو شتر بے مہار بن کر رہنے کے بجائے خدا کے حضور ذمہ داری اور جوابدہی کا احساس دلائے۔ جاہلانہ رسوم اور ظلم اور بد اخلاقی اور بدکرداری سے منع کر کے پاکیزہ زندگی، عدل اور تقویٰ اور اخلاقِ فاضلہ کی طرف رہنمائی کرے۔ (۴۴)

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝ (الشعراء۔ ۲۱۰ تا ۲۱۲)

"اس کتاب کو شیاطین لے کر نہیں اُترے ہیں، نہ یہ کام اُن کو سجتا ہے اور نہ وہ ایسا کر ہی سکتے ہیں۔ وہ تو اس کی سماعت سے بھی دُور رکھے گئے ہیں۔"

کفارِ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جھوٹ کی جو مہم چلا رکھی تھی اس میں سب سے بڑی مشکل انہیں یہ پیش آ رہی تھی کہ اُس حیرت انگیز کلام کی کیا توجیہ کی جائے جو قرآن کی شکل میں لوگوں کے سامنے آ رہا تھا اور دلوں میں اُترا چلا جاتا تھا۔ یہ بات تو اُن کے بس میں نہ تھی کہ لوگوں تک اس کے پہنچنے کو روک سکیں۔ اب پریشان کُن مسئلہ اُن کے لیے یہ تھا کہ لوگوں کو اس سے بدگمان کرنے اور اس کی تاثیر سے بچانے کے لیے کیا بات بنائیں۔ اس گھبراہٹ میں جو الزامات انہوں نے عوام میں پھیلائے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ کاہن ہیں اور عام کاہنوں کی طرح ان پر بھی یہ کلام شیاطین القا کرتے ہیں۔ اس الزام کو وہ اپنا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ کسی کے پاس یہ جانچنے کے لیے آخر کیا ذریعہ ہو سکتا ہے کہ یہ کلام کوئی فرشتہ لاتا ہے یا شیطان؟ اور شیطانی القاء کی تردید کوئی کرے گا تو آخر کیسے؟

اللہ تعالیٰ نے اس پر فرمایا کہ یہ کلام اور یہ مضامین شیاطین کے منہ پر پھبتے ہی نہیں۔ کوئی عقل رکھتا ہو تو خود سمجھ سکتا ہے کہ کہیں یہ باتیں جو قرآن میں کہی جا رہی ہیں شیاطین کی طرف سے بھی ہو سکتی ہیں؟ کیا

تمہاری بستیوں میں کاہن موجود نہیں ہیں اور شیاطین سے ربط ضبط رکھ کر جو باتیں وہ کرتے ہیں تم نے کبھی نہیں سنیں؟ کیا تم نے کبھی سُنا کہ کسی شیطان نے کسی کاہن کے ذریعے سے لوگوں کو خدا پرستی اور خدا ترسی کی تعلیم دی ہو؟ شرک و بُت پرستی سے روکا ہو؟ آخرت کی باز پُرس کا خوف دلایا ہو؟ ظلم اور بدکاری اور بداخلاقیوں سے منع کیا ہو؟ نیکوکاری اور راستبازی اور خلقِ خدا کے ساتھ احسان کی تلقین کی ہو؟ شیاطین کا یہ مزاج کہاں ہے؟ اُن کا مزاج تو یہ ہے کہ لوگوں میں فساد ڈلوائیں اور انہیں بُرائیوں کی طرف رغبت دلائیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے کاہنوں کے پاس تو لوگ یہ پوچھنے جاتے ہیں کہ عاشق کو معشوق ملے گا یا نہیں؟ جوئے میں کون سا داؤں مفید رہے گا؟ دشمن کو نیچا دکھانے کے لیے کیا چال چلی جائے؟ اور فلاں شخص کا اُونٹ کس نے چُرایا ہے؟ یہ معاملات چھوڑ کر کاہنوں اور ان کے سرپرست شیاطین کو خلقِ خدا کی اصلاح، بھلائیوں کی تعلیم اور بُرائیوں کے استیصال کی فکر کب سے لاحق ہو گئی؟ شیاطین اگر چاہیں بھی تو یہ کام ان کے بس کا نہیں ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے آپ کو انسانوں کے سچے معلّم اور حقیقی مُزکّی کے مقام پر رکھ کر خالص حق اور خالص خیر کی وہ تعلیم دے سکیں جو قرآن دے رہا ہے۔ وہ دھوکا دینے کی خاطر بھی یہ بہروپ دھاریں تو ان کا کام ایسی آمیزشوں سے خالی نہیں ہو سکتا جو ان کی جہالت اور ان کے اندر چھپی ہوئی شیطانی فطرت کی غمّازی نہ کریں۔ نیت کی خرابی، ارادوں کی ناپاکی، مقاصد کی خباثت اور اخلاق کی گندگی اُس شخص کی زندگی میں بھی اور اس کی تعلیم میں بھی جھلک کر رہے گی جو شیاطین سے الہام حاصل کر کے پیشوا بن بیٹھا ہو۔ بے آمیز راستی اور خالص نیکی نہ شیاطین القاء کر سکتے ہیں اور نہ ان سے ربط ضبط رکھنے والے اس کے حامل ہو سکتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ شیاطین کا قرآن کے القاء میں دخیل ہونا تو درکنار، جس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے رُوح الامین اس کو لے کر چلتا ہے اور جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر وہ اس کو نازل کرتا ہے، اس پورے سلسلے میں کسی جگہ بھی شیاطین کو کان لگا کر سُننے تک کا موقع نہیں ملتا۔ وہ آس پاس کہیں پھٹکنے بھی نہیں پاتے کہ سُن گُن لے کر ہی کوئی بات اُچک لے جائیں اور جا کر اپنے دوستوں کو پہلے سے یہ بتا دیں کہ آج محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ پیغام سُنانے والے ہیں، یا ان کی تقریر میں فلاں بات کا بھی ذکر آنے والا ہے۔ (۲۴۳)

یہ الزام کہ آپؐ کو کچھ دوسرے لوگ سکھاتے پڑھاتے ہیں

کفارِ قریش ایک طرف تو یہ کہتے تھے کہ معاذ اللہ شیاطین آپؐ پر قرآن کا القاء کرتے ہیں، اور دوسری طرف اس کے بالکل برعکس وہ یہ الزام بھی لگاتے تھے کہ آپ کچھ دوسرے لوگوں سے سیکھ پڑھ کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں:

ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ۔ (الدُّخان۔۱۴)

"پھر انہوں نے رسول کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہنے لگے "یہ تو سکھایا پڑھایا ہوا مجنون ہے۔"

ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ بے چارا تو سیدھا سادھا آدمی تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے اسے بھڑ تیل پر چڑھا لیا، وہ در پردہ قرآن کی آیتیں گھڑ گھڑ کر اسے پڑھا دیتے ہیں، یہ آ کر عام لوگوں کے سامنے انہیں پیش کر دیتا ہے، وہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ گالیاں اور پتھر کھاتا پھرتا ہے۔ اس طرح ایک چلتا ہوا فقرہ کہہ کر وہ اُن ساری دلیلوں اور نصیحتوں اور مفید تعلیمات کو اڑا دیتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رسول سے ان کے سامنے پیش کر کر کے تھکے جا رہے تھے۔ وہ نہ اُن معقول باتوں پر کوئی توجہ کرتے تھے جو قرآن مجید میں بیان کی جا رہی تھیں، نہ یہ دیکھتے تھے کہ جو شخص یہ باتیں پیش کر رہا ہے وہ کس پائے کا آدمی ہے اور نہ یہ الزام رکھتے وقت ہی وہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ ہم یہ کیا بکواس کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص در پردہ بیٹھ کر سکھانے پڑھانے والا ہوتا تو وہ حضرت خدیجہؓ اور ابوبکرؓ اور علیؓ اور زیدؓ بن حارثہ اور بیسیوں دوسرے ابتدائی مسلمانوں سے آخر کیسے چھپ جاتا جن سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب اور ہر وقت کا ساتھی کوئی نہ تھا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ سب سے بڑھ کر حضور کے گرویدہ اور معتقد تھے؟ حالانکہ در پردہ کسی دوسرے شخص کے سکھانے پڑھانے سے نبوت کا کاروبار چلایا گیا ہوتا تو یہی لوگ آپ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ (۳۵)

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّهُمْ يَقُولُونَ إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ ۗ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ۔ (النحل - ۱۰۳)

"ہمیں معلوم ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا ہے۔ حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف ہے اس کی زبان عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔"

روایات میں مختلف اشخاص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کفارِ مکہ اُن میں سے کسی پر یہ گمان کرتے تھے۔ ایک روایت میں اُس کا نام جَبر بیان کیا گیا ہے جو عامر بن الحضرمی کا ایک رُومی غلام تھا۔ دوسری روایت میں حُوَیطب بن عبدالعزّیٰ کے ایک غلام کا نام لیا گیا ہے جسے عائش یا یعیش کہتے تھے۔ ایک اور روایت میں یَسار کا نام لیا گیا ہے جس کی کنیت ابو فکیہہ تھی اور جو مکے کی ایک عورت کا یہودی غلام تھا۔ ایک اور روایت بلعان یا بلعام نامی ایک رُومی غلام سے متعلق ہے۔ بہر حال ان میں سے جو بھی ہو، کفارِ مکہ نے محض یہ دیکھ کر کہ ایک شخص توراۃ اور انجیل پڑھتا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے ملاقات ہے، بے تکلف یہ الزام گھڑ دیا کہ اس قرآن کو دراصل وہ تصنیف کر رہا ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اسے اپنی طرف سے خدا کا نام لے لے کر پیش کر رہے ہیں۔ اس سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے مخالفین آپ کے خلاف افترا پردازیاں کرنے میں کس قدر بے باک تھے، بلکہ یہ سبق بھی ملتا ہے کہ لوگ اپنے ہم عصروں کی قدر و قیمت پہچاننے میں کتنے بے انصاف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے تاریخ انسانی کی ایک ایسی عظیم شخصیت تھی جس کی نظیر نہ اُس وقت دُنیا بھر میں کہیں موجود تھی اور نہ آج تک پائی گئی ہے مگر اِن عقل کے اندھوں کو اُس کے مقابلہ میں ایک عجمی غلام جو کچھ توراۃ و انجیل پڑھ لیتا تھا، قابلِ تر نظر آ رہا تھا اور وہ گمان کر رہے تھے کہ یہ گوہر نایاب اِس کوئلے سے چمک حاصل کر رہا ہے۔ (۳۶)

حضورؐ کے صاحبِ وحی ہونے کا ایک صریح ثبوت

قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

"(اے نبیؐ) تم اُس وقت مغربی گوشے (یعنی طُورِ سینا کے دامن میں) موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو یہ فرمانِ شریعت عطا کیا اور نہ تم اِس واقعہ کے شاہدین میں سے تھے بلکہ اس کے بعد تمہارے زمانے تک ہم بہت سی نسلیں اُٹھا چکے ہیں اور اُن پر بہت زمانہ بیت چکا ہے۔ تم اہلِ مدین کے درمیان بھی موجود نہ تھے کہ اُن کو ہماری آیات سنا رہے ہوتے۔ مگر (اُس وقت کی یہ خبریں) بھیجنے والے ہم ہیں۔ اور تم طُور کے دامن میں اُس وقت موجود نہ تھے جب ہم نے موسیٰؑ کو (پہلی مرتبہ) پکارا تھا۔ مگر یہ تمہارے رب کی رحمت ہے (کہ تم کو یہ معلومات دی جا رہی ہیں) تاکہ تم ایک ایسی قوم کو خبردار کر دو جس کے پاس تم سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ یہ لوگ ہوش میں آئیں۔" (القصص ۔ ۴۴ تا ۴۶)

یہ تینوں باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں کہ یہ معلومات حاصل ہونے کا کوئی ذریعہ آپؐ کے پاس اللہ کی وحی کے سوا نہیں ہے۔ جس وقت قرآن مجید میں یہ باتیں کہی گئی تھیں اس وقت مکہ کے تمام سردار اور عام کفار اس بات پر تُلے ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کو غیر نبی اور معاذ اللہ جھوٹا مدعیٔ نبوت ثابت کر دیں۔ ان کی مدد کے لیے یہود کے علماء اور عیسائیوں کے راہب بھی حجاز کی بستیوں میں موجود تھے۔ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں عالمِ بالا سے آ کر یہ قرآن نہیں سنا جاتے تھے بلکہ اسی مکہ کے رہنے والے تھے اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ آپ کی بستی اور آپ کے قبیلے کے لوگوں سے چھپا ہوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت اِس کھلے چیلنج کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے طور پر یہ تینوں باتیں ارشاد فرمائی گئیں، اُس وقت مکے اور حجاز اور پورے عرب میں کوئی ایک شخص بھی اٹھ کر وہ بے ہودہ بات نہ کہہ سکا جو آج کے مستشرقین کہتے ہیں۔ اگرچہ جھوٹ گھڑنے میں وہ لوگ ان سے کچھ کم نہ تھے لیکن ایسا دروغ بے فروغ آخر وہ کیسے بول سکتے تھے جو ایک لمحہ کے لیے بھی نہ چل سکتا ہو۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمدؐ

(صلی اللہ علیہ وسلم) تم فلاں فلاں یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں سے یہ معلومات حاصل کراتے ہو، کیونکہ پورے ملک میں وہ اس غرض کے لیے کسی کا نام نہیں لے سکتے تھے جس کا نام بھی وہ لیتے فوراً ہی یہ ثابت ہو جاتا کہ اُس سے آنحضرتؐ نے کوئی معلومات حاصل نہیں کی ہیں۔ وہ کیسے کہتے کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے پاس پچھلی تاریخ اور علوم و آداب کی ایک لائبریری موجود ہے جس کی مدد سے تم یہ ساری تقریریں کر رہے ہو، کیونکہ لائبریری تو درکنار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کہیں سے وہ ایک کاغذ کا پرزہ بھی برآمد نہیں کر سکتے تھے جس میں یہ معلومات لکھی ہوئی ہوں۔ مکے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لکھے پڑھے آدمی نہیں ہیں اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ نے کچھ مترجمین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو عبرانی اور سریانی اور یونانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے آپ کو دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا لیے حیا آدمی بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہ رکھتا تھا کہ شام و فلسطین کے تجارتی سفروں میں آپ یہ معلومات حاصل کر آئے تھے کیونکہ یہ سفر تنہا نہیں ہوتے تھے۔ مکے ہی کے تجارتی قافلے ہر سفر میں آپ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سینکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپ نے کسی سے کوئی درس نہیں لیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد تو دو سال کے اندر ہی رومی سلطنت سے مسلمان برسرِ پیکار ہو گئے تھے۔ اگر کہیں جھوٹوں بھی شام و فلسطین میں کسی عیسائی راہب یا یہودی ربی سے حضورؐ نے کوئی مذاکرہ کیا ہوتا تو رومی سلطنت رائی کا پہاڑ بنا کر یہ پروپیگنڈا کرنے میں ذرا دریغ نہ کرتی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) معاذ اللہ سب کچھ یہاں سے سیکھ گئے تھے اور مکے جا کر نبی بن بیٹھے۔ غرض اُس زمانے میں جبکہ قرآن کا یہ چیلنج قریش کے کفار و مشرکین کے لیے پیغامِ موت کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کو جھٹلانے کی ضرورت موجودہ زمانے کے مستشرقین کی بہ نسبت اُن لوگوں کو بدرجہا زیادہ لاحق تھی، کوئی شخص بھی کہیں سے ایسا کوئی مواد فراہم کر کے نہ لا سکا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کے سوا اِن معلومات کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہے جس کی نشاندہی کی جا سکتی ہو۔ (۳۴)

حضورؐ پر مجنون ہونے کا الزام

جو بے سروپا الزامات کفارِ قریش حضورؐ پر لگا رہے تھے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ معاذ اللہ مجنون ہیں۔ اِسی معنیٰ میں وہ آپ کو مسحور (سحر زدہ یا جادو کا مارا ہوا آدمی) بھی کہتے تھے، اور یہی اُن کے اس قول کا مطلب بھی تھا کہ آپ پر جِنّ کا اثر ہے۔ قرآن مجید میں اُن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ:

وَيَقُولُونَ أَئِنَّا لَتَارِكُوٓا۟ ءَالِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍۭ ۔ (الصّٰفّٰت -۳۶)

"اور وہ کہتے ہیں "کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک مجنون شاعر کی خاطر چھوڑ بیٹھیں؟"

دوسری جگہ اُن کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ:

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا۔ (الفرقان۔ ۸)

"اور یہ ظالم کہتے ہیں کہ تم تو بس ایک جادو کے مارے ہوئے آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو"

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ۔ (المومنون۔ ۷۰)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اس پر جن کا اثر ہے؟ (یعنی جن کے اثر سے یہ مجنون ہو گیا ہے)"

اِن سارے اعتراضات کا مطلب ایک ہی تھا، کیونکہ اہلِ عرب کے نزدیک آدمی کی دیوانگی کے وجوہ دو ہی تھے۔ یا تو کسی نے جادو کر کے اُسے پاگل بنا دیا ہو، یا کوئی جن اس پر مسلط ہو گیا ہو۔ (۳۸)

قرآن مجید میں اُن کے یہ اعتراضات دراصل یہ بتانے کے لیے نقل کیے گئے تھے کہ معترضین کس قدر عناد اور تعصب میں اندھے ہو چکے ہیں۔ اُن کے جو اعتراضات یہاں اور دوسرے مقامات پر بیان کیے گئے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس لائق نہ تھا کہ اُس پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی جاتی۔ ان کا بس ذکر کر دینا ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ مخالفین کا دامن دلائل سے کس قدر خالی ہے اور وہ کیسی لچر اور پوچ باتوں سے ایک مدلل اصلاحی دعوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک شخص کہتا ہے لوگو! یہ شرک جس پر تمہارے مذہب و تمدن کی بنیاد قائم ہے ایک غلط عقیدہ ہے اور اس کے غلط ہونے کے یہ اور یہ دلائل ہیں۔ جواب میں شرک کے برحق ہونے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی بس آوازہ کس دیا جاتا ہے کہ یہ جادو کا مارا ہوا آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کا سارا نظام توحید پر چل رہا ہے اور یہ یہ حقائق ہیں جو اس کی شہادت دیتے ہیں۔ جواب میں شور بلند ہوتا ہے جادوگر ہے۔ وہ کہتا ہے تم دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیئے گئے ہو بلکہ تمہیں اپنے رب کے پاس پلٹ کر جانا ہے، دوسری زندگی میں اپنے اعمال کا حساب دینا ہے اور اس حقیقت پر یہ اخلاقی اور یہ تاریخی اور یہ علمی و عقلی اُمور دلالت کر رہے ہیں۔ جواب میں کہا جاتا ہے شاعر ہے۔ وہ کہتا ہے میں خدا کی طرف سے تمہارے لیے تعلیمِ حق لے کر آیا ہوں اور یہ ہے وہ تعلیم۔ جواب میں اُس تعلیم پر کوئی بحث و تنقید نہیں ہوتی۔ بس بلا ثبوت ایک الزام چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ کہیں سے نقل کر لیا گیا ہے۔ وہ اپنی رسالت کے ثبوت میں خدا کے معجزانہ کلام کو پیش کرتا ہے، خود اپنی زندگی اور اپنی سیرت و کردار کو پیش کرتا ہے اور اُس اخلاقی انقلاب کو پیش کرتا ہے جو اس کے اثر سے اس کے پیروؤں کی زندگی میں ہو رہا تھا۔ مگر مخالفت کرنے والے ان میں سے کسی چیز کو بھی نہیں دیکھتے۔ پوچھتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ تم کھاتے کیوں ہو؟ بازاروں میں کیوں چلتے پھرتے ہو؟ تمہاری اردل میں کوئی فرشتہ کیوں

نہیں آیا ہے ؟ تمہارے پاس کوئی خزانہ یا باغ کیوں نہیں ہے ؟ یہ باتیں خود ہی بتا رہی تھیں کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور کون اس کے مقابلے میں عاجز آ کر بے تکی ہانک رہا ہے۔ (۳۹)

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (سبا - ۴۶)

"اے نبی، ان سے کہو کہ "میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو، تمہارے رفیق میں آخر ایسی کونسی بات ہے جو جنون کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تمہیں متنبہ کرنے والا ہے۔"

یعنی اغراض اور خواہشات اور تعصبات سے پاک ہو کر خالصتہً للہ غور کرو۔ ہر شخص الگ الگ بھی نیک نیتی کے ساتھ سوچے اور دو دو چار چار آدمی سر جوڑ کر بھی بے لاگ طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر کے تحقیق کریں کہ آخر وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر آج تم اس شخص کو مجنون ٹھیرا رہے ہو جسے کل تک تم اپنے درمیان نہایت دانا آدمی سمجھتے تھے ؟ آخر نبوت سے تھوڑی ہی مدت پہلے کا تو واقعہ تھا کہ تعمیر کعبہ کے بعد حجرِ اسود نصب کرنے کے مسئلہ پر جب قبائل قریش باہم لڑ پڑے تھے تو تم ہی لوگوں نے بالاتفاق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تسلیم کیا تھا اور انہوں نے ایسے طریقے سے اس جھگڑے کو چکایا تھا جس پر تم سب مطمئن ہو گئے تھے۔ جس شخص کی عقل و دانش کا یہ تجربہ تمہاری ساری قوم کو ہو چکا ہے اب کیا بات ایسی ہو گئی کہ تم اسے مجنون کہنے لگے ؟ ہٹ دھرمی اور ضد کی بات تو دوسری ہے، مگر کیا واقعی تم اپنے دلوں میں بھی وہی کچھ سمجھتے ہو جو اپنی زبانوں سے کہتے ہو ؟ وہ تمہیں ایک سخت عذاب کے آنے سے پہلے خبردار کر رہا ہے۔ کیا یہی وہ قصور ہے جس کی بنا پر تم اسے جنون کا مریض ٹھیراتے ہو ؟ کیا تمہارے نزدیک عقلمند وہ ہے جو تمہیں تباہی کے راستے پر جاتے دیکھ کر کہے کہ شاباش بہت اچھے جا رہے ہو ؟ اور مجنون وہ ہے جو تمہیں برا وقت آنے سے پہلے خبردار کر دے اور فساد کی جگہ صلاح کی راہ بتائے ؟ (۴۰)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ بِهٖ جِنَّةٌ (المومنون - ۷۰)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص کو جنون ہے ؟"

یعنی کیا ان کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ واقعی یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون سمجھتے ہیں ؟ ظاہر ہے کہ یہ اس کی اصل وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ زبان سے چاہے وہ کچھ ہی کہتے رہیں، دلوں میں تو وہ ان کی دانائی و زیرکی کے قائل ہیں۔ علاوہ بریں ایک پاگل اور ایک ہوشمند آدمی کا فرق کوئی ایسا چھپا ہوا

تو نہیں ہوتا کہ دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو۔ آخر ایک ہٹ دھرم اور بے حیا آدمی کے سوا کون اس کلام کو سُن کر یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی دیوانے کا کلام ہے؟ اور اس شخص کی زندگی کو دیکھ کر کون یہ بات ظاہر کر سکتا ہے کہ یہ کسی مخبوط الحواس آدمی کی زندگی ہے؟ بڑا ہی عجیب ہے وہ جنون دیا منتشر تصور جو کفر کی بکواس کے مطابق مرگی کا دَورہ جس میں آدمی کی زبان سے قرآن جیسا کلام نکلے اور جس میں آدمی ایک تحریک کی ایسی کامیاب رہنمائی کرے کہ اپنے ہی ملک کی نہیں، دُنیا بھر کی قسمت بدل ڈالے۔ (۴۱)

مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ وَاِنَّ لَكَ لَاَجۡرًا غَيۡرَ مَمۡنُوۡنٍ ۚ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيۡمٍ ۚ (القلم: ۲تا۴)

" اے نبی، تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔ اور یقیناً تمہارے لیے ایسا اجر ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔"

اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہاں خطاب بظاہر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا، لیکن اصل مقصود کفار کو اُن کی تہمت کا جواب دینا تھا۔ لہٰذا کسی شخص کو یہ شبہہ نہ ہو کہ یہ آیت حضورؐ کو یہ اطمینان دلانے کے لیے نازل ہوئی تھی کہ آپ مجنون نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ کو اپنے متعلق تو ایسا کوئی شبہہ نہ تھا کہ اُسے دُور کرنے کے لیے آپ کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہوتی۔ مدعا کفار سے یہ کہنا تھا کہ تم جس قرآن کی وجہ سے اُس کے پیش کرنے والے کو مجنون کہہ رہے ہو وہی تمہارے اِس الزام کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہے۔ البتہ حضورؐ کو جس بات کی تسلی دی گئی تھی وہ یہ تھی کہ آپؐ کے لیے بے حساب اور لازوال اجر ہے کیونکہ آپ خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں اُن کے جواب میں آپ کو ایسی ایسی اذیت ناک باتیں سُننی پڑ رہی ہیں اور پھر بھی آپ اپنے اِس فرض کو انجام دیے چلے جا رہے ہیں۔

پھر یہ بتایا گیا کہ آپ کے بلند اخلاق اِس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کفار آپ پر دیوانگی کی جو تہمت رکھ رہے ہیں وہ سراسر جھوٹی ہے۔ کیونکہ اخلاق کی بلندی اور دیوانگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دیوانہ وہ شخص ہوتا ہے جس کا ذہنی توازن بگڑا ہُوا ہو اور جس کے مزاج میں اعتدال باقی نہ رہا ہو۔ اس کے برعکس آدمی کے بلند اخلاق اِس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نہایت صحیح الدماغ اور سلیم الفطرت انسان ہے اور اُس کا ذہن اور مزاج غایت درجہ متوازن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق جیسے کچھ تھے، اہلِ مکہ اِن سے ناواقف نہ تھے۔ اس لیے اُن کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی اِس بات کے لیے کافی تھا کہ مکہ کا ہر معقول آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ وہ لوگ کس قدر بے شرم ہیں جو ایسے بلند اخلاق آدمی کو مجنون کہہ رہے ہیں۔ ان کی یہ بیہودگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں بلکہ خود اُن

کے لیے نقصان دہ تھی کہ مخالفت کے جوش میں پاگل ہو کر وہ آپ کے متعلق ایسی بات کہہ رہے تھے جسے کوئی ذی فہم آدمی قابلِ تصور نہ مان سکتا تھا۔ یہی معاملہ اُن مدعیانِ علم و تحقیق کا بھی ہے جو اس زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مرگی اور جنون کی تہمت رکھ رہے ہیں۔ قرآنِ پاک دنیا میں ہر جگہ مل سکتا ہے، اور حضورؐ کی سیرت بھی اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ لکھی ہوئی موجود ہے۔ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو لوگ اِس بے مثل کتاب کے پیش کرنے والے اور ایسے بلند اخلاق رکھنے والے انسان کو ذہنی مریض قرار دیتے ہیں وہ عداوت کے اندھے جذبے سے مغلوب ہو کر کیسی لغویات کہہ رہے ہیں۔ (۴۲)

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ (الاعراف: ۱۸۴)

"کیا اِن لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہے۔"

رفیق سے مُراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ کیونکہ آپ مکّہ ہی کے لوگوں میں پیدا ہُوئے، انہی کے درمیان رہے بسے، بچپے سے جوان اور جوان سے بڑھے ہُوئے۔ نبوّت سے پہلے ساری قوم آپؐ کو ایک نہایت سلیم الطبع اور صحیح الدماغ آدمی کی حیثیت سے جانتی تھی۔ نبوت کے بعد جب آپؐ نے خدا کا پیغام پہنچانا شروع کیا تو یکایک آپ کو مجنون کہنے لگی۔ ظاہر ہے کہ یہ حکمِ جنون اُن باتوں پر نہ تھا جو آپؐ نبی ہونے سے پہلے کرتے تھے۔ بلکہ صرف اُنہی باتوں پر لگایا جا رہا تھا جن کی آپ نے نبی ہونے کے بعد تبلیغ شروع کی۔ اسی وجہ سے فرمایا جا رہا ہے کہ اِن لوگوں نے کبھی سوچا بھی ہے؟ آخر اِن باتوں میں سے کون سی بات جنون کی ہے؟ کونسی بات بے تکی، بے اصل اور غیر معقول ہے؟ اگر یہ آسمان و زمین کے نظام پر غور کرتے یا خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کو بھی بنظرِ تأمل دیکھتے تو انہیں خود معلوم ہو جاتا کہ شرک کی تردید، توحید کے اثبات، بندگیِ رب کی دعوت اور انسان کی ذمّہ داری و جوابدہی کے بارے میں جو کچھ اِن کا بھائی انہیں سمجھا رہا ہے اس کی صداقت پر یہ پُورا نظامِ کائنات اور خلق اللہ کا ذرّہ ذرّہ شہادت دے رہا ہے۔ (۴۳)

شاعری کا الزام

کفّارِ قریش حضورؐ پر شاعر ہونے کا الزام بھی رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعرِ مجنون کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا:

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ (الشعراء۔ آیت ۲۲۴)

"اور شُعراء کے پیچھے تو بہکے ہُوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔"

یعنی شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اخلاق، عادات و خصائل اور اُفتادِ مزاج میں اُن لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راستبازی اور خدا ترسی ہے۔ بات بات میں ذمہ داری کا احساس ہے۔ برتاؤ میں لوگوں کے حقوق کا پاس و لحاظ ہے۔ معاملات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے۔ اور زبان جب کھلتی ہے خیر ہی کے لیے کھلتی ہے، شر کا کلمہ اُس سے کبھی ادا نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دُھن میں یہ رات دن لگے رہتے ہیں اور ان کی ساری زندگی ایک مقصدِ عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اُچھل اُچھل کر اُن پر داد دے رہے ہیں۔ کہیں کسی زنِ بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حُسن موضوعِ سخن ہے اور سُننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں۔ کہیں جنسی مواصلت کی حکایت بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت مسلط ہے۔ کہیں ہزل بکا جا رہا ہے یا مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔ کہیں کسی کی ہجو اُڑائی جا رہی ہے اور لوگ اُس سے لطف لے رہے ہیں۔ کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اُس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں۔ اور کہیں کسی کے خلاف نفرت، عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگ جاتی ہے۔ ان مجلسوں میں شاعروں کے کلام سننے کے لیے جو ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگتے ہیں اور بڑے بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رَو میں بہنے والے، اور لطف و لذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو بھی نہیں گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند مقصد اور نصب العین بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کا کھلا کھلا فرق دانستہ اگر کسی کو نظر نہیں آتا تو وہ اندھا ہے، اور اگر سب کچھ دیکھ کر بھی کوئی محض حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایمان قتل کر کے یہ کہتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے گرد جمع ہونے والے لوگ اُسی قبیل کے ہیں جیسے شعراء اور ان کے پیچھے لگے رہنے والے لوگ ہوتے ہیں، تو وہ جھوٹ بولنے میں بے حیائی کی ساری حدیں پار کر گیا ہے۔ (۲)

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝ (الشعراء۔ آیت ۲۲۵)

"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ (یعنی شعراء) ہر وادی میں بھٹکتے ہیں؟"

یعنی کوئی ایک متعیّن راہ نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوّتِ گویائی صرف کرتے ہوں بلکہ اُن کا توسنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جذبات و خواہشات اور اغراض و مقاصد کی ہر نئی رَو اُن کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اِس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صدق بھی ہے۔ کبھی ایک لہر اٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں، اور کبھی دوسری لہر آئی تو اُسی زبان سے انتہائی گندے سفلی جذبات کا ترشّح شروع ہو گیا۔ کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اُسے آسمان پر چڑھا دیا اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اُسی کو تحت الثریٰ میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بُزدل کو رُستم و اسفندیار پر فضیلت دینے میں اُنہیں ذرا تأمل نہیں ہوتا اگر اُس سے کوئی غرض وابستہ ہو۔ اِس کے برعکس کسی سے رنج پہنچ جائے تو اُس کی پاک زندگی پر دھبّہ لگانے اور اُس کی عزّت پر خاک پھینکنے میں، بلکہ اس کے نسب پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ خدا پرستی اور دہریّت، مادّہ پرستی اور روحانیت، حُسنِ اخلاق اور بداخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائے گا۔ شعراء کی اِن معروف خصوصیات سے جو شخص بھی واقف تھا اس کے دماغ میں یہ بات کیسے اُتر سکتی تھی کہ اِس قرآن کے لانے والے پر شاعری کی تہمت رکھی جائے جس کی تقریر جچی تُلی، جس کی بات دو ٹوک، جس کی راہ بالکل واضح اور مُتعیّن ہے، اور جس نے حق اور راستی اور بھلائی کی دعوت سے ہٹ کر کبھی ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ آپ کے مزاج کو تو شاعری کے ساتھ سرے سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (یٰسٓ آیت ۶۹) "ہم نے اُس کو شعر نہیں سکھایا ہے نہ یہ اُس کے کرنے کا کام ہے۔" یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ جو لوگ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ سب اِسے جانتے تھے۔ معتبر روایات میں آیا ہے کہ کوئی شعر پورا حضورؐ کو یاد نہ تھا۔ دورانِ گفتگو میں کبھی کسی شاعر کا کوئی اچھا شعر زبانِ مبارک پر آتا بھی تو غیر موزوں پڑھ جاتے تھے یا اس میں الفاظ کا اُلٹ پھیر ہو جاتا تھا۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ دورانِ تقریر میں آپؐ نے شاعر کا مصرع یوں نقل کیا:

كفى بالاسلام والشيب للمرء ناهيا

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اصل مصرع یوں ہے:

كفى الشيب والاسلام للمرء ناهياً

ایک مرتبہ عباس بن مرداس سُلَمی سے آپ نے پوچھا کیا تم ہی نے یہ شعر کہا ہے:

اتجعل نهبي ونهب العبيد بين الاقرع وعُيَينه

انہوں نے عرض کیا آخری فقرہ یوں نہیں ہے بلکہ یوں ہے، بَيْنَ عُيَيْنَةَ والاقرع۔ آپ نے فرمایا معنی میں تو دونوں یکساں ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ حضورؐ کبھی اشعار بھی اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے تھے؟ انہوں نے فرمایا شعر سے بڑھ کر آپؐ کو کسی چیز سے نفرت نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھار بنی قیس کے شاعر کا ایک شعر پڑھتے تھے مگر اول کو آخر اور آخر کو اول پڑھ جاتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ عرض کرتے یا رسول اللہ یوں نہیں بلکہ یوں ہے، تو آپؐ فرماتے "بھائی میں شاعر نہیں ہوں اور نہ شعر گوئی میرے کرنے کا کام ہے۔" جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے، یا شراب نوشی کے، یا قبائلی منافرت اور جنگ وجدل کے، یا نسلی فخر وغرور کے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، ڈینگیں، طعن، پھبتیاں اور مشرکانہ خرافات تو اس شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اس شاعری کے متعلق یہ تھی کہ لان يمتلئ جوف احدكم قيحا خير له من ان يمتلئ شعرا "تم میں سے کسی شخص کا خول پیپ سے بھر جانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرے۔" تاہم جس شعر میں کوئی اچھی بات ہوتی تھی آپ اس کی داد بھی دیتے تھے اور آپؐ کا ارشاد تھا کہ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً "بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں۔" اُمَیّہ بن ابی الصَّلت کا کلام سُن کر آپؐ نے فرمایا اٰمَنَ شِعْرُہٗ وَكَفَرَ قَلْبُہٗ۔ "اس کا شعر مومن ہے مگر اس کا دل کافر ہے۔" ایک مرتبہ ایک صحابی نے سَو کے قریب عمدہ عمدہ اشعار آپ کو سُنائے اور آپ فرماتے گئے ھیہ "اور سناؤ۔" (۴۵)

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۔ (الشعراء، آیت ۲۲۶)

"اور وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔"

یہ شاعروں کی ایک اور خصوصیت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کی عین ضد تھی۔ حضورؐ کے متعلق آپ کا ہر جاننے والا جانتا تھا کہ آپؐ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہی کہتے ہیں۔ آپؐ کے قول اور فعل کی مطابقت ایسی صریح حقیقت تھی جس سے آپ کے گرد وپیش کے معاشرے میں کوئی انکار نہ کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس شعراء کے متعلق کس کو معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں کہنے کی باتیں اور ہیں اور کرنے

کی اور سخاوت کا مضمون اس زور شور سے بیان کریں گے کہ آدمی سمجھے کہ شاید ان سے بڑھ کر دریا دل کوئی نہ ہوگا، مگر عمل میں کوئی دیکھے تو معلوم ہوگا کہ سخت بخیل ہیں۔ بہادری کی باتیں کریں گے مگر خود بزدل ہوں گے۔ بے نیازی اور قناعت اور خودداری کے مضامین باندھیں گے مگر خود حرص و طمع میں ذلت کی آخری حد کو پار کر جاتیں گے۔ دوسروں کی ادنیٰ کمزوریوں پر گرفت کریں گے مگر خود بدترین کمزوریوں میں مبتلا ہوں گے۔ (۲۹)

مخالفین کے الزامات کا تضاد اور اس پر قرآن کی گرفت

پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کفار مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر متضاد الزامات لگاتے تھے اور کوئی ایک الزام تیقن کے ساتھ انہوں نے کبھی نہیں لگایا۔ قرآن مجید میں اُن کی اِسی کمزوری پر گرفت کر کے ان کا جھوٹا ہونا ثابت کیا گیا۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ (الطور: ۲۹ تا ۳۲)

"پس اے نبیؐ! تم نصیحت کیے جاؤ، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کاہن ہو اور نہ مجنون کیا لوگ کہتے ہیں کہ یہ شخص شاعر ہے جس کے حق میں ہم گردشِ ایام کا انتظار کر رہے ہیں؟ ان سے کہو اچھا انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ کیا ان کی عقلیں انہیں ایسی ہی باتیں کرنے کے لیے کہتی ہیں؟ یا درحقیقت یہ عناد میں حد سے گزر گئے ہیں؟"

ان چند فقروں میں مخالفین کے سارے پروپیگنڈے کی ہوا نکال کر انہیں بالکل بے نقاب کر دیا گیا ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ قریش کے سردار اور شیوخ بڑے عقلمند بنے پھرتے ہیں، مگر کیا ان کی عقل یہی کہتی ہے کہ جو شخص شاعر نہیں ہے اسے شاعر کہو، جسے ساری قوم ایک دانا آدمی کی حیثیت سے جانتی ہے اُسے مجنون کہو، اور جس شخص کا کہانت سے کوئی دُور دراز کا تعلق بھی نہیں ہے اُسے خواہ مخواہ کاہن قرار دو۔ پھر اگر عقل ہی کی بنا پر یہ لوگ حکم لگاتے تو کوئی ایک حکم لگاتے بہت سے متضاد حکم تو ایک ساتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ ایک شخص آخر بیک وقت شاعر، مجنون اور کاہن کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ مجنون ہے تو نہ کاہن ہو سکتا ہے نہ شاعر۔ کاہن ہے تو شاعر نہیں ہو سکتا اور شاعر ہے تو کاہن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شعر کی زبان اور اس کے موضوعات بحث الگ ہوتے ہیں اور کہانت کی زبان اور اس کے مضامین الگ۔ ایک ہی کلام کو بیک وقت شعر بھی کہنا اور کہانت بھی قرار دینا کسی ایسے آدمی کا کام نہیں ہو سکتا جو شعر

اور کہانت کا فرق جانتا ہو نہیں ہے۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں یہ متضاد باتیں عقل سے نہیں بلکہ سراسر عناد اور ہٹ دھرمی سے کی جا رہی ہیں، اور قوم کے یہ بڑے بڑے سردار ضد کے جوش میں اندھے ہو کر محض بے سروپا الزامات لگا رہے ہیں جنہیں کوئی سنجیدہ انسان قابل اعتناء نہیں سمجھ سکتا۔ (۱۴)

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا - بنی اسرائیل ۴۸

•اے نبی، دیکھو کیسی باتیں ہیں جو یہ لوگ تم پر چھانٹتے ہیں۔ یہ بھٹک گئے ہیں، انہیں راستہ نہیں ملتا۔

یعنی یہ تمہارے متعلق کوئی ایک رائے ظاہر نہیں کرتے بلکہ مختلف اوقات میں بالکل مختلف اور متضاد باتیں کہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں تم خود جادوگر ہو۔ کبھی کہتے ہیں تم پر کسی اور نے جادو کر دیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں تم شاعر ہو۔ کبھی کہتے ہیں تم مجنون ہو اور کبھی یہ کہ کاہن ہو۔ ان کی یہ متضاد باتیں خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ حقیقت ان کو معلوم نہیں ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ وہ آئے دن ایک نئی بات چھانٹنے کے بجائے کوئی ایک قطعی رائے ظاہر کرتے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے کسی قول پر بھی مطمئن نہیں ہیں۔ ایک الزام رکھتے ہیں، پھر آپ ہی محسوس کرتے ہیں کہ یہ چسپاں نہیں ہوتا۔ اس کے بعد دوسرا الزام لگاتے ہیں اور اسے بھی لگتا ہوا نہ پا کر ایک تیسرا الزام تصنیف کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کا ہر نیا الزام ان کے پہلے الزام کی تردید کر دیتا ہے اور اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ صداقت سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

محض عداوت کی بنا پر ایک سے ایک بڑھ کر جھوٹ گھڑے جا رہے ہیں۔ ([illegible])

بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيجٍ - (ق ۵)

•بلکہ ان لوگوں نے تو جس وقت حق ان کے پاس آیا اُسی وقت اسے صاف جھٹلا دیا۔ اسی وجہ سے اب یہ الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس مختصر سے فقرے میں بھی ایک بہت بڑا مضمون بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے صرف تعجب کرنے اور بعید از عقل ٹھہرانے ہی پر اکتفا نہ کیا، بلکہ جس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتِ حق پیش کی اُسی وقت بلا تأمل اُسے قطعی جھوٹ قرار دے دیا۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ ہونا تھا اور یہی ہوا کہ انہیں اس دعوت اور اس کے پیش کرنے والے رسول کے معاملہ میں کسی ایک موقف پر قرار نہیں ہے۔ کبھی آپ کو شاعر کہتے ہیں، تو کبھی کاہن اور کبھی مجنون۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ جادوگر ہے اور کبھی کہتے ہیں کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ اپنی بڑائی قائم کرنے کے لیے خود یہ چیز بنا لایا ہے اور کبھی یہ

الزام تراشتے ہیں کہ اس کے پس پشت کچھ دوسرے لوگ ہیں جو یہ کلام گھڑ گھڑ کر اُسے دیتے ہیں۔ یہ متضاد باتیں خود ظاہر کرتی ہیں کہ یہ لوگ اپنے موقف میں بالکل الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اِس اُلجھن میں یہ ہرگز نہ پڑتے اگر جلد بازی کر کے نبیؐ کو پہلے ہی قدم پر جھٹلا نہ دیتے اور بلا فکر و تامل ایک پیشگی فیصلہ صادر کر دینے سے پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے کہ یہ دعوت کون پیش کر رہا ہے، کیا بات کہہ رہا ہے اور اس کے لیے دلیل کیا دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص اِن کے لیے اجنبی نہ تھا۔ کہیں سے اچانک ان کے درمیان نہ آ کھڑا ہُوا تھا۔ اِن کی اپنی ہی قوم کا فرد تھا۔ اِن کا اپنا دیکھا بھالا آدمی تھا۔ یہ اُس کی سیرت و کردار اور اُس کی قابلیت سے ناواقف نہ تھے۔ ایسے آدمی کی طرف سے جب ایک بات پیش کی گئی تھی تو چاہیے اسے فوراً قبول نہ کر لیا جاتا، مگر وہ اس کی مستحق بھی تو نہ تھی کہ سُنتے ہی اسے رد کر دیا جاتا۔ پھر وہ بات بے دلیل بھی نہ تھی۔ وہ اس کے لیے دلائل پیش کر رہا تھا۔ چاہیئے تھا کہ اُس کے دلائل کھلے کانوں سے سُنے جاتے اور تعصب کے بغیر اُن کو جانچ کر دیکھا جاتا کہ وہ کہاں تک معقول ہیں۔ لیکن یہ روش اختیار کرنے کے بجائے جب ان لوگوں نے ضد میں آ کر ابتداء ہی میں اُسے جھٹلا دیا تو اُس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ایک حقیقت تک پہنچنے کا دروازہ تو انہوں نے اپنے لیے خود بند کر لیا اور ہر طرف بھٹکتے پھرنے کے بہت سے راستے کھول لیے۔ اب یہ اپنی ابتدائی غلطی کو نباہنے کے لیے دس متضاد باتیں تو بنا سکتے ہیں، مگر اس ایک بات کو سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ نبی سچا بھی ہو سکتا ہے اور اُس کی پیش کردہ بات حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔ (۴۹)

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۔ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۔ (الفرقان - ۴۱-۴۲)

"اے نبیؐ، یہ لوگ جب تمہیں دیکھتے ہیں تو بس تمہارا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ (کہتے ہیں) کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اس نے تو ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم اُن کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے۔"

کفار کی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ پہلی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو حقیر سمجھ رہے ہیں اور مذاق اڑا کر آپ کی قدر گرانا چاہتے ہیں، گویا ان کے نزدیک آنحضرتؐ نے اپنی حیثیت سے بہت اونچا دعویٰ کر دیا تھا۔ دوسری بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کے دلائل کی قوت اور آپؐ کی شخصیت کا لوہا مان رہے ہیں اور بے ساختہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگر ہم تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے خداؤں کی بندگی پر جم نہ گئے ہوتے تو یہ شخص ہمارے قدم اکھاڑ چکا ہوتا۔ یہ متضاد باتیں خود بتا رہی ہیں کہ اسلامی تحریک نے ان لوگوں کو کس قدر بوکھلا دیا تھا۔ کھسیانے ہو کر مذاق بھی اُڑاتے تھے تو

احساسِ کمتری بلا ارادہ ان کی زبان سے وہ باتیں نکلوا دیتا تھا جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دلوں میں وہ اس طاقت سے کس قدر مرعوب ہیں۔ (۵۰)

طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ

الزامات کی بوچھاڑ کرنے کے ساتھ ساتھ کفارِ قریش بار بار آپؐ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اُن مطالبات کا ذکر آیا ہے اور ان کا جواب دیا گیا ہے:

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۝ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۝ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۝ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۝ (بنی اسرائیل۔ ۹۰ تا ۹۳)

"اور انہوں نے کہا ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے، اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایک ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں"۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو "پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟"

معجزات کے مطالبے کا ایک جواب اسی سورہ کی آیت وَمَا مَنَعَنَا أَن نُّرْسِلَ بِالْآيَاتِ میں گزر چکا ہے[1]۔ اب یہاں اسی مطالبے کا دوسرا جواب دیا گیا ہے۔ اس مختصر سے جواب کی بلاغت تعریف

---

[1] وہ جواب یہ تھا کہ جو معجزات کسی نبی کی دلیلِ نبوت کے طور پر پیش کیے گئے ہوں اُن کو دیکھ کر بھی جب کوئی قوم نبی کو جھٹلا دیتی ہے تو اس پر لامحالہ خدا کا عذاب نازل ہو جاتا ہے اور اس کی کثرت مثالیں تاریخ میں گزر چکی ہیں۔ اب یہ سراسر اللہ کی رحمت ہے کہ وہ ایسا کوئی معجزہ نہیں بھیج رہا ہے مگر تم لوگ ایسے نادان ہو کہ اس کا مطالبہ کر رہے ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

سے بالاتر ہے۔ مخالفین کا مطالبہ تھا کہ اگر تم پیغمبر ہو تو ابھی زمین کی طرف اشارہ کرو اور یکایک ایک چشمہ پھوٹ بہے۔ یا فوراً ایک لہلہاتا باغ پیدا ہو جائے اور اس میں نہریں جاری ہو جائیں۔ آسمان کی طرف اشارہ کرو اور تمہارے جھٹلانے والوں پر آسمان ٹکڑے ہو کر گر جائے۔ ایک پھونک مارو اور چشم زدن میں سونے کا ایک محل بن کر تیار ہو جائے۔ ایک آواز دو اور ہمارے سامنے خدا اور اس کے فرشتے فوراً آ کھڑے ہوں اور وہ شہادت دیں کہ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ یا ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ کر جاؤ اور اللہ میاں سے ایک خط ہمارے نام لکھوا لاؤ جسے ہم ہاتھ سے چھوئیں اور آنکھوں سے پڑھیں ــــــ ان لمبے چوڑے مطالبوں کا بس یہ جواب دے کر چھوڑ دیا گیا کہ "ان سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" یعنی بیوقوفو! کیا میں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا کہ تم یہ مطالبے مجھ سے کرنے لگے؟ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میں قادر مطلق ہوں؟ میں نے کب کہا تھا کہ زمین و آسمان پر میری حکومت چل رہی ہے؟ میرا دعویٰ تو اول روز سے یہی تھا کہ میں خدا کی طرف سے پیغام لانے والا ایک انسان ہوں۔ تمہیں جانچنا ہے تو میرے پیغام کو جانچو۔ ایمان لانا ہے تو اس پیغام کی صداقت و معقولیت دیکھ کر ایمان لاؤ۔ انکار کرنا ہے تو اس پیغام میں کوئی نقص نکال کر دکھاؤ۔ میری صداقت کا اطمینان کرنا ہے تو ایک انسان ہونے کی حیثیت سے میری زندگی کو، میرے کام کو دیکھو۔ یہ سب چھوڑ کر تم مجھ سے یہ کیا مطالبے کرنے لگے کہ زمین پھاڑو اور آسمان گراؤ؟ آخر پیغمبری کا ان کاموں سے کیا تعلق ہے؟ (۵۸)

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۔ (العنکبوت: ۵۰-۵۱)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں (یعنی معجزات) اس کے رب کی طرف سے؟ کہو، نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں بس ایک صاف صاف خبردار کر دینے والا ہوں۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت اُن لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

یعنی اُمّی ہونے کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا کیا بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ آپ کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے یہ کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے

تو صرف اُس شخص کے لیے جو دنیا کی موجودہ زندگی کو ایک عارضی زندگی سمجھتا ہو اور یہ تسلیم کرتا ہو کہ اصلی اور ابدی زندگی آخرت کی زندگی ہے جہاں حق کا انجام لازمًا اچھا ہوگا اور باطل کا انجام لازمًا بُرا ہوگا ایسا شخص قرآن معقول دلائل اور اُن پاکیزہ تعلیمات کو دیکھ کر ایمان لاتے گا جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں، اور اپنی عقل سے کام لے کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ قرآن جن عقائد اور اعمال کو غلط کہہ رہا ہے ان میں فی الواقع کیا غلطی ہے لیکن آخرت کا منکر جو سرے سے تلاشِ حق میں سنجیدہ ہی نہیں ہے وہ ایمان نہ لانے کے لیے آئے دن نت نئے مطالبے پیش کرے گا، حالانکہ اس کا خواہ کوئی مطالبہ بھی پورا کر دیا جاتے وہ انکار کرنے کے لیے کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈ نکالے گا یہی بات ہے جو سورۂ انعام میں فرمائی گئی ہے کہ "اے نبیؐ! اگر ہم تمہارے اوپر کاغذ میں لکھی لکھائی کوئی کتاب بھی اُتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھُو کر بھی دیکھ لیتے تو جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے" (انعام-۷) (۵۴)

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ (الانعام-۸-۹)

"وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اُتارا گیا؟ اگر کہیں ہم نے فرشتہ اُتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا، پھر انہیں کوئی مُہلت نہ دی جاتی۔ اور اگر ہم فرشتے کو اُتارتے تب بھی اسے انسانی شکل میں اُتارتے اور اِس طرح انہیں اسی شبہ میں ڈال دیتے جس میں اب یہ مبتلا ہیں۔"

اُن لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ جب یہ شخص خدا کی طرف سے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے تو آسمان سے ایک فرشتہ اُترنا چاہیے تھا جو لوگوں سے کہتا کہ یہ خدا کا پیغمبر ہے، اِس کی بات مانو ورنہ تمہیں سزا دی جائے گی۔ جاہل معترضین کو اِس بات پر تعجب تھا کہ خالقِ ارض و سماء کسی کو پیغمبر مقرر کرے اور پھر اِس طرح اسے بے یار و مددگار پتھر کھانے اور گالیاں سُننے کے لیے چھوڑ دے۔ اتنے بڑے بادشاہ کا سفیر اگر کسی بڑے لاؤ لشکر کے ساتھ نہ آیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کی اردلی میں دینا چاہیے تھا تاکہ وہ اس کی حفاظت کرتا اس کا رُعب بٹھاتا، اس کی ماموریت کا یقین دلاتا اور خرقِ الفطری طریقے سے اس کے کام انجام دیتا۔

اس کا پہلا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر فرشتہ اپنی اصلی صورت میں بھیج دیا جاتا تو فیصلہ چُکا دینے کا وقت آ جاتا اور پھر مہلت نہ دی جاتی۔ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کے لیے جو مہلت تمہیں ملی ہوئی ہے یہ اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔ ورنہ جہاں غیب کا پردہ چاک ہُوا، پھر مہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے گا۔ اُس کے بعد تو صرف حساب ہی لینا باقی

رہ جاتے گا۔ اس لیے کہ دنیا کی زندگی تمہارے لیے ایک امتحان کا زمانہ ہے اور امتحان اس امر کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل و فکر کے صحیح استعمال سے اس کا ادراک کرتے ہو یا نہیں اور ادراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق درست رکھتے ہو یا نہیں۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرط لازم ہے۔ اور تمہاری دنیوی زندگی جو دراصل مہلت امتحان ہے، اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک غیب، غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا، یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجہ امتحان نکلنے کا وقت آپہنچے گا۔ لہٰذا تمہارے مطالبہ کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے سامنے فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں نمایاں کر دیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ ابھی تمہارے امتحان کی مدت ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کے بعد دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر فرشتہ انسانی صورت میں آتا تو تمہیں وہی شبہات لاحق ہوتے جواب نبی کے بارے میں لاحق ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فرشتے کے آنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے علانیہ اپنی اصلی غیبی صورت میں ظاہر ہوتا لیکن اوپر بتا دیا گیا ہے کہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ اب دوسری صورت یہ باقی رہ گئی کہ وہ انسانی صورت میں آئے۔ اس کے متعلق فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ انسانی صورت میں آتے تو اس کے مامور من اللہ ہونے میں بھی تم کو وہی اشتباہ پیش آئے گا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مامور من اللہ ہونے میں پیش آ رہا ہے۔ (۴۳)

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ (الانعام: ۳۷-۳۹)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس (نبی) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی (یعنی حسی معجزہ) کیوں نہیں اُتاری گئی؟ اِن سے کہو کہ اللہ نشانی اُتارنے کی پوری قدرت رکھتا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔ زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔ ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں وہ بہرے اور گونگے ہیں، تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔"

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ اس کے دکھانے پر قادر نہیں ہے

بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جسے تم لوگ اپنی نادانی کی وجہ سے نہیں سمجھ رہے ہو۔ اگر تمہیں محض تماشا بینی کا شوق نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ معلوم کرنے کے لیے نشانی دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے وہ امر حق ہے یا نہیں، تو آنکھیں کھول کر دیکھو، تمہارے گرد و پیش ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمین کے جانوروں اور ہوا کے پرندوں کی کسی ایک نوع کو لے کر اس کی زندگی پر غور کرو، کس طرح اس کی ساخت ٹھیک ٹھیک اس کے مناسب حال بنائی گئی ہے، کس طرح اس کی جبلت میں اس کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق قوتیں ودیعت کی گئی ہیں، کس طرح اس کی رزق رسانی کا انتظام ہو رہا ہے، کس طرح اس کی ایک تقدیر مقرر ہے جس کے حدود سے نہ وہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے، کس طرح ان میں سے ایک ایک جانور اور ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کی اسی مقام پر جہاں وہ ہے خبر گیری، نگرانی، حفاظت اور رہنمائی کی جا رہی ہے، کس طرح اس سے ایک مقرر اسکیم کے مطابق کام لیا جا رہا ہے، کس طرح اسے ایک ضابطہ کا پابند بنا کر رکھا گیا ہے اور کس طرح اس کی پیدائش، تناسل اور موت کا سلسلہ پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اگر خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے صرف اسی ایک نشانی پر غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ خدا کی توحید اور اس کی صفات کا جو تصور یہ پیغمبر تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے اور اس تصور کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس رویہ کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہے وہ عین حق ہے۔ لیکن تم لوگ نہ خود اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتے ہو نہ کسی سمجھانے والے کی بات سنتے ہو۔ جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہوئے ہو اور چاہتے ہو کہ عجائب قدرت کے کرشمے دکھا کر تمہارا دل بہلایا جائے۔ (۵۵)

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ۚ

(الرعد-۳۱)

— اور کیا ہو جاتا اگر کوئی قرآن ایسا اتار دیا جاتا جس کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے، یا زمین شق ہو جاتی، یا مردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟

اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس میں خطاب کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان جب بار بار کفار کی طرف سے نشانی کا مطالبہ سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بے چینی پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کو کوئی ایسی نشانی دکھا دی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے۔ پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نہ آنے کی وجہ سے کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل رہا ہے تو ان کی یہ بے چینی اور بھی زیادہ بڑھ

جاتی تھی۔ اِس پر مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ اگر قرآن کی کسی سورت کے ساتھ ایسی اور ایسی نشانیاں بھی ایک دکھا بھی دی جائیں تو کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے ؟ کیا تمہیں ان سے یہ خوش گمانی ہے کہ یہ قبولِ حق کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں، صرف ایک نشانی کے ظہور کی کسر ہے ؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں، کائنات کے آثار میں، نبیؐ کی پاکیزہ زندگی میں، اصحابِ نبیؐ کے انقلابِ حیات میں تذکیر نظر نہ آیا کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مُردوں کے قبروں سے نکل آنے میں کوئی روشنی پالیں گے ؟ (۶۱)

حضورؐ کی رسالت کا صریح ثبوت

اس طرح کفار نے جتنے بھی الزامات و اعتراضات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کیے اور اس کا ثبوت مانگنے کے لیے جتنے بھی معجزات دکھانے کے مطالبات کیے، ان میں سے ایک ایک کا نہایت معقول جواب دے کر یہ گنجائش باقی نہیں رہنے دی گئی کہ کوئی شخص عقل و استدلال کی بنیاد پر آپؐ کی رسالت کو مشتبہ ثابت کر سکتا۔ پھر بہت ایسے صریح ثبوت آپؐ کی رسالت کے حق میں پیش کیے گئے جن کے مقابلہ میں کسی شخص کے لیے انکار کی گنجائش نہ تھی۔ ہم ان کو مختصراً پیش کرتے ہیں:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۔ (العنکبوت۔ ۴۸)

"(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست شک میں پڑ سکتے تھے۔"

اس آیت میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اَن پڑھ تھے۔ آپؐ کے اہلِ وطن اور رشتہ دار برادری کے لوگ جن کے درمیان بعمرِ پیدائش سے سنِ کہولت کو پہنچنے تک آپؐ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپؐ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ قلم ہاتھ میں لیا۔ اس امرِ واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات، انبیاء سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے اسے کبھی کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس کی اُمّیت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص

ہٹ دھرمی کے سوا اس کی نبوت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی درجہ میں بھی معقول کہا جا سکتا ہو۔ (۵۷)

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (یونس - ۱۶)

"(اے نبیؐ) ان سے کہو کہ "اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی (کہ میں نبی نہ بنایا جاؤں) تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟"

یہ ایک زبردست دلیل تھی کفارِ مکہ کے اس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ گھڑ کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور حضورؐ کے اس دعوے کی تائید میں کہ آپ خود اس کے مصنف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی آپؐ پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو بہت دور کی چیز تھے، مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو ان لوگوں کے سامنے کی چیز تھی۔ آپؐ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے۔ ان کے شہر میں پیدا ہوئے، ان کی آنکھوں کے سامنے بچپن گزارا، جوان ہوئے، ادھیڑ عمر کو پہنچے، رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انہی کے ساتھ تھا اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی؟

آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا:

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی تھی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعوائے نبوت کے ساتھ ہی آپؐ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ ان مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے، اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے تھے جو اب قرآن کی ان پے در پے سورتوں میں زیر بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپؐ کے کسی گہرے سے گہرے دوست اور کسی قریب سے قریب رشتہ دار نے بھی آپؐ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی تھی جسے اس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا جو آپؐ نے اچانک چالیس سال کی عمر کو پہنچ کر دینی شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپؐ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ خارج سے آپؐ کے اندر آتی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے

کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپؐ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ مکہ تو درکنار، پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپؐ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپؐ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپؐ سے سابقہ پیش آیا تھا وہ آپؐ کو ایک نہایت سچے، بے داغ، اور قابل اعتماد، امین انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل و فریب لے کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور اور تحدی کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کے اس بیہودہ الزام کے جواب میں ان سے کہو کہ اللہ کے بندو کچھ عقل سے تو کام لو۔ میں کوئی باہر سے آیا ہوا اجنبی آدمی تو نہیں ہوں، تمہارے درمیان ایک عمر اس سے پہلے گزار چکا ہوں۔ میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم کیسے یہ توقع مجھ سے کر سکتے ہو کہ میں خدا کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر یہ قرآن تمہارے سامنے پیش کر سکتا تھا؟ (۵۸)

وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ۔ (القصص۔ ۸۶)

"اور اے نبیؐ! تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی۔ یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی ہے (کہ یہ تم پر نازل ہوئی ہے)۔"

یہ ایک اور دلیل تھی جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام بالکل بے خبر تھے کہ انہیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان مشن پر وہ مامور کیے جانے والے ہیں، ان کے حاشیہ خیال میں بھی اس کا ارادہ یا خواہش تو درکنار اس کی توقع تک کبھی نہ گزری تھی، بس یکایک راہ چلتے انہیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام ان سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا

تھا۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا۔ مکے کے لوگ خود جانتے تھے کہ غارِ حرا سے جس روز آپ نبوت کا پیغام لے کر اُترے اس سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی کیا تھی، آپ کے مشاغل کیا تھے، آپ کی بات چیت کیا تھی، آپ کی گفتگو کے موضوعات کیا تھے، آپ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں۔ یہ پوری زندگی صداقت، دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی۔ اس میں انتہائی شرافت، امن پسندی، پاسِ عہد، ادائے حقوق اور خدمتِ خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا، مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال گزر سکتا کہ یہ نیک بندہ کل نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ آپ سے قریب ترین ربط ضبط رکھنے والوں میں، آپ کے رشتہ داروں، ہمسایوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے اُن مضامین اور مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک لفظ تک آپ کی زبان سے نہ سُنا تھا جو غارِ حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد یکایک آپ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپ کو وہ مخصوص زبان اور وہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرتے نہ سُنا تھا جو اچانک قرآن کی صورت میں لوگ آپ سے سُننے لگے۔ کبھی آپ وعظ کہنے کھڑے نہ ہوئے تھے۔ کبھی کوئی دعوت اور تحریک لے کر نہ اُٹھے تھے، بلکہ کبھی آپ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ آپ اجتماعی مسائل کے حل، یا مذہبی اصلاح، یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں۔ اُس انقلابی ساعت سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سیدھے سادے جائز طریقوں سے اپنی روزی کماتا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتا ہے، مہمانوں کی تواضع، غریبوں کی مدد اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کرنے کے لیے خلوت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا یکایک ایک عالمگیر زلزلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اُٹھنا، ایک انقلاب انگیز دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا لٹریچر پیدا کر دینا، ایک مستقل فلسفۂ حیات اور نظامِ فکر و اخلاق و تمدن لے کر سامنے آجانا، اتنا بڑا تغیر تھا جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری اور ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً رُونما نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری بہرحال تدریجی ارتقا کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل اُن لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی شب و روز زندگی گزار رہا ہو۔ اگر آنحضرتؐ کی زندگی اِن مراحل سے گزری ہوتی تو مکے میں سینکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے کہ یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کفارِ مکہ نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے مگر یہ اعتراض کرنے والا ان میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپؐ خود بھی نبوت کے نہ خواہشمند تھے، نہ اس کے لیے متوقع اور منتظر تھے، بلکہ پوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپ کو اس معاملہ سے سابقہ پیش آ گیا، اس کا ثبوت اُس واقعہ سے ملتا ہے جو احادیث میں آغازِ وحی کی کیفیت کے متعلق موجود ہے۔ (چونکہ اس سے پہلے ہم "آغازِ رسالت" کے باب میں اس کی تفصیل درج کر چکے ہیں، اس لیے یہاں اس کے اعادے کی حاجت نہیں ہے) (۹۹)

فصل سوم

قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان کی دعوت

دعوتِ اسلامی کا تیسرا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ لوگ قرآنِ مجید کو اللہ کی کتاب تسلیم کریں، اُس کی ہر بات کو حق اور مِن جانب اللہ مانیں، اُس میں عقائد، افکار، اخلاق، عبادات اور معاملات کے متعلق جو تعلیم بھی دی گئی ہے اُسے اپنی زندگی کے لیے اساسی قانون قرار دیں، اور ہر اُس چیز کو رد کر دیں جو اس کی ہدایت کے خلاف ہو۔ اس عقیدے میں یہ ماننا بھی لازماً شامل تھا کہ قرآن لفظ بلفظ اللہ کا کلام ہے جو جبریلِ امین کے ذریعے سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف معانی آپؐ کے دل میں ڈال دیے گئے ہوں اور آپؐ نے اپنے الفاظ میں اُن کو ادا کر دیا ہو۔ نیز اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ یہ کتاب جن الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے ٹھیک انہی الفاظ میں وہ جوں کی توں محفوظ کر دی گئی ہے۔ اس میں نہ کوئی تبدیلی ہوئی ہے، نہ کوئی کمی یا بیشی ہوئی ہے، اور نہ باطل اس میں کسی طرح داخل ہو سکتا ہے۔ علاوہ بریں یہ کتاب چونکہ براہِ راست اللہ رب العالمین کا کلام ہے اس لیے یہ خود رسول پر بھی حاکم ہے۔ اگرچہ یہ آئی رسول ہی کے ذریعہ سے ہے، مگر رسول اُس کا تابع ہے، اُس کے اتباع پر مامور ہے، اس کے اندر اپنی طرف سے کچھ گھٹانے یا بڑھانے کا مجاز نہیں ہے، بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے وہ خود اس کی پیروی کرے، اور پھر اسی کے منشا کے مطابق دین اور پورے نظامِ حیات کو قائم کر دے۔

یہ عقیدہ اُس انقلاب کو اور زیادہ مستحکم کر رہا تھا جو برپا کرنا اسلام کے پیشِ نظر تھا، اس لیے کہ اس نے خدا کی طرف سے ایک مستقل کتاب فراہم کر دی تھی جس میں خدا نے خود اپنے الفاظ میں صاف صاف بتا دیا

تھا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اب لوگ ہر وقت ہر زمانے میں اس کی طرف رجوع کر کے معلوم کر سکتے ہیں کہ اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ ایک انسان کو رسول بنانے کے ساتھ ایک کتاب بھی اس کے ساتھ نازل کر دینا اور لوگوں کو دونوں پر ایمان لانے اور دونوں کی اطاعت کرنے کا حکم دینا، لازمی طور پر یہ معنی رکھتا تھا کہ انسانی افراد اور معاشروں میں جہاں بھی اس ایمان اور اس اطاعت کو قبول کر لیا جاتے وہاں سے من مانی کرنے کی آزادی رخصت ہو جاتے، فرد اپنی انفرادی حیثیت میں اور معاشرہ اپنی اجتماعی حیثیت میں ایک رہنما اور ایک کتاب آئین کا تابع فرمان ہو جائے، رہنما کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد بھی کتاب آئین ہر وقت یہ بتانے کے لیے دنیا میں موجود رہے کہ خدا نے کس چیز کا حکم دیا ہے اور کس سے منع کیا ہے، اور رہنما کی چھوڑی ہوئی سنت (جو خود قرآن کی رو سے کلام الٰہی کی مستند سرکاری تشریح و توضیح ہے) اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دے کہ خواہشات نفس کے بندے، یا دوسرے نظریات زندگی کے معتقد، کتاب آئین کو اس کے اصل معنی و مدعا سے ہٹا کر اس کی غلط تعبیریں کرنے لگیں۔

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کی تبلیغ کے آغاز ہی میں توحید اور رسالت محمدیہ کے ساتھ قرآن پر ایمان لانے اور اس کو کلام الٰہی کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی دعوت دینا بھی کیوں ضروری تھا اور اس کی کیا اہمیت تھی۔ اب ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے کہ جس وقت اس قرآن کو پیش کیا گیا تھا اس وقت اُس کی حیثیت کیا بیان کی گئی تھی، اور جو لوگ اس کو کتاب اللہ ماننے سے انکار کر رہے تھے ان کے سامنے کس قدر مضبوط دلائل کے ساتھ اس کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کیا گیا تھا۔

قرآن خدا کا کلام ہے جو لفظاً بلفظ حضورؐ پر وحی کیا گیا ہے

یہ اوّلین بات تھی جسے پورے زور کے ساتھ قرآن میں اس قدر کثرت کے ساتھ بیان کیا گیا کہ اس مضمون کی ساری آیات یہاں نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ پورے قرآن میں کہیں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں پایا جاتا جس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہو کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام ہے۔ ساری کتاب اس حیثیت ہی سے پیش کی گئی ہے کہ یہ خدا کی نازل کردہ وحی ہے۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ
فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ ۴۸)

"اور (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی ہے جو حق لے کر آئی ہے اور کتب الٰہیہ میں سے جو کچھ اس سے پہلے آیا ہوا موجود ہے اُس کی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔

پس تم لوگوں کے درمیان اُس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کی ہے اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے مُنہ موڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔"

اس آیت میں صراحتہً نہ صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی ہے جو ٹھیک ٹھیک حق لے کر آتی ہے، بلکہ دو باتیں اور بھی بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ہر اُس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کے اندر اپنی اصلی اور صحیح صورت میں موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ اُن کتابوں کی محافظ و نگہبان ہے یعنی اِس نے اُن تمام برحق تعلیمات کو اپنے اندر لے کر محفوظ کر دیا ہے جو اُن میں پائی جاتی ہیں، اور جو خلافِ حق باتیں ان کے اندر شامل کر دی گئی ہیں انہیں اِس کتاب کی مدد سے چھانٹ کر الگ کیا جا سکتا ہے۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا

(بنی اسرائیل۔ ۱۰۵)

"اور اِس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہُوا ہے اور (اے محمدؐ) ہم نے تمہیں اِس کے سوا کسی کام کے لیے رسُول بنا کر نہیں بھیجا ہے کہ (جو مان لے اُسے) بشارت دے دو اور (جو نہ مانے) اُسے ڈرا دو۔"

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ (الکہف۔ ۲۷)

"اور (اے نبیؐ) تمہارے رب کی جو کتاب تم پر وحی کی گئی ہے اُسے پڑھ کر سُنا دو۔"

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (الزمر۔ ۴۱)

"(اے محمدؐ) ہم نے تم پر یہ کتاب لوگوں کے لیے حق کے ساتھ نازل کی ہے۔ اب جو ہدایت قبول کرے گا اپنے ہی بھلے کے لیے کرے گا اور جو گمراہ ہو گا اس کا وبال بھی اسی پر ہو گا۔ تم اُن کے ذمہ دار نہیں ہو۔"

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (الشوریٰ۔ ۷)

"اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف عربی زبان کا قرآن وحی کیا تاکہ تم بستیوں کے مرکز (مکہ) اور اس کے گرد و پیش رہنے والوں کو خبردار کر دو۔"

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ۔ (الاحقاف۔ ۱)

"اِس کتاب کا نزول اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔"

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص-۲۹)

"یہ ایک کتاب ہے برکت والی جسے (اے محمدؐ) ہم نے تم پر نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔"

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (النمل-۶)

"اور (اے محمدؐ) یقیناً تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو (یعنی اُس ہستی کی طرف سے جو علم اور حکمت میں کامل ہے)۔"

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۔ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۔ (الشعراء-۱۹۲ تا ۱۹۵)

"اور بلاشبہ یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ اسے لے کر ایک امانت دار روح[1] تمہارے قلب پر اتری ہے، تاکہ (اے محمدؐ) تم تنبیہ (خلق خدا کو خبردار کرنے والے انبیاء) میں سے ہو جاؤ، صاف صاف عربی زبان میں۔"

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۔ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۔ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۔ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔ (القیمٰۃ: ۱۶ تا ۱۹)

"اے نبیؐ اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو اس کی قرأت کو غور سے سنتے رہو۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔"

یہ آیات نہ صرف اس بات کی صراحت کرتی ہیں کہ یہ پوری کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوئی ہے، بلکہ آخری دو آیتیں اس باب میں قطعی صریح ہیں کہ اس کے محض معانی حضور پر القاء نہیں ہوتے ہیں جنہیں آپ اپنے الفاظ میں ادا کرتے ہوں، بلکہ اس کے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتے ہیں۔ روح الامین کا ربُّ العٰلمین کی طرف سے عربی زبان میں وحی لے کر نازل ہونا، اُسے آپ کے سامنے پڑھنا، آپ کا اُسے جلدی جلدی یاد کرنے کی کوشش کرنا، اور اللہ تعالیٰ

---

[1] امانت دار روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جو قرآن لے کر آتے تھے۔ یہاں ان کا نام لینے کے بجائے امانت دار روح کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے یہ بتانا مقصود ہے کہ وہ خالص روح ہیں بلا شائبۂ مادیت، اور ایسے امین ہیں کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اُن کے ذریعہ سے وحی بھیجتا ہے بالکل اسی طرح وہ بلاکم و کاست نبی تک پہنچا دیتے ہیں۔ (حاشیہ از مترجم)

کا یہ فرمایا کہ آپ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ جب یہ پڑھا جا رہا ہو اُس وقت اسے سُنتے رہیں، پھر اُسے یاد کرا دینا، اُسے پڑھوا دینا اور اس کا مطلب سمجھا دینا، سب کچھ ہمارے ذمّہ ہے، یہ ساری باتیں اُسی صورت میں بامعنی ہوتی ہیں جبکہ وحی کے الفاظ بھی اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتے ہوں۔ ورنہ قلبِ رسُول پر محض معانی اور خیالات کا اِلقاء ہونے کی صورت میں اس کے پڑھنے اور سُننے اور یاد کرنے اور بزبانِ عربی اس کے نازل ہونے کے کوئی معنی نہیں رہتے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خود بھی قرآن کے اِتّباع پر مامُور ہیں

قرآن میں اِس بات کی بھی صاف صاف صراحت کر دی گئی کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قرآن کے تابع امر ہیں، اُس کی پیروی پر مامُور ہیں اور آپ کو اس میں کچھ گھٹانے یا بڑھانے یا کسی قسم کا ردّ و بدل کر دینے کا اختیار نہیں ہے۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا۔ (الاحزاب ۲)

"اور (اے نبیؐ) پیروی کرو اُس چیز کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے وحی کی جا رہی ہے۔ جو کچھ تم لوگ کرتے ہو، اللہ اُس سے یقیناً باخبر ہے۔"

اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ۔

(الانعام - ۱۰۶)

"(اے محمدؐ) جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے وحی کیا گیا ہے اُسی کی پیروی کرو۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور مشرکین سے بے پروا ہو جاؤ۔"

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ۔ (الاحقاف - ۹)

(اے محمدؐ اِن سے کہو) میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے شخص کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔"

وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِم بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَتَّبِعُ مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مِن رَّبِّي ۚ هَٰذَا بَصَائِرُ مِن رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (الاعراف ۲۰۳)

"اور (اے نبیؐ) جب تم اِن لوگوں کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے لیے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ اِن سے کہو میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ یہ (قرآن کی آیات) بصیرت کی روشنیاں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت و رحمت ہیں ان لوگوں کے لیے

جو اس پر ایمان لائیں۔"

یعنی میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو، یا جس چیز کی میں خود ضرورت محسوس کروں اُسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کر دوں۔ میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ یہ قرآن ہے۔ اس کے اندر بصیرت افروز روشنیاں موجود ہیں اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اسے مان لیتے ہیں ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے اور ان کے اخلاقِ حسنہ میں رحمتِ الٰہی کے آثار نُمایاں ہونے لگتے ہیں۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ (یونس-۱۵)

"اور جب اُن کو ہماری صاف صاف آیات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو (آخرت میں) ہم سے ملنے کی اُمید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ، یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ (اے محمدؐ) ان سے کہو "مجھے یہ حق نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تبدیلی کر لوں۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے۔"

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝ (الحاقہ-۴۴تا۴۷)

"اور اگر یہ (نبی) خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگِ گردن کاٹ دیتے، پھر تم میں سے کوئی اس میں حائل ہونے والا نہ ہوتا۔"

قرآن ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور اس کی ہر بات اٹل ہے

یہ بات بھی قرآن میں صاف صاف کہہ دی گئی کہ قرآن کو لفظاً بلفظ محفوظ رکھنے کا اللہ نے خود ذمہ لیا ہے، اس کی ہر بات اٹل ہے، اس میں باطل کسی طرف سے راہ نہیں پا سکتا، اور اللہ تعالیٰ آفاق اور انفس میں مسلسل ایسی نشانیاں دکھاتا چلا جائے گا جن سے اس کا حق ہونا ثابت ہو جائے گا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (الحجر-۹)

"ہم ہی نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

یعنی یہ براہِ راست ہماری حفاظت میں ہے۔ نہ کسی کے مٹائے مٹ سکے گا، نہ کسی کے دبائے دب سکے گا، نہ کسی کے طعنوں اور اعتراضوں سے اس کی قدر گھٹ سکے گی، نہ کسی کے روکے اس کی دعوت رُک سکے گی نہ اس میں تحریف اور ردّوبدل کا کسی کو موقع مل سکے گا۔"

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۔ (البروج - ۲۱-۲۲)

بلکہ یہ قرآن بلند پایہ ہے اُس لوح میں (نقش ہے) جو محفوظ ہے۔"

یعنی اِس قرآن کا لکھا اَمِٹ ہے، اَٹل ہے، خدا کی اُس لوح محفوظ میں ثبت ہے جس کے اندر کوئی ردّوبدل نہیں ہو سکتا۔ جو بات اِس میں لکھ دی گئی ہے وہ پوری ہو کر رہنے والی ہے تمام دنیا مل کر بھی اسے باطل کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ۔ (حٰم السجدہ - ۴۲)

"اور حقیقت یہ ہے کہ یہ (قرآن) ایک زبردست کتاب ہے، باطل نہ اس کے آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ اُس ہستی کی نازل کردہ چیز ہے جو حکمت والی ہے اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے۔"

سامنے سے باطل کے نہ آسکنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کر کے کوئی شخص اس کی کسی بات کو غلط اور کسی تعلیم کو باطل و فاسد ثابت کرنا چاہے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پیچھے سے نہ آسکنے کا مطلب یہ ہے کہ بعد میں کبھی کوئی حقیقت و صداقت ایسی منکشف نہیں ہو سکتی جو قرآن کے پیش کردہ حقائق کے خلاف ہو، کوئی علم ایسا نہیں آسکتا جو فی الواقع "علم" ہو اور قرآن کے بیان کردہ علم کی تردید کرتا ہو، کوئی تجربہ اور مشاہدہ ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ ثابت کر دے کہ قرآن نے عقائد، اخلاق، قانون، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور سیاستِ مدن کے باب میں انسان کی جو رہنمائی کی ہے وہ غلط ہے۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔

(حٰم السجدہ - ۵۳)

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کے اپنے نفس میں بھی دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ (قرآن) واقعی برحق ہے۔"

اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ عنقریب اِس قرآن کی دعوت دنیا کے ایک بڑے حصے پر چھا جائے گی اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس کی بدولت انسانی زندگی میں کیسا عظیم مذہبی، اخلاقی،

ذہنی و فکری، تہذیبی و سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب برپا ہوتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جوں جوں آفاقِ ارض و سماء اور خود انسان کے اپنے وجود کے بارے میں انسانی علم کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا قرآن کا برحق ہونا اور زیادہ کھلتا چلا جائے گا۔

قرآن کا انکار کفر ہے

ایمان بالقرآن اسلامی دعوت کا اتنا ہی اہم جز ہے جتنا توحید اور رسالت پر ایمان، اس لیے کسی لگی لپٹی کے بغیر لوگوں کو دعوت دی گئی کہ اس کے کلامِ الٰہی ہونے پر ایمان لاؤ، اور جو اس پر ایمان نہ لاتے وہ کافر ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات میں جن لوگوں کو برسرِ ہدایت قرار دیا گیا ہے ان کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۔ (البقرہ۔۴)

"اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو (اے نبیؐ) تم پر نازل ہوئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔"

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۔ (بنی اسرائیل۔۸۲)

"ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو (اس پر) ایمان لانے والوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے اور (ایمان نہ لانے والے) ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔"

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ۔ (العنکبوت۔۴۷)

"اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔"

کفار کا ردِّ عمل

اس حیثیت سے جب قرآن کو پیش کیا گیا تو کفارِ قریش اور عام مشرکینِ عرب کے لیے اس کو ماننا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول ماننے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا۔ کیونکہ حضورؐ کو رسول مان کر وہ آپ کی اطاعت و پیروی قبول کر بھی لیتے تو یہ اُمید کر سکتے تھے کہ آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد وہ یہ قلادہ اپنی گردن سے اُتار پھینکیں گے۔ لیکن یہاں تو ایک کتاب بھی اس حیثیت سے پیش کی جا رہی تھی کہ اس کا لفظ لفظ اللہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔ اس کتاب کو مسلمان حرفاً حرفاً یاد کر رہے تھے، کیونکہ نماز میں اس کی تلاوت لازم تھی۔ اور حضورؐ ہر وحی کے نزول کے بعد اُسے لکھواتے بھی جا رہے تھے۔ اس چیز سے پیچھا چھٹنے

کی وہ کوئی اُتھید نہ کر سکتے تھے، اور وہ سمجھتے تھے کہ اسے اللہ کا کلام مان لینے کے بعد اُن کی زندگی مستقل طور پر ایک ضابطہ میں کس دی جاتی گی جس سے انحراف کے معنی خداوندِ عالم سے انحراف کے ہوں گے۔ اس لیے انہوں نے قرآن کے کلام اللہ ہونے سے انکار کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا پورا زور لگا دیا، اور ہر ممکن تدبیر اس مقصد کے لیے استعمال کر ڈالی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات ہرگز نہ چلنے پائے۔

تمام کتبِ الٰہیہ کا انکار

اس سلسلے میں اُن کا سب سے پہلا حربہ یہ تھا کہ سرے سے تمام کتبِ الٰہیہ کا انکار کر دیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ۔ (سبا ۳۱)

"اور جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے کہا کہ ہم ہرگز نہ اِس قرآن کو مانیں گے، نہ اِس سے پہلے آئی ہوئی کسی کتاب کو۔"

لیکن اُن کی یہ بات خود اہلِ عرب میں کسی طرح نہ چل سکتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کے صحیفوں کو تو وہ خود مانتے تھے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ تھے، چنانچہ قرآن میں دو جگہ اُن کا حوالہ اِس طرح دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہلِ عرب کے نزدیک مسلّم تھے اگرچہ ان کا کوئی نسخہ ان کے پاس محفوظ نہ تھا[1]۔ اس کے علاوہ عرب میں یہود و نصاریٰ بھی کثرت سے موجود تھے جو کتبِ الٰہیہ کو مانتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کفارِ عرب کو ان کی مدد کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے اس موقف پر زیادہ اصرار نہ کیا۔ (۴۰)

حضورؐ پر قرآن کو خود تصنیف کر لینے کا الزام

پھر انہوں نے سب سے زیادہ زور اپنے اِس الزام پر دیا کہ حضورؐ اِس کو خود تصنیف کر کے اللہ کی طرف منسوب فرما رہے ہیں۔ اس کے بڑے مفصل جوابات قرآن میں دیے گئے اور پُرزور دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا کہ یہ کلامِ الٰہی ہے:

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (السجدہ ۲)

"اِس کلام کی تنزیل بلاشبہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔"

قرآن مجید کی متعدد سورتیں اس طرح کے کسی نہ کسی تعارفی فقرہ سے شروع ہوتی ہیں جس سے مقصود آغازِ کلام ہی میں یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ کلام کہاں سے آ رہا ہے۔ یہ بظاہر اُسی طرح کا ایک تمہیدی فقرہ ہے جیسے ریڈیو پر

---

[1] یہ حوالے النجم، آیت ۳۶، اور الاعلیٰ آیت ۱۹ میں موجود ہیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

اعلان کرنے والا پروگرام کے آغاز میں کہتا ہے کہ ہم فلاں اسٹیشن سے بول رہے ہیں لیکن ریڈیو کے اس معمولی اعلان کے برعکس قرآن مجید کی کسی سورت کا آغاز جب اس غیر معمولی اعلان سے ہوتا ہے کہ یہ پیغام فرمانروائے کائنات کی طرف سے آرہا ہے تو یہ محض مصدرِ کلام کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اس میں ایک بہت بڑا دعویٰ، ایک عظیم چیلنج اور ایک سخت اِنذار بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ چھوٹتے ہی اتنی بڑی خبر دیتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے، خداوندِ عالم کا کلام ہے۔ یہ اعلان فوراً ہی یہ بھاری سوال آدمی کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے کہ اِس دعوے کو تسلیم کروں یا نہ کروں؟ تسلیم کرتا ہوں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہوگا، پھر میرے لیے اس کے مقابلہ میں کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ تسلیم نہیں کرتا تو لامحالہ یہ خطرہ مول لیتا ہوں کہ اگر واقعی یہ خداوندِ عالم کا کلام ہے تو اسے رد کرنے کا نتیجہ مجھ کو ابدی شقاوت و بدبختی کی صورت میں دیکھنا پڑے گا۔ اس بنا پر یہ تمہیدی فقرہ مجرد اپنی اِس غیر معمولی نوعیت ہی کی بنا پر آدمی کو مجبور کر دیتا ہے کہ چوکنّا ہو کر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اِس کلام کو سُنے اور یہ فیصلہ کرے کہ اِس کو کلامِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العٰلمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے بلکہ مزید برآں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ "بیشک یہ خدا کی کتاب ہے، اِس کے مُنزّل من اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے"۔ اِس تاکیدی فقرے کو اگر نزولِ قرآن کے واقعاتی پسِ منظر اور خود قرآن کے اپنے سیاق میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اِس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل مکّہ معظمہ کے اُن باشندوں سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اِس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی اُن کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی بھی اور اس کے بعد کی بھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو شخص اِس دعوے کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا ہے وہ ہماری قوم کا سب سے زیادہ راستباز، سنجیدہ اور پاک سیرت انسان ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دعوائے نبوّت سے ایک دن پہلے تک بھی کسی نے اُس سے وہ باتیں نہ سُنی تھیں جو دعوائے نبوّت کے بعد یکایک اُس نے بیان کرنی شروع کر دیں۔ وہ اِس کتاب کی زبان اور طرزِ بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرزِ بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اِس بات کو بداہتہً جانتے تھے کہ ایک ہی شخص کے دو طرزِ بیان اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اِس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہلِ زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ اُن کے سارے ادیب اور شاعر اِس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اِس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ اُن کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور

اِس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے، اور جو پاکیزہ مضامین اِس کلام میں بیان کیے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ اُنہیں اِس کتاب میں، اور اِس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دُور دُور بھی اُس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھُوٹے مدّعی کا کام اور کلام کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خوردبین لگا کر بھی اس امر کی نشاندہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوّت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم اور قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف اُن کی قوم کے کیسے لوگ کھِنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ یہ ساری باتیں مل جُل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں۔ اسی لیے اِس پس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا کہ اس کتاب کا ربُّ العٰلمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس پر کسی دلیل کے اضافے کی کوئی حاجت نہ تھی (۹۱)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ ﴿٣﴾ (السجدہ ۳۲-۳)

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تاکہ تو متنبّہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی متنبّہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پائیں۔"

پچھلے تمہیدی فقرے کے بعد مشرکینِ مکّہ کے پہلے اعتراض کو لیا جا رہا ہے جو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت پر کرتے تھے۔ یہ محض سوال و استفہام نہیں ہے بلکہ اس میں سخت تعجب کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن ساری باتوں کے باوجود جن کی بنا پر اس کتاب کا مُنَزَّل مِنَ اللہ ہونا ہر شک و شبہہ سے بالاتر ہے، کیا یہ لوگ ایسی صریح ہٹ دھرمی کی بات کہہ رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے اسے خود تصنیف کر کے جھوٹ موٹ اللہ ربّ العالمین کی طرف منسوب کر دیا ہے؟ اتنا لغو اور بے سروپا الزام رکھتے ہوئے کوئی شرم ان کو نہیں آتی؟ انہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا کہ جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو اور اُن کے کام اور کلام کو جانتے ہیں اور اِس کتاب کو بھی سمجھتے ہیں، وہ اس بیہودہ الزام کو سُن کر کیا رائے قائم کریں گے۔

جس طرح پہلی آیت میں لَارَيْبَ فِيْهِ کہنا کافی سمجھا گیا تھا اور اس سے بڑھ کر کوئی استدلال قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کے حق میں پیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی، اُسی طرح اِس آیت میں بھی کفّارِ مکّہ کے الزامِ افترا پر صرف اتنی بات ہی کہنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے کہ "یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔" اس کی وجہ بھی وہی ہے جو اُوپر آیت ۲ کی تشریح میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ کون، کس ماحول میں، کس شان کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا تھا، یہ سب کچھ سامعین کے سامنے موجود تھا۔ اور یہ کتاب بھی اپنی زبان اور اپنے ادب اور مضامین کے

ساتھ سب کے سامنے تھی۔ اور اس کے اثرات و نتائج بھی مکّے کی اُس سوسائٹی میں سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اِس صورتِ حال میں اس کتاب کا رب العالمین کی طرف سے آیا ہُوا حق ہونا ایسا صریح امر واقعہ تھا جسے صرف حتمی طور پر بیان کر دینا ہی کفار کے الزام کی تردید کے لیے کافی تھا۔ اس پر کسی استدلال کی کوشش بات کو مضبوط کرنے کے بجائے اُلٹی اسے کمزور کرنے کی موجب ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت سُورج چمک رہا ہو اور کوئی ڈھیٹ آدمی کہے کہ یہ اندھیری رات ہے۔ اس کے جواب میں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ تم اسے رات کہتے ہو؟ یہ روزِ روشن تو سامنے موجود ہے۔ اس کے بعد دن کے موجود ہونے پر اگر آپ منطقی دلیلیں قائم کریں گے تو اپنے جواب کے زور میں کوئی اضافہ نہیں کریں گے بلکہ درحقیقت اس کے زور کو کچھ کم ہی کریں گے۔ (۶۲)

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ (یونس۔ ۳۷)

"اور یہ قرآن وہ چیز نہیں ہے جو اللہ کی وحی و تعلیم کے بغیر تصنیف کر لیا جائے۔ بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق اور الکتاب کی تفصیل ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ فرمانروائے کائنات کی طرف سے ہے۔"

"جو کچھ پہلے آچکا تھا اس کی تصدیق ہے" یعنی ابتداء سے جو اصولی تعلیمات انبیاء علیہم السّلام کے ذریعہ سے انسان کو بھیجی جاتی رہی ہیں، یہ قرآن اُن سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہیں پیش کر رہا ہے بلکہ اُنہی کی تصدیق و توثیق کر رہا ہے۔ اگر یہ کسی نئے مذہب کے بانی کی ذہنی اُپج کا نتیجہ ہوتا تو اس میں ضرور یہ کوشش پائی جاتی کہ پُرانی صداقتوں کے ساتھ کچھ اپنا نرالا رنگ بھی ملا کر اپنی شانِ امتیاز نمایاں کی جائے۔ "الکتاب کی تفصیل" ہے، یعنی اُن اصولی تعلیمات کو جو تمام کتُبِ آسمانی کا لُبِّ لباب (الکتاب) ہیں، اس میں پھیلا کر، دلائل و شواہد کے ساتھ، تلقین و تفہیم کے ساتھ، تشریح و توضیح کے ساتھ، اور عملی حالات پر انطباق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے (۶۳)

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل۔ ۸۸)

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر بھی اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔"

یہ چیلنج اس مقام کے علاوہ قرآن مجید میں چار دوسرے مقامات پر بھی دیا گیا ہے، سُورۂ بقرہ، آیات ۲۳، ۲۴۔ سُورۂ یونس، آیت ۳۸۔ سورۂ ہُود، آیت ۱۳۔ اور سُورۂ طُور، آیات ۳۳، ۳۴۔ اِن سب مقامات پر یہ بات کفار کے اِس الزام کے جواب میں ارشاد ہُوئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود یہ قرآن تصنیف کر لیا ہے اور خواہ مخواہ وہ اِسے خدا کا کلام بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ مزید برآں سورۂ یونس، آیت ۱۶ میں اِسی الزام کی تردید کرتے ہُوئے یہ بھی فرمایا گیا کہ

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۔

"(اے محمدؐ) ان سے کہو کہ اگر اللہ نے چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمہیں نہ سناؤں، تو میں ہرگز نہ سنا سکتا تھا بلکہ اللہ تمہیں اِس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟"

اِن آیات میں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر جو استدلال کیا گیا ہے وہ دراصل تین دلیلوں سے مرکّب ہے:

ایک یہ کہ قرآن اپنی زبان، اُسلوبِ بیان، طرزِ استدلال، مضامین، مباحث، تعلیمات اور اخبارِ غیب کے لحاظ سے ایک معجزہ ہے جس کی نظیر لانا انسانی قدرت سے باہر ہے۔ تم کہتے ہو کہ اسے ایک انسان نے تصنیف کیا ہے، مگر ہم کہتے ہیں کہ تمام دنیا کے انسان مل کر بھی اِس شان کی کتاب تصنیف نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر وہ جن جنہیں مشرکین نے اپنا معبود بنا رکھا ہے، اور جن کی معبودیت پر یہ کتاب علانیہ ضرب لگا رہی ہے، منکرینِ قرآن کی مدد پر اکٹھے ہو جائیں تو وہ بھی ان کو اس قابل نہیں بنا سکتے کہ قرآن کے پایہ کی کتاب تصنیف کرکے اِس چیلنج کو رد کر سکیں۔

دوسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے یکایک تمہارے درمیان نمودار نہیں ہوگئے ہیں، بلکہ اس قرآن کے نزول سے پہلے بھی چالیس سال تمہارے درمیان رہ چکے ہیں۔ کیا دعوائے نبوّت سے ایک دن پہلے بھی کبھی تم نے ان کی زبان سے اِس طرز کا کلام، اور اِن مسائل اور مضامین پر مشتمل کلام سُنا تھا؟ اگر نہیں سُنا تھا اور یقیناً نہیں سُنا تھا تو کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے کہ کسی شخص کی زبان، خیالات، معلومات اور طرزِ فکر و بیان میں یکایک ایسا عظیم تغیّر واقع ہو سکتا ہے؟

تیسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں قرآن سُنا کر کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ تمہارے درمیان ہی رہتے سہتے ہیں۔ تم ان کی زبان سے قرآن بھی سنتے ہو اور دوسری گفتگوئیں اور تقریریں بھی سُنا کرتے ہو۔ قرآن کے کلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام میں زبان اور اُسلوبِ بیان کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اِس قدر مختلف طرز کلام کبھی ہو نہیں سکتے۔ یہ فرق صرف اُسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے، بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپؐ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اُسلوب قرآن کی زبان اور اُسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ عربی زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقّاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔ (۴۴)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (ہود: ۱۳-۱۴)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑلی ہے؟ کہو "اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمہارے معبود) ہیں اُن کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بُلا لو اگر تم (انہیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔ اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے۔ پھر کیا تم (اس امرِ حقیقی کے آگے) سرِ تسلیم خم کرتے ہو؟"

یہاں ایک ہی دلیل سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت بھی دیا گیا ہے اور توحید کا ثبوت بھی۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اگر تمہارے نزدیک یہ انسانی کلام ہے تو انسان کو ایسے کلام پر قادر ہونا چاہیے۔ لہٰذا تمہارا یہ دعویٰ کہ میں نے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے) اسے خود تصنیف کیا ہے صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ تم ایسی ایک کتاب تصنیف کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر بار بار چیلنج دینے پر بھی تم سب مل کر اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتے تو میرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ میں اس کتاب کا مصنّف نہیں ہوں بلکہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے۔

۲۔ پھر جب کہ اس کتاب میں تمہارے معبودوں کی بھی عَلَانیہ کھُلّا مخالفت کی گئی ہے اور صاف صاف کہا گیا ہے کہ ان کی عبادت چھوڑ دو کیونکہ اُلُوہیت میں اُن کا کوئی حصّہ نہیں ہے، تو ضروری ہے کہ تمہارے معبودوں کو بھی (اگر فی الواقع ان میں کوئی طاقت ہے) میرے دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے اور اس کتاب کی نظیر پیش کرنے میں تمہاری مدد کرنی چاہیے۔ لیکن اگر وہ اس فیصلے کی گھڑی میں بھی تمہاری مدد نہیں کرتے اور تمہارے اندر ایسی کوئی طاقت نہیں پھونکتے کہ تم اس کتاب کی نظیر تیار کر سکو، تو اس سے صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ تم نے خواہ مخواہ ان کو معبود بنا رکھا ہے، ورنہ درحقیقت ان کے اندر کوئی قدرت اور کوئی شائبہ اُلُوہیت نہیں ہے جس کی بنا پر وہ معبود ہونے کے مستحق ہوں۔ (۶۵)

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (یونس - ۳۸)

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو "اگر تم اپنے الزام میں سچے ہو تو ایک ہی سُورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بُلا سکتے ہو مدد کے لیے

بلالوث

عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیلنج محض قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے تھا۔ اعجاز قرآن پر جس انداز سے بحثیں کی گئی ہیں اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔ لیکن قرآن کا مقام اس سے بلند تر ہے کہ وہ اپنی کتائی و بے نظیری کے دعوے کی بنیاد محض اپنے لفظی محاسن پر رکھے۔ بلاشبہ قرآن اپنی زبان کے لحاظ سے بھی لاجواب ہے، مگر وہ اصل چیز جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسانی دماغ ایسی کتاب تصنیف نہیں کر سکتا، اس کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہیں۔ اس میں اعجاز کے جو جو پہلو ہیں اور جن وجوہ سے اُن کا من جانب اللہ ہونا یقینی ہے اور انسان کا ایسی تصنیف پر قادر ہونا غیر ممکن ہے، اُن کو خود قرآن میں مختلف مواقع پر بیان کر دیا گیا ہے۔ (۴۹)

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۔ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۔ (الطور۔ ۳۳-۳۴)

"کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اس شان کا ایک کلام بنا لائیں"

دوسرے الفاظ میں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قریش کے جو لوگ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا تصنیف کردہ کلام کہتے ہیں خود اُن کا دل یہ جانتا ہے کہ یہ آپ کا کلام نہیں ہو سکتا اور دوسرے وہ لوگ بھی جو اہل زبان ہیں نہ صرف یہ کہ اسے سُن کر صاف محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ انسانی کلام سے بہت اعلیٰ وارفع ہے بلکہ اُن میں سے جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے واقف ہے وہ کبھی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ واقعی یہ آپ ہی کا کلام ہے۔ پس صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ قرآن کو آپ کی تصنیف قرار دینے والے دراصل ایمان نہیں لانا چاہتے اس لیے وہ طرح طرح کے جھوٹے بہانے گھڑ رہے ہیں جن میں سے ایک بہانہ یہ بھی ہے۔

اور بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ سرے سے انسانی کلام ہی نہیں ہے اور یہ بات انسان کی قدرت سے باہر ہے کہ ایسا کلام تصنیف کر سکے۔ اگر تم اسے انسانی کلام کہتے ہو تو اس پائے کا کوئی کلام لا کر دکھاؤ جسے کسی انسان نے تصنیف کیا ہو۔ یہ چیلنج نہ صرف قریش کو، بلکہ تمام دنیا کے منکرین کو سب سے پہلے اس آیت میں دیا گیا تھا۔ اس کے بعد تین مرتبہ مکہ معظمہ میں اور پھر آخری بار مدینۂ منورہ میں اسے دُہرایا گیا (ملاحظہ ہو سورۂ یونس، آیت ۳۸۔ سورہ ہود ۱۳۔ سورۂ بنی اسرائیل، ۸۸۔ سورۂ البقرہ، ۲۳)۔ مگر کوئی اس کا جواب دینے کی نہ اُس وقت ہمت کر سکا نہ اُس کے بعد آج تک کسی کی جرأت ہوئی کہ قرآن کے مقابلہ میں کسی انسانی تصنیف کو لے آئے۔

بعض لوگ اِس چیلنج کی حقیقی نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ایک قرآن ہی کیا، کسی شخص کے طرز میں بھی دوسرا کوئی شخص نثر یا نظم لکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ ہومر، رومی، شیکسپیئر، گوئٹے، غالب، ٹیگور اور اقبال سب ہی اس لحاظ سے بے مثل ہیں کہ ان کی نقل اُتار کر انہی جیسا کلام بنا لانا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ قرآن کے چیلنج کا یہ جواب دینے والے دراصل اس غلط فہمی میں ہیں کہ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ کا مطلب قرآن کے طرزِ بیان کے مطابق اِس جیسی کوئی کتاب لکھ دینا ہے۔ حالانکہ اس سے مُراد طرز میں مماثلت نہیں ہے، بلکہ مُراد یہ ہے کہ اِس پلے کی اور اِس شان اور اِس مرتبے کی کوئی کتاب لے آؤ جو صرف عربی ہی میں نہیں دُنیا کی کسی زبان میں اِن خصوصیات کے لحاظ سے قرآن کی مدِ مقابل قرار پا سکے جن کی بنا پر قرآن ایک معجزہ ہے۔ مختصراً چند بڑی بڑی خصوصیات ملاحظہ ہوں جن کی بنا پر قرآن پہلے بھی معجزہ تھا اور آج بھی معجزہ ہے۔

۱۔ جس زبان میں قرآن مجید نازل ہُوا ہے اُس کے ادب کا وہ بلند ترین اور مکمل ترین نمونہ ہے۔ پُوری کتاب میں ایک لفظ اور ایک جملہ بھی معیار سے گرا ہُوا نہیں ہے۔ جس مضمون کو بھی ادا کیا گیا ہے موزوں ترین الفاظ اور مناسب ترین انداز بیان میں ادا کیا گیا ہے۔ ایک ہی مضمون بار بار ادا ہُوا ہے اور ہر مرتبہ پیرایۂ بیان نیا ہے جس سے تکرار کی بدنمائی کہیں پیدا نہیں ہوتی۔ اوّل سے لے کر آخر تک ساری کتاب میں الفاظ کی نشست ایسی ہے جیسے نگینے تراش تراش کر جڑے گئے ہوں۔ کلام اتنا مؤثر ہے کہ کوئی زبان داں آدمی اُسے سُن کر سر دُھنے بغیر نہیں رہ سکتا، حتیٰ کہ منکر اور مخالف کی رُوح بھی وجد کرنے لگتی ہے۔ چودہ سو برس گزرنے کے بعد بھی آج تک یہ کتاب عربی زبان کے ادب کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے جس کے برابر تو درکنار، جس کے قریب بھی اس زبان کی کوئی کتاب اپنی ادبی قدر و قیمت میں نہیں پہنچتی۔ یہی نہیں، بلکہ یہ کتاب عربی زبان کو اِس طرح پکڑ کر بیٹھ گئی ہے کہ چودہ صدیاں گزر جانے پر بھی اس زبان کا معیارِ فصاحت وہی ہے جو اس کتاب نے قائم کر دیا تھا، حالانکہ اتنی طویل مدت میں زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو اتنی صدیوں تک اِملا، انشاء، محاورے، قواعدِ زبان اور استعمالِ الفاظ میں ایک ہی شان پر باقی رہ گئی ہو۔ لیکن یہ صرف قرآن کی طاقت ہے جس نے عربی زبان کو اپنے مقام سے ہلنے نہ دیا۔ اُس کا ایک لفظ بھی آج تک متروک نہیں ہُوا ہے۔ اُس کا ہر محاورہ آج تک عربی ادب میں مستعمل ہے۔ اُس کا ادب آج بھی عربی کا معیاری ادب ہے۔ اور تقریر و تحریر میں آج بھی فصیح زبان وہی مانی جاتی ہے جو چودہ سو برس پہلے قرآن میں استعمال ہوئی تھی۔ کیا دنیا کی کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف اِس شان کی ہے؟

۲۔ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت، اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ پہلے اس کی تاثیر نے ایک

قوم کو بدلا اور پھر اُس قوم نے اُٹھ کر دُنیا کے ایک بہت بڑے حصّے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو۔ یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی ہوئی نہیں رہ گئی ہے بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ چودہ سو برس سے اس کے اِن اثرات کا سلسلہ جاری ہے، اور روز بروز اس کے یہ اثرات پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔

۳۔ جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات پر حاوی ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اِس کائنات کا خالق اور ناظم و مدبّر کون ہے، کیا اس کی صفات ہیں، کیا اس کے اختیارات ہیں، اور وہ حقیقتِ نفسُ الاَمری کیا ہے جس پر اُس نے یہ پورا انتظام قائم کیا ہے۔ وہ اِس جہان میں انسان کی حیثیت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک مشخص کر کے بتاتی ہے کہ یہ اُس کا فطری مقام ہے اور یہ اُس کی پیدائشی حیثیت ہے جسے بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اِس مقام اور اِس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لیے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے جو حقیقت سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کون سے ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں۔ صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز سے، نظامِ کائنات کے ایک ایک گوشے سے، انسان کے اپنے نفس اور اس کے وجود سے اور انسان کی اپنی پوری تاریخ سے بے شمار دلائل پیش کرتی ہے اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا رہا ہے، اور صحیح راستہ، جو ہمیشہ سے ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا، کس ذریعہ سے اس کو معلوم ہو سکتا ہے اور کس طرح ہر زمانے میں وہ اُس کو بتایا جاتا رہا ہے۔ وہ صحیح راستے کی صرف نشان دہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اُس راستے پر چلنے کے لیے ایک پورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے جس میں عقائد، اخلاق، تزکیۂ نفس، عبادات، معاشرت، تہذیب، تمدّن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو سے متعلق ایک نہایت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں وہ پوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور اُن غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اِس دُنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالم میں رُونما ہونے والے ہیں۔ وہ اس دُنیا کے ختم ہونے اور دوسرا عالم برپا ہونے کی نہایت مفصل کیفیت بیان کرتی ہے، اِس تغیّر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے، دوسرے عالم کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے، اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہاں انسان

کیسے ایک دوسری زندگی پاتے گا، کس طرح اس کی دنیوی زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، کن اُمور کی اُس سے بازپرس ہوگی، کیسی ناقابلِ انکار صورت میں اُس کا پُورا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا، کیسی زبردست شہادتیں اس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی، جزا اور سزا پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے، جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ اس وسیع مضمون پر جو کلام اِس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اِس حیثیت سے نہیں ہے کہ اس کا مصنّف کچھ صُغریٰ کُبریٰ جوڑ کر چند قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے، بلکہ اِس حیثیت سے ہے کہ اس کا مصنّف حقیقت کا براہِ راست علم رکھتا ہے، اُس کی نگاہ ازل سے ابد تک سب کچھ دیکھ رہی ہے، تمام حقائق اُس پر عیاں ہیں، کائنات پُوری کی پُوری اُس کے سامنے ایک کھُلی کتاب کی طرح ہے، نوعِ انسانی کے آغاز سے اُس کے خاتمے تک ہی نہیں بلکہ خاتمے کے بعد اُس کی دوسری زندگی تک بھی وہ اُس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے، اور قیاس و گمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جن حقیقتوں کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے ان میں سے کوئی ایک بھی آج تک غلط ثابت نہیں کی جا سکی ہے۔ جو تصوّر کائنات و انسان وہ پیش کرتا ہے وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ و سائنس اور علومِ عمران کے تمام آخری مسائل کے جوابات اُس کے کلام میں موجود ہیں اور ان سب کے درمیان ایسا منطقی ربط ہے کہ ان پر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے وہ صرف انتہائی معقول اور انتہائی پاکیزہ ہی نہیں ہے بلکہ چودہ سو برس سے رُوئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجربے نے اس کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اِس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے یا کبھی موجود رہی ہے جسے اِس کتاب کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہو؟

۴۔ یہ کتاب پُوری کی پُوری بیک وقت لکھ کر دنیا کے سامنے پیش نہیں کر دی گئی تھی بلکہ چند ابتدائی ہدایات کے ساتھ ایک تحریکِ اصلاح کا آغاز کیا گیا تھا اور اس کے بعد ۲۳ سال تک وہ تحریک جن جن مرحلوں سے گزرتی رہی اُن کے حالات اور اُن کی ضروریات کے مطابق اس کے اجزاء اُس تحریک کے رہنما کی زبان سے کبھی طویل خطبوں اور کبھی مختصر جملوں کی شکل میں ادا ہوتے رہے۔ پھر اِس مشن کی تکمیل پر مختلف اوقات میں صادر ہونے والے یہ اجزاء اُس مکمل کی صورت میں مُرتّب کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیے گئے جسے "قرآن" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ تحریک کے رہنما کا بیان ہے کہ یہ خطبے اور جملے اس کے طبعزاد نہیں ہیں بلکہ خداوندِ عالم کی طرف سے اُس پر نازل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص انہیں خود اُس رہنما

کے معجزہ قرار دیتا ہے تو وہ دُنیا کی تاریخ سے کوئی نظیر ایسی پیش کرے کہ کسی انسان نے سالہا سال تک مسلسل ایک زبردست اجتماعی تحریک کی بطورِ خود رہنمائی کرتے ہوئے کبھی ایک واعظ اور معلّمِ اخلاق کی حیثیت سے، کبھی ایک مظلوم جماعت کے سربراہ کی حیثیت سے، کبھی ایک مملکت کے فرمانروا کی حیثیت سے، کبھی ایک برسرِ جنگ فوج کے قائد کی حیثیت سے، کبھی ایک فاتح کی حیثیت سے، کبھی ایک شارع اور مُقنّن کی حیثیت سے، کبھی ایک قاضی اور جج کی حیثیت سے، غرض بکثرت مختلف حالات اور اوقات میں بہت سی مختلف حیثیتوں سے جو مختلف تقریریں کی ہوں یا باتیں کہی ہوں وہ جمع ہو کر ایک مکمل، مربوط اور جامع نظامِ فکر و عمل بنا دیں، اُن میں کہیں کوئی تناقض اور تضاد نہ پایا جاتے، ان میں ابتدا سے انتہا تک ایک ہی مرکزی تخیّل اور سلسلۂ فکر کارفرما نظر آتے، اُس نے اوّل روز سے اپنی دعوت کی جو بنیاد بیان کی ہو آخری دن تک اُسی بنیاد پر پورہ عقائد و اعمال کا ایک ایسا ہمہ گیر نظام بناتا چلا جائے جس کا ہر جُز دوسرے اجزاء سے کامل مطابقت رکھتا ہو اور اُس مجموعہ کو پڑھنے والا کوئی صاحبِ بصیرت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے کہ تحریک کا آغاز کرتے وقت اُس کے مُحرّک کے سامنے آخری مرحلے تک کا پُورا نقشہ موجود تھا اور ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ بیچ کے کسی مقام پر اُس کے ذہن میں کوئی ایسا خیال آیا ہو جو پہلے اُس پر منکشف نہ تھا یا جسے بعد میں اس کو بدلنا پڑا۔ اِس شان کا کوئی انسان اگر کبھی گزرا ہو جس نے اپنے ذہن کی خلّاقی کا یہ کمال دکھایا ہو تو اس کی نشان دہی کی جائے۔

۵- جس رہنما کی زبان پر یہ خطبے اور جملے جاری ہوتے تھے وہ یکایک کسی گوشے سے نکل کر صرف ان کو سنانے کے لیے نہیں آجاتا تھا اور انہیں سُنانے کے بعد کہیں چلا نہیں جاتا تھا۔ وہ اس تحریک کے آغاز سے پہلے بھی انسانی معاشرے میں زندگی بسر کر چکا تھا اور اُس کے بعد بھی وہ زندگی کی آخری ساعت تک ہر وقت اُسی معاشرے میں رہتا تھا۔ اس کی گفتگو اور تقریروں کی زبان اور طرزِ بیان سے لوگ بخوبی آشنا تھے۔ احادیث میں اُن کا ایک بڑا حصّہ اب بھی محفوظ ہے جسے بعد کے عربی داں لوگ پڑھ کر خود بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اُس رہنما کا اپنا طرزِ کلام کیا تھا۔ اُس کے ہم زبان لوگ اُس وقت بھی صاف محسوس کرتے تھے اور آج بھی عربی زبان کے جاننے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کتاب کی زبان اور اس کا اُسلوب اُس رہنما کی زبان اور اُس کے اُسلوب سے بہت مختلف ہے۔ حتیٰ کہ جہاں اُس کے کسی خطبے کے بیچ میں اس کتاب کی کوئی عبارت آجاتی ہے وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں کوئی انسان کبھی اس بات پر قادر ہُوا ہے یا ہو سکتا ہے کہ سالہا سال تک دو قطعی مختلف اُسلوبوں میں کلام کرنے کا تکلّف نباہتا چلا جائے اور کبھی یہ راز فاش نہ ہو سکے کہ یہ دو الگ اُسلوب دراصل ایک ہی شخص

سکتے ہیں ، عارضی اور وقتی طور پر اس قسم کے تصنّع میں کامیاب ہو جانا تو ممکن ہے لیکن مسلسل ۲۳ سال تک ایسا ہونا کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص جب خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر کلام کرے تو اس کی زبان اور اسلوب کچھ ہو ، اور جب خود اپنی طرف سے گفتگو یا تقریر کرے تو اس کی زبان اور اس کا اسلوب بالکل ہی کچھ اور ہو۔

۶ - وہ رہنما اس تحریک کی قیادت کے دوران میں مختلف حالات سے دوچار ہوتا رہا۔ کبھی برسوں وہ اپنے ہم وطنوں اور اپنے قبیلے والوں کی تضحیک ، توہین اور سخت ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ کبھی اس کے ساتھیوں پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ ملک چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور ہو گئے۔ کبھی دشمنوں نے اس کے قتل کی سازشیں کیں۔ کبھی خود اسے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ کبھی اس کو انتہائی عسرت اور فاقہ کشی کی زندگی گزارنی پڑی۔ کبھی خود اسے پیہم لڑائیوں سے سابقہ پیش آیا جن میں شکست اور فتح ، دونوں ہی ہوتی رہیں۔ کبھی وہ دشمنوں پر غالب آیا اور وہی دشمن جنہوں نے اس پر ظلم توڑے تھے ، اس کے سامنے سرنگوں نظر آئے۔ کبھی اسے وہ اقتدار نصیب ہوا جو کم ہی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ ان تمام حالات میں ایک انسان کے جذبات ظاہر ہے کہ یکساں نہیں رہ سکتے۔ اس رہنما نے ان مختلف مواقع پر خود اپنی ذاتی حیثیت میں جب کبھی کلام کیا ، اس میں ان جذبات کا اثر نمایاں نظر آتا ہے جو ایسے مواقع پر انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن خدا کی طرف سے آئی ہوئی وحی کے طور پر ان مختلف حالات میں جو کلام اس کی زبان سے سنا گیا وہ انسانی جذبات سے بالکل خالی تھا اور آج بھی خالی نظر آتا ہے۔ کسی ایک مقام پر بھی کوئی بڑے سے بڑا نقاد انگلی رکھ کر قرآن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہاں انسانی جذبات کارفرما نظر آتے ہیں۔

۷ - جو وسیع اور جامع علم اس کتاب میں پایا جاتا ہے وہ اس زمانے کے اہلِ عرب اور اہلِ روم و یونان و ایران تو درکنار اس بیسویں صدی کے اکابر اہلِ علم میں سے بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ فلسفہ و سائنس اور علومِ عمران کی کسی ایک شاخ کے مطالعہ میں اپنی عمر کھپا دینے کے بعد آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اس شعبہ علم کے آخری مسائل کیا ہیں ، اور پھر جب وہ غائر نگاہ سے قرآن کو دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں ان مسائل کا ایک واضح جواب موجود ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک علم تک محدود نہیں ہے بلکہ ان تمام علوم کے باب میں صحیح ہے جو کائنات اور انسان سے کوئی تعلق رکھتے ہیں۔ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ چودہ سو برس پہلے ریگستانِ عرب میں ایک اُمّی کو علم کے ہر گوشے پر اتنی وسیع نظر حاصل تھی اور اس نے ہر بنیادی مسئلے پر غور و خوض کر کے اس کا ایک صاف اور قطعی جواب سوچ لیا تھا؟

اعجازِ قرآن کے اگرچہ اور بھی متعدد وجوہ ہیں ، لیکن صرف ان چند وجوہ ہی پر اگر آدمی غور کرے تو

پس معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کا معجزہ ہونا جتنا نزولِ قرآن کے زمانے میں واضح تھا اس سے بہت زیادہ آج واضح ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک یہ واضح تر ہوتا چلا جائے گا ۔ (۴۶)

یہ اعتراض کہ سارا قرآن یک وقت کیوں نہ نازل ہو گیا؟

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے، اگرچہ اس سے قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہی تھی مگر کفارِ قریش اس کو انسانی کلام قرار دینے کے لیے بار بار جس بات کا سہارا لیتے تھے وہ یہ بھی تھی کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو ایک ہی دفعہ پورا کا پورا نازل کر دیا جاتا۔ اس کا وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے سوچ سوچ کر تصنیف کیا جا رہا ہے۔ قرآن میں ان کے اس اعتراض کو نقل کر کے یا اس کی طرف اشارہ کر کے بڑے دل نشین انداز میں ان کو بتایا گیا کہ یہ تدریجاً کیوں نازل کیا جا رہا ہے اور اس تدریج کی حکمت کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۔ وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ۔

(الفرقان-۳۲-۳۳)

منکرین کہتے ہیں "اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟" ــــ ہاں، ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے) کہ جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے اس کا ٹھیک جواب بر وقت ہم نے تمہیں بتا دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔

یہ کفارِ مکہ کا بڑا دل پسند اعتراض تھا جسے وہ اپنے نزدیک نہایت زوردار اعتراض سمجھ کر بار بار دہراتے تھے مگر قرآن میں اس کے مدلل جوابات دے کر اس کا بھی پوری طرح قلع قمع کر دیا گیا۔ ان کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ شخص خود سوچ سوچ کر یا کسی سے پوچھ پوچھ کر اور کتابوں سے نقل کر کر کے یہ مضامین نہیں لا رہا ہے بلکہ یہ واقعی خدا کی کتاب ہے تو اکٹھی ایک ہی وقت کیوں نہیں آ جاتی؟ خدا تو جانتا ہے کہ پوری بات کیا ہے جو وہ فرمانا چاہتا ہے۔ وہ نازل کرنے والا ہوتا تو سب کچھ بیک وقت فرما دیتا۔ یہ جو سوچ سوچ کر کبھی کچھ مضمون لایا جاتا ہے اور کبھی کچھ، یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ وحی اوپر سے نہیں آتی، یہیں کہیں سے حاصل کی جاتی ہے، یا خود گھڑ گھڑ کر لائی جاتی ہے۔

اس کے جواب میں قرآن کو تدریجاً نازل کرنے کی بہت سی حکمتیں بیان کی گئیں:

(۱) ایسا اس لیے کیا جا رہا ہے کہ وہ لفظ بلفظ حافظہ میں محفوظ ہو سکے، کیونکہ اس کی تبلیغ و اشاعت تحریری صورت میں نہیں بلکہ ایک اَن پڑھ نبیؐ کے ذریعہ سے اَن پڑھ سامعین کے سامنے زبانی تقریر کی شکل میں ہو رہی ہے۔

(۲) تاکہ اُس کی تعلیمات اچھی طرح ذہن نشین ہو سکیں۔ اس غرض کے لیے ٹھیر ٹھیر کر تھوڑی تھوڑی بات کہنا اور ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے بیان کرنا زیادہ مفید ہے۔

(۳) تاکہ اُس کے بتائے ہوئے طریقِ زندگی پر دل جمتا جائے۔ اس غرض کے لیے احکام و ہدایات کا بتدریج نازل کرنا زیادہ مبنی بر حکمت ہے، ورنہ اگر سارا قانون اور پورا نظامِ حیات بیک وقت بیان کر کے اُسے قائم کرنے کا حکم دے دیا جاتے تو ہوش پراگندہ ہو جاتیں۔ علاوہ بریں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر حکم اگر مناسب موقع پر دیا جائے تو اس کی حکمت اور رُوح زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے بہ نسبت اس کے کہ تمام احکام دفعہ وار مرتب کر کے بیک وقت دے دیے جاتیں۔

(۴) تاکہ تحریکِ اسلامی کے دوران میں، جبکہ حق اور باطل کی مسلسل کشمکش چل رہی ہو، نبی اور اُس کے پیروؤں کی ہمت بندھائی جاتی رہے۔ اس لیے خدا کی طرف سے بار بار، وقتاً فوقتاً، موقع بموقع پیغام آنا زیادہ کارگر ہے بہ نسبت اس کے کہ بس ایک دفعہ ایک لمبا چوڑا ہدایت نامہ دے کر انہیں دنیا بھر کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یُوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ پہلی صورت میں آدمی محسوس کرتا ہے کہ جس خدا نے اُسے اس کام پر مامور کیا ہے وہ اُس کی طرف متوجہ ہے، اس کے کام سے دلچسپی لے رہا ہے، اس کے حالات پر نگاہ رکھتا ہے، اس کی مشکلات میں رہنمائی کر رہا ہے، اور ہر ضرورت کے موقع پر اُسے شرفِ باریابی و مخاطبت عطا فرما کر اُس کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ کرتا رہتا ہے۔ یہ چیز حوصلہ بڑھانے والی اور عزم کو مضبوط رکھنے والی ہے۔ دوسری صورت میں آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بس وہ ہے اور طوفان کی موجیں۔

آخر میں تنزیل کے لیے تدریج کا طریقہ اختیار کرنے کی ایک اور حکمت بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی شانِ نزول یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ "ہدایت" کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنا چاہتا ہے اور اس کی اشاعت کے لیے اس نے نبیؐ کو ایجنٹ بنایا ہے۔ بات اگر یہ ہوتی تو یہ مطالبہ بجا ہوتا کہ پوری کتاب تصنیف کر کے بیک وقت ایجنٹ کے حوالے کر دی جائے۔ لیکن دراصل اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر اور جاہلیت اور فسق کے مقابلے میں ایمان و اسلام اور اطاعت و تقویٰ کی ایک تحریک برپا کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے ایک نبی کو داعی و قائد بنا کر اٹھایا ہے۔ اس تحریک کے دوران میں اگر ایک طرف قائد اور اُس کے پیروؤں کو حسبِ ضرورت تعلیم اور ہدایات دینا اس نے اپنے ذمہ لیا ہے تو دوسری طرف

یہ کام بھی اپنے ہی ذمّہ رکھا ہے کہ مخالفین جب کبھی کوئی اعتراض یا شبہ یا اُلجھن پیش کریں اُسے وہ صاف کر دے، اور جب بھی وہ کسی بات کو غلط معنی پہنائیں، وہ اس کی صحیح تشریح و تفسیر کر دے۔ ان مختلف ضروریات کے لیے جو تقریریں اللہ کی طرف سے نازل ہوتی رہی ہیں ان کے مجموعے کا نام قرآن ہے، اور یہ کتابِ آئین یا کتابِ اخلاق و فلسفہ نہیں بلکہ کتابِ تحریک ہے، جس کے مَعرضِ وجود میں آنے کی صحیح فطری صورت یہی ہے کہ تحریک کے اوّلِ لمحۂ آغاز کے ساتھ شروع ہو اور آخری لمحات تک جیسے جیسے تحریک چلتی رہے یہ بھی ساتھ ساتھ حسبِ موقع و ضرورت نازل ہوتی رہے۔ (۶۸)

وَإِذَا بَدَّلْنَآ ءَايَةً مَّكَانَ ءَايَةٍ ۙ وَٱللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوٓا۟ إِنَّمَآ أَنتَ مُفْتَرٍۭ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ قُلْ نَزَّلَهُۥ رُوحُ ٱلْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِٱلْحَقِّ لِيُثَبِّتَ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ۝ (النحل ۱۰۱-۱۰۲)

"جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرتے ہیں ۔۔۔ اور اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کرے ۔۔ تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔ ان سے کہو کہ اسے تو رُوح القدس نے ٹھیک ٹھیک میرے رب کی طرف سے بتدریج نازل کیا ہے تاکہ ایمان لانے والوں کے ایمان کو پختہ کرے اور فرماں برداروں کو زندگی کے معاملات میں سیدھی راہ بتائے اور انہیں فلاح و سعادت کی خوشخبری دے۔"

ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے سے مُراد ایک حکم کے بعد دوسرا حکم بھیجنا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں اور بارہا ایک ہی معاملہ میں چند سال کے وقفوں سے یکے بعد دیگرے دو دو، تین تین حکم بھیجے گئے ہیں۔ مثلاً شراب کا معاملہ، یا زنا کی سزا کا معاملہ۔ لیکن ہم کو یہ معنی لینے میں اس بنا پر تامّل ہے کہ سُورۂ نحل کی یہ آیت مکّی دَور میں نازل ہوئی ہے، اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اُس دَور میں تدریج فی الاحکام کی کوئی مثال پیش نہیں آئی تھی۔ اس لیے ہم یہاں "ایک آیت کی جگہ دوسری آیت نازل کرنے" کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے مختلف مقامات پر کبھی ایک مضمون کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے اور کبھی وہی مضمون سمجھانے کے لیے دوسری مثال سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ہی قصّہ بار بار آیا ہے اور ہر مرتبہ اسے دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک معاملہ کا کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے اور کبھی اُسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لیے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے اور کبھی دوسری دلیل۔ ایک بات ایک وقت میں مجمل طور پر کہی گئی ہے اور وہ دوسرے وقت میں مفصّل۔ یہی چیز تھی جسے کفّارِ مکّہ اس بات کی دلیل ٹھیراتے تھے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ یہ قرآن خود تصنیف کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر یہ کلام کا شیع علم الٰہی ہوتا تو پوری بات یک وقت کہہ دی جاتی۔ اللہ بھی انسان کی طرح ناقص العلم تھوڑا ہی ہے کہ سوچ سوچ کر بات کرے، رفتہ رفتہ معلومات حاصل کرتا رہے، اور ایک بات ٹھیک نہ بیٹھتی نظر آتی تو دوسرے طریقے سے بات کرے۔ یہ تو انسانی علم کی کمزوریاں ہیں جو تمہارے اس کلام میں نظر آرہی ہیں۔

اس کے جواب میں پہلے بیان کیا گیا کہ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے "روح القدس" لے کر آ رہی ہے۔ "روح القدس" کا لفظی ترجمہ "پاک روح" یا "پاکیزگی کی روح" ہے، اور اصطلاحاً یہ لقب حضرت جبریل کو دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ (شعراء میں) انہی کے لیے روح الامین کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں یعنی امانتدار روح۔ یہاں وحی لانے والے فرشتے کا نام لینے کے بجائے اس کا لقب استعمال کرنے سے سامعین کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ اس کلام کو ایک ایسی روح لے کر آ رہی ہے جو بشری کمزوریوں اور نقائص سے پاک ہے۔ وہ نہ خائن ہے کہ اللہ کچھ بھیجے اور وہ اپنی طرف سے کمی بیشی کر کے کچھ اور بنا دے۔ نہ کذاب و مفتری ہے کہ خود کوئی بات گھڑ کے اللہ کے نام سے بیان کر دے۔ نہ بدنیت ہے کہ اپنی کسی نفسانی غرض کی بنا پر دھوکے اور فریب سے کام لے۔ وہ سراسر ایک مقدس و مطہر روح ہے جو اللہ کا کلام پوری امانت کے ساتھ لا کر پہنچاتی ہے۔

پھر بتایا گیا کہ اس کے تدریج اس کلام کو لے کر آنے اور یک وقت سب کچھ نہ لے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے علم و دانش میں کوئی نقص ہے جیسا کہ تم نے اپنی نادانی سے سمجھ لیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی قوت فہم اور قوت اخذ میں نقص ہے جس کے سبب سے وہ بیک وقت ساری بات کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ایک وقت کی سمجھی ہوئی بات میں پختہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ روح القدس اس کلام کو تھوڑا تھوڑا کر کے لائے، کبھی اجمال سے کام لے اور کبھی اسی بات کی تفصیل بتائے، کبھی ایک طریقے سے بات سمجھائے اور کبھی دوسرے طریقے سے، کبھی ایک پیرایۂ بیان اختیار کرے اور کبھی دوسرا، اور ایک ہی بات کو بار بار طرح طرح سے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرے، تاکہ مختلف قابلیتوں اور استعدادوں کے طالبین حق ایمان لا سکیں، اور ایمان لانے کے بعد علم و یقین اور فہم و ادراک میں پختہ ہو سکیں۔

اس تدریج کی دوسری مصلحت یہ بتائی گئی کہ جو لوگ ایمان لا کر فرمانبرداری کی راہ چل رہے ہیں ان کو دعوت اسلامی کے کام میں اور زندگی کے پیش آمدہ مسائل میں جس وقت جس قسم کی ہدایات درکار ہوں وہ بروقت دے دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ نہ انہیں قبل از وقت بھیجنا مناسب ہو سکتا ہے، اور نہ بیک وقت ساری ہدایات دے دینا مفید ہے۔

تیسری مصلحت یہ بتائی گئی کہ قرآن کے داعیوں کو جن مزاحمتوں اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے اور جس جس طرح انہیں ستایا اور تنگ کیا جا رہا ہے، اور دعوتِ اسلامی کی راہ میں مشکلات کے جو پہاڑ سدِ راہ ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے وہ بار بار اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ پیغامِ ربانی سے ان کی ہمت بندھائی جاتی رہے اور ان کو آخری نتائج کی کامیابی کا یقین دلایا جاتا رہے تاکہ وہ بے دل اور دل شکستہ نہ ہونے پائیں۔ (۷۹)

یہ الزام کہ کچھ دوسرے لوگ قرآن تصنیف کر کے حضورؐ کو دیتے رہتے ہیں

پچھلے الزام کے بالکل برعکس تھا، بلکہ ایک دوسرا الزام یہ لگاتے تھے کہ حضورؐ کو اس قرآن کے تصنیف کرنے میں کچھ دوسرے لوگ مدد دے رہے ہیں اور پرانے زمانے کی لکھی ہوئی چیزیں نقل کرا کر آپ سنا کرتے ہیں، اور یہ کام شب و روز ہو رہا ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ۔ وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۔ قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۔ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۔ (الفرقان: ۴-۶)

"جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔ اے محمدؐ، ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے اس نے جو زمین و آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔"

ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص خود تو ان پڑھ ہے۔ مطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔ پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا، چالیس برس کی عمر تک ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ جانتا تھا جو آج اس کی زبان سے نکل رہی ہیں۔ اب آخر یہ معلومات آ کہاں سے رہی ہیں؟ لامحالہ ان کا سرچشمہ کچھ اگلے لوگوں کی کتابیں ہیں جن کے اقتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں، انہیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے، اور پھر انہیں یاد کر کے ہمیں آ کر سناتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہلِ کتاب میں سے پڑھے لکھے تھے اور مکے ہی میں رہتے تھے۔ ایک عداس تھا جو حویطب بن عبد العزیٰ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ دوسرا یسار تھا جو علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام تھا۔ اور تیسرا جبر، عامر بن ربیعہ کا

آزاد کردہ غلام۔

بظاہر یہ بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وحی کے دعوے کو رد کرنے کے لیے نبی کے ماخذ علم کی نشان دہی کر دینے سے بڑھ کر وزنی اعتراض اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ ایسے زبردست اعتراض کے جواب میں کوئی دلیل پیش کرنے کے بجائے صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو، صریح بے انصافی کی بات کہہ رہے ہو، سخت جھوٹ کا طوفان اٹھا رہے ہو، یہ تو اُس خدا کا کلام ہے جو زمین و آسمان کا بھید جانتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اُس شدید مخالفت کے ماحول میں جب ایسا زوردار اعتراض پیش کیا گیا تو اُسے یوں حقارت کے ساتھ کیوں رد کر دیا گیا؟ اور خود مخالفین نے اس کا صاف صاف مفصل جواب کیوں نہ مانگا؟ اُنہوں نے کیوں نہ کہا کہ ہمارے اعتراض کو محض ظلم اور جھوٹ کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے؟ پھر نئے نئے مسلمان ہونے والوں کے دلوں میں اس اعتراض سے کوئی شک کیوں نہ پیدا ہوا؟

اس کا جواب مکے ہی کے اُس ماحول پر تھوڑا سا غور کرنے سے مل جاتا ہے جس میں یہ اعتراض کیا گیا تھا۔

پہلی بات یہ ہے کہ مکے کے وہ ظالم سردار جو اُس وقت ایک ایک مسلمان کو مارتے، کوٹتے اور تنگ کرتے پھر رہے تھے اُن کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن لوگوں پر وہ الزام لگا رہے تھے کہ یہ پرانی پرانی کتابوں کے ترجمے کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے ہیں، اُن کے گھروں پر اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر چھاپہ مار کر وہ سارا ذخیرہ برآمد کر لیتے جو اُن کے زعم میں اس کام کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا اور اسے عوام کے سامنے لا کر رکھ دیتے، بلکہ وہ عین اُس وقت چھاپہ مار سکتے تھے جب یہ کام ہو رہا ہو۔ مگر انہوں نے ایک دن بھی یہ اقدام کر کے اپنے الزام کا ثبوت پیش نہ کیا۔

پھر جن لوگوں کے نام وہ اس سلسلے میں پیش کرتے تھے وہ شہر مکہ ہی کے رہنے والے تھے اور اُن کی قابلیتیں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ کوئی صاحب عقل آدمی یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ قرآن جس شان کا کلام ہے اس کے تصنیف کرنے میں یہ لوگ کسی درجے میں بھی حصہ دار ہو سکتے ہیں۔

مزید برآں یہ لوگ دراصل مکے ہی کے چند سرداروں کے آزاد کردہ غلام تھے اور عرب کی قبائلی زندگی میں ایک غلام آزاد ہو کر بھی اپنے سابق مالک کی سرپرستی کے بغیر جی نہیں سکتا تھا۔ اب یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کمزور لوگ اپنے سرپرستوں کی ناراضی مول لے کر ظلم و ستم کے اُس خوفناک ماحول میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاذ اللہ نبوت کی اس "سازش" میں شریک ہونے کی ہمت کر سکتے تھے؟

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ تینوں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے تھے اور

آپ سے وہی گہری عقیدت رکھتے تھے جو دوسرے صحابہ کرامؓ کو آپؐ سے تھی۔ اِسی ایمان کی بدولت وہ بھی دوسرے صحابہؓ کے ساتھ ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں کون یہ باور کر سکتا تھا کہ جو لوگ خود قرآن کے تصنیف کرنے میں حصہ لے رہے ہوں وہ اُس پر اور اُس کے پیش کرنے والے نبی پر ایمان لائیں اور اُس کی عقیدت کے جرم میں ظلم وستم برداشت کریں! (۵۰)

کفّار کی ہٹ دھرمی کا ایک عجیب نمونہ

اپنے ہر الزام اور اعتراض کا معقول جواب پا کر کفّار کی ہٹ دھرمی نے ایک نرالی صورت اختیار کی، اور وہ یہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی تو ہم اُس وقت مانتے جب یہ کسی ایسی زبان میں فر فر قرآن سُناتے جس سے یہ واقف نہیں ہیں۔ قرآن میں اس کا جو جواب دیا گیا وہ یہ تھا:

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاۗءٌ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى اُولٰۗىِٕكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ (حٰم السجدہ ۴۴)

"اگر ہم اِس کو عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے "کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی" ان سے کہو یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اُن کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ اُن کا حال تو ایسا ہے جیسے اُن کو دُور سے پکارا جا رہا ہو۔"

یہ اُس ہٹ دھرمی کا ایک اور نمونہ ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کیا جا رہا تھا۔ کفّار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) عرب ہیں، عربی اُن کی مادری زبان ہے، وہ اگر عربی میں قرآن پیش کرتے ہیں تو یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ کلام اُنہوں نے خود نہیں گھڑ لیا ہے بلکہ اُن پر خدا نے نازل کیا ہے۔ اُن کے اِس کلام کو خدا کا نازل کیا ہوا کلام تو اُس وقت مانا جا سکتا تھا جب یہ کسی ایسی زبان میں یکایک دھواں دھار تقریر کرنا شروع کر دیتے جسے یہ نہیں جانتے، مثلاً فارسی یا رُومی یا یُونانی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب اِن کی اپنی زبان میں قرآن بھیجا گیا ہے جسے یہ سمجھ سکیں تو ان کو یہ اعتراض ہے کہ عرب کے ذریعہ سے عربوں کے لیے عربی زبان میں یہ کلام کیوں نازل کیا گیا؟ لیکن اگر کسی دوسری زبان میں یہ بھیجا جاتا تو اُس وقت یہی لوگ یہ اعتراض کرتے کہ یہ معاملہ بھی خوب ہے، عرب قوم میں ایک عرب کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مگر کلام اُس پر ایسی زبان میں نازل کیا گیا ہے جسے نہ رسول سمجھتا ہے

اُن کے اِس لغو اعتراض کو رد کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انہیں یہ بھی سمجھایا گیا کہ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے تمہاری اپنی زبان میں ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جسے تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو اور جس سے جان سکتے ہو کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ اس سے منہ موڑ کر تم اپنا ہی نقصان کر رہے ہو۔

تَنْزِيلٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۝ (حٰم السجدہ: ۱-۴)

"یہ خدائے رحمٰن و رحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے، ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن، اُن لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں، بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔"

اس میں پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ یہ کلام خدا کی طرف سے نازل ہو رہا ہے۔ یعنی تم جب تک چاہو یہ رٹ لگاتے رہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود تصنیف کر رہے ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس کلام کا نزول خداوند عالم کی طرف سے ہے۔ مزید برآں یہ ارشاد فرما کر مخاطبین کو متنبہ کیا گیا کہ تم اگر اس کلام کو سن کر بگڑ رہے ہو تو تمہارا غصہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہیں بلکہ خدا کے خلاف ہے، اگر اسے رد کرتے ہو تو ایک انسان کی بات نہیں بلکہ خدا کی بات رد کرتے ہو، اور اگر اس سے بے رخی برتتے ہو تو ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے منہ موڑتے ہو۔

دوسری بات یہ ارشاد ہوئی کہ اس کا نازل کرنے والا وہ خدا ہے جو اپنی مخلوق پر بے انتہا مہربان اور رحیم ہے۔ نازل کرنے والے خدا کی دوسری صفات کے بجائے اُس کی صفتِ رحمت کا ذکر اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ اس نے اپنی رحمت کے تقاضے سے یہ کلام نازل کیا ہے۔ اس سے مخاطبین کو خبردار کر دیا گیا کہ اس کلام سے اگر کوئی بے رخی برتتا ہے یا اسے رد کرتا ہے، یا اس پر چیں بجبیں ہوتا ہے تو درحقیقت اپنے آپ سے دشمنی کرتا ہے۔ یہ تو ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جو خدا نے سراسر اپنی رحمت کی بنا پر انسانوں کی رہنمائی اور فلاح و سعادت کے لیے نازل کی ہے۔ خدا اگر انسان سے بے رخی برتتا تو انہیں اندھیرے میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا اور کچھ پروا نہ کرتا کہ یہ کس گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ لیکن یہ اس کا فضل و کرم ہے کہ پیدا کرنے اور روزی دینے کے ساتھ اُن کی زندگی سنوارنے کے لیے علم کی روشنی دکھانا بھی وہ اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اسی بنا پر یہ کلام وہ اپنے ایک بندے پر نازل کر رہا ہے۔ اب اُس شخص سے بڑھ کر ناشکرا اور آپ اپنا

دشمن کون ہوگا جو اس رحمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹا اس سے لڑنے کے لیے دوڑے۔

تیسری بات یہ فرمائی گئی کہ اس کتاب کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں یعنی اس میں کوئی بات گنجلک اور پیچیدہ نہیں ہے کہ کوئی شخص اس بنا پر اسے قبول کرنے سے معذوری ظاہر کر سکے کہ اس کی سمجھ میں اس کتاب کے مضامین آتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں تو صاف صاف بتایا گیا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا، صحیح عقائد کون سے ہیں اور غلط عقائد کون سے، اچھے اخلاق کیا ہیں اور برے اخلاق کیا، نیکی کیا ہے اور بدی کیا، کس طریقے کی پیروی میں انسان کی بھلائی ہے اور کس طریقے کو اختیار کرنے میں اُس کا اپنا نقصان ہے۔ ایسی صاف اور کھلی ہوئی ہدایت کو اگر کوئی شخص رد کرتا ہے یا اُس کی طرف توجہ نہیں کرتا تو وہ کوئی معذرت پیش نہیں کر سکتا۔ اس کے اس رویّے کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود برسرِ غلط رہنا چاہتا ہے۔

چوتھی بات یہ فرمائی گئی کہ یہ عربی زبان کا قرآن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن کسی غیر زبان میں آتا تو اہل عرب یہ عذر پیش کر سکتے تھے کہ ہم اُس زبان ہی سے نابلد ہیں جس میں تم نے اپنی کتاب بھیجی ہے۔ لیکن یہ تو ان کی اپنی زبان میں ہے۔ اسے نہ سمجھ سکنے کا بہانہ یہ نہیں بنا سکتے۔

پانچویں بات یہ فرمائی گئی کہ یہ کتاب اُن لوگوں کے لیے ہے جو علم رکھتے ہیں یعنی اس سے فائدہ صرف دانا لوگ ہی اٹھا سکتے ہیں۔ نادان لوگوں کے لیے یہ اسی طرح بے فائدہ ہے جس طرح ایک قیمتی ہیرا اُس شخص کے لیے بے فائدہ ہے جو ہیرے اور پتھر کا فرق نہ جانتا ہو۔

چھٹی بات یہ فرمائی گئی کہ یہ کتاب بشارت دینے والی اور ڈرانے والی ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ محض ایک تخیل، ایک فلسفہ اور ایک نمونۂ انشا پیش کرتی ہو جسے ماننے یا نہ ماننے کا کچھ حاصل نہ ہو بلکہ یہ پکار پکار کر تمام دنیا کو خبردار کر رہی ہے کہ اسے ماننے کے نتائج نہایت شاندار اور نہ ماننے کے نتائج انتہائی ہولناک ہیں۔ ایسی کتاب کو صرف ایک بے وقوف ہی سرسری طور پر نظر انداز کر سکتا ہے۔ (۴۷)

قرآن کی دعوت کو روکنے کے لیے کفار کی تدبیریں

ان سب تدبیروں میں ناکام ہونے کے بعد ان کا آخری حربہ یہ تھا کہ کھلی کھلی ہٹ دھرمی پر اتر آئیں، قرآن کی دعوت کو زبردستی روکنے کی کوشش کریں، اور جب قرآن سنایا جانے لگے تو خوب شور مچائیں اور ہر طرف سے اس کا مذاق اڑانے اور اس پر آوازے کسنے کے لیے ٹوٹ پڑیں۔ قرآن کریم میں ان کی یہ سب چالیں ایک ایک کر کے بیان کر دی گئیں جن سے ہر معقول آدمی کو معلوم ہو گیا کہ کفار کے پاس اب دلیل کے جواب میں دلیل نہیں ہے بلکہ اس میدان میں شکست کھا کر اب وہ تعصب، زبردستی اور بیہودگی سے حق کی آواز کو دبانے پر اتر آتے ہیں۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِکَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ۔ (حٰم السجدہ - ۵)

" اور انہوں نے کہہ دیا کہ جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں (یعنی ہمارے دلوں تک اس کے پہنچنے کا کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے)، ہمارے کانوں میں گرانی ہے، (یعنی ہم اسے نہیں سنتے)، اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے (یعنی جدائی پڑ گئی ہے) پس تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کر رہے ہیں (یعنی تیری مخالفت میں سرگرم ہیں)۔"

وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِہِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَ وَیَقُوْلُوْنَ اِنَّہٗ لَمَجْنُوْنٌ ۝ وَمَا ہُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ (القلم: ۵۱-۵۲)

" جب یہ کافر لوگ کلامِ نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ اپنی (غضبناک) نظروں سے تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص تو مجنون ہے۔ حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔"

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِھٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (حٰم السجدہ - ۲۶)

" اور یہ منکرینِ حق کہتے ہیں کہ اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور شور مچا کر اس میں خلل ڈالو شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ۔"

فَمَالِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا قِبَلَکَ مُھْطِعِیْنَ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِیْنَ۔ (المعارج: ۳۶-۳۷)

"پس (اے نبیؐ) کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے تمہاری طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں؟ (یعنی تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر مذاق اڑانے اور آوازے کسنے کے لیے ہر طرف سے دوڑ پڑے ہیں)۔" (۶۳)

فصل چہارم

آخرت پر ایمان لانے کی دعوت

دعوتِ اسلامی کا چوتھا نکتہ یہ تھا کہ لوگ آخرت پر ایمان لائیں۔ یہ ایک محض مختصر سا نکتہ نہ تھا بلکہ اس میں بہت سی اہم حقیقتیں شامل تھیں جنہیں تسلیم کرنے کا مجموعی نام ایمان بالآخرۃ تھا۔

اوّل یہ کہ دنیا میں انسان غیر ذمہ دار بنا کر نہیں چھوڑ دیا گیا ہے کہ یہاں جو کچھ بھی وہ چاہے کرتا رہے، کوئی اُس سے بازپرس کرنے والا نہ ہو، بلکہ یہ دنیا دارالامتحان ہے جس میں انسان آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور جو کچھ بھی وہ یہاں کرتا ہے اس کی جواب دہی اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے کرنی ہوگی۔

دوم یہ کہ اس جواب دہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔ نوعِ انسانی کو دنیا میں کام کرنے کے لیے جتنی مہلت دینے کا اللہ فیصلہ فرما چکا ہے، اس کے ختم ہونے پر قیامت برپا ہوگی جس میں یہ سارا نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظامِ عالم قائم کیا جائے گا اور ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جتنے انسان گزر چکے ہوں گے وہ سب بیک وقت زندہ کر کے از سرِ نو اُس عالم میں اٹھائے جائیں گے۔ یہ دوسری زندگی دنیا کی موجودہ زندگی کی طرح عارضی نہیں بلکہ ابدی ہوگی۔ موت اس میں کبھی نہ آئے گی۔

سوم یہ کہ اُس وقت تمام اگلے پچھلے انسانوں کو جمع کر کے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں اُن اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی جو اُس نے خود اپنی ذمہ داری پر دنیا میں کیے ہوں گے۔

چہارم یہ کہ دنیا میں انسان جو کچھ بھی کر رہا ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ اس کو براہِ راست جانتا ہے، مگر عدل کی تمام شرائط پوری کرنے کے لیے وہ اُس کا مکمل اور بالکل صحیح نامۂ اعمال تیار کرا رہا ہے۔ بے شمار شہادتیں اس کے ایک ایک قول و فعل کے لیے فراہم کر رہا ہے خواہ وہ اُس نے علانیہ کیا ہو یا چھپ کر، بلکہ جس نیت اور جس ارادے سے اس نے کوئی بات کی یا کہی ہے اور جو جو خیالات اُس نے اپنے دل میں رکھے ہیں، ان

سب کا ثبوت بھی ہو رہا محفوظ کیا جا رہا ہے۔ پھر اس بات کے گواہ بھی اُس نے تیار کر رکھے ہیں کہ انسان کو حق اور باطل کا فرق بتا دینے اور غلط راستوں کے درمیان سیدھا راستہ بتانے کے لیے اُس کی طرف سے پُورا انتظام کر دیا گیا تھا۔ یہ سب شہادتیں اللہ کی عدالت میں اِس شان سے پیش ہوں گی کہ انسان اِن کا انکار نہ کر سکے گا۔

پنجم یہ کہ اللہ کی عدالت میں کوئی رشوت، بے جا سفارش، اور خلافِ حق وکالت نہ چل سکے گی۔ کسی کا بوجھ نہ کسی دوسرے پر ڈالا جائے گا اور نہ کوئی عزیز سے عزیز اور قریب سے قریب شخص اپنے عزیز و قریب کا بوجھ اپنے اُوپر لے گا۔ جن واقعی یا خیالی ہستیوں کو آدمی اپنا ولی و ناصر سمجھتا ہے وہ اس کے کسی کام نہ آئیں گی۔ انسان وہاں تن تنہا بالکل بے یار و مددگار کھڑا ہوا اپنے کارنامۂ حیات کا حساب آپ دے رہا ہوگا۔ اور فیصلہ بالکل اللہ کے اختیار میں ہوگا۔

ششم یہ کہ فیصلے کا مدار کلیۃً اس بات پر ہوگا کہ انسان نے دنیا میں انبیاء کے بتائے ہوئے حق کو مان کر اس کے مطابق اللہ کی ٹھیک بندگی کی ہے یا نہیں، اور آخرت میں اپنی جواب دہی کے احساس کو ملحوظ رکھتے ہوئے زندگی بسر کی یا اسے بھول کر سب کچھ دنیا ہی کے لیے کرتا رہا۔ پہلی صورت میں اس کے لیے جنت ہے اور دوسری صورت میں جہنم۔

یہ آخرت کا عقیدہ اسلامی دعوت کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا توحید، رسالت اور قرآن کو کلامِ الٰہی ماننے کا عقیدہ، کیونکہ اسلام جس طرزِ فکر و عمل کی طرف بلا رہا تھا اور جس راہ پر چلنے کی دعوت دے رہا تھا اس پر ایک قدم چلنا بھی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے جب تک وہ دنیا کو امتحان گاہ، اور اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ نہ سمجھ لے، اور جب تک اُس کے دماغ سے یہ خیال نکل نہ جائے کہ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے جس میں ظاہر ہونے والے نتائج ہی خیر و شر کا اصل معیار ہیں، اور وہ سچے دل سے یہ بات نہ مان لے کہ اصلی اور ابدی زندگی وہ ہے جو موت کے بعد آنے والی ہے، اور خیر و شر کا حقیقی معیار یہ ہے کہ کس راہ پر چل کر آدمی اُس دوسری زندگی میں کامیاب ہوگا اور کس پر چل کر برا انجام دیکھے گا۔ یہ عقیدہ نہ ہو تو آدمی سرے سے توحید و رسالت اور ایمان بالقرآن کی دعوت کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھے گا، اور اگر کسی وجہ سے اس کو مان بھی لے تو خدا کی بندگی، رسول کی اطاعت اور قرآن کی پیروی میں ہرگز سنجیدہ نہ ہوگا۔ اس لیے کہ جب آدمی یہ سمجھتا ہو کہ آخرکار سب کو مر کر مٹی میں مل جانا ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کی پیروی کرنے کی جزا اور نہ کرنے کی سزا لازماً ملنے والی ہو، تو وہ کبھی ایمانداری کے ساتھ اپنے آپ کو اُس ضابطہ میں جکڑوا دینے کے لیے تیار نہ ہوگا جس میں اسلام اس کو باندھنا چاہتا ہے بلکہ زندگی کے ہر معاملہ میں وہ طریقہ اختیار کرے گا جس سے دنیا میں کچھ فائدہ، کچھ لطف اور کچھ قوت حاصل ہو

اور پھر اس طریقے سے اجتناب کرے گا جس کی بدولت وہ حیاتِ دنیا کے فائدوں اور لذتوں سے محروم ہوتا ہو یا نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہوتا ہو۔

قریش کا آخرت کو بعید از عقل اور ناممکن سمجھنا

اس عقیدے کی یہی اہمیت تھی جس کی وجہ سے قریش اور مشرکین عرب کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پیش کیا تو وہ سب سے زیادہ اسی پر چیں بجبیں ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر اس کو ہم مان لیں تو ہماری ساری آزادیاں ختم ہو جائیں گی، ہم تنہائی میں بھی، جہاں ہمیں کوئی دیکھنے والا نہ ہو، کوئی ایسا فعل جسے خدا اور رسول اور قرآن نے حرام کیا ہے نہ کر سکیں گے۔ ہم جہاں کوئی ناجائز فائدہ یا لطف یا قوت حاصل کرنے پر پوری طرح قادر رہیں گے وہاں بھی یہ عقیدہ ہمارے ہاتھ باندھ کر رکھ دے گا۔ یہ تو ایک غیر محسوس سپاہی ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ لگا رہے گا جو کسی حالت میں بھی ہم کو من مانی نہ کرنے دے گا۔ اسی بنا پر وہ پوری قوت کے ساتھ اس پر حملہ آور ہو گئے، اور انہوں نے بڑے زور شور سے لوگوں میں یہ خیال پھیلانے کی کوشش کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات تو قطعی خلافِ عقل ہے، بعید از امکان ہے، سراسر دیوانگی بلکہ محض قابلِ مضحکہ ہے۔ (۴۳)

آخرت کو مشکوک سمجھنے والوں کے خیالات

کفار میں سے ایک قلیل گروہ ایسا بھی تھا جو کہتا تھا کہ ہم گمان کی حد تک تو سمجھتے ہیں کہ شاید آخرت ہو مگر ہمیں اس کا یقین نہیں ہے۔ اس گروہ کا ذکر صرف ایک جگہ قرآن میں آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کے لوگ بہت کم پائے جاتے تھے:

وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُم مَّا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ (الجاثیہ۔ ۳۲)

"اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہوتی ہے، ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں، یقین ہم کو نہیں ہے۔"

بظاہر اس گروہ اور منکرینِ آخرت کے درمیان اس لحاظ سے بڑا فرق ہے کہ وہ آخرت کے بالکل منکر ہیں اور یہ گروہ اس کے ممکن ہونے کا گمان رکھتا ہے۔ لیکن نتیجے اور انجام کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کہ آخرت کے انکار اور اس پر یقین نہ ہونے کے اخلاقی نتائج بالکل ایک جیسے ہیں۔ کوئی شخص خواہ آخرت کو نہ مانتا ہو، یا اس کا صرف گمان رکھتا ہو مگر یقین نہ رکھتا ہو، دونوں صورتوں میں لازماً وہ خدا

کے سامنے اپنی جوابدہی کے احساس سے خالی ہوگا اور یہ عدمِ احساس اس کو لازماً فکر و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا کیے رہے گا۔ صرف آخرت کا یقین ہی دنیا میں آدمی کے رویّے کو درست رکھ سکتا ہے۔ یہ اگر نہ ہو تو شک اور انکار دونوں اسے ایک ہی طرح کی غیر ذمہ دارانہ روش پر ڈال دیتے ہیں۔ اور چونکہ یہی غیر ذمہ دارانہ روش آخرت کی بدانجامی کا اصل سبب ہے، اس لیے دوزخ میں جانے سے نہ انکار کرنے والا بچ سکتا ہے، نہ یقین نہ رکھنے والا۔ (۵۵)

منکرینِ آخرت کے خیالات

اِس ایک مقام کو چھوڑ کر باقی تمام مقامات پر قرآن میں آخرت کا کھلا کھلا انکار کرنے والوں کے اقوال نقل کیے گئے ہیں:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۔ وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۔ (الجاثیہ: ۲۴۔۲۵)

"یہ لوگ کہتے ہیں کہ "زندگی بس یہی ہماری دنیا کی زندگی ہے یہیں ہمیں مرنا اور جینا ہے اور گردشِ ایّام کے سوا کوئی چیز نہیں جو ہمیں ہلاک کرتی ہو۔" درحقیقت اِس معاملہ میں اِن کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ یہ محض گمان کی بنا پر یہ باتیں کرتے ہیں اور جب ہماری واضح آیات (جو آخرت پر دلالت کرتی ہیں) انہیں سنائی جاتی ہیں تو ان کے پاس کوئی حجت اِس کے سوا نہیں ہوتی کہ "اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو۔"

یعنی کوئی ذریعۂ علم ایسا نہیں ہے جس سے اِن کو تحقیق یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اس زندگی کے بعد انسان کے لیے کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، اور یہ بات بھی انہیں معلوم ہو گئی ہو کہ انسان کی رُوح کسی خدا کے حکم سے قبض نہیں کی جاتی بلکہ آدمی محض گردشِ ایّام سے مر کر فنا ہو جاتا ہے۔ منکرینِ آخرت یہ باتیں کسی علم کی بنا پر نہیں بلکہ محض گمان کی بنا پر کرتے ہیں۔ علمی حیثیت سے اگر وہ بات کریں تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ بس یہ ہے کہ "ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں۔" لیکن یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ "ہم جانتے ہیں کہ اِس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔" اِسی طرح علمی طریقہ پر وہ یہ جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آدمی کی رُوح خدا کے حکم سے نکالی نہیں جاتی ہے بلکہ انسان محض اُسی طرح مر کر ختم ہو جاتا ہے جیسے ایک گھڑی چلتے چلتے رُک جاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ "ہم اِن دونوں میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں جانتے کہ فی الواقع کیا صورت پیش آتی ہے۔" اب سوال یہ ہے کہ جب انسانی ذرائعِ علم

کی حد تک زندگی بعد موت کے ہونے یا نہ ہونے، اور قبضِ روح واقع ہونے یا گردشِ ایام سے آپ ہی آپ مر جانے کا یکساں احتمال ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ امکانِ آخرت کے احتمال کو چھوڑ کر حتمی طور پر انکارِ آخرت کے حق میں فیصلہ کر ڈالتے ہیں؟ کیا اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور ہے کہ دراصل مسئلے کا آخری فیصلہ وہ دلیل کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی خواہشات کی بنا پر کرتے ہیں؟ چونکہ اُن کا دل یہ نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہو اور موت کی حقیقت نیستی اور عدم نہیں، بلکہ خدا کی طرف سے قبضِ روح ہو، اس لیے وہ اپنے دل کی مانگ کو اپنا عقیدہ بنا لیتے ہیں اور دوسری بات کا انکار کر دیتے ہیں۔ (۷۶)

قَالُوْٓا ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۔ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا هٰذَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۔ (المومنون: ۸۲-۸۳)

"یہ کہتے ہیں "کیا جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیوں کے پنجر بن کر رہ جائیں گے تو ہم کو پھر زندہ کر کے اٹھایا جائے گا؟ ہم نے بھی یہ وعدے بہت سُنے ہیں اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا بھی سُنتے رہے ہیں۔ یہ محض افسانہائے پارینہ ہیں۔""

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرَابًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۔ (الرعد۔۵)

"اور اگر تمہیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ "جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے۔"

یعنی ان کا آخرت سے انکار اور اسے بعید از امکان سمجھنا دراصل خدا سے اور اس کی قدرت اور حکمت سے انکار ہے۔ یہ صرف اتنا ہی نہیں کہتے کہ ہمارا مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ پیدا ہونا غیر ممکن ہے، بلکہ ان کے اسی قول میں یہ خیال بھی پوشیدہ ہے کہ معاذ اللہ وہ خدا عاجز و درماندہ اور نادان ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے۔ (۷۷)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۔ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۔ (سبا: ۷-۸)

"منکرین لوگوں سے کہتے ہیں "ہم بتائیں تمہیں ایسا شخص جو خبر دیتا ہے کہ جب تمہارے جسم کا ذرہ ذرہ منتشر ہو چکا ہوگا اُس وقت تم نئے سرے سے پیدا کر دیئے جاؤ گے؟ نہ معلوم یہ شخص اللہ کے نام سے جھوٹ گھڑتا ہے یا اسے جنون لاحق ہے۔"

قریش کے سردار قطعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھوٹا کہہ دینے کی ہمت نہ رکھتے تھے کیونکہ پوری قوم آپ کو صادق القول جانتی تھی اور کبھی ساری عمر کسی نے آپ کی زبان سے کوئی جھوٹی بات نہ سنی تھی۔ اس لیے وہ لوگوں کے سامنے اپنا الزام اس شکل میں پیش کرتے تھے کہ یہ شخص جب زندگی بعد موت جیسی اَن ہونی بات زبان سے نکالتا ہے تو لا محالہ اس کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو (معاذ اللہ) یہ شخص جان بوجھ کر ایک جھوٹی بات کہہ رہا ہے، یا پھر یہ مجنون ہے۔ لیکن یہ مجنون والی بات بھی اتنی ہی بے سروپا تھی جتنی جھوٹ والی بات۔ اس لیے کہ کوئی عقل کا اندھا ہی ایک کامل درجے کے عاقل و فہیم آدمی کو مجنون مان سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بیہودہ باتوں کے جواب میں کسی استدلال کی ضرورت محسوس نہ فرمائی اور کلام صرف ان کے اس اچنبھے پر کیا جو زندگی بعد موت کے امکان پر وہ ظاہر کرتے تھے۔ (۴۸)

يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِى الْحَافِرَةِ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ (النّٰزعٰت ۱۰-۱۲)

"یہ لوگ کہتے ہیں "کیا واقعی ہم پلٹا کر پھر واپس لائے جائیں گے؟ کیا جب ہم کھوکھلی بوسیدہ ہڈیاں بن چکے ہوں گے؟" کہنے لگے "یہ واپسی تو پھر بڑے گھاٹے کی ہوگی!"

یعنی جب ان کو جواب دیا گیا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا تو وہ مذاق کے طور پر آپس میں ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یارو، اگر واقعی ہمیں پلٹ کر دوبارہ زندگی کی حالت میں واپس آنا پڑا تو ہم مارے گئے۔ اس کے بعد تو پھر ہماری خیر نہیں۔ (۴۹)

وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ

(الواقعہ ۴۷-۵۰)

"اور وہ کہتے تھے "کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کے پنجر رہ جائیں گے تو پھر اٹھا کھڑے کیے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی اٹھائے جائیں گے جو پہلے گزر چکے ہیں؟" اے نبی، ان لوگوں سے کہو، یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔"

امکانِ آخرت کے دلائل

منکرینِ آخرت اپنے انکار کے حق میں جو کچھ کہتے تھے اس کو نقل کر کے قرآن مجید میں جگہ جگہ وہ دلائل دیے گئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آخرت کا آنا عقلی طور پر ممکن ہے، اور اسے ممکن سمجھنا نہیں بلکہ غیر ممکن

سمجھنا خلافِ عقل ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۔ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۔ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۔ (یٰسٓ ۔ ۷۷ تا ۷۹)

"کیا انسان دیکھتا نہیں ہے کہ ہم نے اُسے ایک نُطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ صریح جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا؟ اب وہ ہم پر مثالیں چسپاں کرتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول جاتا ہے۔ کہتا ہے کون ان ہڈیوں کو زندہ کرے گا جبکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں؟ اس سے کہو، انہیں وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انہیں پیدا کیا تھا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے۔"

یعنی وہ یہ بات بھول جاتا ہے کہ ہم نے بے جان مادہ سے وہ ابتدائی نطفۂ حیات پیدا کیا جو اُس کا ذریعۂ تخلیق بنا، اور پھر اُس حقیر نطفے کو پرورش کر کے اُسے یہاں تک بڑھا لائے کہ آج وہ ہمارے سامنے باتیں چھانٹنے کے قابل ہوا ہے۔ وہ ہمیں بھی عام مخلوقات کی طرح عاجز سمجھ رہا ہے اور اس خیالِ خام میں مبتلا ہے کہ جس طرح انسان مُردے کو زندہ نہیں کر سکتا اسی طرح ہم بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لیے پوچھتا ہے کہ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ ابن عباسؓ، قتادہؓ اور سعید بن جُبیرؒ کی روایت ہے کہ اس موقع پر کفارِ مکہ میں سے ایک شخص قبرستان سے کسی مُردے کی ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آ گیا اور اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے توڑ کر اور اس کے منتشر اجزاء ہوا میں اُڑا کر آپ سے کہا "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم کہتے ہو کہ مُردے زندہ کر کے پھر اٹھائے جائیں گے۔ اب بتاؤ، اِن بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟" اِس کا مختصر ترین اور بلیغ ترین جواب یہ دیا گیا کہ وہی جس نے اِسے پہلے پیدا کیا تھا۔ (۸۰)

وَقَالُوا أَإِذَا كُنَّا عِظَامًا وَرُفَاتًا أَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا ۔ قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ۔ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ ۚ فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا ۖ قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هُوَ ۖ قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ قَرِيبًا ۔ يَوْمَ يَدْعُوكُمْ فَتَسْتَجِيبُونَ بِحَمْدِهِ وَتَظُنُّونَ إِن لَّبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا ۔ (بنی اسرائیل ۴۹ تا ۵۲)

"وہ کہتے ہیں "جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟" ــــ ان سے کہو "تم پتھر یا لوہا بھی ہو جاؤ، یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز جو تمہارے ذہن میں قبولِ حیات سے بعید تر ہو، پھر بھی تم اٹھ کر رہو گے۔" وہ ضرور پوچھیں گے "کون ہے

جو ہمیں پھر زندگی کی طرف پلٹا کر لائے گا؟ جواب میں کہو "وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا۔" وہ (مذاق اُڑانے کے انداز میں) سر ہلا ہلا کر پوچھیں گے "اچھا، تو یہ ہوگا کب؟" تم کہو "کیا عجب کہ وہ وقت قریب ہی آ لگا ہو۔ جس روز وہ تمہیں پکارے گا، تم اس کی حمد کرتے ہوئے اُس کی پکار کے جواب میں نکل آؤ گے اور تمہارا گمان اُس وقت یہ ہوگا کہ ہم بس تھوڑی دیر ہی اِس حالت میں پڑے رہے ہیں۔"

یعنی دنیا میں مرنے کے وقت سے لے کر قیامت میں اٹھنے کے وقت تک کی مدت تم کو چند گھنٹوں سے زیادہ محسوس نہ ہوگی۔ تم اُس وقت یہ سمجھو گے کہ ہم ذرا دیر سوئے پڑے تھے کہ یکایک اِس شورِ محشر نے ہمیں جگا اٹھایا۔ (۸۱)

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا۔ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (مریم ۶۶ تا ۶۷)

"انسان کہتا ہے کیا واقعی جب میں مر چکوں گا تو پھر زندہ کر کے نکال لایا جاؤں گا؟ کیا انسان کو یاد نہیں رہا کہ ہم پہلے اس کو پیدا کر چکے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہ تھا؟"

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ۔

(الحج: ۵)

"لوگو، اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) کہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقتِ خاص تک رحموں میں ٹھیرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی پوری جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ زمین سوکھی پڑی ہے، پھر جہاں ہم نے اُس پر مینہ برسایا، یکایک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی اور اُس نے ہر قسم کی خوش منظر نباتات اگلنی شروع کر دی۔"

مٹی سے پیدا کرنے کا مطلب یا تو یہ ہے کہ ہر انسان اُن مادّوں سے پیدا کیا جاتا ہے جو سب کے سب زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور اس تخلیق کی ابتدا نطفے سے ہوتی ہے۔ یا یہ کہ نوعِ انسانی کا آغاز آدم علیہ السلام سے کیا گیا جو براہِ راست مٹی سے بنائے گئے تھے، اور پھر آگے نسلِ انسانی کا سلسلہ نطفے سے چلا، جیسا کہ سورۂ سجدہ میں فرمایا:

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ۔

(آیات ۷-۸)

"انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ایک سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی شکل میں نکلتا ہے۔"

دونوں صورتوں میں یہ بہرحال ثابت ہے کہ زندہ انسان کی تخلیق بے جان مادّوں کو جمع کر کے کی گئی ہے۔ اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اُن مختلف اطوار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے استقرارِ حمل کے بعد بچہ ماں کے پیٹ میں گزرتا ہے۔ اُن کی وہ تفصیلات بیان نہیں کی گئیں جو آج کل صرف طاقت ور خوردبین ہی سے نظر آ سکتی ہیں، بلکہ اُن بڑے بڑے نمایاں تغیّرات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے اُس زمانے کے عام بدو بھی واقف تھے۔ یعنی نطفہ قرار پانے کے بعد ابتداً جمے ہوئے خون کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے، پھر وہ گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل ہوتا ہے جس میں پہلے شکل صورت کچھ نہیں ہوتی اور آگے چل کر انسانی شکل نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسقاط کی مختلف حالتوں میں چونکہ تخلیقِ انسانی کے یہ سب مراحل لوگوں کے مشاہدے میں آتے تھے، اس لیے انہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس سوال کا جواب انسان کے اپنے فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ جو خدا انسان کو اس طرح پیدا کرتا ہے اور پروان چڑھاتا ہے اس کے لیے آخر اسے دوبارہ پیدا کرنا کیوں ناممکن ہو؟ (۴۲)

وَقَالُوا أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ ۚ بَلْ هُم بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَافِرُونَ ۝ قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ۝

(السجدہ - ۱۰-۱۱)

"اور یہ لوگ کہتے ہیں: "جب ہم مٹی میں رَل مل چکے ہوں گے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ ان سے کہو "موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لے گا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے۔""

پہلے فقرے اور آخری فقرے کے درمیان پوری ایک داستان کی داستان ہے جسے سامع کے ذہن پر چھوڑ

دیا گیا ہے۔ کفار کا جو اعتراض پہلے فقرے میں نقل کیا گیا ہے وہ اتنا مہمل تھا کہ اس کی تردید کی حاجت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کا محض نقل کر دینا ہی اس کی لغویت ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اس لیے کہ ان کا اعتراض جن دو اجزاء پر مشتمل ہے وہ دونوں ہی سراسر غیر معقول ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ "ہم مٹی میں رل مل گئے ہوں گے" آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ "ہم" جس چیز کا نام ہے وہ کب مٹی میں رلتی ملتی ہے؟ مٹی میں تو صرف وہ جسم ملتا ہے جس سے "ہم" نکل چکا ہوتا ہے۔ اس جسم کا نام "ہم" نہیں ہے۔ زندگی کی حالت میں جب اس جسم کے اعضاء کاٹے جاتے ہیں تو عضو پر عضو کٹتا چلا جاتا ہے مگر "ہم" پورا کا پورا اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ اس کا کوئی جزء بھی کسی کٹے ہوئے عضو کے ساتھ نہیں جاتا۔ اور جب یہ "ہم" کسی جسم میں سے نکل جاتا ہے تو پھر پورا جسم موجود ہوتے ہوتے بھی اس پر اس "ہم" کے کسی ادنیٰ شائبے تک کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو ایک عاشق جاں نثار اپنے معشوق کے مردہ جسم کو لے جا کر دفن کر دیتا ہے، کیونکہ معشوق اُس جسم سے نکل چکا ہوتا ہے اور عاشق اپنے معشوق کو نہیں بلکہ اس خالی جسم کو دفن کرتا ہے جس میں کبھی اس کا معشوق رہتا تھا۔ پس معترضین کے اعتراض کا پہلا مقدمہ ہی بے بنیاد ہے۔ رہا اس کا دوسرا جزء کہ "کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" تو یہ انکار و تعجب کے انداز کا سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا اگر معترضین نے بات کرنے سے پہلے اس "ہم" اور اس کے پیدا کیے جانے کے مفہوم پر ایک لمحہ کے لیے بھی کچھ غور کر لیا ہوتا۔ اس "ہم" کی موجودہ پیدائش اس کے سوا کیا ہے کہ کہیں سے کوئلہ اور کہیں سے لوہا اور کہیں سے چونا اور اسی طرح کے دوسرے اجزاء جمع ہوئے اور اس کالبدِ خاکی میں یہ "ہم" براجمان ہو گیا۔ پھر اس کی موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس کالبدِ خاکی میں سے جب "ہم" نکل جاتا ہے تو اس کا مکان تعمیر کرنے کے لیے جو اجزاء زمین کے مختلف حصوں سے فراہم کیے گئے تھے وہ سب اسی زمین میں واپس چلے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس نے پہلے اس "ہم" کو یہ مکان بنا کر دیا تھا، کیا وہ دوبارہ اسی سروسامان سے وہی مکان بنا کر اسے از سرِ نو اس میں نہیں بسا سکتا؟ یہ چیز جب پہلے ممکن تھی اور ممکن کیا معنی، واقعہ کی صورت میں رونما ہو بھی چکی ہے، تو دوبارہ اس کے ممکن ہونے اور واقعہ بننے میں آخر کیا امر مانع ہے؟ یہ باتیں ایسی ہیں جنہیں ذرا سی عقل آدمی استعمال کرے تو خود ہی سمجھ سکتا ہے لیکن وہ اپنی عقل کو اس رخ پر کیوں نہیں جانے دیتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے حیات بعد الموت اور آخرت پر اس طرح کے لایعنی اعتراضات جڑتا ہے؟ بیچ کی ساری بحث چھوڑ کر اللہ تعالیٰ دوسرے فقرے میں اسی سوال کا جواب دیتا ہے کہ "دراصل یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں"۔ یعنی اصل بات یہ نہیں ہے کہ دوبارہ پیدائش کوئی بڑی ہی اور بعید از امکان بات ہے جو ان کی سمجھ میں نہ آ سکتی ہو، بلکہ دراصل جو چیز انہیں یہ بات سمجھنے سے روکتی ہے وہ ان کی یہ خواہش ہے کہ ہم زمین میں چھوٹے پھریں اور دل کھول کر گناہ کریں اور پھر بخیرو (Scot free

یہاں سے نکل جائیں، پھر ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہو، پھر اپنے کرتوتوں کا کوئی حساب ہمیں نہ دینا پڑے۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ تمہارا "ہم" جس مکان میں رہتا ہے وہ تو ضرور مٹی میں رل مل جائے گا، مگر خود یہ "ہم" مٹی میں نہ ملے گا بلکہ اس کی مہلتِ عمل ختم ہوتے ہی خدا کا فرشتۂ موت آئے گا اور اُسے جسم سے نکال کر جوں کا توں اپنے قبضے میں لے لے گا۔ اُس کا کوئی ادنیٰ سا جز بھی جسم کے ساتھ مٹی میں نہ جا سکے گا۔ وہ پُورا کا پُورا حراست (Custody) میں لے لیا جائے گا اور اپنے رب کے حضور پیش کر دیا جائے گا:

اس مختصر سی آیت میں بہت سے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر سے سرسری طور پر نہ گزر جانا چاہیے :-

۱ - اس میں تصریح ہے کہ موت کچھ یونہی نہیں آجاتی کہ ایک گھڑی چل رہی تھی، کُوک ختم ہُوئی اور وہ چلتے چلتے یکایک بند ہو گئی۔ بلکہ دراصل اِس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو آ کر ٹھیک ٹھیک اُسی طرح باقاعدہ وصُول کرتا ہے جس طرح ایک سرکاری تحویل امین (Official (Receiver) کسی چیز کو اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر اس کی مزید تفصیلات جو بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس افسرِ موت کے ماتحت فرشتوں کا ایک پُورا عملہ ہے جو موت وارد کرنے اور رُوح کو جسم سے نکالنے اور اس کو قبضے میں لینے کی بہت سی مختلف النوع خدمات انجام دیتا ہے۔ نیز یہ کہ اُس عملے کا برتاؤ مُجرم رُوح کے ساتھ کچھ اور ہوتا ہے اور مومنِ صالح رُوح کے ساتھ کچھ اور۔ (ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سُورۂ نساء آیت ۹۷ - الانعام، ۹۳ - النحل، ۲۸ - الواقعہ، ۸۳ - ۹۴)۔

۲ - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا، بلکہ اُس کی رُوح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ قرآن کے الفاظ "موت کا فرشتہ تم کو پُورا کا پُورا اپنے قبضے میں لے لے گا" اِسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ قبضے میں لینے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ مقبوضہ چیز قابض کے پاس رہے۔

۳ - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت جو چیز قبضے میں لی جاتی ہے وہ آدمی کی حیوانی زندگی (Biological Life) نہیں بلکہ اس کی وہ خودی، اس کی وہ اَنا (Ego) ہے جو "میں" اور "ہم" اور "تم" کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ اَنا دنیا میں کام کر کے جیسی کچھ شخصیت بھی بنتی ہے وہ پُوری کی پُوری، جوں کی توں (Intact) نکال لی جاتی ہے، بغیر اس کے کہ اُس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی ہو۔ اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے، اِسی کو آخرت میں نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا، اِسی پر مقدمہ قائم کیا جائے گا، اِسی سے حساب لیا جائے گا اور اِسی کو جزا و سزا

دیکھنی ہوگی۔ (۳۳)

فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمْ مَّنْ خَلَقْنَا إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِّنْ طِينٍ لَّازِبٍ۔
(الصّٰفّٰت۔ ۱۱)

"پھر ذرا اِن سے پوچھو، اِن کی پیدائش زیادہ مشکل ہے یا اُن چیزوں کی جو ہم نے پیدا کر رکھی ہیں؟ اِن کو تو ہم نے لیس دار گارے سے پیدا کیا ہے۔"

یہ کفّارِ مکہ کے اُس شبہ کا جواب تھا جو وہ آخرت کے بارے میں پیش کرتے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ آخرت ممکن نہیں ہے، کیونکہ مرے ہوئے انسانوں کا دوبارہ پیدا ہونا محال ہے۔ اس کے جواب میں امکانِ آخرت کے دلائل پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اُن کے سامنے یہ سوال رکھا کہ اگر تمہارے نزدیک مرے ہوئے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا بڑا سخت کام ہے جس کی قدرت تمہارے خیال میں ہم کو حاصل نہیں ہے تو بتاؤ کہ یہ زمین و آسمان اور یہ بے شمار اشیاء جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، اِن کا پیدا کرنا کوئی آسان کام ہے؟ آخر تمہاری عقل کہاں ماری گئی ہے کہ جس خدا کے لیے یہ عظیم کائنات پیدا کرنا مشکل نہ تھا، اور جو خود تم کو ایک دفعہ پیدا کر چکا ہے، اس کے متعلق تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہاری دوبارہ تخلیق سے وہ عاجز ہے۔ پھر فرمایا کہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اِسی مٹی سے دوبارہ بنایا جا سکتا ہے۔ اُس کا سارا مادّۂ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے وہ غذا سے بنتا ہے، اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرنے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزاء سے مرکّب ہوتی ہے وہ سب بھی غذا ہی سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخرکار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لیے غلّے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور اُن حیوانات کو پرورش کرے جن کا دُودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔ اِس جواب میں بناے استدلال یہ ہے کہ یہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کیے جانے کا آج امکان ہے، جیسا کہ تمہارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اِسی مٹی سے تمہاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہوگی؟ (۳۴)

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ
(المؤمن۔ ۵۷)

"آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا انسانوں کو پیدا کرنے کی بہ نسبت زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

یہ کفار کے اِس خیال کا جواب تھا کہ انسان کا مر کر دوبارہ جی اٹھنا غیر ممکن ہے۔ اِس پر ارشاد فرمایا گیا

کہ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ درحقیقت نادان ہیں۔ اگر عقل سے کام لیں تو اُن کے لیے یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہ ہو کہ جس خدا نے یہ عظیم الشان کائنات بنائی ہے اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کوئی دشوار کام نہیں ہو سکتا۔ (۸۵)

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا۔ (النّٰزعٰت۔ ۲۷) کیا تم لوگوں کی تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے اُس کو بنایا۔

تخلیق سے مُراد انسانوں کی دوبارہ تخلیق ہے اور آسمان سے مراد وہ پورا عالم بالا ہے جس میں بے شمار تارے اور سیارے، بے حد و حساب شمسی نظام اور ان گنت کہکشاں پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم جو موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو کوئی بڑا ہی امرِ محال سمجھتے ہو، اور بار بار کہتے ہو کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو چکی ہوں اُس حالت میں ہمارے پراگندہ اجزائے جسم پھر سے جمع کر دیئے جائیں اور ان میں جان ڈال دی جائے، کبھی اِس بات پر بھی غور کرتے ہو کہ اِس عظیم کائنات کا بنانا زیادہ سخت کام ہے یا تمہیں ایک مرتبہ پیدا کر چکنے کے بعد دوبارہ اِسی شکل میں پیدا کر دینا؟ جس خدا کے لیے وہ کوئی مشکل کام نہ تھا اس کے لیے آخر یہ کیوں ایسا مشکل کام ہے کہ وہ اس پر قادر نہ ہو سکے؟ (۸۶)

وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۝ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ (الصّٰفّٰت۔ ۱۵ تا ۲۰)

"اور کہتے ہیں "یہ تو صریح جادُو ہے۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ جب ہم مر چکے ہوں اور مٹی بن جائیں اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں اُس وقت ہم پھر زندہ کر کے اُٹھا کھڑے کیے جائیں؟ اور کیا ہمارے اگلے وقتوں کے آباء و اجداد بھی اُٹھائے جائیں گے؟" ان سے کہو "ہاں، اور تم (خدا کے مقابلے میں) بے بس ہو۔" بس ایک ہی جھڑکی ہوگی اور یکایک یہ اپنی آنکھوں سے (وہ سب کچھ جس کی خبر دی جا رہی ہے) دیکھ رہے ہوں گے۔ اُس وقت یہ کہیں گے ہائے ہماری کم بختی، یہ تو یوم الجزاء ہے۔"

ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ تو عالمِ طلسمات کی باتیں ہیں۔ کوئی جادُو کی دُنیا ہے جس کا یہ شخص ذکر کر رہا ہے۔ جس میں مرنے اُٹھیں گے، عدالت ہوگی، جنت بسائی جائے گی اور دوزخ کے عذاب ہوں گے۔ اُن کے اِس قول کا یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ یہ شخص دل چلوں کی سی باتیں کر رہا ہے، اس کی یہ باتیں ہی اِس بات کا صریح ثبوت ہیں کہ کسی نے اس پر جادُو کر دیا ہے جس کی وجہ سے بھلا چنگا آدمی یہ باتیں کرنے لگا۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ ہاں ایسا ہی ہوگا اور تم اپنے خدا کے آگے بے بس ہو۔ وہ جو کچھ بھی تمہیں بنانا چاہے بنا سکتا ہے جب اُس نے

چاہا اُس کے ایک اشارے پر تم موجود ہیں آگئے جب وہ چاہے گا اُس کے ایک اشارے پر تم مر جاؤ گے اور پھر جس وقت بھی وہ چاہے گا اس کا ایک اشارہ تمہیں اُٹھا کھڑا کرے گا۔ اِس کام کا وقت جب آئے گا تو دنیا کو دوبارہ برپا کر دینا کوئی بڑا لمبا چوڑا کام نہ ہوگا۔ بس ایک ہی جھڑکی سوتوں کو جگا اُٹھانے کے لیے کافی ہوگی۔ "جھڑکی" کا لفظ یہاں بہت معنی خیز ہے۔ اِس سے بعث بعد الموت کا کچھ ایسا نقشہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک جو انسان مرے تھے وہ گویا سوتے پڑے تھے، یکایک کوئی ڈانٹ کر کہتا ہے "اُٹھ جاؤ" اور بس آن کی آن میں سب اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ (۸۷)

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ۔ (الغاشیہ: ۱۷ تا ۲۰)

"(یہ لوگ آخرت کو نہیں مانتے) تو کیا اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟"

یعنی اگر یہ لوگ آخرت کی یہ باتیں سُن کر کہتے ہیں کہ آخر یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا ہے تو کیا خود اپنے گردوپیش کی دُنیا پر نظر ڈال کر انہوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ اُونٹ کیسے بن گئے؟ یہ آسمان کیسے بلند ہو گیا؟ یہ پہاڑ کیسے قائم ہو گئے؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی؟ یہ ساری چیزیں اگر بن سکتی تھیں اور بنی ہوئی اِن کے سامنے موجود ہیں تو قیامت کیوں نہیں آسکتی؟ آخرت میں ایک دوسری دُنیا کیوں نہیں بن سکتی؟ دوزخ اور جنت کیوں نہیں ہو سکتیں؟ یہ تو ایک بے عقل اور بے فکر آدمی کا کام ہے کہ دُنیا میں آنکھیں کھولتے ہی جن چیزوں کو اُس نے موجود پایا ہے اُن کے متعلق تو وہ یہ سمجھ لے کہ اُن کا وجود میں آنا تو ممکن ہے کیونکہ وہ وجود میں آئی ہوئی ہیں، مگر جو چیزیں اُس کے مشاہدے اور تجربے میں ابھی نہیں آئی ہیں اُن کے بارے میں وہ بے تکلف یہ فیصلہ صادر کر دے کہ اُن کا ہونا ممکن نہیں ہے۔ اُس کے دماغ میں اگر عقل ہے تو اُسے سوچنا چاہیے کہ جو کچھ موجود ہے یہ آخر کیسے وجود میں آگیا؟ یہ اُونٹ ٹھیک اُن خصوصیات کے مطابق کیسے بن گئے جن خصوصیات کے جانوروں کی عرب کے صحرا میں رہنے والے انسانوں کو ضرورت تھی؟ یہ آسمان کیسے بن گیا جس کی فضا میں سانس لینے کے لیے ہوا بھری ہوئی ہے، جس کے بادل بارش لے کر آتے ہیں، جس کا سُورج دن کی روشنی اور گرمی فراہم کرتا ہے، جس کے چاند اور تارے رات کو چمکتے ہیں؟ یہ زمین کیسے بچھ گئی جس پر انسان رہتا بستا ہے، جس کی پیداوار سے اُس کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں، جس کے چشموں اور کنوؤں پر اس کی زندگی کا انحصار ہے؟ یہ پہاڑ زمین کی سطح پر کیسے اُبھر آئے جو رنگ برنگ کی مٹی اور پتھر اور طرح طرح کی معدنیات لیے ہوئے میخ کی طرح گڑے ہوئے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ کسی قادرِ مطلق، صانعِ حکیم کی

کاریگری کے بغیر ہو گیا ہے؟ کوئی سوچنے اور سمجھنے والا دماغ اِس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔ وہ اگر ضدّی اور ہٹ دھرم نہیں ہے تو اُسے ماننا پڑے گا کہ اِن میں سے ہر چیز ناممکن تھی اگر کسی زبردست قدرت اور حکمت والے نے اُسے ممکن نہ بنایا ہوتا۔ اور جب ایک قادر کی قدرت سے دُنیا کی اِن چیزوں کا بننا ممکن ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ جن چیزوں کے آئندہ وجود میں آنے کی خبر دی جا رہی ہے اُن کو بعید از امکان سمجھا جائے۔ (۸۸)

أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۔ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۔ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۔ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۔ (القیٰمۃ ۔ ۴۰)

"کیا انسان ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحمِ مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے۔ پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے؟"

یہ حیات بعد موت کے امکان کی ایک اور دلیل تھی جو کفّار کے سامنے پیش کی گئی۔ جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق تھا جو یہ مانتے تھے کہ ابتدائی نطفے سے تخلیق کا آغاز کر کے پورا انسان بنا دینے تک کا سارا فعل اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور حکمت کا کرشمہ ہے، ان کے لیے تو فی الحقیقت اِس دلیل کا کوئی جواب تھا ہی نہیں، کیونکہ وہ خواہ کتنی ہی ڈھٹائی برتتے، ان کی عقل یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی تھی کہ جو خدا اس طرح انسان کو دنیا میں پیدا کرتا ہے وہ دوبارہ بھی اسی انسان کو وجود میں لے آنے پر قادر ہے۔ لیکن جو دہریے اِس صریح حکیمانہ فعل کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے تھے، وہ زبان سے چاہے کتنی ہی ہٹ دھرمی کا اظہار کرتے، حقیقت میں اُن کے لیے اس بات کی کوئی توجیہ ممکن نہ تھی کہ آغازِ آفرینش سے آج تک دنیا کے ہر حصے اور ہر قوم میں کس طرح ایک ہی نوعیت کے تخلیقی فعل کے نتیجے میں لڑکوں اور لڑکیوں کی پیدائش مسلسل اِس تناسب سے ہوتی چلی جا رہی ہے کہ کہیں کسی زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی انسانی آبادی میں صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہی پیدا ہوتی چلی جائیں اور آئندہ اُس کی نسل چلنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ وہ خواہ کتنے ہی ڈھیٹ ہوتے، بہرحال ان کے لیے یہ دعویٰ کرنا ممکن نہ تھا کہ یہ بھی اتفاقاً ہی ہوتے چلا جا رہا ہے۔ اور جب ایک دفعہ ان کے دل یہ گواہی دے دیتے کہ یہ سب کچھ ایک صانع حکیم کی حکمت اور کاریگری کا کرشمہ ہے تو ان کے لیے یہ ماننے بغیر کوئی چارہ نہ تھا کہ وہی دانا کاریگر اپنی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا سکتا ہے۔ (۸۹)

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۔ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ۔ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۔ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۔ (الطارق ۔ ۵ تا ۸)

"پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اُچھلنے والے پانی سے

پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے یقیناً وہ (خالق) اُسے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے۔"

یعنی انسان ذرا اپنی ہستی ہی پر غور کرے کہ وہ کس طرح پیدا کیا گیا ہے۔ آخر وہ کون ہے جو ماں اور باپ کی بہت سی مواصلتوں میں سے کسی ایک کو استقرارِ حمل کا ذریعہ بنا دیتا ہے اور اسے ایک خاص انسان کی پیدائش کا سبب بناتا ہے؟[1] پھر کون ہے جو استقرارِ حمل کے بعد سے ماں کے پیٹ میں درجہ بدرجہ نشوونما دے کر اُسے اس حد کو پہنچاتا ہے کہ وہ ایک زندہ بچے کی شکل میں پیدا ہو؟ پھر کون ہے جو رحمِ مادری ہی میں اُس کے جسم کی ساخت اور اس کی جسمانی و ذہنی صلاحیتوں کا تناسب قائم کر دیتا ہے؟ پھر کون ہے جو پیدائش سے لے کر موت کے وقت تک اُس کی مسلسل نگہبانی کرتا رہتا ہے؟ اُسے بیماریوں سے بچاتا ہے۔ حادثات سے بچاتا ہے۔ طرح طرح کی آفات سے بچاتا ہے۔ اُس کے لیے زندگی کے اِتنے ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ اور اُس کے لیے ہر قدم پر دنیا میں باقی رہنے کے وہ مواقع فراہم کرتا ہے جن میں سے اکثر کا اُسے شعور تک نہیں ہوتا، کجا

---

[1] یہ مسئلہ اُس وقت کے عربوں کے لیے جتنا پیچیدہ تھا اُس سے بدرجہا زیادہ پیچیدہ جدید علمی تحقیقات کی بدولت آج اس زمانے کے لوگوں کے لیے ہو گیا ہے۔ اب جو انکشافات ہوتے ہیں اُن کی رُو سے مرد اور عورت کی ازدواجی زندگی کے دوران میں اربوں جرثومے (Sperm) مرد کے جسم سے خارج ہو کر عورت کے جسم میں داخل ہوتے ہیں، اور عورت کے اندر بھی بیسیوں تک ایسے بیضے (Ova) مسلسل پیدا ہوتے رہتے ہیں جن میں سے ہر بیضے میں مرد کے کسی ایک جرثومے کے ساتھ مل جانے سے استقرارِ حمل کی استعداد موجود ہوتی ہے۔ پھر یہ سب یکساں بھی نہیں ہیں بلکہ ہر جرثومہ اور ہر بیضہ بالکل جداگانہ خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، اور ان کے ہر جوڑے کی مواصلت سے ایک خاص قسم کا انسان پیدا ہو سکتا ہے جو لازماً کسی دوسرے جوڑے کی مواصلت سے پیدا ہونے والے انسان سے مختلف ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے والا آخر کون ہے کہ مرد کے بے شمار جرثوموں میں سے کس جرثومے کو عورت کے بہت سے بیضوں میں سے کس بیضے کے ساتھ ملا کر کس وقت کس قسم کا انسان پیدا کیا جائے؟ مرد اور عورت دونوں اس معاملے میں بالکل بے اختیار ہیں۔ کوئی حکیم یا ڈاکٹر بھی اس میں قطعاً دخل انداز نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ کسی جرثومے کا کسی بیضے کے ساتھ مل جانا محض ایک اتفاقی امر ہے کیونکہ اس حیرت انگیز تخلیقی عمل کے نتیجے میں [illegible] مختلف خاندانوں میں جس قسم کے انسان پیدا ہوتے ہیں وہ انسانی تاریخ کے کار ناموں میں بڑے فیصلہ کن اثر رکھتے ہیں، اور یہ اثر ایسی مدبرانہ حکمتوں کے ساتھ مرتب ہوتا ہے جن کی بدولت انسان کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوا کہ تاریخ کا کوئی فلسفہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر انسان کسی حکمت کے بغیر الل ٹپ پیدا ہوا کرتے تو ان کی تاریخ کے کسی فلسفے کا تصور ہرگز نہ کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ ماننے بغیر چارہ ہی نہیں ہے کہ اس اُچھلتے ہوئے پانی سے انسانوں کی تخلیق ایک خدائے حکیم و دانا ہی اپنے خاص منصوبے کے مطابق کر رہا ہے۔

(حاشیہ از مؤلف)

وہ انہیں خود فراہم کرنے پر قادر ہو گیا یہ سب کچھ ایک خدا کی تدبیر اور نگرانی کے بغیر ہو رہا ہے؟ اگر کوئی صاحب عقل آدمی اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا تو یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ جس طرح وہ انسان کو وجود میں لاتا ہے اور استقرار حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی نگہبانی کرتا ہے، یہی اِس بات کا کھلا ہُوا ثبوت ہے کہ وہ اُسے موت کے بعد پلٹا کر پھر وجود میں لا سکتا ہے۔ اگر وہ پہلی چیز پر قادر تھا اور اُسی قدرت کی بدولت انسان اِس وقت دُنیا میں زندہ موجود ہے، تو آخر کیا معقول دلیل یہ گمان کرنے کے لیے پیش کی جا سکتی ہے کہ دوسری چیز پر وہ قادر نہیں ہے۔ اِس قدرت کا انکار کرنے کے لیے آدمی کو سرے سے اِس بات ہی کا انکار کرنا ہوگا کہ خدا اُسے وجود میں لایا ہے، اور جو شخص اِس کا انکار کر سکتا ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ ایک روز اُس کے دماغ کی خرابی اُس سے یہ دعویٰ بھی کرا دے کہ دُنیا کی تمام کتابیں ایک حادثہ کے طور پر چھپ گئی ہیں، دنیا کے تمام شہر ایک حادثہ کے طور پر بن گئے ہیں، اور زمین پر کوئی اتفاقی حادثہ ایسا ہو گیا تھا جس سے تمام کارخانے بن کر خود بخود چلنے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اور اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے اندر کام کرنے والی قوتوں اور صلاحیتوں کا پیدا ہونا اور اس کا ایک زندہ ہستی کی حیثیت سے باقی رہنا اُن تمام کاموں سے بدرجہا زیادہ پیچیدہ عمل ہے جو انسان کے ہاتھوں دنیا میں ہوتے اور ہو رہے ہیں۔ اتنا بڑا پیچیدہ عمل اِس حکمت اور تناسب اور تنظیم کے ساتھ اگر اتفاقی حادثہ کے طور پر ہزار ہا لاکھوں برس تک ایک تسلسل کے ساتھ ہو سکتا ہو تو پھر کونسی چیز ہے جسے ایک دماغی مریض حادثہ نہ کہہ سکے؟ (۹۰)

بَلْ عَجِبُوٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِیْظٌ ۔ (قٓ: ۲تا۴)

"بلکہ ان لوگوں کو تعجب اِس بات پر ہُوا کہ ایک خبردار کرنے والا خود انہی میں سے اِن کے پاس آ گیا۔ پھر منکرین کہنے لگے "یہ تو عجیب بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے (تو دوبارہ اُٹھائے جائیں گے؟) یہ واپسی تو عقل سے بعید ہے"۔ (حالانکہ) زمین ان کے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے، اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے"۔

اُن لوگوں کو پہلا تعجب تو اس بات پر تھا کہ اُنہی کی جنس اور قوم کے ایک فرد نے اُٹھ کر دعویٰ کیا تھا کہ مَیں خدا کی طرف سے تمہیں خبردار کرنے کے لیے آیا ہُوں۔ اس کے بعد مزید تعجب اُنہیں اِس پر ہُوا کہ وہ شخص انہیں جس چیز سے خبردار کر رہا تھا وہ یہ تھی کہ تمام انسان مرنے کے بعد از سرِ نَو زندہ کیے جائیں گے، اور ان

سب کو اکٹھا کر کے اللہ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا، اور وہاں ان کے اعمال کا محاسبہ کرنے کے بعد جزا اور سزا دی جائے گی۔ اِس پر فرمایا گیا کہ یہ بات اگر ان لوگوں کی عقل میں نہیں سماتی تو یہ اِن کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے۔ اِس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ اللہ کا علم اور اس کی قدرت بھی تنگ ہو جائے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے قیامت تک مرنے والے بے شمار انسانوں کے اجزائے جسم جو زمین میں بکھر چکے ہیں اور آئندہ بکھرتے چلے جائیں گے اُن کو جمع کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن میں سے ہر ہر جُز جس شکل میں جہاں بھی ہے، اللہ تعالیٰ براہِ راست اُس کو جانتا ہے اور مزید برآں اُس کا پورا ریکارڈ اللہ کے دفتر میں محفوظ کیا جا رہا ہے جس سے کوئی ایک ذرہ بھی چھُوٹا ہُوا نہیں ہے۔ جس وقت اللہ کا حکم ہو گا اُسی وقت آناً فاناً اُس کے فرشتے اس ریکارڈ سے رجوع کر کے ایک ایک ذرے کو نکال لائیں گے اور تمام انسانوں کے وہی جسم پھر بنا دیں گے جن میں رہ کر اُنہوں نے دُنیا کی زندگی میں کام کیا تھا۔

یہ آیت بھی منجملہ اُن آیات کے ہے جن میں اِس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ آخرت کی زندگی نہ صرف یہ کہ ویسی ہی جسمانی زندگی ہوگی جیسی اِس دنیا میں ہے، بلکہ جسم بھی ہر شخص کا وہی ہوگی جو اِس دُنیا میں تھا۔ اگر حقیقت یہ نہ ہوتی تو کفار کی بات کے جواب میں یہ کہنا بالکل بے معنی تھا کہ زمین تمہارے جسم میں سے جو کچھ کھاتی ہے وہ سب ہمارے علم میں ہے اور ذرے ذرے کا ریکارڈ موجود ہے۔ (۹۱)

أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ ۚ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ۔ (قٓ۔ ۱۵)

"تو کیا پہلی بار کی تخلیق سے ہم عاجز تھے؟ مگر ایک نئی تخلیق کی طرف سے یہ لوگ شک میں پڑے ہوئے ہیں۔"

چند مختصر الفاظ میں یہ ایسی صاف اور سیدھی بات منکرینِ آخرت کے مقابلے میں پیش کی گئی تھی جو ہر معقول آدمی کے دماغ میں پیوست ہو گئی ہو گی۔ کوئی شخص اگر خدا کا منکر نہ ہو اور جہالت کی اس حد تک نہ پہنچ گیا ہو کہ اِس منظم کائنات اور اِس کے اندر انسان کی پیدائش کو محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے لگے، اس کے لیے یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ خدا ہی نے ہمیں اور اِس پوری کائنات کو بنایا ہے۔ اب یہ امرِ واقعہ کہ ہم اِس دنیا میں موجود ہیں اور زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے، آپ ہی اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ خدا ہمیں اور اِس کائنات کو پیدا کرنے سے عاجز نہ تھا۔ اِس کے بعد اگر کوئی کہتا ہے کہ قیامت برپا کرنے کے بعد وہی خدا ایک دوسرا نظامِ عالم نہ بنا سکے گا، اور موت کے بعد وہ ہمیں پھر پیدا نہ کر سکے گا، تو وہ محض ایک خلافِ عقل بات کہتا ہے۔ خدا عاجز ہوتا تو پہلے ہی پیدا نہ کر سکتا۔ جب وہ پہلے پیدا کر چکا ہے اور اُسی تخلیق کی بدولت ہم خود وجود میں آئے بیٹھے ہیں، تو یہ فرض کر لینے کے لیے آخر کیا معقول بنیاد ہو سکتی ہے

کہ اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو توڑ کر پھر بنا دینے سے وہ عاجز ہو جائے گا۔ (۹۲)

آخرت کے وجوب کے دلائل

قرآن میں صرف اِس پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ ناقابلِ انکار دلائل سے آخرت کا ممکن ہونا ثابت کر دیا گیا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی ثابت کیا گیا کہ اُس کا برپا ہونا ضروری ہے۔ عقل چاہتی ہے، انصاف چاہتا ہے، اخلاق کے تقاضے چاہتے ہیں کہ آخرت ہو اور اُس میں انسان کے تمام اُن اعمال کا محاسبہ کیا جائے جو اُس نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے مرتے دم تک کیے، اور اپنے پیچھے اپنے اُن اعمال کے ایسے اچھے یا بُرے اثرات چھوڑ گیا جو بعد میں مدتہائے دراز تک آنے والی نسلوں کو متاثر کرتے رہے۔ یہ محاسبہ نہ ہو، اور اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا نہ ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی یہ دنیا انصاف سے خالی ہے، اور انسان کو یہاں عقل و شعور دے کر، اخلاق کے خیر و شر کی تمیز دے کر، اور بے شمار اشیاء اور دوسرے انسانوں پر اختیارات دے کر فضول اور بے معنی ہی پیدا کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک دنیا کی موجودہ زندگی کا تعلق ہے، اِس میں نہ پورا محاسبہ ممکن ہے، نہ پورا انصاف، اور نہ پوری جزا و سزا۔ اِس لیے لازماً ایک دوسرا عالم برپا ہونا چاہیے جس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک وجود میں آنے والے تمام انسانوں کو بیک وقت جمع کیا جائے، تمام کھلے اور چھپے اعمال کا اور اُن سے پیدا ہونے والے نتائج کا محاسبہ کر کے ایک ایک شخص کی ذمہ داری متعین کی جائے، اور اُس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ ابدی ہو تاکہ جو شخص جتنی سزا کا مستحق ہے وہ پوری بھگت سکے اور جتنے انعام و اکرام کا مستحق ہے وہ اسے پورا دیا جا سکے۔

اس مضمون کو قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا تاکہ کفار کے پاس انکارِ آخرت کے لیے کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ (۹۳)

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ۔ (القیامۃ: ۳۶)

"کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟"

عربی زبان میں اِبلِ سُدًی اُس اُونٹ کو کہتے ہیں جو یونہی چھوٹا پھر رہا ہو۔ جدھر چاہے چرتا پھرے۔ کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔ اِسی معنی میں ہم شتر بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شتر بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اُسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہو؟ کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو؟ کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو؟ اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اُس کے اعمال کی باز پرس کی جائے؟ یہی بات ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید میں اس طرح بیان کی گئی کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کفار سے فرمائے گا۔ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ "کیا تم نے

یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر آنا نہیں ہے؟" (المؤمنون: ۱۱۵)
ان دونوں مقامات پر زندگی بعدِ موت کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے؟ کیا تمہیں اپنے اور جانوروں میں یہ کھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے، اور تم با اختیار؟ اُس کے افعال میں اخلاقی حُسن و قبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمہارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے؟ پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہیں اُسی طرح تم بھی ہو؟ جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اُٹھائے جانے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے کہ اُس نے صرف اپنی جبلّت کے لگے بندھے تقاضے پورے کیے ہیں، اپنی عقل سے کام لے کر کوئی فلسفہ تصنیف نہیں کیا، کوئی مذہب ایجاد نہیں کیا، کسی کو معبود نہیں بنایا، نہ خود کسی کا معبود بنا، کوئی کام ایسا نہیں کیا جسے نیک یا بد کہا جا سکتا ہو، کوئی اچھی یا بُری سُنّت جاری نہیں کی جس کے اثرات نسل در نسل چلتے رہیں اور وہ اُن پر کسی اجر یا سزا کا مستحق ہو۔ لہٰذا وہ اگر مر کر فنا ہو جائے تو یہ سمجھ میں آنے کے قابل بات ہے، کیونکہ اُس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد ہی نہیں ہوتی جس کی باز پُرس کے لیے اُسے دوبارہ زندہ کر کے اُٹھانے کی کوئی حاجت ہو۔ لیکن تم حیات بعدِ موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو جبکہ عین اپنی موت کے وقت تک تم ایسے اخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزاء و سزا کے مستوجب ہونے کا تمہاری عقل خود حکم لگاتی ہے؟ جس آدمی نے کسی بے گناہ کو قتل کیا اور فوراً ہی کسی حادثے کا شکار ہو گیا، کیا تمہارے نزدیک اس کو بالکل (Scot free) چھوٹ جانا چاہیے اور اس ظلم کا بدلہ اُسے کبھی نہ ملنا چاہیے؟ جو آدمی دُنیا میں کسی ایسے فساد کا بیج بو گیا جس کا خمیازہ اُس کے بعد صدیوں تک انسانی نسلیں بھگتتی رہیں، کیا تمہاری عقل واقعی اِس بات پر مطمئن ہے کہ اُسے بھی کسی جھینگے یا ٹڈے کی طرح مر کر فنا ہو جانا چاہیے اور کبھی اُٹھ کر اپنے اُن کرتوتوں کی جواب دہی نہیں کرنی چاہیے جن کی بدولت ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں خراب ہوئیں؟ جس آدمی نے عمر بھر حق و انصاف اور خیر و صلاح کے لیے اپنی جان لڑائی اور جیتے جی مصیبتیں ہی بھگتتا رہا، کیا تمہارے خیال میں وہ بھی حشرات الارض ہی کی قسم کی کوئی مخلوق ہے جسے اپنے اِس عمل کی جزا پانے کا کوئی حق نہیں ہے؟ (۳۴۳)

لَآ أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ۔ (القیامۃ: ۱-۲)

"نہیں، میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے روز کی، اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔"

یعنی تمہارا خیال غلط ہے کہ قیامت نہیں آئے گی۔ میں قسم کھاتا ہوں قیامت کی اور ملامت کرنے والے نفس کی کہ وہ ضرور آئے گی۔

اِس مقام پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم جس بات پر کھائی تھی اُسے بیان نہیں کیا، کیونکہ بعد کا فقرہ خود اُس پر دلالت کر رہا تھا۔ قسم اِس بات پر کھائی گئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا اور وہ ایسا کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ اِس بات پر اِن دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی؟ یہ مناسبت سوچنے سمجھنے والے انسان کے لیے اُس وقت جتنی واضح تھی اس سے زیادہ آج واضح ہے۔

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اُس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ اُس کا آنا یقینی ہے۔ پوری کائنات کا نظام اِس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ازلی ہے نہ ابدی۔ اس کی نوعیت ہی خود یہ بتا رہی ہے کہ یہ نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ انسان کی عقل پہلے بھی اِس گمان کے لیے کوئی مضبوط دلیل نہ پاتی تھی کہ یہ ہر آن بدلنے والی دنیا کبھی قدیم اور غیر فانی بھی ہو سکتی ہے لیکن جتنا جتنا اِس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اُتنا ہی زیادہ یہ امر خود انسان کے نزدیک بھی یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اِس ہنگامۂ ہست و بود کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا، اور لازماً اس کی ایک انتہا بھی ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اِس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت ہی کی قسم کھائی ہے، اور یہ ایسی ہی قسم ہے جیسے ہم کسی شکی انسان کو، جو اپنے موجود ہونے ہی میں شک کر رہا ہو، خطاب کر کے کہیں کہ تمہاری جان کی قسم تم موجود ہو، یعنی تمہارا وجود خود تمہارے موجود ہونے پر شاہد ہے۔

لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اُس کے بعد پھر انسان دوبارہ اُٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا اور وہ اپنے کیے کا اچھا یا بُرا نتیجہ دیکھے گا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفسِ لوّامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں ایسا موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اِس ضمیر میں لازماً بھلائی اور بُرائی کا ایک احساس پایا جاتا ہے، اور چاہے انسان کتنا ہی بگڑا ہوا ہو، اُس کا ضمیر اُسے کوئی بُرائی کرنے اور کوئی بھلائی نہ کرنے پر ضرور ٹوکتا ہے، قطعِ نظر اِس سے کہ اُس نے بھلائی اور بُرائی کا جو معیار بھی قرار دے رکھا ہو وہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ یہ اِس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان نرا حیوان نہیں ہے بلکہ ایک اخلاقی وجود ہے، اُس کے اندر فطری طور پر بھلائی اور بُرائی کی تمیز پائی جاتی ہے، وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے، اور جس بُرائی کا ارتکاب اُس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو اُس پر اگر وہ اپنے ضمیر کی ملامتوں کو دبا کر خوش بھی ہو لے، تو اِس کے برعکس صورت میں، جبکہ اُسی بُرائی کا ارتکاب کسی دوسرے نے اُس کے ساتھ کیا ہو، اُس کا دل اندر سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ اِس زیادتی کا مرتکب ضرور سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔ اب اگر انسان کے وجود میں

اس طرح کے نفسِ لوّامہ کی موجودگی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ یہی نفسِ لوّامہ زندگی بعد موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضا کہ اپنے جن اچھے اور بُرے اعمال کا انسان ذمہ دار ہے اُن کی جزا یا سزا اُس کو ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعد موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پُورا نہیں ہو سکتا۔ کوئی صاحبِ عقل آدمی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرنے کے بعد اگر آدمی معدوم ہو جائے تو اُس کی بہت سی بھلائیاں ایسی ہیں جن کے اجر سے وہ لازماً محروم ہو کر رہ جائے گا، اور اُس کی بہت سی بُرائیاں ایسی ہیں جن کی منصفانہ سزا پانے سے وہ ضرور بچ نکلے گا۔ اس لیے جب تک آدمی اس بیہودہ بات کا قائل نہ ہو کہ عقل رکھنے والا انسان ایک غیر معقول نظامِ کائنات میں پیدا ہو گیا ہے، اور اخلاقی احساسات رکھنے والا انسان ایک ایسی دنیا میں جنم لے بیٹھا ہے جو بنیادی طور پر اپنے پُورے نظام میں اخلاق کا کوئی وجود ہی نہیں رکھتی، اُس وقت تک وہ حیات بعد موت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تناسخ یا آواگون کا فلسفہ بھی فطرت کے اس مطالبے کا جواب نہیں ہے۔ کیونکہ اگر انسان اپنے اخلاقی اعمال کی سزا یا جزا پانے کے لیے پھر اسی دُنیا میں جنم لیتا چلا جائے تو ہر جنم میں وہ پھر کچھ مزید اخلاقی اعمال کرتا چلا جائیگا جو نئے سرے سے جزا و سزا کے متقاضی ہوں گے اور اس لامتناہی سلسلے میں بجائے اس کے کہ اُس کا حساب کبھی چُک سکے، اُلٹا اُس کا حساب بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اس لیے فطرت کا یہ تقاضا صرف اسی صورت میں پُورا ہوتا ہے کہ اس دُنیا میں انسان کی صرت ایک ہی زندگی ہو، اور پھر پوری نوعِ انسانی کا خاتمہ ہو جانے کے بعد ایک دوسری زندگی ہو جس میں انسان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک حساب کر کے اسے پُوری جزا اور سزا دے دی جائے۔ (۹۰)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۞ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۫ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۔ (صٓ۔ ۲۷، ۲۸)

"ہم نے اس آسمان اور زمین کو، اور اس دنیا کو جو اُن کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں کر دیا ہے۔ یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کے لیے بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں، یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں؟"

یعنی اس کائنات کو ہم نے محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے کہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی غرض اور مقصد نہ ہو، کوئی عدل اور انصاف نہ ہو، اور کسی اچھے یا بُرے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ انسان

دنیا اُن شُترِ بے مہار کی طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے اور یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے کہ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے اور اُس پر کوئی باز پرس نہ ہو۔ جو شخص جزا و سزا کا قائل نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ نیک و بد سب آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں گے، کسی سے کوئی محاسبہ نہ ہوگا، نہ کسی کو بھلائی یا بُرائی کا کوئی بدلہ ملے گا، وہ دراصل دُنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھ رہا ہے اور اُس کا خیال یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے دنیا بنا کر اور اس میں انسان کو پیدا کر کے ایک فعلِ عبث کا ارتکاب کیا ہے۔ مگر کیا فی الحقیقت تمہارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخر کار یکساں ہو جائیں؟ کیا یہ تصور تمہارے لیے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اُس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بد آدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی محاسبہ نہ ہو اور انسانی افعال کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو اس سے اللہ کی حکمت اور اُس کے عدل دونوں کی نفی ہو جاتی ہے اور کائنات کا پورا نظام ایک اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ اِس مفروضے پر تو دُنیا میں بھلائی کے لیے کوئی محرک اور بُرائی سے روکنے کے لیے کوئی مانع سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ خدا کی خدائی اگر معاذ اللہ ایسی ہی اندھیر نگری ہو تو پھر وہ شخص بے وقوف ہے جو اس زمین پر تکلیفیں اٹھا کر خود صالح زندگی بسر کرتا ہے اور خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے، اور وہ شخص عقل مند ہے جو سازگار مواقع پا کر ہر طرح کی زیادتیوں سے فائدے سمیٹتا اور ہر قسم کے فسق و فجور سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ (۹۶)

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۔ (التغابن - ۷)

”منکرین نے بڑے دعوے سے کہا کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز دوبارہ نہ اُٹھائے جائیں گے۔ ان سے کہو ”نہیں، میرے رب کی قسم تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، پھر ضرور تمہیں بتایا جائے گا کہ تم نے (دُنیا میں) کیا کچھ کیا ہے، اور ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔“

اگرچہ کسی منکرِ آخرت کے پاس نہ پہلے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ تھا، نہ آج ہے، نہ کبھی ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے، لیکن ان لوگوں نے ہمیشہ بڑے زور کے ساتھ یہی دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ قطعیت کے ساتھ آخرت کا انکار کر دینے کے لیے نہ کوئی عقلی بنیاد موجود ہے نہ علمی بنیاد۔

ان کی اِس بات کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ؐ سے فرمایا کہ تم ہماری قسم کھا کر کہو کہ تم لوگ ضرور اُٹھائے جاؤ گے اور ضرور تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ تم دنیا میں کیا کر کے آئے ہو۔ قرآن مجید میں یہ تیسرا مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ؐ سے فرمایا ہے کہ اپنے رب کی قسم کھا کر لوگوں سے کہو کہ ضرور ایسا ہو کر رہے گا۔ پہلے سورۂ یونس میں فرمایا: ”وہ پوچھتے ہیں کیا واقعی یہ حق ہے؟ کہو میرے رب کی قسم یہ یقیناً حق ہے اور تم

امکان ہوتا نہیں رکھتے کہ اُسے ظہور میں آنے سے روک دو" (آیت ۵۳)۔ پھر سُورۂ سبا میں فرمایا "منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آرہی ہے! کہو، قسم ہے میرے رب کی وہ تم پر آکر رہے گی" (آیت ۳)۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک منکرِ آخرت کے لیے آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ آپ اُسے آخرت کے آنے کی خبر قسم کھا کر دیں یا قسم کھائے بغیر دیں؟ وہ جب اس چیز کو نہیں مانتا تو محض اس بنا پر کیسے مان لے گا کہ آپ قسم کھا کر اُس سے یہ بات کہہ رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب وہ لوگ تھے جو اپنے ذاتی علم اور تجربے کی بنا پر یہ بات خوب جانتے تھے کہ آپ کی زبان سے عمر بھر کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں نکلی ہے، اس لیے چاہے زبان سے وہ آپ کے خلاف کیسے ہی بہتان گھڑتے رہے ہوں، اپنے دلوں میں وہ یہ تصوّر تک نہ کر سکتے تھے کہ ایسا سچّا انسان کبھی خدا کی قسم کھا کر وہ بات کہہ سکتا ہے جس کے برحق ہونے کا اُسے یقینِ کامل نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ آپ محض آخرت کا عقیدہ ہی بیان نہیں کر رہے تھے بلکہ اُس کے لیے نہایت معقول دلائل بھی پیش فرما رہے تھے۔ مگر جو چیز نبی اور غیر نبی کے درمیان فرق کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک غیر نبی آخرت کے حق میں جو مضبوط سے مضبوط دلائل دے سکتا ہے اُن کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس یہی ہو سکتا ہے کہ آخرت کے نہ ہونے کی بہ نسبت اس کا ہونا معقول تر اور اَغلب (Most Probable) تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے برعکس نبی کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالاتر ہے۔ اُس کی اصل حیثیت یہ نہیں ہے کہ عقلی استدلال سے وہ اس نتیجے پر پہنچا ہو کہ آخرت ہونی چاہیے۔ بلکہ اس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اس بات کا علم رکھتا ہے کہ آخرت ہوگی اور یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ وہ ضرور ہو کر رہے گی۔ اس لیے ایک نبی ہی قسم کھا کر یہ بات کہہ سکتا ہے۔ ایک فلسفی اپنے کسی قول پر بھی قسم نہیں کھا سکتا۔ اور آخرت پر ایمان ایک نبی کے بیان ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ فلسفی کا استدلال اپنے اندر یہ قوت نہیں رکھتا کہ دوسرا شخص تو درکنار فلسفی خود بھی اپنی دلیل کی بنا پر اُسے اپنا ایمانی عقیدہ بنا سکے۔ فلسفی اگر واقعی صحیح الفکر فلسفی ہو تو وہ "ہونا چاہیے" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ "ہے اور یقیناً ہے" کہنا صرف ایک نبی کا کام ہے۔

پھر قسم کھا کر صرف یہی نہیں کہا گیا کہ مرنے کے بعد تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے، بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ اُس وقت ضرور تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ دنیا میں تم کیا کر کے آئے ہو۔ یہی وہ اصل مقصد ہے جس کے لیے بنی آدم کو مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھایا جائے گا، اور اسی میں اس سوال کا جواب بھی آگیا کہ ایسا کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے۔ اس برحق کائنات میں جس مخلوق کو کفر و ایمان میں سے کسی ایک راہ کے اختیار کرنے کی آزادی دی گئی ہو، اور جسے اس دنیا میں بہت سی چیزوں پر تصرّف کا اقتدار بھی عطا کیا گیا ہو، اور جس نے کفر یا ایمان کی راہ اختیار کر کے عمر بھر اپنے اس اقتدار کو صحیح یا غلط طریقے سے استعمال کر کے بہت سی بھلائیاں یا بہت سی بُرائیاں خود

اپنی ذمہ داری برپا کی ہوں، اُس کے بارے میں یہ تصوّر کرنا انتہائی غیر معقول ہے کہ یہ سب کچھ جب وہ کر چکے تو آخر کار بھلے کی بھلائی اور بُرے کی بُرائی، دونوں بے نتیجہ رہیں اور سرے سے کوئی وقت ایسا آئے ہی نہیں جب اِس مخلوق کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو۔ جو شخص ایسی غیر معقول بات کہتا ہے وہ لامحالہ دو حماقتوں میں سے ایک حماقت کا ارتکاب کرتا ہے۔ یا تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات ہے تو مبنی بر حکمت، مگر یہاں انسان جیسی با اختیار مخلوق کو غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ یا پھر وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی کائنات ہے جسے بنانے میں سرے سے کسی حکیم کی حکمت کار فرما نہیں ہے۔ پہلی صورت میں وہ ایک متناقض بات کہتا ہے کیونکہ مبنی بر حکمت کائنات میں ایک با اختیار مخلوق کا غیر ذمہ دار ہونا صریحًا خلافِ عدل و حکمت ہے۔ اور دوسری صورت میں وہ اِس بات کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایک اَلل ٹپ بنی ہوئی بے حکمت کائنات میں انسان جیسی ذی عقل مخلوق کا وجود میں آنا آخر کیسے ممکن ہُوا؟ اور اُس کے ذہن میں عدل و انصاف کا تصور کہاں سے آ گیا؟ بے عقل سے عقل کی پیدائش اور بے عدلی سے عدل کا تصوّر برآمد ہو جانا ایک ایسی بات ہے جس کا قائل یا تو ایک ہٹ دھرم آدمی ہو سکتا ہے یا پھر وہ جو بہت زیادہ فلسفہ بگھارنے کے بگھارتے دماغی مریض ہو چکا ہو۔

پھر یہ فرمایا کہ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ آخرت کی دوسری دلیل ہے۔ پہلی دلیل آخرت کے ضروری ہونے کی تھی اور یہ دلیل اس کے ممکن ہونے کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خدا کے لیے کائنات کا اتنا بڑا نظام بنا دینا دُشوار نہ تھا اور جس کے لیے اِس دُنیا میں انسانوں کو پیدا کرنا دُشوار نہیں ہے، اس کے لیے یہ بات آخر کیوں دُشوار ہو گی کہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر کے اپنے سامنے حاضر کرے اور اُن کا حساب لے؟ (٩٧)

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِينَ ۝ فَأْتُوا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ أَهْلَكْنَاهُمْ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ۝ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ ۝ مَا خَلَقْنَاهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيقَاتُهُمْ أَجْمَعِينَ ۔

(الدُّخان ۳۴ تا ۴۰)

"یہ لوگ کہتے ہیں "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں، اس کے بعد ہم دوبارہ اٹھائے جانے والے نہیں، اگر تم سچے ہو تو اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو" یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے اُن کو اِس بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔ یہ آسمان و زمین اور اُن کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ اِن کو ہم نے برحق پیدا

کیا ہے۔ مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اِن سب کے اُٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا
دن ہے۔"

کفّار کا کہنا یہ تھا کہ پہلی دفعہ جب ہم مریں گے تو بس فنا ہو جائیں گے۔ اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔ "پہلی موت"
کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے ہاں پہلا بچہ
پیدا ہُوا تو اِس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اِس کے بعد لازماً دوسرا بچہ ہو، بلکہ صرف یہ کافی
ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بچّہ نہ ہُوا ہو۔ اِس لیے کفّار "پہلی موت" کا لفظ اس معنی میں استعمال نہیں کرتے
تھے کہ اس کے بعد کوئی زندگی اور پھر کوئی دوسری موت ہو۔ بلکہ وہ پہلی موت کو جو اس دنیا میں آتی ہے ایک ہی
اور آخری موت سمجھتے تھے۔ اُن کا استدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اُٹھتے نہیں دیکھا
ہے، اِس لیے ہم یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی۔ تم لوگ اگر دعویٰ کرتے ہو کہ
دوسری زندگی ہوگی تو ہمارے آباء و اجداد کو قبروں سے اٹھا لاؤ تاکہ ہمیں زندگی بعدِ موت کا یقین آ جائے۔ یہ کام تم نے
نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمہارا دعویٰ بے بنیاد ہے۔" یہ گویا اُن کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل
تھی۔ حالانکہ سراسر مہمل تھی۔ آخر اُن سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو کر اسی دُنیا میں واپس آئیں گے؟
اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی مسلمان نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ ہم مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں؟

اُن کے اعتراض کا پہلا جواب یہ دیا گیا کہ یہ لوگ تُبّع[1] اور اس سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں سے کچھ بہتر تو
نہیں ہیں۔ اُن کو ہم نے اُن کے جرائم ہی کی وجہ سے تو ہلاک کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اِس جواب کا مطلب
یہ تھا کہ انکارِ آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص، گروہ یا قوم کو مجرم بنائے بغیر نہیں رہتی۔ اخلاق کی خرابی اُس کا لازمی
نتیجہ ہے اور تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اِس نظریے کو جس قوم نے بھی اختیار کیا وہ آخرکار تباہ ہو کر رہی۔
کفّارِ مکّہ تو اُس خوشحالی اور شوکت و حشمت کو پہنچ بھی نہیں سکے ہیں جو تُبّع کی قوم، اور اُس سے پہلے سبا اور قومِ
فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے۔ مگر یہ مادّی خوشحالی اور دنیوی شان و شوکت اخلاقی زوال کے نتائج
سے اُن کو کب بچا سکی تھی کہ یہ اپنی ذرا سی پُونجی اور اپنے ذرائع و وسائل کے بل بوتے پر اُن سے بچ جائیں گے۔

اُن کے اعتراض کا دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہے
وہ دراصل اِس کارخانۂ عالم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے۔ اِسی بنا پر اُس نے یہ رائے قائم کی ہے

---

[1] تُبّع قبیلہ حِمیَر کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ ۱۱۵ قبل مسیح میں اُن کو یمن پر اقتدار حاصل ہُوا اور ۳۰۰ء تک
یہ وہاں حکمران رہے۔ (تفہیم القرآن، جلد چہارم، الدخان، حاشیہ ۳۲)

کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کرکے ایک روز بس یونہی مٹی میں رَل مِل جائے گا اور اُس کے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالقِ حکیم کی بنائی ہوئی ہے، اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ فعلِ عَبَث کا ارتکاب کرے گا۔ انکارِ آخرت کے جواب میں یہ استدلال قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔

رہا اُن کا یہ مطالبہ کہ "اُٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو" اس کا جواب یہ دیا گیا کہ زندگی بعدِ موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مُردہ قبرستان سے اُٹھا کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اس کے لیے تو رب العالمین نے ایک وقت مقرر کردیا ہے جب تمام اوّلین و آخرین کو وہ بیک وقت زندہ کرکے اپنی عدالت میں جمع کرے گا اور ان کے مقدمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام بہرحال اپنے وقتِ مقرر ہی پر ہوگا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کیونکہ اس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اُس عدالت سے کامیاب نکلنے کی تیاری کرسکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری عمر اس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ بُرائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے بس اسی دُنیا کی زندگی تک ہے، مرنے کے بعد پھر کوئی عدالت نہیں ہوتی ہے جس میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی مستقل نتیجہ نکلتا ہو۔ (۹۸)

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (الجاثیہ: ۲۱-۲۲)

"کیا وہ لوگ جنہوں نے بُرائیوں کا ارتکاب کیا ہے یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم انہیں اور ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو ایک جیسا کردیں گے کہ اُن کا جینا اور مرنا یکساں ہو جائے؟ بہت بُرے حکم ہیں جو یہ لوگ لگاتے ہیں۔ اللہ نے تو آسمان اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ ہر متنفّس کو اُس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے۔ لوگوں پر ظلم ہرگز نہ کیا جائے گا۔"

یہ آخرت کے برحق ہونے پر اخلاقی استدلال ہے۔ اخلاق میں خیر و شر اور اعمال میں نیکی و بدی کے فرق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اچھے اور بُرے لوگوں کا انجام یکساں نہ ہو، بلکہ اچھوں کو ان کی اچھائی کا اچھا بدلہ ملے اور بُرے اپنی بُرائی کا بُرا بدلہ پائیں۔ یہ بات اگر نہ ہو، اور نیکی و بدی کا نتیجہ ایک ہی جیسا ہو تو سرے سے اخلاق میں خوبی و زشتی کی تمیز ہی بے معنی ہو جاتی ہے اور خدا پر بے انصافی کا الزام عائد ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں بدی کی راہ پر چلتے ہیں وہ تو ضرور یہ چاہتے ہیں کہ کوئی جزا و سزا نہ ہو، کیونکہ یہ تصور ہی اُن کے عیش کو مُنغّص کردینے والا ہے لیکن خداوندِ عالم کی حکمت اور اس کے عدل سے یہ بات بالکل بعید ہے کہ وہ نیک و بد سے ایک جیسا

معاملہ کرے اور کچھ نہ دیکھے کہ مومن صالح نے دنیا میں کس طرح زندگی بسر کی ہے اور کافر و فاسق یہاں کیا گل کھلاتا رہا ہے۔ ایک شخص عمر بھر اپنے اوپر اخلاق کی پابندیاں لگاتے رہا، حق والوں کے حق ادا کرتا رہا، ناجائز فائدوں اور لذتوں سے اپنے آپ کو محروم کیے رہا۔ اور حق و صداقت کی خاطر طرح طرح کے نقصانات برداشت کرتا رہا۔ دوسرے شخص نے اپنی خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کیں۔ نہ خدا کا حق پہچانا اور نہ بندوں کے حقوق پر دست درازی کرنے سے باز آیا، جس طرح سے بھی اپنے لیے فائدے اور لذتیں سمیٹ سکتا تھا، سمیٹتا چلا گیا۔ کیا خدا سے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ ان دونوں قسم کے آدمیوں کی زندگی کے اس فرق کو وہ نظر انداز کر دے گا؟ مرتے دم تک جن کا جینا یکساں نہیں رہا ہے، موت کے بعد اگر ان کا انجام یکساں ہو تو خدا کی خدائی میں اس سے بڑھ کر اور کیا بے انصافی ہو سکتی ہے؟

پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی تخلیق کھیل کے طور پر نہیں کی ہے بلکہ یہ ایک بامقصد حکیمانہ نظام ہے۔ اس نظام میں یہ بات بالکل ناقابلِ تصور ہے کہ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات اور ذرائع و وسائل کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے جن لوگوں نے اچھا کارنامہ انجام دیا ہو، اور انہیں غلط طریقے سے استعمال کر کے جن دوسرے لوگوں نے ظلم و فساد برپا کیا ہو، یہ دونوں قسم کے انسان آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں اور اس موت کے بعد کوئی دوسری زندگی نہ ہو جس میں انصاف کے مطابق ان کے اچھے اور بُرے اعمال کا کوئی اچھا یا بُرا نتیجہ نکلے۔ اگر ایسا ہو تو یہ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھلونا ہو گی نہ کہ ایک حکیم کا بنایا ہوا بامقصد نظام۔ (۹۹)

سورۂ جاثیہ میں آیات ۱۲ تا ۲۳ کا سارا مضمون اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ آخرت کا انکار در اصل وہی لوگ کرتے ہیں جو خواہشاتِ نفس کی بندگی کرنا چاہتے ہیں اور عقیدۂ آخرت کو اپنی اس آزادی میں مانع سمجھتے ہیں۔ پھر جب وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں تو ان کی بندگیٔ نفس اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ اپنی گمراہی میں روز بروز زیادہ ہی بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی بُرائی ایسی نہیں ہوتی جس کے ارتکاب سے وہ باز رہ جائیں۔ کسی کا حق مارنے میں انہیں تامل نہیں ہوتا۔ کسی ظلم اور زیادتی کا موقع پا جانے کے بعد ان سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس سے صرف اس لیے رک جائیں گے کہ حق و انصاف کا کوئی احترام اُن کے دلوں میں ہے۔ جن واقعات کو دیکھ کر کوئی انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے، وہی ان کی آنکھوں کے سامنے بھی آتے ہیں، مگر وہ ان سے اُلٹا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں ٹھیک کر رہے ہیں اور ہمیں یہی کچھ کرنا چاہیے۔ کوئی کلمۂ نصیحت اُن پر کارگر نہیں ہوتا۔ جو دلیل بھی کسی انسان کو بُرائی سے روکنے کے لیے مفید ہو سکتی ہے، وہ ان کے دل کو اپیل نہیں کرتی، بلکہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ساری دلیلیں اپنی اس بے قید

آزادی کے حق میں نکالتے چلے جاتے ہیں، اور ان کے دل و دماغ کسی اچھی فکر کے بجائے شب و روز اپنی اغراض و خواہشات ہر ممکن طریقے سے پوری کرنے کی اُدھیڑبن ہی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ عقیدۂ آخرت کا انکار انسانی اخلاق کے لیے تباہ کن ہے۔ آدمی کو آدمیت کے دائرے میں اگر کوئی چیز رکھ سکتی ہے تو وہ صرف یہ احساس ہے کہ ہم غیر ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ ہمیں خدا کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ اس احساس سے خالی ہو جانے کے بعد کوئی شخص بڑے سے بڑا عالم بھی ہو تو وہ جانوروں سے بدتر رویہ اختیار کیے بغیر نہیں رہتا۔ (۱۰۰)

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ۔ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ۝ أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ۝ سَلْهُمْ أَيُّهُم بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ۝ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ۔ (القلم۔ ۳۵ تا ۴۱)

"کیا ہم فرماں برداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، تم کیسے حکم لگاتے ہو؟ کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے ضرور وہاں وہی کچھ ہے جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ یا پھر کیا تمہارے لیے روزِ قیامت تک ہم پر کچھ عہد و پیمان ثابت ہیں کہ تمہیں وہی کچھ ملے گا جس کا تم حکم لگاؤ؟ ان سے پوچھو تم میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ یا پھر کیا ان کے ٹھیرائے ہوئے کچھ شریک ہیں (جنہوں نے اس کا ذمہ لیا ہو)؟ یہ بات ہے تو لائیں اپنے شریکوں کو اگر یہ سچے ہیں۔"

مکہ کے سردار مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم کو جو نعمتیں دنیا میں مل رہی ہیں یہ ہمارے مقبولِ خدا ہونے کی علامت ہیں، اور تم جس بدحالی میں مبتلا ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم خدا کے مغضوب ہو۔ لہٰذا اگر کوئی آخرت ہوئی بھی جیسا کہ تم کہتے ہو تو وہاں بھی ہم مزے کریں گے اور عذاب تم پر ہوگا نہ کہ ہم پر۔ اس پر فرمایا گیا کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ خدا فرمانبردار اور مجرم میں تمیز نہ کرے۔ تمہاری سمجھ میں آخر کیسے یہ بات آتی ہے کہ کائنات کا خالق کوئی اندھا راجہ ہے جو یہ نہیں دیکھے گا کہ کن لوگوں نے دنیا میں اس کے احکام کی اطاعت کی اور برے کاموں سے پرہیز کیا، اور کون لوگ تھے جو اس سے بے خوف ہو کر ہر طرح کے گناہ اور جرائم اور ظلم و ستم کرتے رہے؟ تم نے ایمان لانے والوں کی خستہ حالی اور اپنی خوشحالی تو دیکھ لی مگر اپنے اور ان کے اخلاق و اعمال کا فرق نہیں دیکھا اور بے تکلف حکم لگا دیا کہ خدا کے ہاں فرمانبرداروں کے ساتھ تو مجرموں کا سا معاملہ کیا جائے گا، اور تم جیسے مجرموں کو جنت عطا کر دی جائے گی۔ یہ حکم آخر تم نے کس بنا پر لگا لیا ہے؟ کیا تمہارے پاس خدا کی کوئی کتاب ہے

جس میں یہ لکھا ہو؟ یا خدا سے تمہارا کوئی عہد و پیمان ہو گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو تم میں سے کون آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس نے اللہ سے تمہارے لیے ایسا کوئی عہد و پیمان لے رکھا ہے؟ اور اگر تمہارے معبودوں میں سے کسی نے یہ کہا ہے تو بلاؤ اُن کو اور پوچھو کہ ان میں سے کس نے خدا سے یہ وعدہ لے لیا ہے۔ غرض تم اپنے حق میں جو حکم لگا رہے ہو اس کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ یہ عقل کے بھی خلاف ہے خدا کی کسی کتاب میں بھی تم یہ لکھا ہوا نہیں دکھا سکتے۔ تم میں سے کوئی یہ دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ اس نے خدا سے ایسا کوئی عہد لے لیا ہے۔ اور جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں سے بھی کسی سے تم یہ شہادت نہیں دلوا سکتے کہ خدا کے ہاں تمہیں جنت دلوا دینے کا وہ ذمّہ لیتا ہے۔ پھر یہ غلط فہمی آخر تمہیں کہاں سے لاحق ہو گئی؟ (۱۰۱)

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۔ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ (التکویر: ۸-۹)

"اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی؟"

اِس آیت کے اندازِ بیان میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت غضبناکی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ قیامت کے روز بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابلِ نفرت ہوں گے کہ اُن کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اِس معصوم کو کیوں قتل کیا؟ بلکہ اُن سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ تو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی؟ اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اِس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیئے گئے جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فحویٰ سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اہلِ عرب کو یہ احساس دلایا گیا کہ جاہلیت نے اُن کو اخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ در گور کرتے ہیں، پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ اپنی اِسی جاہلیت پر قائم رہیں گے اور اُس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں آخرت کے ضروری ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کر دی گئی۔ جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا ہے، آخر اس کی کہیں تو داد رسی ہونی چاہیے، اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب اُن سے اِس بے دردانہ ظلم کی باز پرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سننے والا نہ تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اِس فعل کو بالکل جائز کر رکھا گیا تھا۔ نہ ماں باپ کو اِس پر شرم آتی تھی۔ نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا۔ نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلمِ عظیم بالکل ہی بے داد رہ جانا چاہیے؟ (۱۰۲)

انکارِ آخرت کے اخلاقی نتائج

قرآن کریم میں آخرت کے امکان اور اس کے وجوب پر اتنے مضبوط دلائل قائم کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ صرف آخرت کا عقیدہ ہی وہ چیز ہے جو انسان کی سیرت و کردار کو صحیح و مستحکم اخلاقی بنیادوں پر قائم رکھتا ہے۔ یہ نہ ہو تو اُس کو ظلم و ستم، فسق و فجور، بدعہدی و خیانت اور بدکاری و بداطواری سے روکنے والی کوئی چیز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت کا انکار کرنے والے زبان سے خواہ کتنی ہی حُجتیں بگھارتے رہیں، اُن کے عمل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ دراصل اخلاقی بے قیدیوں کی آزادی چاہتے ہیں اور اُسی کو برقرار رکھنے کے لیے آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ قرآن مجید میں اُن اخلاقی خرابیوں کی نشاندہی کی گئی جو خود عرب کے معاشرے میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں، اور لوگوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیا گیا کہ کیا یہ خرابیاں اُس صورت میں بھی پیدا ہو سکتی تھیں جب لوگوں کو یہ احساس ہوتا کہ ہمیں ایک دن اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ایک ایک فعل کی جواب دہی کرنی ہو گی؟ (۱۰۴)

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ۝ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ ۝ بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۝ (القیامہ ۳ تا ۵)

"کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اُس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ مگر انسان چاہتا یہ ہے کہ آگے بھی بداعمالیاں کرتا رہے۔"

پہلی دو آیتوں میں منکرین کی اُن باتوں کا جواب دیا گیا ہے جو وہ کہتے تھے کہ آخر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو مرے ہوئے سینکڑوں ہزاروں برس گزر چکے ہوں، جن کے جسم کا ذرّہ ذرّہ خاک میں مل کر پراگندہ ہو چکا ہو، جن کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر نہ معلوم زمین میں کہاں کہاں منتشر ہو چکی ہوں، جن میں سے کوئی جل مرا ہو، کوئی درندوں کے پیٹ میں جا چکا ہو، کوئی سمندر میں غرق ہو کر مچھلیوں کی غذا بن چکا ہو، اُن سب کے اجزائے جسم پھر سے جمع ہو جائیں اور ہر انسان پھر وہی شخص بن کر اُٹھ کھڑا ہو جو دس بیس ہزار سال پہلے کبھی وہ تھا؟ اس کا نہایت معقول اور انتہائی پُرزور جواب اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے سوال کی شکل میں دے دیا ہے کہ "کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو کبھی جمع نہ کر سکیں گے؟" یعنی اگر تم سے یہ کہا گیا ہوتا کہ تمہارے یہ منتشر اجزائے جسم کسی وقت آپ سے آپ جمع ہو جائیں گے اور تم آپ سے آپ اِسی جسم کے ساتھ جی اُٹھو گے، تو بلاشبہ تمہارا اِس کو ناممکن سمجھنا بجا ہوتا۔ مگر تم سے تو کہا یہ گیا ہے کہ یہ کام خود نہیں ہو گا بلکہ اللہ تعالیٰ ایسا کرے گا۔ اب کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے ہو کہ کائنات کا خالق، جسے تم خود بھی خالق مانتے ہو، اس کام سے عاجز ہے؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے جواب میں کوئی شخص جو خدا کو خالق مانتا ہو، اُس وقت یہ کہہ سکتا تھا اور

نہ آج یہ کہہ سکتا ہے کہ خدا بھی یہ کام کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی بے وقوف ایسی بات کہے تو اس سے پوچھا جا سکتا ہے کہ تم آج جس جسم میں اِس وقت موجود ہو اس کے لیے تمہارا اجزاء کو ہوا اور پانی اور مٹی اور نہ معلوم کہاں کہاں سے جمع کر کے اُسی خدا نے کیسے یہ جسم بنا دیا جس کے متعلق تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ پھر ان اجزا کو جمع نہیں کر سکتا؟

پھر فرمایا کہ بڑی بڑی ہڈیوں کو جمع کر کے تمہارا ڈھانچہ پھر سے کھڑا کر دینا تو در کنار، ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ تمہارے نازک ترین اجزائے جسم حتّٰی کہ تمہاری انگلیوں کی پوروں تک کو پھر ویسا ہی بنا دیں جیسی وہ پہلے تھیں۔

آخری فقرے میں منکرین آخرت کے اصل مرض کی صاف صاف تشخیص کر دی گئی کہ ان لوگوں کو جو چیز آخرت کے انکار پر آمادہ کر رہی ہے وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ فی الواقع یہ قیامت اور آخرت کو ناممکن سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے اِس انکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ آخرت کو ماننے سے لازماً ان پر کچھ اخلاقی پابندیاں عائد ہوتی ہیں، اور انہیں یہ پابندیاں ناگوار ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح یہ اب تک زمین میں بے نتھے بیل کی طرح پھرتے رہے ہیں، اُسی طرح آئندہ بھی پھرتے رہیں۔ جو ظلم، جو بے ایمانیاں، جو فسق و فجور، جو بدکرداریاں یہ اب تک کرتے رہے ہیں، اُن کی کھلی چھوٹ آئندہ بھی انہیں ملی رہے، اور یہ خیال کبھی ان کو یہ ناروا آزادیاں برتنے سے نہ روکنے پائے کہ ایک دن انہیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ان اعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اس لیے دراصل ان کی عقل انہیں آخرت پر ایمان لانے سے نہیں روک رہی ہے بلکہ ان کی خواہشاتِ نفس اِس میں مانع ہیں۔ (۱۰۲)

اور یہی بات ان آیات میں فرمائی گئی ہے:

وَمَا يُكَذِّبُ بِهِۦٓ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۔ (المطففین ۱۲)

"اور اُسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزر جانے والا بد عمل ہے۔"

إِنَّ ٱلَّذِينَ يَضِلُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌۢ بِمَا نَسُوا۟ يَوْمَ ٱلْحِسَابِ ۔ (صٓ ۲۶)

"جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں اُن کے لیے سخت عذاب ہے اِس وجہ سے کہ وہ روزِ حساب کو بھول گئے ہیں۔"

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ ٱلْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ ٱلْءَاخِرَةَ ۔ (القیامۃ ۲۰-۲۱)

"ہرگز نہیں، اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔"

یہ منکرین کے انکارِ آخرت کی دوسری وجہ ہے۔ پہلی وجہ تو اُوپر بیان کردی گئی کہ وہ مجبوری کھلی چھوٹ چاہتے ہیں اور اُن اخلاقی پابندیوں سے بچنا چاہتے ہیں جو آخرت کو ماننے سے لازماً اُن پر عائد ہوتی ہیں، اس لیے دراصل خواہشاتِ نفس اُنہیں انکارِ آخرت پر اُبھارتی ہیں اور پھر وہ عقلی دلیلیں بگھارتے ہیں تاکہ اپنے اِس انکار کو معقول ثابت کریں۔ اب دوسری وجہ یہ بیان کی جا رہی ہے کہ منکرینِ آخرت چونکہ تنگ نظر اور کوتاہ بین ہیں اِس لیے اُن کی نگاہ میں ساری اہمیت اُنہی نتائج کی ہے جو اِسی دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں اور اُن نتائج کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتے جو آخرت میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو فائدہ، یا لذّت، یا خوشی یہاں حاصل ہو جائے اُسی کی طلب میں ساری محنتیں اور کوششیں کھپا دینی چاہییں کیونکہ اُسے پا لیا تو گویا سب کچھ پا لیا، خواہ آخرت میں اس کا انجام کتنا ہی بُرا ہو۔ اسی طرح اُن کا خیال یہ ہے کہ جو نقصان یا تکلیف یا رنج و غم یہاں پہنچ جائے وہی دراصل بچنے کے قابل چیز ہے، قطع نظر اِس سے کہ اُس کو برداشت کر لینے کا کتنا ہی بڑا اجر آخرت میں مل سکتا ہو۔ وہ نقد سودا چاہتے ہیں۔ آخرت جیسی اُدھار کی چیز کے لیے وہ نہ آج کے کسی نفع کو چھوڑ سکتے ہیں نہ کسی نقصان کو گوارا کر سکتے ہیں۔ اِس اندازِ فکر کے ساتھ جب وہ آخرت کے مسئلے پر عقلی بحثیں کرتے ہیں تو دراصل وہ خالص عقلیت نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے یہ اندازِ فکر کام کر رہا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اُن کا فیصلہ بہرحال یہی ہوتا ہے کہ آخرت کو نہیں ماننا ہے خواہ اندر سے اُن کا ضمیر پکار پکار کر کہہ رہا ہو کہ آخرت کے امکان، وقوع اور وجوب کی جو دلیلیں قرآن میں دی گئی ہیں وہ نہایت معقول ہیں اور اس کے خلاف جو استدلال وہ کر رہے ہیں وہ نہایت بودا ہے۔ (۱۰۵)

إِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا۔ (الدھر: ۲۷)

"یہ لوگ تو جلدی حاصل ہونے والی چیز (دُنیا) سے محبت رکھتے ہیں اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اُسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔"

یعنی یہ کفارِ قریش جس وجہ سے اخلاق اور عقائد کی گمراہیوں پر مُصر ہیں، اور جس بنا پر اللہ کے رسُول کی دعوتِ حق کے لیے اِن کے کان بہرے ہو گئے ہیں، وہ دراصل اِن کی دُنیا پرستی اور آخرت سے بے فکری و بے نیازی ہے۔ اِس لیے ایک سچّے خدا پرست انسان کا راستہ اِن کے راستے سے اِتنا الگ ہے کہ دونوں کے درمیان کسی مصالحت کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (۱۰۶)

أَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝ (التکاثر: ۱ تا ۸)

"تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے، یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر (سُن لو کہ) ہرگز نہیں، عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (اس روش کے انجام کو) جانتے ہوتے (تو تمہارا یہ طرز عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے، پھر (سُن لو کہ) تم بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھو گے۔ پھر ضرور اُس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی۔"

لفظ اَلْھٰکُمْ لَہْو سے مُشتق ہے جس کے اصل معنی غفلت کے ہیں، لیکن عربی زبان میں یہ لفظ اُس شغل کے لیے بولا جاتا ہے جس سے آدمی کی دلچسپی اتنی بڑھ جائے کہ وہ اُس میں منہمک ہو کر دوسری اہم تر چیزوں سے غافل ہو جائے۔ اس مادّے سے جب اَلْھٰکُمْ کا لفظ بولا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کسی لہو نے تم کو اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ تمہیں کسی اور چیز کا، جو اُس سے اہم تر ہے، ہوش باقی نہیں رہا ہے۔ اسی کی دُھن تم پر سوار ہے۔ اُسی کی فکر میں تم لگے ہوئے ہو۔ اور اس انہماک نے تم کو بالکل غافل کر دیا ہے۔

"تکاثر" کثرت سے ہے، اور اس کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ لوگ کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کریں۔ تیسرے یہ کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلے میں اس بات پر فخر جتائیں کہ انہیں دوسروں سے زیادہ کثرت حاصل ہے۔

پس اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ کے معنی ہوئے "تکاثر نے تمہیں اپنے اندر ایسا مشغول کر لیا ہے کہ اس کی دُھن نے تمہیں اُس سے اہم تر چیزوں سے غافل کر دیا ہے۔" اس فقرے میں یہ تصریح نہیں کی گئی ہے کہ تکاثر میں کس چیز کی کثرت اور اَلْھٰکُمْ میں کس چیز سے غافل ہو جانا مراد ہے، اور اَلْھٰکُمْ (تم کو غافل کر دیا ہے) کے مخاطب کون لوگ ہیں۔ اس عدمِ تصریح کی وجہ سے ان الفاظ کا اطلاق اپنے وسیع ترین مفہوم پر ہو جاتا ہے۔ تکاثر کے معنی محدود نہیں رہتے بلکہ دنیا کے تمام فوائد و منافع، سامانِ عیش، اسبابِ لذّت، اور وسائلِ قوت و اقتدار کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی سعی و جہد کرنا، اُن کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، اور ایک دوسرے کے مقابلے میں اُن کی کثرت پر فخر جتانا اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اَلْھٰکُمْ کے مخاطب بھی محدود نہیں رہتے بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اس کے مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دنیا حاصل کرنے اور اس میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے، اور دوسروں کے مقابلے میں اس پر فخر جتانے کی دُھن افراد پر بھی سوار ہے اور اقوام پر بھی۔ اسی طرح اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ میں چونکہ اس امر کی صراحت نہیں کی گئی کہ تکاثر نے

لوگوں کو اپنے اندر منہمک کر کے کس چیز سے غافل کر دیا ہے، اس لیے اس کے مفہوم میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو اس تکاثر کی دھن نے ہر اس چیز سے غافل کر دیا ہے جو اس کی بہ نسبت اہم تر ہے۔ وہ خدا سے غافل ہو گئے ہیں، عاقبت سے غافل ہو گئے ہیں۔ اخلاقی حدود اور اخلاقی ذمہ داریوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ انہیں بس معیارِ زندگی بلند کرنے کی فکر ہے، اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ معیارِ آدمیت کس قدر گر رہا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ دولت چاہیے، اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ وہ کس ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ انہیں عیش و عشرت اور جسمانی لذتوں کے سامان زیادہ سے زیادہ مطلوب ہیں، اس ہوس رانی میں غرق ہو کر وہ اس بات سے بالکل غافل ہو گئے ہیں کہ اس روش کا انجام کیا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ طاقت، زیادہ سے زیادہ فوجیں، زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر ہے، اور اس معاملہ میں ان کے درمیان ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ جاری ہے، اس بات کی فکر انہیں نہیں ہے کہ یہ سب کچھ خدا کی زمین کو ظلم سے بھر دینے اور انسانیت کو تباہ و برباد کر دینے کا سروسامان ہے۔ غرض تکاثر کی بے شمار صورتیں ہیں جنہوں نے اشخاص اور اقوام سب کو اپنے اندر ایسا مشغول کر رکھا ہے کہ انہیں دنیا اور اس کے فائدوں اور لذتوں سے بالاتر کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ اور یہ فکر مرتے دم تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

اس غلطی پر لوگوں کو متنبّہ کرنے کے بعد فرمایا گیا کہ تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ متاعِ دنیا کی یہ کثرت، اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانا ہی ترقی اور کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے۔ عنقریب اس کا برا انجام تمہیں معلوم ہو جائے گا اور تم جان لوگے کہ یہ کتنی بڑی غلطی تھی جس میں تم عمر بھر مبتلا رہے۔ عنقریب سے مراد آخرت بھی ہو سکتی ہے، کیونکہ جس ہستی کی نگاہ ازل سے ابد تک تمام زمانوں پر حاوی ہے اُس کے لیے چند ہزار یا چند لاکھ سال بھی زمانے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ لیکن اس سے مراد موت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ تو کسی انسان سے بھی کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ اور یہ بات مرتے ہی انسان پر کھل جاتی ہے کہ جن مشاغل میں وہ اپنی ساری عمر کھپا کر آیا ہے وہ اُس کے لیے سعادت و خوش بختی کا ذریعہ تھے یا بدانجامی و بدبختی کا ذریعہ؟ (۱۰۷)

پھر قرآن خود عربی معاشرے میں سے چند سامنے کی مثالیں دے کر بتاتا ہے کہ آخرت سے غفلت نے لوگوں میں کیسی کیسی برائیاں پیدا کر دی ہیں۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (المطففین ۱ تا ۶)

"تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔"

لفظ مُطَفِّفِين طفیف سے مشتق ہے جس کے معنی عربی زبان میں چھوٹی اور حقیر چیز کے ہیں، اور تطفیف کا لفظ اصطلاحاً ناپ تول میں چوری چھپے تھوڑی تھوڑی کمی کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ کام کرنے والا ناپ کر یا تول کر چیز دیتے ہوئے کوئی بڑی مقدار نہیں اڑاتا بلکہ ہاتھ کی صفائی دکھا کر ہر خریدار کے حصے میں سے تھوڑا تھوڑا اڑاتا رہتا ہے اور خریدار بیچارے کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ تاجر اسے کیا اور کتنا گھاٹا دے رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ برائی جو معاشرے میں عام تھی کبھی نہ پھیل سکتی اگر لوگوں کو آخرت کا کوئی خیال ہوتا۔ (۱۰۸)

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (الفجر: ۱۷ تا ۲۰)

"ہرگز نہیں (دنیوی خوشحالی یا بدحالی معیارِ عزت و ذلت نہیں ہے) بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے، اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو، اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔"

یعنی یہ جو تم نے دنیوی خوشحالی و بدحالی کو معیارِ عزت و ذلت سمجھ رکھا ہے یہ تمہارا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے۔ ورنہ اصل معیار تو اخلاق کی خوبی و زشتی ہے۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ یتیم کا باپ جب تک زندہ رہتا ہے اُس کے ساتھ تمہارا برتاؤ کچھ اور ہوتا ہے اور جب اس کا باپ مرجاتا ہے تو ہمسائے اور دور کے رشتہ دار تو درکنار چچا اور ماموں اور بڑے بھائی تک اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ تمہارے معاشرے میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا کوئی چرچا نہیں ہے۔ نہ کوئی خود کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لیے کوئی فکر کریں اور ایک دوسرے کو اس کا انتظام کرنے پر اکسائیں۔ میراث میں عورتوں اور بچوں کو تو تم نے ویسے ہی محروم کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور با اثر ہوتا ہے وہ بلا تأمل ساری میراث سمیٹ لیتا ہے، اور ان سب کا حصہ مارکھاتا ہے جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بوتا نہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی اہمیت تمہاری نگاہ میں نہیں ہے کہ ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حقدار کو اس کا حق دو خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ مال کمانے میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی تمیز کوئی نہیں۔ جس طریقے سے بھی مال حاصل کیا جا سکتا ہو اُسے

حاصل کرنے میں تمہیں کوئی تأمل نہیں ہوتا۔ اور خواہ کتنا ہی مال مل جائے تمہاری حرص و طمع کی آگ کبھی نہیں بجھتی (۱۰۹)

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝ (الماعون ۱ تا ۳)

"تم نے دیکھا اُس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اُکساتا۔"

یہاں اللہ تعالیٰ نے دو نمایاں ترین مثالیں دے کر دراصل یہ بتایا ہے کہ انکارِ آخرت لوگوں میں کس قسم کی اخلاقی برائیاں پیدا کرتا ہے۔ اصل مقصود ان دو ہی باتوں پر گرفت کرنا نہیں ہے کہ آخرت کو نہ ماننے سے بس یہ دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ یتیموں کو دھتکارتے ہیں اور مسکینوں کا کھانا دینے پر نہیں اُکساتے۔ بلکہ جو بے شمار خرابیاں اس گمراہی کے نتیجے میں رونما ہوتی ہیں ان میں سے دو ایسی چیزیں بطورِ نمونہ پیش کی گئی ہیں جن کو ہر شریف الطبع اور سلیم الفطرت انسان مانے گا کہ وہ نہایت قبیح اخلاقی رذائل ہیں۔ اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ اگر یہی شخص خدا کے حضور اپنی حاضری اور جواب دہی کا قائل ہوتا تو اس سے ایسی کمینہ حرکتیں سرزد نہ ہوتیں کہ یتیم کا حق مارے، اس پر ظلم ڈھائے، اس کو دھتکار دے، اور مسکین کو نہ خود کھلائے نہ کسی سے یہ کہے کہ اس کا کھانا اس کو دو۔ آخرت کا یقین رکھنے والوں کے اوصاف تو وہ ہیں جو سورۂ بلد اور سورۂ عصر میں بیان کیے گئے ہیں کہ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (وہ ایک دوسرے کو خلقِ خدا پر رحم کھانے کی نصیحت کرتے ہیں) اور وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ (وہ ایک دوسرے کو حق پرستی اور ادائے حقوق کی نصیحت کرتے ہیں)۔ (۱۱۰)

دنیا میں انسان امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے

ایک طرف قرآن نے اس طریقے سے آخرت کے امکان اور اس کی ضرورت کے متعلق لوگوں کے ہر شبہ کو نہایت معقول طریقے سے رفع کیا اور دوسری طرف اس نے اُن کو یہ بھی بتایا کہ تم اپنی غفلت کی وجہ سے دُنیا کو محض ایک چراگاہ یا تفریح گاہ سمجھے بیٹھے ہو، حالانکہ یہ ایک امتحان گاہ ہے جہاں ہر وقت اپنی زندگی کے ہر انفرادی اور اجتماعی معاملہ میں تم دراصل امتحان دے رہے ہو۔ اور یہ امتحان تمہیں بے خبر رکھ کر نہیں لیا جا رہا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے تم کو یہ بتانے کا پورا انتظام کر دیا ہے کہ اس میں تمہاری کامیابی و ناکامی کا مدار کس چیز پر ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۔ (الملک ۲)

"جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔"

یعنی دُنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے شروع کیا ہے کہ اُن کا امتحان

لے اور یہ دیکھے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اِس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ موت اور حیات اُسی کی طرف سے ہے۔ کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے یہ کہ انسان جیسی ایک مخلوق جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اُس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت۔ خالق نے اُسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اُس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اُس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ اسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تاکہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا بُرائی کا اظہار کر سکے اور عملاً یہ دکھا دے کہ وہ کیسا انسان ہے۔ چوتھے یہ کہ خالق ہی دراصل اِس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا بُرا۔ اعمال کی اچھائی اور بُرائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والے کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والا کا کام ہے۔ لہٰذا جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہیے اُسے یہ معلوم کرنا ہو گا کہ ممتحن کے نزدیک حُسنِ عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس شخص کا جیسا عمل ہو گا اس کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی، کیونکہ اگر جزا نہ ہو تو سرے سے امتحان لینے کے کوئی معنی ہی نہیں رہتے۔ (۱۱۱)

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۔ (الدھر: ۲-۳)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اسی غرض کے لیے ہم نے اُسے سُننے اور دیکھنے والا بنایا۔ ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر (ناشکری) کرنے والا۔"

یہ ہے دُنیا میں انسان کی اور انسان کے لیے دُنیا کی اصل حیثیت۔ وہ درختوں اور جانوروں کی طرح نہیں ہے کہ اس کا مقصدِ تخلیق یہیں پورا ہو جائے اور قانونِ فطرت کے مطابق ایک مدت تک اپنے حصے کا کام کر کے وہ یہیں مر کر فنا ہو جائے۔ نیز یہ دُنیا اُس کے لیے نہ دارالعذاب ہے، جیسا کہ راہب سمجھتے ہیں، نہ دارالجزا ہے، جیسا کہ تناسخ کے قائلین سمجھتے ہیں، نہ چراگاہ اور تفریح گاہ ہے، جیسا کہ مادہ پرست سمجھتے ہیں، اور نہ رزم گاہ، جیسا کہ ڈارون اور مارکس کے پیرو سمجھتے ہیں، بلکہ دراصل یہ اُس کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔ وہ جس چیز کو عمر سمجھتا ہے حقیقت میں وہ امتحان کا وقت ہے جو اُسے یہاں دیا گیا ہے۔ دُنیا میں جو قوتیں اور صلاحیتیں بھی اُس کو دی گئی ہیں، جن چیزوں پر بھی اُس کو تصرف کے مواقع دیے گئے ہیں، جن حیثیتوں سے بھی وہ یہاں کام کر رہا ہے، اور جو تعلقات بھی اُس کے اور دوسرے انسانوں کے درمیان ہیں، وہ سب

اصل میں امتحان کے بے شمار پرچے ہیں، اور زندگی کے آخری سانس تک اِس امتحان کا سلسلہ جاری ہے۔ نتیجہ اِس کا دُنیا میں نہیں نکلنا ہے بلکہ آخرت میں اُس کے تمام پرچوں کو جانچ کر یہ فیصلہ ہونا ہے کہ وہ کامیاب ہُوا ہے یا ناکام۔ اور اُس کی کامیابی و ناکامی کا سارا انحصار اِس پر ہے کہ اُس نے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہُوئے یہاں کام کیا اور کس طرح امتحان کے وہ پرچے کیے جو اُسے یہاں دیے گئے تھے۔ اگر اُس نے اپنے آپ کو بے خدا یا بہت سے خداؤں کا بندہ سمجھا، اور سارے پرچے یہ سمجھتے ہُوئے کیے کہ آخرت میں اسے اپنے خالق کے سامنے کوئی جواب دہی نہیں کرنی ہے، تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی غلط ہو گیا۔ اور اگر اس نے اپنے آپ کو خدائے واحد کا بندہ سمجھ کر اُس طریقے پر کام کیا جو خدا کی مرضی کے مطابق ہو اور آخرت کی جواب دہی کو پیشِ نظر رکھا تو وہ امتحان میں کامیاب ہو گیا۔

[یہ مضمون قرآن مجید میں اِس کثرت کے ساتھ اور اتنی تفصیلات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اُن سب مقامات کا حوالہ دینا یہاں مشکل ہے۔ جو حضرات اُسے پُوری طرح سمجھنا چاہتے ہوں وہ تفہیم القرآن کی ہر جلد کے آخر میں فہرست موضوعات کے اندر لفظ "آزمائش" نکال کر وہ تمام مقامات دیکھیں جہاں قرآن میں مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن کے سوا دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں یہ حقیقت اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہو۔]

پھر فرمایا گیا "ہم نے اُسے سمیع و بصیر بنایا"۔ اس کا مفہوم صحیح طور پر "ہوش گوش رکھنے والا بنایا" سے ادا ہوتا ہے، لیکن ہم نے ترجمے کی رعایت سے سمیع کے معنی "سُننے والا" اور بصیر کے معنی "دیکھنے والا" کیے ہیں۔ اگرچہ عربی زبان کے اِن الفاظ کا ترجمہ یہی ہے مگر ہر عربی داں جانتا ہے کہ حیوان کے لیے سمیع اور بصیر کے الفاظ کبھی استعمال نہیں ہوتے۔ حالانکہ وہ بھی سُننے اور دیکھنے والا ہوتا ہے۔ پس سُننے اور دیکھنے سے مُراد یہاں سماعت اور بینائی کی وہ قوتیں نہیں ہیں جو حیوانات کو بھی دی گئی ہیں، بلکہ اِس سے مُراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا اور پھر اُس سے نتائج اخذ کرتا ہے۔ علاوہ بریں سماعت اور بصارت انسان کے ذرائع علم میں چونکہ سب سے زیادہ اہم ہیں اس لیے اختصار کے طور پر صرف انہی کا ذکر کیا گیا ہے، ورنہ اصل مُراد انسان کو وہ تمام حواس عطا کرنا ہے جن کے ذریعے سے وہ معلومات حاصل کرتا ہے۔ پھر انسان کو جو حواس دیے گئے ہیں وہ اپنی نوعیت میں اُن حواس سے بالکل مختلف ہیں جو حیوانات کو دیے گئے، کیونکہ اُس کے ہر حاسے کے پیچھے ایک سوچنے والا دماغ موجود ہوتا ہے جو حواس کے ذریعے سے آنے والی معلومات کو جمع کر کے اور ان کو ترتیب دے کر اُن سے نتائج نکالتا ہے، رائے قائم کرتا ہے اور پھر کچھ فیصلوں پر پہنچتا ہے جن پر اس کا رویۂ زندگی مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنے کے بعد کہ انسان کو پیدا کر کے ہم اُس کا امتحان لینا چاہتے تھے یہ ارشاد

فرمایا کہ "اِسی غرض کے لیے ہم نے اُسے سمیع و بصیر بنایا"۔ دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے علم اور عقل کی طاقتیں دیں تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر مقصودِ کلام یہ نہ ہو اور سمیع و بصیر بنانے کا مطلب محض سماعت و بینائی کی قوتیں رکھنے والا بنانا ہی ہو، تو ایک اندھا اور بہرا آدمی تو پھر امتحان سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے، حالانکہ جب تک کوئی علم و عقل سے بالکل محروم نہ ہو، امتحان سے اس کے مستثنیٰ ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ہم نے اُسے محض علم و عقل کی قوتیں دے کر ہی نہیں چھوڑ دیا، بلکہ ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی بھی کی تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ شکر کا راستہ کون سا ہے اور کفر کا راستہ کونسا، اور اس کے بعد جو راستہ بھی وہ اختیار کرے اس کا ذمہ دار وہ خود ہو۔ سُورۂ بَلَد میں یہی مضمون اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَ هَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ "اور ہم نے اسے دونوں راستے (یعنی خیر و شر کے راستے) نمایاں کر کے بتا دیے"۔ اور سُورۂ شمس میں یہی بات اِس طرح بیان کی گئی ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا، "اور قسم ہے (انسان کے) نفس کی اور اُس ذات کی جس نے اُسے (تمام ظاہری و باطنی قوتوں کے ساتھ) اُستوار کیا، پھر اُس کا فجور اور اُس کا تقویٰ دونوں اُس پر الہام کر دیے"۔ اِن تمام تصریحات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے اور ساتھ ساتھ قرآن مجید کے اُن تفصیلی بیانات کو بھی نگاہ میں رکھا جائے جن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے انسان کی ہدایت کے لیے دُنیا میں کیا کیا انتظامات کیے ہیں، تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اِس آیت میں "راستہ دکھانے" سے مراد رہنمائی کی کوئی ایک ہی صُورت نہیں ہے بلکہ بہت سی صورتیں ہیں جن کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر:

۱۔ ہر انسان کو علم و عقل کی صلاحیتیں دینے کے ساتھ ایک اخلاقی حس بھی دی گئی ہے جس کی بدولت وہ فطری طور پر بھلائی اور بُرائی میں امتیاز کرتا ہے، بعض افعال اور اوصاف کو بُرا جانتا ہے اگرچہ وہ خود اُن میں مبتلا ہو، اور بعض افعال و اوصاف کو اچھا جانتا ہے اگرچہ وہ خود اُن سے اجتناب کر رہا ہو۔ حتیٰ کہ جن لوگوں نے اپنی اغراض و خواہشات کی خاطر ایسے فلسفے گھڑ لیے ہیں جن کی بنا پر بہت سی بُرائیوں کو انہوں نے اپنے لیے حلال کر لیا ہے، اُن کا حال بھی یہ ہے کہ وہی بُرائیاں اگر کوئی دوسرا اُن کے ساتھ کرے تو وہ اُس پر چیخ اٹھتے ہیں اور اُس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے جھوٹے فلسفوں کے باوجود حقیقت میں وہ اُن کو بُرا ہی سمجھتے ہیں۔ اِسی طرح نیک اعمال و اوصاف کو خواہ کسی نے جہالت اور حماقت اور دقیانوسیت ہی قرار دے رکھا ہو، لیکن جب کسی انسان سے خود اس کی ذات کو کسی نیک سلوک کا فائدہ پہنچتا ہے تو اس کی فطرت اُسے قابلِ قدر سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

۲۔ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ضمیر (نفسِ لوّامہ) نام کی ایک چیز رکھ دی ہے جو اُسے ہر اُس موقع پر ٹوکتی ہے جب وہ کوئی بُرائی کرنے والا ہو، یا کر رہا ہو، یا کر چکا ہو۔ اِس ضمیر کو انسان خواہ کتنی ہی تھپکیاں دے کر سُلا دے، اور اُس کو بے حس بنانے کی چاہے کتنی ہی کوشش کر لے، لیکن وہ اُسے بالکل فنا کر دینے پر قادر نہیں ہے۔ دُنیا میں ڈھیٹ بن کر وہ اپنے آپ کو قطعی بے ضمیر ثابت کر سکتا ہے۔ وہ حجتیں بگھار کر دُنیا کو دھوکا دینے کی بھی ہر کوشش کر سکتا ہے۔ وہ اپنے نفس کو بھی فریب دینے کے لیے اپنے افعال کے بے شمار عذرات تراش سکتا ہے۔ مگر اِس کے باوجود اللہ نے اُس کی فطرت میں جو مُحاسب بٹھا رکھا ہے وہ اِتنا جاندار ہے کہ کسی بُرے انسان سے بھی یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ وہ حقیقت میں کیا ہے۔ یہی بات ہے جو سُورۂ قیامہ میں فرمائی گئی ہے کہ "انسان خود اپنے آپ کو خوب جانتا ہے خواہ وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔" (آیت ۱۵)

۳۔ انسان کے اپنے وجود میں اور اس کے گرد و پیش زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات میں ہر طرف ایسی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں جو خبر دے رہی ہیں کہ یہ سب کچھ کسی خدا کے بغیر نہیں ہو سکتا، نہ بہت سے خدا اِس کارخانۂ ہستی کے بنانے اور چلانے والے ہو سکتے ہیں۔ اِسی طرح آفاق اور انفس کی یہی نشانیاں قیامت اور آخرت پر بھی صریح دلالت کر رہی ہیں۔ انسان اگر ان سے آنکھیں بند کر لے، یا اپنی عقل سے کام لے کر ان پر غور نہ کرے، یا جن حقائق کی نشان دہی یہ کر رہی ہیں اُن کو تسلیم کرنے سے جی چُرائے تو یہ اس کا اپنا قصُور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے تو حقیقت کی خبر دینے والے نشانات اس کے سامنے رکھ دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہے۔

۴۔ انسان کی اپنی زندگی میں، اُس کی ہم عصر دنیا میں، اور اس سے پہلے گزری ہوئی تاریخ کے تجربات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں اور آتے رہے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک بالاتر حکومت اُس پر اور ساری کائنات پر فرمانروائی کر رہی ہے، جس کے آگے وہ بالکل بے بس ہے، جس کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے اور جس کی مدد کا وہ محتاج ہے۔ یہ تجربات و مشاہدات صرف خارج ہی میں اِس حقیقت کی خبر دینے والے نہیں ہیں، بلکہ انسان کی اپنی فطرت میں بھی اُس بالاتر حکومت کے وجود کی شہادت موجود ہے جس کی بنا پر بڑے سے بڑا دہریہ بھی بُرا وقت آنے پر خدا کے آگے دُعا کے لیے ہاتھ پھیلا دیتا ہے، اور سخت سے سخت مُشرک بھی سارے جھُوٹے خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کو پکارنے لگتا ہے۔

۵۔ انسان کی عقل اور اس کی فطرت قطعی طور پر حکم لگاتی ہے کہ جُرم کی سزا اور عمدہ خدمات کا صلہ ملنا ضروری ہے۔ اِسی بنا پر تو دنیا کے ہر معاشرے میں عدالت کا نظام کسی نہ کسی صورت میں قائم کیا جاتا ہے اور جن خدمات

کو قابلِ تحسین سمجھا جاتا ہے اُن کا صلہ دینے کی بھی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کی جاتی ہے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اخلاق اور قانونِ مکافات کے درمیان ایک ایسا لازمی تعلق ہے جس سے انکار کرنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اب اگر یہ مسلّم ہے کہ اِس دنیا میں بے شمار جرائم ایسے ہیں جن کی پُوری سزا تو درکنار سرے سے کوئی سزا بھی نہیں دی جا سکتی، اور بے شمار خدمات بھی ایسی ہیں جن کا پُورا صلہ تو کیا، کوئی صلہ بھی خدمت کرنے والے کو نہیں مل سکتا، تو آخرت کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اِلّا یہ کہ کوئی بے وقوف یہ فرض کرے، یا کوئی ہٹ دھرم یہ رائے قائم کرنے پر اصرار کرے کہ انصاف کا تصور رکھنے والا انسان ایک ایسی دُنیا میں پیدا ہو گیا ہے جو بجائے خود انصاف کے تصور سے خالی ہے۔ اور پھر اِس سوال کا جواب اُس کے ذمّہ رہ جاتا ہے کہ ایسی دنیا میں پیدا ہونے والے انسان کے اندر یہ انصاف کا تصور آخر آ کہاں سے گیا؟

۴۔ اِن تمام ذرائعِ رہنمائی کی مدد کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی صریح اور واضح رہنمائی کے لیے دُنیا میں انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل کیں جن میں صاف صاف بتا دیا گیا کہ شکر کی راہ کونسی ہے اور کُفر کی راہ کونسی، اور اِن دونوں راہوں پر چلنے کے نتائج کیا ہیں۔ انبیاء اور کتابوں کی لائی ہوئی یہ تعلیمات بے شمار محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے اِتنے بڑے پیمانے پر ساری دنیا میں پھیلی ہیں کہ کوئی انسانی آبادی بھی خدا کے تصور، آخرت کے تصور، نیکی اور بدی کے فرق، اور اُن کے پیش کردہ اخلاقی اصولوں اور قانونی احکام سے ناواقف نہیں رہ گئی ہے، خواہ اسے یہ معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ علم اُسے انبیاء اور کتابوں کی لائی ہُوئی تعلیمات ہی سے حاصل ہُوا ہے۔ آج جو لوگ انبیاء اور کتابوں کے مُنکر ہیں، یا اُن سے بالکل بے خبر ہیں، وہ بھی اُن بہت سی چیزوں کی پیروی کر رہے ہیں جو دراصل اُنہی پیغمبروں اور کتابوں کی تعلیمات سے چھَن چھَن کر اُن تک پہنچی ہیں اور وہ نہیں جانتے کہ اِن چیزوں کا اصل ماخذ کونسا ہے۔ (۱۱۲)

فیصلے کا ایک دن مقرر ہے

اس کے بعد قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا کہ اس امتحان کا نتیجہ اسی دنیا میں ظاہر نہ ہوگا بلکہ ایک وقت اس کے لیے مقرر ہے جب دُنیا کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو دوبارہ زندہ کر کے اُٹھایا جائے گا اور اُن سب کا حساب لیا جائے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دی جائے گی۔

إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا لَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۔ (الدخان ۔ ۴۰)

"اِن سب کے لیے فیصلے کا ایک طے شدہ وقت ہے"

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (الواقعہ ۴۹-۵۰)

"ان سے کہو یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کیے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر ہے۔"

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِیْهِ اُخْرٰی فَاِذَا هُمْ قِیَامٌ یَّنْظُرُوْنَ ۔ (الزمر ۶۸)

"اور اس روز صور پھونکا جائے گا اور وہ سب مر کر گر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے اُن کے جنہیں اللہ زندہ رکھنا چاہے (مثلاً فرشتے) پھر ایک دوسرا صور پھونکا جائے گا اور یکایک سب کے سب اُٹھ کر دیکھ رہے ہوں گے۔"

وَقِیْلَ لِلظّٰلِمِیْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ۔ (الزمر ۲۴)

"اور ظالموں سے کہہ دیا جائے گا کہ اب چکھو مزہ اُس کمائی کا جو تم کرتے رہے تھے۔"

اصل میں لفظ "کسب" استعمال ہوا ہے جس سے مراد قرآن مجید کی اصطلاح میں جزا و سزا کا وہ استحقاق ہے جو آدمی اپنے عمل کے نتیجے میں کماتا ہے۔ نیک عمل کرنے والے کی اصل کمائی یہ ہے کہ وہ اللہ کے اجر کا مستحق بنتا ہے۔ اور گمراہی و بدراہی اختیار کرنے والے کی کمائی وہ سزا ہے جو اسے آخرت میں ملنے والی ہے۔ (۱۱۳)

اَلْیَوْمَ تُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ ۔ (المومن ۱۷)

"(اس وقت کہا جائے گا) آج ہر متنفس کو اُس کمائی کا بدلہ دیا جائے گا جو اُس نے (دنیا میں) کی تھی۔ آج کسی پر ظلم نہ ہوگا۔"

یعنی کسی نوعیت کا ظلم بھی نہ ہوگا۔ واضح رہے کہ جزا کے معاملہ میں ظلم کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کسی اجر کا مستحق ہو اور وہ اس کو نہ دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ وہ جتنے اجر کا مستحق ہو اس سے کم دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ سزا کا مستحق نہ ہو مگر اسے سزا دے ڈالی جائے۔ چوتھے یہ کہ جو سزا کا مستحق ہو اُسے سزا نہ دی جائے۔ پانچویں یہ کہ جو کم سزا کا مستحق ہو اُسے زیادہ سزا دے دی جائے۔ چھٹے یہ کہ مظلوم مُنہ دیکھتا رہ جائے اور ظالم اس کی آنکھوں کے سامنے صاف بری ہو کر نکل جائے۔ ساتویں یہ کہ ایک کے گناہ میں دوسرا پکڑ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ظلم کی تمام نوعیتوں میں سے کسی نوعیت کا ظلم بھی اُس کی عدالت میں نہ ہونے پائے گا۔ (۱۱۴)

انسان جو کچھ دُنیا میں کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس سے براہ راست واقف ہے

پھر قرآن میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اس دارالامتحان میں انسان جو کچھ بھی کر رہا ہے اللہ تعالیٰ اس سے براہِ راست واقف ہے۔ اُس کا کوئی فعل ہی بلکہ اُس کے دل کا کوئی خیال تک اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اِس لیے یوم الحساب میں انسان کو اُس خدا سے سابقہ پیش آئے گا جو اس کے پورے کارنامۂ حیات سے پوری طرح باخبر ہے۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۔ (الملک-۱۳)

"تم چھپا کر بات کرو یا زور سے (اُس کے لیے یکساں ہے)، وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔"

اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ۔ (الزخرف-۸۰)

"کیا وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم اُن کی راز کی باتیں اور اُن کی سرگوشیاں نہیں سُن رہے ہیں؟ ہم سب کچھ سُن رہے ہیں، اور ہمارے فرشتے اُن کے پاس ہی لکھ رہے ہیں۔"

وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۔ (ق-۱۶)

"اُس کے دل میں اُبھرنے والے وسوسوں تک کو ہم جانتے ہیں اور ہم اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہیں۔"

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۔ (الحدید-۴)

"وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔"

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ ۝ وَاللّٰهُ يَقْضِىْ بِالْحَقِّ ۔ (المؤمن: ۱۹-۲۰)

"اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک ٹھیک بے لاگ فیصلہ کرے گا۔" (۱۱۵)

آخرت کی عدالت میں ناقابلِ انکار شہادتوں سے اُس کے اعمال کا ثبوت پیش کیا جائے گا۔

لیکن قرآن مجید میں تصریح فرما دی گئی کہ آخرت میں فیصلہ اللہ تعالیٰ صرف اپنے ذاتی علم کی بنا پر نہ کرے گا بلکہ وہ ہر شخص کے اعمال کا مفصل اور مکمل اور نہایت صحیح ریکارڈ تیار کرا رہا ہے۔ اور عدالتِ الٰہی میں ایسی شہادتیں آدمی کے اعمال کے بارے میں پیش کی جائیں گی جن کا انکار کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ

اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ۔ (قٓ - ۱۷-۱۸)

"دو کاتب اُس کے دائیں اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اُس کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر باش نگران موجود نہ ہو۔"

مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم خود براہِ راست انسان کی حرکات و سکنات اور اُس کے خیالات کو جانتے ہیں، دوسری طرف ہر انسان پر دو فرشتے مامور ہیں۔ جو اُس کی ایک ایک بات کو نوٹ کر رہے ہیں اور اُس کا کوئی قول و فعل اُن کے ریکارڈ سے نہیں چھوٹتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت اللہ کی عدالت میں انسان کی پیشی ہوگی اُس وقت اللہ کو خود بھی معلوم ہوگا کہ کون کیا کر کے آیا ہے، اور اُس پر شہادت دینے کے لیے دو گواہ بھی موجود ہوں گے جو اُس کے اعمال کا دستاویزی ثبوت لا کر سامنے رکھ دیں گے۔ یہ دستاویزی ثبوت کس نوعیت کا ہوگا؟ اِس کا ٹھیک ٹھیک تصوّر کرنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ مگر جو حقائق آج ہمارے سامنے آ رہے ہیں انہیں دیکھ کر یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جس فضا میں انسان رہتا ہے اور کام کرتا ہے اُس میں ہر طرف اُس کی آوازیں، اُس کی تصویریں اور اس کی حرکات و سکنات کے نقوش ذرّے ذرّے پر ثبت ہو رہے ہیں اور اُن میں سے ہر چیز کو بعینہٖ اُنہی شکلوں اور آوازوں میں دوبارہ اِس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ اصل اور نقل میں ذرہ برابر فرق نہ ہو۔ آج انسان یہ کام نہایت ہی محدود پیمانے پر آلات کی مدد سے کر رہا ہے لیکن خدا کے فرشتے نہ اِن آلات کے محتاج ہیں نہ اِن قیود سے مُقیّد۔ انسان کا اپنا جسم اور اس کے گرد و پیش کی ہر چیز اُن کی ٹیپ اور اُن کی فلم ہے جس پر وہ ہر آواز اور ہر تصویر کو اس کی نازک ترین تفصیلات کے ساتھ جُوں کی تُوں ثبت کر سکتے ہیں اور قیامت کے روز آدمی کو اُس کے اپنے کانوں سے اُس کی اپنی آواز میں اس کی وہ باتیں سُنوا سکتے ہیں جو وہ دُنیا میں کرتا تھا، اور اُس کی اپنی آنکھوں سے اُس کے اپنے تمام کرتوتوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا سکتے ہیں جن کی صحت سے انکار کرنا اس کے لیے ممکن نہ رہے۔

اِس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی عدالت میں کسی شخص کو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر سزا نہ دے گا بلکہ عدل کی تمام شرائط پوری کر کے اس کو سزا دے گا۔ اسی لیے دُنیا میں ہر شخص کے اقوال و افعال کا مکمل ریکارڈ تیار کرایا جا رہا ہے تاکہ اس کی کارگزاریوں کا پُورا ثبوت ناقابلِ انکار شہادتوں سے فراہم ہو جائے۔ (۱۱۶)

وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۔ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ ۔ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۔ (الانفطار: ۱۰ تا ۱۲)

"حالانکہ تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب جو تمہارے ہر فعل کو جانتے ہیں۔"

یعنی تم لوگ دارالجزاء کا انکار کر دو یا اُس کو جھٹلاؤ یا اُس کا مذاق اڑاؤ، اس سے حقیقت نہیں بدلتی حقیقت

یہ ہے کہ تمہارے رب نے تمہیں دُنیا میں شترِ بے مُہار بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اُس نے تم میں سے ایک ایک آدمی پر نہایت راست باز نگراں مقرر کر رکھے ہیں جو بالکل بے لاگ طریقے سے تمہارے تمام اچھے اور بُرے اعمال کو ریکارڈ کر رہے ہیں اور ان سے تمہارا کوئی کام چھپا ہُوا نہیں ہے، خواہ تم اندھیرے میں، خلوتوں میں، سُنسان جنگلوں میں، یا اور کسی ایسی حالت میں اُس کا ارتکاب کرو جہاں تمہیں پُورا اطمینان ہو کہ جو کچھ تم نے کیا ہے وہ نگاہِ خلق سے مخفی رہ گیا ہے۔ اِن نگراں فرشتوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے کِرَامًا کَاتِبِیْن کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں یعنی ایسے کاتب جو کریم (نہایت بزرگ اور معزز) ہیں کسی سے نہ ذاتی محبت رکھتے ہیں نہ عداوت کہ ایک کی بے جا رعایت اور دوسرے کی ناروا مخالفت کر کے خلافِ واقعہ ریکارڈ تیار کریں۔ خائن بھی نہیں ہیں کہ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوتے بغیر بطورِ خود غلط سَلَط اندراجات کر لیں۔ رشوت خوار بھی نہیں ہیں کہ کچھ لے دے کر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف جھوٹی رپورٹیں کر دیں۔ اُن کا مقام اِن ساری اخلاقی کمزوریوں سے بلند ہے، اس لیے نیک و بد دونوں قسم کے انسانوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ہر ایک کی نیکی بے کم و کاست ریکارڈ ہوگی، اور کسی کے ذمّہ کوئی ایسی بدی نہ ڈال دی جائے گی جو اس نے نہ کی ہو۔ پھر اُن فرشتوں کی دوسری صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "جو کچھ تم کرتے ہو اُسے وہ جانتے ہیں" یعنی اُن کا حال دُنیا کی سی آئی ڈی اور اطلاعات (Intelligence) کی ایجنسیوں جیسا نہیں ہے کہ ساری تگ و دَو کے باوجود بہت سی باتیں اُن سے چھُپی رہ جاتی ہیں۔ وہ ہر ایک کے اعمال سے پُوری طرح باخبر ہیں۔ ہر جگہ ہر حال میں ہر شخص کے ساتھ اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی اس کی نگرانی کر رہا ہے، اور اُنہیں یہ تک معلوم ہوتا ہے کہ کس شخص نے کس نیّت سے کوئی کام کیا ہے۔ اس لیے اُن کا مرتب کردہ ریکارڈ ایک مکمّل ریکارڈ ہے جس میں درج ہونے سے کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔ اِسی کے متعلق سورۂ کہف آیت ۴۹ میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز مجرمین یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اُن کا جو نامۂ اعمال پیش کیا جا رہا ہے اس میں کوئی چھوٹی یا بڑی بات درج ہونے سے نہیں رہ گئی ہے، جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب جُوں کا تُوں ان کے سامنے حاضر ہے۔ (۱۱۷)

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۔ (الزّلزال: ۲ تا ۵)

"اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی، اور انسان کہے گا کہ یہ اِس کو کیا ہو رہا ہے؟ اُس روز وہ اپنے (اُوپر گزرے ہوئے) حالات بیان کرے گی کیونکہ تیرے رب نے اُسے (ایسا کرنے کا) حکم دیا ہو گا۔"

یہ وہی مضمون ہے جو سورۂ انشقاق آیت ۴ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وَاَلْقَتْ مَا فِیْہَا وَتَخَلَّتْ "اور جو کچھ اُس کے اندر ہے اُسے باہر پھینک کر خالی ہو جائے گی"۔ اِس کے کئی مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مرے ہوئے انسان زمین کے اندر جہاں جہاں جس شکل اور جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے اُن سب کو وہ نکال کر باہر ڈال دیگی، اور بعد کا فقرہ اِس پر دلالت کرتا ہے کہ اُس وقت اُن کے جسم کے تمام بکھرے ہوئے اجزاء جمع ہو کر از سرِ نو اسی شکل و صورت میں زندہ ہو جائیں گے جس میں وہ پہلی زندگی کی حالت میں تھے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو اور وہ بالکل ہی نئے آدمی ہوں تو وہ یہ کیسے کہیں گے کہ زمین کو یہ کیا ہو رہا ہے۔ نئے آدمیوں نے زمین کی پہلی حالت کو دیکھا ہی کب ہوگا کہ وہ یہ کہہ سکیں؟ دوسرا مطلب یہ ہے کہ صرف مرے ہوئے انسانوں ہی کو وہ باہر نکال پھینکنے پر اکتفا نہ کرے گی، بلکہ اُن کی پہلی زندگی کے افعال و اقوال اور حرکات و سکنات کی شہادتوں کا جو انبار اس کی تہوں میں دبا پڑا ہے اُس سب کو بھی وہ نکال کر باہر ڈال دے گی۔ اِس پر بعد کا یہ فقرہ دلالت کرتا ہے کہ زمین اپنے اُوپر گزرے ہوئے حالات بیان کرے گی۔ تیسرا مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ سونا، چاندی، جواہر اور ہر قسم کی دولت جو زمین کے پیٹ میں ہے اس کے بھی ڈھیر کے ڈھیر وہ باہر نکال کر رکھ دے گی اور انسان دیکھے گا کہ یہی ہیں وہ چیزیں جن پر وہ دُنیا میں مرا جاتا تھا، جن کی خاطر اُس نے قتل کیے، حق داروں کے حقوق مارے، چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے، خشکی اور تری میں قزاقیاں کیں، جنگ کے معرکے برپا کیے، اور پوری پوری قوموں کو تباہ کر ڈالا۔ آج وہ سب کچھ سامنے موجود ہے اور اُس کے کسی کام کا نہیں بلکہ اُلٹا اس کے لیے عذاب کا سامان بنا ہوا ہے۔

دوسرے فقرے میں انسان سے مراد ہر انسان بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ زندہ ہو کر ہوش میں آتے ہی پہلا تأثر ہر شخص پر یہی ہوگا کہ آخر یہ کیا ہو رہا ہے، بعد میں اُس پر یہ بات کھلے گی کہ یہ روزِ حشر ہے۔ اور انسان سے مراد آخرت کا منکر انسان بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ جس چیز کو وہ غیر ممکن سمجھتا تھا وہ اس کے سامنے برپا ہو رہی ہوگی اور وہ اس پر حیران و پریشان ہوگا۔ رہے اہلِ ایمان تو اُنہیں کوئی حیرانی و پریشانی نہ ہوگی، اس لیے کہ سب کچھ ان کے عقیدہ و یقین کے مطابق ہو رہا ہوگا۔

تیسرے فقرے میں فرمایا گیا ہے کہ زمین اپنے حالات سنائے گی، کیونکہ اس کے رب نے اسے ایسا کرنے کا حکم دیا ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھ کر پوچھا "جانتے ہو اس کے وہ حالات کیا ہیں؟" لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اُس کے رسُول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا "وہ حالات یہ ہیں کہ زمین ہر بندے اور بندی کے بارے میں اُس عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پیٹھ پر اُس نے کیا ہوگا۔ وہ کہے گی کہ اس نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا۔ یہ ہیں وہ حالات جو زمین بیان کرے گی" (مسند احمد، ترمذی،

نسائی، ابن جریر، عبدبن حمید، ابن المنذر، حاکم، ابن مردویہ، بیہقی فی الشعب) حضرت ربیعۃ الجرشی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "ذرا زمین سے بچ کر رہنا کیونکہ یہ تمہاری جڑ بنیاد ہے اور اس پر عمل کرنے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے عمل کی یہ خبر نہ دے خواہ اچھا ہو یا بُرا" (معجم الطبرانی) حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے روز زمین ہر اُس عمل کو لے آئے گی جو اُس کی پیٹھ پر کیا گیا ہوگا" پھر آپؐ نے یہی آیات تلاوت فرمائیں (ابن مردویہ بیہقی)۔ حضرت علیؓ کے حالات میں لکھا ہے کہ جب آپ بیت المال کا سب روپیہ اہلِ حقوق میں تقسیم کر کے اُسے خالی کر دیتے تو اس میں دو رکعت نماز پڑھتے اور پھر فرماتے "تجھے گواہی دینی ہوگی کہ میں نے تجھ کو حق کے ساتھ بھرا اور حق ہی کے ساتھ خالی کر دیا"۔

زمین کے متعلق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اُوپر گزرے ہوئے سب حالات اور واقعات بیان کرے گی، قدیم زمانے کے آدمی کے لیے تو بڑی حیران کُن ہوگی کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی۔ لیکن آج علوم طبیعی کے انکشافات اور سینما، لاؤڈ سپیکر، ریڈیو، ٹیلیویژن، ٹیپ ریکارڈر، الکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اس دَور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اُس کے نقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں، گھروں کی دیواروں اور اُن کے فرش اور چھت کے ذرّے ذرّے میں، اور اگر کسی سڑک یا میدان یا کھیت میں آدمی نے بات کی ہو تو اُن سب کے ذرّات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے اِن ساری آوازوں کو ٹھیک اُسی طرح ان چیزوں سے دُہروا سکتا ہے جس طرح کبھی وہ انسان کے مُنہ سے نکلی تھیں۔ انسان اپنے کانوں سے اُس وقت سُن لے گا کہ یہ اُس کی اپنی ہی آوازیں ہیں اور اُس کے سب جاننے والے پہچان لیں گے کہ جو کچھ وہ سُن رہے ہیں وہ اُسی شخص کی آواز اور اُسی کا لہجہ ہے۔ پھر انسان نے زمین پر جہاں جس حالت میں بھی کوئی کام کیا ہے اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اُس کے گرد و پیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے اور اس کی تصویر اُن پر نقش ہو چکی ہے۔ بالکل گھُپ اندھیرے میں بھی اُس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شعاعیں موجود ہیں جن کے لیے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں قیامت کے روز ایک متحرک فلم کی طرح انسان کے سامنے آ جائیں گی اور یہ دکھا دیں گی کہ وہ زندگی بھر کس وقت، کہاں کہاں کیا کچھ کرتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر انسان کے اعمال کو براہِ راست خود جانتا ہے، مگر آخرت میں جب وہ عدالت قائم کرے گا تو جس کو بھی سزا دے گا، انصاف کے تمام تقاضے پورے کر کے دے گا۔ اُس کی عدالت میں ہر مجرم انسان کے خلاف جو مقدمہ قائم کیا جائے گا اُس کو ایسی کھُلی شہادتوں سے ثابت کر دیا جائے گا

کہ اُس کے مجرم ہونے میں کسی کلام کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ سب سے پہلے تو وہ نامۂ اعمال ہے جس میں ہر وقت اُس کے ساتھ لگے ہوئے کراماً کاتبین اس کے ایک ایک قول اور فعل کا ریکارڈ درج کر رہے ہیں۔ یہ نامۂ اعمال اُس کے ہاتھ میں دے دیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا کہ "پڑھ اپنا کارنامۂ حیات، اپنا حساب لینے کے لیے تو خود کافی ہے" (بنی اسرائیل۔ ۱۴)۔ انسان اُسے پڑھ کر حیران رہ جائے گا کہ کوئی چھوٹی یا بڑی چیز ایسی نہیں ہے جو اُس میں ٹھیک ٹھیک درج نہ ہو (الکہف۔ ۴۹)۔ اِس کے بعد انسان کا اپنا جسم ہے جس سے اُس نے دنیا میں کام لیا ہے۔ اللہ کی عدالت میں اُس کی اپنی زبان شہادت دے گی کہ اُس سے وہ کیا کچھ بولتا رہا ہے، اس کے اپنے ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے کہ ان سے کیا کیا کام اُس نے لیے (النور ۲۴)۔ اس کی آنکھیں شہادت دیں گی کہ اُن سے اُس نے کیا کچھ دیکھا۔ اس کے کان شہادت دیں گے کہ اُن سے اُس نے کیا کچھ سُنا۔ اس کے جسم کی پوری کھال اس کے افعال کی شہادت دے گی۔ وہ حیران ہو کر اپنے اعضا سے کہے گا کہ تم بھی میرے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ اُس کے اعضا جواب دیں گے کہ آج جس خدا کے حکم سے ہر چیز بول رہی ہے اُسی کے حکم سے ہم بھی بول رہے ہیں (حٰم السجدہ۔ ۲۰ تا ۲۲)۔ اِس پر مزید وہ شہادتیں ہیں جو زمین اور اس کے پورے ماحول سے پیش کی جائیں گی جن میں آدمی اپنی آوازیں خود اپنے کانوں سے سُنے گا اور اپنی حرکات کی ہُو بہُو تصویریں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ اِس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ انسان کے دل میں جو خیالات، ارادے اور مقاصد چھپے ہوئے تھے، اور جن نیتوں کے ساتھ اس نے اعمال کیے تھے وہ بھی نکال کر سامنے رکھ دیے جائیں گے، جیسا کہ سورۂ عادیات میں بیان کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے قطعی اور صریح اور ناقابلِ انکار ثبوت سامنے آجانے کے بعد انسان دم بخود رہ جائے گا اور اُس کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کا موقع باقی نہ رہے گا، جیسا کہ سورۂ المرسلات، آیات ۳۵-۳۶ میں ارشاد ہوا ہے۔ (۱۱۸)

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (الکہف۔ ۴۹)

○ اور نامۂ اعمال سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اُس وقت تم دیکھو گے کہ مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے ڈر رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ "ہائے ہماری کم بختی، یہ کیسی کتاب ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی یا بڑی حرکت ایسی نہیں رہی جو اِس میں درج نہ کی گئی ہو۔" جو جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے حاضر پائیں گے، اور تیرا رب کسی پر ظلم نہ

کرے گا۔"

یعنی ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ کسی نے کوئی جرم نہ کیا ہو اور وہ خواہ مخواہ اُس کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جائے، اور نہ یہی ہوگا کہ آدمی کو اُس کے جرم سے بڑھ کر سزا دی جائے، یا بے گناہ کو پکڑ کر سزا دے ڈالی جائے۔ (۱۱۹)

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ‎﴿٥٢﴾‏ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ (القمر: ۵۲-۵۳)

"جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ سب دفتروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی موجود ہے۔"

یعنی یہ لوگ اِس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں کہ ان کا کیا دھرا کہیں غائب ہو گیا ہے۔ نہیں، ہر شخص، ہر گروہ، اور ہر قوم کا پورا ریکارڈ محفوظ ہے اور اپنے وقت پر وہ سامنے آجائے گا۔ (۱۲۰)

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُم بِمَا عَمِلُوا ۚ أَحْصَاهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۔ (المجادلہ-۶)

"(یہ ذلت کا عذاب ہونا ہے) اُس دن جب اللہ اُن سب کو پھر سے زندہ کرکے اُٹھائے گا اور اُنہیں بتا دے گا کہ وہ کیا کچھ کرکے آئے ہیں۔ وہ بھول گئے ہیں مگر اللہ نے ان کا سب کیا دھرا گِن گِن کر محفوظ کر رکھا ہے اور اللہ ایک ایک چیز پر شاہد ہے۔"

یعنی اُن کے بھول جانے سے معاملہ رفت گذشت نہیں ہوگیا ہے۔ اُن کے لیے خدا کی نافرمانی اور اُس کے احکام کی خلاف ورزی ایسی معمولی چیز ہو سکتی ہے کہ اُس کا ارتکاب کرکے اسے یاد تک نہ رکھیں، بلکہ اسے کوئی قابلِ اعتراض چیز ہی نہ سمجھیں کہ اُس کی کچھ پروا انہیں ہو۔ مگر خدا کے نزدیک یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اُس کے ہاں اُن کا ہر کرتوت نوٹ ہو چکا ہے۔ کس شخص نے، کب، کہاں، کس غرض سے، کیا حرکت کی، اُس حرکت کے بعد اُس کا اپنا ردِّ عمل کیا تھا، اور اس کے کیا نتائج، کہاں کہاں، کس کس شکل میں برآمد ہوئے، یہ سب کچھ اُس کے دفتر میں لکھ لیا گیا ہے۔ (۱۲۱)

الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۔ (یٰس-۶۵)

"آج ہم اُن کے مُنہ بند کیے دیتے ہیں، اُن کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دُنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۔"

یہ حکم اُن ہیکڑ مجرموں کے معاملہ میں دیا جائے گا جو اپنے جرائم کا اقبال کرنے سے انکار کریں گے، گواہیوں

کو بھی جھٹلا دیں گے، اور نامۂ اعمال کی صحت بھی تسلیم نہ کریں گے تب اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ اچھا، اپنی بکواس بند کرو اور دیکھو کہ تمہارے اپنے اعضاء تمہارے کرتوتوں کی کیا رُوداد سناتے ہیں۔ (۱۴۲)

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔

(النور۔۲۴)

"وہ اس دن کو بھول نہ جائیں جبکہ ان کی زبانیں اور اُن کے اپنے ہاتھ پاؤں اُن کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو سُورۂ یٰسٓ کی اُس آیت میں جو پہلے نقل ہوئی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم اُن کے منہ بند کر دیں گے، اور دوسری طرف سُورۃ نُور کی اِس آیت میں فرماتا ہے کہ اُن کی زبانیں گواہی دیں گی۔ اِن دونوں باتوں میں تطابق کیسے ہوگا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ منہ بند کر دینے سے مُراد اُن کا اختیارِ کلام سلب کر لینا ہے، یعنی اس کے بعد وہ اپنی زبان سے اپنی مرضی کے مطابق بات نہ کر سکیں گے۔ اور زبانوں کی شہادت سے مُراد یہ ہے کہ اُن کی زبانیں خود یہ داستان شروع کر دیں گی کہ ہم سے اِن ظالموں نے کیا کام لیا تھا، کیسے کیسے کُفر بکے تھے، کیا کیا جُھوٹ بولے تھے، کیا کیا فتنے برپا کیے تھے اور کس کس موقع پر انہوں نے ہمارے ذریعہ سے کیا باتیں کی تھیں۔ (۱۴۳)

حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ (حٰمٓ السجدہ: ۲۰-۲۱)

"پھر جب سب وہاں پہنچ جائیں گے تو اُن کے کان اور اُن کی آنکھیں اور اُن کے جسم کی کھالیں اُن پر گواہی دیں گی کہ وہ دُنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے "تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟" وہ جواب دیں گی "ہمیں اُسی خدا نے گویائی دی ہے جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔ اُسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اسی کی طرف تم پلٹائے جا رہے ہو۔"

احادیث میں اس کی تشریح یہ آئی ہے کہ جب کوئی ہیکڑ مُجرم اپنے جرائم کا انکار ہی کرتا چلا جائیگا اور تمام شہادتوں کو بھی جھٹلانے پر تُل جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کے جسم کے اعضاء ایک ایک کر کے شہادت دیں گے کہ اُس نے اُن سے کیا کیا کام لیے تھے۔ یہ مضمون حضرت انسؓ، حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور

مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، بزار وغیرہ محدثین نے اِن روایات کو نقل کیا ہے۔

یہ آیت منجملہ اُن بہت سی آیات کے ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عالم آخرت محض ایک رُوحانی عالم نہیں ہوگا بلکہ انسان وہاں دوبارہ اُسی طرح جسم و رُوح کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے جس طرح وہ اب دُنیا میں ہیں، بلکہ اُن کو جسم بھی وہی دیا جائے گا جس میں اب وہ رہتے ہیں۔ وہی تمام اجزا اور جواہر (Atoms) جن سے اُن کے بدن اِس دُنیا میں مرکب تھے، قیامت کے روز جمع کر دیئے جائیں گے اور وہ اپنے اُنہی سابق جسموں کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جن کے اندر رہ کر وہ دُنیا میں کام کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اعضاء وہاں اُسی صورت میں تو گواہی دے سکتے ہیں جبکہ وہ وہی اعضاء ہوں جن سے اُس نے اپنی پہلی زندگی میں جُرم کا ارتکاب کیا تھا، اس مضمون پر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات بھی دلیل قاطع ہیں: بنی اسرائیل، آیات ۴۹ تا ۵۱ - ۹۸ - المومنون، ۳۵ تا ۳۸ - ۸۲ - ۸۳ - النور، ۲۴ - السجدہ، ۱۰ - یٰس، ۶۵ - ۷۸ - ۷۹ - الصافات، ۱۶ تا ۱۸ - الواقعہ، ۴۷ تا ۵۰ - النازعات، ۱۰ تا ۱۴ - (۱۴۳)

إِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ ۝ (یٰس - ۱۲)

"ہم یقیناً ایک روز مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ افعال انہوں نے کیے ہیں وہ سب ہم لکھتے جا رہے ہیں، اور جو کچھ آثار انہوں نے پیچھے چھوڑے ہیں وہ بھی ہم ثبت کر رہے ہیں ہر چیز کو ہم نے ایک کھلی کتاب میں درج کر رکھا ہے"

اِس سے معلوم ہُوا کہ انسان کا نامۂ اعمال تین قسم کے اندراجات پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ ہر شخص جو کچھ بھی اچھا یا بُرا عمل کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے۔ دوسرے، اپنے گردوپیش کی اشیاء اور خود اپنے جسم کے اعضاء پر جو نقوش (Impressions) بھی انسان مُرتسم کرتا ہے وہ سب کے سب ثبت ہو جاتے ہیں، اور یہ سارے نقوش ایک وقت اِس طرح اُبھر آئیں گے کہ اُس کی اپنی آواز سُنی جائے گی، اس کے اپنے خیالات اور نیتوں اور ارادوں کی پُوری داستان اس کی لوحِ ذہن پر لکھی نظر آئے گی اور اس کے ایک ایک اچھے اور بُرے فعل اور اس کی تمام حرکات و سکنات کی تصویریں سامنے آجائیں گی۔ تیسرے، اپنے مرنے کے بعد اپنی آئندہ نسل پر، اپنے معاشرے پر اور پوری انسانیت پر اپنے اچھے اور بُرے اعمال کے جو اثرات وہ چھوڑ گیا ہے وہ جس وقت تک اور جہاں جہاں تک کارفرما رہیں گے وہ سب اس کے حساب میں لکھے جاتے رہیں گے۔ اپنی اولاد کو جو بھی اچھی یا بُری تربیت اُس نے دی ہے، اپنے معاشرے میں جو بھلائیاں یا بُرائیاں بھی اُس نے پھیلائی ہیں، اور انسانیت کے حق میں جو پھول یا کانٹے بھی وہ بو گیا ہے

اُن سب کا پُورا ریکارڈ اُس وقت تک تیار کیا جاتا رہے گا جب تک اس کی لگائی ہُوئی یہ فصل دُنیا میں اپنے اچھے یا بُرے پھل لاتی رہے گی۔ (۱۴۵)

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۗ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔

(الجاثیہ : ۲۸-۲۹)

"اُس وقت تم ہر گروہ کو گھٹنوں کے بل گرا دیکھو گے۔ ہر گروہ کو پکارا جائے گا کہ آئے اور اپنا نامۂ اعمال دیکھے۔ اُن سے کہا جائے گا: "آج تم لوگوں کو اُن اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے رہے تھے۔ یہ ہمارا تیار کرایا ہُوا نامۂ اعمال ہے جو تمہارے اُوپر ٹھیک ٹھیک شہادت دے رہا ہے۔ جو کچھ بھی تم کرتے تھے اسے ہم لکھواتے جا رہے تھے"۔

لکھوانے کی صرف یہی ایک ممکن صورت نہیں ہے کہ کاغذ پر قلم سے لکھوایا جائے۔ انسانی اقوال و افعال کو ثبت کرنے اور دوبارہ اُن کو بعینہٖ اُسی شکل میں پیش کر دینے کی متعدد دوسری صُورتیں اسی دنیا میں خود انسان دریافت کر چکا ہے، اور ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ آگے اس کے اور کیا امکانات پوشیدہ ہیں جو کبھی انسان ہی کی گرفت میں آ جائیں گے۔ اب یہ کون جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کس کس طرح انسان کی ایک ایک بات، اور اس کی حرکات و سکنات میں سے ایک ایک چیز اور اُس کی نیتوں اور ارادوں اور خواہشات اور خیالات میں سے ہر مخفی سے مخفی شے کو ثبت کرا رہا ہے، اور کس طرح وہ ہر آدمی، ہر گروہ اور ہر قوم کا پورا کارنامۂ حیات بے کم و کاست اس کے سامنے لا کر رکھ دے گا۔ (۱۴۶)

وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ؕ (المرسلٰت ۔ ۱۱)

"اور جب رسُولوں کی حاضری کا وقت آ پہنچے گا"۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ میدانِ حشر میں جب نوعِ انسانی کا مقدمہ پیش ہو گا تو ہر قوم کے رسُول کو شہادت کے لیے پیش کیا جائے گا تاکہ وہ اِس امر کی گواہی دے کہ اُس نے اللہ کا پیغام اُن لوگوں تک پہنچا دیا تھا۔ یہ گمراہوں اور مجرموں کے خلاف اللہ کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی حجت ہو گی جس سے یہ ثابت کیا جائے گا کہ وہ اپنی غلط روش کے خود ذمہ دار ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو خبردار کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی گئی تھی۔ مثال کے طور پر حسبِ ذیل مقامات ملاحظہ ہوں: تفہیم القرآن جلد دوم، الاعراف، آیات ۶، ۱۷۲، ۱۷۳۔ حواشی ۱۳۴، ۱۳۵۔ جلد چہارم، الزّمر، آیت ۶۹، حاشیہ ۸۰۔ جلد ششم، المُلک، آیت ۸، حاشیہ ۱۴۔ (۱۴۷)

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِایْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ (الزُّمَر-۶۹)

"اور کتابِ اعمال لا کر رکھ دی جائے گی، انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیے جائیں گے لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا"

انبیاء تو اس امر کی گواہی دیں گے کہ انہوں نے خدا کا پیغام پہنچایا تھا۔ ان کے سوا دوسرے گواہوں سے مراد وہ گواہ بھی ہیں جو اس بات کی شہادت دیں گے کہ انبیاء کے بعد لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا گیا تھا، اور وہ گواہ بھی جو لوگوں کے اعمال کی شہادت پیش کریں گے۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ گواہ صرف انسان ہی ہوں۔ فرشتے اور جن اور حیوانات، اور انسانوں کے اپنے اعضاء اور در و دیوار اور شجر و حجر، سب اُن گواہوں میں شامل ہوں گے۔ (۱۲۸)

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (العٰدیٰت: ۹-۱۰)

"تو کیا وہ اُس وقت کو نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ (مدفون) ہے اُسے نکال لیا جائے گا، اور سینوں میں جو کچھ (مخفی) ہے اُسے برآمد کر کے اُس کی جانچ پڑتال کی جائے گی؟"

یعنی مرے ہوئے انسان جہاں جس حالت میں بھی پڑے ہوں گے وہاں سے اُن کو نکال کر زندہ انسانوں کی شکل میں اٹھالایا جائے گا۔ اور دلوں میں جو ارادے اور نیتیں، جو اغراض و مقاصد، جو خیالات و افکار اور ظاہری افعال کے پیچھے جو محرکات (Motives) چھپے ہوئے ہوں گے وہ سب کھول کر رکھ دیے جائیں گے۔ اور اُن کی جانچ پڑتال کر کے اچھائی کو الگ اور برائی کو الگ چھانٹ دیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر فیصلہ صرف ظاہر ہی کو دیکھ کر نہیں کیا جائے گا کہ انسان نے عملاً کیا کچھ کیا، بلکہ دلوں میں چھپے ہوئے راز کو بھی نکال کر یہ دیکھا جائے گا کہ جو کام انسان نے کیے وہ کس نیت سے اور کس غرض سے کیے۔ اس بات پر اگر غور کیا جائے تو انسان یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اصلی اور مکمل انصاف خدا کی عدالت کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے لادینی قوانین بھی اصولی حیثیت سے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ کسی شخص کے محض ظاہری فعل کی بنا پر اُسے سزا نہ دی جائے بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ اس نے کس نیت سے وہ فعل کیا ہے۔ لیکن دنیا کی کسی عدالت کے پاس بھی وہ ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ نیت کی ٹھیک ٹھیک تحقیق کر سکے۔ یہ صرف اور صرف خدا ہی کر سکتا ہے کہ انسان کے ہر ظاہری فعل کے پیچھے جو باطنی محرکات کارفرما رہے ہیں اُن کی بھی جانچ پڑتال کرے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ وہ کس جزا یا سزا کا مستحق ہے۔ پھر آیت کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ محض اللہ کے اُس علم کی بنا پر نہیں ہوگا جو وہ دلوں کے ارادوں اور نیتوں کے متعلق پہلے ہی سے رکھتا ہے، بلکہ قیامت کے

روز ان رازوں کو کھول کر علانیہ سامنے رکھ دیا جائے گا اور کھلی عدالت میں جانچ پڑتال کر کے یہ دیکھا جائے گا کہ ان میں خیر کیا تھی اور شر کیا تھا۔ اسی لیے مُحصّل مَافِی الصُّدُوْرِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ تحصیل کے معنی کسی چیز کو نکال کر باہر لانے کے بھی ہیں، مثلاً چھلکا اتار کر مغز نکالنا۔ اور مختلف چیزوں کو چھانٹ کر ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ لہٰذا دلوں کے اسرار کی تحصیل میں یہ دونوں معنی شامل ہیں۔ ان کو کھول کر ظاہر کر دینا بھی اور ان کو چھانٹ کر برائی اور بھلائی کو الگ کر دینا بھی (۱۲۹)

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ، وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔

(الطارق: ۹-۱۴)

"جس روز پوشیدہ اسرار کی جانچ پڑتال ہوگی اُس وقت انسان کے پاس نہ خود اپنا کوئی زور ہوگا اور نہ کوئی اس کی مدد کرنے والا ہوگا۔ قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی اور (نباتات اُگتے وقت) پھٹ جانے والی زمین کی، یہ ایک جچی تلی بات ہے، ہنسی مذاق نہیں ہے۔"

پوشیدہ اسرار سے مُراد ہر شخص کے وہ اعمال بھی ہیں جو دُنیا میں ایک راز بن کر رہ گئے، اور وہ معاملات بھی ہیں جو اپنی ظاہری صورت میں تو دُنیا کے سامنے آئے مگر اُن کے پیچھے جو نیتیں اور اغراض اور خواہشات کام کر رہی تھیں، اُن کے جو باطنی محرکات تھے، اُن کا حال لوگوں سے چھپا رہ گیا۔ قیامت کے روز یہ سب کچھ کھل کر سامنے آ جائے گا اور جانچ پڑتال صرف اِسی بات کی نہیں ہوگی کہ کس شخص نے کیا کچھ کیا، بلکہ اس بات کی بھی ہوگی کہ کس وجہ سے کیا، کس غرض اور کس نیت اور کس مقصد سے کیا۔ اسی طرح یہ بات بھی ساری دُنیا سے، حتیٰ کہ ایک فعل کرنے والے انسان سے بھی مخفی رہ گئی ہے کہ جو فعل اس نے کیا اُس کے کیا اثرات دُنیا میں ہوئے، کہاں کہاں پہنچے اور کتنی مدت تک چلتے رہے۔ یہ راز بھی قیامت ہی کے روز کھلے گا اور اس کی پوری جانچ پڑتال ہوگی کہ جو بیج کوئی شخص دنیا میں بو گیا تھا اس کی فصل کس کس شکل میں کب تک کٹتی رہی اور کون کون اسے کاٹتا رہا۔

آخری فقروں کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آسمان سے بارشوں کا برسنا اور زمین کا شق ہو کر نباتات اپنے اندر سے اُگلنا کوئی مذاق نہیں ہے بلکہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے، اُسی طرح قرآن جس چیز کی خبر دے رہا ہے کہ انسان کو پھر اپنے خدا کی طرف پلٹنا ہے، یہ بھی کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے بلکہ ایک دوٹوک بات ہے، ایک سنجیدہ حقیقت ہے، ایک اٹل قول حق ہے جسے پورا ہو کر رہنا ہے۔ (۱۳۰)

يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝ (القیامہ۔ ۱۳ تا ۱۵)

"اُس روز انسان کو اُس کا سب اگلا پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا۔ بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے۔"

اصل الفاظ ہیں بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں، اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک معنی اس کے یہ ہیں کہ آدمی کو اُس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دُنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کما کر اُس نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجی تھی اور یہ حساب بھی اُس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا بُرے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا جو اُس کے بعد مدتہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اُسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اُسے کرنا چاہیے تھا مگر اس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہ کرنا چاہیے تھا وہ اُس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اُس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا اُس کا پورا حساب تاریخ وار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنی یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اُس نے کی وہ بھی اُسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اُس سے بھی اُسے آگاہ کر دیا جائے گا۔

مگر آدمی کا نامۂ اعمال اُس کے سامنے رکھنے کی غرض درحقیقت یہ نہیں ہوگی کہ مجرم کو اُس کا جرم بتایا جائے، بلکہ ایسا کرنا تو اِس وجہ سے ضروری ہوگا کہ انصاف کے تقاضے برسرِ عدالت جُرم کا ثبوت پیش کیے بغیر پُورے نہیں ہوتے۔ ورنہ ہر انسان خوب جانتا ہے کہ وہ خود کیا ہے۔ اپنے آپ کو جاننے کے لیے وہ اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ اسے کوئی دوسرا بتائے کہ وہ کیا ہے۔ ایک جھوٹا دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے لیکن اُسے خود تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک چور لاکھ حیلے اپنی چوری چھپانے کے لیے اختیار کر سکتا ہے، مگر اس کے اپنے نفس سے تو یہ بات مخفی نہیں ہوتی کہ وہ چور ہے۔ ایک گمراہ آدمی ہزار دلیلیں پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ جس کُفر یا دہریت یا شرک کا قائل ہے وہ درحقیقت اُس کی ایماندارانہ رائے ہے، لیکن اس کا اپنا ضمیر تو اس سے بے خبر نہیں ہوتا کہ اِن عقائد پر وہ کیوں جما ہوا ہے اور اِن کی غلطی سمجھنے اور تسلیم کرنے سے دراصل کیا چیز اُسے روک رہی ہے۔ ایک ظالم، ایک بدنیت، ایک بدکردار، ایک حرام خور اپنی بداعمالیوں کے لیے طرح طرح کی معذرتیں پیش کر کے خود اپنے ضمیر تک کا منہ بند کرنے کی کوشش کر سکتا ہے تاکہ وہ اسے ملامت کرنے سے باز آ جائے اور یہ مان لے کہ واقعی کچھ مجبوریاں، کچھ مصلحتیں، کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ یہ سب کچھ کر رہا ہے، لیکن اس کے باوجود

اُس کو یہ علم تو بجائے خود حاصل ہوتا ہی ہے کہ اس نے کس پر کیا ظلم کیا ہے، کس کا حق مارا ہے، کس کی عصمت خراب کی ہے، کس کو دھوکا دیا ہے، اور کن ناجائز طریقوں سے کیا کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے آخرت کی عدالت میں پیش ہوتے وقت ہر کافر، ہر منافق، ہر فاسق و فاجر اور مجرم خود جانتا ہوگا کہ وہ کیا کر کے آیا ہے اور کس حیثیت میں آج اپنے خدا کے سامنے کھڑا ہے۔ (۱۳۱)

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى (النازعات: ۳۴-۳۵)

"پھر جب وہ ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا، اُس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا۔"

یعنی جب انسان دیکھ لے گا کہ وہی محاسبے کا دن آ گیا ہے جس کی اُسے دنیا میں خبر دی جا رہی تھی، تو قبل اس کے کہ اُس کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے، اُسے ایک ایک کر کے خود ہی اپنی وہ سب حرکتیں یاد آنے لگیں گی جو وہ دُنیا میں کر کے آیا ہوگا۔ بعض لوگوں کو اسی دُنیا میں یہ تجربہ ہوتا ہے کہ جب یکایک وہ کسی ایسے خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں جس سے موت اُن کو بالکل قریب کھڑی نظر آنے لگتی ہے تو اپنی پوری زندگی کی فلم اُن کی چشمِ تصور کے سامنے یک لخت پھر جاتی ہے۔ (۱۳۲)

وَجِایْٓءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۝ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِىْ ۝ (الفجر: ۲۳-۲۴)

"اور جہنم اُس روز سامنے لے آئی جائے گی، اُس دن انسان کو سمجھ آئے گی، حالانکہ اُس وقت اُس کے سمجھنے کا کیا حاصل! وہ کہے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ پیشگی سامان کیا ہوتا۔"

اصل الفاظ ہیں يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس روز انسان یاد کرے گا کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کر کے آیا ہے اور اس پر نادم ہوگا، مگر اُس وقت یاد کرنے اور نادم ہونے کا کیا فائدہ۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اُس روز انسان کو ہوش آئے گا، اُسے نصیحت حاصل ہوگی، اُس کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ جو کچھ اُسے انبیاء نے بتایا تھا وہی صحیح تھا اور اُن کی بات نہ مان کر اُس نے حماقت کی، مگر اُس وقت ہوش میں آنے اور نصیحت پکڑنے اور اپنی غلطی کو سمجھنے کا کیا فائدہ؟ (۱۴۳)

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۔ (الانفطار-۵)

"اُس وقت ہر شخص کو اُس کا اگلا پچھلا سب کیا دھرا معلوم ہو جائے گا۔"

اصل الفاظ ہیں مَا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ۔ ان الفاظ کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور وہ سب ہی یہاں مراد ہیں۔ مثلاً:

۱ - جو اچھا یا بُرا عمل آدمی نے کر کے آگے بھیج دیا وہ مَا قَدَّمَتْ ہے اور جس کے کرنے سے وہ باز رہا وہ مَا اَخَّرَتْ - اِس لحاظ سے یہ الفاظ تقریباً انگریزی زبان کے الفاظ commission اور Ommission کے ہم معنی ہیں -

۲ - جو کچھ پہلے کیا وہ مَا قَدَّمَتْ ہے اور جو کچھ بعد میں کیا وہ مَا اَخَّرَتْ یعنی آدمی کا پُورا نامۂ اعمال ترتیب وار اور تاریخ وار اس کے سامنے آجائے گا -

۳ - جو اچھے اور بُرے اعمال آدمی نے اپنی زندگی میں کیے وہ مَا قَدَّمَتْ ہیں اور ان اعمال کے جو آثار و نتائج وہ انسانی معاشرے میں اپنے پیچھے چھوڑ گیا وہ مَا اَخَّرَتْ - (۱۴۴)

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۙ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۙ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۔ (زلزال: ۶تا۸)

" اُس روز لوگ متفرق حالت میں پلٹیں گے تاکہ اُن کے اعمال اُن کو دکھائے جائیں۔ پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا "

پچھلے فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر ایک اکیلا اپنی انفرادی حیثیت میں ہوگا۔ خاندان، جتھے، پارٹیاں، قومیں، سب بکھر جائیں گی۔ یہ بات قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بھی فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سُورۂ اَنعام میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس روز لوگوں سے فرمائے گا کہ " لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے پہلی مرتبہ تمہیں پیدا کیا تھا " (آیت ۹۴)۔ اور سورۂ مریم میں فرمایا " یہ اکیلا ہمارے پاس آئے گا " (آیت ۸۰)۔ اور یہ کہ " اُن میں سے ہر ایک قیامت کے روز اللہ کے حضور اکیلا حاضر ہوگا " (آیت ۹۵)۔ دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جو ہزارہا برس کے دوران میں جگہ جگہ مرے تھے، زمین کے گوشے گوشے سے گروہ در گروہ چلے آ رہے ہوں گے، جیسا کہ سورۂ نَبَا میں فرمایا گیا ہے کہ " جس روز صُور میں پھونک مار دی جائے گی تم فوج در فوج آجاؤ گے " (آیت ۱۸)۔

اُن کو اُن کے اعمال دکھائے جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہر نیک و بد کو اس کا نامۂ اعمال دے دیا جائے گا تاکہ وہ دیکھ لے کہ وہ دُنیا میں کیا کر کے آیا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کی تصریح فرمائی گئی ہے کہ کافر و مومن، صالح و فاسق، تابع فرمان اور نافرمان، سب کو ان کے نامۂ اعمال دیئے ضرور جائیں گے (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الحاقّہ، آیات ۱۹، ۲۵، اور الانشقاق، آیات ۷-۱۰)۔ ظاہر ہے کہ کسی کو اس کے اعمال دکھانے اور اس کا نامۂ اعمال اُس کے حوالے کرنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علاوہ بریں زمین جب اپنے اوپر گزرے

ہوتے حالات پیش کرے گی تو حق و باطل کی وہ کشمکش جو ابتدا سے برپا ہے اور قیامت تک برپا رہے گی اُس کا پورا نقشہ بھی سب کے سامنے آ جائے گا، اور اس میں سب ہی دیکھ لیں گے کہ حق کے لیے کام کرنے والوں نے کیا کچھ کیا، اور باطل کی حمایت کرنے والوں نے ان کے مقابلے میں کیا کیا حرکتیں کیں۔ بعید نہیں کہ ہدایت کی طرف بلانے والوں اور ضلالت پھیلانے والوں کی ساری تقریریں اور گفتگوئیں لوگ اپنے کانوں سے سُن لیں۔ دونوں طرف کی تحریریں اور لٹریچر کا پورا ریکارڈ جُوں کا توں سب کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے۔ حق پرستوں پر باطل پرستوں کے ظلم، اور دونوں گروہوں کے درمیان برپا ہونے والے معرکوں کے سارے مناظر میدانِ حشر کے حاضرین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

پھر یہ ارشاد کہ جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا، اِس کا ایک سیدھا سادھا مطلب تو یہ ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ آدمی کی کوئی ذرّہ برابر نیکی یا بدی بھی ایسی نہیں ہوگی جو اس کے نامۂ اعمال میں درج ہونے سے رہ گئی ہو۔ اُسے وہ بہرحال دیکھ لے گا لیکن اگر دیکھنے سے مُراد اُس کی جزا و سزا دیکھنا لیا جائے تو اس کا یہ مطلب لینا بالکل غلط ہے کہ آخرت میں ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی کی جزا اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بدی کی سزا ہر شخص کو الگ الگ دی جائیگی۔ اور کوئی شخص بھی وہاں اپنی کسی نیکی کی جزا اور کسی بدی کی سزا پانے سے نہ بچے گا کیونکہ اوّل تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ایک ایک بُرے عمل کی سزا اور ایک ایک اچھے عمل کی جزا الگ دی جائیگی۔ دوسرے اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا صالح مومن بھی اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے قصور کی سزا پانے سے نہ بچے گا اور کوئی بدترین کافر و ظالم اور بدکار انسان بھی اپنے کسی چھوٹے سے چھوٹے اچھے فعل کا اجر پائے بغیر نہ رہے گا۔ یہ دونوں معنی قرآن اور حدیث کی تصریحات کے بھی خلاف ہیں اور عقل بھی اسے نہیں مانتی کہ یہ تقاضائے انصاف ہے۔ عقل کے لحاظ سے دیکھیے تو یہ بات آخر کیسے سمجھ میں آنے کے قابل ہے کہ آپ کا کوئی خادم نہایت وفادار اور خدمت گزار ہو، لیکن آپ اس کے کسی چھوٹے سے چھوٹے قصور کو بھی معاف نہ کریں، اور اس کی ایک ایک خدمت کا اجر و انعام دینے کے ساتھ اس کے ایک ایک قصور کو گن گن کر ہر ایک کی سزا بھی اسے دے ڈالیں۔ اسی طرح یہ بھی عقلاً ناقابلِ فہم ہے کہ آپ کا پروردہ کوئی شخص جس پر آپ کے بے شمار احسانات ہوں، وہ آپ سے غدّاری اور بے وفائی کرے اور آپ کے احسانات کا جواب ہمیشہ نمک حرامی ہی سے دیتا رہے، مگر آپ اُس کے مجموعی رویّے کو نظر انداز کر کے اس کی ایک ایک غدّاری کی الگ سزا اور اُس کی ایک ایک خدمت کی، خواہ وہ کسی وقت پانی لا کر دے دینے یا پنکھا جھل دینے ہی کی خدمت ہو، الگ جزا دیں۔ اب رہے قرآن و حدیث، تو وہ وضاحت کے ساتھ مومن، منافق، کافر، مومنِ صالح، مومنِ خطاکار، مومنِ ظالم و فاسق، محض کافر، اور کافرِ مُفسد و ظالم وغیرہ مختلف قسم کے لوگوں کی جزا و سزا کا ایک مفصل قانون بیان کرتے ہیں اور یہ جزا و سزا دنیا سے آخرت تک

انسان کی پُوری زندگی پر حاوی ہے۔

اِس سلسلے میں قرآن مجید اصُولی طور پر چند باتیں بالکل وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے:

اوّل یہ کہ کافر، مُشرک اور منافق کے اعمال (یعنی وہ اعمال جن کو نیکی سمجھا جاتا ہے) ضائع کر دیے گئے، آخرت میں وہ اُن کا کوئی اجر نہیں پا سکیں گے۔ ان کا اگر کوئی اجر ہے بھی تو وہ دنیا ہی میں اُن کو مل جائے گا۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو الاعراف ۱۴۷۔ التوبہ ۱۷-۶۹ تا ۹۹۔ ہود ۱۵-۱۶۔ ابراہیم ۱۸۔ الکہف ۱۰۴-۱۰۵۔ النُّور ۳۹۔ الفرقان ۲۳۔ الاحزاب ۱۹۔ الزُّمر ۶۵۔ الاحقاف ۲۰۔

دوم: یہ کہ بدی کی سزا اُتنی ہی دی جائے گی جتنی بدی کی گئی ہو، مگر نیکیوں کی جزا اصل فعل سے زیادہ دی جائے گی، بلکہ کہیں تصریح ہے کہ ہر نیکی کا اجر اس سے دس گنا ہے، اور کہیں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ جتنا چاہے نیکی کا اجر بڑھا کر دے۔ ملاحظہ ہو۔ البقرہ ۲۶۱۔ الانعام ۱۶۰۔ یُونس ۲۶-۲۷۔ النُّور ۳۸۔ القصص ۸۴۔ سبا ۳۷۔ المومن ۴۰۔

سوم: یہ کہ مومن اگر بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کریں گے تو اُن کے چھوٹے چھوٹے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ النساء ۳۱۔ الشُّوریٰ ۳۷۔ النجم ۳۲۔

چہارم: یہ کہ مومن صالح سے ہلکا حساب لیا جائے گا، اس کی بُرائیوں سے درگذر کیا جائے گا، اور اس کے بہترین اعمال کے لحاظ سے اس کو اجر دیا جائے گا۔ العنکبوت ۷۔ الزُّمر ۳۵۔ الاحقاف ۱۶۔ الانشقاق ۸۔

احادیث بھی اِس معاملہ کو بالکل صاف کر دیتی ہیں۔ ہم سُورۂ انشقاق کی تفسیر میں وہ احادیث نقل کر چکے ہیں جو قیامت کے روز ہلکے حساب اور سخت حساب فہمی کی تشریح کرتے ہُوئے حضورؐ نے فرمائی ہیں (تفہیم القرآن، جلد ششم، الانشقاق، حاشیہ ۶)۔ حضرت اَنسؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیقؓ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ اِتنے میں یہ آیت نازل ہُوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور عرض کیا "یا رسُول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلّم)، کیا مَیں اُس ذرّہ برابر بُرائی کا نتیجہ دیکھوں گا جو مجھ سے سرزد ہُوئی؟" حضورؐ نے فرمایا "اے ابوبکرؓ، دنیا میں جو معاملہ بھی تمہیں ایسا پیش آتا ہے جو تمہیں ناگوار ہو، وہ اُن ذرّہ برابر بُرائیوں کا بدلہ ہے جو تم سے صادر ہوں، اور جو ذرّہ برابر نیکیاں بھی تمہاری ہیں، انہیں اللہ آخرت میں تمہارے لیے محفوظ رکھ رہا ہے" (ابن جریر، ابن ابی حاتم، طَبرانی فی الاَوسط، بَیہقی فی الشُّعَب، ابن المُنذِر، حاکم، ابن مَرْدُوْیَہ، عَبْد بن حُمَیْد)۔

حضرت ابُو ایّوب انصاریؓ سے بھی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اِس آیت کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ "تم میں سے جو شخص نیکی کرے گا، اس کی جزا آخرت میں ہے، اور جو کسی قسم کی بدی کرے گا وہ اِسی

دُنیا میں اُس کی سزا مصائب اور امراض کی شکل میں بھگت لے گا" (ابن مردویہ)۔ قتادہ نے حضرت انسؓ کے حوالہ سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ مومن پر ظلم نہیں کرتا۔ دُنیا میں اس کی نیکیوں کے بدلے وہ رزق دیتا ہے۔ اور آخرت میں اُن کی جزا دے گا۔ رہا کافر تو دنیا میں اُس کی بھلائیوں کا بدلہ چُکا دیا جاتا ہے، پھر جب قیامت ہوگی، تو اُس کے حساب میں کوئی نیکی نہ ہوگی"۔ (ابن جریر)۔ مسروق حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پُوچھا کہ "عبداللہ بن جُدعان جاہلیت کے زمانہ میں صلۂ رحمی کرتا تھا، مسکین کو کھانا کھلاتا تھا، مہمان نواز تھا، اسیروں کو رہائی دلواتا تھا۔ کیا آخرت میں یہ اُس کے لیے نافع ہوگا؟" حضورؐ نے فرمایا "نہیں، اُس نے مرتے دم تک کبھی یہ نہیں کہا کہ رَبِّ اغْفِرْلِیْ خَطِیْئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ "میرے پروردگار، روزِ جزا میں میری خطا معاف کیجیو"۔ (ابن جریر)۔ اسی طرح کے جوابات رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اور لوگوں کے بارے میں بھی دیے ہیں جو جاہلیت کے زمانے میں نیک کام کرتے تھے، مگر مرے کفر و شرک ہی کی حالت میں تھے۔ لیکن حضورؐ کے بعض ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کی نیکی اُسے جہنّم کے عذاب سے تو نہیں بچا سکتی، البتہ جہنّم میں اُس کو وہ سخت سزا نہ دی جائے گی جو ظالم اور فاسق اور بدکار کافروں کو دی جائے گی۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ حاتم طائی کی سخاوت کی وجہ سے اُس کو ہلکا عذاب دیا جائے گا۔ (رُوح المعانی)

تاہم یہ آیت انسان کو ایک بہت اہم حقیقت پر متنبّہ کرتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی اپنا ایک وزن اور اپنی ایک قدر رکھتی ہے، اور یہی حال بدی کا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی حساب میں آنے والی چیز ہے، یونہی نظر انداز کر دینے والی چیز نہیں ہے۔ اِس لیے کسی چھوٹی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر اُسے چھوڑنا نہیں چاہیے، کیونکہ ایسی بہت سی نیکیاں مل کر اللہ تعالیٰ کے حساب میں ایک بہت بڑی نیکی قرار پا سکتی ہیں، اور کسی چھوٹی سے چھوٹی بدی کا ارتکاب بھی نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح کے بہت سے چھوٹے گناہ مل کر گناہوں کا ایک انبار بن سکتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ بخاری و مُسلم میں حضرت عدیؓ بن حاتم سے یہ روایت منقول ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "دوزخ کی آگ سے بچو خواہ وہ کھجور کا ایک ٹکڑا دینے یا ایک اچھی بات کہنے ہی کے ذریعہ سے ہو"۔ انہی حضرت عدیؓ سے صحیح روایت میں حضورؐ کا یہ قول نقل ہُوا ہے کہ "کسی نیک کام کو بھی حقیر نہ سمجھو، خواہ وہ کسی پانی مانگنے والے کے برتن میں ایک ڈول ڈال دینا ہو، یا یہی نیکی ہو کہ تم اپنے کسی بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملو"۔ بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا "اے مسلمان عورتو، کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے ہاں کوئی چیز بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے خواہ وہ بکری کا ایک کھُر ہی کیوں نہ ہو"۔ مسند احمد،

نسائی، اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ فرمایا کرتے تھے "اے عائشہ، اُن گناہوں سے بچی رہنا جن کو چھوٹا سمجھا جاتا ہے کیونکہ اللہ کے ہاں اُن کی پرسش بھی ہونی ہے" مُسند احمد میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "خبردار، چھوٹے گناہوں سے بچ کر رہنا، کیونکہ وہ سب آدمی پر جمع ہو جائیں گے، یہاں تک کہ اسے ہلاک کر دیں گے۔" (۱۳۵)

آخرت میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔

آخری اہم بات جو قرآن مجید نے آخرت کے سلسلے میں بتائی وہ یہ تھی کہ وہاں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوگی، کجا کہ کسی کو اپنے باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، شوہر، دوست یا مُرید اور پیر کو بچانے کی فکر ہو۔ ہر شخص اپنے اعمال کا بوجھ خود اُٹھائے گا، کوئی نہ کسی کا بوجھ رتی برابر بھی اُٹھانے کے لیے تیار ہوگا، اور نہ خدا کا انصاف یہ گوارا کرے گا کہ ایک کا بارِ گناہ دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ فیصلہ اُس وقت بالکل اللہ رب العالمین کے ہاتھ میں ہوگا جو مالک یوم الدین ہے۔ اُس دربار میں بولنے کا یارا کسی کو نہ ہوگا اِلّا یہ کہ اللہ خود اجازت دے اور عرض کرنے والا شخص ٹھیک بات کہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ؕ (الفاطر:۱۸)

"کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔ اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اُٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصہ بھی بٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔"

"بوجھ" سے مُراد اعمال کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ہاں ہر شخص اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، اور ہر ایک پر صرف اُس کے اپنے ہی عمل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اِس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ایک شخص کی ذمہ داری کا بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ اور نہ یہی ممکن ہے کہ کوئی شخص دوسرے کی ذمہ داری کا بار خود اپنے اُوپر لے لے اور اُسے بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس کے جرم میں پکڑوا دے۔ یہ بات یہاں اس بنا پر فرمائی گئی تھی کہ مکہ معظمہ میں جو لوگ اسلام قبول کر رہے تھے اُن سے اُن کے مشرک رشتہ دار اور برادری کے لوگ کہتے تھے کہ تم ہمارے کہنے سے اس نئے دین کو چھوڑ دو اور دینِ آبائی پر قائم رہو، عذاب ثواب ہماری گردن پر۔

پہلے فقرے میں اللہ کے قانونِ عدل کا بیان ہے کہ وہ ایک کے گناہ میں دوسرے کو نہ پکڑے گا، بلکہ ہر ایک کو اُس کے اپنے ہی گناہ کا ذمہ دار ٹھیرائے گا۔ اور بعد کے فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو

لوگ آج یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم ہماری ذمہ داری پر کفر و معصیت کا ارتکاب کرو، قیامت کے روز ہم تمہارا بارِ گناہ اپنے اوپر لے لیں گے، وہ دراصل محض ایک جھوٹا بھروسہ دلا رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی اور لوگ دیکھ لیں گے کہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں تو ہر ایک کو اپنی پڑ جائے گی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے منہ موڑ لے گا۔ اور کوئی کسی کا ذرہ برابر بوجھ بھی اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ (۱۳۹)

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۔ (عبس: ۳۴ تا ۳۷)

"اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ اُن میں سے ہر شخص پر اُس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اُسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا۔"

بھاگنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اُن عزیزوں کو جو دنیا میں اُسے سب سے زیادہ پیارے تھے مصیبت میں مبتلا دیکھ کر، بجائے اس کے کہ اُن کی مدد کو دوڑے، اُلٹا اُن سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اُسے مدد کے لیے نہ پکار بیٹھیں۔ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں خدا سے بے خوف اور آخرت سے غافل ہو کر یہ سب جس طرح ایک دوسرے کی خاطر گناہ کرتے اور ایک دوسرے کو گمراہ کرتے رہے، اُس کے بُرے نتائج سامنے آتے دیکھ کر اُن میں سے ہر ایک دوسرے سے بھاگے گا کہ کہیں وہ اپنی گمراہیوں اور گناہگاریوں کی ذمہ داری اُس پر نہ ڈالنے لگے۔ بھائی کو بھائی سے، اولاد کو ماں باپ سے، شوہر کو بیوی سے، اور ماں باپ کو اولاد سے خطرہ ہوگا کہ یہ کم بخت اب ہمارے خلاف مقدمے کے گواہ بننے والے ہیں۔ (۱۴۰)

وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ○ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ○ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ○ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ○ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ ۔ (المعارج: ۱۰ تا ۱۴)

"اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا، اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔"

یعنی ایسا نہ ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں رہے ہوں گے اس لیے نہ پوچھیں گے۔ بلکہ ہر ایک اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوگا کہ دوسرے پر کیا بن رہی ہے اور پھر وہ اسے نہ پوچھے گا کیونکہ اس کو اپنی ہی پڑی ہوگی۔

اس کے برعکس وہ چاہے گا کہ ان سب کو فدیہ میں دے کر خود چھوٹ جائے۔ (۱۳۸)

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ۔ (المؤمن - ۱۸)

"ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔"

ظالم سے مراد ہر وہ شخص ہے جس نے حق پر ظلم کر کے ناحق اور ناراستی کا طریقہ اختیار کیا ہو۔ حمیم سے مراد کسی شخص کا ایسا دوست ہے جو اس کو پٹتے دیکھ کر جوش میں آتے اور اُسے بچانے کے لیے دوڑے۔ آخری بات بر سبیل تنزل کفار کے عقیدۂ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے۔ حقیقت میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہوگا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کرنے کی اجازت اگر مل بھی سکتی ہے تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے، اور اللہ کے نیک بندے کبھی کافروں اور مشرکوں اور فساق و فجار کے دوست نہیں ہو سکتے کہ وہ انہیں بچانے کے لیے سفارش کا خیال بھی کریں لیکن چونکہ کفار و مشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعموم یہ عقیدہ رہا ہے، اور آج بھی ہے، کہ ہم جن بزرگوں کے دامن گرفتہ ہیں وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے بلکہ اڑ کر کھڑے ہو جائیں گے اور ہم کو بخشوا کر ہی چھوڑیں گے، اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے، اور جس کی سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔ (۱۳۹)

يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ (النبأ - ۳۸)

"وہ دن جبکہ روح (جبریلؑ) اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے، کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جس کو رحمان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔"

یعنی میدان حشر میں دربار الٰہی کے رعب کا یہ عالم ہوگا کہ اہل زمین ہوں یا اہل آسمان، کسی کی بھی یہ مجال نہ ہوگی کہ از خود اللہ تعالیٰ کے حضور زبان کھولے، یا عدالت کے کام میں مداخلت کر سکے۔ بولنے سے مراد شفاعت ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی۔ ایک یہ کہ جس شخص کو کسی گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وہی شخص اُسی شخص کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ شفاعت کرنے والا بجا اور درست بات کہے، بے جا نوعیت کی سفارش نہ کرے۔ اس میں مزید ایک شرط یہ بھی نکلتی ہے کہ جس کے معاملہ میں وہ سفارش کرے وہ دنیا میں کم از کم کلمۂ حق کا قائل رہا ہو یعنی محض گنہگار ہو، کافر نہ ہو۔ (۱۴۰)

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ۔ (الانفطار - ۱۹)

"یہ وہ دن ہے جب کسی شخص کے لیے کچھ کرنا کسی کے بس میں نہ ہوگا اور فیصلہ اُس دن بالکل

اللہ کے اختیار میں ہوگا"۔

خلاصۂ بحث

یہ تھا دعوتِ اسلامی کا چوتھا نکتہ جس کو اس زور کے ساتھ، اس معقول انداز میں، اتنی وضاحت سے پیش کیا گیا کہ اُس کے سامنے کفار کے محض ٹھٹھے، اور یہ احمقانہ مطالبے کہ تم اٹھالاؤ ہمارے باپ دادا کو، کسی طرح ٹھیر نہ سکتے تھے۔ جو لوگ اپنی اغراض اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے لڑ رہے تھے، اور جن کو بہرحال لڑنا ہی تھا، اُن کو چھوڑ کر ہر ذی ہوش آدمی یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آخرت کا برپا ہونا نہ امکان سے خارج ہے، نہ عقل کے خلاف ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ خدا کے سامنے جواب دہی کے احساس سے خالی ہو کر دنیا میں انسان کا طرزِ عمل حق اور انصاف کے مستقل اصولوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو سکے، اور نہ انسان کو حقیقی اور مکمل انصاف اس کے سوا کسی اور طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ موجودہ نظامِ عالم ختم ہونے کے بعد قیامت اور حشر برپا ہو، تمام اگلی پچھلی نسلوں کو جمع کر کے مالکِ کائنات کے سامنے پیش کیا جائے، اور بالکل بے لاگ طریقے سے ہر شخص کی ذمہ داری مشخص کر کے جزا یا سزا جس کا بھی وہ مستحق ہو اُسے دی جائے۔ (۱۴۱)

فصل پنجم

اخلاقی تعلیمات

دعوتِ اسلامی نے یہ عقائد اپنے مدلل اور مؤثر طریقے سے پیش کرنے کے ساتھ اخلاق کا بھی ایک نہایت واضح تصور لوگوں کے سامنے رکھ دیا جس سے قرآن کے سننے اور پڑھنے والے ہر شخص کو صاف صاف معلوم ہو گیا کہ اسلام کس قسم کے اخلاق پسند اور کس قسم کے ناپسند کرتا ہے۔ انسانیت کا کونسا نمونہ اس کے نزدیک بُرا ہے جسے وہ بدلنا اور مٹانا چاہتا ہے اور کونسا نمونہ اچھا ہے جسے وہ تیار کرنا، پروان چڑھانا اور فروغ دینا چاہتا ہے۔ برائی اُس کی نگاہ میں کیا ہے، کیا اُس کے پیدا ہونے کے اسباب ہیں، کیا شکلیں وہ انسانی زندگی میں اختیار کرتی ہے، اور کیا چیزیں اسے نشوونما دیتی ہیں۔ اس کے برعکس بھلائی اس کی نظر میں کیا ہے، کیا چیز اس کا سرچشمہ ہے، کس طرح اُس کے ظہور کی راہیں کھلتی ہیں، اور کن شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ اس نے بتایا کہ

اسلام کا مقصد ہی بُرائی کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اور بھلائی کی راہوں کو ہموار کرنا، زیادہ سے زیادہ کشادہ کرنا اور افراد سے لے کر معاشرے تک ہر شعبہ حیات میں بُرائیوں کی جگہ بھلائیوں کو قائم کر دینا ہے۔ یہ بیان اسلامی دعوت میں اِتنا مفصّل، اتنا صریح، اتنا دل نشین اور عقلِ عام کے لیے اس قدر قابلِ فہم تھا کہ جاہلیت کے معاشرے میں صدیوں سے جو لوگ اخلاقی پستیوں میں مبتلا تھے اُن کے لیے بھی یہ سمجھنا کچھ دشوار نہ تھا کہ واقعی انسانیت کا وہ نمونہ بدترین ہے جسے اسلام بُرا کہہ رہا ہے اور وہی نمونہ بہترین ہے جس کے سانچے میں وہ افراد اور معاشرے کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ (۱۴۷)

اخلاق کے مسئلے میں چند بنیادی حقائق

اس سلسلے میں سب سے پہلے چند حقائق لوگوں کے سامنے پیش کیے گئے تاکہ اخلاق کا مسئلہ بنیادی طور پر اُن کی سمجھ میں آجائے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا۔ (الشمس: ۷ تا ۱۰)

"اور قسم ہے نفسِ انسانی کی، اور اُس ذات کی جس نے اُسے ہموار کیا، پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیزگاری اُس پر الہام کر دی، یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہو گیا وہ جس نے اس کو دبا دیا۔"

نفسِ انسانی کو ہموار کرنے سے مُراد یہ ہے کہ خالق نے اُس کو ایسا جسم عطا کیا جو اپنے قامتِ راست، اپنے ہاتھ پاؤں، اور اپنے دماغ کے اعتبار سے انسان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے موزوں ترین تھا۔ اس کو دیکھنے، سُننے، چھونے، چکھنے اور سُونگھنے کے ایسے حواس عطا کیے جو اپنے تناسُب اور اپنی خصوصیات کی بنا پر اُس کے لیے بہترین ذریعۂ علم بن سکتے تھے۔ اُس کو قوّتِ عقل و فکر، قوّتِ استدلال و استنباط، قوّتِ خیال، قوّتِ حافظہ، قوّتِ تمیز، قوّتِ فیصلہ، قوّتِ ارادی، اور دوسری ذہنی قوّتیں عطا کیں جن کی بدولت وہ دُنیا میں اُس کام کے قابل ہوا جو انسان کے کرنے کا ہے۔ اُسے جبلّی بدمعاش اور پیدائشی گناہ گار بنا کر نہیں بلکہ راست اور سیدھی فطرت پر پیدا کیا اور اس کی ساخت میں کوئی کجی نہیں رکھ دی کہ وہ سیدھی راہ اختیار کرنا چاہے بھی تو نہ کر سکے۔

اِلہام کا لفظ اصطلاحاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی تصوّر یا خیال کو غیر شعوری طور پر بندے کے دل و دماغ میں اُتار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نفسِ انسانی پر اُس کی بدی اور نیکی و پرہیزگاری الہام کر دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اندر خالق نے نیکی اور بدی، دونوں کے رجحانات و میلانات رکھ

دیے ہیں، اور یہ وہ چیز ہے جس کو ہر شخص اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے لاشعور میں اللہ تعالیٰ نے یہ تصوّرات ودیعت کر دیے ہیں کہ اخلاق میں کوئی چیز بھلائی ہے اور کوئی چیز بُرائی، اچھے اخلاق و اعمال اور بُرے اخلاق و اعمال یکساں نہیں ہیں، فجور (بدکاری) ایک قبیح چیز ہے اور تقویٰ (بُرائیوں سے اجتناب) ایک اچھی چیز۔ یہ تصوّرات انسان کے لیے اجنبی نہیں ہیں بلکہ اُس کی فطرت اِن سے آشنا ہے اور خالق نے بُرے اور بھلے کی تمیز پیدائشی طور پر اُس کو عطا کر دی ہے۔

تزکیہ: پاک کرنے، اُبھارنے اور نشوونما دینے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس تدسیہ: دبانے، چھپانے، بہکانے اور گمراہ کرنے کا ہم معنی ہے۔ آیت میں یہ بات فیصلہ کُن طریقے سے کہی گئی ہے کہ انسان کی فلاح اور نامُرادی کا سارا انحصار اِس سوال پر ہے کہ اللہ نے جو قوتیں اُس کو دی ہیں اُنہیں استعمال کر کے وہ اپنے نفس کے اچھے اور بُرے رُجحانات میں سے کن کو اُبھارتا اور کن کو دباتا ہے۔ فلاح صرف اُس شخص کے لیے ہے جو اپنے نفس کو فجور سے پاک کرے اور اُس کو اُبھار کر تقویٰ کی بلندیوں پر لے جائے اور اُس کے اندر بھلائیوں کو نشوونما دے۔ اور نامراد ہے وہ جو اپنے اندر پائے جانے والے نیکی کے رُجحانات کو دبا دے اور اپنے نفس کو بہکا کر بُرائی کے رجحانات کی طرف لے جائے اور فجور کو اُس پر اِتنا غالب کر دے کہ تقویٰ اُس کے نیچے اِس طرح چھپ کر رہ جائے جیسے ایک لاش قبر پر مٹی ڈال دینے کے بعد چھُپ جاتی ہے۔ (۱۴۳)

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا - إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا۔ (الدّھر ۲-۳)

"ہم نے انسان کو (ماں اور باپ کے) ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اُس کا امتحان لیں، اور اِس غرض کے لیے ہم نے اُسے سننے اور دیکھنے والا بنایا، ہم نے اُسے راستہ دکھا دیا، خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا"

ماں اور باپ کے مخلوط نطفے سے تو انسان کی طرح جانور بھی پیدا ہوتا ہے، مگر انسان اور جانور میں فرق یہ ہے کہ جانور اِس دُنیا میں امتحان کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے اور انسان امتحان کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اِسی وجہ سے جانوروں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اُس کو سمیع و بصیر بنایا یعنی علم و عقل کی طاقتیں بخشیں، تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہو سکے۔ پھر محض یہ طاقتیں دے کر اُسے چھوڑ نہیں دیا بلکہ اُس کی رہنمائی بھی کی تاکہ وہ یہ جان لے کہ بندۂ خدا ہونے کی حیثیت سے اُس کے لیے شکر کا راستہ کونسا ہے اور کفر (ناشکری) کا راستہ کونسا۔ اب اُس کا امتحان اِس امر میں ہے کہ دونوں راہوں کے فرق سے آگاہ ہونے کے بعد وہ اپنی اِن طاقتوں سے کام لے کر شکر کی راہ اختیار کرتا ہے یا کفر کی راہ۔ (۱۴۴)

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۔ (البلد: ۸ تا ۱۰)

"کیا ہم نے اُسے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے؟ اور دونوں نمایاں راستے اُسے نہیں دکھا دیئے؟"

دو آنکھوں سے مُراد ڈنگر کی آنکھیں نہیں بلکہ وہ انسانی آنکھیں ہیں جنہیں کھول کر آدمی دیکھے تو اُسے ہر طرف وہ نشانات نظر آتی ہیں جو حقیقت کا پتہ دیتے ہیں اور صحیح و غلط کا فرق سمجھاتے ہیں۔ زبان اور ہونٹوں سے مُراد بھی محض بولنے کے آلات نہیں ہیں، بلکہ نفسِ ناطقہ (Reasoning mind) ہے جو ان آلات کی پُشت پر سوچنے سمجھنے کا کام کرتا اور ان سے اِظہار ما فی الضمیر کا کام لیتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ہم نے محض عقل و فکر کی طاقتیں عطا کر کے اُسے یُونہی چھوڑ نہیں دیا کہ اپنا راستہ خود تلاش کرے، بلکہ اس کی رہنمائی کے لیے اُس کے سامنے بھلائی اور بُرائی، نیکی اور بدی کے دونوں راستے بھی نمایاں کر کے رکھ دیئے تاکہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ان میں سے جس کو چاہے اپنی ذمّہ داری پر اختیار کرے۔ (۱۲۵)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ (التین: ۴ تا ۶)

"ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اُلٹا پھیر کر ہم نے اُسے سب نیچوں سے نیچ کر دیا، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے۔"

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو وہ اعلیٰ درجے کا جسم عطا کیا ہے جو کسی دوسری جاندار مخلوق کو نہیں دیا، اور اسے فکر و فہم اور علم و عقل کی وہ بلند پایہ قابلیتیں بخشی ہیں جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں بخشیں۔ مگر جب وہ ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کرنے کے بجائے اپنے جسم اور ذہن کی طاقتوں کو بُرائی کے راستے میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے بُرائی ہی کی توفیق دیتا ہے اور گراتے گراتے گراوٹ کی اس انتہا کو پہنچا دیتا ہے کہ کوئی رذیل ترین مخلوق بھی اُس تک نہیں پہنچی۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسانی معاشرے کے اندر بکثرت مشاہدے میں آتی ہے۔ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، نشہ بازی، کمینہ پن، غیظ و غضب اور ایسی ہی دوسری خصلتوں میں سے جن خصلت میں بھی آدمی مستغرق ہوتا ہے اخلاقی حیثیت سے فی الواقع سب نیچوں سے نیچ ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر صرف اسی ایک بات کو دیکھیے کہ ایک قوم جب دوسری قوم کی دشمنی میں اندھی ہو جاتی ہے تو کس طرح درندگی میں سب درندوں کو مات کر دیتی ہے۔ درندہ تو صرف اپنی غذا کے لیے کسی جانور کا شکار کرتا ہے، جانوروں کا قتلِ عام نہیں کرتا۔ مگر انسان خود اپنے ہی ہم جنس انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے۔ درندہ صرف اپنے

پنجوں اور دانتوں سے کام لیتا ہے، مگر یہ احسنِ تقویم پر پیدا کیا ہوا انسان اپنی عقل اور قوّتِ ایجاد سے کام لے کر ایک سے ایک مہلک ہتھیار بناتا چلا جاتا ہے تاکہ پوری پوری بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دے۔ درندہ صرف زخمی یا ہلاک کرتا ہے۔ مگر انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو اذیّت دینے کے ایسے ایسے دردناک طریقے ایجاد کرتا ہے جن کا تصوّر بھی کسی درندے کے دماغ میں کبھی نہیں آ سکتا۔ پھر یہ اپنی دشمنی اور انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کے لیے کمینہ پن کی اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے کہ دشمن کی عورتوں کے ننگے جلوس نکالتا ہے۔ ایک ایک عورت کو دس دس بیس بیس آدمی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ باپوں اور بھائیوں اور شوہروں کے سامنے اُن کی بیٹیوں، بہنوں اور بیویوں کی عصمت لوٹتے ہیں، بچوں کو ان کے ماں باپ کے سامنے قتل کرتے ہیں، ماؤں کو اپنے بچّوں کا خون پینے پر مجبور کرتے ہیں۔ انسانوں کو زندہ جلاتے اور زندہ دفن کرتے ہیں۔ دُنیا میں وحشی سے وحشی جانوروں کی بھی کوئی قسم ایسی نہیں ہے جو انسانوں کی اِس وحشت کا کسی درجے میں بھی مقابلہ کر سکتی ہو۔ یہی حال دوسری بُری صفات کا بھی ہے کہ ان میں سے جس کی طرف بھی انسان رُخ کرتا ہے، اپنے آپ کو اَرذَل المخلوقات ثابت کر دیتا ہے۔ حتّٰی کہ مذہب، جو انسان کے لیے مقدس ترین شے ہے، اُس کو بھی وہ اِتنا گرا دیتا ہے کہ درختوں اور جانوروں اور پتھروں کو پُوجتے پُوجتے پستی کی انتہا کو پہنچ کر مرد و عورت کے اعضائے جنسی تک کو پُوج ڈالتا ہے اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے عبادت گاہوں میں دیوداسیاں رکھتا ہے جن سے زنا کا ارتکاب کارِ ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے۔ جن ہستیوں کو وہ معبُود کا درجہ دیتا ہے اُن کی طرف اُس کی دیومالا (Mythology) میں ایسے ایسے گندے قصّے منسُوب ہوتے ہیں جو ذلیل ترین انسانوں کے لیے بھی باعثِ شرم ہیں۔ (۱۴۶)

اِن حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ قرآن نے واضح طور پر نفسِ انسانی کی تین الگ الگ قسمیں بیان کیں۔ ایک نفسِ اَمّارہ، جو آدمی کو بُرائیوں پر اُکساتا ہے (یُوسف۔ ۵۳)۔ دُوسرا نفسِ لَوّامہ، جو انسان کو بُرائی کے خیال، خواہش، اِرادے اور فیصلے تک ہر مرحلے پر ٹوکتا ہے اور اس کا ارتکاب کر گزرنے کے بعد ملامت کرتا رہتا ہے (القیامہ۔ ۲)۔ تیسرا نفسِ مُطمئنّہ، جو پُورے اطمینانِ قلب کے ساتھ بُرائی کی راہ چھوڑ کر بھلائی کی راہ اختیار کرتا ہے اور اُسے اِس بات پر کوئی حسرت لاحق نہیں ہوتی کہ اُس نے بُرائی کی لذّتوں اور فائدوں کو کیوں چھوڑا اور بھلائی کی خاطر کیوں محرومیاں، قربانیاں، تکلیفیں اور مُصیبتیں برداشت کیں۔ اِس پر حسرت تو درکنار، اُس کا دل اِس بات پر خوش ہوتا ہے کہ وہ بُرائی کی گندگی سے بچ گیا، اور بھلائی کی پاکیزگی اُسے حاصل ہو گئی۔ اِسی تیسری قسم کے نفس کو قرآن نے خدا کا پسندیدہ نفس قرار دیا ہے اور اُسے جنّت کی خوشخبری سُنائی ہے (الفجر۔ ۲۷ تا ۳۰)

اسبابِ ضلالت

اِس کے بعد قرآن مجید میں ایک ایک کر کے اُن اسباب کو بیان کیا گیا جن کی بدولت انسان بالعموم گمراہی میں مبتلا ہوتے رہے ہیں اور عرب کے کفّار بھی اُنہی کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہو رہے تھے۔

۱- باپ دادا کی اندھی تقلید

ان میں سے اوّلین چیز دینِ آبائی کی اندھی تقلید ہے جو صرف اِس بنا پر کی جاتی رہی ہے کہ باپ دادا سے ایسا ہی ہوتا چلا آرہا ہے، اور کبھی خود اپنی عقل سے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی کہ باپ دادا جو کچھ کرتے تھے وہ درست اور معقول بھی تھا یا نہیں۔ اِس اندھی تقلید کے لیے کوئی دلیل اس کے سوا نہ تھی کہ یہ باپ دادا کا طریقہ ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن نے تاریخ سے بکثرت مثالیں پیش کیں۔

حضرت ہودؑ نے جب عاد کو اُن کی بے راہ روی پر ٹوکا اور انہیں راہِ راست پر آنے کی تلقین کی تو انہوں نے صرف یہ کہہ کر اُن کی تمام دلیلوں اور نصیحتوں کو رد کر دیا کہ "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ کی عبادت کریں اور اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں" (الاعراف - ۷۰)۔

حضرت صالحؑ نے جب ثمود کو سمجھانے کی کوشش کی تو اُن کا جواب یہ تھا کہ "اے صالحؑ اس سے پہلے تو ہمارے درمیان تُو ایسا شخص تھا جس سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اُن معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ جس طریقے کی طرف تو ہم کو بلا رہا ہے اُس کے بارے میں ہمیں سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال دیا ہے" (ہود - ۶۲)

حضرت شعیبؑ نے جب اہلِ مدین کو اُن کی صریح گمراہیوں پر متنبہ کیا تو اُن کا جواب بھی یہی تھا کہ "اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟" (ہود - ۸۷)

حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا کہ "یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو" تو اُن کے پاس اِس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے"۔ حضرت ابراہیمؑ نے اِس پر اُن سے صاف کہہ دیا کہ "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے" (الانبیاء - ۵۲ تا ۵۴)۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان سے پُوچھا کہ یہ تمہاری دعائیں کو سُنتے بھی ہیں؟ اور تمہیں کوئی فائدہ یا نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں؟ مگر اُن کا جواب یہ تھا کہ ہم کو اس سے کچھ بحث نہیں، ہم تو بس صرف اس لیے کرتے ہیں کہ "ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے" (الشعراء: ۷۲ تا ۷۴)۔

حضرت موسیٰؑ نے جب کھلے کھلے معجزات کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کو دعوتِ حق دی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ "کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟" (یونس - ۷۸)۔

اِن مثالوں کو پیش کرتے ہوئے قرآن مجید نے بتایا کہ تمام جاہل قوموں نے اپنے انبیاء کی دعوت کو اسی حجّت بے حجّت سے رد کیا ہے۔ چنانچہ پہلی قوموں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سب ہی نے اپنے انبیاء

کی صاف صاف دلیلوں، نصیحتوں اور فہمائشوں کا اگر کوئی جواب دیا تو یہ کہ "تم کچھ نہیں ہو مگر ہمارے ہی جیسے انسان۔ چاہتے یہ ہو کہ ہم کو اُن معبودوں کی بندگی سے روک دو جن کی بندگی ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں" (ابراہیم۔۱۰)۔ دوسری جگہ فرمایا "اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی خبردار کرنے والا بھیجا، اُس کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم اُنہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ہر نبی نے اُن سے پوچھا کیا تم اُسی ڈگر پر چلتے رہو گے خواہ میں اُس راستے سے زیادہ سیدھا راستہ تمہیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ انہوں نے سارے رسولوں کو یہی جواب دیا کہ جس چیز کی طرف بُلانے کے لیے تم بھیجے گئے ہو ہم اُس کے کافر ہیں" (الزخرف ۲۳، ۲۴)۔

اور یہ کچھ پچھلی قوموں ہی کا حال نہیں تھا بلکہ ہر زمانے کے جاہل لوگوں کا طریقہ یہی ہے اور رہا ہے کہ "وہ کسی علم اور ہدایت اور روشنی دکھانے والی کتاب کے بغیر اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس تعلیم کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں بلکہ ہم اُس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، خواہ شیطان اُن کے باپ دادا کو جہنم ہی کی طرف کیوں نہ بلاتا رہا ہو" (لقمان: ۲۰-۲۱)۔

یہ مثالیں پیش کرکے قرآن نے براہِ راست قریش اور اہلِ عرب کو متنبہ کیا کہ تم بھی اُنہی لوگوں کی طرح ہو۔ نہ خود اپنی عقل سے کام لے کر یہ سوچتے ہو کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو یہ صحیح بھی ہے یا نہیں، اور نہ دلیل و حجت کے ساتھ تمہارے مذہب، رسوم اور اطوار کی جو غلطی تمہیں سمجھائی جاتی ہے اُس پر کچھ غور کرتے ہو۔ بس صرف اِس وجہ سے ایک غلط چیز پر اصرار کر رہے ہو کہ یہ باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ سورۂ صافات میں فرمایا "اِن لوگوں نے اپنے باپ دادا کو گمراہ پایا، لہٰذا یہ اُنہی کے نقشِ قدم پر دوڑے چلے، حالانکہ اِن سے پہلے اکثر گزرے ہوئے لوگ گمراہ ہو چکے تھے" (آیات ۶۹ تا ۷۱)۔ سورۂ ہود میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے فرمایا "تم اُن معبودوں کی طرف سے کسی شک میں نہ رہو جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں۔ یہ بس اُسی طرح عبادت کیے جا رہے ہیں جس طرح پہلے اِن کے باپ دادا کرتے تھے" (آیت ۱۰۹)۔

یہ ننگی وعریانی جیسی کھلی شرمناک بات پر جب قریش اور اہلِ عرب کو ٹوکا گیا اور انہیں اس بات پر شرم دلائی گئی کہ کعبے کے گرد بھی وہ برہنہ طواف کرنے میں تامل نہیں کرتے جس سے زیادہ صریح گھناؤنا فعل کوئی نہیں ہو سکتا، تو انہوں نے اسے بھی تقلیدِ آبائی کی بنیاد پر جائز ٹھیرانے کی کوشش کی۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے "جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے"

اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ آپ نبیؐ! ان سے کہو، اللہ بے حیائی کا کبھی حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لیکر وہ باتیں کہتے ہو جن کو تم نہیں جانتے کہ اللہ نے ان کا حکم دیا ہے؟" (آیت ۲۸)۔

کفّارِ عرب طرح طرح کی غیر معقول جاہلانہ رسموں پر چلے ہوتے تھے اور بلا کسی دلیل کے یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ یہ سب اللہ کی مقرر کردہ ہیں۔ اِس کے متعلق سُورۂ مائدہ میں فرمایا گیا "اور جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس تعلیم کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور آؤ رسُول کی طرف تو یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے بس وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے جائیں گے خواہ وہ کوئی علم نہ رکھتے ہوں اور راہِ راست پر نہ ہوں؟" (آیت ۱۰۴)۔

اسی طرح کفّارِ عرب نے حلال و حرام کی بہت سی خود ساختہ پابندیاں صرف اِس دلیل سے اپنے اُوپر لازم کرلی تھیں کہ یہ پہلے سے چلی آرہی ہیں، اور اُن میں بہت سی حلال چیزیں حرام، اور بہت سی حرام و شرمناک اور قبیح چیزیں حلال کرلی گئی تھیں۔ ان کے متعلق سُورۂ بقرہ میں فرمایا گیا کہ "جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُس ہدایت کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے تو وہ کہتے ہیں، نہیں، بلکہ ہم تو اُس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اور کیا یہ اُنہی کی پیروی کیے جائیں گے خواہ اِن کے باپ دادا نہ کسی چیز کی سمجھ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں؟" (آیت ۱۷۰)

سُورۂ انعام میں اس اندھی تقلید کو ایسے پُرزور طریقے سے نامعقول ثابت کیا گیا کہ عرب کے ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم لوگ بھی ایک دفعہ تو اپنے دلوں میں مان گئے ہوں گے کہ فی الواقع ہم نہایت ہی لغو باتوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ فرمایا:

> "یہ لوگ اللہ کے لیے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مواشی میں سے ایک حصّہ مقرر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کے لیے ہے، بزعم خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے۔ پھر جو ان کے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا، مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے[1]۔ کیسے بُرے فیصلے ہیں جو

---

[1] یعنی جو حصّے یا پھل وغیرہ اللہ کے نام پر نکالے جاتے تھے اُن میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصّے میں شامل کر دیا جاتا تھا، اور اگر شریکوں کے حصّے میں سے گر جاتا یا خدا کے حصّے میں مل جاتا تو اسے اُنہی کے حصّے میں واپس کیا جاتا تھا۔ کھیت کا جو حصّہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لیے مخصوص ہوتا تھا اُس میں سے اگر کبھی پانی اُس حصّے کی طرف پھوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصّہ میں داخل کر دی جاتی تھی، لیکن اگر اس کے برعکس صورت پیش آجاتی تو خدا کے حصّے میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا حصّہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو

یہ لوگ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکین کے لیے اُن کے شریکوں نے خود اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ اُن کو ہلاکت میں ڈالیں اور اُن پر اُن کے دین کو مشتبہ بنا دیں[1] . . . . اور وہ کہتے ہیں کہ یہ مویشی اور کھیتیاں محفوظ ہیں، اِن کو کوئی نہیں کھا سکتا سوائے اُس کے جسے ہم کھلانا چاہیں، بزعمِ خود۔ اور کچھ جانور ہیں جن کی سواری و بار برداری حرام کر دی گئی ہے، اور کچھ جانور ہیں جن پر وہ اللہ کا نام نہیں لیتے اللہ پر افترا کرتے ہوئے (یعنی یہ جھوٹ گھڑتے ہوئے کہ اللہ نے اِن پر اپنا نام لینے سے منع کر دیا ہے) . . . . اور کہتے ہیں کہ اِن جانوروں کے پیٹ میں جو کچھ ہے وہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں کے لیے حرام۔ لیکن اگر وہ مُردہ ہو تو مرد اور عورت سب اس میں شریک ہیں . . . . دیکھو، یہ آٹھ نر و مادہ ہیں، دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے۔ اے نبی، اِن سے پُوچھو کہ اللہ نے اِن کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ذرا ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ اِن سے پوچھو اِن کے نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ میں ہوں؟ کیا تم اُس وقت حاضر تھے جب اللہ نے اِن کے حرام ہونے کا تمہیں حکم دیا تھا؟ پھر اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسوب کر کے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط رہنمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھاتا۔" (آیات ۱۳۶ تا ۱۴۴)

۲- بڑے لوگوں اور پیشوؤں کی غلط پیروی

تقلیدِ آبائی سے قریب تر ایک اور سبب گمراہی کا قرآن نے نشان دہی کی جو لوگوں کو بگاڑنے اور معاشرے کو خراب کرنے میں اُس سے کسی طرح کم نہیں ہے، اور وہ ہے اپنی قوم، یا دُنیا کے بڑے لوگوں، لیڈروں، مذہبی پیشواؤں، اور دولت مند سرداروں کی پیروی جو یہ دیکھے بغیر کہ وہ کدھر جا رہے ہیں، صرف اِس بنا پر کی جاتی

---

* خدا کا حصّہ کیا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصّے کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصے میں کچھ کمی آجاتی تو وہ خدا کے حصّے سے پُوری کی جاتی تھی لیکن خدا کے حصّے میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصّہ میں سے ایک حبّہ بھی خدا کے حصے میں نہ ڈالا جاتا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[1] یعنی انہیں اِس غلط فہمی میں ڈال دیں کہ یہی اُسی دین کا کوئی حصہ ہے جو انہیں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام سے ملا تھا۔ اِس مقام پر ظاہر ہے کہ شریکوں سے مراد دیوتا اور معبود نہیں بلکہ وہ مذہبی پیشوا ہیں جنہوں نے بعد کے دور میں غلط جاہلانہ اور مذہبی رسوم کو رواج دیا اور لوگوں نے اِس طرح پیروی کی جیسی خدا کے قانون کی کرنی چاہیے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کردہ ہیں بڑے لوگ۔ قرآن نے لوگوں کو آگاہ کیا کہ قیامت کے روز اس طرح کی پیروی کرنے والے پچھتا پچھتا کر کہیں گے:

"اے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راستے سے بے راہ کر دیا۔ اے ہمارے رب، ان کو دُہرا عذاب دے اور اُن پر سخت لعنت کر" (الاحزاب: ۶۷ - ۶۸)۔

"اے ہمارے پروردگار ہمیں اُن جنوں اور انسانوں کو دکھا جنہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا، ہم اُنہیں پاؤں تلے روند ڈالیں گے تاکہ وہ خوب ذلیل و خوار ہوں" (حٰم السجدہ - ۲۹)

"(جب اللہ تعالیٰ سزا دے گا) اُس وقت وہی پیشوا اور رہنما جن کی دنیا میں پیروی کی گئی تھی اپنے پیروؤں سے لاتعلقی ظاہر کریں گے، مگر عذاب دیکھ کر رہیں گے اور اُن کے اسباب و وسائل کا سلسلہ کٹ جائے گا۔ اور وہ لوگ جو دنیا میں اُن کی پیروی کرتے تھے کہیں گے کہ کاش ہم کو ایک موقع پھر مل جاتا تو ہم اِن سے اُسی طرح بیزار ہو کر دکھا دیتے جس طرح آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں۔ یُوں اللہ اِن لوگوں کے وہ اعمال جو یہ دُنیا میں کر رہے ہیں اِن کے سامنے اِس طرح لائے گا کہ یہ حسرتوں اور پشیمانیوں سے ہاتھ ملتے رہیں گے۔ مگر آگ سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے" (البقرہ: ۱۶۶ - ۱۶۷)۔

"کاش تم اِن ظالموں کا حال اُس وقت دیکھو جب یہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور ایک دوسرے سے دُو بدُو جھگڑا کریں گے۔ جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے "تم نہ ہوتے تو ہم مسلمان ہوتے"۔ وہ بڑے بننے والے اُن دبے ہوئے لوگوں سے کہیں گے "کیا ہم نے تم کو ہدایت قبول کرنے سے روکا تھا جبکہ وہ تمہارے پاس آئی تھی؟ تم تو خود ہی مجرم تھے"۔ وہ دبے ہوئے لوگ اُن بڑے بننے والوں سے کہیں گے "نہیں، بلکہ وہ شب و روز کی مکاری تھی جب تم ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اُس کا ہمسر ٹھیرائیں"۔ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتائیں گے" (سبا: ۳۱ تا ۳۳)

اِس حقیقت کو قرآن نے بطور ایک عالمگیر قانون کے بیان کیا کہ کسی معاشرے کو آخر کار جو چیز تباہ کرتی ہے وہ اس کے کھاتے پیتے، خوشحال اور اُونچے طبقوں کا بگاڑ ہے۔ جب کسی قوم کی شامت آنے کو ہوتی ہے تو اُس کے دولت مند اور صاحبِ اثر و اقتدار لوگ فسق و فجور پر اتر آتے ہیں، ظلم و ستم اور بدکاریاں اور شرارتیں کرنے

گئے ہیں، اور آخر یہی فسق پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا :

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا ۔ (آیت ۱۶)

"اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اُس کے خوشحال لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اُس میں فسق کرنے لگتے ہیں تب عذاب کا فیصلہ اُس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔"

۳۔ غرور و تکبّر

تیسرا اہم سببِ ضلالت جس کی قرآن نے نشان دہی کی وہ یہ ہے کہ انسان حق بات ماننے سے صرف اس لیے انکار کرتا ہے کہ اُسے اپنے رویّہ کی غلطی تسلیم کرنے میں اپنی ہیٹی ہوتی نظر آتی ہے، یا وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اس حق کو تسلیم کر لوں گا تو گمراہ معاشرے میں جو اُونچا مقام مجھے حاصل ہے وہ مجھ سے چھن جائے گا، یا وہ خیال کرتا ہے کہ اپنی بات چھوڑ کر دوسرے کی بات مان لینا اُس کے مقامِ بلند سے فروتر ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ بات کتنی ہی غلط ہو جس پر وہ اَڑا ہوا ہے اور وہ بات کتنی ہی برحق ہو جسے دوسرا شخص پیش کر رہا ہے۔ قرآن مجید میں اس سببِ ضلالت کو بار بار لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا تاکہ اُن کا اپنا غرور بھی ٹوٹے جو قبولِ حق میں مانع ہو رہا تھا، اور اُن بہت سے علمبردارانِ ضلالت کی گمراہی کے اصل سبب سے بھی وہ واقف ہو جائیں جو اُن کے اپنے زمانے میں، یا اُن سے پہلے گزرے ہوئے زمانے میں حق کا راستہ روکنے والے تھے۔

مثال کے طور پر سورۂ نوح میں حضرت نوحؑ کا یہ قول نقل کیا گیا کہ "اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز راہِ حق کی طرف آنے کے لیے پکارا، مگر میری پکار نے ان کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے ان کو دعوت دی تاکہ تو انہیں معاف کر دے تو انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبّر کیا[1]" (آیات ۶-۷)

سورۂ المؤمن میں یہ قصّہ بیان کیا گیا کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا تو اسی کے اہلِ دربار میں سے ایک حق پسند آدمی نے بڑے دردمندانہ اور خیر خواہانہ انداز میں نہایت مدلّل طریقے سے اُس کو

---

[1] تکبّر سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے حق کے آگے سر جھکا دینے اور خدا کے رسول کی نصیحت قبول کرنے کو اپنی شان سے گری ہوئی بات سمجھا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی بھلا آدمی کسی بگڑے ہوئے شخص کو نصیحت کرے اور وہ جواب میں سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہو اور پاؤں پٹختا ہوا نکل جائے تو یہ تکبّر کے ساتھ کلامِ نصیحت کو رد کرنا ہوگا۔ (حاشیہ از مؤلف)

سمجھانے اور غلط رویّہ چھوڑ کر راست روی اختیار کرنے کی تلقین کی، مگر اُس نے اِن باتوں کا کوئی اثر نہ لیا اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (آیت ۳۵)

"اِس طرح اللہ ٹھپّہ لگا دیتا ہے ہر متکبر و جبّار کے دل پر۔"

یعنی تکبّر اور جبّاریت کی ہوا جس دل میں بھر جاتی ہے پھر اُس کے دروازے ہر کلمۂ نصیحت اور ہر قولِ حق کے لیے بند ہو جاتے ہیں اور اللہ پھر اُس پر لعنت کی ایسی مُہر لگا دیتا ہے کہ خواہ کوئی اسے راہِ راست پر لانے کی کتنی ہی کوشش کرے، وہ کسی طرح سیدھا نہیں ہوتا۔

سُورۂ اعراف میں بیان کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو جب تختیوں پر ایک ہدایت نامہ لکھ کر دیا تو اس کے ساتھ ہی تنبیہ فرما دیا کہ "میں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو کسی حق کے بغیر زمین میں تکبّر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، کبھی اُس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اُسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اُسے اختیار کر لیں گے۔" (آیت ۱۴۶)

سُورہ بقرہ میں فرمایا: "انسانوں میں کوئی ایسا ہوتا ہے جس کی باتیں دُنیا کی زندگی میں تم کو بہت بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی پر بار بار اللہ کو گواہ ٹھیراتا ہے، مگر وہ بدترین دشمنِ حق ہوتا ہے۔ یہ باتیں بنا کر جب وہ پلٹتا ہے تو زمین میں اس کی ساری دوڑ دھوپ فساد برپا کرنے اور کھیتیوں اور نسلوں کو برباد کرنے میں صرف ہوتی ہے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور جب اُس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو اپنے وقار کا گھمنڈ اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔" (آیات ۲۰۴ تا ۲۰۶)

سُورۂ مدثّر میں خود مکّہ کے ایک سردار کا کردار پیش کیا گیا جس نے قریش کے سرداروں سے صاف صاف کہا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو الزامات تم لوگ لگاتے ہو وہ سب جھوٹے ہیں، اور قرآن ایک ایسا کلام ہے جس میں بڑی حلاوت ہے، اس کی جڑ بڑی گہری ہے اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمردار ہیں۔ مگر جب اُس کے سامنے یہ سوال آیا کہ اِس رسول اور اِس کلام کو حق مان کر میں اپنی سرداری کھو بیٹھوں، یا اِس پر جھوٹا الزام لگا کر اپنی سرداری بچا لوں، تو اُس نے دوسری چیز کو ترجیح دی اور اپنے ضمیر سے لڑ کر آخرکار ایک الزام تصنیف کر ڈالا جسے اس کا دل خود جانتا تھا کہ وہ محض اپنی بڑائی قائم رکھنے کے لیے ایک صریح جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ قرآن نے اُس کی یہ تصویر پیش کر کے اُسے بالکل بے نقاب کر دیا:

"اُس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی، تو خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ ہاں، خدا کی مار اُس پر، کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر (لوگوں کی طرف) دیکھا پھر

پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا کہ یہ کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے، یہ تو ایک انسانی کلام ہے" (آیات ۱۸ تا ۲۵)۔

۴۔ دُنیا کی خوشحالی و بدحالی کو خیر و شر کا معیار سمجھنا

پھر قرآن نے بتایا کہ گمراہی کا ایک اور بڑا سبب یہ خیال ہے کہ دُنیا میں جو نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہی معیارِ خیر و شر ہیں۔ یہاں اگر کوئی خوشحال ہے خواہ اُس کی خوشحالی کیسی ہی بدکرداریوں کا نتیجہ ہو، وہ کامیاب ہے اور یہاں جو خستہ حال ہے خواہ اس کی خستہ حالی کیسی ہی نیک عمل کے ساتھ ہو، وہ بہرحال ناکام ہے۔ گویا خیر وہ ہے جس کا نتیجہ یہاں بظاہر اچھا نظر آرہا ہے، اور شر وہ ہے جس کا نتیجہ یہاں بظاہر بُرا دیکھا جا رہا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس ظاہری "خیر" کے پیچھے کتنی ہی حرام خوریاں اور بداخلاقیاں پائی جاتی ہوں، اور وہ "شر" اپنے پیچھے کتنا ہی حسن عمل اور بلندیٔ اخلاق کا سرمایہ رکھتا ہو۔ قرآن نے اس غلط نقطۂ نظر کی مثالیں پچھلی تاریخ سے بھی پیش کیں، اور خود مکہ اور عرب کے لوگوں کی گفتار و کردار میں بھی اس کو نمایاں کر کے دکھایا۔

حضرت نوحؑ کے قصہ میں بتایا کہ اُن کی قوم کے سرداروں نے یہ کہہ کر اُن کی تعلیم و ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کیا تھا کہ اُن پر ایمان لانے والے غریب لوگ تھے جنہیں معاشرہ میں کوئی بلند مرتبہ حاصل نہ تھا۔ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ "اُنہوں نے کہا کیا ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے کی ہے؟" (الشعراء آیت ۱۱۱)۔

حضرت صالحؑ کے قصے میں قرآن نے صراحت کی کہ اُن کے غریب پیروؤں سے اُن کی قوم کے بڑے لوگوں نے کہا اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ "کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟" اُنہوں نے کہا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ "ہم تو اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے ہیں" اس پر اُن بڑے لوگوں نے کہا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ "ہم اُس چیز کو ماننے والے نہیں جس پر تم ایمان لائے ہو" (الاعراف ۷۵-۷۶) یعنی تم جیسے حقیر لوگوں نے جس چیز کو مانا ہے اسے ہم نہیں مان سکتے۔

پھر تمام انبیاء کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ اُن سب کے مخالف اُن کی قوم کے خوشحال لوگ تھے اور اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جس کو دُنیا میں خوب مال و اولاد نصیب ہے وہی حق پر ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (سبا: ۳۴-۳۵)

"اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں کوئی خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اُس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو ماننے والے نہیں

اور انہوں نے کہا ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں۔"

یہی سوچنے کا انداز رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کفارِ مکہ اور اہلِ عرب کا تھا جس کے غلط ہونے پر قرآن مجید میں بار بار اُن کو ٹوکا گیا۔

سُورۂ مریم میں فرمایا "اِن لوگوں کو جب ہماری کھُلی کھُلی آیات سُنائی جاتی ہیں تو انکار کرنے والے ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ بتاؤ ہم دونوں گروہوں میں سے کون بہتر حالت میں ہے اور کس کی مجلسیں شاندار ہیں؟ حالانکہ اِن سے پہلے ہم کتنی ہی ایسی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں جو اِن سے زیادہ سروسامان رکھتی تھیں اور ظاہری شان و شوکت میں اِن سے بڑھی ہوئی تھیں" (آیات ۷۳-۷۴)۔

سُورۂ مومنون میں فرمایا "کیا یہ لوگ اِس خیال میں ہیں کہ ہم جو اِن کو مال اور اولاد سے نوازے جا رہے ہیں تو انہیں بھلائیاں دینے میں سرگرم ہیں؟ نہیں، اصل معاملے کا انہیں شعور نہیں ہے۔ درحقیقت جو لوگ اپنے رب کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں، اور جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں اور جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، اور جن کا حال یہ ہے کہ (اپنے رب کی خوشنودی کے لیے) جو نیک کام وہ بجا لاتے ہیں اُن کے بعد بھی اُن کے دل اِس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، وہی دراصل بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے اور سبقت کر کے اُنہیں پالینے والے ہیں" (آیات ۵۵ تا ۶۱)۔

اِسی بات کو سمجھانے کے لیے سُورۂ فجر میں پہلے عاد اور ثمود اور فرعون جیسی زبردست ترقی یافتہ قوموں اور سلطنتوں کی طغیانی و سرکشی کا انجام بیان کیا اور پھر فرمایا کہ انسان اب بھی اِس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ دُنیا کی نعمت و دولت ہی اصل عزّت ہے اور یہاں کی غربت و تنگ دستی ہی اصل ذلّت ہے۔ حالانکہ نعمت و دولت ہو یا غربت و تنگ دستی، دونوں ہی انسان کی آزمائش کے لیے ہیں، اور ان میں سے کوئی بھی اصل عزّت و ذلّت کا معیار نہیں ہے (ملاحظہ ہو الفجر، آیات ۱۵-۱۶)۔

۵۔ خواہشِ نفس اور قیاس و گمان کی پیروی

گمراہی کے اسباب بتاتے ہُوئے قرآن نے ایک اور اہم سبب کی بھی نشاندہی کی اور وہ یہ کہ انسان محض قیاس و گمان کی بنا پر کسی چیز کو حق اور کسی دوسری چیز کو باطل سمجھ بیٹھے، یا اپنی خواہشاتِ نفس کو اپنا خدا بنا کر اُن کی ایسی بندگی کرے کہ جدھر جدھر وہ چاہیں اُسے گھسیٹے لیے پھریں۔ مگر کبھی خدا کی دی ہوئی عقل اور اس کے بخشے ہوئے ذرائع علم سے کام لے کر وہ یہ نہ دیکھے کہ اپنے گمانوں اور قیاسات کی بنا پر اُس نے جو راستہ اختیار کیا ہے، یا اپنی خواہشات کی پیروی میں جس راہ پر وہ چلا جا رہا ہے وہ صحیح اور معقول بھی ہے یا نہیں۔ اِس غلطی پر قرآن نے بار بار لوگوں کو متنبّہ کیا تاکہ وہ خیالات اور خواہشات کی وادیوں میں بھٹکنے کے بجائے عقل و خرد کی سیدھی

ماہ پرآتیں۔

سُورۂ اعراف میں ایک شخص کی مثال پیش کی گئی جو علم رکھنے کے باوجود خواہشاتِ نفس کی پیروی میں دُنیا کا ہو کر رہ گیا تھا، پھر اُس جیسے لوگوں کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: "ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں۔ اُن کے پاس دل ہیں، مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں۔ اُن کے پاس آنکھیں ہیں، مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں، مگر وہ اُن سے سُنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں" (آیات ۱۷۵ تا ۱۷۹)

سُورۂ انفال میں اُن لوگوں کا ذکر کیا گیا جو سب کچھ سُننے کے بعد بھی گویا کچھ نہ سنتے تھے، اور پھر فرمایا: "درحقیقت اللہ کے نزدیک تمام جاندار مخلوقات میں سے بدترین مخلوق وہ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے" (آیت ۲۲)۔ بہرے اور گونگے سے مُراد جسمانی بہرے اور گونگے نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو نہ حق سُنتے ہیں اور نہ حق بولتے ہیں۔

سُورۂ یونس میں آیت ۳۱ سے ۳۵ تک پے در پے یہ دلائل دینے کے بعد کہ جن جن معبُودوں کو مشرکین نے خُدائی میں ربِّ کائنات کا شریک بنا رکھا ہے اُن میں سے کوئی بھی خدائی صفات اور اختیارات نہیں رکھتا، صاف فرمایا گیا کہ اُن کو معبود کسی علم کی بنا پر نہیں بنایا گیا ہے بلکہ محض گمان وقیاس سے اپنی جگہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ بھی خدائی میں کچھ حصّہ رکھتے ہیں۔ "ان میں سے اکثر لوگ گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کر رہے ہیں، حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پُورا نہیں کرتا" (آیت ۳۶)

سُورۂ حج میں پچھلی گذری ہوئی غلط کار قوموں کی تباہی کے آثار کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا "کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ اُن کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈر دیکھ کر) ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سُننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں" (آیت ۴۶)۔

اسی طرح سُورۂ فرقان میں قومِ نوحؑ، عاد، ثمود، اصحاب الرّس، قومِ فرعون اور قومِ لوطؑ کے انجام کی طرف توجّہ دلانے کے بعد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمّہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سُنتے ہیں یا عقل سے کام لیتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے" (آیات ۴۳، ۴۴)

یہی بات سُورۂ جاثیہ میں بھی فرمائی کہ "اے نبی، کیا تم نے کبھی اُس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی

خواہشِ نفس ہی کو اپنا خدا بنا لیا اور علم کے باوجود اللہ نے اُسے گمراہی میں پھینک دیا، اُس کے دل اور کانوں پر مُہر لگا دی اور اُس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اب اللہ کے بعد اور کون ہے جو اُسے ہدایت دے؟" (آیت ۲۳)۔

۶۔ بُرائی کو خوبی سمجھنا اور غیر حق پر مگن رہنا

ایک اور چیز جس کو قرآن نے افراد اور معاشرے کی گمراہی کے بڑے اسباب میں شمار کیا وہ یہ بھی کہ انسان بُرے کاموں کو اچھا سمجھنے لگے، حق کے خلاف چلتے ہوئے سرے سے کوئی بے اطمینانی محسوس ہی نہ کرے، بلکہ اُلٹا اُس پر مگن ہو، اُس پہ اِترائے، اور حق جاننے کی ضرورت سے بالکل بے نیاز ہو چنانچہ سورۂ فاطر میں فرمایا "بھلا کچھ ٹھکانا بھی ہے اُس شخص کی گمراہی کا جس کے لیے اُس کا بُرا عمل خوشنما بنا دیا گیا ہو اور وہ اُسے اچھا سمجھ رہا ہو" (آیت ۸)۔ اور سورۂ مومن میں فرمایا کہ "جہنم میں جب لوگوں کو عذاب دیا جا رہا ہوگا اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارا انجام اس لیے ہُوا کہ تم زمین میں غیر حق پر مگن تھے اور اُس پر اِتراتے تھے" (آیت ۷۵)۔

۷۔ یہ خیال کہ نیکی اور حق پرستی سے انسان کی دُنیا برباد ہو جاتی ہے

قرآن مجید میں اِس خیال کو بھی ایک بڑا سبب گمراہی بتایا گیا۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ جب حضرت شُعیبؑ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ناپ تول میں کمی کرنے اور قافلے لُوٹنے اور رہزنی کرنے سے روکا تو قوم کے سرداروں نے لوگوں سے کہا کہ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا إِنَّكُمْ إِذًا لَّخَاسِرُونَ "اگر تم نے شُعیبؑ کی پیروی کی تو تم یقیناً تباہ ہو جاؤ گے" (آیت ۹۰)۔ گویا اُن کا مطلب یہ تھا کہ بھلا کہیں تجارت میں ایمانداری برتنے سے بھی کاروبار چل سکتا ہے؟ اور ہم جو تجارتی قافلوں کے راستے پر آباد ہیں، اگر رہزنی نہ کریں، اور راستوں کو پُرخطر بنا کر قافلوں سے بھاری رہگذر وصول نہ کریں تو ہماری یہ خوشحالی کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ یہی بات قریش کے سرداروں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تھی کہ إِن نَّتَّبِعِ الْهُدَىٰ مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا "اگر ہم تمہارے ساتھ اِس ہدایت کی پیروی اختیار کر لیں تو ہم اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے" (القصص۔ ۵۷)۔ یعنی ہمارا جو کچھ اثر عرب کے لوگوں پر ہے وہ اِسی وجہ سے ہے کہ ہم یہاں مُشرکین عرب کے مذہبی پیشوا بنے ہوئے ہیں۔ اِسی وجہ سے ہماری تجارت چمک رہی ہے۔ اِسی وجہ سے ہمارے قافلوں کو سارے ملک کے راستوں میں امن میسر ہے۔ اور اِسی وجہ سے عرب کے تمام قبائل ہمارا احترام کرتے ہیں۔ اگر ہم آپ کی بات مان کر وہ راہ اختیار کر لیں جو آپ پیش کر رہے ہیں تو سارا عرب ہمارا مخالف ہو جائے گا، جو حیثیت ہمیں ملک میں حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی، اور ہمارا مکّے میں بھی امن چین سے رہنا ممکن نہ رہے گا۔

۸۔ شفاعت کا مشرکانہ عقیدہ

یہ قدیم ترین زمانے سے ہر دور میں گمراہی کا ایک بڑا سبب رہا ہے اور عرب میں جب اسلام کی دعوت اٹھی تو اُس کو بھی اِس سے سابقہ پیش آیا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے کچھ پیارے بندے ایسے ہیں جن کی بات کسی طرح نہیں ٹل سکتی۔ اُن کا دامن آدمی تھام لے، نذر نیاز اور پوجا پاٹ سے اُن کو خوش کرتا رہے پھر دنیا میں جو چاہے کرے، اُن کی سفارش ہر جرم و گناہ کی سزا سے اُسے بچا لے گی۔ اللہ کی بخشش اور مہربانیاں حاصل کرنے اور اپنے دل کی مرادیں پانے کا یہ آسان راستہ موجود ہوتے ہوئے کسی کو کیا پڑی ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی بیڑیاں اپنے پاؤں میں ڈال کر ہر گناہ کی لذت اور ہر ظلم و زیادتی کے فائدے سے اپنے آپ کو محروم کر لے۔ کفارِ عرب کا کہنا یہ تھا کہ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ "ہم تو اُن کی عبادت اِس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں" (الزمر۔۳) یعنی اللہ کی بارگاہ بہت اونچی ہے۔ اُس تک براہِ راست ہماری پہنچ کہاں ہو سکتی ہے اِس لیے ہم اِن بزرگ ہستیوں کو اُس تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ نیز وہ کہتے تھے کہ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِندَ اللَّهِ "یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں" (یونس ۱۸)۔

اِس غلط عقیدے کی موجودگی میں نیکی اور بھلائی کی کوئی دعوت کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے قرآن میں پے درپے اِس پر ضرب لگائی گئی اور اِس کا سراسر بے بنیاد ہونا ایسے دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا گیا کہ کسی معقول آدمی کے لیے ایسی احمقانہ شفاعت کا قائل ہونا ممکن نہ رہا۔

سورۂ مومن میں فرمایا: "اے نبی، اِن لوگوں کو اُس دن سے ڈرا دو جو قریب آ لگا ہے، جبکہ کلیجے منہ کو آ رہے ہوں گے اور لوگ چپ چاپ غم کے گھونٹ پیے کھڑے ہوں گے۔ ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی اطاعت کی جاتی ہو۔ اللہ نگاہوں کی چوری تک سے واقف ہے اور وہ راز تک جانتا ہے جو سینوں نے چھپا رکھے ہیں۔ اور اللہ ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ رہے وہ معبود جنہیں یہ لوگ اُسے چھوڑ کر پکار رہے ہیں، تو وہ کسی چیز کا بھی فیصلہ کرنے والے نہیں ہیں، حقیقت میں اللہ ہی سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے" (آیات ۱۸تا۲۰)۔

اِن آیات میں شفاعت کے اِس مشرکانہ عقیدے کو بالکل پاش پاش کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اوّل تو بجائے خود یہ بات خلافِ عقل و انصاف ہے کہ ظالم کی سفارش کی جائے۔ پھر یہ خدا کی شانِ خدائی کے قطعی خلاف ہے کہ اُس کے بندوں میں سے کوئی ایسا سفارشی ہو جس کی اطاعت کی جاتی ہو یعنی خدا اُس کی سفارش ماننے پر مجبور ہو۔ اِس پر مزید یہ بات کسی طرح تصور تک کرنے کے لائق نہیں ہے کہ خدا کے ہاں ایسے لوگوں کی سفارش چلے جو دنیا میں ظلم کر کے آنے والے مجرم کی حمایت پر اٹھیں اور یہ چاہیں کہ خدا اُن کو اُن کی خاطر معاف کر دے۔ اِس سے بھی بڑھ کر اہم بات یہ ہے کہ ایک حاکم جو کسی شخص کے جرائم سے خوب واقف ہے اور جس کو انصاف کے ساتھ اُس کے مقدمے کا فیصلہ کرنا ہے، وہ ایسے لوگوں کو اُس کی سفارش کا حق دے دے جو یہ جانتے ہی نہیں کہ

وہ شخص کیا کچھ کر کے آیا ہے۔

دوسری جگہ اس تصورِ شفاعت کی تردید ایک اور پہلو سے کی گئی۔ فرمایا: "اللہ کو چھوڑ کر یہ لوگ جنہیں پکارتے ہیں وہ شفاعت کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، اِلّا یہ کہ (اس کا دعوے کرنے والے) حق کے ساتھ شہادت دیں اور وہ جانتے ہوں" (الزخرف - ۸۶)۔ یعنی جو شخص کسی دیوی، دیوتا یا بزرگ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ اُسے لازماً شفاعت کے اختیارات حاصل ہیں اور اس کو ایسی شفاعت کا اختیار ہے جو رد نہیں کی جا سکتی، وہ سامنے آ کر اور علم کی بنا پر اس بات کی برحق شہادت دے۔ محض سُنی سُنائی باتوں پر، یا محض قیاس و وہم و گمان پر ایسا ایک عقیدہ مان لینا سراسر لغو ہے جس کے حق ہونے کی شہادت علم کی بنا پر نہیں دی جا سکتی۔ بالفاظِ دیگر جو لوگ کچھ ہستیوں کے لیے ایسے اختیارات کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کو "معلوم" ہے کہ انہیں یہ اختیارات حاصل ہیں اور ہم اس کی "سچی" "شہادت" دیتے ہیں۔

لیکن قرآن نے شفاعت کا قطعی انکار نہیں کیا، بلکہ بار بار یہ بتایا کہ شفاعت صرف وہ کر سکتا ہے جس کو اللہ نے اس کی اجازت دی ہو، اور صرف اُس کے حق میں کر سکتا ہے جس کے لیے شفاعت سُننے پر اللہ راضی ہو، اور اس پر مزید شرط یہ ہے کہ وہ حق کے مطابق شفاعت کرے، خلافِ حق و انصاف بات نہ کرے۔ پھر بھی شفاعت قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ کے اختیار میں ہے، وہ ہرگز کسی کی شفاعت ماننے پر مجبور نہیں ہے۔ اس باب میں قرآن کی تصریحات یہ ہیں:

مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ - (البقرہ - ۲۵۵)۔

"کون ہے جو اُس کے حضور اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے؟"

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ (سبا - ۲۳)

"اور اُس کے حضور شفاعت کوئی فائدہ نہیں دیتی سوائے اُس شخص کے جس کے لیے اُس نے اجازت دی ہو"

يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (النبا - ۳۸)

"جس روز رُوح (یعنی جبریلؑ) اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے۔ کوئی نہ بولے گا سوائے اُس کے جسے رحمان نے اجازت دی ہو اور وہ ٹھیک بات کہے۔"

قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا، لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (الزمر - ۴۴)

"اے نبیؐ، کہہ دو کہ شفاعت ساری کی ساری اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی

بادشاہی اُسی کی ہے۔"

یعنی شفاعت سُننا یا نہ سُننا اور اُسے قبول کرنا یا رد کر دینا بالکل اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ کائنات کی بادشاہی کا مالک ہے۔ کسی کی یہ مجال نہیں کہ اُس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے، اور کسی کا یہ مرتبہ نہیں کہ اُس کی شفاعت اللہ کو ضرور سُننی اور ماننی ہی پڑے۔

تاریخِ انسانی سے اچھے اور بُرے کرداروں کی مثالیں

اسبابِ ضلالت کی یہ تفصیلات جو قرآن میں بیان کی گئی تھیں، قریش اور عرب کے معاشرے میں یہ سب پائی جاتی تھیں اور ایک ایک شخص جو ان کو سُنتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا کہ فی الواقع جاہے اندر گمراہی کے یہ سارے اسباب کام کر رہے ہیں۔ اِس کے بعد قرآن مجید میں تاریخِ انسانی سے پے درپے ایسے کرداروں کی مثالیں بھی پیش کی گئیں جو بہترین تھے اور ایسے کرداروں کی مثالوں کو بھی نمایاں کر کے بیان کیا گیا جو بدترین تھے، تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ اسلام کیسے انسان بنانا چاہتا ہے، اور کیسے انسان اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں جن کی یا تو اصلاح ہونی چاہیے، یا پھر ان کے وجود سے معاشرے کو پاک کر دینا چاہیے، یا جن کو اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے غضب کا نشانہ بنا کر اس دنیا میں تباہ کر دیا۔ قرآن کے اِس بیان کو ذرا سلسلہ وار تاریخی ترتیب کے ساتھ دیکھتے جائیے۔

آدم علیہ السّلام کے دو بیٹوں کا واقعہ

سب سے پہلا عبرتناک واقعہ جو تاریخِ انسانی میں پیش آیا وہ آدم علیہ السّلام کے دو بیٹوں کا ہے جس میں دو کردار ایک دوسرے کے مقابلے میں سامنے آتے ہیں۔ دونوں بھائی قربانی کرتے ہیں۔ ایک کی قربانی مقبول ہوتی ہے، دوسرے کی نہیں ہوتی۔ وہ حسد میں آکر اپنے بھائی سے کہتا ہے کہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ اُس کا بھائی کہتا ہے "اللہ تو پرہیزگاروں کی قربانی قبول کیا کرتا ہے" (یعنی تیری قربانی قبول نہ ہونے میں میرا کوئی قصور نہیں، تو اپنے اخلاق و اعمال کی اُس خامی کو دُور کرنے کی فکر کر جس کی وجہ سے تیری قربانی قبول نہ ہوئی)۔ "لیکن اگر تو میرے قتل ہی کے درپے ہوگا تو میں تیرے قتل کے درپے نہیں ہوں گا، کیونکہ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ تیرے قتل کی فکر میں بھی تیرے ساتھ خونِ ناحق کے گناہ میں شریک ہوں میں اِس کو ترجیح دوں گا کہ میرے اور اپنے گناہ کو تو خود ہی سمیٹ لے۔" آخر کار وہ ظالم بھائی اپنے نیک بھائی کو قتل کر دیتا ہے اور پھر اس پر بہت پچھتاتا ہے۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد دیکھیے کہ عرب کے اُس ماحول میں، جہاں انسانی جان کی کوئی حرمت نہ تھی اور ہر طرف کُشت و خون کا بازار گرم تھا، قرآن نے کتنی عظیم بات کہی کہ "جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی ایک جان کو بچایا اُس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی" (المائدہ، آیات ۲۷ تا ۳۲)۔

حضرت نوحؑ اور اُن کی قوم

تاریخ کی پہلی قوم جس نے زمین میں سرکشی کا طوفان اُٹھایا وہ حضرت نوحؑ کی قوم تھی۔ قرآن میں کئی جگہ اس کا قصہ بیان کر کے ایک طرف اُس قوم اور اُس کے سرداروں کا کردار پیش کیا گیا جس کی وجہ سے آخر کار وہ سب مبتلائے عذاب ہوئے، اور دوسری طرف خود حضرت نوحؑ کے کردار کی درخشاں مثالیں پیش کی گئیں۔ سُورۂ عنکبوت میں بتایا گیا کہ انتہائی شدید مخالفت و مزاحمت کے مقابلے میں ساڑھے نو سو برس تک وہ انتہائی صبر کے ساتھ اُس قوم کی اصلاح کے لیے کوشش کرتے رہے (آیت ۱۴)۔ اُنہوں نے ہر ممکن طریقے سے نہایت دردمندی کے ساتھ لوگوں کو راہِ راست دکھانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، مگر قوم کے سرداروں نے اُن کی ایک نہ چلنے دی (سُورۂ نوح مکمل)۔ اُن کو مجنون کہا گیا اور سخت ڈانٹ پھٹکار کی گئی (القمر۔۹)۔ اُن کی اور ان پر ایمان لانے والے غریب لوگوں کی تذلیل کی گئی (ہود: ۲۷، الشعراء: ۱۱۱)۔ اُن کو دھمکی دی گئی کہ تم اگر باز نہ آئے تو تمہیں سنگسار کر دیا جائے گا (الشعراء: ۱۱۶)۔ مگر انہوں نے ڈٹ کر کہا کہ میرا وجود اور میری نصیحتیں تمہارے لیے ناقابلِ برداشت ہیں تو جو کچھ تم کر سکتے ہو وہ میرے خلاف کر ڈالو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو، میرا بھروسا اللہ پر ہے (یونس۔۷۱)۔ پھر جب کشمکش انتہا کو پہنچ گئی تو اُن کی قوم نے کہا کہ تم جس طوفان کا ڈراوا ہمیں دیتے ہو وہ لے آؤ۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے اُن کی آنکھوں کے سامنے وہ کشتی بنانی شروع کی جس میں بیٹھ کر وہ اور اُن کے ساتھ اہلِ ایمان اُس آنے والے طوفان سے بچنے والے تھے۔ مگر اُن کی قوم کے لوگ اُنہیں کشتی بناتے دیکھ کر اُن کا مذاق اُڑاتے پھرتے تھے کہ بڑے میاں کی دیوانگی آخر یہاں تک پہنچ گئی کہ خشکی پر جہاز چلانے کی تیاری کر رہے ہیں، اور اُنہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ عنقریب یہی خشکی ایسا سمندر بننے والی ہے جہاں ایک ایک موج پہاڑوں کے برابر ہوگی جس میں خود حضرت نوحؑ کے بیٹے سمیت سب غرق ہو جائیں گے، اور یہی سطحِ زمین پر بنی ہوئی کشتی جُودی پہاڑ پر جا ٹکے گی (ہود: ۳۸تا۴۴)۔ آخری منظر اس قصے کا یہ پیش کیا گیا کہ حضرت نوحؑ نے جب اپنے بیٹے کو بھی دوسرے کافروں کے ساتھ ڈوبتے دیکھا تو بشریت سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اُس کو بچا لیا جائے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو ڈانٹ دیا کہ جاہل نہ بنو، یہ تمہارا بیٹا ہی سہی، لیکن تمہارا "اہل" نہیں ہے بلکہ عمل غیر صالح ہے، اس لیے ایسی درخواست مجھ سے نہ کرو۔ حضرت نوحؑ نے بارگاہِ الٰہی سے اپنی دُعا کا یہ جواب سُنتے ہی فوراً معافی مانگی اور عرض کیا "اے میرے پروردگار، میں اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں، اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا" (ہود: ۴۵تا۴۷)

قوم عاد اور حضرت ہودؑ علیہ السلام

عرب کی مشہور قوم، عاد، جس سے اہلِ عرب کا بچہ بچہ اُس زمانے میں واقف تھا جس کے متعلق لوگ

یہ بھی جانتے تھے کہ وہ خدا کے عذاب سے تباہ ہوئی تھی، اُس کے بارے میں قرآن نے بتایا کہ شرک و بت پرستی
کے ساتھ اُس کے اندر کیا اخلاقی عیوب پائے جاتے تھے۔ سورۂ حٰم السجدہ میں ہے کہ "اُنہوں نے زمین میں حق کے
بغیر تکبر کیا اور کہا کون ہے ہم سے زیادہ زور آور" (آیت-۱۵)۔ سورۂ فجر میں ہے کہ اُنہوں نے "دنیا میں بڑی
سرکشی دکھائی اور بہت فساد برپا کیا" (آیات ۶ تا ۱۲)۔ سورۂ شعراء میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے ان سے فرمایا
"یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ ہر اُونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو، اور بڑے بڑے قصر
تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ رہنا ہے، اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو جبّارین کر ڈالتے ہو" (آیات ۱۲۸ تا ۱۳۰)۔
سورۂ ہود میں ہے کہ "اُنہوں نے ہر جبّار دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی" (آیت ۵۹)۔ حضرت ہودؑ نے ان کو سمجھانے
کی جتنی کوششیں کیں اُن سب کا جواب وہ تمرّد اور عناد اور مخالفانہ چالوں ہی کے ساتھ دیتے چلے گئے حتیٰ کہ
حضرت نوحؑ کی طرح اُنہیں بھی اپنی قوم سے کہنا پڑا کہ "تم سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھو
اور مجھے ذرا مہلت نہ دو، میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، کوئی جاندار ایسا
نہیں جس کی چوٹی اُس کے ہاتھ میں نہ ہو" (ہود: ۵۵-۵۶)۔ آخر کار اُنہوں نے خدا کے پیغمبر سے کہہ دیا کہ "اگر
تو سچا ہے تو لے آ وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے"۔ پھر جب وہ عذاب سامنے سے آتا نظر آیا تو وہ
بیوقوف یہ سمجھے کہ یہ بادل ہے جو ہماری وادیوں کو سیراب کرے گا، مگر وہ ایک تباہ کن آندھی تھی جس نے
ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا (الاحقاف۔ ۲۲ تا ۲۵)۔

ثمود اور حضرت صالح علیہ السلام

عاد کے بعد ثمود عرب کی اقوام قدیمہ میں سے مشہور ترین قوم تھی جس کے چھوڑے ہوئے آثار پورے شمالی
حجاز میں پھیلے ہوئے تھے اور اب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ قریش کے تجارتی قافلے اُن پر سے گزرتے ہوئے شام کی طرف
جاتے رہتے تھے۔ یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ ایک خوفناک زلزلے نے اس قوم کو تباہ کیا جس کے اثر سے اُس علاقے
کے پہاڑ آج تک کھیل کھیل ہو رہے ہیں۔ قرآن میں بتایا گیا کہ اس قوم نے خدا سے بغاوت کر کے صرف شرک و
بت پرستی ہی کا جرم نہیں کیا تھا بلکہ خدا کی زمین میں سرکشی اور فساد کا طوفان بھی برپا کیا تھا (الفجر آیات ۶ تا ۱۲۔
الاعراف۔ ۷۴)۔ اُس کے سردار حد سے گزرے ہوئے مفسد لوگ تھے جن کے ہاتھوں کوئی اصلاح کا کام نہ ہوتا
تھا (الشعراء: ۱۵۱-۱۵۲)۔ وہ اپنے عیش اور اپنی شان دکھانے کے لیے میدانی علاقوں میں قصر اور پہاڑوں کو
تراش تراش کر عمارتیں بناتے تھے (الاعراف ۷۴، الشعراء-۱۴۹)۔ یہ ایک بگڑے ہوئے معاشرے کی خصوصیت
ہوتی ہے کہ ایک طرف غریب لوگ سر چھپانے کو ڈھنگ کی جگہ تک نہیں پاتے اور دوسری طرف بڑے
لوگ شاندار محل تعمیر کرتے ہیں۔ اُن بڑے لوگوں کے نزدیک حضرت صالحؑ اِس لیے ایمان لانے کے قابل نہ تھے

کہ اُن پر غریب لوگ ایمان لائے تھے (الاعراف ۷۵-۷۶)۔ حضرت صالحؑ نے جب اُن کو خدا پرستی کی دعوت دی اور ظلم و فساد اور عیش پرستی سے روکا تو اُن کے ۹ بڑے بڑے مفسد قبائلی جتھہ داروں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا "خدا کی قسم کھا کر فیصلہ کر لو کہ رات کو صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر شبخون ماریں گے، پھر صالحؑ کے ولی (یعنی اُن کے قبیلے کے سردار) سے کہہ دیں گے کہ ہم اُس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں" (النمل: ۴۸-۴۹) لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس چال کو ناکام کر دیا۔ اُنہوں نے حضرت صالحؑ سے معجزے کا مطالبہ کیا اور ان کے اپنے مطالبے ہی پر اللہ تعالیٰ نے ایک اونٹنی اُن کے سامنے لا کر رکھ دی جس کا وجود خود ایک صریح معجزہ تھا۔ اس کے بعد حضرت صالحؑ کے ذریعہ سے اُن کو خبردار کر دیا گیا کہ یہ اونٹنی تمہاری زمینوں میں جہاں چاہے گی چرتی پھرے گی اور ایک دن تنہا یہ پانی پیے گی اور دوسرا دن تم سب اور تمہارے جانوروں کے پینے کا ہے۔ اس کو تم نے بُری نیت سے ہاتھ لگایا تو پھر تمہارے اوپر عذاب آ جائے گا (الاعراف ۷۳۔ ہود ۶۴۔ الشعراء ۱۵۵) کچھ مدت تک وہ لوگ اُس اونٹنی سے ڈرتے رہے آخر کار انہوں نے یہ جانتے ہوئے کہ یہ اونٹنی ایک معجزہ ہے، اپنے ایک سب سے زیادہ سرپھرے سردار کو پکارا کہ اس بلا سے ہمارا پیچھا چھڑا، اور اُس نے اس کام کا بیڑا اُٹھا کر اسے مار ڈالا (القمر ۲۹۔ الشمس ۱۲-۱۴)۔ یہ سرکشی دکھا کر انہوں نے حضرت صالحؑ کو چیلنج دیا کہ لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈراتے تھے (الاعراف ۷۷) حضرت صالحؑ نے کہا بس اب تین دن اپنے گھروں میں مزے کر لو۔ اس کے بعد وہ زبردست کڑاکے دار زلزلہ آیا جس نے حضرت صالحؑ اور اہلِ ایمان کے سوا پوری قوم کو ہلاک کر دیا اور اُن کے گھر اس طرح پڑے کے پڑے رہ گئے کہ گویا وہاں کبھی کوئی بسا ہی نہ تھا (الاعراف ۷۸۔ ہود ۶۵ تا ۶۸۔ القمر ۳۱)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام

سب سے بڑا مثالی کردار قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کا پیش کیا گیا جنہیں اہلِ عرب اپنے دین کا پیشوا مانتے تھے، اور جن کے ساتھ نسبت ہی پر قریش کے سارے فخر و ناز اور رسوخ و اثر کی بنا قائم تھی۔ قرآن نے اُن کو بتایا کہ ابراہیم علیہ السلام کی وہ کیا خوبیاں تھیں جن کی بنا پر اللہ رب العالمین نے اپنے اُس بندے کو اپنا خلیل (دوست) قرار دیا (النساء-۱۲۵)، اور فرمایا کہ میں تجھے تمام انسانوں کا امام بناتا ہوں (البقرہ-۱۲۴)۔ اُن پر جب یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ اللہ کے سوا کوئی رب اور الٰہ نہیں ہے اور اُن کا باپ اور اُن کی قوم سب گمراہ ہیں تو انہوں نے باپ دادا کی اندھی تقلید کو چھوڑ دیا۔ اپنے قومی مذہب کو ترک کر دینے اور بالکل یکسو ہو کر صرف خالقِ ارض و سما کی بندگی اختیار کر لینے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہیں کی، اور صرف اپنی جگہ ہی خالص خدا پرست بن کر رہ نہیں گئے، بلکہ علی الاعلان اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہہ دیا کہ

میں تمہارے اِس دینِ شرک سے بیزار ہوں اور میرے نزدیک تم صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو (الانعام ۷۴ تا ۸۱)۔ انہوں نے باپ سے صاف صاف کہا کہ تم اندھے بہرے بے اختیار معبودوں کی بندگی کر کے دراصل شیطان کی بندگی کر رہا ہے، اور باپ نے انہیں سختی کے ساتھ جھڑک کر گھر سے نکال دیا (مریم ۴۲ تا ۴۹)۔ انہوں نے جب قوم کو دلیلوں سے سمجھانے کی کوشش کی اور وہ نہ مانی تو موقع پا کر اُس کے بُت خانے میں گھس گئے، اور اُس کے بُتوں کو توڑ کر عملاً اُسے یہ دکھا دیا کہ جن کی وہ بندگی کر رہی ہے وہ اُس کو تو کیا، خود اپنے آپ کو بھی بچانے پر قادر نہیں ہیں (الانبیاء ۵۱ تا ۶۷۔ الصّافات ۸۸ تا ۹۶)۔ اُن کو ملک کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا جو رب ہونے کا مدعی تھا تو انہوں نے بالکل بے خوف ہو کر اس سے کہا کہ مَیں اُس ہستی کے سوا کسی کو رب نہیں مانتا جس کے ہاتھ میں زندگی و موت ہے۔ اس نے کہا زندگی و موت میرے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے یہ منہ توڑ جواب دے کر اُسے مبہوت کر دیا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اُسے مغرب سے نکال کر دکھا دے (البقرہ ۲۵۸)۔ اُن کے لیے آگ کا الاؤ تیار کیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ انہیں اُس میں پھینک کر زندہ جلا دیا جائے۔ مگر وہ پھر بھی باطل کے آگے نہ جھکے اور حق کی خاطر جل مرنے پر تیار ہو گئے۔ یہ تو اللہ کا فضل تھا کہ اُس نے آگ کو ٹھنڈا کر دیا اور اُسے اُن کے لیے بے ضرر بنا دیا، مگر انہوں نے اپنی طرف سے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ وہ آگ میں پھینکا جانا قبول کر سکتے ہیں، حق کو چھوڑ کر باطل کی بندگی کرنا قبول نہیں کر سکتے (الانبیاء ۶۸ تا ۷۰۔ الصّافات ۹۷۔۹۸)۔ آخر کار جب اُن کے لیے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ دین کو چھوڑیں یا وطن کو؟ تو انہوں نے دین کو نہ چھوڑا اور گھر، خاندان، قوم، وطن سب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر خدا کے بھروسے پر نکل کھڑے ہوئے۔ جانتے تھے کہ غریب الوطنی کیا چیز ہوتی ہے، خصوصاً اُس زمانے میں اپنی قوم کی پناہ سے نکل کر کسی غیر علاقے کا رُخ کرنا جیسا کچھ خطرناک ہو سکتا تھا اُس سے وہ ناواقف نہ تھے۔ مگر انہوں نے بے تکلف کہہ دیا کہ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ "مَیں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہ میری ضرور رہنمائی فرمائے گا" (الصّافات۔۹۹)۔ بڑھاپے کی عمر میں جب بڑی دعاؤں اور تمناؤں کے بعد اُن کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تو اُن کے رب نے اُن کو ایک اور سخت آزمائش میں ڈالا۔ انہیں اشارہ کیا گیا کہ اِس دُودھ پیتے بچے کو اِس کی ماں کے ساتھ لے جا کر مکّہ کی سُنسان، بے آب و گیاہ وادی میں اُس جگہ چھوڑ آؤ جہاں ہم اپنا گھر بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اِس حکم کی تعمیل کے لیے بھی بلا تأمّل آمادہ ہو گئے اور فلسطین سے، جہاں وہ رہتے تھے، سینکڑوں میل دُور لے جا کر بیوی اور بچے کو بالکل خدا کے بھروسے پر چھوڑ دیا (الحج ۲۶۔ ابراہیم ۳۷)۔ پھر ایک اور اُس سے بھی زیادہ شدید آزمائش کی گئی۔ جب وہی لڑکا بڑا ہو کر اس عمر کو پہنچ گیا کہ باپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے تو اشارہ کیا گیا کہ اِسے ہمارے لیے ذبح کر دو۔ وہ اِس فرمان پر بھی عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور بیٹے کے گلے پر چھُری پھیرنے ہی والے تھے

کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی قربانی قبول فرما کر ایک "ذبحِ عظیم" کو اُس کے فدیے میں دے دیا۔ (الصّافات ۱۰۰ تا ۱۰۷)۔ خدا اور اُس کے دین کے معاملے میں وہ کسی کے ساتھ کوئی رو رعایت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وطن چھوڑتے ہوئے انہوں نے صاف صاف اپنی قوم سے کہا کہ "ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بَیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ" (الممتحنہ۔ ۴)۔ اپنے باپ سے انہوں نے دعائے مغفرت کا وعدہ کیا تھا اور دُعا کی بھی، مگر جب اُنہیں احساس ہُوا کہ وہ تو اللہ کا دُشمن تھا تو اُنہوں نے اُس سے محبت کا یہ تعلق بھی ختم کر دیا (التوبہ۔ ۱۱۴)۔ یہ تھی وہ سیرت اور یہ تھا وہ کردار جسے دعوتِ اسلامی نے نمونے کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

حضرت لُوطؑ اور قومِ لُوط

حضرت لُوطؑ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے بھتیجے تھے اور اُن کے ساتھ ہی ہجرت کر کے فلسطین کی طرف آئے تھے۔ یہاں جس جگہ انہوں نے اپنا مسکن بنایا تھا اُس کے قریب ہی ایک نہایت خبیث قوم آباد تھی جو دُنیا میں خباثت کے اعتبار سے اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لُوط علیہ السّلام کو اُس کی اصلاح کا کٹھن کام سپرد کیا اور اُنہیں نبی بنا کر اُس کے علاقے میں بھیج دیا۔ اُس قوم کا حال یہ تھا کہ اُس میں مرد کی مرد سے مباشرت عام تھی جس کا ارتکاب چھُپ کر بھی نہیں بلکہ عَلانیہ ایک دوسرے کے سامنے اور بھری مجلسوں میں کیا جاتا تھا۔ اِس پر مزید وہ ایک رہزن قوم تھی، کسی شخص یا قافلے کا اُس کے علاقے سے بخیریت گذر جانا ممکن نہ تھا (النمل ۵۴۔ العنکبوت ۲۹)۔ حضرت لُوطؑ نے برسوں اِس کو خدا سے ڈرایا اور اِن حرکتوں سے باز آجانے کی تلقین کی مگر اُس کا جواب یہ تھا کہ "اے لُوطؑ، اگر تُو نے یہ باتیں نہ چھوڑیں تو ہم تجھے اپنے ہاں سے نکال دیں گے" (الشعراء۔ ۱۶۷)۔ حضرت لُوطؑ نے اِن دھمکیوں کی پرواہ نہ کی اور اپنی تبلیغ جاری رکھی تو اُن لوگوں نے آپس میں طے کیا کہ "آلِ لُوط کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو، یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں" (الاعراف ۸۲۔ النمل ۵۶)۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے اُن کو سزا دینے کا فیصلہ فرما دیا اور اس پر عمل درآمد کے لیے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا۔ چند فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لُوطؑ کے ہاں مہمان بنا کر بھیج دیے گئے۔ اِن کا آنا تھا کہ سارے شہر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور لوگ جُوق در جُوق حضرت لُوطؑ کے گھر کی طرف چڑھ دَوڑے تا کہ اُن لڑکوں کے ساتھ فعلِ بد کریں۔ حضرت لُوطؑ نے اِن کی بے انتہا مِنّت سَماجت کی کہ میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رُسوا نہ کرو، کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟ مگر اُن لوگوں پر ایک نشہ سا سوار تھا۔ انہوں نے حضرت لُوطؑ کی ایک نہ سُنی بلکہ اُلٹا اُن کو ڈانٹا کہ "کیا ہم بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دُنیا بھر کے ٹھیکیدار نہ بنو" (الحجر۔ ۷۰)۔ تب فرشتوں نے حضرت لُوطؑ سے کہا کہ "ہم خدا کے بھیجے ہُوئے فرشتے ہیں اور اِن پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں، آپ صبح سے پہلے پہلے اپنے

گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جائیں"۔ جو لوگ اُن کے مکان پر چڑھ آتے تھے اُن کو تو اُسی وقت اندھا کر دیا گیا (القمر۔۳۷)، اور صبح سویرے باقی قوم کا تختہ اُلٹ دیا گیا، اُس کی بستیاں تلپٹ کر دی گئیں، اور اس پر ایسے پتھروں کی بارش کی گئی جن میں سے ہر ایک نشان زدہ تھا کہ کس پتھر کو اُن میں سے کس آدمی کا خاتمہ کرنا ہے (ہُود ۸۲۔ ۸۳)۔ یہ ایسی بدبخت قوم تھی کہ اس کے پورے علاقے میں ایک حضرت لُوطؑ کے گھر کے سوا کسی با ایمان کا گھر نہ پایا جاتا تھا (الذّاریات ۔۳۶) اور اُس ایک گھر میں بھی خود حضرت لُوطؑ کی بیوی بے ایمان تھی جس کے متعلق اُن کو حکم دیا گیا کہ اُسے ساتھ نہ لے جاؤ، کیونکہ اُسے بھی مبتلائے عذاب ہونا ہے (ہُود ۔۸۱)۔ قرآن میں یہ قصہ جگہ جگہ بیان کر کے لوگوں کو بتایا گیا کہ ایک بدکردار قوم کیسی ہوتی ہے اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے کیسے کیسے سخت حالات میں کام کیا ہے۔

قصۂ یُوسف علیہ السّلام

اِس کے بعد تاریخی اعتبار سے حضرت یُوسف علیہ السّلام کے قصّے کی باری آتی ہے جس پر ایک پُوری سُورۃ قرآن میں نازل کر کے اچھے اور بُرے کردار ایک دوسرے کے بالمقابل پیش کر دیئے گئے۔ اِس میں ایک طرف برادرانِ یُوسف کا کردار ہے جنہوں نے صرف اس بنا پر کہ والدِ ماجد حضرت یعقوب علیہ السّلام اپنے کم سن بیٹے یوسفؑ سے زیادہ محبت کرتے ہیں آپس میں طے کیا کہ ان کو قتل کر دیں یا کہیں پھینک دیں اور اس کے بعد صالح لوگ بن جائیں"۔ باپ کو دھوکا دیکر بھائی کو سیر و تفریح کے بہانے لے گئے، اُس کو اندھے کنویں میں ڈال دیا، پھر جھوٹ موٹ کا خون اُس کے قمیص پر لگا کر لے آئے اور باپ سے کہا کہ اُسے بھیڑیے نے پھاڑ کھایا۔

اُس تجارتی قافلے والوں کا کردار ہے جنہوں نے حضرت یُوسف کو اندھے کنویں میں پایا تھا۔ اُنہوں نے اُس مظلوم بچے کو اپنے لیے مالِ تجارت بنا لیا اور مصر لے جا کر بیچ ڈالا۔

عزیزِ مصر کی بیوی کا کردار ہے جس کے شوہر نے حضرت یُوسفؑ کو خریدا تھا اور جس کے گھر میں پل کر وہ جوان ہوئے تھے۔ اُس کی بے شرمی کا حال یہ تھا کہ اُس نے اُن کو گناہ کی دعوت دی، وہ انکار کر کے بھاگے تو اُن کا پیچھا کیا، عین اُس موقع پر اُس کا شوہر آ گیا تو اُلٹا ان پر الزام لگایا کہ وہ اُس کی عصمت خراب کرنا چاہتے تھے۔ اُس کا جھوٹ جب صریح طور پر ثابت ہو گیا اور شہر کے اُونچے طبقوں کی عورتوں میں اُس کے عشق کا چرچا ہونے لگا تو اُس نے اُنہیں اپنے ہاں دعوت پر بلا کر حضرت یُوسف کو اُن کے سامنے یہ بتانے کے لیے پیش کیا کہ ایسے حسین جوان پر میں مرمٹی تو کیا قصور کیا، اور بے تکلف بھری مجلس میں کہا کہ اگر یہ میرے ساتھ ناجائز تعلق پر راضی نہ ہوا تو میں اسے قید کرا دوں گی۔

مصر کے اُونچے طبقے کی عورتوں کا کردار ہے جنہوں نے اُس محفل میں حضرت یُوسف کا حُسن دیکھ کر اپنے

ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ وہ بھی اُن کے پیچھے پڑ گئیں اور اور انہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔
مصر کے حاکموں کا کردار ہے جنہوں نے اپنی عورتوں کے اخلاقی بگاڑ کی سزا اُلٹی حضرت یوسف کو دی اور بے قصور انہیں قید کر کے برسوں جیل میں ڈالے رکھا۔

دُوسری طرف حضرت یوسف کا کردار ہے جس میں اخلاق کی پاکیزگی کا ایک سے ایک بہتر نمونہ سامنے آتا ہے۔ انہوں نے قید ہو جانا گوارا کر لیا مگر اپنے دامن کو گناہ سے داغدار کرنا گوارا نہ کیا۔ اس پر بھی انہیں اپنے تقویٰ کا کوئی زعم لاحق نہ ہُوا بلکہ انہوں نے بڑی عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ "اے میرے پروردگار! قید مجھے اُس چیز سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ لوگ مجھے دعوت دے رہے ہیں، اور اگر تُو نے ان عورتوں کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف جھک پڑوں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔"
انہوں نے جیل میں بھی خدا کے بندوں کو وعظ و نصیحت کر کے راہِ راست دکھانے کی کوشش کی اور تبلیغِ حق کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اس کا صرف ایک واقعہ سورۂ یوسف میں آیت ۳۶ سے ۴۰ تک بیان کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قید کے اس طویل زمانے میں وہ کس طرح دعوت الی اللہ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔

پھر جب بادشاہِ مصر کے ایک خواب کی تعبیر انہوں نے دی اور بادشاہ نے اُس سے متأثر ہو کر انہیں رہا کرنا اور اپنے پاس بلانا چاہا تو انہوں نے اُس وقت تک رہائی قبول نہ کی جب تک عزیزِ مصر کی بیوی اور اس کے ساتھ کی دوسری عورتوں نے اُن کی پاکدامنی اور خود اپنے قصوروار ہونے کی شہادت نہ دے دی۔
اس کے بعد وہ دور آیا جب مصر میں انہیں شاہانہ اقتدار حاصل ہو گیا۔ اُس زمانے میں اُن کے وہی بھائی جنہوں نے اُن کو اندھے کنوئیں میں پھینکا تھا اُن کے پاس بار بار غلہ مانگنے کے لیے آتے رہے اور وہ انہیں غلہ دیتے رہے، اور ایک مرتبہ بھی اُن کے دل میں خیال نہ آیا کہ اُن سے اُس ظلم کا بدلہ لیں جو انہوں نے اُن کے ساتھ کیا تھا۔ اوّل اوّل تو یہ بھائی اس بات سے ناواقف تھے کہ مصر کے جس فرمانروا سے وہ غلہ حاصل کر رہے ہیں وہ کون ہے اور صرف حضرت یوسفؑ ہی اُن کو پہچان رہے تھے۔ مگر جب تیسری مرتبہ وہ آئے اور حضرت یوسفؑ نے انہیں بتایا کہ میں تمہارا وہی بھائی ہوں جس کے ساتھ تم نے وہ ظلم کیا تھا جو تم جانتے ہو، اور انہوں نے اپنے خطاکار ہونے کا اعتراف کیا، تو حضرت یوسفؑ کا جواب یہ تھا کہ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے"۔ پھر صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اپنے والدِ ماجد حضرت یعقوب علیہ السلام کو وطن سے مصر بلوایا، بلکہ ان بھائیوں کو بھی ان کے سارے اہل و عیال سمیت بلا کر وہاں عزت کے ساتھ آباد کیا۔

آخری شان اِس عظیم انسان کے کردار کی سورۂ یوسف میں یہ دکھائی گئی کہ اپنے اِس عروج پر وہ کسی فخر و غُرور کا اظہار نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے آگے سرِ بندگی خم کر کے عرض کرتا ہے کہ "اے میرے رب، تُو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے، تُو ہی دُنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ مُسلم (فرماں بردار) کی حیثیت سے کر اور مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔"

حضرت شُعَیب علیہ السّلام اور اہلِ مَدیَن و اصحابُ الاَیکہ

قرآن مجید میں اہلِ مَدیَن اور اصحاب الایکہ کا حال بھی لوگوں سے بیان کیا گیا جن کا علاقہ شمالی حجاز میں واقع تھا۔ ان کے متعلق بتایا گیا کہ خدا کے سوا دوسروں کی عبادت کے ساتھ جو اخلاقی خرابیاں اُن کے اندر خصوصیّت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں وہ یہ تھیں کہ وہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے، رہزن لوگ تھے اور انہوں نے بڑا فساد برپا کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت شُعیب علیہ السّلام کو مَدیَن میں اپنا نبی بنا کر مبعوث کیا اور اَیکہ والوں کی اِصلاح کا کام بھی اُن کے سپرد فرمایا۔ وہ مُدّتوں ان لوگوں کو خدا کا خوف دلا کر ان بُرائیوں سے باز آنے کی تلقین کرتے رہے مگر صرف ایک قلیل تعداد اُن پر ایمان لائی اور باقی سب اپنے کرتُوتوں پر اَڑے رہے۔ مَدیَن کے سرداروں نے حضرت شُعَیبؑ سے کہا "کیا تمہاری نماز تمہیں یہ حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبُودوں کو چھوڑ دیں، یا یہ کہ ہم اپنے مالوں میں جو کچھ کرنا چاہیں وہ نہ کریں"؟ (ہود۔ ۸۷)۔ بالفاظِ دیگر انہیں اِس بات پر بھی اصرار تھا کہ خدا کے سوا دوسرے معبُودوں کی بندگی صرف اِس وجہ سے کی جائے کہ باپ دادا اُن کی بندگی کرتے رہے ہیں، اور وہ اِس بات پر بھی مُصر تھے کہ اپنے مالوں میں اُنہیں اپنی مرضی کے مطابق ہر طرح کے تصرُّف کی آزادی ہونی چاہیے خواہ وہ لوٹ مار ہو، یا تجارت میں بے ایمانی ہو، یا کمزور لوگوں پر ظلم و ستم ہو۔ اُنہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ "اگر تم نے شُعَیبؑ کی پیروی کی تو برباد ہو جاؤ گے" (الاَعراف ۔ ۹۰)۔ گویا اُن کے نزدیک قوم کا پھلنا پھولنا اِسی پر منحصر تھا کہ وہ ہر طرح کے ناجائز طریقوں سے مال و دولت حاصل کرے، اور صرف جائز طریقوں کی پابندی قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ قوم برباد ہو جاتی۔ اُنہوں نے حضرت شُعَیبؑ کو دھمکیاں دیں کہ "ہم تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو نکال باہر کریں گے" (الاَعراف ۔ ۸۸)۔ اور اُن سے کہا کہ "تم کو تو ہم اپنے درمیان ایک کمزور آدمی دیکھتے ہیں۔ اگر تمہارا قبیلہ نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہارا بِل بُوتا اِتنا نہیں ہے کہ ہم پر تم بھاری ہو" (ہُود ۔ ۹۱)۔ اِس پر حضرت شُعَیبؑ نے یہ فرما کر اُنہیں شرم دلائی کہ "میرا قبیلہ کیا تمہارے مقابلے میں اللہ سے زیادہ طاقت ور ہے؟ اُس کو تم نے بالکل پس پُشت ڈال دیا"؟ (ہُود ۔ ۹۲)۔ ایسا ہی رویّہ اصحابُ الاَیکہ نے بھی حضرت شُعَیبؑ کے ساتھ اختیار کیا۔ اُن کی نصیحت کو اُنہوں نے قبول نہ کیا اور جواب دیا تو یہ کہ "اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دو" (الشُّعراء ۔ ۱۸۷)۔ آخرکار

دونوں قومیں خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئیں اور تباہ کر کے رکھ دی گئیں۔ قریش کے لوگ اپنے تجارتی سفروں میں شام جاتے ہوئے ہمیشہ اُن علاقوں سے گزرتے تھے جہاں یہ قومیں مبتلائے عذاب ہوئی تھیں، اِس لیے وہ قرآن کے اِس بیان سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

قصۂ فرعون و موسیٰ علیہ السلام

دنیا بھر میں یہ ہولناک تاریخی واقعہ مشہور تھا کہ فرعون اور اس کا لشکر خدا کے عذاب میں گرفتار ہو کر سمندر میں غرق ہوا تھا، اور عرب میں یہود و نصاریٰ کثرت سے موجود تھے جن کے ذریعہ سے سارے ہی اہلِ عرب جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس کے پاس نبی بنا کر بھیجے گئے تھے، اور اُنہوں نے حیرت انگیز معجزے دکھا کر اُسے دعوتِ حق دی تھی، مگر وہ کسی معجزے کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لایا تھا۔ خود قریش کے لوگ حضرت موسیٰ کے ان معجزوں سے واقف تھے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُن کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ لَوْلَآ اُوْتِیَ مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی "اِن کو وہ معجزے کیوں نہ دیے گئے جو موسیٰ کو دیے گئے تھے؟" (القصص۔۴۸)۔ اِسی بنا پر قرآن میں جگہ جگہ حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا جس سے اچھے اور بُرے کردار اپنی خصوصیات کے ساتھ پوری طرح واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آ گئے۔

فرعون کے جرائم اُس میں ایک ایک کر کے گناتے گئے ہیں: "اُس نے زمین میں بڑی سرکشی کی۔ اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اُن میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اُس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اُس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا۔ فی الواقع وہ مفسد لوگوں میں سے تھا" (القصص۔۴)۔ یعنی اُس کی حکومت کا قاعدہ یہ نہ تھا کہ قانون کی نگاہ میں ملک کے سب باشندے یکساں ہوں اور سب کو برابر کے حقوق دیے جائیں، بلکہ اُس نے سیاست کا یہ طرز اختیار کیا تھا کہ ملک کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کیا جائے، کسی کو مراعات و امتیازات دے کر حکمران گروہ ٹھیرایا جائے، اور کسی کو محکوم بنا کر دبایا اور پیسا جائے۔ اِس دوسرے گروہ میں خصوصیت کے ساتھ بنی اسرائیل پر اُس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ اُن کے لڑکوں کو وہ قتل کرتا اور لڑکیوں کو جیتا چھوڑ دیتا تھا، تاکہ رفتہ رفتہ اُن کی نسل ختم ہو جائے اور اُن کی عورتیں مصریوں کے تصرّف میں آ کر ایک مصری نسل پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ اِسی بنا پر جب حضرت موسیٰ ایک اسرائیلی گھر میں پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی والدہ کو اشارہ کیا کہ جب اِس بچّے کے قتل کا خطرہ لاحق ہو تو اِسے ایک ٹوکری میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا (القصص۔۷)۔

خود اپنی مصری قوم کے ساتھ اُس کا جو معاملہ تھا اس کی پوری تصویر سورۂ زخرف کے صرف ایک فقرے میں کھینچ دی گئی ہے: "اُس نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور اُنہوں نے اُس کی اطاعت کی، درحقیقت وہ تھے ہی

فاسق لوگ" (الزخرف۔ ۵۴)۔ اِس میں فرعون کی سیاست اور اُس کی قوم کی گری ہُوئی اخلاقی حالت، دونوں کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

"جب کوئی شخص کسی ملک میں اپنی مطلق العنانی چلانے کی کوشش کرتا ہے اور اُس کے لیے کھُلّم کھُلا ہر طرح کی چالیں چلتا ہے، ہر فریب اور مکر و دغا سے کام لیتا ہے، کھُلے بازار میں ضمیروں کی خرید و فروخت کا کاروبار چلاتا ہے، اور جو بکتے نہیں اُنہیں بے دریغ کُچلتا اور رَوندتا ہے تو خواہ وہ زبان سے یہ بات کہے یا نہ کہے، اپنے عمل سے صاف ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ درحقیقت اِس ملک کے باشندوں کو عقل اور اخلاق اور مردانگی کے لحاظ سے ہلکا سمجھتا ہے اور اُس نے اُن کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے کہ میں اِن بیوقوف، بزدل اور بے ضمیر لوگوں کو جدھر چاہوں ہانک کر لے جا سکتا ہوں۔ پھر جب اُس کی یہ تدبیریں ملک میں کامیابی کے ساتھ چل جاتی ہیں اور باشندگانِ ملک اس کے دست بستہ غلام بن کر رہ جاتے ہیں تو وہ اپنے عمل سے ثابت کر دیتے ہیں کہ اُس خبیث نے جو کچھ انہیں سمجھا تھا، واقعی وہ وہی کچھ ہیں۔ اور اُن کے اِس ذلیل حالت میں مبتلا ہونے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بنیادی طور پر "فاسق" ہوتے ہیں۔ اُن کو اِس سے کچھ بحث نہیں ہوتی کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔ انصاف کیا ہے اور ظلم کیا۔ سچائی اور دیانت اور شرافت قدر کے لائق ہے یا جھُوٹ اور بے ایمانی اور رذالت۔ اِن مسائل کے بجائے اُن کے لیے اصل اہمیت صرف اپنے ذاتی مفاد کی ہوتی ہے جس کے لیے وہ ہر ظالم کا ساتھ دینے، ہر جبّار کے آگے دبنے، ہر باطل کو قبول کرنے اور ہر صدائے حق کو دبانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔" (تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزخرف حاشیہ ۵۰)

حضرت مُوسیٰ علیہ السّلام جب اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ اُس کے دربار میں اللہ جل شانہٗ کے پیغمبر کی حیثیت سے پہنچے اور اُنہوں نے ایسے صریح معجزے پے در پے پیش کیے جن کے متعلق ایک بیوقوف سے بیوقوف آدمی بھی یہ گمان نہیں کر سکتا تھا کہ یہ جادُو کے کرشمے ہیں، اُن کو وہ محض اپنی کبریائی کے زعم میں جادُو ہی کہتا رہا اور اُس کے درباری اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔ عصا کے اژدہا بن جانے کو تو خود اُس کے بلائے ہوئے ماہر جادُوگروں نے مان لیا کہ یہ اُن کے فن کی چیز نہیں بلکہ خدا کا معجزہ ہے۔ رہے دوسرے معجزات، مثلاً حضرت موسیٰ کے پیشگی اعلان کے مطابق پُوری سرزمینِ مصر میں قحط برپا ہونا اور اُن کی دعا ہی سے اس کا دُور ہونا، اُن کے اعلان پر سارے ملک میں . . . .

. . . . بارشوں کا ہولناک طوفان آنا اور اُن کی دعا ہی سے اُس کا ختم ہونا، اُن کے

اعلان پر ٹڈی دلوں کا خوفناک حملہ ہونا اور ان کی دعا ہی سے اس کا دفع ہونا، اسی طرح ان کے اعلان کے مطابق جوؤں اور سُرسُریوں کا عذاب، مینڈکوں کا عذاب اور خون کا عذاب باری باری لوپہیے ملک میں آنا اور صرف اُن کی دُعا سے اُن کا ٹلنا، اِس شُبہ کی اُدنیٰ گنجائش بھی نہ چھوڑتا تھا کہ یہ کسی ساحر کی جادوگری ہے کیونکہ ایسے کام نہ کبھی کوئی جادوگر کر سکا ہے، نہ کر سکتا ہے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ سب اللہ ربّ العالمین کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ اسی لیے ہر عذاب کے آنے پر فرعون اور اُس کے اہلِ دربار حضرت موسیٰؑ سے کہتے کہ آپ کو اپنے رب کے ہاں جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر دُعا کیجیے کہ یہ عذاب ہم پر سے ٹل جائے تو ہم آپ کی بات مان لیں گے مگر جب وہ ٹل جاتا تو وہ اپنے عہد سے پھر جاتے تھے (الاعراف ۱۳۴-۱۳۵۔ الزخرف ۴۹-۵۰)۔ قرآن میں صاف کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دلوں میں یقین رکھتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ حق پر ہیں اور پھر ظلم و سرکشی کی وجہ سے انکار کیے چلے جا رہے تھے (النمل-۱۴)۔ یہ حقیقت اُس وقت بالکل کھل گئی جب فرعون اپنے لشکروں سمیت غرق ہونے لگا اور اُس نے پکار کر کہا "میں مان گیا کہ کوئی خدا اُس کے سوا نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں اسلام لانے والوں میں سے ہوں" (یونس-۹۰)۔

اِس طرح حق کو حق جان لینے کے باوجود اُس نے اور اُس کے درباریوں نے باطل پرستی اور ظلم و تکبّر کی حد کر دی۔ اُس کے درباریوں نے اُس سے کہا کہ "کیا حضور اِس موسیٰؑ اور اس کی قوم کو اسی طرح چھوڑے رکھیں گے کہ یہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کی اور آپ کے معبودوں کی بندگی چھوڑ دیں"؟ اُس نے کہا "نہیں، ہم ابھی حکم دیتے ہیں کہ ان کے لڑکوں کو قتل کیا جائے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے" (الاعراف-۱۲۷)۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے جو حکم جاری ہُوا تھا وہ پھر سے تازہ کیا گیا اور نیا حکم یہ دیا گیا کہ جو جو لوگ موسیٰؑ کے ساتھ ایمان لانے والے ہوں اُن کے لڑکوں کو قتل کیا جائے اور اُن کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے (المؤمن-۲۵)۔ اُس نے حضرت موسیٰؑ سے کہا "اگر میرے سوا تُو نے کسی کو خدا مانا تو میں تجھے قید کر دوں گا" (الشعراء-۲۹)۔ اپنے بھرے دربار میں کہا "اے سردارو، میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا کوئی اور خدا بھی ہے" (القصص-۳۸)۔ ڈھنڈورا پیٹ کر اعلان کیا کہ "میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" (النازعات-۲۴)۔ غایتِ خیرہ چشمی کے ساتھ اپنے وزیر ہامان سے کہا "ذرا ایک اُونچی عمارت تو بنا۔ میں اُس پر چڑھ کر دیکھوں تو سہی کہ موسیٰؑ کا خدا کہاں ہے" (القصص ۳۸۔ المؤمن ۳۶-۳۷)۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ اس نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کا فیصلہ کر ڈالا اور اپنے اہلِ دربار سے کہا "چھوڑو مجھے کہ میں اِس موسیٰؑ کو قتل کر دوں اور یہ اپنے رب کو پکار دیکھے" (المؤمن ۲۶)۔

ایک کردار یہ ہے جو اِس قصّے میں فرعون اور اُس کے اعیانِ سلطنت اور اُس کی قوم کا نظر آتا ہے۔ دوسرا ایک نہایت عبرت انگیز اور سبق آموز کردار ساحرانِ مصر کا ہے جو اپنے دین کی حمایت میں حضرت موسیٰؑ

کا مقابلہ کرنے کے لیے سارے ملک سے جمع ہو کر آتے تھے جب وہ آتے ہیں تو فرعون سے کہتے ہیں کہ "مگر نہ اگر ہم جیت گئے تو کچھ انعام تو ملے گا نا؟" وہ کہتا ہے "انعام ہی نہیں ملے گا بلکہ تم تو ہمارے مقرّبین میں شامل ہو جاؤ گے"۔ مگر جب یہی جادوگر جب حضرت موسیٰ کے معجزے سے اپنے جادو کو مغلوب ہوتے دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ یہاں جادو نہیں بلکہ خدائی طاقت کام کر رہی ہے، تو سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ "ہم نے مان لیا رب العالمین کو، موسیٰ اور ہارون کے رب کو"۔ اب اُن کے اندر یکلخت اتنا بڑا انقلاب واقع ہو جاتا ہے کہ فرعون اُنہیں ہاتھ پاؤں کٹوانے اور سُولی پر چڑھا دینے کی دھمکیاں دیتا ہے اور وہ اُس کی کسی دھمکی کی پروا نہیں کرتے۔ اُس سے صاف کہتے ہیں کہ تجھے جو کچھ کرنا ہے کر ڈال، ہم تیری خاطر اُن کھلی صداقتوں سے جو ہم نے دیکھ لی ہیں، اور اپنے خالق سے مُنہ نہیں موڑ سکتے (الاعراف ۱۱۳ تا ۱۲۶۔ طٰہٰ ۷۰ تا ۷۳۔ الشعراء ۴۱ تا ۵۱)۔

ایک اور کردار فرعون کے درباریوں میں سے ایک درباری کا ہے۔ وہ دل میں ایمان لا چکا تھا اور اُسے چھپائے ہوئے تھا۔ مگر جب فرعون نے حضرت موسیٰ کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ بھرے دربار میں بے خوف اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس نے کہا "کیا تم لوگ ایک شخص کو صرف اِس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" اِس کے بعد اُس نے ایک طویل اور پُر زور وعظ کہا جسے سُورۂ مومن میں آیت ۲۸ سے ۴۴ تک مسلسل نقل کیا گیا ہے۔ اُس وعظ میں اُس نے کھلم کھلا فرعون اور اُس کی سلطنت کے اعیان و ارکان اور اُس کی قوم کو خدا کے عذاب سے ڈرایا، ان سب کو سیدھا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی، اور اِس بات کی کچھ پروا نہ کی کہ اِس حق گوئی کا کیا نتیجہ اُس کو دیکھنا پڑے گا۔

سب سے زیادہ شاندار کردار اِس میں حضرت موسیٰ کا سامنے آتا ہے۔ وہ ایک ایسی قوم کے فرد تھے جو مصر میں ذلّت کی آخری حد کو پہنچا دی گئی تھی اور اتنی جان بھی نہ رکھتی تھی کہ اپنے بچوں کے قتل پر اُف تک کر سکے۔ خود حضرت موسیٰ پر ایک مصری کے قتل کا الزام تھا جس میں اُن کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے اور وہ ملک چھوڑ کر کئی سال تک مدین میں پناہ گزین رہے تھے۔ اِس حالت میں جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبی مقرر کر کے، اور بس ایک لاٹھی اور ید بیضا کا معجزہ دے کر فرعون جیسے جبّار کی حکومت سے جا ٹکرانے کا حکم دیا تو وہ اللہ کی مدد کے بھروسے پر کسی لاؤ لشکر کے بغیر اُس کے دربار میں جا کھڑے ہوئے۔ اُس کی کسی دھمکی سے مرعوب نہ ہوئے۔ اس کے کسی جبر و ظلم کے آگے نہ دبے۔ سالہا سال تک مسلسل سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ اور جب فرعون نے علانیہ اُن کے قتل کا ارادہ کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر اُس کی دھمکی کو اُس کے مُنہ پر مار دیا کہ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ "میں نے پناہ لے لی اپنے اور تمہارے رب کی ہر اُس متکبّر

سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا" (المومن - ۲۷)۔

دوسری تاریخی مثالیں

اسی طرح قرآن میں دوسری بہت سی تاریخی مثالیں پیش کرکے یہ اچھی طرح واضح کر دیا گیا کہ اسلام کس کردار اور اخلاق کے انسانوں کو پسند کرتا ہے اور کیسے انسان اس کو ناپسند ہیں۔ مثلاً ایک طرف حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام ہیں جو تختِ شاہی پر متمکن ہونے کے باوجود خدا ترسی و آئینِ بندگی سے ذرا نہیں ہٹتے، غرور و تکبّر کے بجائے شکر اور اطاعت کے طریقے پر قائم رہتے ہیں، اور جہاں بھی انہیں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اُن کو آزمائش میں ڈالا گیا ہے، فوراً عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جاتے ہیں (ص: ۱۷ تا ۴۴۔ النمل ۱۹-۴۰، سبا ۳۴-۳۵)۔

ملکۂ سبا ہے جو ایک مشرک قوم کی فرمانروا ہونے کے باوجود جب حق سے آگاہ ہو جاتی ہے تو بلا تأمّل اُسے قبول کر لیتی ہے اور اس کی کچھ پروا نہیں کرتی کہ اُس کی مشرک قوم اُس کا ساتھ دیتی ہے یا نہیں (النمل - ۴۴)۔

سورۂ یٰسٓ کا ایک مردِ حق پرست ہے جس کی قوم تین تین پیغمبروں کی شدید مخالفت کرتی ہے اور انہیں سنگسار کر دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے، مگر وہ اس خطرناک حالت میں بھی شہر کے ایک حصے سے دوڑتا ہوا آتا ہے، قوم کو پیغمبروں کی بات مان لینے کی تلقین کرتا ہے، اُس کی گمراہی دلیل کے ساتھ ثابت کرتا ہے، اپنے ایمان کا صاف صاف اعلان کرتا ہے، اور اس کی پاداش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، پھر بھی اُس کے دل سے ظالموں کے حق میں بددعا نہیں نکلتی، بلکہ وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اُس کی قوم کے لوگ اب بھی جان لیں کہ کس چیز کی بدولت اُس کے رب کے ہاں اُسے عزت اور مغفرت نصیب ہوئی (آیات ۱۳ تا ۲۷)۔

اصحابِ کہف ہیں جو ایک مشرک قوم کے ظلم سے اپنا ایمان بچا لینے کے لیے محض خدا کے بھروسے پر ایک غار میں جا چھپتے ہیں اور اس بات کی کوئی فکر نہیں کرتے کہ اس پناہ گاہ میں وہ کب تک بے سہارا رہ سکیں گے۔ انہیں فکر ہوتی ہے تو بس یہ کہ وہ ایمان کے راستے سے نہ ہٹنے پائیں (الکہف ۱۳ تا ۲۰)۔

دوسری طرف قارون ہے جو حضرت موسیٰ کی قوم کا ایک فرد تھا، مگر دنیا پرستی کی خاطر فرعون کے مقرب درباریوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اُس نے حرام کی دولت کے انبار جمع کیے اور اُن پر خوب اترایا۔ نیک لوگوں نے اُسے بھلائی کی تلقین کی تو اُس نے یہ کہہ کر اُن کی بات رد کر دی کہ مجھے جو کچھ ملا ہے وہ میری قابلیت کا نتیجہ ہے۔ دنیا پر فریفتہ لوگ اُس کی شان و شوکت دیکھ کر اُسے بڑا نصیبے والا سمجھتے اور تمنا کرتے کہ کاش ہمیں بھی یہی نصیب ہو۔ مگر جب اللہ نے اُسے اور اُس کے محل اور اُس کی دولت کو زمین میں دھنسا دیا تو وہ اُن لوگوں کے لیے عبرت بن گیا جو اُس کا سا مرتبہ پانے کی آرزو رکھتے تھے (القصص ۷۶ تا ۸۲)۔

قومِ سبا ہے جس کے ملک کو اللہ نے جنّت بنا رکھا تھا، مگر جب اس نے اللہ کی ناشکری کا راستہ اختیار کیا تو اللہ نے ایک خوفناک سیلاب سے اس کو تباہ کر دیا، اس کے باغ جھاڑ جھنکاڑ بن گئے، اور وہ ایسی پراگندہ ہوئی کہ عرب میں اس کی پراگندگی ضرب المثل بن کر رہ گئی (سبا ۱۵ تا ۱۹)۔

سب سے زیادہ بدتر مثال یہود کی پیش کی گئی جنہوں نے خدا کی نافرمانیاں کر کے تاریخ میں دو بار فسادِ عظیم برپا کیا اور اس کی سزا یہ بھگتی کہ ایک مرتبہ بابل و آشور کے سخت گیر حکمرانوں نے انہیں غارت کیا اور دوسری مرتبہ رومیوں نے انہیں فلسطین سے نکال کر دنیا بھر میں پراگندہ کر دیا (بنی اسرائیل ۴ تا ۷)۔ اسی آخری پراگندگی کے بعد وہ عرب میں پہنچے تھے اور ان کا ایک ایک اخلاقی عیب اہلِ عرب کے سامنے تھا جس کی نشان دہی کر کے قرآن نے لوگوں کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ ان صفات کے انسانوں کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر اپنی دنیوی اغراض اور خواہشات کے لیے خود اپنے مذہب کی تعلیمات کے خلاف اس بھروسے پر گناہ کرتے تھے کہ ہمیں تو معاف کر ہی دیا جائے گا (الاعراف ۔ ۱۶۹)۔ وہ کہتے تھے کہ اُمّیوں (یعنی غیر یہودیوں) کے مال مار کھانے اور ان کے ساتھ بدمعاملگی کرنے سے ہم پر کوئی گناہ عائد نہیں ہوتا (آلِ عمران ۔ ۷۵)۔ ان کے علماء اور درویش لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے تھے (التوبہ ۔ ۳۴)۔ سُود خواری ان میں عام تھی حالانکہ ان کے دین میں اس سے منع کیا گیا تھا (النساء ۔ ۱۶۱)۔ انہوں نے جادو ٹونے اور سِفلی عملیات کا شیطانی کاروبار پھیلا رکھا تھا اور اسے حضرت سلیمان علیہ السّلام کی طرف جھوٹ منسوب کرتے تھے (البقرہ ۔ ۱۰۲)۔ ان کے اندر ہر طرح کی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں مگر انہوں نے یہ طریقہ چھوڑ دیا تھا کہ ایک دوسرے کو برے کاموں سے روکیں، اسی لیے وہ اخلاقی پستیوں میں گرتے چلے جا رہے تھے (المائدہ ۔ ۷۹)۔ یہ وہ عیب ہے جسے قرآن نے تمام قوموں کی بربادی کا ایک عام سبب بیان کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ ہود میں پچھلی قوموں کے پے در پے مبتلائے عذاب ہونے کے واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ "کیوں نہ ان قوموں میں، جو تم سے پہلے گزر چکی ہیں، ایسے اہلِ خیر موجود رہے جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ ایسے لوگ نکلے بھی تو بہت کم جن کو ہم نے ان قوموں میں سے بچا لیا، ورنہ ظالم لوگ تو انہی مزوں میں پڑے رہے جن کے سامان انہیں فراوانی کے ساتھ دیے گئے تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق تباہ کر دے حالانکہ ان کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں" (آیات ۱۱۶ - ۱۱۷)۔

وہ برائیاں جن کی قرآن میں مذمّت کی گئی

یہ ایک اسلوب تھا جس سے قرآن نے تاریخی واقعات کے پیرایہ میں اپنی اخلاقی تعلیمات کو بیان کیا۔ اس کے بعد دوسرا اسلوب یہ ہے کہ اس نے براہِ راست ان بُرے اوصاف اور اعمال اور اخلاق کی مذمّت کی جو

قریش، اور عرب اور عام انسانی معاشرے میں پائے جاتے تھے۔ یہ ایسی برائیاں تھیں جن کو اچھا کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ ان کے مقابلے میں اس نے بتایا کہ وہ اچھے اوصاف، اخلاق اور اعمال کیا ہیں جن سے اسلام افراد اور معاشرے کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ایسی خوبیاں تھیں جنہیں فضائلِ اخلاق ماننے سے انکار کر دینا بھی کسی کے بس میں نہ تھا۔

اب ہم پہلے اُن برائیوں کو بیان کریں گے جن کی قرآن میں مذمت کی گئی اور لوگوں کو بتایا گیا کہ اسلام ان سے انسانی زندگی کو پاک کرنا چاہتا ہے۔

—— "تباہی ہے ہر اُس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے، جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کا مال ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا" (الہمزہ: ۱ تا ۳)۔

—— "تم نے دیکھا اُس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکّے دیتا ہے اور مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا (یعنی نہ خود اپنے نفس کو اس پر آمادہ کرتا ہے نہ دوسروں کو اس بات پر اکساتا ہے کہ غریب و محتاج لوگوں کی بھوک مٹانے کے لیے کچھ کریں)۔ پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں لوگوں کو دینے سے گریز کرتے ہیں" (الماعون)۔

—— "انسان کا حال یہ ہے کہ اُس کا رب جب اسے آزمائش میں ڈالتا ہے (اور بہ آزمائش کی خاطر اُسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا۔ اور جب وہ اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے (اور اس بنا پر) اُس کا رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں (یعنی یہ معیارِ عزت و ذلت نہیں ہے)، بلکہ تم لوگ یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے، اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہو" (الفجر۔ ۱۵ تا ۲۰)۔

—— "جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ تو اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں" (النساء: ۱۰)

—— "تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی فکر نے غفلت میں ڈال رکھا ہے یہاں تک کہ (اسی فکر میں) تم لب گور تک پہنچ جاتے ہو۔ ہرگز نہیں (یہ کوئی بھلائی نہیں ہے)، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا" (التکاثر۔ ۱ تا ۳)۔

—— "اور کسی ایسے شخص کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے،

طعنے دیتا ہے، چغلیاں کھاتا پھرتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، ظلم و زیادتی میں حد سے گزر جانے والا ہے، سخت بداعمال ہے، جفاکار ہے، اور ان سب عیوب کے ساتھ بداصل ہے۔ (اس کا دباؤ قبول نہ کرو) محض اس لیے کہ وہ بہت مال و اولاد رکھتا ہے۔" (القلم: ۱۰ تا ۱۴)۔

——— "تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جو لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جب کہ سب لوگ رب العٰلمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" (المطففین۔ ۱ تا ۶)۔

——— "انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔" (الرحمٰن ۔۹)۔

——— (قیامت کے روز اہل جنت) "مجرمین سے پوچھیں گے کہ کیا چیز تمہیں دوزخ میں لے گئی؟ وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے، اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور (حق کے خلاف) باتیں بنانے والوں میں ہم بھی شامل ہو جاتے تھے اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے۔" (المدثر: ۴۲ تا ۴۶)۔

——— (قیامت کے روز دوزخی کو زنجیروں میں باندھ کر لے جانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا جائے گا) "یہ نہ خدائے بزرگ پر ایمان رکھتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے پر اکساتا تھا۔ لہٰذا آج نہ یہاں اس کا کوئی یارِ غمخوار ہے اور نہ اس کے لیے زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا جسے خطاکاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا۔" (الحاقہ ۳۳ تا ۳۷)۔

——— "وہ کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اس کو نہیں دیکھا؟" (البلد ۶-۷)۔ (ڈھیروں مال اڑا دینے سے مطلب اپنی دولت مندی کی نمائش اور اپنے فخر اور بڑائی کے اظہار کے لیے خوب مال خرچ کرنا ہے اور آخری فقرے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فخر جتانے والا کیا یہ سمجھتا ہے کہ کوئی یہ دیکھنے والا نہیں ہے کہ اس نے یہ دولت کس طرح حاصل کی اور کن کاموں میں کس نیت سے اس کو اڑا دیا؟)

——— "جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں اور اپنے اس خرچ کے بعد کسی پر کوئی احسان نہ جتائیں نہ (اس شخص کو جسے انہوں نے مال دیا ہے) کوئی دکھ دیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیت دی جائے۔" (البقرہ ۔۲۶۲-۲۶۳)۔

——— "اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے۔" (البقرہ ۔۲۶۴)۔

——— "جو لوگ اس مال میں بخل کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو دیا ہے وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے بہتر ہے، بلکہ یہ ان کے لیے بہت برا ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کرتے ہیں وہی قیامت کے

سو وہ اُن کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا" (آل عمران -۱۸۰)۔ بخل صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنا مال نہ اپنی ذات پر خرچ کرے اور نہ اپنے بال بچوں پر، بلکہ بخل یہ بھی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اپنے عیش و آرام اپنی دلچسپیوں اور تفریحوں اور اپنی دولت مندی کی نمائش پر اُٹھاتا رہے مگر کسی نیک کام پر خرچ کرنے کے لیے اُس کا دل آمادہ نہ ہو۔

—— "اللہ ایسے لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور اور اپنی بڑائی پر فخر کرنے والے ہیں، جو بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کرنے کے لیے کہتے ہیں اور اللہ نے جو کچھ اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اُسے چھپاتے ہیں" (النساء - ۳۶ - ۳۷)۔

—— "جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں" (التغابن -۱۶)۔

—— "لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر اور زمین پر اکڑ کر نہ چل۔ اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر اور اپنی آواز پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے" (لقمان: ۱۸-۱۹)۔

—— "اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو" (النساء -۳۲) کسی کو اپنے مقابلے میں کسی حیثیت سے بڑھا ہوا دیکھ کر بے چین ہو جانا ہی رشک و حسد اور رقابت کی اصل جڑ ہے جس کے باعث آدمی دوسرے سے جلنے لگتا ہے، اپنی بھلائی کے لیے اُس کی بُرائی چاہتا ہے، اور جو فضل جائز طریقے سے اُسے نہیں ملتا اُسے حاصل کرنے کے لیے ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے۔

—— "اے نبیؐ، لوگوں سے کہو کہ میرے رب نے تو حرام کیے ہیں فحش کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے، اور گناہ، اور ناحق کی زیادتی، اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر وہ بات کہو جس کے من جانب اللہ ہونے کا تمہیں علم نہیں ہے" (الاعراف -۳۳)۔

—— "اللہ کے نام کو ایسی قسمیں کھانے کے لیے استعمال نہ کرو جن سے مقصود نیکی اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان اصلاح کے کاموں سے باز رہنا ہو" (البقرہ -۲۲۴)۔

—— "اور اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے کوئی معاہدہ کیا ہو اور اپنی قسمیں پختہ کرنے کے بعد توڑ نہ ڈالو جبکہ تم اللہ کو اپنے اوپر کفیل ٹھیرا چکے ہو۔ اللہ تمہارے سب افعال سے باخبر ہے۔ تمہاری حالت اُس عورت کی سی نہ ہو جائے جس نے آپ ہی محنت کے ساتھ سُوت کاتا اور آپ ہی اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ تم اپنی قسموں کو اپنے معاملات میں مکر و فریب کا ہتھیار بناتے ہو تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ کر فائدے میں رہے۔ حالانکہ اللہ اِس (عہد و پیمان) کے ذریعے سے تم کو آزمائش میں ڈالتا ہے" (النحل - ۹۱-۹۲)

—— "اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں اور اُن رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے (آخرت میں) بُرا ٹھکانا ہے" (الرعد-۲۵)۔

—— "بادشاہ جب کسی ملک میں گھُس آتے ہیں تو اُسے بگاڑ دیتے ہیں اور اُس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں" (النمل-۳۴)۔

—— سورہ الحجرات میں جن اخلاقی بُرائیوں کی مذمت کی گئی ہے وہ ہیں ایک دوسرے کا مذاق اڑانا، ایک دوسرے پر طعن کرنا، لوگوں کے بُرے بُرے لقب رکھنا، بے جا بدگمانی کرنا، دوسروں کے حالات کا تجسس کرنا، اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کی بُرائی کرنا (آیات ۱۱-۱۲)۔

—— "قطعاً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے جہالت و نادانی کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کیا" (الانعام-۱۴۰)۔

—— "جب اُن میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بُری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا اسے مٹی میں دبا دے" (النحل-۵۸-۵۹)۔

—— (قیامت کے روز جب خدا کے حضور لوگوں کی پیشی ہو گی تو) "زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قصور میں ماری گئی؟" (التکویر-۸-۹)۔

—— "جو شخص خود کوئی جُرم یا گناہ کرے اور اُس کا الزام کسی بے گناہ پر تھوپ دے اُس نے بڑے بہتان اور گناہ کا بار سمیٹ لیا" (النساء-۱۱۲)۔

—— "تم کسی خائن کے حامی نہ بنو... اللہ کسی خیانت کار اور معصیت پیشہ کو پسند نہیں کرتا" (النساء: ۱۰۵-۱۰۷)۔

—— "خائن اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا پھر ہر شخص کو اُس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا اور لوگوں پر کوئی ظلم نہ ہو گا" (آل عمران-۱۶۱)۔

—— "جانتے بوجھتے ایک دوسرے کی امانتوں میں خیانت نہ کرو" (الانفال-۲۷)۔

—— "جو سُود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتری ہو، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔ اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی کے لیے دو اسی کے دینے والے درحقیقت مال بڑھاتے ہیں" (الروم-۳۹)۔

—— "آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ الا یہ کہ لین دین ہو تمہارے درمیان آپس کی رضامندی سے۔ ایک دوسرے کو ہلاک نہ کرو... تم میں سے جو ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا

اس کو ہم ضرور آگ میں جھونکیں گے۔" (النساء: ۲۹-۳۰)۔

——— "آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے اُن کو اِس غرض کے لیے پیش کرو کہ لوگوں کے مالوں کا کوئی حصہ جان بوجھ کر گناہ کے ساتھ کھا جاؤ" (البقرہ - ۱۸۸)۔ اِس کا مطلب یہ بھی ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کرو۔ اور یہ بھی کہ عدالت میں یہ جانتے ہوئے کہ مال دراصل دوسرے شخص کا ہے محض اِس بنا پر مقدمہ نہ لے جاؤ کہ وہ شخص اپنی ملکیت کا ثبوت نہ دے سکے گا، یا تم کوئی ہیر پھیر کر کے مقدمہ جیت جاؤ گے۔

——— "گواہوں کو شہادت دینے سے انکار نہ کرنا چاہیے جب وہ گواہی کے لیے بلائے جائیں۔۔۔ اور شہادت کو چھپاؤ نہیں۔ جو اُسے چھپاتے اُس کا دل گناہ گار ہے" (البقرہ - ۲۸۲-۲۸۳)۔

——— "جھوٹی بات کہنے سے پرہیز کرو" (الحج - ۳۰)۔ اِسی میں جھوٹی شہادت بھی آجاتی ہے جس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عُدِلَت شہادۃ الزُّور بالاشراك بالله "جھوٹی گواہی شرک باللہ کے برابر رکھی گئی ہے۔"

——— "جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اُس میں سے حصہ پائے گا اور جو بُرائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا" (النساء - ۸۵) یعنی اُس کی بھلائی یا اس کی بُرائی میں وہ بھی حصہ دار ہوگا۔

——— سورۂ نور میں آیت ۴ سے ۲۶ تک پاکدامن عورتوں پر جھوٹے بہتان گھڑنے، اُن کو سُننے اور آگے پھیلانے اور معاشرے کے اندر فحش کی اشاعت کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے جس کی تفصیلات کو چھوڑ کر ہم صرف آیات کے حوالے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اور یہ معاملہ صرف عورتوں ہی کی حد تک خاص نہیں ہے، مردوں پر بہتان لگانا بھی ویسا ہی گناہ ہے جیسا عورتوں پر بہتان لگانا۔

——— "بیویوں کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو" (النساء - ۱۹)۔ "اگر عورتوں کو طلاق دو اور اُن کی عدت پوری ہونے کو آئے تو یا بھلے طریقے سے انہیں روک لو، یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ اُن کو ستانے کے لیے نہ روک رکھو تاکہ ان پر زیادتی کرو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرے گا" (البقرہ ۲۳۱)

——— "عورتوں سے اُن کے سرپرستوں کی اجازت کے ساتھ نکاح کرو اور ان کے مہر معروف طریقے سے ادا کرو کہ وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں، آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کریں" (النساء - ۲۵)

——— "اے نبی! عورتوں سے اِس بات کا عہد لو کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی

اور کسی امرِ معروف میں (اے نبی) تمہاری نافرمانی نہ کریں گی" (الممتحنہ۔۱۲) بہتان گھڑ کر لانے سے مراد دو باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی عورت دوسری عورتوں پر غیر مردوں سے آشنائی کا الزام لگاتے اور اس کا چرچا کرے، دوسرے یہ کہ وہ بچّہ تو کسی کا جنے اور شوہر کو اس دھوکے میں رکھے کہ بچّہ اُس کا ہے۔

۔۔۔۔۔۔ " اے بنی آدم، ہم نے تم پر لباس نازل کیا ہے تاکہ تمہارے جسم کے قابلِ شرم حصّوں کو ڈھانکے اور زینت کا ذریعہ بنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے بنی آدم تم کو شیطان فتنے میں نہ ڈالے جس طرح اس نے تمہارے والدین (آدمؑ و حوّا علیہما السلام) کو جنّت سے نکلوا تھا اور ان کے لباس اُن پر سے اُتروا دیے تھے تاکہ اُن کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھول دے" (الاعراف: ۲۶۔۲۷)۔

۔۔۔۔۔۔ " اے نبیؐ، اِن سے کہو کس نے حرام کر دیا اللہ کی اُس زینت کو جو اُس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے اور کھانے پینے کی پاک چیزوں کو؟" (الاعراف ۳۲) " رہبانیت کی بدعت (عیسائیوں نے) خود نکالی، ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا" (الحدید۔۲۷)۔

۔۔۔۔۔۔ " کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں سے تم نشہ آور چیز بھی بناتے ہو اور اچھا رزق بھی حاصل کرتے ہو" (النحل۔۶۷) یعنی اللہ نے جو اچھا رزق دیا تھا اسے تم ایک بُرے کام، نشہ پیدا کرنے والی چیز بنانے کے لیے استعمال کرتے ہو۔

یہ بُرے اخلاق و اوصاف اور اعمال جن کی قرآن میں مذمّت کی گئی تھی، اِن کی بُرائی سے انکار کرنا کسی کے لیے ممکن نہ تھا، نہ قریش اور اہلِ عرب میں سے کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی ہمّت رکھتا تھا کہ اُس کا معاشرہ ان بُرائیوں سے پاک ہے، اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ جن بُرائیوں سے قرآن روک رہا ہے اُن میں سے کوئی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یا آپ کے اصحاب میں پائی جاتی ہے۔ ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کے سوا جو لوگ بھی صاف اور بے تعصّب ذہن رکھتے تھے ان کے لیے یہ ماننے کے سوا چارہ نہ تھا کہ ان بُرائیوں سے واقعی افراد اور معاشرے کو پاک ہونا چاہیے اور یہ شخص کوئی قصور نہیں کر رہا ہے جو انسانی زندگی کو ان سے پاک کرنا چاہتا ہے۔

جامع اخلاقی ہدایات

اِن بُرائیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ قرآن میں پے در پے ایسی جامع اخلاقی ہدایات دی گئیں جن کی خوبی دِلوں میں کھُب جانے والی تھی، اور کسی سلیم الطبع انسان کے لیے ان کو برحق ماننے بغیر چارہ نہ تھا۔ خصوصیت کے ساتھ یہ اِس بنا پر اور بھی زیادہ پُرکشش تھیں کہ اُنہیں صرف بیان ہی نہیں کیا گیا، بلکہ اِن کو پیش کرنے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم اور اُن پر ایمان لانے والے لوگ رضی اللہ عنہم عملاً ان پر کاربند تھے۔ ذیل میں ہم ان کو سلسلہ وار نقل کرتے ہیں:

"اللہ عدل اور احسان اور رشتہ داروں کی مدد کا حکم دیتا ہے اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق حاصل کرو" (النحل-۹۰)۔

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں سے کہو: آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ کہ اس کے ساتھ (خدائی میں) کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں رزق دیتے ہیں، ان کو بھی دیں گے۔ اور فحش کاموں کے قریب نہ جاؤ خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔ اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے قتل نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔ اور یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے۔ اور جب بات کہو انصاف کی بات کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو[1]۔ ان باتوں کی نصیحت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم سبق لو" (الانعام-۱۵۱-۱۵۲)۔

"تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اس کی۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو ان کو اُف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان کے ساتھ احترام سے بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو، اور دعا کیا کرو کہ پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے سب لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔ اور رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق۔ اور فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ اور اگر تمہیں ان سے (یعنی حاجت مندوں سے) اس بنا پر

---

[1] اللہ کے عہد سے مراد وہ عہد بھی ہے جو انسان اپنے خدا سے کرے، اور وہ عہد بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے، اور وہ عہد بھی جو انسان اور خدا، اور انسان اور انسانوں کے درمیان اسی وقت آپ سے آپ بندھ جاتا ہے جب کوئی شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی معاشرے کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ یہ آخری عہد وہ فطری عہد (Natural Contract) ہے جس کے باندھنے میں اگرچہ انسان کے ارادہ و شعور کا کوئی دخل نہیں ہے لیکن واجب الاحترام ہونے میں وہ شعوری عہد و پیمان سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

پہلوتہی کرنی پڑے کہ ابھی تم اللہ کی اُس رحمت کو جس کے تم اُمیدوار ہو تلاش کر رہے ہو، تو اُنہیں نرمی کے ساتھ جواب دو۔ اور نہ اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ رکھو (کہ بخل کرنے لگو) نہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دو (کہ بے اندازہ خرچ کرنے لگو) اور ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کے حال سے خوب باخبر ہے اور انہیں دیکھ رہا ہے۔ اور اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ درحقیقت اُن کا قتل ایک بہت بڑی خطا ہے۔ اور زنا کے قریب نہ پھٹکو، وہ بہت فحش کام اور بڑا ہی بُرا راستہ ہے۔ اور قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے، مگر حق کے ساتھ۔ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق دیا ہے، پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اُس کی مدد کی جائے گی۔ اور مالِ یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے، یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔ اور عہد کو پورا کرو، عہد کے بارے میں بازپرس ہونے والی ہے۔ پیمانے سے دو تو پورا بھر کر دو اور تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو، یہ اچھا طریقہ ہے اور بلحاظِ انجام بھی یہی بہتر ہے۔ اور کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ کان اور دل سب ہی کی بازپرس ہونی ہے۔ اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ اِن اُمور میں سے ہر ایک کا بُرا پہلو تمہارے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو (اے نبیؐ) تمہارے رب نے تم پر وحی کی ہیں" (بنی اسرائیل۔ ۲۳ تا ۳۹)۔

——— "اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ (بندگی و عبادت میں) کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ اور پڑوسی رشتہ دار سے، اجنبی ہمسائے سے، پہلو کے ساتھی سے (یعنی ہم نشین ساتھی سے یا جس سے وقتی طور پر آدمی کا ساتھ ہو جائے) مسافر سے، اور اُن لونڈی غلاموں سے جو تمہاری ملکیت میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو" (النساء۔ ۳۶)۔

——— "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف (یعنی چند ظاہری مذہبی رسوم کو ادا کر دیا) بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ اور روزِ آخر اور فرشتوں اور کتاب[1] اور پیغمبروں کو سچے دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مدد مانگنے والوں کو دے اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں جو معاہدہ کریں تو

---

[1] یعنی خدا کی کتاب جو اُس نے کسی نبی کے ذریعے سے بھی ہو، اور خصوصاً قرآن، جو اس نے اپنے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

اپنے عہد کو وفا کریں اور تنگی و مصیبت میں صبر کریں اور (حق و باطل کی) جنگ میں ثابت قدم رہیں۔ یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی متقی ہیں" (البقرہ۔ ۱۷۷)۔

"یقیناً فلاح پائی اُن ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں، جو لغویات سے دُور رہتے ہیں، زکوٰۃ (پاکیزگی کے طریقے) پر عامل ہوتے ہیں، جو (حرامکاری اور بدکاری) سے اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور مملوکہ لونڈیوں کے کہ اُن پر (محفوظ نہ رکھنے میں) وہ قابلِ ملامت نہیں ہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی زیادتی کرنے والے ہیں۔ اور (فلاح پائی اُن ایمان لانے والوں نے) جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھتے ہیں، اور اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں[1]" (المومنون۔ ۱ تا ۹)۔

"رحمان کے (اصلی) بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں[2]، اور جاہل اُن کے منہ آئیں تو کہتے ہیں کہ تم کو سلام۔ جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔ جو دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب کو ہم سے پھیر دے، اس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا مستقر اور مقام ہے۔ جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہیں پکارتے، اور کسی جان کو ناحق قتل نہیں کرتے جسے اللہ نے حرام کیا ہے، اور زنا نہیں کرتے۔ یہ کام جو کوئی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائیگا اور اُس میں وہ ہمیشہ ذلت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ اِلّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عمل صالح کرنے لگا ہو۔ ایسے لوگوں کی بُرائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا اور وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کر کے نیک عمل اختیار کرتا ہے وہ اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے۔ اور (رحمان کے اصلی بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے، اور کسی لغو چیز پر اُن کا گزر ہو جاتے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں جنہیں اُن کے رب کی آیات سُنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اُس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔ جو دُعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا" (الفرقان۔ ۶۳ تا ۷۴)۔

"جو کچھ بھی تم لوگوں کو (یہاں) دیا گیا ہے وہ محض دُنیا کی چند روزہ زندگی کا سر و سامان ہے، اور

---

[1] یعنی ان کو ضائع نہیں کرتے۔ اُن کی پوری شرائط اور اُن کے اوقات کی پابندی کے ساتھ ان کو صحیح طریقے سے ادا کرتے ہیں (حاشیہ از مؤلف)

[2] یعنی اکڑ کر نہیں چلتے (حاشیہ از مؤلف)

جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہی بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں[1]۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور فحش کاموں سے بچتے ہیں۔ اگر کبھی انہیں غصہ آجائے تو درگزر کر جاتے ہیں۔ جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں، اور جو رزق ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں[2]، اور جب اُن پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے (جیسی کی گئی ہو)، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو لوگ اپنے اُوپر ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جو صبر کرے اور درگزر کر جائے، تو یہ بڑی اولو العزمی کے کاموں میں سے ہے" (الشوریٰ: ۳۶ تا ۴۳)۔

ـــــ "انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو جَزَع فَزَع کرنے لگتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے، مگر وہ لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے[3]۔ جو روزِ جزا کو برحق مانتے ہیں اور اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں کیونکہ ان کے رب کا عذاب ایسی چیز نہیں ہے جس سے

---

[1] یعنی اپنی طاقت اور ذہانت و قابلیت اور ذرائع و وسائل پر نہیں بلکہ اللہ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہیں اور یہ اعتماد رکھتے ہیں کہ اُسی کی دی ہوئی ہدایت صحیح و برحق ہے، اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کے ہاں کسی نیکی کا اجر ضائع نہ ہوگا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] رزق سے مراد رزقِ حلال ہے۔ قرآن میں کہیں حرام مال کو اللہ کا رزق نہیں کہا گیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ (۱) جو رزقِ حلال ہم نے ان کو دیا ہے اُسی میں سے خرچ کرتے ہیں، اپنے اخراجات کے لیے حرام مال پر ہاتھ نہیں مارتے۔ (۲) اُس رزق کو سمیٹ سمیٹ کر نہیں رکھتے بلکہ اسے خرچ کرتے ہیں۔ (۳) اس میں سے راہِ خدا میں بھی خرچ کرتے ہیں، سب کچھ اپنی ذات ہی کے لیے وقف نہیں کر دیتے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[3] یعنی انہوں نے خود طے کر رکھا ہے کہ اُن کے مالوں میں سے اتنا سائل اور محروم کا حق ہے جسے وہ ادا کرتے رہیں گے۔ سائل سے مراد وہ محتاج شخص ہے جو اُن سے مدد مانگے۔ اور محروم سے مراد وہ شخص ہے جس کے متعلق اُن کو معلوم ہو جائے کہ یہ بیچارا اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے رزق پانے سے محروم رہ گیا ہے۔ وہ خواہ مانگنے نہ آئے، مگر یہ اُس کی حالت سے واقف ہونے کے بعد خود جا کر اُس کی مدد کرتے ہیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

کوئی بے خوف ہو۔ جو (عریانی اور بدکاری سے) اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، سوائے اپنی بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے (جن سے محفوظ نہ رکھنے میں) اُن پر کوئی ملامت نہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس کرتے ہیں۔ جو اپنی گواہیوں میں راستبازی پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں" (المعارج - ۱۹ تا ۳۴)۔

—— (اہلِ جنت وہ لوگ ہیں،) "جو اپنی نذر[1] پوری کرتے ہیں اور اُس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ جو اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تمہیں صرف اللہ کے لیے کھلا رہے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکریے کے طالب نہیں ہیں، ہمیں تو اپنے رب سے اُس دن کے عذاب کا ڈر ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا" (الدھر - ۷ تا ۱۰)۔

—— "دوڑ کر چلو اُس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اُس جنت کی طرف لے جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، جو اُن خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو خوشحالی اور تنگ حالی، ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں، ایسے ہی نیک لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی بُرا کام اُن سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے) وہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں، اور اللہ کے سوا کون گناہوں کا معاف کرنے والا ہے؟ وہ دیدہ و دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے" (آلِ عمران - ۱۳۳ تا ۱۳۵)۔

فضائلِ اخلاق کی تعلیم

یہ جامع اخلاقی ہدایات بجائے خود ایسی تھیں جن سے کوئی صلاحیت پسند انسان جس میں کچھ بھی اخلاقی حِس اور خیر و شر کی تمیز موجود تھی، متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا لیکن قرآن نے صرف اِنہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ فضائلِ اخلاق میں سے ایک ایک کو نمایاں کر کے بتایا کہ اسلام انسان کو کن بھلائیوں سے آراستہ کرنا چاہتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ نے عملاً یہ دکھا دیا کہ وہ بھلائیاں صرف زبان سے کہنے ہی کی نہیں ہیں بلکہ اسلام نے جس زندگی میں بھی راہ پائی ہے وہ ان بھلائیوں سے آراستہ ہو گئی ہے۔ یہاں اُن سب کو تفصیل کے ساتھ نقل کرنا مشکل ہے، اِس لیے ہم ان میں سے چند کو بطور مثال نقل کرتے ہیں۔

—— "نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ

---

[1] نذر سے مراد کوئی ایسا نیک کام ہے جسے آدمی نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرنے کا خود عہد کیا ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

سخت سزا دینے والا ہے" (المائدہ-۲)۔

۔۔۔ (حضرت موسیٰ نے) عرض کیا کہ میرے رب، جو احسان تو نے مجھ پر کیا ہے اس کے بعد میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا" (القصص-۱۷)۔

۔۔۔ "برائی کی مدافعت ایسی بھلائی سے کرو جو بہترین ہو۔ جو باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں۔ تم دُعا کرو کہ "اے میرے پروردگار میں شیطان کی اُکساہٹوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں"[1] (المومنون-۹۶ تا ۹۸)۔

۔۔۔ "وہ بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب بیہودہ بات اُنہوں نے سُنی تو اس کا جواب دینے سے پرہیز کیا اور کہا کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ تم کو سلام ہے۔ ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہتے" (القصص-۵۴-۵۵)۔

۔۔۔ "وہ آخرت کا گھر (یعنی جنت) ہم اُن لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں" (القصص-۸۳)۔

۔۔۔ (یہ اہل ایمان وہ لوگ ہیں) "جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے روکیں گے" (الحج-۴۱)۔

۔۔۔ (اللہ کے نور کی طرف ہدایت پانے والے) "اُن گھروں میں پائے جاتے ہیں جنہیں بلند کرنے کا اور جن میں اپنے نام کے ذکر کا اللہ نے اذن دیا ہے۔ اُن میں ایسے لوگ صبح و شام اُس کی تسبیح کرتے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کر دیتی۔ وہ اُس دن سے ڈرتے ہیں جس میں دل اُلٹنے اور دیدے پتھرا جانے کی نوبت آجاتے گی" (النور-۳۶-۳۷)

۔۔۔ "اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہی خسارے میں رہنے والے ہیں" (المنافقون-۹)۔

۔۔۔ "اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، انصاف کے علمبردار بنو اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ (تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی) زد تمہارے اپنے اُوپر یا تمہارے والدین اور قریب ترین رشتہ داروں پر پڑ

---

[1] یعنی خدا سے پناہ مانگو کہ شیطان کبھی تم کو گالی کا جواب گالی سے، جھوٹ کا جواب جھوٹ سے، ظلم کا جواب ظلم سے، بے انصافی اور حق ماری کا جواب بے انصافی اور حق ماری سے دینے پر آمادہ نہ کر سکے (حاشیہ از مؤلف)

کیوں نہ پڑتی ہو، صاحب معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ اُن کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے" (النساء۔ ۱۳۵)۔

——— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے، اور اللہ سے ڈرو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے" (المائدہ ۔ ۸)۔

——— "جو لوگ تم سے لڑتے ہیں اُن سے اللہ کی راہ میں لڑو اور حد سے نہ گزر جاؤ۔ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا" (البقرہ ۔ ۱۹۰)۔

——— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور راست اور درست بات کیا کرو" (الاحزاب ۔ ۷۰)۔

——— "جو کوئی تم پر زیادتی کرے اُس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اُس نے کی ہے اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بُرائی سے بچنے والوں کے ساتھ ہے" (البقرہ ۔ ۱۹۴)۔

——— "اگر تم بدلہ لو تو بس اُسی قدر لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو۔ لیکن اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں ہی کے لیے بہتر ہے" (النحل ۔ ۱۲۶)۔

——— "تم اہل کتاب اور مشرکین سے بُری اذیت ناک باتیں سنو گے۔ (ان اشتعال انگیز باتوں پر) اگر تم صبر کرو اور خدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے" (آل عمران ۔ ۱۸۶)۔

——— "اللہ بدگوئی پر زبان کھولنے کو پسند نہیں کرتا اِلّا یہ کہ جس پر ظلم کیا گیا ہو[1]" (النساء ۔ ۱۴۸)۔

——— "نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں، جو اللہ کے عہد کو وفا کرتے ہیں اور معاہدے توڑتے نہیں ہیں، جو اُن روابط کو جوڑتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے اور اِس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں اُن سے سخت حساب نہ لیا جائے، جو اپنے رب کی خوشنودی کی خاطر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ بھی رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں اور بدی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں" (الرعد۔ ۱۹ تا ۲۲)۔

——— "اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے حوالے کرو[2]، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ

---

[1] یعنی مظلوم کو ظالم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] اِس ارشاد میں مسلم معاشرے کے افراد کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ امانتوں میں خیانت نہ کریں بلکہ جو امانت بھی

کرو تو عدل کے ساتھ کرو" (النساء: ۵۸)۔

—— "اگر تم میں سے کوئی شخص کسی پر اعتماد کر کے کوئی امانت اس کے حوالے کرے تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ اپنے رب سے ڈرے" (البقرہ-۲۸۳)۔

—— "تم نیکی کا مرتبہ نہیں پا سکتے جب تک وہ چیزیں (راہِ خدا میں) خرچ نہ کرو جو تم کو محبوب ہیں۔ اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو گے، اللہ کو اس کا علم ہے" (آلِ عمران-۹۲)۔

—— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصّہ (راہِ خدا میں) خرچ کرو اور بُری سے بُری چیز چھانٹ کر نہ دو، حالانکہ تم خود اُسے کبھی نہ لوگے اِلّا یہ کہ اغماض برت جاؤ۔ اللہ (تمہارے ایسے خرچ سے) بے نیاز اور ستودہ صفات ہے" (البقرہ-۲۶۷)

—— "اگر علانیہ صدقات دو تو یہ بھی اچھا ہے، اور اگر اُن کو مخفی رکھو اور غریب لوگوں کو دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ تمہاری بہت سی بُرائیاں (اس طرزِ عمل سے) محو ہو جاتی ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے" (البقرہ-۲۷۱)۔

—— (صدقات خاص طور پر) "اُن فقراء کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں ایسے گھِر گئے ہیں کہ زمین میں (اپنی کسبِ معاش کے لیے) دَوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ اُن کی خودداری کی وجہ سے ناواقف آدمی اُن کو خوشحال سمجھتا ہے، مگر تم اُن کے بشرے سے اُن کی حالت جان سکتے ہو۔ وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ نہیں مانگتے۔ ایسے لوگوں پر تم جو مال بھی خرچ کرو گے اللہ کو اس کا علم ہے" (البقرہ-۲۷۳)۔

—— (جہنم کی آگ سے) "وہ نہایت پرہیزگار آدمی دُور رکھا جائے گا جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے۔ اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اُسے چکانا ہو۔ وہ تو صرف اپنے ربِّ برتر کی خاطر یہ کام کرتا ہے" (اللیل-۱۷ تا ۲۰)۔

—— "اور خرچ کرو اُس مال سے جو ہم نے تم کو دیا ہے قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آ جائے اور وہ کہے کہ میرے رب، کاش تو مجھے تھوڑی سی مہلت دے دیتا کہ میں صدقہ دیتا اور صالحوں میں سے ہو جاتا"

۴- ان پر اعتماد کر کے اُن کے سپرد کی گئی ہو اُسے ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔ اور بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کو بطورِ اجتماعی کے کاسفرمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ذمّہ داری کے مناصب (Positions of Trust) ایسے لوگوں کے حوالہ کرو جو بارِ امانت اُٹھانے کے اہل ہوں۔ مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری اور ملک کی حکمرانی کے مرتبے نااہل بدیانت کم ظرف اور بدعمل لوگوں کو نہ دو، کیونکہ بُرے لوگوں کی قیادت پوری قوم کو خراب کر دیتی ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

(المنافقون ۔ ۱۰)[1]

— "اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا بُرائی (کرنے والوں) کو معاف کر دو تو اللہ (کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ) بڑا معاف کرنے والا ہے (حالانکہ سزا دینے پر) پوری قدرت رکھتا ہے" (النساء ۔ ۱۴۹) ۔

— "آپس کے معاملات میں فیّاضی کو نہ بھولو" (البقرہ ۔ ۲۳۷) ۔

— "قرض دار تنگ دست ہو تو اس کا ہاتھ کھلنے تک اُسے مہلت دو اور اگر صدقہ کر دو (یعنی قرض معاف کر دو) تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو" (البقرہ ۔ ۲۸۰) ۔

— "یتیموں کے مال اُن کو دو اور اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو اور نہ اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھا جاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے" (النساء ۔ ۲) ۔

— "یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان کے اندر (اپنے معاملات خود سنبھالنے کی) اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ فضول خرچی کر کے جلدی جلدی ان کا مال اس اندیشے سے کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنا حق مانگیں گے۔ جو شخص مالدار ہو وہ (ان کی جائداد کے انتظام کا معاوضہ لینے میں) پرہیز سے کام لے، اور جو نادار ہو وہ معروف طریقے سے کھائے (یعنی جیسے ہر انصاف پسند آدمی معقول معاوضہ قرار دے)۔ پھر جب اُن کے مال انہیں واپس دو تو ان پر گواہ بنا لو، اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے" (النساء ۔ ۶) ۔

— (اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے) "اُن یتیم لڑکیوں کے حق میں جن کے واجبی حق تم ادا نہیں کرتے اور اُن سے نکاح کرنے سے باز رہتے ہو اور اُن بچوں کے حق میں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے، اور ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو" (النساء: ۱۲۷) ۔

— "جو لوگ نکاح کا موقع نہ پاتے ہوں وہ عفّت مآبی اختیار کریں[2] یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے" (النور ۔ ۳۳)

— "اے نبی، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں (غیر عورتوں کی دید سے) بچا کر رکھیں، اور شرمگاہوں

---

[1] یعنی صدقہ ایسی حالت میں کرو جب تم صحیح و تندرست ہو۔ اِس کا انتظار نہ کرو کہ مرنے کا وقت آ جائے گا تو صدقہ دے دیں گے۔ صدقے سے مراد ہے سچی نیت کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے مال دینا۔ افسوس ہے کہ اُردو زبان میں یہ لفظ بڑے ہی گھٹیا مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] یعنی غیر شادی شدہ لوگ ناجائز طریقوں سے خواہشاتِ نفس پوری نہ کریں (حاشیہ از مؤلف)

و بدکاری سے) اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں . . . اور مومن عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں بچائیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنی زینت کا اظہار نہ کریں بجز اُس کے جو خود ظاہر ہو جائے، اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں، اور اپنی زینت نہ ظاہر کریں مگر ان لوگوں کے سامنے (جن کی تفصیل سُورۂ نُور کی اِس آیت میں دی گئی ہے)، اور اپنے پاؤں زمین پر اِس طرح مارتی ہُوئی نہ چلیں کہ جو زینت انہوں نے چُھپا کر رکھی ہے اُس کا علم لوگوں کو ہو جائے" (النّور: ۳۰ - ۳۱)۔

—— "اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے اِس طرح بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی میں مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو اور پچھلے دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو" (الاحزاب: ۳۲ - ۳۳)۔

—— "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، حرام نہ کر لو اُن پاک چیزوں کو جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کی ہیں، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور اللہ نے جو حلال اور پاک رزق تمہیں دیا ہے اسے کھاؤ، اور اُس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو" (المائدہ: ۸۷ - ۸۸)۔

—— "اور ہم اچھے اور بُرے حالات میں ڈال کر تمہاری آزمائش کر رہے ہیں[1]" (الانبیاء: ۳۵)۔

—— "مومن مرد اور مومن عورتیں سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرتے ہیں" (التوبہ: ۷۱)۔

—— "جو عزت چاہتا ہو (اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ) عزت ساری کی ساری اللہ کے ہاتھ میں ہے اُس کے ہاں جو چیز اُوپر چڑھتی ہے وہ صرف پاکیزہ قول ہے اور عملِ صالح اس کو اُوپر چڑھاتا ہے" (فاطر: ۱۰)۔

صالح افراد ہی نہیں، صالح معاشرہ بھی مطلوب ہے

اِن فضائلِ اخلاق کے ساتھ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا کہ اسلام کا مقصود صرف صالح افراد تیار کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انہیں جوڑ کر ایک صالح معاشرہ بنانا بھی ہے، کیونکہ اس کے بغیر نوعِ انسانی کا خُسران سے بچنا اور فلاح پانا ممکن نہیں ہے۔ اِس مضمون کو اگرچہ بہت سی جگہ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے، مگر ہم صرف دو مقامات

---

[1] یعنی اِس بات کی آزمائش کر رہے ہیں کہ اچھے حالات میں تم متکبّر، ظالم، خدا فراموش اور بندۂ نفس تو نہیں بن جاتے، اور بُرے حالات میں پست اور ذلیل اور ناجائز طریقے تو اختیار نہیں کرنے لگتے۔ یہ ایک کم ظرف آدمی کا کام ہے کہ اچھے حالات آئیں تو فرعون بن جائے اور بُرے حالات آئیں تو زمین پر ناک رگڑنے لگے یا اُن کو بدلنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کرنے پر اُتر آئے۔ مومن کا کام ہر حال میں راستی پر قائم رہنا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

بطور مثال لیتے ہیں۔

(۱) اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۔ (البلد ۸ تا ۱۷)

"کیا ہم نے انسان کو دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور (بھلائی اور برائی کے) دونوں نمایاں راستے نہیں دکھا دیے ؟ مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہ کی اور تم کیا جانو کہ وہ دشوار گزار گھاٹی کیا ہے ؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا، یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم کو یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔ پھر یہ کہ آدمی اُن لوگوں میں شامل ہو جو ایک دوسرے کو صبر اور رحمدلی کی تلقین کریں"۔

صالح معاشرے کی خصوصیات

اس میں غلام کو آزاد کرانا، یا قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا انفرادی نیکیاں ہیں جنہیں اُن بے شمار انفرادی نیکیوں میں سے بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے جو افراد میں ہونی چاہییں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ایسے نیک افراد بکھرے ہوئے نہ رہیں بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ مل کر ایک جماعت بن جائیں جو ایمان لانے والے اور ایک دوسرے کو صبر اور خلقِ خدا پر رحم کھانے کی تلقین کرنے والے ہوں، تاکہ ان سے ایک صابر اور رحیم معاشرہ وجود میں آئے۔ ایسا معاشرہ جس کا پاکیزہ اخلاق پر ثابت قدم ہو۔ بُرائیوں اور بُرائی کی ترغیبات سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ راہِ حق کی مشکلات اور مزاحمتوں کا پامردی سے مقابلہ کرے۔ راستی پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔ اور خلقِ خدا کے لیے ظالم و جابر اور سنگدل نہ ہو بلکہ رحیم و شفیق ہو۔ اس قسم کا معاشرہ خدا اور آخرت پر ایمان اور رسُول اور اُس کے لائے ہوئے قانون پر غیر متزلزل یقین و اعتماد کے بغیر نہیں بن سکتا۔ اس لیے لامحالہ یہ خوبیاں ایک مومن معاشرے ہی میں ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہیں جو دنیا کی زندگی میں پیش آنے والی کسی آزمائش میں بھی اپنی خوبیوں سے منحرف نہ ہو سکیں۔

(۲) وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۔ (العصر)

"زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لاتے اور نیک عمل کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے"۔

زمانے سے مُراد گزرا ہُوا زمانہ (یعنی تاریخ) بھی ہے، اور گزرتا ہُوا زمانہ بھی جو ہر آن گزر رہا ہے۔ اُس کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُس حقیقت پر گواہ ہے جو آگے بیان کی جا رہی ہے۔

انسان کا لفظ مُطلقًا استعمال ہُوا ہے، اِس لیے اِس سے مُراد ایک ایک انسان بھی ہے، انسانوں کا ہر مجموعہ بھی، اور پُوری نوعِ انسانی بھی۔

خسارے کا لفظ گھاٹے اور نقصان اور ناکامی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، جو فلاح، نفع اور کامیابی کی ضد ہے۔

وہ چار صفات جن پر نوعِ انسانی کی فلاح کا مدار ہے

اِن چند مختصر سے جملوں میں قسم کھا کر قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ جو تاریخ گزر چکی ہے، اور جو حال اب گزر رہا ہے، دونوں اِس بات پر گواہ ہیں کہ انسان بحیثیتِ شخص، بحیثیتِ قوم اور بحیثیتِ نوع، فلاح نہیں بلکہ خسارے میں مبتلا ہے، اور اِس خسارے سے صرف وہی لوگ محفوظ ہیں اور رہے ہیں جن میں یہ چار صفتیں پائی گئی ہیں اور پائی جاتی ہیں۔

ایمان

یعنی اِس بات پر پُورا یقین کہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی خالق، مالک، رازق، حاجت روا، معبُود اور حاکم ہے جس کی بندگی و اطاعت اور پرستش کرنی چاہیے۔ اور اللہ کے رسُول کی لائی ہوئی ہدایت ہی برحق ہے جس کی پیروی کرنی چاہیے۔ اور زندگی صرف یہی دنیا کی عارضی زندگی نہیں ہے بلکہ اِس کے بعد ایک دوسری مستقل اور پائیدار زندگی بھی آنے والی ہے جس میں ہم کو اپنے اُن اعمال کا حساب دینا ہے جو ہم نے دنیا میں کیے ہیں اور اُن کی جزا یا سزا پانی ہے۔ یہ ایمان فلاح پانے اور خسارے سے بچنے کے لیے شرطِ اوّل ہے کیونکہ اِس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہیں ہے جو سیرت و اخلاق اور کردار کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہو اور جس پر ایک پاکیزہ زندگی کی عمارت قائم ہو سکتی ہو۔ اِس کے بغیر انسانی زندگی خواہ بظاہر کتنی ہی خوشنما ہو، اُس کا حال ایک بے لنگر کے جہاز کا سا ہوتا ہے جو اغراض اور خواہشات اور تخیّلات کی موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اور کہیں قرار نہیں پکڑ سکتا۔

حُسنِ عمل

ایمان کے ساتھ اِس صفت کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے۔ ایمان وہ بیج ہے جس کے بغیر نیک اعمال کا درخت پیدا نہیں ہو سکتا، خواہ بعض لوگوں کی زندگیوں میں ایمان کے بغیر کچھ ظاہری اور ناپائیدار خوبیاں اور نیکیاں پائی جاتی ہوں۔ اور درخت وہ نیک اعمال ہیں جن کا اُس انسان کی زندگی میں رُونما ہونا اور

نشوونما پانا عقل اور منطق کا لازمی تقاضا ہے جس کے دل میں ایمان کا بیج بویا جا چکا ہو۔ اگر کہیں یہ بیج بویا گیا ہو اور اس سے حُسنِ عمل کا درخت پیدا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا دل اِس بیج کی قبر بن گیا ہے اور خسارے سے اُس کے بچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے، کیونکہ ایمان کے ساتھ نیک اعمال خسارے سے بچنے کی دوسری لازمی شرط ہیں۔

مذکورۂ بالا دونوں صفتیں انفرادی حیثیت سے افراد میں پائی جا سکتی ہیں اور وہ صرف انفرادی فلاح کی ضامن ہو سکتی ہیں۔ مگر اجتماعی فلاح اِس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ ایسے نیک افراد سے ایک معاشرہ بنے اور اُس میں وہ مزید دو صفتیں بھی پائی جائیں جنہیں اِس سورہ میں خسارے سے بچنے کے لیے بطورِ شرط بیان کیا گیا ہے۔

ایک دوسرے کو حق کی نصیحت

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک، صحیح اور سچی اور مطابقِ عدل و انصاف اور مطابقِ حقیقت بات خواہ وہ عقیدہ و خیال سے متعلق ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا یا خود اپنے نفس کا۔ پس حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ صالح اہلِ ایمان کا معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اُس میں باطل سر اُٹھا رہا ہو اور حقوق پامال کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اُس کا تماشا دیکھتے رہیں۔ بلکہ اُس کا اجتماعی ضمیر ایسا زندہ ہو، اور اس کے افراد اِس بات کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوں کہ جہاں بھی باطل سر اُٹھائے یا کوئی حق پامال ہوتا نظر آئے، وہاں باطل کی مخالفت اور حق کی حمایت کرنے کے لیے لوگ اٹھ کھڑے ہوں۔ کوئی شخص صرف خود ہی حق پرست اور راست باز اور عادل و منصف ہونے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے، بلکہ دوسروں کو بھی اِسی طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہی وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی تنزل و انحطاط سے بچانے کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر کوئی معاشرہ اِس عنصر سے خالی ہو تو وہ خسران سے نہیں بچ سکتا، بلکہ اجتماعی بگاڑ بڑھتا رہے تو افراد کا بھی حق پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک دوسرے کو صبر کی تلقین

صبر کے لغوی معنی روکنے اور باندھنے یا رُکنے اور باز رہنے کے ہیں۔ اور عربی زبان کے استعمالات میں یہ لفظ تحمل، برداشت، ضبط، ثابت قدمی، ارادے کی مضبوطی، اور ہمت و جرأت کے ساتھ کسی مزاحم طاقت کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ لیکن قرآن مجید میں اِس لفظ کو اتنے وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی بن جاتی ہے۔

صبر کا قرآنی مفہوم

قرآن میں سو سے زیادہ مقامات پر یہ لفظ آیا ہے۔ اگر ان سب مقامات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مفہوم میں حسبِ ذیل معانی شامل ہیں:

اپنے جذبات و میلانات اور خواہشات و رجحانات کو حدود اللہ کا پابند بنانا۔

خدا کی نافرمانی میں خواہ کیسے ہی فائدے اور کیسی ہی لذتیں حاصل ہونے کے مواقع نظر آتے ہوں، ان کے لالچ میں مبتلا ہو کر پھسل نہ جانا، اور خدا کی فرمانبرداری میں جو نقصانات، تکلیفیں اور محرومیاں بھی پیش آئیں انہیں برداشت کرتے جانا۔

عمر بھر ضبطِ نفس سے کام لے کر گناہ کی جانب شیطان کی ہر ترغیب اور نفس کی ہر خواہش کو رد کرتے رہنا۔ ہر طمع اور خوف کے مقابلے میں حق پرستی پر قائم رہنا۔ ہر اس اذیت اور نقصان کو گوارا کر لینا جو اس دنیا میں راست بازی اختیار کرنے سے پہنچے، اور ہر اس فائدے اور لذت کو ٹھکرا دینا جو ناجائز طریقے اختیار کرنے سے حاصل ہو۔

حرام خوروں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر رشک و تمنا کے جذبات سے بے چین ہونا تو درکنار ان کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھنا اور ٹھنڈے دل سے یہ سمجھ لینا کہ ایک ایماندار آدمی کے لیے اس چمکدار گندگی سے وہ بے رونق طہارت ہی بہتر ہے جو اللہ اپنے فضل سے اس کو بخشے۔

ایمان لانے کے سارے خطرات کو اپنی جان پر جھیل جانا۔ دشمنانِ حق کے ہر ظلم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا۔ مخالفتوں کے طوفان اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں حق کی حمایت پر جمے رہنا اور باطل کے آگے دبنے یا اس سے مصالحت کر لینے کا خیال تک دل میں نہ لانا۔

مخالفین کی زیادتیوں اور اہانتوں کے طعن و استہزاء اور کذب و افتراء پر بے ساختہ مشتعل نہ ہو جانا بلکہ سکون کے ساتھ اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے تبلیغ و اصلاح کا کام حکمت کے ساتھ کرتے رہنا خواہ اس کے نتیجہ خیز ہونے کے امکانات بظاہر کتنے ہی دور کیوں نظر آتے ہوں۔

اشتعال انگیزیوں پر بے صبر ہو کر جلد بازی میں کوئی ایسا غلط کام نہ کر بیٹھنا جو دعوتِ حق کی مصلحت کے خلاف اور مقصدِ دعوت کے لیے نقصان دہ ہو۔

سالہا سال تک ان باطل پرست اشرار کے مقابلے میں حق کی خاطر جدوجہد کرتے رہنا جو اخلاق کی ساری حدیں پھاند جاتے ہوں اور طاقت و اقتدار کے نشے میں بدمست ہو رہے ہوں، مگر کسی حال میں راستی سے ہٹ کر ان کی سی ناروا تدبیریں اختیار کرنے پر نہ اتر آنا۔

باطل کے مقابلے میں حق کی کمزوری اور اقامتِ حق کی سعی کرنے والوں کی مسلسل ناکامیاں اور ائمۂ باطل کی سرفرازیاں اور کامیابیاں دیکھ کر مایوس و دل شکستہ نہ ہونا کبھی گھبراہٹ اور بے حوصلگی اور بدحواسی میں مبتلا ہو کر یہ نہ سمجھنا کہ اقامتِ حق کی سعی لاحاصل ہے اور اب یہی مناسب ہے کہ اُس ذرا سی دینداری پر قناعت کر کے بیٹھ رہا جائے جس کی گنجائش کفر و فسق کی سلطانی میں مل رہی ہو۔ بد سے بدتر حالات میں بھی عزم و ہمت کے ساتھ حق کی سربلندی کے لیے کوشش جاری رکھنا۔

ایک مومنِ صابر یہ سب کچھ اس لیے نہیں کرتا کہ اس کے ثمرات و نتائج اسی دنیا میں اُسے حاصل ہو جائیں بلکہ اِس اعتماد پر کرتا ہے کہ مرنے کے بعد جو دوسری زندگی آنے والی ہے اُس میں وہ اپنے اِس کیے کا پھل پائے گا۔

پھر وہ ایسا چھچھورا بھی نہیں ہوتا کہ اچھا وقت آئے اور دُنیا میں کامیابیاں اُس کے قدم چومیں تو اکڑ جائے اور فخر و غرور میں مبتلا ہو کر فرعون بن جائے، اور بُرا وقت آئے تو بلبلا اُٹھے اور اُس وقت کو ٹالنے کے لیے کوئی ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے میں بھی تامّل نہ کرے۔

وہ ہر حالت میں اپنا توازن برقرار رکھتا ہے۔ وقت کی ہر گردش کے ساتھ اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ ہمیشہ ایک معقول اور صحیح رویّہ پر قائم رہتا ہے۔ حالات سازگار ہوں اور وہ دولت و اقتدار و ناموری کے آسمانوں پر چڑھ رہا ہو تو اپنی بڑائی کے نشے میں بدمست نہیں ہوتا۔ اور کسی وقت مصائب و مشکلات کی چکّی اُسے پیسے ڈال رہی ہو تو اپنے جوہرِ انسانیت کو اُس میں ضائع نہیں کر دیتا۔ خدا کی طرف سے آزمائش خواہ نعمت کی شکل میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، اُس کی بُردباری اپنے حال پر قائم رہتی ہے۔

سُورۂ عصر کا منشا یہ ہے کہ انسان خسارے سے صرف اسی صورت میں بچ سکتا ہے کہ افراد فرداً فرداً بھی مومن، صالح، حق پرست اور صابر ہوں، اور ان سے ایک ایسا معاشرہ بھی وجود میں آئے جس میں ہر فرد دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرے۔

اخلاقی تعلیم کا یہ ہتھیار وہ زبردست ہتھیار تھا جس کا کوئی توڑ مشرکینِ قریش اور کفّارِ عرب کے پاس نہ تھا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کے خلاف خواہ کیسی ہی الزام تراشیاں وہ کرتے، کوئی معقول آدمی یہ باور نہ کر سکتا تھا کہ ایسی اعلیٰ درجے کی اخلاقی تعلیم کوئی خود غرض، یا مجنون، یا ساحر یا کاہن دے سکتا ہے۔

فصل ششم

عالمگیر اُمّتِ مُسلِمہ کی تاسیس

دعوتِ اسلامی کا ایک اہم نکتہ یہ تھا کہ تمام دُنیا کے انسان اصل میں ایک، اور آدمی ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں۔ اُن کے درمیان اللہ کی بنائی ہُوئی فطرت نے قوموں، نسلوں، قبیلوں، زبانوں، وطنوں اور رنگوں کا جو فرق رکھا ہے وہ محض تعارُف کے لیے ہے تاکہ اُن کے درمیان تعاوُن ہو سکے، نہ اِس لیے کہ اُن کے درمیان اِس سے تفرّق پیدا ہو، عداوتیں پڑیں، ایک گروہ دوسرے گروہوں کو کمین اور ذلیل اور اپنے آپ کو افضل و اشرف سمجھے، اور ایک گروہ دوسروں کو دبانے، لُوٹنے اور مٹا دینے پر تُل جائے۔ اِس بنیادی انسانی مساوات کے دائرے میں اگر کوئی چیز لوگوں کے درمیان جائز اور معقول طور پر وجہِ اجتماع بن سکتی ہے تو وہ صحیح عقیدہ و فکر ہے جس پر وہ جمع ہو کر ایک اُمّت بنیں، اور اِس اُمّت میں بجا طور پر کوئی شے اگر سببِ فضیلت بن سکتی ہے تو وہ تقویٰ ہے، یعنی خدا سے ڈرنا، اُس کی نافرمانی سے بچنا اور آخرت کی بازپُرس کو یاد رکھ کر غلط راہوں پر چلنے سے باز رہنا۔

اِس نظریّے پر اسلام نے دنیا بھر کے انسانوں میں صرف ایک تفرّق کو باقی رکھا، اور وہ تھی ایمان اور کُفر کی تفریق۔ جو انسان بھی، خواہ وہ کسی مُلک، قوم، قبیلے، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ کوئی زبان بولتا ہو، اللہ کی توحید کو اُس طرح مان لے جس طرح محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُسے پیش کیا ہے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو تمام بنی نوعِ انسانی کے لیے اللہ کا آخری رسُول اور قرآن کو اللہ کی آخری کتاب تسلیم کرلے، اور آخرت پر ایمان لے آئے، وہ مومن ہے، مومنوں کا بھائی ہے، جماعتِ مومنین کا ایک رُکن ہے، اُمّتِ مُسلِمہ کا ایک فرد ہے، اور مُسلم معاشرے میں اُس کے حقوق ہر لحاظ سے مُساوی ہیں۔ اِس کے برعکس جو شخص اِس عقیدے کو نہ مانے وہ کافر ہے، خواہ وہ مومن کا باپ، ماں، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی، بیوی یا شوہر ہی کیوں نہ ہو، ہم قبیلہ یا ہم وطن، یا ہم رنگ ہونا تو پھر بھی بعد کا درجہ رکھتا ہے۔ مومن اُس کے ساتھ انسانی تعلق تو باقی رکھے گا، لیکن دوسرے ہر لحاظ سے اُس کا معاشرہ مسلم معاشرے

سے الگ ہو گا۔ وہ دُنیا کے معاملات میں تو اُس کے ساتھ وہ سب روابط رکھ سکتا ہے جو انسانوں کے درمیان فطری طور پر ہوتے ہیں، مگر دین کے معاملہ میں وہ اُس سے دوستی اور محبت نہیں رکھ سکتا، اس کے ساتھ مل کر ایک جماعت اور ایک معاشرہ نہیں بنا سکتا حتیٰ کہ اس کا باپ بھی اگر کافر تھا تو وہ اُس کے لیے دعائے مغفرت تک نہیں کر سکتا۔ دین کے معاملہ میں جنگ کی نوبت آجائے تو بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے لڑ جائے گا اور اُسے کاٹ پھینکنے میں ذرا تأمل نہ کرے گا۔ وطن اور قوم دین کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں تو وہ گھر بار اور قوم و وطن سب کو چھوڑ کر ہجرت کر جائے گا مگر اپنے دین کو وطنیت اور قومیت پر ہرگز قربان نہ کرے گا۔

اِس اُمّت کا نام ہمیشہ سے "اُمّتِ مُسلِمہ" تھا، ہر نبی کی اُمّت مُسلِم ہی تھی، اور یہی نام اُن لوگوں کا بھی رکھا گیا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ اِس کے دروازے رُوئے زمین کے ہر شخص کے لیے کھُلے تھے، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، شمال کا باشندہ ہو یا جنوب کا۔ اِس میں کسی قوم کے لیے کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی جو کسی دوسری قوم کو حاصل نہ ہو۔ اِس کی بنا اتفاقی پیدائش پر نہ تھی بلکہ شعوری ایمان پر تھی۔ اور اِس ایمان میں دنیا بھر کے جو لوگ بھی مشترک ہوں وہ بالکل برابر کے حقوق کے ساتھ اِس اُمّت میں شریک ہو سکتے تھے۔

پھر یہ اُمّت محض مان کر بیٹھ جانے والوں کی اُمّت نہ تھی، بلکہ ایک داعی اور مُبلّغ اُمّت تھی۔ اِس کا ہر فرد ایک تحریک کا کارکن تھا جس کا سب سے عزیز تر مقصد یہ تھا کہ جو حق اُسے اللہ کے رسُولؐ اور اُس کی کتاب کے ذریعہ سے ملا ہے اُسے دوسروں تک پہنچائے اور جتنے اللہ کے بندوں کو بھی دُنیا میں گمراہی سے اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کر سکتا ہو کرے۔

یہ وہ چیز تھی جس پر صرف قریش ہی نہیں بلکہ عرب کے سارے قبائل تلملا اُٹھے۔ ہزارہا برس سے اُن کا پُورا اجتماعی نظام قبائلیت پر مبنی تھا۔ قبیلہ ہی وہ چیز تھی جس سے وابستگی پر اُن کا معاشرہ قائم تھا۔ یہی چیز اُن کی پُشت پناہ تھی۔ خُونی رشتے ہی ان کے درمیان ربط و تعلق اور ہمدردی و مددگاری کی بُنیاد تھے۔ اِسی پر وہ اپنے شرف اور عزت و کرامت کا مدار رکھتے تھے۔ اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے پر اپنا سارا فخر و ناز اِس بنا پر جتاتا تھا کہ اُس کے آبا و اجداد نے فلاں فلاں کارنامے انجام دیئے تھے۔ اب جو انہوں نے دیکھا کہ اُن کے درمیان ایک ایسی دعوت اُٹھ رہی ہے جو قبائلیت کی جڑ ہی کاٹے ڈالتی ہے، جو ہر قوم اور قبیلے کے اندر سے آدمی نکال نکال کر اُن کو ایک مستقل جماعت الگ نام سے بنا رہی ہے، جو نہ قوم جانتی ہے نہ قبیلہ، بلکہ ایک عقیدے پر عالمگیر اُخوّت اور رفاقت کی بنیاد

رکھ رہی ہے، جو فخرِ شرف کے سارے قدیم تصوّرات کا خاتمہ کر کے "رذیل" اور "شریف" سب کو برابر کیے دے رہی ہے، اور کفر و ایمان کے اختلاف کو دوستی و دشمنی کا مدار ٹھیرا کر بیٹے کو باپ سے، بھائی کو بھائی سے، شوہر کو بیوی سے جُدا کر رہی ہے، تو اُن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس عظیم معاشرتی انقلاب کو ہضم کرنا اُن کے بس میں نہ تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کل کو ابتدا ہی میں مَسل ڈالا جائے تاکہ اس کے کبھی پھولنے، اور پھُول سے بارغ بننے کی نوبت ہی نہ آسکے۔ لیکن جن لوگوں کے دماغ میں عقل تھی اور جن کے دل پر تعصبات کے قفل پڑے ہوئے نہ تھے انہوں نے محسوس کر لیا کہ یہی وہ نسخۂ کیمیا ہے جو قبائلی عداوتوں اور تفرقوں کو مٹا کر تمام عرب کو متحد کر سکتا ہے، اور پھر عرب سے گزر کر دنیا بھر کی قوموں کو ایک لڑی میں پرو سکتا ہے۔

دعوتِ اسلامی کے اس جُز کا ملخّص جو اُوپر بیان کیا گیا ہے اُس کی پوری اہمیت اُس وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب قرآن مجید سے اس کی تفصیلات آدمی کے سامنے آجائیں۔ (۱۴۷)

تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں اور ان میں فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے

اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت جو قرآن مجید میں بیان کی گئی وہ یہ تھی کہ پوری نوعِ انسانی ایک ماں اور باپ کی اولاد ہے اور اس بنا پر تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً (النساء-۱)۔

"اے انسانو، ڈرو اپنے اُس رب سے جس نے تم کو ایک فردِ واحد سے پیدا کیا اور اُسی سے اُس کا جوڑا بنایا اور اُن دونوں سے بہت سے مرد و عورت (دنیا میں) پھیلا دیے۔"

اس کے بعد دوسری اہم حقیقت جو قرآن نے دنیا کے سامنے پیش کی وہ یہ تھی کہ انسانی وحدت کے اندر قوموں اور قبیلوں کی کثرت جو اللہ نے پیدا کی ہے وہ صرف تعارف کے لیے ہے، اور اُن کے درمیان فضیلت کا معیار نسل و رنگ اور زبان و وطن نہیں بلکہ تقویٰ کی اخلاقی صفت ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (الحجرات-۱۳)

"اے انسانو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے

زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار (یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنے والا) ہے۔"

اِس آیت میں پوری نوعِ انسانی کو خطاب کر کے اُس عظیم گمراہی کی نشان دہی کر دی گئی جو دنیا میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے یعنی نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصب۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دَور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اُس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدائش (Accident of Birth) کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں ان کی بنا ایک خاندان، قبیلے، یا نسل میں پیدا ہو جانا ہے، اور کہیں ایک جغرافی خطے میں، یا ایک خاص رنگ والی، یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہونا۔ پھر اِن بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے وہ صرف اِس حد تک محدود نہیں رہی ہے کہ جنہیں اس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو اُن کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اِس تمیز نے نفرت، عداوت، تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اِس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں۔ مذاہب ایجاد کیے گئے ہیں۔ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اخلاقی اُصول وضع کیے گئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں نے اِس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اِس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق بلکہ ابناء اللہ ٹھیرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں وَرن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا جس کی رُو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اُونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھیرائے گئے، اور شودروں کو انتہائی ذلّت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، آج اِس بیسویں صدی ہی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے اُنہیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا، اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلّط قائم کر کے جو برتاؤ اُن کے ساتھ کیا، اُس کی تہ میں بھی یہی تصوّر کارفرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کی سرحدوں سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو اُن پر مُباح ہے اور اُنہیں حق پہنچتا ہے کہ اُن کو لُوٹیں، غلام بنائیں، اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے اس کی بدترین مثالیں زمانۂ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور آج دیکھی جا رہی

ہیں خصوصیت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصور پچھلی جنگ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی۔

اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے تین نہایت اہم اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ تم سب کی اصل ایک ہے، ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے، اور آج تمہاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔ اس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اُس تفرقے اور اونچ نیچ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے جس کے زعم باطل میں تم مبتلا ہو۔ ایک ہی خدا تمہارا خالق ہے، ایسا نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف خداؤں نے پیدا کیا ہو۔ ایک ہی مادۂ تخلیق سے تم بنے ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ انسان کسی پاک یا بڑھیا مادے سے بنے ہوں اور کچھ دوسرے انسان کسی ناپاک یا گھٹیا مادے سے بن گئے ہوں۔ ایک ہی ماں باپ کی تم اولاد ہو، یہ بھی نہیں ہے کہ ابتدائی انسانی جوڑے بہت سے رہے ہوں جن سے دنیا کے مختلف خطّوں کی آبادیاں الگ الگ پیدا ہوئی ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ پوری روئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان تو نہیں ہو سکتا تھا۔ نسل بڑھنے کے ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں اور پھر خاندانوں سے قبائل اور اقوام وجود میں آ جائیں۔ اسی طرح زمین کے مختلف خطّوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ، خدوخال، زبانیں اور طرز بود و ماند بھی لامحالہ مختلف ہی ہو جانے تھے، اور ایک خطے کے رہنے والوں کو باہم قریب تر اور دور دراز خطّوں کے رہنے والوں کو بعید تر ہی ہونا تھا۔ مگر اس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اونچ اور نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کیے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل و حقیر جانیں، ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوّق جمائے، اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح حاصل ہو۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتّب کیا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اُن کے درمیان باہمی تعارف اور تعاون کی فطری صورت یہی تھی۔ اِسی طریقے سے ایک خاندان، ایک برادری، ایک قبیلے اور ایک قوم کے لوگ مل کر مشترک معاشرت بنا سکتے تھے، اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے مددگار

بن سکتے تھے۔ مگر یہ محض شیطانی جہالت تھی کہ جس چیز کو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے تعارُف کا ذریعہ بنایا تھا اُسے تفاخر اور تنافر کا ذریعہ بنا لیا گیا اور پھر نوبت ظلم و عدوان تک پہنچا دی گئی۔

تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں، کیونکہ اُن کا پیدا کرنے والا ایک ہے، اُن کا مادۂ پیدائش اور طریق پیدائش ایک ہی ہے، اور اُن سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے۔ علاوہ بریں کسی شخص کا کسی خاص ملک، قوم یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے جس میں اُس کے اپنے ارادہ و انتخاب اور اس کی اپنی سعی و کوشش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا، بُرائیوں سے بچنے والا، اور نیکی و پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنی ذاتی خوبی کی بنا پر قابلِ قدر ہے۔ اور جس کا حال اس کے برعکس ہو وہ بہرحال ایک کمتر درجے کا انسان ہے چاہے وہ کالا ہو یا گورا، مشرق میں پیدا ہو یا مغرب میں۔

یہی حقائق جو قرآن کی ایک مختصر سی آیت میں بیان کیے گئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کو اپنے مختلف خطبات اور ارشادات میں زیادہ کھول کر بیان فرمایا۔ فتح مکہ کے موقع پر طوافِ کعبہ کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں فرمایا:

الحمدُ للهِ الّذی اذهب عنکم عُبِّیَّةَ الجاهلیّةِ وتکبُّرها۔ یاَیُّها النّاسُ الناس رجلان، بَرٌّ تقیٌّ کریمٌ علی اللہ، وفاجرٌ شقیٌّ هَیِّنٌ علی اللہ۔ الناس کلّهم بنو آدم وخلق اللہ آدمَ من تُراب۔ (بیہقی فی شعب الایمان۔ ترمذی)

"شکر ہے اُس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اُس کا تکبّر دُور کر دیا۔ لوگو، تمام انسان بس دو ہی حصّوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار، جو اللہ کی نگاہ میں عزّت والا ہے۔ دوسرا فاجر اور شقی، جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔"

حجّۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق کے وسط میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس میں فرمایا:

یَااَیُّها النّاس، اَلَا اِنَّ ربّکم واحدٌ، لا فضلَ لعربیٍّ علی عجمیٍّ ولا لعجمیٍّ علی عربیٍّ، ولا لِاَسْوَدَ علی احمرَ ولا لاحمرَ علی اسودَ الّا بالتّقوٰی۔ اِنَّ اکرمکم

عند اللہ اتقکم۔ الا ھل بلغت؟ قالوا بلیٰ یا رسول اللہ۔ قال فلیبلغ الشاھد الغائب۔ (بیہقی)

"لوگو، خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ، میں نے تمہیں بات پہنچا دی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ فرمایا، اچھا تو جو موجود ہے وہ اُن لوگوں تک یہ بات پہنچا دے جو موجود نہیں ہیں۔"

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:

کلکم بنو آدم و آدم خلق من تراب۔ ولینتھین قوم یفخرون باٰبائھم او لیکونن اھون علی اللہ من الجعلان۔ (بزار)

"تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں حقیر کیڑوں سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔"

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا:

ان اللہ لا یسئلکم عن احسابکم ولا انسابکم یوم القیامۃ، ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ (ابن جریر)

"اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ کے ہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم۔ (مسلم۔ ابن ماجہ)

"اللہ تمہاری صورتیں اور مال نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔"

یہ تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک ہی محدود نہیں رہی ہیں بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہل ایمان کی ایک عالمگیر برادری عملاً قائم کر کے دکھا دی جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں جس میں

اُونچ نیچ اور چھُوت چھات اور تفریق و تعصّب کا کوئی تصوّر نہیں، جس میں شریک ہونے والے تمام انسان خواہ وہ کسی نسل و قوم اور ملک و وطن سے تعلق رکھتے ہوں، بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مساوات اور وحدت کے اصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے اُس کی کوئی نظیر دُنیا کے کسی دین اور کسی نظام میں نہیں پائی جاتی، نہ کبھی پائی گئی ہے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے تمام روئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک عقیدے کی بنا پر ایک اُمّت بنا دیا ہے۔ (۱۴۹)

یہی ابدی قاعدہ آخرت میں بھی جاری ہوگا

اس سے آگے بڑھ کر قرآن نے لوگوں کو اِس حقیقت سے باخبر کیا کہ نسل و قوم و وطن کے بجائے عقیدہ و عمل کی بنیاد پر اختلاف اور اجتماع کا یہی قاعدہ موجودہ دنیا کے ختم ہونے کے بعد آخرت کی دوسری زندگی میں بھی اِسی طرح جاری ہوگا، اور دوسری بنیادوں پر یہاں جو جتھہ بندیاں قائم ہیں وہ سب تتر بتر ہو جائیں گی۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَتَفَرَّقُونَ (الرّوم - ۱۴)

"جس روز قیامت برپا ہوگی سب انسان اُس روز الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے۔"

یعنی دنیا کی وہ تمام جتھہ بندیاں جو آج قوم، نسل، وطن، زبان، قبیلہ و برادری اور معاشی و سیاسی مفادات کی بنیاد پر بنی ہوئی ہیں، اُس روز ٹوٹ جائیں گی، اور خالص عقیدے اور اخلاق و کردار کی بنیاد پر نئے سرے سے ایک دوسری گروہ بندی ہوگی۔ ایک طرف نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی قوموں میں سے مومن و صالح انسان الگ چھانٹ لیے جائیں گے اور ان سب کا ایک گروہ ہوگا۔ دوسری طرف ایک ایک قسم کے گمراہانہ نظریات و عقائد رکھنے والے اور ایک ایک قسم کے بدعمل اور جرائم پیشہ لوگ اُس عظیم الشان انسانی بھیڑ میں سے چھانٹ چھانٹ کر الگ نکال لیے جائیں گے اور ان کے الگ الگ گروہ بن جائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں یُوں سمجھنا چاہیے کہ اسلام جس چیز کو اس دنیا میں تفرقے اور اجتماع کی حقیقی بنیاد قرار دیتا ہے اور جسے جاہلیت کے پرستار یہاں ماننے سے انکار کرتے ہیں، آخرت میں اُسی بنیاد پر تفرقہ بھی ہوگی اور اجتماع بھی۔ اسلام کہتا ہے کہ انسانوں کو کاٹنے اور جوڑنے والی اصل چیز عقیدہ و اخلاق ہے۔ ایمان لانے والے اور خدائی ہدایت پر نظامِ زندگی کی بنیاد رکھنے والے ایک اُمّت ہیں، خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور کفر و فسق کی راہ اختیار کرنے والے ایک دوسری اُمّت ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی نسل و وطن سے ہو۔ ان دونوں کی قومیت ایک نہیں ہو سکتی۔ یہ نہ دنیا میں ایک مشترک راہِ زندگی بنا کر ایک ساتھ چل سکتے ہیں اور نہ آخرت میں ان کا انجام ایک ہو سکتا ہے۔ دنیا سے آخرت تک اِن کی راہ اور منزل ایک دوسرے سے الگ ہے۔

جاہلیت کے پرستار اِس کے برعکس ہر زمانے میں اِصرار کرتے رہے ہیں، اور آج بھی اِس بات پر مُصر ہیں کہ جتھہ بندی نسل و وطن اور زبان کی بُنیادوں پر ہونی چاہیے۔ اِن بُنیادوں کے لحاظ سے جو لوگ مشترک ہوں اُنہیں بلا لحاظِ مذہب و عقیدہ ایک قوم بن کر دُوسری ایسی ہی قوموں کے مقابلے میں متحد ہونا چاہیے، اور اِس قومیت کا ایک ایسا نظامِ زندگی ہونا چاہیے جس میں توحید اور شرک اور دہریت کے معتقدین سب ایک ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہی تخیّل ابو جہل اور ابو لہب اور سردارانِ قریش کا تھا جب وہ بار بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر الزام رکھتے تھے کہ اِس شخص نے آکر ہماری قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔ اِسی پر قرآن مجید یہاں متنبّہ کر رہا ہے کہ تمہاری یہ تمام جتھہ بندیاں جو تم نے اِس دُنیا میں غلط بُنیادوں پر قائم کر رکھی ہیں آخر کار ٹوٹ جانے والی ہیں۔ نوعِ انسانی میں مستقل تفریق اُسی عقیدے اور نظریۂ حیات اور اخلاق و کردار کی بُنیاد پر ہونے والی ہے جس پر اسلام دُنیا کی اِس زندگی میں کرنا چاہتا ہے۔ جن لوگوں کی منزل ایک نہیں ہے اُن کی راہِ زندگی آخر کیسے ایک ہو سکتی ہے۔ (۱۵۰)

اُمّتِ مُسلِمہ

جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا، تمام انسانوں کو ایک قرار دینے کے بعد اسلام اُن کے درمیان صرف تقویٰ کو وجہِ امتیاز قرار دیتا ہے، اور اسلام کے نقطۂ نظر سے تقویٰ کا مطلب ہے اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب کے بیان کردہ عقائد و احکام کو ماننا، اور آخرت کی بازپُرس کو ملحوظ رکھتے ہوئے نافرمانی کی روِش چھوڑ کر فرمانبرداری کی روِش اختیار کر لینا۔ اِس لیے اسلام تمام نوعِ انسانی کو صرف دو حصّوں پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک وہ جو ایمان لاتے، اور دوسرا وہ جو ایمان نہ لاتے۔ ایمان لانے والوں کو وہ ایک اُمّت بناتا ہے اور اُس کا نام اُمّتِ مُسلِمہ رکھتا ہے جس میں دُنیا کا ہر مومن شریک ہو سکتا ہے۔ اور یہ کوئی نیا نام نہیں ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اُوپر ایمان لانے والوں کے لیے رکھا ہو، بلکہ قدیم ترین زمانے سے تمام انبیاء کی اُمّتوں کا اللہ تعالیٰ نے یہی نام رکھا ہے:

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (الحج - ۲۸)

"اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مُسلم رکھا تھا اور اِس (قرآن) میں بھی۔"

"تمہارا" کا خطاب مخصوص طور پر صرف اُنہی اہلِ ایمان کی طرف نہیں ہے جو اِس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے، یا اِس کے بعد اہلِ ایمان کی صف میں داخل ہوئے۔ بلکہ اس کے مخاطب تمام وہ لوگ ہیں جو آغازِ تاریخِ انسانی سے توحید، آخرت، رسالت اور کُتبِ الٰہی کے ماننے والے رہے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اِس ملّتِ حق کے ماننے والے پہلے بھی "نوحی"، "ابراہیمی"، "موسوی"، "مسیحی" وغیرہ نہیں کہلاتے تھے بلکہ اُن کا

نام "مسلم" (اللہ کے تابع فرمان) تھا۔ اور آج بھی وہ "محمدی" نہیں بلکہ "مسلم" ہیں۔ اس بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں کے لیے یہ سوال معّما بن گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کا نام قرآن سے پہلے "مسلم" کس کتاب میں رکھا گیا تھا۔ ضروری نہیں کہ ہر زبان میں یہی عربی لفظ "مسلم" استعمال ہوا ہو۔ لیکن انبیاء کے ماننے والوں کا جو نام بھی کسی زبان میں رکھا گیا وہ مسلم ہی کا ہم معنی تھا۔ (۱۵۱)

اُمّتِ مسلمہ کی عالمگیری اور ازلیت و ابدیت

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِہٖ ھُمْ بِہٖ یُؤْمِنُوْنَ- وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِہٖٓ اِنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِہٖ مُسْلِمِیْنَ ۔ (القصص: ۵۲-۵۳)

"جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اِس (قرآن) پر ایمان لا رہے ہیں۔ اور جب یہ اُنہیں سُنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں "ہم اِس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے سے مسلم ہیں"۔

یعنی اس سے پہلے بھی ہم انبیاء اور کُتبِ آسمانی کے ماننے والے تھے، اِس لیے اُس وقت بھی اسلام کے سوا ہمارا کوئی اور دین نہ تھا۔ پھر اب جو نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب لے کر آیا ہے اُسے بھی ہم نے مان لیا ہے۔ لہٰذا درحقیقت ہمارے دین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، بلکہ جیسے ہم پہلے مسلمان تھے ویسے ہی اب بھی مسلمان ہیں۔

ایمان لانے والے اہل کتاب کا یہ قول جسے قرآن مجید میں نقل کیا گیا ہے، اِس بات کی صاف صراحت کر دیتا ہے کہ اسلام صرف اُس دین کا نام نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں اور "مسلم" کی اصطلاح کا اطلاق محض حضورؐ کے پیروؤں تک محدود نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے تمام انبیاء کا دین یہی اسلام تھا اور ہر زمانہ میں اُن سب کے پیرو مسلمان ہی تھے۔ یہ مسلمان اگر کبھی کافر ہوئے تو صرف اُس وقت جبکہ کسی بعد کے آنے والے نبی صادق کو ماننے سے اُنہوں نے انکار کر دیا۔ لیکن جو لوگ پہلے نبی کو مانتے تھے اور بعد کے آنے والے نبی پر بھی ایمان لے آئے اُن کے اسلام میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوا۔ وہ جیسے مسلمان پہلے تھے ویسے ہی بعد میں رہے۔

تعجب ہے کہ بعض بڑے بڑے اہل علم بھی اِس حقیقت کے ادراک سے عاجز رہ گئے ہیں، حتیٰ کہ اس صریح آیت کو دیکھ کر بھی اُن کا اطمینان نہ ہُوا۔ علامہ سیوطی نے ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر لکھا ہے کہ مسلم کی اصطلاح صرف اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مختص ہے۔ پھر جب یہ آیت اُن کے سامنے آئی تو خود فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ لیکن کہتے ہیں کہ میں نے پھر خدا سے دعا کی کہ

اس معاملہ میں مجھے شرحِ صدر عطا کر دے۔ آخر کار اپنی رائے سے رجوع کرنے کے بجائے انہوں نے اُس پر اصرار کیا اور اس آیت کی متعدد تاویلیں کر ڈالیں جو ایک سے ایک بڑھ کر بے وزن ہیں۔ مثلاً اُن کی ایک تاویل یہ ہے کہ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ کے معنی ہیں ہم قرآن کے آنے سے پہلے ہی مُسلم بن جانے کا عزم رکھتے تھے، کیونکہ ہمیں اپنی کتابوں سے اس کے آنے کی خبر مل چکی تھی اور ہمارا ارادہ یہ تھا کہ جب وہ آئے گا تو ہم اسلام قبول کر لیں گے۔ اُن کی دوسری تاویل یہ ہے کہ اس فقرے میں مُسلمین کے بعد لفظ بِہٖ محذوف ہے، یعنی پہلے ہی سے ہم قرآن کو مانتے تھے، کیونکہ اُس کے آنے کی ہم توقع رکھتے تھے اور اس پر پیشگی ایمان لاتے ہوتے تھے، اس لیے توراۃ و انجیل کو ماننے کی بنا پر نہیں بلکہ قرآن کو اُس کے نزول سے پہلے برحق مان لینے کی بنا پر ہم مُسلم تھے۔ تیسری تاویل اُن کی یہ ہے کہ تقدیرِ الٰہی میں ہمارے لیے پہلے ہی مقدّر ہو چکا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی آمد پر ہم اسلام قبول کر لیں گے، اس لیے درحقیقت ہم پہلے ہی مُسلم تھے۔ ان تاویلوں میں سے کسی کو دیکھ کر بھی محسوس نہیں ہوتا کہ اللہ کے عطا کردہ شرحِ صدر کا اُس میں کوئی اثر موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں صرف اسی ایک مقام پر نہیں بلکہ بیسیوں مقامات پر اس اُصولی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اصل دین صرف "اسلام" (اللہ کی فرمانبرداری) ہے، اور خدا کی کائنات میں خدا کے بندوں کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا دین ہو نہیں سکتا، اور آغازِ آفرینش سے جو نبی بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے آیا ہے وہ یہی دین لے کر آیا ہے، اور انبیاء علیہم السلام ہمیشہ خود مُسلم رہے ہیں، اپنے پیروؤں کو انہوں نے مُسلم ہی بن کر رہنے کی تاکید کی ہے، اور اُن کے وہ سب متبعین جنہوں نے نبوت کے ذریعے سے آتے ہوئے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کیا، ہر زمانے میں مُسلم ہی تھے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں :

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آلِ عمران-۹)

"درحقیقت اللہ کے نزدیک دین تو اسلام ہی ہے۔"

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔ (آلِ عمران-۸۵)

"اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔"

حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں :

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (یونس-۷۲)

"میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں مُسلموں میں شامل ہو کر رہوں۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :

وَإِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. وَوَصّٰى بِهَآ إِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ - أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ. قَالُوْا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ اٰبَآئِكَ إِبْرٰهٖمَ وَإِسْمٰعِيْلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ (البقرہ: ۲/ ۱۳۱تا۱۳۳)۔

"جب اُس کے رب نے اُس سے کہا کہ مُسلم (تابعِ فرمان) ہو جا" تو اُس نے کہا "مَیں ربُّ العٰلمین کا مُسلم ہو گیا"۔ اور اسی چیز کی وصیّت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کو کی اور یعقوبؑ نے بھی، کہ "اے میرے بچو، اللہ نے تمہارے لیے اِس دین کو پسند کیا ہے لہٰذا تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مُسلم ہو"۔ (اے یہودیو) کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی وفات کا وقت آیا؟ جب کہ اُس نے اپنی اولاد سے پوچھا "تم کس کی بندگی کرو گے میرے بعد؟" انہوں نے جواب دیا "ہم بندگی کریں گے آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبود کی، اُس کو اکیلا معبود مان کر، اور ہم اُسی کے مُسلم ہیں"۔

مَا كَانَ إِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا۔

(آلِ عمران - ۶۷)

"ابراہیمؑ نہ یہودی تھا نہ نصرانی، بلکہ وہ یکسُو مُسلم تھا"۔

حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ خود دُعا مانگتے ہیں:

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ - (البقرہ-۱۲۸)

"اے ہمارے رب، ہم کو اپنا مُسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک اُمّت پیدا کر جو تیری مُسلم ہو"۔

حضرت لُوطؑ کے قصّے میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ - (الذّاریات-۳۶)

"ہم نے قومِ لُوطؑ کی بستی میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا (یعنی خود حضرت لُوطؑ کا گھر)"۔

حضرت یُوسفؑ بارگاہِ ربّ العزّت میں عرض کرتے ہیں:

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ (یُوسف-۱۰۱)

"مجھ کو مُسلم ہونے کی حالت میں موت دے اور مجھے صالحوں کے ساتھ ملا۔"
حضرت موسیٰ علیہ السّلام اپنی قوم سے کہتے ہیں:
يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ (یونس-۸۴)
"اے میری قوم کے لوگو، اگر تم اللہ پر ایمان لاتے ہو تو اُسی پر بھروسہ کرو اگر تم مُسلم ہو۔"

بنی اسرائیل کا اصل مذہب یہودیت نہیں بلکہ اسلام تھا، اِس بات کو دوست اور دشمن سب جانتے تھے چنانچہ فرعون سمندر میں ڈوبتے وقت آخری کلمہ جو کہتا ہے وہ یہ ہے:
اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (یونس-۹۰)

"میں مان گیا کہ کوئی معبود اُس کے سوا نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لاتے ہیں اور میں مُسلموں میں سے ہوں۔"
تمام انبیاءِ بنی اسرائیل کا دین بھی یہی اسلام تھا:
اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا (المائدہ-۴۴)

"ہم نے توراۃ نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ اُسی کے مطابق وہ نبی جو مُسلم تھے اُن لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے جو یہودی بن گئے تھے۔"
یہی حضرت سلیمان علیہ السّلام کا دین تھا، چنانچہ ملکۂ سبا اُن پر ایمان لاتے ہوئے کہتی ہے:
اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (النمل-۴۴)
"میں سلیمان کے ساتھ ربّ العالمین کی مُسلم ہو گئی۔"
اور یہی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور اُن کے حواریوں کا دین تھا۔
وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ۔ (المائدہ-۱۱۱)

"اور جبکہ میں نے حواریوں پر وحی کی کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لاتے اور گواہ رہ کہ ہم مُسلم ہیں۔"
اِس معاملہ میں اگر کوئی شک اِس بنا پر کیا جائے کہ عربی زبان کے الفاظ "اسلام" اور "مُسلم" اِن مختلف

ملکوں اور مختلف زبانوں میں کیسے مستعمل ہو سکتے تھے، تو ظاہر ہے کہ یہ محض ایک نادانی کی بات ہو گی کیونکہ اصل اعتبار عربی کے ان الفاظ کا نہیں بلکہ اُس معنی کا ہے جس کے لیے یہ الفاظ عربی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ دراصل جو بات ان آیات میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا ہُوا حقیقی دین مسیحیت یا موسویت یا محمدیت نہیں ہے بلکہ انبیاء اور کُتُبِ آسمانی کے ذریعے سے آتے ہوتے فرمانِ خداوندی کے آگے سرِ اطاعت جُھکا دینا ہے، اور یہ رویّہ جہاں جس بندۂ خدا نے بھی جس زمانے میں اختیار کیا ہے وہ ایک ہی عالمگیر اَزلی و اَبدی دینِ حق کا متبع ہے۔ اِس دین کو جن لوگوں نے ٹھیک ٹھیک شعور اور اخلاص کے ساتھ اختیار کیا ہے اُن کے لیے مُوسیٰؑ کے بعد مسیحؑ کو اور مسیحؑ کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کو ماننا تبدیلِ مذہب نہیں بلکہ حقیقی دین کے اِتباع کا فطری و منطقی تقاضا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے گروہوں میں بے سوچے سمجھے گُھس آتے یا پیدا ہو گئے اور قومی و نسلی اور گروہی تعصبات نے جن کے لیے اصل مذہب کی حیثیت اختیار کر لی، وہ بس یہودی یا مسیحی بن کر رہ گئے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر اُن کی جہالت کی قلعی کُھل گئی کیونکہ انہوں نے اللہ کے آخری نبی کا انکار کر کے نہ صرف یہ کہ آئندہ کے لیے مُسلم رہنا قبول نہ کیا بلکہ اپنی اِس حرکت سے یہ ثابت کر دیا کہ حقیقت میں وہ پہلے بھی "مُسلم" نہ تھے محض ایک نبی یا بعض انبیاء کی شخصی گرویدگی میں مبتلا تھے، یا آباؤ اجداد کی اندھی تقلید کو دین بنائے بیٹھے تھے۔ (۱۵۲)

اُمتِ مُسلمہ کی شانِ ترکیب

اِس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف اُس اصل دین کو تازہ کیا جو ابتدا سے چلا آرہا تھا، بلکہ اُس اُمت کو بھی از سرِ نو قائم کیا جو تمام انبیاء علیہم السلام کے زمانے سے "اُمتِ مُسلمہ" کہلاتی چلی آرہی تھی۔ اِس اُمت میں مختلف قبیلوں اور خاندانوں اور علاقوں سے نکل نکل کر جو لوگ شامل ہوتے چلے گئے، آپؐ نے اُن سب کو ایک دوسرے کا حامی و مددگار، ایک دوسرے کا بھائی، ایک دوسرے کا ہمدرد و غمگسار بنایا، سب کی جان، مال، آبرو کو برابر کی حُرمت دی، سب کے حقوق اور فرائض یکساں ٹھیرائے اور کسی کے لیے کوئی ایسا امتیاز نہ رکھا جو دوسرے کو حاصل نہ ہو۔ یہ عرب کے قبیلہ پرست اور عصبیت زدہ ماحول کے لیے ایک عجیب چیز تھی جسے قبول کرنے کے لیے اُن کا دماغ کسی طرح آمادہ نہ ہوتا تھا۔ (۱۵۳)

ابن زید کی روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب نے آپ سے ایک روز پوچھا اگر مَیں تمہارے دین کو مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا جو اور سب ایمان لانے والوں کو ملے گا۔ اُس نے کہا میرے لیے (یعنی نبی کے چچا کے لیے) بھی کوئی فضیلت نہیں؟ حضورؐ نے فرمایا اور آپ کیا

چاہتے ہیں ؟ اس پر وہ بولا تبّاً لفقعا الدین تبّاً ان اکون وھولاء سواء "ناس جاتے، اس دین کا ناس جائے جس میں میں اور یہ دوسرے لوگ برابر ہوں" (ابن جریر) (۱۵۲)

اس تصورِ عصبیت کے بجائے قرآن نے صاف صاف کہا لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (الممتحنہ-۳) "قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں کام آئیں گی نہ اولاد" یہ خونی رشتے یہیں دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور وہاں ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اصل چیز ایمان ہے جو قیامت میں کام آنے والی ہے اس لیے دنیا میں بھی تمہارے رشتہ و تعلق کی بنیاد اسی پر قائم ہونی چاہیے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔ (المائدہ: ۵۵)

"تمہارے رفیق تو حقیقت میں صرف اللہ اور اللہ کا رسول اور وہ اہلِ ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں۔"

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ۔ (الحجرات-۱۰)

"مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو۔"

یہ اور ایسی ہی دوسری آیات تھیں جنہوں نے دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم کر دی۔ اسی تعلیم کی یہ برکت ہے کہ کسی دوسرے دین یا مسلک کے پیروؤں میں وہ اخوت نہیں پائی گئی ہے جو مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوئی اور آج تک پائی جاتی ہے۔ اس کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت ارشادات میں بیان فرمایا جن سے اس کی پوری روح اور زیادہ اجاگر ہو گئی۔

حضرت جریرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی۔ ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا، دوسری یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا، تیسری یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا" (بخاری، کتاب الایمان)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر" (بخاری، کتاب الایمان۔ مسند احمد میں اسی مضمون کی روایت حضرت سعید بن مالکؓ نے بھی اپنے والد سے نقل کی ہے)۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان

کی جان، مال اور عزت حرام ہے۔" (مسلم، کتاب البر والصلۃ۔ ترمذی، باب البر والصلۃ)۔

حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا، اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا، اور اس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔" (مسند احمد)۔

حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ آپؐ کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں کہ "گروہِ اہلِ ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا سر کے ساتھ جسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اہلِ ایمان کی ہر تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سر جسم کے ہر حصے کا درد محسوس کرتا ہے۔" (مسند احمد) (۱۵۵)

حضرت نعمانؓ بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَثَلُ الْمُؤْمِنِیْنَ فِیْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى (بخاری و مسلم)۔

"مومنوں کی مثال آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی سی ہے کہ اگر ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا (بخاری، مسلم، ترمذی)

"مومن دوسرے مومن کے لیے اس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ وَمَنْ كَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُّسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (بخاری و مسلم)۔

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے نہ اس کی مدد سے باز رہتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی کسی حاجت کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہوگا اللہ اس کی حاجت پوری کرنے میں لگ جائے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو کسی مصیبت سے نکالے گا اللہ تعالیٰ اسے روزِ قیامت کی مصیبتوں سے نکال دے گا۔ اور جو شخص کسی مسلمان کی عیب پوشی کرے گا اللہ

قیامت کے روز اُس کی عیب پوشی کرے گا۔ (۱۵۹)

حضرت جابرؓ بن عبداللہ اور ابوطلحہ بن سہل الانصاریؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

ما من امرئٍ یخذل امرأً مسلمًا فی موضعٍ تُنتهکُ فیه حرمتُهٗ وینتقصُ فیه من عرضه الّا خذله اللّٰه فی موطنٍ یُحبّ فیه نصرتَهٗ وما من امرئٍ ینصُرُ مُسلمًا فی موضعٍ یُنتقصُ فیه من عرضه ویُنتهکُ من حُرمتِهٖ الّا نصرهُ اللّٰهُ فی موطنٍ یُحبُّ فیه نُصرتَهٗ (ابوداؤد)۔

"اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرتا جہاں اس کی تذلیل کی جا رہی ہو اور اس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اُس کی حمایت ایسے موقع پر نہیں کرے گا جہاں وہ اللہ کی مدد کا خواہاں ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی حمایت ایسے موقع پر کرتا ہے جہاں اُس کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو اور اس کی تذلیل و توہین کی جا رہی ہو تو اللہ عزّوجلّ اس کی مدد ایسے موقع پر کرے گا جہاں وہ چاہتا ہے کہ اللہ اُس کی مدد کرے"۔ (۱۶۰)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

المسلمُ مَنْ سَلِمَ المُسلمُونَ مِن لسانه ویَدِهٖ (بخاری و مسلم)۔

"مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں"۔

حضرت ابوبکرہ نفیعؓ بن الحارث کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر یوم النحر کی تقریر میں حضورؐ نے فرمایا:

الا فلا ترجعوا بعدی کفّارًا یضرب بعضکم رقاب بعضٍ (بخاری و مسلم)

"خبردار رہو، میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو"۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا انصُر اخاك ظالمًا اومظلومًا "تیرا بھائی ظالم ہو یا مظلوم، اس کی مدد کر"۔ ایک شخص نے عرض کیا اگر وہ مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کروں گا، مگر وہ ظالم ہو تو میں اس کی مدد کیسے کروں؟ فرمایا تحجزہ او تمنعه من الظلم فان ذالك نصرهٗ "اس کو ظلم سے روک دے اور باز رکھ، کیونکہ یہی اس کی مدد ہے" (بخاری)۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص کی روایت ہے:

المؤمنون تكافأ دماءهم وهم يدٌ على من سواهم۔
(مسند ابو داؤد طیالسی۔ حدیث ۲۲۵۸)

"مومنوں کے خون برابر کی قیمت رکھتے ہیں، اور دوسروں کے مقابلے میں وہ سب ایک ہاتھ کی طرح ہیں۔"

حضرت انسؓ بن مالک حضورؐ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

أُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ۔ فَاِذَا شَهِدُوا وَاسْتَقْبَلُوا قِبْلَتَنَا وَاَكَلُوا ذَبِيحَتَنَا وَصَلَّوْا صَلٰوتَنَا فَقَدْ حُرِّمَتْ عَلَيْنَا دِمَاؤُهُمْ وَاَمْوَالُهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا۔ لَهُمْ مَا لِلْمُسْلِمِينَ وَعَلَيْهِمْ مَا عَلَيْهِمْ (نسائی، کتاب الایمان۔ مسند احمد، مرویاتِ انسؓ بن مالک)

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ اِس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، اور محمد اللہ کا رسول ہے۔ پھر جب وہ یہ شہادت دے دیں، اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کریں اور ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں، تو اُن کے خون اور اُن کے مال ہم پر حرام ہیں سوائے اِس کے کہ کوئی حق اُن پر آتا ہو۔ اُن کے لیے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں، اور اُن پر وہی فرائض ہیں جو مسلمانوں پر ہیں۔"

ایک دعوت اور تحریک کی علمبردار اُمّت

مگر یہ اُمّت اس حیثیت کی نہ تھی کہ کچھ لوگ ایمان لا کر بس اپنی جگہ اللہ اللہ کریں، نیک کام کریں، اور آپس میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار اور ہمدرد و غمخوار رہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس اُمّت کا کام یہ تھا کہ اِس کا ہر فرد اسلام کی دعوت لوگوں میں پھیلائے، بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ یہ پوری اُمّت تمام قوموں اور قبیلوں میں سے چھانٹ کر اسی لیے نکالی گئی ہے کہ یہ خلقِ خدا کی اصلاح کرے۔ تمام قوموں سے اِس کا تعلق حق اور انصاف کا تعلق ہو اور ناحق اور بے انصافی کا تعلق کسی سے نہ ہو۔ اگر معاملہ صرف پہلی صورت تک محدود ہوتا تو قریش اور مشرکین عرب کسی نہ کسی حد تک اسے برداشت کرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔ مگر یہ دوسری صورت ایسی تھی جس میں وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ اُمّت بڑھنے اور پھیلنے کا صرف رُجحان ہی نہیں رکھتی بلکہ فرداً فرداً اِس کا ہر شخص، اور اجتماعی طور پر یہ پوری جماعت اپنی تحریک کو پھیلانے میں سرگرم ہے۔ اِس سے اُن کے اندیشے حدِ برداشت سے بڑھ گئے، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ روز ٹوٹ ٹوٹ کر اُن کے آدمی اِس نئی جماعت میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (حٰمٓ السجدہ - ۳۳)۔

"اور اُس شخص کی بات سے اچھی بات اور کس کی ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ مَیں مُسلمان ہوں"

اِس سے پہلے آیات ۳۰ تا ۳۲ میں مسلمانوں کو بتایا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی پر ثابت قدم ہوجانا اور اِس راستے کو اختیار کرلینے کے بعد پھر اِس سے منحرف نہ ہونا بجائے خود وہ بنیادی نیکی ہے جو آدمی کو فرشتوں کا دوست اور جنّت کا مستحق بناتی ہے۔ اس کے بعد اِس آیت میں اُن کو بتایا گیا کہ آگے کا درجہ جس سے زیادہ بلند کوئی درجہ انسان کے لیے نہیں ہے، یہ ہے کہ تم خود نیک عمل کرو، اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاؤ، اور شدید مخالفت کے ماحول میں بھی، جہاں اسلام کا اعلان و اظہار کرنا اپنے اُوپر مُصیبتوں کو دعوت دینا ہے، ڈٹ کر کہو کہ مَیں مُسلمان ہوں۔ اِس ارشاد کی پُوری اہمیت سمجھنے کے لیے اُس ماحول کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص بھی مُسلمان ہونے کا اظہار کرتا تھا اُسے یکایک محسوس ہوتا تھا کہ گویا اُس نے درندوں کے جنگل میں قدم رکھ دیا ہے جہاں ہر ایک اُسے پھاڑ کھانے کو دَوڑ رہا ہے۔ اور اِس سے آگے بڑھ کر جس نے اسلام کی تبلیغ کے لیے زبان کھولی اُس نے تو گویا درندوں کو پکار دیا کہ آؤ اور مجھے بھنبھوڑ ڈالو۔ اِن حالات میں فرمایا گیا کہ کسی شخص کا اللہ کو اپنا رب مان کر سیدھی راہ اختیار کرلینا اور اُس سے نہ ہٹنا بلاشبہ اپنی جگہ بڑی اور بنیادی نیکی ہے، لیکن کمال درجے کی نیکی یہ ہے کہ آدمی اُٹھ کر کہے کہ مَیں مُسلمان ہوں، اور نتائج سے بے پروا ہو کر اللہ کی طرف خلقِ خدا کو دعوت دے، اور اپنے اِس کام کو کرتے ہوئے اپنا عمل اِتنا پاکیزہ رکھے کہ کسی کو اسلام اور اُس کے علمبرداروں پر حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہ مل سکے۔ (۱۵۹)

مُسلمانوں کا اِمامتِ عالَم پر مامُور ہونا

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ - ۱۴۳)۔

"اور اِسی طرح ہم نے تم کو ایک اُمّتِ وَسَط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسُول تم پر گواہ"

یہ اُمّتِ محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کی امامتِ عالَم کا اعلان تھا۔ "اِسی طرح" کا اشارہ اللہ کی اُس رہنمائی کی طرف بھی تھا جس سے محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیروی قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی

اور وہ ترقی کرتے کرتے اِس مرتبے پر پہنچے کہ "اُمّتِ وَسَط" قرار دیے گئے، اور تحویلِ قبلہ کی طرف بھی جیسے نادان محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے تھے، حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف سمتِ قبلہ کا پھرنا یہ معنی رکھتا تھا کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دُنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کیا اور اُمّتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا۔

"اُمّتِ وَسَط" کا لفظ اِس قدر وسیع معنویت اپنے اندر رکھتا ہے کہ کسی دوسرے لفظ سے اِس کے ترجمے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اِس سے مُراد ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے، جو عدل و انصاف اور توسّط کی روش پر قائم ہو، جو دُنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتا ہو، جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق، ناروا تعلق کسی سے نہ ہو۔

پھر یہ جو فرمایا کہ تمہیں "اُمّتِ وَسَط" اِس لیے بنایا گیا ہے کہ "تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسُول تم پر گواہ"، تو اِس کا مطلب یہ تھا اور آج بھی ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائیگا اُس وقت رسولؐ، اللہ تعالیٰ کے ذمّہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم اللہ نے اُسے دی تھی، وہ اُس نے تم کو بے کم و کاست پُوری کی پُوری پہنچا دی اور عملاً اُس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اِس کے بعد رسُول کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عامِ انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہوگا اور یہ شہادت دینی ہوگی کہ رسُول نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انہیں پہنچانے میں، اور جو کچھ رسُول نے تمہیں دکھایا تھا وہ تم نے اُنہیں دکھانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

اِس طرح کسی شخص یا گروہ کا اِس دُنیا میں خدا کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا ہی درحقیقت اُس کا اِمامت اور پیشوائی کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اِس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے وہیں ذمہ داری کا بہت بڑا بار بھی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اِس اُمّت کے لیے خدا ترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت بنے، اُسی طرح اِس اُمّت کو بھی تمام دُنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے، حتّٰی کہ اِس کے قول اور عمل اور برتاؤ، ہر چیز کو دیکھ کر دُنیا کو معلوم ہو کہ خدا ترسی اِس کا نام ہے، راست روی یہ ہے، عدالت اِس کو کہتے ہیں، حق پرستی ایسی ہوتی ہے، اور اسلام دُنیا کے انسانوں کو یہ کچھ بنانے آیا ہے۔ (۱۶۰)

اُمّتِ مُسلمہ کی خصوصیات

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ط (آلِ عمران-۱۱۰)

"تم دُنیا میں وہ بہترین اُمّت ہو جسے (انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے) میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو بتایا گیا کہ دُنیا کی امامت و رہنمائی کے جس منصب سے بنی اسرائیل اپنی نااہلی کے باعث معزول کیے جا چکے ہیں اُس پر اب تم مامور کیے گئے ہو۔ اس لیے کہ اخلاق و اعمال کے لحاظ سے اب تم دنیا میں سب سے بہتر انسانی گروہ بن گئے ہو اور تم میں وہ صفات پیدا ہو گئی ہیں جو امامتِ عادلہ کے لیے ضروری ہیں، یعنی نیکی کو قائم کرنے اور بدی کو مٹانے کا جذبہ و عمل، اور اللہ وحدہٗ لاشریک کو اعتقاداً و عملاً اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرنا۔ لہٰذا اب امامتِ عالم کا یہ کام تمہارے سپرد کیا گیا ہے۔ (۱۹۱)

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ (التوبہ-۷۱)۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں، سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرتے ہیں۔"

یعنی مومن مرد و زن ایک ایسا گروہ بن گئے ہیں جس کے افراد میں یہ خصوصیت مشترک ہے کہ نیکی سے وہ اتنی دلچسپی رکھتے ہیں کہ دنیا کو اُس کا حکم دیتے ہیں، بدی سے وہ اتنی نفرت کرتے ہیں کہ دنیا کو اس سے روکتے ہیں۔ خدا کی یاد اُن کے لیے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضروریات میں شامل ہے، راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کے لیے ان کے دل اور ہاتھ کھلے ہوتے ہیں، اور خدا اور رسُول کی اطاعت اُن کی زندگی کا وتیرہ ہے۔ اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرزِ زندگی نے انہیں آپس میں ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ (۱۹۲)

فدا کاری کا جذبہ

اس اُمّت کے لوگوں میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا گیا کہ وہ اپنے دین کو ہر چیز پر مقدّم رکھیں، ہر چیز کو اُس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، مگر کسی چیز پر اُسے قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ اگر اپنے وطن، خاندان، گھر بار میں رہتے ہوئے خدا کی بندگی کرنا ممکن ہو تو ٹھیک، لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایمان

کا امتحان اسی چیز میں ہے کہ آیا وہ گھر بار، بال بچوں، خاندان اور وطن کی محبت میں خدا کی بندگی کو چھوڑتے ہیں یا خدا کی بندگی کے لیے اِن سب کو چھوڑ کر ہجرت اور جلاوطنی کے خطرات مول لیتے ہیں؟

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (النحل - ۴۱)

"جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں اُن کو ہم دُنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔"

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۣ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَاۗبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (العنکبوت ۵۶ تا ۶۰)

"اَے میرے بندو جو ایمان لاتے ہو، میری زمین وسیع ہے، پس تم میری ہی بندگی بجا لاؤ۔ ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لاتے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اُن کو ہم جنت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے —— اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ اُن کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے۔ وہ سب کچھ سُنتا اور جانتا ہے۔"

سُورۂ عنکبوت کی اِن آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا جذبہ تھا جو اُس وقت اُمّتِ مُسلمہ میں پھونکا گیا تھا۔

پہلی آیت میں اشارہ ہے ہجرت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مکّے میں خدا کی بندگی کرنی مشکل ہو رہی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ۔ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔ جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ۔ تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے۔ جو سچّا مومن ہے

وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات مار دے گا جو جھوٹا مدعیٔ ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑ دے گا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا۔ یہ آیت اِس باب میں بالکل صریح ہے کہ ایک سچا خدا پرست انسان محبِّ قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پر دُنیا کی ہر چیز کو وہ قربان کر دے گا مگر اُسے دُنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہٰذا تمہارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائقِ فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پُورے کیے جائیں۔ آخر کار تمہیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے۔ اگر دُنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا اور ایمان بچانے کے لیے جان کھو آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہو گا۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے؟ جان پر قربان کیا ہوا ایمان؟ یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

تیسری آیت میں بتایا گیا کہ اگر ایمان اور نیکی کے راستہ پر چل کر بالفرض تم دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دُنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام ہی مرے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہرحال ہو گی اور نری تلافی ہی نہ ہو گی بلکہ بہترین اجر بھی نصیب ہو گا۔

چوتھی آیت میں فرمایا گیا کہ آخرت کا یہ بہترین اجر اُن لوگوں کے لیے ہے جو ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے۔ جنہوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا اور مُنہ نہیں موڑا۔ ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کی طرف ذرّہ برابر التفات نہ کیا۔ کفّار و فسّاق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا اور اُن کی دولت و حشمت پر ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی جنہوں نے بھروسا اپنی جائداد و زمین اور اپنے کاروبار اور اپنے کنبے قبیلے پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا۔ جو اسبابِ دُنیوی سے قطع نظر کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار ہو گئے اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ جنہوں نے اپنے رب پر یہ اعتماد کیا کہ ایمان اور نیکی پر قائم رہنے کا اجر اُس کے ہاں کبھی ضائع نہ ہو گا اور یقین رکھا کہ وہ اپنے مومن و صالح بندوں کی اس دُنیا میں بھی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں بھی اُن کے عمل کا بہترین بدلہ دے گا۔

آخری آیت میں فرمایا، ہجرت کرتے ہوئے تمہیں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، اِن میں سے کون اپنا رزق اُٹھائے پھر رہا ہے؟ اللہ ہی تو اِن سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے اِن کو کسی نہ کسی طرح رزق مِل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا تم یہ سوچ سوچ کر ہمّت نہ ہارو کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے، تمہیں بھی دے گا۔ (۱۴۲)

اہلِ ایمان سے کُفّار کے تعلق کی نوعیّت

ایک طرف اُمّتِ مُسلمہ کے اندر اُس کے افراد کا باہمی تعلق اور اپنے دین و ایمان سے اُن کی وابستگی کو صاف صاف بیان کیا گیا۔ اور دوسری طرف یہ بھی بتا دیا گیا کہ کفّار سے مسلمانوں کا تعلق کس طرح کا ہونا چاہیے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ (آلِ عمران-۲۸)

"مومن اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔"

يٰۤاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (النسآء: ۱۴۴)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جٰهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلَا رَسُولِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً ؕ (التوبہ-۱۶)۔

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم یُونہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اُس کی راہ میں) جانفشانی کی اور اللہ اور رسُول اور مومنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا۔"

سُورۂ توبہ کی اِس آیت میں خطاب مدینے کے اُن لوگوں سے کیا گیا ہے جو نئے نئے اسلام لائے تھے۔ اُن سے کہا گیا ہے کہ جب تک تم اِس آزمائش سے گزر کر یہ ثابت نہ کرو گے کہ واقعی تم خُدا اور اُس کے دین کو اپنی جان و مال اور اپنے بھائی بندوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے ہو، تم سچّے مومن قرار نہیں دیے جا سکتے۔ اب تک تو ظاہر کے لحاظ سے تمہاری حیثیت یہ ہے کہ اسلام چونکہ مومنینِ صادقین اور سابقینِ اوّلین کی جانفشانیوں سے غالب آ گیا اور ملک پر چھا گیا اِس لیے تم مسلمان ہو گئے۔ (۱۴۳)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُونَ ۚ قُلْ اِنْ كَانَ

آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۔ (التوبہ ۔ ۲۳ ۔ ۲۴) ۔

" اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں ۔ تم میں سے جو اُن کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے ۔ اے نبی، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اُس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا ۔"

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۚ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (الممتحنہ ۔ ۴) ۔

" تم لوگوں کے لیے ابراہیمؑ اور اُس کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا " ہم تم سے اور تمہارے اُن معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہو گئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ ۔"

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ ۙ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي ۔

(الممتحنہ ۔ ۱)

" اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضاجوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم اُن کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اُس کو ماننے سے وہ

انکار کر چکے ہیں۔ وہ رسُول کو اور تم کو اس بنا پر نکال باہر کرتے ہیں کہ تم اللہ اپنے رب پر ایمان لاتے ہو "

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ (المجادلہ - ۲۲)

"تم کبھی یہ نہ پاؤگے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اُس کے رسُول کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ اُن کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے، یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہلِ خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دِلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک رُوح عطا کر کے ان کو قوت بخشی ہے "

سُورۂ مجادلہ کی اِس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک بات اصُولی ہے اور دوسری امرِ واقعی کا بیان۔ اصُولی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ دینِ حق پر ایمان اور اعدائے دین کی محبّت، دو بالکل متضاد چیزیں ہیں جن کا ایک جگہ اجتماع کسی طرح قابلِ تصوّر نہیں ہے۔ یہ بات قطعی ناممکن ہے کہ ایمان اور دشمنانِ خدا و رسُول کی محبت ایک دل میں جمع ہو جائیں، بالکل اُسی طرح جیسے ایک آدمی کے دل میں اپنی ذات کی محبّت اور اپنے دشمن کی محبّت دونوں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ ایمان کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اُس نے ایسے لوگوں سے محبّت کا رشتہ بھی جوڑ رکھا ہے جو اسلام کے مخالف ہیں تو یہ غلط فہمی تمہیں ہرگز لاحق نہ ہونی چاہیے کہ شاید وہ اپنی اس روش کے باوجود ایمان کے دعوے میں سچا ہو۔ اِسی طرح جن لوگوں نے اسلام اور مخالفینِ اسلام سے بیک وقت رشتہ جوڑ رکھا ہے وہ خود بھی اپنی حیثیت پر اچھی طرح غور کر لیں کہ وہ فی الواقع کیا ہیں، مومن ہیں یا منافق؟ اور فی الواقع کیا ہونا چاہتے ہیں، مومن بن کر رہنا چاہتے ہیں یا منافق؟ اگر اُن کے اندر کچھ بھی راستبازی موجود ہے اور وہ کچھ بھی یہ احساس اپنے اندر رکھتے ہیں کہ اخلاقی حیثیت سے منافقت انسان کے لیے ذلیل ترین رویّہ ہے، تو انہیں بیک وقت دو کشتیوں میں سوار ہونے کی کوشش چھوڑ دینی چاہیے۔ ایمان تو اُن سے دو ٹوک فیصلہ چاہتا ہے۔ مومن رہنا چاہتے ہیں تو ہر اُس رشتے اور تعلق کو قربان کر دیں جو اسلام کے ساتھ اُن کے تعلق سے متصادم ہوتا ہو۔ اسلام کے رشتے سے کسی اور رشتے کو عزیز رکھتے ہیں تو بہتر ہے کہ ایمان کا جھوٹا دعویٰ چھوڑ دیں۔

یہ تو ہے اصولی بات۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہاں صرف اصول بیان کر دینے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس امر واقعی کو بھی مدعیانِ ایمان کے سامنے نمونے کے طور پر پیش فرما دیا کہ جو لوگ سچے مومن تھے انہوں نے فی الواقع سب کی آنکھوں کے سامنے تمام اُن رشتوں کو کاٹ پھینکا جو اللہ کے دین کے ساتھ اُن کے تعلق میں حائل ہو رہے تھے۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو بدر و اُحد کے معرکوں میں سارے عرب نے دیکھ لیا تھا۔ مکہ سے جو صحابہ کرام ہجرت کر کے مدینے آئے تھے وہ صرف خدا اور اُس کے دین کی خاطر خود اپنے قبیلے اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے لڑ گئے۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے اپنے باپ عبداللہ بن جراح کو قتل کیا۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو قتل کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے بیٹے عبدالرحمٰن سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ، اور حضرت عُبیدہؓ بن الحارث نے عُتبہ، شیبہ اور ولید بن عُتبہ کو قتل کیا جو ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ حضرت عمرؓ نے اسیرانِ جنگ بدر کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے رشتہ دار کو قتل کرے۔ اسی جنگ بدر میں حضرت مصعبؓ بن عمیر کے سگے بھائی ابوعزیز بن عمیر کو ایک انصاری پکڑ کر باندھ رہا تھا۔ حضرت مصعبؓ نے دیکھا تو پکار کر کہا "ذرا مضبوط باندھنا، اس کی ماں بڑی مالدار ہے، اس کی رہائی کے لیے وہ تمہیں بہت سا فدیہ دے گی۔" ابوعزیز نے کہا "تم بھائی ہو کر یہ بات کہہ رہے ہو؟" حضرت مصعبؓ نے جواب دیا "اس وقت تم میرے بھائی نہیں ہو بلکہ یہ انصاری میرا بھائی ہے جو تمہیں گرفتار کر رہا ہے۔" اسی جنگ بدر میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس اور داماد ابوالعاص (حضرت زینبؓ بنت رسول اللہ کے شوہر) گرفتار ہو کر آئے، مگر ان کے ساتھ رسولؐ کی رشتہ داری کی بنا پر قطعاً کوئی امتیازی سلوک نہ کیا گیا جو دوسرے قیدیوں سے کچھ بھی مختلف ہوتا۔ اس طرح عالم واقعہ میں دنیا کو یہ دکھا دیا گیا کہ مخلص مسلمان کیسے ہوتے ہیں اور اللہ اور اس کے دین کے ساتھ اُن کا تعلق کیسا ہوا کرتا ہے۔

دیلمی نے حضرت معاذؓ کی روایت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا نقل کی ہے کہ اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ (وفی روایۃٍ لِفَاسِقٍ) عَلَیَّ یَدًا وَلَا نِعْمَۃً فَیَوَدُّہٗ قَلْبِیْ فَاِنِّیْ وَجَدْتُ فِیْمَا اُوْحِیَتْ اِلَیَّ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ "خدایا، کسی فاجر (اور ایک روایت میں ہے فاسق) کا میرے اوپر کوئی احسان نہ ہونے دے کہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی محبت پیدا ہو، کیونکہ تیری نازل کردہ وحی میں یہ بات میں نے پائی ہے کہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھنے والوں کو تم اللہ اور رسول کے مخالفوں سے محبت کرتے نہ پاؤ گے۔" (۱۴۵)

کسی کی خاطر ایمان نہیں چھوڑا جا سکتا

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝ وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمان: ۱۴-۱۵)

"اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی خود تاکید کی ہے۔ اُس کی ماں نے مشقت پر مشقت اُٹھا کر اُسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اُس کا دُودھ چھوٹنے میں لگے (اسی لیے ہم نے اس کو نصیحت کی کہ) میرا شکر اور اپنے والدین کا شکر بجا لا، میری ہی طرف تجھے پلٹنا ہے لیکن اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو (میرا شریک) نہیں جانتا تو اُن کی بات ہرگز نہ مان، البتہ دنیا میں اُن کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔"

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ (العنکبوت ۸)

"ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ہدایت کی ہے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھہرائے جسے تو (میرے شریک کی حیثیت سے) نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔"

سورۂ عنکبوت کی اس آیت کے متعلق مسلم، ترمذی، احمد، ابوداؤد اور نسائی کی روایت ہے کہ یہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ وہ ۱۸-۱۹ سال کے تھے جب اُنہوں نے اسلام قبول کیا۔ اُن کی ماں حمنہ بنت سفیان بن اُمیہ (ابوسفیان کی بھتیجی) کو جب معلوم ہوا کہ بیٹا مسلمان ہو گیا ہے تو اس نے کہا کہ جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤں گی نہ پیوں گی نہ سائے میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی ہوگی۔" حضرت سعدؓ اس پر سخت پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ممکن ہے کہ ایسے ہی حالات سے دوسرے وہ نوجوان بھی دوچار ہوتے ہوں جو مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ اسی لیے اس مضمون کو سورۂ لقمان کی اُس آیت میں بھی پورے زور کے ساتھ دوہرایا گیا ہے جسے ہم اُوپر نقل کر چکے ہیں۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ انسان پر مخلوقات میں سے اگر کسی کا حق سب سے بڑھ کر ہے تو وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ لیکن ماں باپ بھی اگر انسان کو شرک پر مجبور کریں تو اُن کی بات قبول نہ کرنی چاہیے، کجا کہ کسی اور کے۔

کہنے پر آدمی ایسا کرے۔ پھر الفاظ یہ ہیں کہ وَاِنْ جَاهَدٰكَ "اگر وہ دونوں تجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا پورا زور بھی لگا دیں"۔ اِس سے معلوم ہُوا کہ کم تر درجے کا دباؤ، یا ماں باپ میں سے کسی ایک کا زور دینا تو بدرجۂ اولیٰ رَد کر دینے کے لائق ہے۔ اِس کے ساتھ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا) کا فقرہ بھی قابلِ غور ہے۔ اِس میں اُن کی بات نہ ماننے کے لیے ایک معقول دلیل دی گئی ہے۔ ماں باپ کا یہ حق تو بے شک ہے کہ اولاد اُن کی خدمت کرے، اُن کا ادب و احترام کرے، اُن کی جائز باتوں میں اُن کی اطاعت بھی کرے۔ لیکن یہ حق اُن کو نہیں پہنچتا کہ آدمی اپنے علم کے خلاف اُن کی اندھی تقلید کرے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک بیٹا یا بیٹی صرف اس بنا پر ایک مذہب کی پیروی کیے جاتے کہ یہ اُس کے ماں باپ کا مذہب ہے۔ اگر اولاد کو یہ علم حاصل ہو جاتے کہ والدین کا مذہب غلط ہے تو اُسے اُس مذہب کو چھوڑ کر صحیح مذہب اختیار کرنا چاہیے اور اُن کے دباؤ ڈالنے پر بھی اُس طریقے کی پیروی نہ کرنی چاہیے جس کی گمراہی اُس پر کھل چکی ہو۔ اور یہ معاملہ جب والدین کے ساتھ ہے تو پھر دُنیا کے ہر شخص کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے۔ کسی شخص کی تقلید بھی جائز نہیں ہے جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ وہ شخص حق پر ہے۔ (۱۳۴)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۡ وَلَيُسْـَٔــلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ (العنکبوت: ۱۲-۱۳)

"یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اُوپر لے لیں گے۔ حالانکہ اُن کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اُوپر لینے والے نہیں ہیں، وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں۔ ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اُٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی۔ اور قیامت کے روز یقیناً اُن سے اِن افترا پردازیوں کی بازپرس ہوگی جو وہ کرتے رہتے ہیں۔"

کفّار کے اِس قول کا مطلب یہ تھا کہ اوّل تو زندگی بعدِ موت اور حشر و نشر اور حساب و جزا کی یہ باتیں سب ڈھکوسلا ہیں۔ لیکن اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے اور اُس میں کوئی بازپرس بھی ہونی ہے، تو ہم ذمہ لیتے ہیں کہ خدا کے سامنے سارا عذاب ثواب ہم اپنی گردن پر لے لیں گے۔ تم ہمارے کہنے سے اِس نئے دین کو چھوڑ دو اور اپنے دینِ آبائی کی طرف واپس آجاؤ۔ روایات میں متعدد سردارانِ قریش کے متعلق یہ مذکور ہے کہ ابتداءً جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے اُن سے مل کر یہ لوگ اِسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ابوسفیان اور حرب بن اُمیّہ بن خلف نے اُن سے مل کر یہی کہا تھا۔

اس پر فرمایا گیا کہ اوّل تو یہی ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا کے ہاں کسی دوسرے کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لے اور کسی کے کہنے سے گناہ کرنے والا خود اپنے گناہ کی سزا پانے سے بچ جائے، کیونکہ وہاں تو ہر شخص اپنے کیے کا آپ ذمہ دار ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو جس وقت کفر و شرک کا انجام ایک دہکتی ہوئی جہنم کی صورت میں سامنے آئے گا اُس وقت کس کی یہ ہمّت ہوگی کہ دُنیا میں جو وعدہ اُس نے کیا تھا اس کی لاج رکھنے کے لیے یہ کہہ دے کہ حضور میرے کہنے سے جس شخص نے ایمان کو چھوڑ کر اِرتداد کی راہ اختیار کی تھی، آپ اسے معاف کر کے جنّت میں بھیج دیں، اور میں جہنّم میں اپنے کفر کے ساتھ اس کے کفر کی سزا بھی بھگتنے کے لیے تیار ہوں؟ (١٩٦)

کفّار کے لیے استغفار ممنوع ہے

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۔ (التوبہ - ۱۱۳)

"نبی اور ایمان لانے والوں کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دُعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ اُن پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنّم کے مستحق ہیں۔"

کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لانا یہ معنی رکھتی ہے کہ اوّل تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی و محبّت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابلِ معافی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اُس شخص کے معاملہ میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گنہگار ہو، لیکن جو شخص کھلا ہُوا باغی ہو اُس کے ساتھ ہمدردی و محبّت رکھنا اور اُس کے جُرم کو قابلِ معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اُصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے، یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے، اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبّت بے لاگ نہیں ہے، اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کر لے اور ہمارے رشتہ داروں کو تو ضرور بخش دے خواہ اُسی جُرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مجرموں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اُس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبّت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مشرکین کے لیے

مغفرت کی دُعا نہ کرو" بلکہ یُوں فرمایا ہے کہ تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے، تمہارا یہ کام نہیں ہے، کہ تم اُن کے لیے مغفرت کی دُعا کرو" یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو یہ کچھ بات نہ ہوئی۔ تم میں تو وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جُرم کو قابلِ معافی سمجھنا تم کو خود اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملہ میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دُنیوی تعلقات میں صلۂ رحمی، مواسات اور رحمت و شفقت کا برتاؤ، تو یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتہ دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دُنیوی حقوق ضروری ادا کیے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہرحال مدد کی جائے گی۔ حاجت مند آدمی کو بہرصورت سہارا دیا جائے گا۔ بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے گی۔ یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا۔ ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔ (۳۴۸)

شادی بیاہ اور وراثت کا تعلق بھی اُن سے جائز نہیں

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ (الممتحنہ۔۱۰)

"نہ مسلمان عورتیں کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار اُن کے لیے حلال۔"

وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (الممتحنہ۔۱۰)

"اور تم خود بھی کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ روکے رکھو۔"

البتہ اِس حکم میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں سے مسلمان مرد نکاح کر سکتے ہیں جیسا کہ سورۂ مائدہ، آیت ۵ میں فرمایا گیا ہے۔ رہیں مسلمان عورتیں تو وہ مسلمان کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں ہیں۔

وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّن مُّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ (البقرہ۔۲۲۱)

"تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ اور اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا، جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام مشرک شریف سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔"

حضرت اُسامہؓ بن زیدؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَلَا الْکَافِرُ الْمُسْلِمَ (بخاری، مسلم، نسائی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد)۔

"مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے"

کافروں کی دو قسمیں اور اُن کے ساتھ برتاؤ میں فرق

اِس طرح اُمتِ مسلمہ کو کفار سے پوری طرح الگ کر دینے کے بعد صرف ایک اعتبار سے دو قسم کے کافروں کے درمیان مسلمانوں کے برتاؤ میں فرق کیا گیا، اور وہ یہ ہے:

"اللہ تمہیں اِس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم اُن لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔ اُن سے جو لوگ دوستی کریں وہ ظالم ہیں" (الممتحنہ۔ آیات ۸-۹)۔

بالفاظِ دیگر مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ انہیں دشمن کافر اور غیر دشمن کافر میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے اور اُن کافروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرنا چاہیے جنہوں نے کبھی اُن کے ساتھ کوئی بُرائی نہ کی ہو۔ اِس کی بہترین تشریح وہ واقعہ ہے جو حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ اور اُن کی کافر ماں کے درمیان پیش آیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی ایک بیوی کافرہ تھیں اور مکہ ہی میں رہ گئی تھیں۔ حضرت اسماءؓ اُنہی کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب مکے اور مدینے کے درمیان آمدورفت شروع ہوئی تو وہ بیٹی سے ملنے کے لیے مدینہ آئیں اور کچھ تحفے تحائف بھی لائیں۔ حضرت اسماءؓ کا اپنا بیان ہے کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر پوچھا "اپنی ماں سے مل لوں؟ اور کیا میں اُن سے صلۂ رحمی بھی کر سکتی ہوں؟" حضورؐ نے فرمایا ملو بھی اور صلۂ رحمی بھی کرو (مسند احمد، بخاری، مسلم)۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنے کافر ماں، باپ، بھائی بہن اور رشتہ داروں کی مدد کرنا جائز ہے اگر وہ دشمنِ اسلام نہ ہوں۔ اور اسی طرح ذِمّی مساکین پر صدقات بھی صرف کیے جا سکتے ہیں (احکام القرآن للجصاص۔ روح المعانی)۔ (۱۴۹)

اُمتِ مسلمہ کی حقیقی حیثیت

اِس طرح جو جماعت وجود میں آئی تھی وہ کسی معنی میں بھی ایک "قوم" نہ تھی۔ اُس کی حقیقی حیثیت کو اُن

الفاظ سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے جو قرآن اور حدیث میں اس کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

حزب

ایک لفظ حِزْب ہے جو قرآن مجید میں دو جگہ مسلمانوں کے لیے استعمال ہوا ہے (المائدہ۔ آیت ۵۶۔ المجادلہ۔ آیت ۲۲)، اور یہ بعینہٖ پارٹی کا ہم معنی ہے۔ دونوں جگہ مسلمانوں کو حزب اللہ (اللہ کی پارٹی کے لوگ) کہا گیا ہے، یعنی اُس پارٹی کے لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو اللہ کے کام کے لیے وقف کر دیا ہے۔ قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور پارٹیاں اُصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔ کیونکہ اِن کو تمام دنیا سے الگ اور ایک دوسرے سے وابستہ صرف اس بنا پر کیا گیا ہے کہ یہ ایک اُصول اور مسلک کے معتقد اور پیرو ہیں، اور جن لوگوں سے اِن کا اصول و مسلک میں اشتراک نہیں ہے وہ خواہ اِن سے قریب ترین خونی اور مادّی رشتے ہی کیوں نہ رکھتے ہوں، اُن کے ساتھ اِن کا کوئی میل نہیں ہے۔

قرآن سطحِ زمین کی اِس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں دیکھتا ہے۔ ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) دوسری شیطان کی پارٹی (حزب الشیطان)۔ شیطان کی پارٹی میں خواہ باہم اُصول و مسلک کے اعتبار سے کتنے ہی اختلافات ہوں، قرآن اُن سب کو ایک سمجھتا ہے، کیونکہ اُن کا طریقِ فکر اور طریقِ عمل بہرحال اسلام نہیں ہے اور جزئی اختلافات کے باوجود بہرحال وہ سب شیطان کے اِتباع پر متفق ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ۔ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۔ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۔ (المجادلہ۔ ۱۹)

"شیطان اُن پر مسلط ہو چکا ہے اور اُس نے خدا کی یاد اُن کے دل سے بھلا دی ہے۔ وہ شیطان کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، شیطان کی پارٹی والے ہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔"

برعکس اِس کے اللہ کی پارٹی والے خواہ نسل اور وطن، رنگ اور زبان اور تاریخی روایات کے اعتبار سے باہم کتنے ہی مختلف ہوں، بلکہ چاہے اُن کے آباؤ اجداد میں باہم خونی عداوتیں ہی کیوں نہ رہ چکی ہوں، جب وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقِ فکر اور مسلکِ حیات میں متفق ہو گئے تو گویا الٰہی رشتے (حَبْلُ اللّٰہ) سے باہم جُڑ گئے اور اس نئی پارٹی میں داخل ہوتے ہی اُن کے تمام تعلقات حزب الشیطان والوں سے کٹ گئے۔

اُمّت

دوسرا لفظ جو مسلمانوں کے لیے پارٹی ہی کے معنی میں قرآن نے چار جگہ (البقرہ۔ ۱۲۸-۱۴۳، آل عمران ۱۰۴-۱۱۰)

استعمال کیا ہے وہ لفظ اُمّت ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ کثرت سے مُستعمل ہُوا ہے۔ اُمّت اُس جماعت کو کہتے ہیں جس کو کسی امرِ جامع نے مجتمع کیا ہو۔ جن افراد کے درمیان کوئی اصل مشترک ہو اُن کو اُسی اصل کے لحاظ سے "اُمّت" کہا جاتا ہے۔ مثلاً ایک زمانے کے لوگ بھی "اُمّت" کہے جاتے ہیں۔ ایک نسل یا ایک ملک کے لوگ بھی "اُمّت" کہے جاتے ہیں مگر مسلمانوں کو جس اصلِ مشترک کی بنا پر اُمّت کہا گیا ہے وہ نسل یا وطن یا معاشی اغراض وغیرہ نہیں ہیں بلکہ وہ اُن کی زندگی کا مشن اور اُن کی پارٹی کا اصول اور مسلک ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران - ۱۱۰)

"تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔"

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ - ۱۴۳)

"اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی اُمّت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر نگراں ہو اور رسُول تم پر نگراں ہو۔"

اِن آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "مُسلمان" دراصل ایک بین الاقوامی پارٹی کا نام ہے۔ دُنیا کی ساری قوموں میں سے اُن اشخاص کو چھانٹ کر نکالا گیا ہے جو ایک خاص اصُول کو ماننے، ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک مشن کو انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ لوگ چونکہ ہر قوم سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے بھی اِن کا تعلق نہیں رہا ہے، اِس لیے یہ بیچ کی اُمّت ہیں۔ لیکن ہر ہر قوم سے تعلق توڑنے کے بعد سب قوموں سے اِن کا ایک دوسرا تعلق قائم کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دُنیا میں خدائی فوجدار کے فرائض انجام دیں۔ "تم نوعِ انسانی پر نگراں ہو" کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مُسلمان خدا کی طرف سے دُنیا میں فوجدار مقرر کیا گیا ہے اور "نوعِ انسانی کے لیے نکالا گیا ہے" کا فقرہ صاف کہہ رہا ہے کہ مُسلمان کا مشن ایک عالمگیر مشن ہے۔ اِس مشن کا خلاصہ یہ ہے کہ "حزبُ اللہ" کے رہنما سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو فکر و عمل کا جو ضابطہ خدا نے دیا تھا اس کو تمام ذہنی، اخلاقی اور مادّی طاقتوں سے کام لے کر دُنیا میں نافذ کیا جائے، اور اُس کے مقابلہ میں دوسرے ہر طریقے کو مغلوب کر دیا جائے۔ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ یہ ہے وہ چیز جس کی بنیاد پر مُسلمان ایک اُمّت بنائے گئے ہیں۔

جماعت

تیسرا اصطلاحی لفظ جو مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت ظاہر کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت استعمال کیا ہے وہ لفظ جماعت ہے، اور یہ لفظ بھی "حزب" کی طرح بالکل پارٹی کا ہم معنی ہے۔ علیکم بالجماعۃ، اور یدُ اللہ علی الجماعۃ، اور ایسی ہی بکثرت احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قوم" یا "شعب" یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ استعمال کرنے سے قصداً احتراز فرمایا اور ان کے بجائے "جماعت" ہی کی اصطلاح استعمال کی۔ آپ نے کبھی یہ نہ فرمایا کہ "ہمیشہ قوم کے ساتھ رہو" یا "قوم پر خدا کا ہاتھ ہے" بلکہ ایسے تمام مواقع پر آپ جماعت ہی کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے اور یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے اجتماع کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے "قوم" کے بجائے "اُمت"، "جماعت"، "حزب" یا پارٹی کے الفاظ ہی زیادہ مناسب ہیں۔ قوم کا لفظ جن معنوں میں عموماً مستعمل ہوتا ہے اُن کے لحاظ سے ایک شخص خواہ وہ کسی مسلک اور کسی اُصول کا پیرو ہو، ایک قوم میں شامل رہ سکتا ہے جبکہ وہ اُس قوم میں پیدا ہوا ہو اور اپنے نام، طرزِ زندگی اور معاشرتی تعلقات کے اعتبار سے اُس قوم کے ساتھ مُنسلک ہو۔ لیکن اُمّت، جماعت، حزب اور پارٹی کے الفاظ جن معنوں میں مستعمل ہوتے ہیں اُن کے لحاظ سے اُصول اور مسلک ہی پر پارٹی میں شامل ہونے یا اُس سے خارج ہونے کا مدار ہوتا ہے۔

اصُولی جماعت اور قومی جماعت کا فرق

اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے جس کے پیشِ نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کا ایک خاص نظریّہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اِس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی پارٹی ہوتی ہے اِس لیے وہ اُس قوم کا جُزو بن کر کام کر سکتی ہے اور کرتی ہے جس میں وہ پیدا ہُوئی ہو۔

دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کُلّی نظریہ اور جہانی تصوّر (World Idea) لے کر اُٹھتی ہے جس کے پاس تمام نوعِ انسانی کے لیے بلالحاظِ قوم و وطن ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے، جو پُوری زندگی کی تشکیل و تعمیر ایک خاص ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے، جس کا نظریّہ و مسلک، عقائد و افکار اور اصولِ اخلاق سے لے کر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے، جو ایک مستقل تہذیب (Culture) اور ایک مخصوص تمدّن (Civilization) کو وجود میں لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ یہ جماعت بھی اگرچہ ہوتی ایک جماعت ہی ہے، لیکن یہ اُس قسم کی جماعت نہیں ہوتی جو کسی قوم کا جُزو بن کر کام کر سکتی ہو۔ یہ محدود قومیتوں سے

بالاتر ہوتی ہے۔ اِس کا نوعیّت ہی یہ ہوتا ہے کہ اُن تمام تعصّبات کو توڑ ڈالے جن سے دُنیا میں نسل، رنگ، زبان، وطن اور روایات کی بنیاد پر مختلف قومیتیں بنی ہیں۔ یہ اپنے آپ کو ان قومیتوں کے ساتھ کیسے وابستہ کر سکتی ہے؟ یہ تو نسلی و تاریخی قومیتوں کے بجائے ایک عقلی قومیت (Rational Nationality) بناتی ہے جامد قومیتوں کی جگہ ایک نامی قومیت (Expanding Nationality) بناتی ہے۔ یہ خود ایک ایسی قومیت بنتی ہے جو فکری و تہذیبی وحدت کی بنیاد پر رفتہ رفتہ زمین کی پوری آبادی کو اپنے دائرے میں لینے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ لیکن اِس معنی میں ایک قومیت بننے کے باوجود حقیقت میں یہ ایک جماعت ہی رہتی ہے، کیونکہ اس میں شامل ہونے کا مدار اتفاقی پیدائش پر نہیں ہوتا بلکہ اُس خاص نظریّہ و مسلک کی شعوری پیروی پر ہوتا ہے جس کی بنیاد پر یہ جماعت بنتی ہے۔

مسلمان دراصل اِس دوسری قسم کی جماعت کا نام ہے۔ یہ اُس قسم کی پارٹی نہیں ہے جیسی پارٹیاں ایک قوم میں بنا کرتی ہیں۔ بلکہ یہ اُس قسم کی پارٹی ہے جو ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی اور ایک مستقل نظامِ تہذیب و تمدّن بنانے کے لیے اُٹھتی ہے اور چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی تنگ سرحدوں کو توڑ کر عقلی بنیاد پر ایک بڑی جہانی قومیت (World Nationality) بنانا چاہتی ہے۔ اس کو "قوم" کہنا اِس لحاظ سے تو درست ہوگا کہ یہ اپنے آپ کو دُنیا کی نسلی یا تاریخی قومیتوں میں سے کسی قومیت کے ساتھ بھی باعتبارِ جذبات وابستہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی بلکہ اپنے نظریۂ حیات (View of Life) اور فلسفۂ اجتماع (Social Philosophy) کے مطابق خود اپنی تہذیب کی عمارت الگ بناتی ہے۔ لیکن اِس معنی کے لحاظ سے ایک الگ "قوم" ہونے کے باوجود حقیقت میں یہ جماعت ہی رہتی ہے کیونکہ محض اتفاقی پیدائش (Mere Accident of Birth) کسی شخص کو اس کا ممبر نہیں بنا سکتی جب تک کہ وہ اِس کے مسلک کا معتقد اور پیرو نہ ہو۔ اور اسی طرح کسی شخص کا کسی دوسری قوم میں پیدا ہونا اِس امر میں مانع بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قوم سے نکل کر اِس قوم میں داخل ہو جائے جب کہ وہ اِس کے مسلک پر ایمان لانے کے لیے تیار ہو۔ پس جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ مسلمانوں کی قومیت اُن کے ایک جماعت یا پارٹی ہونے ہی کی بنا پر قائم ہے۔ جماعتی حیثیت جڑ کا حکم رکھتی ہے اور قومی حیثیت اس کی فرع ہے۔ اگر جماعتی حیثیت کو اس سے الگ کر لیا جائے اور یہ محض ایک "قوم" بن کر رہ جائے تو یہ اس کا انحطاط اور تنزّل ہے۔ بلکہ یہ دراصل مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کے وجود کی نفی ہے۔ (۱۷۰)

خلاصۂ بحث

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رہنمائی میں اُمّتِ مُسلمہ کی یہ جُداگانہ تنظیم، اور ایک مستقل معاشرے کی حیثیت سے اس کی تاسیس، اور غیر مُسلم معاشرے سے اُس کی قطعی علیحدگی اگرچہ یکلخت نہیں بلکہ بتدریج کئی سال میں ہوتی، لیکن دعوتِ اسلامی کا آغاز جس ڈھنگ پر ہُوا تھا، اُس سے لوگوں نے ابتدا ہی میں یہ بھانپ لیا تھا کہ یہ تحریک کس رُخ پر جاری ہے اور آخر کار یہ کیا رنگ لاتے گی، اِس لیے پُرانے جاہلی معاشرے کو جو لوگ بھی باقی رکھنا چاہتے تھے وہ سب اِس پر بھڑک اٹھے اور اپنے درمیان سے اِس نئی اُمّت کے اُبھرنے کو روکنے کے لیے اُنھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ (۱۷۱)

فصل ہفتم

نبی اور غیر نبی کے کام کا فرق

اِس بحث کو ختم کرتے ہوئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ جو کچھ اب تک کہا جا چکا ہے اس پر ایک مجموعی نظر ڈال لی جائے، کیونکہ یہاں پہنچ کر ایک نبی اور غیر نبی کی قیادت اور اس کے طریقِ کار کا فرق اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جب عرب میں اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے تھے اُس وقت دُنیا میں بھی اور خود آپ کے اپنے ملک میں بھی بے شمار اخلاقی، تمدّنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رُوم اور ایران کے سامراج بھی انتہائی جابرانہ شان کے ساتھ موجود تھے۔ نسلی اور طبقاتی امتیازات بھی شدّت کے ساتھ پائے جاتے تھے۔ کمزوروں پر زبردستوں کا ظلم بھی بے تحاشا جاری تھا۔ ہر طرح کا ناجائز معاشی استحصال بھی ہو رہا تھا۔ بدترین اخلاقی بُرائیاں بھی پھیلی ہُوئی تھیں، حتیٰ کہ عبادت خانے تک فواحش کے اڈّے بنے ہوئے تھے۔ عرب اِن سب مُلکوں سے زیادہ پیچیدہ مسائل سے دوچار تھا جو ایک لیڈر کے ناخنِ تدبیر کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک ملک میں رہنے والی اور ایک ہی زبان بولنے والی قوم جس کے اندر نسل و نسب کے باہمی رشتے بھی موجود تھے، بے شمار قبائل میں بٹی ہوئی تھی۔ اُس کے اندر "عرب قوم" کا تصوّر سرے سے ناپید تھا۔ لوگ اپنے قبیلے ہی کو اپنی قوم سمجھتے اور کہتے تھے۔ ملک میں ہر طرف طوائف الملوکی، خانہ جنگی، بدامنی، جہالت،

اخلاقی پستی، ظلم و ستم، بھوک اور افلاس کا دور دورہ تھا۔ بیرونی طاقتیں عرب کی اِس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر ملک کے اندر گھسی چلی آرہی تھیں۔ شمال میں عین حجاز کی سرحد تک رُومی تسلّط پہنچ چکا تھا اور رُومی قیصریت اندرونِ ملک میں سیاسی اور مشنری پھیلا کر اپنے اثرات کو وسعت دے رہی تھی۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی سلطنت مدّتوں یمن پر حملے اور قبضے کرتی رہی، حتّٰی کہ ایک مرتبہ مکّہ تک بھی اس کی فوجیں پہنچ گئیں۔ ایران عرب کے مشرقی ساحل اور کچھ اندرونی علاقوں پر تو اپنا اندرونی تسلّط جما ہی چکا تھا، بعد میں یمن تک بھی اس کا اقتدار پہنچ گیا۔ حجاز میں اکثر و بیشتر زرخیز خطّوں پر باہر سے آئے ہوئے یہودی صدیوں سے قابض تھے اور اپنی سُود خواری کے جال میں انہوں نے عربوں کو پھانس رکھا تھا۔

اِس حالت میں اگر کوئی مُصلح قسم کا لیڈر عرب سے اُٹھتا تو وہ اپنے کام کا آغاز یا تو جاہلانہ رسموں، اخلاقی خرابیوں اور آپس کی خانہ جنگیوں کو روکنے کی کوششوں سے کرتا، یا پھر امیری و غریبی کا مسئلہ اُٹھا کر غریبوں کو امیروں سے بھڑا دیتا، تاکہ عام لوگوں کی بھوک مٹے اور افلاس دُور ہو۔ اور اگر کوئی سیاسی قسم کا لیڈر اُٹھتا تو وہ عربوں کو یہ لالچ دے کر اپنے پیچھے لگانے کی کوشش کرتا کہ میں تم کو ایک طاقت ور قوم بناؤں گا، بیرونی غاصبوں کو نکال باہر کروں گا، عرب کو ایک بڑی سلطنت بنا دوں گا، تمہاری تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ دوں گا، تمہارے وسائلِ معیشت بڑھاؤں گا، تمہاری بھوک مٹاؤں گا، اور طاقت حاصل کر کے گرد و پیش کے ممالک پر تاخت کروں گا تاکہ تم پر دولت کی بارش ہو۔ اس سارے کام میں اخلاق کا کوئی سوال درمیان میں نہ آتا، اور وہ اپنی سیاسی قیادت کو کامیاب بنانے کے لیے کسی چال، کسی جوڑ توڑ، کسی ہتھکنڈے، کسی زور زبردستی، اور کسی گندے وحشیانہ سے کام لینے میں ذرا تامّل نہ کرتا۔ پھر بنیادی طور پر دونوں قسم کے لیڈروں کی قیادت ایک قوم پرست نہ قیادت ہوتی۔ اپنے قبیلے کی عصبیت سے وہ بہت آگے بڑھتے بھی تو زیادہ سے زیادہ عربی عصبیت تک پہنچ جاتے۔ دوسرے ملکوں اور دوسری قوموں تک اُن کی نظر پھیلتی بھی تو عربی مفاد کے لیے پھیلتی، بین الانسانیت کے وسیع تر تصوّر تک اس کی رسائی محال تھی۔

اسلامی تحریک کا مخصوص طریقِ کار

اب ذرا اللہ کے بھیجے ہوئے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھیے۔ حالات اور مسائل وہی سب کچھ تھے جو اُوپر بیان ہوئے ہیں، اور وہ سب ہی اپنی اپنی جگہ اہم تھے جنہیں بالکل ناقابلِ توجہ نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ حضورؐ نے بھی اُن کو ناقابلِ توجہ نہیں سمجھا۔ وقت آنے پر اُن میں سے ایک ایک کو آپ نے صرف حل ہی نہیں کیا بلکہ وہ انقلابِ عظیم برپا کر کے دکھا دیا جس کا کوئی غیر نبی مُصلح یا سیاسی لیڈر تصوّر تک نہ کر سکتا تھا۔ لیکن آپ نے اپنے کام کے آغاز میں اِن سب سے قطعِ نظر فرما کر اپنی پوری توجہ صرف ایک

بنیادی اصلاح پر مرکوز کر دی جو انسانی زندگی کے سارے مسائل کو حل کرنے کی ایک ہی کلید تھی۔ اگرچہ آپ ایک قبیلے اور ایک شہر میں پیدا ہوئے تھے، لیکن اسلامی تحریک کے پہلے روز ہی سے آپ کے پیش نظر نہ قبیلہ تھا، نہ قوم، نہ ملک، نہ وطن، بلکہ پوری نوع انسانی پر آپ کی نگاہ تھی جس کو آپ ایک صراط مستقیم کی طرف دعوت دینے کے لیے اُٹھے تھے، اور سب مسائل کو چھوڑ کر جس بنیادی اصلاح پر آپ نے اپنی کوششیں مرکوز کر دی تھیں وہ یہ تھی کہ

(۱) لوگ توحید پر ایمان لائیں، سب کی بندگی چھوڑ کر صرف ایک اللہ کی بندگی اختیار کریں اور اُسی کے حکم کو واجب الاتباع قانون مانیں۔

(۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانیں اور اس ہدایت، تعلیم اور آئین و قانون کی اطاعت کریں جو اللہ کی طرف سے اُن کے ذریعہ پہنچے۔ رسول پر اس ایمان سے خود محمد بن عبداللہ بھی مستثنیٰ نہ تھے، کجا کہ کوئی اور ہو سکتا۔

(۳) قرآن کو اللہ کا کلام مانیں اور اس کے فرمان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے واجب الاذعان تسلیم کریں۔

(۴) آخرت پر ایمان لائیں اور یہ سمجھتے ہوئے دُنیا میں کام کریں کہ آخرکار مرنے کے بعد ہمیں اپنے خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔

(۵) اخلاق حسن و قبح کے اُن ناقابل تغیّر اصولوں کی پیروی اختیار کریں جو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتاب نے پیش کیے ہیں۔

(۶) انسانوں میں سے جو لوگ بھی اس دعوت کو قبول کر لیں وہ ایک ایسی اُمّت بن جائیں جو اس دعوت کی علمبردار بن کر اُٹھے، اس کو غالب کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دینے پر تیار ہو جائے، آپس میں پوری طرح متحد ہو، اور اپنا ایک مستقل معاشرہ بنا کر کفر اور کفار سے قلبی محبت اور عملی معاشرت کے تعلقات توڑ لے۔ (۱۶۲)

اس طریق کار کی اہمیت

ابتدا میں سب طرف سے نظر پھیر کر صرف اِسی ایک بنیادی اصلاح پر تمام زور صرف کرنے کی وجہ اوّل تو یہی تھی کہ یہی امرِ حق ہے اور رسول کا اصل کام حق ہی پیش کرنا ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی تحریک کے نقطہ نظر سے انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی میں جتنی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان سب کی اصل علّت انسان کا اپنے آپ کو خود مختار و غیر ذمہ دار سمجھنا، اور آپ اپنا اِلٰہ بن جانا یا اللہ العالمین کے سوا کسی دوسرے کو خدائی اوصاف و اختیارات یا حقوق کا حامل تسلیم کرنا ہے، خواہ وہ دوسرا کوئی انسان ہو یا غیر انسان۔ یہ خرابی جب تک جڑ میں موجود رہے اسلامی نظریہ کی رُو سے کوئی اُوپری اصلاح انفرادی بگاڑ یا اجتماعی خرابیوں کو دُور کرنے میں کامیاب

نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف سے خرابی کو دُور کیا جائے گا تو کسی دُوسری طرف سے وہ سر نکال لے گی۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز اگر ہو سکتا ہے تو صرف اِسی چیز سے ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو انسان کے دماغ سے خود مختاری و غیر جواب دہی کی ہوا نکال دی جائے اور اسے بتایا جائے کہ تو جس دُنیا میں رہتا ہے وہ درحقیقت بے بادشاہ کی سلطنت نہیں ہے، بلکہ فی الواقع اُس کا ایک بادشاہ (Sovereign) موجود ہے اور تو اُس کی پیدائشی رعیّت (Born Subject) ہے۔ اُس کی بادشاہی نہ تیرے تسلیم کرنے کی محتاج ہے، نہ تیرے ٹالے ٹل سکتی ہے اور نہ تو اُس کے حدودِ سلطنت سے نکل کر کہیں جا سکتا ہے۔ اِس اٹل اور اٹل واقعہ کی موجودگی میں تیرا خود مختاری کا زعم ایک احمقانہ غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کا نقصان لامحالہ تیرے ہی اوپر عائد ہو گا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ تو سیدھی طرح اُس کے آگے سر جھکا دے اور بندہ مطیع (مُسلم) بن کر رہے۔ دوسری طرف اُس کو حقیقت کا یہ پہلو بھی دکھا دیا جائے کہ اِس پوری کائنات میں صرف ایک ہی بادشاہ، ایک ہی مالک اور ایک ہی مختارِ کُل ہے۔ کسی دوسرے کو نہ یہاں حکم چلانے کا حق ہے اور نہ درحقیقت کسی کا حکم چلتا ہے۔ اِس لیے تو اُس کے سوا کسی کا بندہ نہ بن، کسی کا حکم نہ مان، کسی کے آگے سر نہ جھکا۔ یہاں کوئی ہزمیجسٹی نہیں ہے۔ میجسٹی اُسی ایک کے لیے مختص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہولی نس نہیں ہے۔ ہولی نس ساری کی ساری اُسی کے لیے خاص ہے۔ یہاں کوئی ہز ہائی نس نہیں ہے۔ ہائی نس صرف اُسی ایک کو زیبا ہے۔ یہاں کوئی ہز لارڈ شپ نہیں ہے۔ لارڈ شپ بالکلیہ اُسی ایک کا حصّہ ہے۔ یہاں کوئی قانون ساز نہیں ہے۔ قانون اُسی کا ہے اور وہی قانون بنانے کا حقدار و سزاوار ہے۔ یہاں کوئی سرکار، کوئی اَن داتا، کوئی شاہ و شہنشاہ، کوئی ولی و کارساز، کوئی مشکل کُشا، کوئی دُعائیں سُننے والا اور کوئی فریاد رس نہیں ہے۔ کسی کے پاس اقتدار کی کنجیاں نہیں ہیں۔ کسی کو برتری و فوقیت حاصل نہیں ہے۔ زمین سے آسمان تک سب بندے ہی بندے ہیں۔ رب اور مولیٰ صرف ایک ہے۔ لہٰذا تو ہر غلامی، ہر اطاعت، ہر پابندی سے انکار کر دے اور اُسی ایک کا غلام، مطیع اور پابندِ حکم بن جا۔

یہ تمام اصلاحات کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر انفرادی سیرت اور اجتماعی نظام کی پوری عمارت از سر نو ایک خاص نقشے پر بنتی ہے۔ اور سارے مسائل جو انسانی زندگی میں آدمؑ سے لے کر اب تک پیدا ہوئے اور اب سے قیامت تک پیدا ہوں گے، اسی بنیاد پر ایک نئے طریقے سے حل ہوتے ہیں۔

حضورؐ کی دعوت کا طریق آغاز

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس بنیادی اصلاح کی دعوت کو بغیر کسی سابق تیاری اور بغیر کسی تمہیدی کارروائی کے براہِ راست پیش کر دیا۔ اُنھوں نے اس دعوت کی منزل تک پہنچنے کے لیے کوئی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا

کہ پہلے کچھ سیاسی اور سوشل طرز کا کام کر کے لوگوں میں اثر پیدا کیا جائے، پھر اس اثر سے کام لے کر رفتہ رفتہ کچھ حاکمانہ اختیارات حاصل کر لیے جائیں، پھر ان اختیارات سے کام لے کر رفتہ رفتہ لوگوں کو چلاتے ہوئے اس مقام تک بڑھا لائیں۔ یہ سب کچھ کچھ نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں ایک شخص اٹھا اور چھوٹتے ہی اس نے لا الٰہ إلا اللہ کا اعلان کر دیا۔ اس سے کم کسی چیز پر اس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ ٹھیری۔ اس کی وجہ محض پیغمبرانہ جرأت اور تبلیغی جوش ہی نہیں ہے۔ در اصل اسلامی تحریک کا طریق کار یہی ہے۔ وہ اثر یا وہ نفوذ و اقتدار جو دوسرے ذرائع سے پیدا کیا جائے، اس اصلاح کے کام میں کچھ بھی مددگار نہیں ہوتا۔ جو لوگ لا الٰہ الا اللہ کے سوا کسی اور بنیاد پر آدمی کا ساتھ دیتے رہے ہوں وہ اس بنیاد پر تعمیر جدید کرنے میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتے۔ اس کام میں تو وہی لوگ مفید ہو سکتے ہیں جو بلانے والے کی طرف لا الٰہ الا اللہ کی آواز سن کر ہی آئیں، اسی چیز میں ان کے لیے کشش ہو، اسی حقیقت کو وہ زندگی کی بنیاد بنائیں اور اسی اساس پر وہ کام کرنے کے لیے اٹھیں۔ لہٰذا اسلامی تحریک چلانے کے لیے جس خاص قسم کے تدبر اور حکمت عملی کی ضرورت ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ کسی تمہید کے بغیر کام کا آغاز توحید کی دعوت ہی سے کیا جائے۔

توحید کے تصور کی وسعت

توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے انفرادی و اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکمیت و ربوبیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر ایک نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا موذنوں کو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ میں کیا پکار رہا ہوں نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد موجود الوقت پورے نظام سے بغاوت اور اس کی جگہ ایک دوسرا نظام تعمیر کرنا ہے تو یقین جانیے کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں، دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہو گا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔

اس طریق کار کی کامیابی کے اسباب

یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے علانیہ یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا، اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے، اس لیے جس جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس آواز کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں اور پروہتوں کو اپنی برہمنیت و

یا پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا۔ رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنے نسلی تفوق کا، رسم پرستوں کو اپنی رسوم کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقے کا، غرض ہر بُت کے پرستار کو اپنے بُت کے ٹوٹنے کا خطرہ اسی ایک آواز میں محسوس ہُوا۔ اس لیے اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ کے مصداق وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔ اس حالت میں صرف وہی لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف آ سکتے تھے جن کا ذہن صاف تھا۔ جو حقیقت کو سمجھنے اور تسلیم کرنے کی استعداد رکھتے تھے۔ جن کے اندر اتنی صداقت پسندی موجود تھی کہ جب ایک چیز کے متعلق جان لیں کہ حق یہ ہے تو اس کی خاطر آگ میں کودنے اور موت سے کھیلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ ایسے ہی لوگوں کی اس تحریک کے لیے ضرورت تھی۔ وہ ایک ایک، دو دو، چار چار کر کے آتے رہے اور کشمکش بڑھتی رہی۔ کسی کا روزگار چھوٹا۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا۔ کسی کے عزیز، دوست آشنا سب چھوٹ گئے۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔ کسی کو عورت، مال، حکومت، ریاست، غرض ہر ممکن چیز کا لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔ یہ سب چیزیں آئیں۔ اِن کا آنا ضروری تھا۔ اِن کے بغیر اسلامی تحریک نہ مستحکم ہو سکتی تھی اور نہ آگے بڑھ سکتی تھی۔

کام کے آدمی چھانٹنے اور انہیں تربیت دینے کا فطری طریقہ

اِن کا لازمی فائدہ یہ تھا کہ گھٹیا قسم کے، کمزور سیرت و کردار اور ضعیف ارادہ رکھنے والے لوگ اس طرف آ ہی نہ سکتے تھے۔ جو بھی آیا وہ نسلِ آدم کا بہترین جوہر تھا جس کی دراصل ضرورت تھی۔ کوئی دوسری صورت کام کے آدمیوں کو ناکارہ آدمیوں سے چھانٹ کر الگ نکال لینے کی اِس کے سوا نہ تھی کہ جو بھی آتے وہ اِس بھٹی میں سے گزر کر آتے۔ پھر جو لوگ آئے اُن کو اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے، یا کسی خاندانی یا قومی مقصد کے لیے مصائب کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا، بلکہ انہوں نے جو کچھ بھی سہا صرف حق اور صداقت کے لیے، خدا اور اس کی رضا کے لیے سہا۔ اسی کے لیے وہ پٹے، اسی کے لیے وہ بھوکے مرے، اسی کے لیے دُنیا بھر کی جفا کاریوں کا تختۂ مشق بنے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن میں وہ صحیح اسلامی ذہنیت پیدا ہوتی چلی گئی جس کی ضرورت تھی۔ ان کے اندر مضبوط اور قابلِ اعتماد اسلامی کردار پیدا ہُوا۔ اُن کی خدا پرستی میں خلوص آتا اور بڑھتا چلا گیا۔ مصائب کی اِس زبردست تربیت گاہ میں کیفیتِ اسلامی کا طاری ہونا ایک فطری امر تھا۔ جب کوئی شخص کسی مقصد کے لیے اُٹھتا ہے اور اُس کی خاطر کشمکش، جدوجہد، مصیبت، تکلیف، پریشانی، مار، قید، فاقہ، جلاوطنی وغیرہ کے مرحلوں سے گزرتا ہے تو اِس ذاتی تجربے کی بدولت

اُس مقصد کی تمام کیفیات اس کے قلب و روح پر چھا جاتی ہیں اور اُن کی پوری شخصیت اُسی مقصد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اِس چیز کی تکمیل میں مدد دینے کے لیے سب سے پہلے نماز ان پر فرض کی گئی تاکہ فکر کی پراگندگی کا ہر امکان دُور ہو جائے۔ اپنے نصب العین پر اُن کی نگاہ جمی رہے جس کو وہ حاکم مان رہے ہیں اُس کی حاکمیت کا بار بار اقرار کر کے اپنے عقیدے میں وہ مضبوط ہو جائیں جس کے حکم کے مطابق انہیں اب دنیا میں کام کرنا ہے اُس کا عالم الغیب والشہادۃ ہونا، اُس کا مالک یوم الدین ہونا، اُس کا قاہر فوق عبادہ ہونا پوری طرح اُن کے ذہن نشین ہو جائے۔ اور کسی حال میں اس کی اطاعت کے سوا دوسرے کسی کی اطاعت کا خیال تک اُن کے دلوں میں نہ آئے۔

اسلامی دعوت کے پھیلنے کے وجوہ

ایک طرف آنے والوں کی تربیت اِس طرح ہو رہی تھی، اور دوسری طرف اِسی کشمکش کی وجہ سے اسلامی تحریک پھیل بھی رہی تھی۔ جب لوگ دیکھتے تھے کہ چند لوگ پیٹے جا رہے ہیں، قید کیے جا رہے ہیں، گھروں سے نکالے جا رہے ہیں تو خواہ مخواہ اُن کے اندر یہ معلوم کرنے کی جستجو پیدا ہوتی تھی کہ آخر یہ سارا ہنگامہ ہے کس لیے؟ اور جب اُنہیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ زن، زر، زمین، کسی چیز کے لیے بھی نہیں ہے، کوئی اِن کی ذاتی غرض نہیں ہے، یہ اللہ کے بندے صرف اِس لیے پٹ رہے ہیں کہ ایک چیز کی صداقت اِن پر منکشف ہوئی ہے تو اُن کے دلوں میں آپ سے آپ یہ معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا تھا کہ آخر وہ ایسی کیا چیز ہے جس کے لیے یہ لوگ ایسے ایسے مصائب برداشت کر رہے ہیں؟ پھر جب انہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز ہے لا الٰہ الا اللہ اور اِس سے انسانی زندگی میں اِس نوعیت کا انقلاب رونما ہوتا ہے، اور اِس دعوت کو یہ کرنے والے لوگ اُٹھے ہیں جو محض صداقت و حقیقت کی خاطر دنیا کے سارے فائدوں کو ٹھکرا رہے ہیں اور جان، مال، اولاد ہر چیز کو قربان کر رہے ہیں، تو اُن کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اُن کے دلوں پر جتنے پردے پڑے ہوئے تھے وہ چاک ہونے لگتے تھے۔ اِس پس منظر میں یہ سچائی تیر کی طرح نشانے پر جا کر بیٹھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بجز اُن لوگوں کے جن کو ذاتی وجاہت کے تکبر، یا آباء پرستی کی جہالت، یا اغراض دنیوی کی محبت نے اندھا بنا رکھا تھا، اور سب لوگ اِس تحریک کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ کوئی جلدی کھنچا اور کوئی زیادہ دیر تک اِس کشش کی مزاحمت کرتا رہا۔ مگر دیر یا سویر ہر صداقت پسند بے لوث آدمی کو اِس کی طرف کھنچنا ہی پڑا۔

حضورؐ کی سیرت کا غیر معمولی اثر

اِس دوران میں تحریک کے رہنما صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شخصی زندگی سے اپنی تحریک کے اُصولوں کا اور ہر اُس چیز کا جس کے لیے یہ تحریک اُٹھی تھی، پُورا پُورا مظاہرہ کیا۔ اُن کی ہر بات، ہر فعل اور ہر حرکت سے

اسلام کی حقیقی رُوح جھلکتی تھی اور آدمی کی سمجھ میں آتا تھا کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔

اُن کی بیوی حضرت خدیجہؓ حجاز کی سب سے زیادہ مالدار خاتون تھیں اور وہ ان کے مال سے تجارت کرتے تھے۔ جب اسلام کی دعوت شروع ہوئی تو اُن کا سارا تجارتی کاروبار بیٹھ گیا کیونکہ ہمہ تن اپنی دعوت میں مصروف ہو جانے اور تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لینے کے بعد یہ کام نہ چل سکتا تھا۔ جو کچھ پچھلا اندوختہ تھا اس کو میاں اور بیوی دونوں نے اِس تحریک کے پھیلانے میں چند سال کے اندر لُٹا دیا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب ۱۰ بعدِ نبوت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تبلیغ کے سلسلہ میں طائف تشریف لے گئے تو وہ شخص جو کبھی حجاز کا مَلِکُ التجار تھا اس کو سواری کے لیے ایک گدھا تک میسّر نہ ہُوا۔

قریش کے لوگوں نے آنحضرتؐ کے سامنے حجاز کی حکومت کا تخت پیش کیا۔ کہا کہ ہم آپ کو اپنا بادشاہ بنا لیں گے۔ عرب کی حسین ترین عورت آپ کے نکاح میں دے دیں گے۔ دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں میں لگا دیں گے۔ بشرطیکہ آپ اِس تحریک سے باز آجائیں۔ مگر وہ شخص جو انسان کی فلاح کے لیے اُٹھا تھا، اس نے اِن سب پیش کشوں کو ٹھکرا دیا اور گالیاں اور پتھر کھانے پر راضی ہو گیا۔

قریش کے اور عرب کے سرداروں نے کہا کہ محمدؐ، ہم تمہارے پاس کیسے آکر بیٹھیں اور تمہاری باتیں کیسے سُنیں جب کہ تمہاری مجلس میں ہر وقت غلام، مُفلس، معاذ اللہ کمین لوگ بیٹھتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو سب سے نیچے طبقے کے لوگ ہیں ان کو تم نے اپنے گرد پیش جمع کر رکھا ہے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تم سے ملیں۔ مگر وہ شخص جو انسانوں کی اُونچ نیچ برابر کرنے آیا تھا، اس نے رئیسوں کی خاطر غریبوں کو دھتکارنے سے انکار کر دیا۔

اپنی تحریک کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک، اپنی قوم، اپنے قبیلے، اپنے خاندان، کسی کے مفاد کی کبھی پروا نہیں کی۔ آپ کے لیے ایمان لانے والے غیر اپنے تھے، اور ایمان نہ لانے والے اپنے غیر تھے۔ اسی چیز نے دُنیا کو آپ کی حق پرستی کا قائل کیا۔ اسی چیز نے دُنیا کو یقین دلایا کہ آپؐ انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لیے اُٹھے ہیں۔ اور اسی چیز نے آپؐ کی دعوت کی طرف ہر ملک اور ہر قوم کے انسانوں کو کھینچا۔ اگر آپ اپنے خاندان کی فکر کرتے تو غیر ہاشمیوں کو اس فکر سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ اگر آپؐ اِس بات کے لیے بے چین ہوتے کہ قُریش کے اقتدار کو تو کسی طرح بچا لُوں، تو غیر قریشی عربوں کو کیا پڑی تھی کہ اِس کام میں شریک ہوتے؟ اگر آپؐ عرب کی برتری کے لیے اُٹھتے تو حبش کے بلالؓ، رُوم کے صُہیبؓ، اور ایران کے سلمانؓ کو کیا پڑی تھی کہ اِس کام میں آپؐ کا ساتھ دیتے؟ دراصل جس چیز نے سب کو کھینچا وہ خالص خدا پرستی تھی جو ہر ذاتی، خاندانی، قومی، وطنی غرض سے مکمل بے لوثی تھی۔ (۱۴۳)

حوالہ جات باب ۶

1. اضافہ از مؤلف
2. تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۹۲
3. " ، جلد چہارم، الزُّمر، حاشیہ ۶۴
4. اضافہ از مؤلف
5. تفہیم القرآن، جلد اوّل، الأنعام، حاشیہ ۲۹
6. اضافہ از مؤلف
7. تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّمر، حاشیہ ۲۷
8. " " " ، الشوریٰ، حاشیہ ۳۸
9. " ، جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۳۱
10. اضافہ از مؤلف
11. تفہیم القرآن، جلد سوم، القصص، حواشی ۸۰ تا ۸۵
12. اضافہ از مؤلف
13. تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۵
14. " " " ، الفرقان، حواشی ۴ تا ۱۷
15. اضافہ از مؤلف
16. تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۱۰
17. " ، جلد پنجم، التغابن، حواشی ۱۱ تا ۱۳
18. تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۰۸
19. " " " ، یوسف، حاشیہ ۶۹
20. اضافہ از مؤلف
21. تفہیم القرآن، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۶۳

(٢٢) تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحقاف، حاشیہ ١٢
(٢٣) ″ ″ ″ ، الزخرف، حواشی ٣٠ تا ٣٢
(٢٤) ″ ″ ″ ، المؤمن، حواشی ٧٥-٧٦
(٢٥) ″ ″ جلد دوم، النحل، حاشیہ ٤
(٢٦) ″ جلد چہارم، الاحقاف، حواشی ١٥-١٦
(٢٧) ″ ، جلد سوم، الشعراء، خلاصہ حاشیہ ٨١
(٢٨) ″ ، جلد چہارم، صٓ، حاشیہ ٨
(٢٩) اضافہ از مؤلف
(٣٠) تفہیم القرآن، جلد سوم، المؤمنون، حاشیہ ٢٧
(٣١) ″ ″ ″ ″ ″ ، حاشیہ ٣٦
(٣٢) ″ ، جلد پنجم، الطور، خلاصہ حاشیہ ٢٢
(٣٣) ″ ، جلد ششم، التکویر، حاشیہ ٢١
(٣٤) ″ ، جلد سوم، الشعراء، حواشی ١٣٠ تا ١٣٢
(٣٥) ″ ، جلد چہارم، الدخان، حاشیہ ١٢
(٣٦) ″ ، جلد دوم، النحل، حاشیہ ١٠٧
(٣٧) ″ ، جلد سوم، القصص، حاشیہ ٩٤
(٣٨) اضافہ از مؤلف
(٣٩) تفہیم القرآن، جلد سوم، الفرقان، حاشیہ ١٨
(٤٠) ″ ، جلد چہارم، سبا، حواشی ٦٦-٦٧
(٤١) ″ ، جلد سوم، المومنون، حاشیہ ٩٧
(٤٢) ″ ، جلد ششم، القلم، خلاصہ حواشی ٢ تا ٤
(٤٣) ″ ، جلد دوم، الاعراف، حاشیہ ١٤٣
(٤٤) ″ ، جلد سوم، الشعراء، حاشیہ ١٤٢
(٤٥) ″ ″ ″ ″ ″ ″ ١٤٣
(٤٦) ″ ″ ″ ″ ″ ″ ١٤٤

(۴۷) تفہیم القرآن ، جلد پنجم ، الطّور ، حاشیہ ۲۵
(۴۸) " ، جلد دوم ، بنی اسرائیل ، حاشیہ ۵۳
(۴۹) " ، جلد پنجم ، قٓ ، حاشیہ ۵
(۵۰) " ، جلد سوم ، الفرقان ، حاشیہ ۵۵
(۵۱) " ، جلد دوم ، بنی اسرائیل ، حاشیہ ۱۰۶
(۵۲) " ، جلد سوم ، العنکبوت ، حاشیہ ۹۱
(۵۳) " ، جلد ششم ، المدثر ، حاشیہ ۳۹
(۵۴) " ، جلد اوّل ، الانعام ، حواشی ۵ تا ۷
(۵۵) " " " " " " ۲۶ - ۲۷
(۵۶) " ، جلد دوم ، الرعد ، حاشیہ ۴۷
(۵۷) " ، جلد سوم ، العنکبوت ، حاشیہ ۹۸
(۵۸) " ، جلد دوم ، یونس ، حاشیہ ۲۱
(۵۹) " ، جلد سوم ، القصص ، حاشیہ ۱۰۹
(۶۰) اضافہ از مؤلف
(۶۱) تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، السجدہ ، حاشیہ ۱
(۶۲) " " " " حواشی ۲-۳-۴
(۶۳) " ، جلد دوم ، یونس ، حاشیہ ۳۵
(۶۴) " " " بنی اسرائیل ، حاشیہ ۱۰۵
(۶۵) " " " ہود ، حاشیہ ۱۳
(۶۶) " " " یونس ، حاشیہ ۴۶
(۶۷) " ، جلد پنجم ، الطّور ، حواشی ۲۶ - ۲۷
(۶۸) " ، جلد سوم ، الفرقان ، حواشی ۴۳ تا ۴۶
(۶۹) " ، جلد دوم ، النحل ، حواشی ۱۰۲ تا ۱۰۶
(۷۰) " ، جلد سوم ، الفرقان ، خلاصہ حاشیہ ۱۲
(۷۱) " ، جلد چہارم ، حٰم السجدہ ، حاشیہ ۵۴

(۷۲) تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، حٰمٓ السجدہ ، حاشیہ ۱

(۷۳) اضافہ از مؤلف

(۷۴) اضافہ از مؤلف

(۷۵) تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، الجاثیہ ، حاشیہ ۴۴

(۷۶) 〃 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۳۴

(۷۷) 〃 ، جلد دوم ، الرّعد ، حاشیہ ۱۲

(۷۸) 〃 ، جلد چہارم ، سبا ، حاشیہ ۱۰

(۷۹) 〃 ، جلد ششم ، النّازعات ، حاشیہ ۴

(۸۰) 〃 ، جلد چہارم ، یٰسٓ ، خلاصہ حواشی ۴۶ تا ۴۷

(۸۱) 〃 ، جلد دوم ، بنی اسرائیل ، حاشیہ ۵۶

(۸۲) 〃 ، جلد سوم ، الحج ، خلاصہ حواشی ۵-۶

(۸۳) 〃 ، جلد چہارم ، السجدہ ، حواشی ۲۰-۲۱

(۸۴) 〃 〃 〃 ، الصّٰفّٰت ، حواشی ۸-۹

(۸۵) 〃 〃 〃 ، المومن ، حاشیہ ۷۹

(۸۶) 〃 ، جلد ششم ، النّٰزعٰت ، حاشیہ ۱۴

(۸۷) 〃 ، جلد چہارم ، الصّٰفّٰت ، حواشی ۸ تا ۱۲

(۸۸) 〃 ، جلد ششم ، الغاشیہ ، حاشیہ ۷

(۸۹) 〃 〃 〃 ، القیٰمۃ ، حاشیہ ۲۵

(۹۰) 〃 〃 〃 ، الطارق ، حواشی ۲-۴

(۹۱) 〃 ، جلد پنجم ، قٓ ، حاشیہ ۴

(۹۲) 〃 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۱۸

(۹۳) اضافہ از مؤلف

(۹۴) تفہیم القرآن ، جلد ششم ، القیٰمۃ ، حاشیہ ۲۴

(۹۵) 〃 〃 〃 〃 〃 ، حاشیہ ۲

(۹۶) 〃 ، جلد چہارم ، صٓ ، حواشی ۲۹ - ۳۰

(۹۷) تفہیم القرآن، جلد پنجم، التغابن، حواشی ۱۵ تا ۱۷

(۹۸) 〃 ، جلد چہارم، الدخان، حواشی ۳۱، ۳۲

(۹۹) 〃 ، 〃 ، الجاثیہ، حواشی ۲۷ - ۲۸

(۱۰۰) 〃 ، 〃 ، 〃 ، حاشیہ ۳۴

(۱۰۱) 〃 ، جلد ششم، القلم، حواشی ۱۹ تا ۲۳

(۱۰۲) 〃 ، 〃 ، التکویر، حاشیہ ۹

(۱۰۳) اضافہ از مؤلف

(۱۰۴) تفہیم القرآن، جلد ششم، القیامۃ، حواشی ۳ تا ۵

(۱۰۵) تفہیم القرآن، 〃 ، 〃 ، حاشیہ ۱۵

(۱۰۶) 〃 ، 〃 ، الدہر، حاشیہ ۲۱

(۱۰۷) 〃 ، 〃 ، التکاثر، حواشی ۱ تا ۳

(۱۰۸) 〃 ، 〃 ، المطففین، حاشیہ ۱

(۱۰۹) 〃 ، 〃 ، الفجر، حواشی ۱ تا ۴

(۱۱۰) 〃 ، 〃 ، الماعون، حاشیہ ۷

(۱۱۱) 〃 ، 〃 ، الملک، حاشیہ ۴

(۱۱۲) 〃 ، 〃 ، الدہر، حواشی ۳ تا ۵

(۱۱۳) 〃 ، جلد چہارم، الزمر، حاشیہ ۴۵

(۱۱۴) 〃 ، 〃 ، المومن، حاشیہ ۲۸

(۱۱۵) اضافہ از مؤلف

(۱۱۶) تفہیم القرآن، جلد پنجم، قٓ، حاشیہ ۲۱

(۱۱۷) 〃 ، جلد ششم، الانفطار، حاشیہ ۷

(۱۱۸) 〃 ، 〃 ، الزلزال، حواشی ۲ تا ۴

(۱۱۹) 〃 ، جلد سوم، الکہف، حاشیہ ۴۶

(۱۲۰) 〃 ، جلد پنجم، القمر، حاشیہ ۲۸

(۱۲۱) 〃 ، 〃 ، المجادلہ، حاشیہ ۱۷

(۱۲۲) تفہیم القرآن ، جلد چہارم ، یٰسٓ ، حاشیہ ۵۵

(۱۲۳) ″ ″ ″ ، حاشیہ ۵۵

(۱۲۴) ″ ″ ″ ، حٰمٓ السجدہ ، حاشیہ ۲۵

(۱۲۵) ″ ″ ″ ، یٰسٓ ، حاشیہ ۹

(۱۲۶) ″ ″ ″ ، الجاثیہ ، حاشیہ ۳۲

(۱۲۷) ″ ″ جلد ششم ، المرسلات ، حاشیہ ۶

(۱۲۸) ″ ″ جلد چہارم ، الزمر ، حاشیہ ۸۰

(۱۲۹) ″ ″ جلد ششم ، العادیات ، حاشیہ ۸

(۱۳۰) ″ ″ ″ ، الطارق ، حواشی ۵ تا ۷

(۱۳۱) ″ ″ ″ ، النجم ، حواشی ۹ تا ۱۰

(۱۳۲) ″ ″ ″ ، النازعات ، حاشیہ ۲۰

(۱۳۳) ″ ″ ″ ، الفجر ، حاشیہ ۱۷

(۱۳۴) ″ ″ ″ ، الانفطار ، حاشیہ ۳

(۱۳۵) ″ ″ ″ ، الزلزال ، حواشی ۵ تا ۷

(۱۳۶) ″ ″ جلد چہارم ، الفاطر ، حواشی ۳۹ - ۴۰

(۱۳۷) ″ ″ جلد ششم ، عبس ، حاشیہ ۲۲

(۱۳۸) ″ ″ ″ ، المعارج ، حاشیہ ۱۱

(۱۳۹) ″ ″ جلد چہارم ، المؤمن ، حواشی ۳۱ - ۳۲

(۱۴۰) ″ ″ جلد ششم ، النبا ، حواشی ۲۳ - ۲۴

(۱۴۱) اضافہ از مؤلف

(۱۴۲) اضافہ از مؤلف

(۱۴۳) تفہیم القرآن ، جلد ششم ، الشمس ، خلاصہ حواشی ۴ - ۵ - ۶

(۱۴۴) اضافہ از مؤلف

(۱۴۵) تفہیم القرآن ، جلد ششم ، البلد ، خلاصہ حواشی ۹ - ۱۰

(۱۴۶) ″ ″ ، التین ، خلاصہ حواشی ۲ - ۴

(۱۴۷) اضافہ از مؤلف

(۱۴۸) اضافہ از مؤلف

(۱۴۹) تفہیم القرآن، جلد پنجم، الحجرات، حاشیہ ۲۰

(۱۵۰) " " جلد سوم، الروم، حاشیہ ۱۸

(۱۵۱) " " " " الحج، حاشیہ ۱۳۲

(۱۵۲) " " " "، القصص، حاشیہ ۷۳

(۱۵۳) اضافہ از مؤلف

(۱۵۴) تفہیم القرآن، جلد ششم، اللہب، دیباچہ

(۱۵۵) " " جلد پنجم، الحجرات، حاشیہ ۱۸

(۱۵۶) " " جلد ششم، البلد، حاشیہ ۱۴

(۱۵۷) " " جلد پنجم، الحجرات، حاشیہ ۲۶

(۱۵۸) اضافہ از مؤلف

(۱۵۹) تفہیم القرآن، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ ۱۳۶

(۱۶۰) " " جلد اول، البقرہ، حاشیہ ۱۴۴

(۱۶۱) " " " " آل عمران، حاشیہ ۸۸

(۱۶۲) " " جلد دوم، التوبہ، خلاصہ حاشیہ ۸

(۱۶۳) " " جلد سوم، العنکبوت، حواشی ۹۴ تا ۹۹

(۱۶۴) " " جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۱۸

(۱۶۵) " " جلد پنجم، المجادلہ، حاشیہ ۳۷

(۱۶۶) " " جلد سوم، العنکبوت، حاشیہ ۱۱

(۱۶۷) " " " " " حاشیہ ۱۷-۱۸

(۱۶۸) " " جلد دوم، التوبہ، حاشیہ ۱۱۱

(۱۶۹) " " جلد پنجم، الممتحنہ، خلاصہ حاشیہ ۱۳

(۱۷۰) ماخوذ از "اسلامی ریاست"، صفحہ ۱۵۹ تا ۱۷۶

(۱۷۱) اضافہ از مؤلف

(۱۴۲) اضافہ از مؤلف

(۱۴۳) ماخوذ از رسالہ "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟"

باب (۷)

دعوتِ عام کی اِبتدا

پچھلے دو ابواب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین سال کی خفیہ دعوت کے بعد جب علی الاعلان اسلام کی تبلیغ شروع کی تو اس پر قریش اور عام اہلِ عرب کے اس قدر بھڑک جانے کی وجہ کیا تھی اور کیوں وہ آپؐ کے مقابلے میں شدید مخالفت و مزاحمت اور عداوت و شقاوت پر تُل گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اس بحث سے بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ اسلام کی یہ دعوت دلائل اور اخلاق کے کیسے زبردست ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اُٹھی تھی کہ اس کے سامنے پرانی جاہلیت اپنی ساری تدبیروں، چال بازیوں، اور ظلم و ستم کے باوجود بے بس ہو کر رہ گئی۔ اب ہم تاریخی بیان کا سلسلہ پھر اُسی مقام سے جوڑتے ہیں جہاں ہم نے اسے چوتھے باب میں چھوڑا تھا۔

اِسلام کا اوّلین اظہار

اگرچہ مؤرخین اور اہلِ سِیَر نے کہیں اس بات کی صراحت نہیں کی ہے، لیکن قرآن مجید میں سُورۂ عَلَق کی ابتدائی پانچ آیتوں کے بعد جس طرح یکایک آیت ۶ سے ۱۹ تک یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شخص نے اللہ کے ایک بندے کو نماز پڑھنے سے منع کیا اور دھمکیاں دے کر اُسے روکنا چاہا، اور احادیث کی معتبر کتابوں میں اس واقعہ کی جو تشریح کی گئی ہے کہ وہ نماز پڑھنے والے خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور آپؐ کو روکنے والا ابوجہل تھا، اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ نے اپنے دین کا اِظہار سب سے پہلے حَرَم میں اسلامی طریقے پر نماز پڑھ کر کیا۔ اُس وقت تک مُسلمان چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور کوئی حرم کعبہ تو درکنار کسی کھلی جگہ بھی علانیہ نماز پڑھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ صرف ایک دفعہ مکہ کی گھاٹیوں میں سے ایک سنسان گھاٹی میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے مشرکین نے مسلمانوں کو دیکھ لیا تھا تو اس پر مارکٹائی کی نوبت آگئی تھی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ ہُوا کہ اِسلام کا کھُلم کھُلا اظہار کیا جائے، تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خوف اور جھجک کے بغیر حَرَم میں جا کر نماز پڑھنی شروع کر دی جس

ہمت آپ کے سوا اور کوئی نہ کر سکتا تھا۔ (۱)

اسی چیز سے قریش کے عام لوگوں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ آپ کا دین ان کے دین سے بدل گیا ہے۔ دوسرے دیکھنے والے تو اس پر حیران ہی تھے، مگر ابوجہل کی رگ جاہلیت اس پر پھڑک اٹھی اور اس نے آپ کو دھمکیاں دے کر اس سے روکنے کی کئی مرتبہ کوشش کی۔ حضرت ابوہریرہؓ کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے پوچھا "کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے سامنے زمین پر اپنا منہ ٹکاتے ہیں؟" لوگوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا "لات اور عزیٰ کی قسم، اگر میں نے ان کو اس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تو ان کی گردن پر پاؤں رکھ دوں گا اور ان کا منہ زمین میں رگڑ دوں گا۔" پھر ایسا ہوا کہ حضورؐ کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ آگے بڑھا تا کہ آپؐ کی گردن پر پاؤں رکھے، مگر یکایک لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیچھے ہٹ رہا ہے اور اپنا منہ کسی چیز سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ یہ تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے کہا میرے اور ان کے درمیان آگ کی ایک خندق اور ایک ہولناک چیز تھی اور کچھ پر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو ملائکہ اس کے چیتھڑے اڑا دیتے (احمد، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن مردویہ، ابونعیم اصفہانی، بیہقی)۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابوجہل نے کہا اگر میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کعبہ کے پاس نماز پڑھتے دیکھ لیا تو ان کی گردن پاؤں تلے دبا دوں گا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر پہنچی تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو ملائکہ علانیہ اسے آ پکڑیں گے (بخاری، ترمذی، نسائی، ابن جریر، عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن مردویہ)۔

ابن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل کا ادھر سے گزر ہوا تو اس نے کہا "اے محمدؐ، کیا میں نے تم کو اس سے منع نہیں کیا تھا؟" اور اس نے آپ کو دھمکیاں دینی شروع کیں۔ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سختی کے ساتھ جھڑک دیا۔ اس پر اس نے کہا "اے محمدؐ، تم کس بل پر مجھے ڈراتے ہو۔ خدا کی قسم، اس وادی میں میرے حمایتی سب سے زیادہ ہیں۔" (احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن ابی شیبہ، ابن المنذر، طبرانی، ابن مردویہ) (۲)

اس کے بعد قریش کے دوسرے لوگ بھی ہجوم کر کر کے آپؐ کو حرم میں نماز پڑھنے سے روکنے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ آپؐ کو اس سے باز رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا "اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے" (الجن-۱۹)۔ یہاں بھی مفسرین نے "اللہ کے بندے" سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی مراد لی ہے۔ اور یہ آیت بتاتی ہے کہ حضورؐ نے علانیہ نماز پڑھنے کا سلسلہ

نہ چھوڑا اگرچہ ابو جہل کے علاوہ قریش کے دوسرے لوگ بھی آپ پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہوتے رہتے۔

اپنے قریب ترین خاندان والوں کو دعوت

دوسرا قدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اٹھایا کہ اپنے قریب ترین خاندان والوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (الشعراء - ۲۱۴) کے مطابق اپنے ہاں مدعو کیا جن میں بنی عبدالمطلب اور بنی ہاشم کے علاوہ کچھ بنی المطلب اور بنی عبد مناف بھی تھے۔ بلاذری اور ابن اثیر کا بیان ہے کہ اس دعوت میں جملہ ۴۵ آدمی شریک ہوئے تھے۔ مگر قبل اس کے کہ حضورؐ اپنی بات کہتے، ابولہب بول اٹھا کہ "یہ تمہارے چچا اور چچا زاد بھائی موجود ہیں۔ جو کچھ چاہو کہو، مگر دین سے پھرنے کی بات نہ کرو۔ تم کو جان لینا چاہیے کہ تمہاری قوم تمام عرب سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اور تمہارا ہاتھ پکڑنے اور تمہیں روکنے کے سب سے زیادہ حق دار تمہارے اپنے خاندان کے لوگ ہیں۔ اگر تم اس کام پر قائم رہے جو تم کر رہے ہو تو تمہیں روکنا اُن کے لیے اس سے زیادہ ہلکی بات ہے کہ تم پر قریش کے دوسرے خاندان ٹوٹ پڑیں اور عرب اُن کی مدد کریں۔ مَیں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جو اپنے خاندان والوں پر اس سے زیادہ سخت آفت لایا ہو جو تم لے آئے ہو" اس طرح ابولہب نے پہلی مجلس کو خراب کر دیا۔ دوسرے روز حضورؐ نے پھر خاندان والوں کو بلایا اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ جناب ابوطالب نے کہا کہ "ہمیں ہرگز عبدالمطلب کو تمہیں چھوڑنا نہ چاہتا تھا، مگر جس کام کا تم کو حکم دیا گیا ہے اسے تم کرو اور مَیں تمہاری حمایت و حفاظت کروں گا۔" ابولہب بولا "خدا کی قسم یہ بہت بُری بات ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑو قبل اس کے کہ دوسرے اس کو پکڑیں۔" ابوطالب نے کہا کہ "خدا کی قسم ہم اس کی حفاظت کریں گے جب تک ہماری جان میں جان ہے۔" یہ روایت بلاذری اور ابن اثیر نے جعفر بن عبداللہ بن ابی الحکم کے حوالہ سے نقل کی ہے جو ایک ثقہ راوی ہیں (انساب الاشراف للبلاذری، جلد اوّل، ص ۱۱۸ - ۱۱۹ - تاریخ الکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۴۰ - ۴۱)۔ (۳)

معتبر روایات میں آیا ہے کہ اس موقع پر حضورؐ نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں نام لے لے کر فرمایا یا بنی عبد المطلب، یا عباس، یا صفیۃ عمۃ رسول اللہ، یا فاطمۃ بنت محمدؐ، انقذوا انفسکم من النار فانی لا املک لکم من اللہ شیئاً، سلونی من مالی ماشئتم "اے اولادِ عبدالمطلب، اے عباس، اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی، اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی، تم لوگ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ کیونکہ مَیں اللہ کی پکڑ سے تم کو بچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا، البتہ میرے مال میں سے تم جو چاہو مجھ سے مانگ سکتے ہو۔" یہ صرف رشتہ داروں کو دعوتِ حق ہی نہیں تھی، بلکہ اس میں اس بات کا اظہار بھی تھا کہ خدا کا دین بے لاگ ہے، اس میں نبی تک کی ذات اور اس کے قریب ترین عزیزوں کے لیے بھی رعایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں جس کے ساتھ بھی کوئی معاملہ ہے اس کے اوصاف (Merits) کے لحاظ سے ہے کسی کا نسب اور کسی کے ساتھ

آدمی کا تعلق کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ گمراہی و بد عملی پر خدا کے عذاب کا خوف سب کے لیے یکساں ہے ایسا نہیں ہے کہ اور سب تو ان چیزوں پر پکڑے جائیں مگر نبی کے رشتہ دار بچے رہ جائیں۔ اِسی اصول کو واضح کرنا چونکہ مقصود تھا اِس لیے حضورؐ نے اِس خطاب میں خود اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا نام بھی لیا، حالانکہ ان کی عمر اُس وقت دو ڈھائی سال سے زیادہ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ سرے سے مکلّف ہی نہ تھیں کہ ان کے بارے میں کسی عذاب یا ثواب کا سوال پیدا ہوتا، لیکن مقصودِ کلام اِس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ دین میں نبی اور اس کے خاندان کے لیے کوئی امتیازی مراعات نہیں ہیں جن سے دوسرے محروم ہوں۔ جو چیز زہرِ قاتل ہے وہ سب ہی کے لیے قاتل ہے، نبی کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے اُس سے خود بچے اور اپنے قریبی لوگوں کو اس سے ڈرائے، پھر ہر خاص و عام کو متنبّہ کر دے کہ جو بھی اسے کھائے گا ہلاک ہو جائے گا۔ اور جو چیز نافع ہے وہ سب ہی کے لیے نافع ہے، نبی کا منصب یہ ہے کہ سب سے پہلے اسے خود اختیار کرے اور اپنے عزیزوں کو اس کی تلقین کرے تاکہ ہر شخص دیکھ لے کہ یہ وعظ و نصیحت دوسروں ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ نبیؐ اپنی دعوت میں مخلص ہے، خود اُس پر عمل کرتا ہے اور اپنے عزیزوں کو اس پر عمل کی تلقین کرتا ہے۔ (۴)

قریش کے تمام خاندانوں کو دعوت

اس کے بعد تیسرا قدم آپؐ نے یہ اُٹھایا کہ ایک روز صبح سویرے صَفا کے سب سے اُونچے مقام پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے پکارا یا صباحاہ (ہائے صبح کا خطرہ)، اَے قریش کے لوگو، اَے بنی کعب بن لُؤَی اَے بنی مُرّہ، اَے آلِ قُصَیّ، اَے بنی عبدِ مناف، اَے بنی عبدِ شمس، اَے بنی ہاشم، اَے آلِ عبدالمطلب۔ اسی طرح قریش کے ایک ایک قبیلے اور خاندان کا نام لے لے کر آپؐ نے آواز دی۔ عرب میں قاعدہ تھا کہ جب صبح تڑکے کسی اچانک حملے کا خطرہ ہوتا تو جس شخص کو بھی اُس کا پتہ چل جاتا وہ اِسی طرح پکارنا شروع کر دیتا اور لوگ اس کی آواز سُنتے ہی ہر طرف سے دوڑ پڑتے۔ چنانچہ حضورؐ کی اِس آواز پر سب لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو خود نہ آسکا اُس نے اپنی طرف سے کسی کو خبر لانے کے لیے بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا: "لوگو، اگر میں تمہیں بتاؤں کہ اِس پہاڑ کے دوسری طرف ایک بھاری لشکر ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے؟" سب نے کہا: "ہاں، ہمارے تجربے میں تم کبھی جھوٹ بولنے والے نہیں رہے ہو۔" آپؐ نے فرمایا: "اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے پہلے تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اُس کی پکڑ سے بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے کر آئیں اور تم لوگ دُنیا کا وبال سر پر اُٹھائے ہوئے آؤ۔ اُس وقت تم پکارو گے یا محمدؐ، مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے مُنہ

پھیر لوں۔ البتہ دنیا میں میرا اور تمہارا خون کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلۂ رحمی کروں گا۔"
(اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی، اور تفسیر ابن جریر میں حضرت عائشہؓ، حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت زبیر بن عمروؓ اور حضرت قبیصہ بن مخارقؓ سے مروی ہیں)۔ (۵)

ابن عباسؓ سے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایت محدثین نے نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوتِ عام پیش کرنے کا حکم دیا گیا اور قرآن مجید میں یہ ہدایت نازل ہوئی کہ آپؐ اپنے قریب ترین عزیزوں کو سب سے پہلے خدا کے عذاب سے ڈرائیں تو آپ نے صبح سویرے کوہِ صفا پر چڑھ کر بلند آواز سے پکارا: یا صباحاہ (ہائے صبح کی آفت)۔ عرب میں یہ صدا وہ شخص لگاتا تھا جو صبح کے جھٹ پٹے میں کسی دشمن کو اپنے قبیلے پر حملہ کرنے کے لیے آتے دیکھ لیتا تھا۔ حضورؐ کی یہ آواز سن کر لوگوں نے دریافت کیا کہ یہ کون پکار رہا ہے۔ بتایا گیا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز ہے۔ اِس پر قریش کے تمام خاندانوں کے لوگ آپؐ کی طرف دوڑ پڑے۔ جو خود آسکتا تھا وہ خود آیا، اور جو نہ آسکتا تھا اُس نے اپنی طرف سے کسی کو بھیج دیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے قریش کے ایک ایک خاندان کا نام لے لے کر پکارا، "اے بنی ہاشم، اے بنی عبدالمطلب، اے بنی فہر، اے بنی فلاں، اے بنی فلاں، اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ پہاڑ کے پیچھے ایک لشکر تم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہے تو تم میری بات کو سچ مانو گے؟" لوگوں نے کہا "ہاں، ہمیں کبھی تم سے جھوٹ سننے کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔" آپؐ نے فرمایا "تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ آگے سخت عذاب آ رہا ہے۔" اِس پر قبل اِس کے کہ کوئی اور بولتا، حضورؐ کے اپنے چچا ابولہب نے کہا تَبًّا لَكَ أَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا "ستیاناس جائے تیرا، کیا اِس لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟" ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اُس نے پتھر اُٹھایا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھینچ مارے (مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، ابن جریر وغیرہ)۔ (۶)

ابن سعد نے ابن عباسؓ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ کوہِ صفا پر حضورؐ نے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ "اللہ نے مجھے اپنے قریب ترین عزیزوں کو خبردار کر دینے کا حکم دیا ہے، اور تم قریش کے لوگ میرے اقارب ہو۔ میں تم کو اللہ سے کچھ دلوانے اور آخرت میں تمہیں کسی حصہ سے بہرہ ور کر دینے کا اختیار نہیں رکھتا الّا یہ کہ تم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے قائل ہو جاؤ۔ تب میں تمہارے رب کے ہاں تمہارے حق میں اس کی شہادت دوں گا، اور اِس کلمہ کی بدولت عرب تمہارے تابع اور عجم تمہارے مطیع ہو جائیں گے۔" اس پر ابولہب بول اٹھا "ناس جائے تیرا، کیا اِس لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا؟"

ابولہب کا کردار

اِس طرح ابولہب نے اوّل روز ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمر باندھ لی اور مرتے دم

ؔ اِس شخص کا اصل نام عبدالعُزّٰی بن عبدالمطلب تھا، اور اس کی کنیت ابوعتبہ تھی لیکن اس کے چمکتے ہوئے سرخ و سفید

بلکہ وہ آپؐ کے ساتھ، اور آپؐ کی وجہ سے خود اپنے خاندان کے ساتھ ایسی شدید دشمنی کرتا رہا جو کوئی بدتر سے بدتر دشمن کر سکتا تھا۔ اگرچہ بنی ہاشم میں سے ایک اور شخص ابوسُفیان بن الحارث بن عبدالمُطّلب بھی حضورؐ کا مخالف ہو گیا تھا، مگر اوّل تو اس کی مخالفت اِس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ ۲۰ سال تک آپؐ کی اور آپؐ کے اصحاب کی ہجو میں اشعار کہتا رہا، اور ہجرت کے بعد لڑائیوں میں آپؐ کے خلاف شریک ہوتا رہا۔ دوسرے، اس میں اور ابولہب میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ آخر کار اُس کا دل اسلام کا قائل ہو گیا، چنانچہ قبل اس کے کہ مکہ فتح ہوتا وہ خود اپنے بال بچوں کو لے کر اَبْوَاء کے مقام پر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کر لی (رضی اللہ عنہ)۔ لیکن ابولہب کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے نہ صرف انسانیت کی بلکہ عرب کی معروف و مسلّم اخلاقی روایات کی بھی ساری حدیں توڑ ڈالیں اور حضورؐ کی دشمنی میں آدمیت و شرافت سے گزر کر کمینہ پن پر اتر آیا، درانحالیکہ آپ کا اور اس کا خون کا رشتہ تھا اور اس رشتہ داری کی وجہ سے اس کی مخالفت، دوسروں کی مخالفت کی بہ نسبت دین کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن رہی تھی۔ (۶)

یہی وجہ ہے کہ اُس وقت کے تمام اَعدائے اسلام میں سے صرف ابولہب ہی ایک شخص ہے جس کا نام لے کر قرآن مجید میں اُس کی مذمّت کی گئی ہے حالانکہ مکہ میں بھی اور ہجرت کے بعد مدینے میں بھی بہت سے ایسے لوگ تھے جو اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں اُس سے کسی طرح کم نہ تھے۔ سوال یہ ہے

۵۔ رنگ کی وجہ سے یہ ابولہب (شعلہ رُو) مشہور ہو گیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ خود عبدالمُطّلب اسے ابولہب کہتے تھے اس لیے یہ نام ایسا مشہور ہُوا کہ اصل نام اِس کے نیچے دب گیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

۶۔ طبقات ابن سعد طبع بیروت، جلد ۴ صفحہ ۴۹۔ ۵۰۔ ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ صاحب حضورؐ کے چچا زاد بھائی بھی تھے اور حلیمہ سعدیہ کا دودھ پینے کی وجہ سے دودھ شریک بھائی بھی۔ جاہلیت کے زمانے میں آپؐ سے بڑی محبت کرتے تھے مگر بعثت کے بعد سخت مخالف ہو گئے تھے۔ بلاذری نے انساب الاشراف (جلد اوّل صفحہ ۲۲۰ طبع مصر) میں بھی قریب قریب یہی کچھ لکھا ہے۔ البتہ اس میں یہ اضافہ ہے کہ حضرت عباس کی سفارش پر حضورؐ نے ان کو معاف فرمایا۔ نیز اُس میں اَبْواء پر ان کی حاضری کو ایک کمزور قول کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے، اور ترجیح اِس قول کو دی گئی ہے کہ یہ عقبہ کی ذرا بعد لے کر نِیْقُ العُقَاب (مکہ اور مدینے کے درمیان جُحْفَہ کے قریب ایک مقام) پر حاضر ہوئے تھے۔ یاقوت نے بھی مُعْجَمُ البُلدان میں یہی روایت نقل کی ہے۔

(حاشیہ از مؤلف)

کہ اس شخص کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر قرآن میں اس کا نام لے کر اس پر اظہارِ غضب کیا گیا ہے؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت کے عربی معاشرے کو سمجھا جائے اور اس پس منظر میں ابولہب کے کردار کو دیکھا جائے۔

قرآن میں ابُولَہَب کا نام لے کر اس کی مذمّت کرنے کی وجہ

قدیم زمانے میں چونکہ پورے ملک عرب میں ہر طرف بدامنی، غارت گری اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اور صدیوں سے حالت یہ تھی کہ کسی شخص کے لیے اُس کے اپنے خاندان اور خونی رشتہ داروں کی حمایت کے سوا جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ تھی، اس لیے عربی معاشرے کی اخلاقی قدروں میں صلۂ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک) کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور قطع رحمی کو بہت بڑا پاپ سمجھا جاتا تھا۔ عرب کی اِنہی روایات کا یہ اثر تھا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تو قریش کے دوسرے خاندانوں اور اُن کے سرداروں نے تو حضورؐ کی شدید مخالفت کی مگر بنی ہاشم اور بنی المطّلب (ہاشم کے بھائی مَطّلب کی اولاد) نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کی مخالفت نہیں کی، بلکہ وہ کھلم کھلا آپ کی حمایت کرتے رہے، حالانکہ اُن میں سے اکثر لوگ آپؐ کی نبوت پر ایمان نہیں لائے تھے۔ قریش کے دوسرے خاندان خود بھی حضورؐ کے اِن خونی رشتہ داروں کی حمایت کو عرب کی اخلاقی روایات کے عین مطابق سمجھتے تھے، اِسی وجہ سے انہوں نے کبھی بنی ہاشم اور بنی المطّلب کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ تم ایک دوسرا دین پیش کرنے والے شخص کی حمایت کر کے اپنے دینِ آبائی سے منحرف ہو گئے ہو۔ وہ اِس بات کو جانتے اور مانتے تھے کہ اپنے خاندان کے ایک فرد کو وہ کسی حالت میں اُس کے دشمنوں کے حوالے نہیں کر سکتے، اور اُن کا اپنے عزیز کی پشتیبانی کرنا قریش اور اہلِ عرب، سب کے نزدیک بالکل ایک فطری امر تھا۔

اس اخلاقی اصول کو جسے زمانۂ جاہلیت میں بھی عرب کے لوگ واجب الاحترام سمجھتے تھے، صرف ایک شخص نے اسلام کی دشمنی میں توڑ ڈالا، اور وہ تھا ابولہب بن عبدالمطّلب۔ یہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا، حضورؐ کے والد ماجد اور یہ ایک ہی باپ کے بیٹے تھے، اگرچہ مائیں دونوں کی مختلف تھیں۔ عرب میں چچا کو باپ کی جگہ سمجھا جاتا تھا، خصوصاً جبکہ بھتیجے کا باپ وفات پا چکا ہو تو عربی معاشرے میں چچا سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بھتیجے کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھے گا۔ لیکن اس شخص نے اسلام کی دشمنی اور کفر کی محبت میں اِن تمام عربی روایات کو پامال کر دیا۔

حضورؐ کا بدترین ہمسایہ

مکہ میں ابولہب حضورؐ کا قریب ترین ہمسایہ تھا۔ دونوں کے گھر ایک دیوار بیچ واقع تھے۔ اُس کے علاوہ حکم بن عاص (مروان کا باپ)، عقبہ بن ابی مُعیط، عدی بن حمراء الثقفی اور ابن الاصداء الہُذلی بھی آپؐ کے ہمسائے تھے[1]۔ یہ لوگ گھر میں بھی حضورؐ کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ آپؐ کبھی نماز پڑھ رہے ہوتے تو یہ اُوپر سے بکری کا اوجھ آپؐ پر پھینک دیتے۔ کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ ہنڈیا پر غلاظت پھینک دیتے۔ حضورؐ باہر نکل کر ان لوگوں سے فرماتے "اے بنی عبد مناف یہ کیسی ہمسائگی ہے؟" ابولہب کی بیوی اُمّ جمیل (ابوسفیان کی بہن) نے تو یہ مستقل وتیرہ ہی اختیار کر رکھا تھا کہ راتوں کو آپؐ کے گھر کے دروازہ پر خاردار جھاڑیاں لا کر ڈال دیتی تاکہ صبح سویرے جب آپؐ یا آپؐ کے بچے باہر نکلیں تو کوئی کانٹا پاؤں میں چُبھ جائے (بیہقی، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ابن عساکر، بلاذری، ابن ہشام)۔

حضورؐ کی صاحبزادیوں کو ابولہب کا اپنے بیٹوں سے طلاق دلوانا

ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں ابولہب کے دو بیٹوں عُتبہ اور عُتَیبَہ سے بیاہی ہوئی تھیں[2]۔ نبوت کے بعد جب حضورؐ نے اسلام کی طرف دعوت دینی شروع کی تو اس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ اور عُتَیبہ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضورؐ کے سامنے آ کر اُس نے کہا کہ میں اَلنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی اور اَلَّذِیْ دَنَا فَتَدَلّٰی کا انکار کرتا ہوں، اور یہ کہہ کر اُس نے حضورؐ کی طرف تھوکا جو آپؐ پر نہیں پڑا۔ حضورؐ نے فرمایا خدایا، اس پر اپنے کتوں میں سے

---

[1] ابن سعد کا بیان ہے کہ ان میں سے بھی ابولہب اور عُقبہ زیادہ قریبی ہمسائے تھے۔ چنانچہ وہ حضرت عائشہؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا میں دو بدترین ہمسایوں کے درمیان تھا، ایک ابولہب، دوسرے عُقبہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کا مکان مکہ میں ان دونوں کے گھروں کے درمیان واقع تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

[2] طبرانی میں قتادہ کی روایت ہے کہ حضرت اُمّ کلثومؓ کا نکاح عُتَیبہ سے اور حضرت رُقیّہؓ کا عُتبہ سے ہوا تھا۔ ابن قُتَیبہ نے المعارف میں اور سُہیلی نے روض الاُنُف میں بھی یہی لکھا ہے مگر ابن اسحاق نے شک کے ساتھ بیان کیا ہے کہ عُتبہ کا نکاح حضرت رُقیّہؓ کے ساتھ ہوا تھا یا حضرت اُمّ کلثومؓ کے ساتھ۔ ابن قُتیبہ نے معارف میں اور زرقانی نے شرح مواہب میں اور طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ابھی رخصتی کی نوبت نہ آئی تھی کہ ابولہب نے دونوں صاحبزادیوں کو طلاق دلوا دی۔ اس کے بعد حضورؐ نے حضرت رُقیّہؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ (حاشیہ از مؤلف)

ایک کُتّے کو مُسلّط کر دے۔ اِس کے بعد عُتیبَہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دورانِ سفر میں ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابُولہب نے اپنے ساتھی اہلِ قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ اِنتظام کرو، کیونکہ مجھے محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددُعا کا خوف ہے۔ اس پر قافلے والوں نے عُتیبَہ کے گرد ہر طرف اپنے اُونٹ بٹھا دیے اور پڑ کر سو رہے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر اس نے عُتیبَہ کو پھاڑ کھایا (الاستیعاب لابن عبدالبّر، الاصابہ لابن حجر، اَنساب الاشراف للبلاذری، دلائل النبوۃ لابی نعیم الاصفہانی، روض الاُنُف للسّہیلی۔ روایات میں یہ اختلاف ہے کہ بعض راوی طلاق کے معاملے کو اعلانِ نبوّت کے بعد کا واقعہ بیان کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَہَبٍ کے نزول کے بعد پیش آیا تھا۔ اس امر میں بھی اختلاف کیا گیا ہے کہ یہ ابولہب کا لڑکا عُتبَہ تھا یا عُتیبَہ لیکن یہ بات ثابت ہے کہ فتح مکّہ کے بعد عُتبَہ نے اسلام قبول کر کے حضورؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ لڑکا عُتیبَہ تھا)۔

حضورؐ کے صاحبزادے کی وفات پر اظہارِ مسرّت کرنا

اُس کے خُبثِ نفس کا یہ حال تھا کہ جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت قاسمؓ کے بعد دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کا بھی انتقال ہو گیا تو یہ اپنے بھتیجے کے غم میں شریک ہونے کے بجائے خوشی خوشی دوڑا ہُوا قریش کے سرداروں کے پاس پہنچا اور اُن کو خبر دی کہ لو آج محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) بے نام و نشان ہو گئے۔[1]

دعوتِ اسلامی کے کام میں رکاوٹیں ڈالنا

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں جہاں بھی اسلام کی دعوت دینے کے لیے تشریف لے جاتے، یہ آپؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور لوگوں کو آپؐ کی بات سننے سے روکتا۔ ربیعہ بن عَبّاد (یا عِباد[2]) الدِّیلی بیان کرتے ہیں کہ میں نوعمر تھا جب اپنے باپ کے ساتھ ذوالمجاز کے بازار میں گیا۔ وہاں میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ کہہ رہے تھے "لوگو، کہو اللہ کے سوا کوئی معبُود نہیں ہے، فلاح پاؤ گے"۔ آپ کے پیچھے پیچھے ایک شخص کہتا جا رہا تھا کہ "یہ جھُوٹا ہے، دینِ آبائی سے پھر گیا ہے"۔ میں نے پوچھا یہ کون شخص ہے؟ لوگوں

---

[1] اس کے معنی یہ ہیں کہ کم بخت دل میں آپؐ کی بزرگی کا بھی قائل تھا اور ڈرتا تھا کہ آپ کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی بددُعا رائگاں نہیں جا سکتی۔ (حاشیہ از مرتّب)

[2] ابن اسحاق نے عِباد اور ابن ہشام نے عَبّاد لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلّف)

نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مسند احمد، طبرانی، بیہقی)۔ دوسری روایت انہی حضرت ربیعہ سے یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں "اے بنی فلاں، میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ تم میری تصدیق کرو اور میرا ساتھ دو تاکہ میں وہ کام پورا کروں جس کے لیے اللہ نے مجھے بھیجا ہے"۔ آپ کے پیچھے پیچھے ایک اور شخص آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ "اے بنی فلاں، یہ تم کو لات اور عزیٰ سے پھیر کر اس بدعت اور گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے جسے یہ لے کر آیا ہے۔ اس کی بات ہرگز نہ مانو اور اس کی پیروی نہ کرو"۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا یہ کون ہے۔ انہوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (مسند احمد، طبرانی، ابن ہشام، طبری)۔ طارق بن عبداللہ المحاربی کی روایت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے ذوالمجاز کے بازاروں میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بآواز بلند پکارتے جا رہے ہیں کہ "لوگو، لا الٰہ الا اللہ کہو، فلاح پاؤ گے"۔ اور پیچھے پیچھے ایک شخص چل رہا ہے جو آپ کو پتھر مارتا جاتا ہے، یہاں تک کہ آپ کی ایڑیاں خون سے تر ہو گئی ہیں، اور وہ کہتا جاتا ہے کہ "یہ جھوٹا ہے، اس کی بات نہ مانو"۔ میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ ان کا چچا ابولہب ہے (ابن ابی شیبہ، ابویعلیٰ، ابن حبان، حاکم، طبرانی۔ اس روایت کو نسائی اور ابن ماجہ نے بھی مختصراً نقل کیا ہے)۔

شعب ابی طالب کے محاصرے میں اس کا رویہ

نبوت کے ساتویں سال جب قریش کے تمام خاندانوں نے بنی ہاشم اور بنی المطلب کا معاشرتی اور معاشی مقاطعہ کیا اور یہ دونوں خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت پر ثابت قدم رہتے ہوئے شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے تو تنہا یہی ابولہب تھا جس نے اپنے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے کفار قریش کا ساتھ دیا۔ یہ مقاطعہ تین سال تک جاری رہا اور اس دوران میں بنی ہاشم اور بنی المطلب پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ مگر ابولہب کا حال یہ تھا کہ جب مکہ میں کوئی تجارتی قافلہ آتا اور شعب ابی طالب کے محصورین میں سے کچھ لوگ خوراک کا سامان خریدنے کے لیے اس کے پاس جاتے تو یہ تاجروں سے پکار کر کہتا کہ ان سے اتنی قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، تمہیں جو خسارہ بھی ہو گا اسے میں پورا کروں گا۔ چنانچہ وہ بے تحاشا قیمت طلب کرتے اور خریدار بیچارے اپنے بھوک سے تڑپتے ہوئے بال بچوں کے پاس خالی ہاتھ پلٹ جاتا۔ پھر ابولہب انہی تاجروں سے وہی چیزیں بازار کے بھاؤ خرید لیتا (ابن سعد و ابن ہشام)۔

اس کی مخالفت دعوت اسلامی کے کام میں کیا رکاوٹ ڈال رہی تھی

مکہ سے باہر کے اہل عرب حج کے لیے آتے، یا مختلف مقامات پر لگنے والے بازاروں میں جمع ہوتے

اُن کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا چچا آپ کے پیچھے لگ کر آپ کی مخالفت کرتا، تو وہ عرب کی معروف روایات کے لحاظ سے یہ بات خلافِ توقع سمجھتے تھے کہ کوئی چچا بلاوجہ دوسروں کے سامنے خود اپنے بھتیجے کو بُرا بھلا کہے اور اسے پتھر مارے اور اس پر الزام تراشیاں کرے۔ اس وجہ سے وہ ابولہب کی بات سے متاثر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شک میں پڑ جاتے اور کہتے کہ آپ کے رشتہ دار آپ کو زیادہ جانتے ہیں۔ (۸)

اس کی بیوی کا رویّہ

ابولہب کی بیوی جسے سورۂ لہب میں حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (لکڑیاں ڈھونے والی، یا لگائی بجھائی کرنے والی) کہا گیا ہے بنی اُمیّہ میں سے ابوسفیان کی بہن تھی۔ اصل نام اِس عورت کا اَرْویٰ تھا اور اُمِّ جمیل اِس کی کُنیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت میں یہ اپنے شوہر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ جب سورۃ اللہب نازل ہوئی اور اُمِّ جمیل نے اُس کو سُنا تو وہ بپھری ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلی۔ اس کے ہاتھ میں مٹھی بھر پتھر تھے تاکہ ان سے آپ کو مارے اور وہ آپ کی ہجو میں اپنے ہی کچھ اشعار پڑھتی جاتی تھی۔ حرم میں پہنچی تو وہاں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضورؐ تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ، یہ آ رہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر یہ کوئی بیہودگی کرے گی۔ حضورؐ نے فرمایا یہ مجھ کو نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپؐ کے موجود ہونے کے باوجود وہ آپؐ کو نہ دیکھ سکی اور اُس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ میں نے سُنا ہے تمہارے صاحب نے میری ہجو کی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا، اِس گھر کے خدا کی قسم اُنہوں نے تو تمہاری کوئی ہجو نہیں کی۔[1] اس پر وہ واپس چلی گئی (ابن ابی حاتم، ابن ہشام۔ بزار نے حضرت عبداللہؓ بن عباس سے بھی اس سے ملتا جلتا واقعہ نقل کیا ہے)۔ (۹)

ابولہب کا انجام

اگرچہ قرآن مجید میں سورۂ لہب کے نزول پر ابولہب اور اس کی بیوی اور اس کے گھر والے بہت بلبلائے، مگر اس میں جو کچھ فرمایا گیا تھا وہ پتھر کی لکیر تھا۔ فرمایا گیا "ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ" یہ ایک پیشین گوئی تھی جو صیغہ ماضی میں اس لیے بیان کی گئی کہ اس کا پورا ہونا ایسا یقینی تھا جیسے کہ وہ پوری ہو چکی۔ ہاتھ ٹوٹنے سے مراد جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں بلکہ کسی شخص کا اپنے اُس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لیے اس نے اپنا پورا زور لگا دیا ہو۔

۱۔ حضرت ابوبکرؓ کے اس جواب کا مطلب یہ تھا کہ ہجو تو اللہ تعالیٰ نے کی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی۔ (حاشیہ از مرتّب)

چنانچہ واقعی یہی ہُوا کہ حضورؐ کی مخالفت شروع کرنے کے بعد چند سال ہی کے اندر ابولہب ایسی ناکامی سے دوچار ہُوا جو سخت عبرتناک تھی۔ جنگِ بدر میں قریش کے اکثر و بیشتر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام کی دشمنی میں اس کے ساتھی تھے۔ مکہ میں اِس شکست کی خبر پہنچی تو اُس کو اتنا رنج ہُوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ موت بھی اس کو عَدَسَہ (Malignent Pustule) نامی بیماری سے آئی جو طاعون سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اُس کے گھر والوں تک نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا کیونکہ انہیں چھوت لگنے کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اس کے پاس نہ آیا یہاں تک کہ اس کی لاش سڑ گئی اور اس کی بُو پھیلنے لگی۔ آخر جب لوگوں نے اُس کے بیٹوں کو طعنے دینے شروع کیے تو ایک روایت یہ ہے کہ اُنہوں نے کچھ حبشیوں کو اُجرت دے کر اس کی لاش اُٹھوائی اور اُنہی مزدوروں نے اُسے دفن کیا۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ اُنہوں نے ایک گڑھا کُھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اُوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اُسے ڈھانک دیا۔ پھر اُس کی مزید اور مکمل شکست اِس طرح ہُوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اِس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اُسی دین کو اس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی دُرّہؓ ہجرت کر کے مکہ سے مدینے پہنچیں اور اسلام لائیں۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر اس کے دونوں بیٹے عُتبہؓ اور مُعتّبؓ حضرت عباسؓ کی وساطت سے حضورؐ کے سامنے پیش ہُوئے اور ایمان لا کر اُنہوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ (۱۰)

تبلیغِ عام

اپنے خاندان، اور قبیلے کے لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچانے سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکّے اور عرب کے لوگوں میں عام تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور جب تک آپؐ مکہ میں مقیم رہے، دس سال مسلسل ہر حال میں اور ہر جگہ لوگوں کو قرآن سُناتے اور اللہ کا دین قبول کرنے کی دعوت دیتے رہے۔ نجی مجلسوں میں بھی برسرِ عام بھی، حرم میں بھی، آپؐ نے یہ کام جاری رکھا اور کوئی طاقت آپؐ کو اس سے باز نہ رکھ سکی۔ باہر سے جو لوگ تجارت، یا عمرہ و زیارت یا کسی اور غرض سے مکے آتے ان سے بھی آپؐ ملاقاتیں کرتے رہے۔ عُکاظ، مَجَنّہ، اور ذِی المجاز[1] کے میلوں میں بھی جا جا کر قبائل کے لوگوں کو دینِ حق کی طرف بُلاتے رہے۔ اور حج کے زمانے

---

[1] منیٰ کے علاوہ یہ تین مقامات ایسے تھے جہاں عرب کے ہر حصے کے لوگ آتے اور بڑے بڑے میلے لگتے تھے۔ سب سے بڑا میلہ عُکاظ کے مقام پر لگتا تھا جو (اُونٹ کی رفتار کے مطابق) طائف سے ایک دن اور مکہ سے تین دن کی مسافت پر واقع تھا۔ یہاں شوال کے آغاز سے آخر تک بہت بڑا اجتماع ہوتا تھا جس میں صرف خرید و فروخت ہی نہ ہوتی تھی بلکہ شاعر و خطیب اُمراء و رؤساء سب ہی آتے تھے۔ شاعری اور خطابت کے مقابلے ہوتے تھے۔ قبائل کے آپس کے جھگڑے بھی طے ہوتے تھے ایسے لوگ

یں جب لوگ منیٰ میں قیام کرتے تھے اُس وقت بھی آپ ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر جاتے اور خاص و عام سب کو پیغامِ حق پہنچانے میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھتے تھے خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے، خاموشی سے سن لے یا تلخ جواب دے، سختی سے پیش آئے یا شبابِ قریش آپ کی مزاحمت کریں، آپ کو اپنے کام سے کام تھا اور اس سے کوئی آپ کو نہ روک سکا۔

ابنِ جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں، اور ابن اثیر نے بھی یہی لکھا ہے کہ قریش کے معاشی و معاشرتی مقاطعے اور شعبِ ابی طالب کی محصوری کے سخت ترین زمانے میں بھی آپ دعوت و تبلیغ سے باز نہ رہے بلکہ خفیہ اور علانیہ، شب و روز دعوت دیتے رہے، قرآن مجید کی سورتیں اور آیتیں، جو اُس دور میں بارش کی طرح برس رہی تھیں، اُنہیں آپ علی الاعلان سناتے رہے، کفار کی حجتوں کا توڑ کرتے رہے، اُن کے شبہات و اعتراضات کے جوابات دیتے رہے، اور اُنہیں حق کا قائل کرنے کی کوشش آپ نے برابر جاری رکھی۔

ابن سعد نے لکھا ہے کہ خفیہ دعوت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد دس سال تک آپ کا یہ طریقہ رہا کہ آپ منیٰ، عکاظ، مجنّہ اور ذی المجاز میں ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر تشریف لے جاتے اور فرماتے یا ایّھا النّاس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا و تملکوا بھا العرب و تذل لکم العجم و اذا اٰمنتم کنتم ملوکًا فی الجنۃ۔ لوگو کہو لا الٰہ الا اللہ، فلاح پا جاؤ گے اور اس کلمہ کی بدولت عرب کے حاکم بن جاؤ گے اور عجم تمہارا مطیع ہو جائے گا، اور جب تم ایمان لے آؤ گے تو جنت میں تم بادشاہ ہو گے۔ پیچھے پیچھے ابولہب آکر جب آپ کی مخالفت کرتا تو لوگ کہتے کہ تمہارے اپنے خاندان، قبیلے اور بستی کے لوگ تم کو زیادہ جانتے ہیں، جب اُنہوں نے تمہاری پیروی قبول نہ کی تو ہم کیسے کریں۔ یہ جواب سن کر حضور بس یہ کہہ کر رہ جاتے اللّٰھم لو شئت لم یکونوا ھکذا۔ خداوندا، اگر تو چاہتا تو یہ ایسے نہ ہوتے۔

طبرانی نے حُرَیث بن الحارث اور مُنیت الازدی سے قریب قریب ایک ہی مضمون کی روایتیں نقل کی ہیں جن میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے ایک جگہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو توحید کی دعوت دے رہے ہیں اور فرماتے جاتے ہیں کہ لوگو، کہو لا الٰہ الا اللہ، فلاح پاؤ گے۔ اس پر لوگ آپ کو اذیتیں

---

* چھڑانے کے لیے فدیے بھی ادا کیے جاتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے خلاف لوگوں کے دعوے بھی پنچایتوں کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ پھر یکم ذی القعدہ سے مَرّ الظّہران (موجودہ وادی فاطمہ) میں لوگ جمع ہونے شروع ہوتے اور ذی القعدہ کے آخری دس دنوں میں مجنّہ نامی پہاڑ کے قریب میلہ لگتا۔ پھر ذی الحجہ کے پہلے آٹھ دنوں میں منیٰ اور عرفات کے درمیان ذی المجاز کا آخری میلہ لگتا تھا جس کے بعد ایامِ حج شروع ہو جاتے اور منیٰ میں تمام عرب سے آئے ہوئے حجاج جمع ہو جاتے۔ (حاشیہ از مؤلف)

دے رہے ہیں۔ کوئی تھوک رہا ہے اور کوئی آپ پر خاک پھینک رہا ہے اور کوئی آپ کو گالیاں دے رہا ہے یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی اور وہ لوگ چلے گئے۔ پھر ایک لڑکی پانی کا ایک بڑا پیالہ اور رومال لیے ہوئے آئی جس کا گلا سامنے سے کھلا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی پیا اور وضو فرمایا۔ پھر لڑکی سے کہا بیٹی، اپنا گلا ڈھانکو۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ ان کی صاحبزادی زینبؓ ہیں۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضورؐ میلوں اور اجتماعات میں تشریف لے جاتے اور اپنی دعوت پیش کرتے تھے۔ اسی طرح مکہ میں جو قابلِ ذکر شخص بھی عرب کے کسی مقام سے آتا آپ اس سے ملتے اور اسے خدا کا دین پہنچاتے تھے۔

ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں لکھتے ہیں کہ حضورؐ شب و روز خفیہ اور علانیہ دعوت دیتے رہے اور کسی کے روکے نہ رُکے۔ لوگوں کی مجلسوں اور محفلوں اور مجمعوں میں جاتے اور دعوت دیتے۔ میلوں اور حج کی اقامت گاہوں میں جاتے اور دعوت دیتے۔ آزاد، غلام، ضعیف، قوی، غنی، فقیر غرض ہر طبقے کے لوگوں سے ملتے اور اللہ کی طرف بلاتے۔

ان تاریخی بیانات کی پوری تائید قرآن مجید کی مکی سورتوں سے ہوتی ہے جو قریش کے اعتراضات و الزامات کے جوابوں سے بھری پڑی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کھلم کھلا اُن کو نہ سنایا گیا ہوتا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت تسلیم کرنے کی دعوت علی الاعلان اُن کو نہ دی ہوتی تو وہ آپ پر، قرآن پر، آخرت پر اور اسلام کی تعلیمات پر اعتراضات، الزامات اور شبہات کی بوچھاڑ کیسے اور کیوں کرتے؟ اور پھر اُن کے جوابات قرآن میں دینے کا حاصل کیا تھا اگر وہ معترضین کو سنائے نہ جاتے؟

حضورؐ کا اخلاقی رُعب

سوال یہ ہے کہ آخر وہ بات کیا تھی جس کی وجہ سے قریش کے لوگ نہ حضورؐ کو حرم میں نماز پڑھنے سے روک سکے اور نہ علانیہ قرآن سنانے سے باز رکھ سکے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں ہی اُن کو سخت ناگوار تھیں، اور کوئی دوسرا مسلمان ان میں سے کوئی فعل کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا، یا جرأت کرتا تو سخت مار کھائے بغیر نہ رہ سکتا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ اس کی اصل وجہ صرف یہی نہ تھی کہ بنی ہاشم اور بنی المطلب حضورؐ کی حمایت میں کٹ مرنے کے لیے تیار تھے اور قریش کے لوگ اس کی وجہ سے خائف تھے۔ بلکہ اس کا سبب حضورؐ کا وہ زبردست رُعب بھی تھا جو قریش کے لوگوں پر طاری تھا۔ وہ آپ کی دعوت پر بُری طرح پیچ و تاب کھاتے تھے، گالیاں دیتے تھے، پتھر مارتے تھے، ہر طرح سے آپ کی دل آزاری کرتے تھے، مگر اس رُعب نے ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا کہ وہ آپ کو رسالت کے کام سے روک دینے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

اس رُعب کے کئی وجوہ تھے۔ ایک وجہ یہ تھی کہ بچپن سے مسلسل آپ کے متعلق ایسی باتیں اُن کے علم و مشاہدے اور تجربے میں آئی رہی تھیں جن کے باعث پوری قوم آپ کے متعلق پہلے سے یہ جانتی تھی کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے جو اُن کے ہاں پیدا ہوئی ہے۔ اسی بنا پر نبوت سے پہلے بھی آپ کا بڑا احترام مکے میں پایا جاتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ کی زبانِ مبارک سے کبھی کوئی غلط بات لوگوں نے نہ سُنی تھی، اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو بات آپ کے منہ سے نکلتی ہے وہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ اسی لیے وہ ڈرتے تھے کہ کہیں آپ کی زبان سے اُن کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو اُن کی شامت لے آئے۔ ابھی چند سطور پہلے یہ قصہ گزر چکا ہے کہ ابولہب جیسے دشمن نے جب اپنے بیٹے کے حق میں حضورؐ سے بددُعا کا کلمہ سُنا تو وہ خوف زدہ ہو گیا۔ شام کے سفر میں اپنے ساتھیوں سے اُس نے کہا کہ اِس لڑکے کی حفاظت میں میری مدد کرو، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق جو بات کہی ہے اس کی وجہ سے مجھے اس کی جان کا ڈر ہے۔ مگر اس کی ساری احتیاطیں لاحاصل ثابت ہوئیں اور اس لڑکے کو واقعی خدا کے ایک شیر نے اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر پھاڑ کھایا۔

تیسری وجہ حضورؐ کا بے داغ کردار تھا جس پر حرف رکھنے کی کوئی گنجائش نہ تھی، آپ کا بلند ترین اور پاکیزہ ترین اخلاق تھا جس کی ساری قوم معترف تھی، آپ کا حُسنِ سلوک تھا جس سے مکہ اور اطرافِ مکہ کے سیکڑوں لوگ فیضیاب ہو چکے اور ہو رہے تھے، آپ کی صداقت، دیانت اور امانت تھی جس کی وجہ سے دشمن بھی آپ پر اعتماد کرتے تھے، حتیٰ کہ مدینہ کی طرف ہجرت کرتے وقت تک بھی ابنِ جریر کے بقول حالت یہ تھی کہ مکے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنی کسی قیمتی چیز کی حفاظت کا خواہشمند ہو اور وہ اس امانت کی حفاظت کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر بھروسہ کر سکتا ہو۔

اس اخلاقی رُعب کی وجہ سے آپ کے بدترین دشمن بھی آپ کے مقابلے میں اکڑ سی گُم کر بیٹھتے تھے اور آپ کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ اس کا اندازہ دو واقعات سے کیا جا سکتا ہے جو ابوجہل جیسے شدید اور جری دشمن کے ساتھ آپ کو پیش آئے۔ (۱۴)

ابوجہل کی مرعوبیت کا ایک واقعہ

ابنِ اسحاق کا بیان ہے کہ ایک دفعہ اراش[1] کا ایک شخص کچھ اونٹ لے کر مکہ آیا۔ ابوجہل نے اُس کے اونٹ خرید لیے اور جب اُس نے قیمت طلب کی تو ٹال مٹول کرنے لگا۔ اراشی نے تنگ آ کر ایک روز حرمِ کعبہ میں قریش کے سرداروں کو جا پکڑا اور مجمعِ عام میں فریاد شروع کر دی۔ دوسری طرف حرم کے ایک گوشے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سردارانِ قریش نے اُس شخص سے کہا کہ "ہم کچھ نہیں کر سکتے، دیکھو، وہ صاحب جو اُس کونے میں بیٹھے ہیں، اُن سے جا کر کہو، وہ تم کو تمہارا روپیہ دلوا دیں گے"۔ اراشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا، اور

[1] یہ ایک مقام کا نام ہے جو [illegible] اراش ہی [illegible]

قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا "آج لطف آئے گا"۔ اراشی نے جا کر حضورؐ سے اپنی شکایت بیان کی آپؐ اُسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اُسے ساتھ لے کر ابوجہل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرداروں نے پیچھے ایک آدمی لگا دیا کہ جو کچھ گزرے اس کی خبر لا کر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ابوجہل کے دروازے پر پہنچے اور کنڈی کھٹکھٹائی۔ اس نے پوچھا "کون؟" آپؐ نے جواب دیا "محمدؐ"۔ وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ آپؐ نے اُس سے کہا "اِس شخص کا حق ادا کر دو"۔ اس نے جواب میں کوئی چون وچرا نہ کی، سیدھا اندر گیا اور اُس کے اونٹوں کی قیمت لا کر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ قریش کا مخبر یہ حال دیکھ کر حرم کی طرف دوڑا اور سرداروں کو سارا ماجرا سنا دیا اور کہنے لگا کہ واللہ آج وہ عجیب معاملہ دیکھا ہے جو کبھی نہ دیکھا تھا۔ حکم بن ہشام (ابوجہل) جب نکلا تو محمدؐ کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا اور جب محمدؐ نے اُس سے کہا کہ اس کا حق ادا کر دو تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُس کے جسم میں جان نہیں ہے (ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۹-۳۰۔ بلاذری نے بھی انساب الاشراف، جلد اول میں اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ ص ۱۲۰-۱۲۹) (۴۳)

دوسرا واقعہ

دوسرا واقعہ قاضی ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب اَعلام النبوۃ میں لکھا ہے۔ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اِس حالت میں اُس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اُس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اسے کچھ دے دے۔ مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہِ شرارت اُس سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بےچارہ ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت اُسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپؐ سے بیان کیا۔ آپؐ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپؐ کو دیکھ کر اس نے آپؐ کا استقبال کیا اور جب آپؐ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق اسے دے دو تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزیدار جھڑپ کی امید کر رہے تھے۔ مگر جب انہوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے اور اُسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے؟ اس نے کہا خدا کی قسم میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں اور بائیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا اگر میں نے ذرا بھی اُن کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیسا زبردست رعب آپ کے دشمنوں تک پر طاری تھا۔ (۱۳)

تیسرا واقعہ

بلاذری کا بیان ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص مسجد حرام میں تشریف فرما تھے کہ بنی زبید کا ایک آدمی آیا اور اس نے کہا، قریش کے لوگو، تمہارے ہاں کون تجارتی مال لانے کی ہمت کرے گا جبکہ باہر سے آنے والوں کو تم لوگ لوٹ لیتے ہو؟ حضورؐ نے پوچھا تم پر کس نے ظلم کیا ہے؟ اس نے کہا ابو الحکم (یعنی ابوجہل) نے۔ اس نے میرے تین بہترین اونٹ خریدنے کی خواہش ظاہر کی اور ان کی قیمت بہت کم لگائی۔ اب اس کے مقابلے میں کوئی شخص ان اونٹوں کی اس کی لگائی ہوئی قیمت سے زیادہ پر خریدنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور اس قیمت پر بیچ دوں تو سخت نقصان اٹھاؤں۔ حضورؐ نے اس سے تینوں اونٹ خود خرید فرما لیے۔ ابوجہل دور بیٹھا ہوا خاموشی سے یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ حضورؐ اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا خبردار جو تم نے پھر کسی کے ساتھ ایسی حرکت کی جو اس غریب بدو کے ساتھ کی ہے، ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا۔ وہ کہنے لگا آئندہ میں کبھی ایسا نہ کروں گا۔ اس پر اُمیہ بن خلف اور دوسرے مشرکین جو وہاں موجود تھے، ابوجہل کو شرم دلانے لگے کہ تم نے محمدؐ کے سامنے ایسی کمزوری دکھائی کہ شبہ ہوتا ہے، شاید تم ان کی پیروی اختیار کرنے والے ہو۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں ان کی کبھی پیروی نہ کروں گا۔ مگر میں نے دیکھا کہ ان کے دائیں اور بائیں کچھ نیزہ بردار کھڑے ہیں اور میں ڈرا کہ میں نے محمدؐ کے حکم کی ذرا سرتابی کی تو وہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ (انساب الاشراف۔ جلد اول۔ ص ۱۳۰)

مخالفین آپؐ کی صداقت کے معترف تھے

اس کے علاوہ ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ حضورؐ کے شدید ترین مخالفین بھی دلوں میں حضورؐ کی صداقت کے معترف تھے، اور اپنے آپ کو جھوٹا جانتے ہوئے، محض ذاتی، جاہلانہ حمیت، دین آبائی کے تعصب، اور اپنی اغراض کی خاطر مخالفت کر رہے تھے۔ یہ کمزوری جن لوگوں کے دلوں میں موجود تھی، وہ آپ کی راہ روکنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر سکتے تھے، مگر آپ کو سچا اور اپنے آپ کو جھوٹا جانتے ہوئے ان کے اندر آپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس سلسلے میں متعدد تاریخی مثالیں ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ یہاں صرف ابوجہل کے متعلق ہم بتانا چاہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ سب سے بڑا دشمن کس طرح بار بار آپ کی صداقت کا اعتراف کر چکا تھا، اور اپنی مخالفت کے اصل وجوہ کس بھونڈے طریقے سے بیان کرتا تھا۔

بیہقی نے زید بن اسلم کے حوالہ سے حضرت مغیرہ بن شعبہ کا بیان نقل کیا ہے کہ اپنے زمانۂ شرک میں ایک

مرتبہ اُن کی ملاقات حضورؐ سے کس طرح ہوئی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں اور ابوجہل مکہ کے ایک راستے سے گزر رہے تھے۔ اتنے میں حضورؐ ہمیں مل گئے۔ آپ نے ابوجہل سے فرمایا "اے ابوالحکم، آ جا خدا اور اس کے رسول کی طرف۔ میں تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔" وہ بولا "اے محمدؐ کیا تم ہمارے معبودوں کی بُرائی کرنے سے باز آتے ہو؟ تم یہی چاہتے ہو نا کہ ہم اس بات کی شہادت دے دیں کہ تم نے بات پہنچا دی؟ تو ہم شہادت دیے دیتے ہیں کہ تم نے بات پہنچا دی۔ مگر خدا کی قسم اگر میں جانتا کہ تم حق پر ہو تو میں تمہاری پیروی اختیار کر لیتا۔" اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے روانہ ہو گئے۔ پھر ابوجہل میری طرف پلٹا اور بولا "خدا کی قسم، میں جانتا ہوں کہ جو کچھ یہ شخص کہتا ہے وہ حق ہے، لیکن ایک چیز مجھے روکتی ہے۔ قُصَیّ کی اولاد نے کہا کہ حجابت ہم میں رہے گی۔ ہم نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا سقایت بھی ہم میں رہے گی۔ ہم نے اس کو بھی مان لیا۔ انہوں نے کہا ندوہ بھی ہم ہی میں ہوگا۔ ہم نے اسے بھی تسلیم کیا۔ پھر انہوں نے کہا لواء بھی ہمارے ہی پاس رہے گا۔ ہم نے اس پر بھی ہاں کر دی۔ پھر انہوں نے بھی کھانے کھلائے اور ہم نے بھی کھلائے یہاں تک کہ جب ہمارے گھٹنے اُن کے گھٹنوں سے ٹکرانے لگے تو وہ کہتے ہیں ہم میں ایک نبی ہے۔ خدا کی قسم یہ میں نہیں مانوں گا۔"

ابن ابی حاتم نے ابویزید مدنی کے حوالہ سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ابوجہل سے حضورؐ کی ملاقات ہو گئی اور اس نے آپؐ سے مصافحہ کیا۔ ایک شخص نے اس سے کہا کہ میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں کہ تم اس صابی (بےدین) سے پھرے ہوئے آدمی سے مصافحہ کر رہے ہو؟ ابوجہل نے سنجیدگی میں اس سے کہا "بخدا میں جانتا ہوں کہ وہ نبی ہیں، مگر ہم کب سے بنی عبد مناف کے تابع ہو گئے ہیں؟"

امام سفیان ثوری، ترمذی، اور حاکم نے حضرت علیؓ کی روایت بیان کی ہے کہ ابوجہل نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم تمہیں جھوٹا قرار نہیں دیتے، مگر جو کچھ تم لے کر آئے ہو اسے جھٹلاتے ہیں۔"

بیہقی اور ابن ہشام نے ابن اسحاق سے اور انہوں نے امام زہری سے یہ دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک روز رات کو ابوجہل، ابوسفیان اور اخنس بن شریق الگ الگ نکلے تاکہ رات کی نماز میں حضورؐ جو قرآن پڑھتے ہیں اسے سنیں۔ تینوں کو ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ صبح ہوئی تو انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔ باہم ملامت کی اور عہد کیا کہ پھر ایسا نہ کریں گے، کیونکہ اگر لوگوں نے ہمیں اس طرح قرآن سنتے دیکھ لیا تو ان کے دلوں میں یہ بات گھر کر جائے گی۔ دوسرے روز پھر ایسا ہی ہوا اور صبح ایک دوسرے کو دیکھ کر انہوں نے پھر عہد کیا کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے۔ تیسرے روز جب پھر یہی کچھ ہوا جس کے نہ کرنے کا انہوں نے عہد کیا تھا تو اخنس اپنی لاٹھی سنبھال کر پہلے ابوسفیان کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ "ابوحنظلہ، مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ جو کچھ تم نے سنا ہے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے کہا "ابوثعلبہ، واللہ میں نے وہ باتیں

سنتی ہیں جنہیں میں سمجھتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ان سے مراد کیا ہے، اور کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن کے معنی و مُراد کو میں نہیں سمجھتا۔" اخنس نے کہا "میرا بھی یہی حال ہے[1]۔" پھر وہ ابوجہل کے پاس گیا اور کہا "ابوالحکم، جو کچھ تم نے محمدؐ سے سُنا ہے اُس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" اس نے کہا "سُنا کیا ہے؟ ہم میں اور بنی عبد مناف میں مقابلہ تھا کہ کون شرف میں بڑھ کر ہے۔ انہوں نے بھی کھانے کھلائے اور ہم نے بھی۔ انہوں نے بھی ذمہ داریوں کے بار اٹھائے اور ہم نے بھی اٹھائے، انہوں نے بھی مال دیے اور ہم نے بھی دیے، یہاں تک کہ جب ہم اور وہ برابر کی ٹکر ہو گئے تو وہ کہنے لگے کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ اب یہ ہم کہاں سے پائیں۔ خدا کی قسم ہم اسے نہیں مانیں گے اور نہ اس کی تصدیق کریں گے۔" تقریباً یہی بات ابوجہل نے اخنس بن شریق سے اُس وقت بھی کہی جب وہ جنگ بدر کے موقع پر اُس سے تنہائی میں ملا تھا۔ ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں سُدّی کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ اخنس نے اُس سے کہا "اس وقت میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا نہیں ہے۔ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ محمدؐ صادق ہیں یا کاذب؟" اس نے جواب دیا "خدا کی قسم محمدؐ صادق ہیں، وہ کبھی جھوٹ نہیں بولے ہیں، مگر جب بنی قُصَیّ لِواء اور حِجابت اور سِقایت کے ساتھ نبوت بھی لے جائیں تو باقی قریش کے لیے کیا رہ جائے گا؟"

یہ جب ابوجہل جیسے سخت معاند کا حال تھا، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی دشمنانِ اسلام کا کیا حال ہوگا؟

---

[1] اِصابہ میں حافظ ابن حجرؒ نے امام زہری کی جو روایت اس قصّے کے متعلق حضرت سعید بن المُسَیّب سے نقل کی ہے اس میں یہ ہے کہ ابوسفیان نے اخنس سے پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس نے کہا کہ میں تو اسے حق سمجھتا ہوں۔ اس کی مزید تائید حضرت معاویہؓ کی اُس روایت سے ہوتی ہے جسے طبرانی نے اوسط میں نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے باپ ابوسفیان میری ماں ہند کو اپنے ساتھ ایک گدھی پر بٹھائے ہوئے اپنے صحرائی علاقے کی طرف جا رہے تھے اور میں ایک گدھی پر اُن کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اتنے میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہمیں راستے میں مل گئے۔ میرے والد نے مجھ سے کہا، معاویہ، تم اُتر جاؤ تاکہ محمدؐ تمہاری گدھی پر سوار ہو جائیں۔ چنانچہ میں اُتر گیا اور آپؐ اس پر سوار ہو گئے۔ پھر آپؐ نے میرے والد اور والدہ کو مخاطب کر کے فرمایا "اے ابوسفیان، اور اے ہند بنتِ عُتبہ، خدا کی قسم تم سب لوگ ایک وقت مرو گے، پھر دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے، پھر جو نیک ہے وہ جنت میں جائے گا اور جو بد ہے وہ جہنم میں داخل ہو گا۔" پھر آپؐ نے سورۂ حٰمٓ السجدہ کی ابتدائی گیارہ آیات ان کو سنائیں۔ اس کے بعد آپؐ گدھی پر سے اُتر گئے اور میں سوار ہو گیا۔ راستے میں میری ماں نے میرے باپ سے کہا "اس ساحرِ کذّاب کے لیے تم نے میرے بیٹے کو سواری سے اُتارا تھا؟" باپ نے کہا "خدا کی قسم، یہ شخص نہ ساحر ہے نہ کذّاب۔"

(حاشیہ از مؤلّف)

حضورؐ کے متعلق قریش کا اعتقاد

اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ قریش کے وہی لوگ جو آپ کی مخالفت میں سرگرم تھے، اپنے دلوں میں حضورؐ کی بزرگی کے بھی قائل تھے، چنانچہ عین اُس زمانے میں جبکہ آپؐ سے اور مسلمانوں سے اُن کی سخت کشمکش برپا تھی مکہ میں ایک ہولناک قحط پڑا جس سے ساری آبادی چیخ اٹھی۔ اُس وقت مکہ کے سردار حضورؐ ہی کے پاس حاضر ہوتے تھے کہ آپ اپنی قوم کو اِس آفت سے نجات دلانے کے لیے دعا فرمائیں۔ امام بخاری اور بیہقی نے تھوڑے سے لفظی اختلافات کے ساتھ مَسروق کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ قریش آپ کے مقابلے میں سرکشی پر تُلے ہوئے ہیں تو آپ نے دعا کی کہ خدایا یوسف علیہ السلام کے سات سالہ قحط کی طرح اِن کے لوگوں کے مقابلے میں میری بھی سات برس کے قحط سے مدد فرما۔ اس پر ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے مُردار اور ہڈیاں اور بہا نوروں کی کھالیں تک کھا ڈالیں۔ آخر کار ابوسفیان اور مکہ کے دوسرے متعدد لوگ آپؐ کے پاس حاضر ہوتے اور عرض کیا کہ "اے محمدؐ، آپؐ تو کہتے ہیں کہ میں رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں، اور حال یہ ہے کہ آپؐ کی قوم ہلاک ہوئی جارہی ہے۔ آپ اس کے حق میں دعا کریں" اس پر آپؐ نے دعا کی اور خوب بارش ہوئی یہاں تک کہ لوگ کثرتِ باراں کی شکایت لے کر آئے۔ تب آپؐ نے دعا فرمائی اللّٰھم حوالینا ولا علینا (خدایا ہمارے گردوپیش ہو، ہم پر نہ ہو)۔ اس کے بعد بادل چھٹ گئے۔

امام بخاری نے ابن عباسؓ سے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ ابوسفیان حضورؐ کے پاس بھوک کی فریاد لے کر آیا، کیونکہ قحط کے مارے لوگوں نے جب کچھ نہ پایا تو صوف تک کھانے لگے تب حضورؐ نے دعا فرمائی اور اللہ نے قحط کی مصیبت دور فرما دی۔

اِن واقعات سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ قریش کے سردار براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹکرانے اور آپ کو تبلیغ عام سے زبردستی روک دینے کی کبھی ہمت نہ کر سکتے تھے لیکن اس کے ساتھ اُن کو یہ بھی کسی طرح گوارا نہ تھا کہ یہ تبلیغ ہوتی رہے۔ ان کے دینِ آبائی کی بیخ کنی ہوتی رہے، ان کے نظامِ زندگی کے بالکل برعکس ایک دوسرا نظام فروغ پاتا رہے، اور لوگ اسلام قبول کرتے رہیں۔ اس لیے ان کا فیصلہ بہرحال یہی تھا کہ اس دعوت کو کسی طرح چلنے نہیں دینا ہے اور ہر قیمت پر اسے زک دینی ہے۔ اسی غصّے میں وہ کبھی حضورؐ پر بھی دست درازی کر بیٹھتے تھے، جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ (۱۴)

حوالہ جات باب (۷)

۱. اضافہ از مؤلف
۲. تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورۃ العلق
۳. اضافہ از مؤلف
۴. تفہیم القرآن، جلد سوم، الشعراء، خلاصہ حاشیہ ۳۵
۵. " " " "
۶. " ، جلد ششم، دیباچہ سورۃ اللھب
۷. اضافہ از مؤلف
۸. تفہیم القرآن، جلد ششم، خلاصہ دیباچہ سورۃ اللھب
۹. " " " اللھب حاشیہ ۳
۱۰. " " " " خلاصہ حاشیہ ۱
۱۱. اضافہ از مؤلف
۱۲. تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء حاشیہ ۵
۱۳. " ، جلد ششم، الماعون حاشیہ ۵
۱۴. اضافہ از مؤلف

باب (۸)

دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی تدبیریں

اس بحث سے پہلے ابتدا ہی میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ سارے قبیلۂ قریش کا رویہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں یکساں نہ تھا، بلکہ لوگ مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔

ایک طبقہ شدید ترین مخالفین کا تھا جو زیادہ تر بڑے بڑے سرداروں پر مشتمل تھا۔ ابن سعد نے طبقات میں ان لوگوں کے نام یہ لکھے ہیں: ابوجہل، ابولہب، اَسود بن عبدِ یغوث (یہ بنی زہرہ میں سے تھا، حضورؐ کا ماموں زاد بھائی تھا)، حارث بن قیس بن عَدِی (جو بنی سہم میں سے تھا اور ابن الغیطلہ کے نام سے مشہور تھا)، ولید بن مُغیرہ (بنی مخزوم میں سے)، اُمیّہ بن خلف اور اُبَی بن خلف (بنی جمح میں سے)، ابوقیس بن فاکہ بن مُغیرہ (بنی مخزوم میں سے)، عاص بن وائل سہمی (یہ عمرو بن العاص کا باپ تھا)، نضر بن الحارث (بنی عبدالدار میں سے)، مُنَبّہ بن الحجاج (بنی سہم میں سے)، زُہیر بن ابی اُمیّہ (بنی مخزوم میں سے، یہ اُم سلمہؓ کا باپ شریک بھائی تھا)، سائب بن صیفی بن عابد (بنی مخزوم میں سے)، اَسود بن عبدالاسد مخزومی، عاص بن سعید بن العاص (بنی اُمیّہ میں سے)، ابوالبختری عاص بن ہشام (بنی اسد میں سے)، عُقبہ بن ابی مُعَیط (بنی اُمیّہ میں سے)، ابن الاصدی (یا الاصداء) الہذلی، حکم بن ابی العاص (بنی اُمیّہ میں سے، یہ مروان کا باپ تھا)، عدی بن حمراء الثقفی۔

دوسرا طبقہ اُن بہت سے سردارانِ قریش کا تھا جو دشمن تو ضرور تھے، مگر ایسے دشمن نہ تھے کہ متقدم الذکر گروہ کی طرح ہاتھ دھو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے ہوں۔ البتہ اسلام کے خلاف جو کارروائیاں کی جاتی تھیں ان میں وہ دشمنوں کا ساتھ دیتے تھے۔ ابن سعد نے عُتبہ بن ربیعہ اور شَیبہ بن ربیعہ (بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے) اور ابوسفیان بن حرب (بنی اُمیّہ میں سے) کو ایسے ہی دشمنوں میں شمار کیا ہے۔ تاہم جو لوگ بھی مخالف تھے ان کا طرزِ عمل بھی قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمۡ يَثۡنُوۡنَ صُدُوۡرَهُمۡ لِيَسۡتَخۡفُوۡا مِنۡهُ (ہود: ۵) "دیکھو، یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اُس سے چھپ جائیں"۔ یعنی یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی دعوت سے ایسے بیزار ہیں کہ آپ سے کتراتے ہیں، کہیں آپ کو بیٹھے دیکھتے ہیں تو اُلٹے پھر جاتے ہیں، کبھی آپ کو سامنے سے آتے دیکھتے ہیں تو رُخ بدل لیتے یا کپڑے کی اوٹ میں مُنہ چھپا لیتے ہیں، تاکہ آمنا سامنا نہ ہو جائے اور آپ اُنہیں مخاطب کر کے کچھ بات نہ کرنے لگیں۔

رہے عام اہلِ مکّہ، تو ان میں سے کچھ غیر جانبدار رہے، کچھ دلوں میں اسلام کے قائل ہو گئے تھے مگر اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھے، کچھ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، اور ایک بڑی تعداد اپنے سرداروں کے بھڑکانے سے دینِ آبائی کی حمیت میں مبتلا ہو کر اُن شرارتوں میں شریک ہو جاتی تھی جو اسلام کے خلاف کی جاتی تھیں۔

اب ہم اُن تدابیر کو الگ الگ بیان کرتے ہیں جو مخالفین نے اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے اختیار کیں۔

۱۔ حضورؐ سے مصالحت کی کوششیں

چونکہ مخالفین حضورؐ کی غیر معمولی شخصیت اور قرآن کی بے پناہ تاثیر کو محسوس کرتے تھے، اِس لیے انہوں نے بار بار یہ کوشش کی کہ آپ سے بات چیت کر کے آپ کو دین کے معاملہ میں کسی نہ کسی طرح مصالحت پر راضی کر لیں۔ اِس غرض کے لیے ان کے متعدد وفد بھی آپ سے ملے اور خاص خاص اشخاص نے بھی مل کر بات کی۔

عُتبہ بن ربیعہ کی آپؐ سے ملاقات

اِن ملاقاتوں میں سے ایک اہم ملاقات عُتبہ بن ربیعہ کی تھی جس کو مختلف محدثین نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے، مگر ماحصل میں زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن عمرؓ سے اور عبد بن حُمید، ابو یعلیٰ اور بیہقی نے جابرؓ بن عبداللہ انصاری سے روایت کیا ہے کہ ایک روز قریش کے کچھ لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھو، تم میں کون سب سے زیادہ سحر، کہانت اور شعر کا جاننے والا ہے۔ وہ اِس شخص کے پاس جائے جس نے ہماری جماعت میں پھوٹ ڈال دی ہے، ہمارے معاملات میں خرابی برپا کر دی ہے اور ہمارے دین کو عیب لگایا ہے، اور اِس سے بات کر کے دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ایسا آدمی ہمارے نزدیک عُتبہ بن ربیعہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ سب نے کہا ابوالولید، تم یہ کام کرو، اور وہ آپ کے پاس گیا۔ (۱)

دوسری روایت محمد بن اسحاق اور بیہقی نے محمد بن کعب القرظی سے نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجدِ حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہؓ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اِس موقع پر عُتبہ بن ربیعہ (ابو سفیان کے خُسر) نے سردارانِ قریش

سے کہا کہ صاحبو، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں، شاید کہ وہ اُن میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آ جائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ "ابوالولید تم پر پورا اطمینان ہے، ضرور جا کر اُس سے بات کرو۔" عتبہ اٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اُس نے کہا "بھتیجے، ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی وہ تم خود جانتے ہو۔ اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو۔ تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بیوقوف ٹھیرایا۔ قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی بُرائی کی۔ اور ہمارے باپ دادا جو مر چکے ہیں، ان سب کو تم نے کافر اور گمراہ ٹھیرایا۔ اب تم ذرا میری بات سنو۔ میں کچھ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ ان پر غور کرو۔ شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوالولید آپ کہیں، میں سنوں گا۔" اس نے کہا "بھتیجے یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے تمہارا مقصد اگر مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں، کسی معاملے کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو اور تمہیں سوتے اور جاگتے میں واقعی کچھ نظر آنے لگا ہے تو ہم بہترین اطبا بلواتے ہیں اور سب مل کر اپنے خرچ پر تمہارا علاج کراتے ہیں۔" عتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپ نے فرمایا "ابوالولید آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے یا ابھی اور کچھ کہنا ہے؟" اُس نے کہا "بس مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا۔" آپ نے فرمایا "اچھا، اب میری سنیے۔" اس کے بعد آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۃ حٰم السجدہ کی تلاوت شروع کی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیت سجدہ (آیت ۳۸) پر پہنچ کر آپ نے سجدہ کیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا "ابوالولید، میرا جواب آپ نے سُن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام۔" عتبہ اٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دُور سے اُس کو دیکھتے ہی کہا "خدا کی قسم، عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔" پھر جب وہ آ کر بیٹھا تو لوگوں نے کہا "کیا سُن آئے؟" اُس نے کہا "بخدا، میں نے ایسا کلام سُنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سُنا تھا۔ خدا کی قسم، نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے نہ کہانت۔ اے اہلِ قریش، میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو، اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی، اور اس کی عزت تمہاری عزت ہی ہو گی۔" سردارانِ قریش اُس کی یہ بات سنتے ہی بول اٹھے "ولید کے ابا، آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔"

عتبہ نے کہا "میری جو رائے تھی وہ میں نے تمہیں بتا دی، اب تمہارا جو جی چاہے کرتے رہو۔"

بیہقی نے اس واقعہ کے متعلق جو روایات جمع کی ہیں ان میں یہ اضافہ ہے کہ جب آپؐ سورۂ حٰم السجدہ کی آیت فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں نے تم کو اسی طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا) پر پہنچے تو عتبہ نے بے اختیار آپؐ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہنے لگا کہ "ایسی بات نہ کہو۔" اور اپنی اس حرکت کا سبب اس نے لوگوں کو یہ بتایا کہ "تم لوگ جانتے ہو کہ محمدؐ جب کوئی بات کہتے ہیں تو وہ جھوٹی نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے عذاب کا خوف ہوا۔" (۲)

ایک اور وفد کی ملاقات

محمد بن اسحاق ابن عباسؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابو سفیان بن حرب، نضر بن حارث، ابوالبختری بن ہشام، اسود بن المطّلب، زمعہ بن الاسود، ولید بن مغیرہ، ابوجہل، عبداللہ بن ابی امیّہ، امیّہ بن خلف، عاص بن وائل، اور حجّاج سہمی کے بیٹے نُبَیہ اور مُنَبِّہ غروب آفتاب کے بعد کعبہ کی دیوار کے پاس جمع ہوئے اور آپس میں کہا کہ محمدؐ کو بلا کر بات کرو اور ان سے بحث کر کے اپنی حجّت پوری کر دو۔ چنانچہ حضورؐ کو پیغام بھیجا گیا کہ آپؐ کی قوم کے اشراف جمع ہوئے ہیں تاکہ آپؐ سے بات کریں۔ حضورؐ چونکہ ان لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے خود بے چین تھے اس لیے آپؐ فوراً تشریف لے آئے۔ ان لوگوں نے کہا کہ "محمدؐ، ہم نے تم کو اس لیے بلایا ہے کہ تمہارے معاملہ میں اپنی طرف سے حجّت پوری کر دیں۔ واللہ، ہم نہیں جانتے کہ عرب میں سے کسی شخص نے اپنی قوم میں وہ فتنہ ڈالا ہو جو تم نے اپنی قوم میں ڈالا ہے۔ تم نے باپ دادا کو بُرا کہا، دین میں عیب نکالا، لوگوں کو بے وقوف ٹھیرایا، معبودوں کی بُرائی کی، جماعت میں پھوٹ ڈال دی، اور کوئی قبیح بات ایسی نہ رہی جو تم ہمارے اور اپنے درمیان نہ لے آئے۔ اگر تم یہ سب کچھ مال کی طلب میں کر رہے ہو تو ہم اپنے مال جمع کر کے تم کو اتنا دے دیں گے کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر تم ہم میں اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ حتیٰ کہ ہم کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے)۔ اور اگر تم بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تم کو بادشاہ بنائے لیتے ہیں لیکن اگر یہ کوئی جن تم پر آتا ہے جو تم پر مسلّط ہو گیا ہے تو ہم اپنے مال صرف کر کے تمہارے علاج کا بندوبست کرتے ہیں تاکہ تم اس کی گرفت سے چھوٹ جاؤ، یا کم از کم ہماری طرف سے عذر پورا ہو جائے۔" جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ "مجھے وہ کوئی مرض لاحق نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو، نہ میں جو چیز تمہارے پاس لایا ہوں وہ اس لیے لایا ہوں کہ تم سے تمہارے مال طلب کروں، یا تم میں شرف حاصل کروں، یا تمہارا بادشاہ بن جاؤں۔ بلکہ اللہ نے

مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر ایک کتاب نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے لیے بشیر (ایمان لانے پر خوشخبری دینے والا) اور نذیر (ایمان نہ لانے پر ڈرانے والا) ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیے اور تمہیں نصیحت کر دی۔ اب اگر تم اس چیز کو قبول کر لو جو میں تمہارے پاس لایا ہوں تو وہ تمہارے لیے دنیا اور آخرت میں خوش نصیبی ہے۔ اور اگر تم اسے رد کرتے ہو تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔" اس پر کفار کے سرداروں نے حضورؐ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کیا (جن کا ذکر جگہ جگہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے اور جن کا جواب بھی قرآن ہی میں دے دیا گیا ہے اس لیے یہاں ہم ان کو درج نہیں کر رہے ہیں)۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے اس واقعہ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ معجزات کے یہ مطالبے سن کر حضورؐ نے فرمایا "میں ان کاموں کے لیے تمہارے پاس نہیں بھیجا گیا ہوں۔ میں نے وہ باتیں تمہارے سامنے پیش کر دی ہیں جن کے لیے مجھے اللہ نے بھیجا ہے۔" آخرکار ان لوگوں نے حضورؐ کو یہ دھمکی دی کہ واللہ ہم تم کو اور تمہاری ان کارروائیوں کو جو تم ہمارے درمیان کر رہے ہو یونہی نہیں چھوڑیں گے تا آنکہ یا ہم تمہیں ختم کر دیں یا تم ہمیں ختم کر دو۔ (۳)

مصالحت کی چند اور کوششیں

اس کے علاوہ بھی متعدد مواقع پر قریش کے سردار حضورؐ کے سامنے متعدد تجویزیں پیش کرتے رہے کہ آپ کسی بات پر راضی ہو جائیں اور آپ کی اور ان کی کشمکش ختم ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ کو اتنا مال دیے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ مالدار آدمی بن جائیں۔ آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کیے دیتے ہیں۔ ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے

۳۔ مثال کے طور پر قرآن میں فرمایا گیا: وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (الانعام آیت ۷) "اگر ہم تیرے اوپر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی کتاب نازل کر دیتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جن لوگوں نے نہیں مانا وہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔" وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ (الحجر آیت ۱۴-۱۵) "اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اس میں چڑھنے لگتے تو یہ کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔ حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا ٹھیرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی: قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ، لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ۔ "کہدو کہ اے کافرو، میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین" اور یہ کہ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ (الزمر، آیت ۶۴)۔ "اِن سے کہو: اے نادانو، کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ اللہ کے سوا میں کسی اور کی عبادت کروں؟" (ابن جریر، فی التفسیر والتاریخ، ابن ابی حاتم۔ طبرانی)۔

ابن عباسؓ کی ایک اور روایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضورؐ سے کہا "اے محمدؐ، اگر تم ہمارے معبودوں کو چوم لو تو ہم تمہارے معبود کی عبادت کریں گے۔" اس پر سورۂ کافرون نازل ہوئی۔ (عبد بن حمید)
سعید بن میناء (ابوالبختری کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، اسود بن المطلب اور امیہ بن خلف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپؐ سے کہا "اے محمدؐ، آؤ ہم تمہارے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمہیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو اُس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے تو ہم تمہارے ساتھ اس میں شریک ہوں گے اور اپنا حصہ اُس سے پالیں گے، اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے اُس سے بہتر ہوئی جو تم

---

[1] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی درجہ میں بھی اس تجویز کو قابلِ قبول یا معنی قابلِ غور ہی سمجھتے تھے، اور آپؐ نے معاذ اللہ کفار کو یہ جواب اس امید پر دیا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منظوری آجائے۔ بلکہ دراصل یہ بات بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی ماتحت افسر کے سامنے کوئی بے جا مطالبہ پیش کیا جائے اور وہ جانتا ہو کہ اس کی حکومت کے لیے یہ مطالبہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ مگر وہ خود صاف انکار کر دینے کے بجائے مطالبہ کرنے والوں سے کہے کہ میں آپ کی درخواست اوپر بھیج دیتا ہوں، جو کچھ وہاں سے جواب آئے گا وہ آپ کو بتا دوں گا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ ماتحت افسر اگر خود ہی انکار کر دے تو لوگوں کا اصرار جاری رہتا ہے، لیکن اگر وہ بتائے کہ اوپر سے حکومت کا جواب ہی تمہارے مطالبہ کے خلاف آیا ہے تو لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔
(حاشیہ از مؤلف)

لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گئے اور اس سے اپنا حصّہ پا لو گے" اِس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورۃ نازل فرمائی کہ قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ (ابن جریر۔ ابن ابی حاتم۔ ابن ہشام اور بلاذری نے بھی اِس واقعہ کو نقل کیا ہے)۔

وَہب بن مُنَبِّہ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہا اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں (عبد بن حُمید۔ ابن ابی حاتم)۔

اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے حضورؐ کے سامنے اس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں اور اِس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دو ٹوک جواب دے کر ان کی اِس امید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم دین کے معاملہ میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر ان سے کوئی مصالحت کر لیں گے۔ (۴)

۲۔ جنابِ ابوطالب پر دباؤ ڈالنے کی کوششیں

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کو روکنے کے لیے قریش کی دوسری تدبیر یہ تھی کہ پے در پے ابوطالب سے مل کر ان پر بھی دباؤ ڈالیں کہ وہ آپؐ کی حمایت چھوڑ دیں، اور ان کے ذریعہ سے حضورؐ پر بھی دباؤ ڈلوائیں کہ آپ اپنے کام سے باز آ جائیں۔

پہلا وفد

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قریش نے جب دیکھا کہ ابوطالب حضورؐ کی حمایت کر رہے ہیں اور آپ کو اُن باتوں سے نہیں روکتے جو انہیں سخت ناگوار ہیں تو اشرافِ قریش کا ایک وفد ان کے پاس گیا جس میں بنی عبدشمس بن عبدِ مَناف میں سے عُتبہ بن رَبیعہ اور شَیبہ بن رَبیعہ، بنی اُمیّہ میں سے ابوسفیان، بنی اَسد بن عبدالعُزّیٰ میں سے ابوالبَختَری عاص بن ہشام اور اَسود بن المُطّلب، بنی مخزوم میں سے ابوجہل اور وَلید بن مُغیرہ، بنی سَہم میں سے حَجّاج کے بیٹے نُبَیہ اور مُنَبِّہ اور انہی میں سے عاص بن وائل شامل تھے۔ انہوں نے کہا کہ "اے ابوطالب، آپ کے بھتیجے نے ہمارے معبودوں کی بُرائی کی، ہمارے دین میں عیب نکالا، ہماری عقلوں کو حماقت قرار دیا، ہمارے باپ دادا کو گمراہ ٹھیرایا۔ اب یا تو آپ اسے ہماری دل آزاری سے روکیں، یا ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں، کیونکہ آپ خود بھی تو ہماری طرح اس کے لائے ہوئے دین کے خلاف ہیں۔ پھر ہم اُس سے نمٹ لیں گے" ابوطالب نے ان کو بہت نرم جواب دے کر اور اچھی اچھی باتیں کر کے ٹھنڈا کیا اور وہ چلے گئے (ابن ہشام۔ طبری۔

البدایہ والنہایہ) ۔

دوسرا وفد

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کام جاری رکھا اور قریش کے سردار اس پر آوبختے رہے تو آخر ان سے صبر نہ ہوسکا اور ایک دوسرا وفد لے کر وہ ابوطالب کے پاس گئے اور کہا کہ اے ابوطالب! آپ ہمارے درمیان سن رسیدہ بزرگ ہیں، شرف اور قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ اُس کی حمایت سے باز آجائیں، مگر آپ باز نہ آئے۔ ہم سے اپنے باپ دادا کی بُرائی اور اپنی عقلوں کی توہین اور اپنے معبودوں کی عیب چینی برداشت نہیں ہوسکتی۔ اب یا تو آپ اسے روکیں، یا پھر ہمارا اور آپ کا مقابلہ ہوگا یہاں تک کہ فریقین میں سے کوئی ایک ہلاک ہوجائے۔ اس کے بعد روایات میں اختلاف ہے۔

امام بخاریؒ نے تاریخ میں اور حافظ ابو یعلیٰ نے اپنی مُسند میں عقیل بن ابی طالب کی جو روایت نقل کی ہے اُس میں یہ ہے کہ ان لوگوں کی موجودگی ہی میں میرے والد نے مجھ سے کہ جاکر محمدؐ کو بلا لاؤ۔ میں سخت گرمی میں ان کو تلاش کرکے لے آیا۔ آپ تشریف لائے تو ابوطالب نے کہا کہ بھتیجے تمہارے بنی عم مجھ سے تمہارے متعلق یہ شکایت کررہے ہیں کہ تم انہیں ان کی مجلسوں میں اور مسجد (یعنی مسجد حرام) میں اذیت دیتے ہو۔ تم ان کو اذیت دینا بند کردو۔ اس پر حضورؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور قریش کے سرداروں سے فرمایا آپ لوگ یہ سُورج دیکھ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ آپؐ نے فرمایا جس طرح یہ سُورج آپ لوگوں سے اپنے شُعلے روک دینے پر قادر نہیں ہے اُسی طرح مَیں بھی اِس کام کو چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں۔ یہ جواب دے کر آپ اُٹھ گئے اور آپؐ کے جانے کے بعد ابوطالب نے کہا میرے بھتیجے نے کبھی کوئی جھُوٹی بات نہیں کہی ہے، لہٰذا آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ طبرانی نے اَوسط اور کبیر میں بھی یہ روایت نقل کی ہے اور ابو یعلیٰ نے بھی اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

ابن ہشام، طَبَری، بَیہقی اور بلاذری نے یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد ابوطالب نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بلا کر کہا "بھتیجے تمہاری قوم نے آکر مجھ سے یہ یہ باتیں کہی ہیں۔ تم میرے لیے بھی اور اپنے لیے بھی جینے کی کچھ گنجائش باقی رہنے دو اور مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ نہ مَیں اُسے اٹھا سکوں اور نہ تم اُٹھا سکو۔ لہٰذا اپنی قوم سے ایسی باتیں کہنا چھوڑ دو جو انہیں ناگوار ہیں"۔ ابوطالب کی یہ بات سُن کر حضورؐ نے محسُوس کیا کہ چچا کے لیے اب میری حمایت کرنا مشکل ہوگیا ہے اور وہ اِس سے دست بردار ہونے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ تب آپؐ نے فرمایا "چچا جان، اگر سُورج میرے سیدھے ہاتھ پر اور چاند بائیں ہاتھ پر بھی رکھ دیا جائے تو مَیں یہ کام نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ یا تو اللہ اِسے کامیاب فرمادے یا مَیں اِس راہ میں

ہو جاؤں۔ پھر آپ رنجیدہ ہو کر رو دیئے اور اُٹھ کر جانے لگے۔ ابوطالب نے یہ دیکھ کر کہ حضورؐ پر اس بات کا کیسا سخت اثر ہوا ہے آپؐ کو پکارا۔ آپ پلٹ کر آئے تو انہوں نے کہا اپنا کام جاری رکھو اور جو کچھ کرنا چاہو کرو، خدا کی قسم میں کسی چیز کی وجہ سے بھی تمہیں دشمنوں کے حوالے نہ کروں گا۔

ابوجہل حضورؐ کے قتل کا ارادہ کرتا ہے

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے کہا "اے گروہ قریش، تم نے دیکھ لیا کہ محمدؐ نے کس طرح صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ ہمارے دین کی بُرائی کرنے، ہمارے باپ دادا کو گمراہ کہنے، ہماری عقلوں کو بے عقلی قرار دینے اور ہمارے معبودوں کو گالیاں دینے سے باز نہ آئیں گے۔ اب میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ کل میں ایک پتھر لے کر بیٹھوں گا اور جب وہ نماز میں سجدہ کریں گے تو ان کا سر کچل دوں گا، پھر بنی عبد مناف جو چاہیں کریں۔" دوسرے روز صبح کو وہ پتھر لے کر آپؐ کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ حضورؐ حسب عادت تشریف لائے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ قریش کے لوگ بھی اپنی مجلسوں میں جمع ہو گئے کہ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ حضورؐ جب سجدے میں گئے تو ابوجہل پتھر لے کر آگے بڑھا، مگر یکایک وہ آپؐ کے قریب پہنچ کر پلٹا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا، اُس کا رنگ فق تھا، اور پتھر بھی اُس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ قریش کے لوگ اُٹھ کر اُس کے پاس گئے اور پوچھا ابوالحکم، یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ اُس نے کہا "میں وہی کام کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا جو میں تم سے کہہ چکا تھا، مگر جب میں قریب پہنچا تو میرے آگے ایک ایسا زبردست اونٹ آ گیا کہ میں نے کبھی اتنے بڑے سر اور ایسی گردن اور ایسی کچلیوں والا اونٹ نہ دیکھا تھا۔ اور وہ مجھے چبا ڈالنے کے لیے تیار ہو گیا۔" بعد میں حضورؐ نے فرمایا کہ وہ جبریلؑ تھے۔

تیسرا وفد

ابن سعد نے لکھا ہے کہ قریش کے شیوخ پھر ایک دفعہ ابوطالب کے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ آپ ہمارے بڑے اور سردار ہیں، ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرتے ہیں اور آپ بھی ہمارے اور اس کے درمیان انصاف کریں۔ اپنے بھتیجے کو بلائیے اور اُس سے کہیے کہ وہ ہمارے معبودوں کی بُرائی چھوڑ دے اور ہم اُسے اور اُس کے معبود کو اُس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اِس پر ابوطالب نے حضورؐ کو بلایا اور کہا "بھتیجے، یہ تمہارے اعمام اور تمہاری قوم کے اشراف اور شیوخ آئے ہیں اور تم سے ایک انصاف کی بات طے کرنا چاہتے ہیں۔" حضورؐ نے کہا آپ لوگ فرمائیں، میں سنتا ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ تم ہمیں اور ہمارے معبودوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور ان کی بُرائی کرنے سے باز آ جاؤ۔ ہم تمہیں اور تمہارے معبود کو تمہارے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ابوطالب نے کہا یہ تو انہوں نے انصاف کی بات کہی ہے، اِسے مان لو۔ حضورؐ نے فرمایا، چچا جان، کیا میں اس سے بہتر

چیز کی بات انہیں نہ بتا دوں؟" ابو طالب نے پوچھا وہ کیا بات ہے؟ حضورؐ نے فرمایا "میں انہیں ایک ایسے کلمے کی طرف بلاتا ہوں جس کے اگر یہ قائل ہو جائیں تو عرب کے فرمانروا بن جائیں اور عجم ان کا تابع ہو جائے" ابو جہل بولا "یہ تو بڑے نفع کا سودا ہے، تمہارے باپ کی قسم ہم ایک نہیں دس ایسے کلمات کہنے کے لیے تیار ہیں" حضورؐ نے فرمایا کہو لا الٰہ الاّ اللہ۔ اس پر وہ سب غضبناک ہو کر نفرت کے ساتھ جھٹ گئے اور کہنے لگے اِصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ، اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (ص۔ آیت ۶) "اپنے معبودوں کی عبادت پر ڈٹے رہو اس بات سے تو کچھ اور ہی مراد ہے" (۵)

اس واقعہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں اور طبری نے تاریخ میں اسے زمانے کے تعیّن کے بغیر بیان کیا ہے۔ ابن اسحاق نے اسے حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ بیان کیا ہے اور اسی کو زمخشری، رازی اور نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ لیکن متعدد دوسری روایات میں اسے اُس وقت کا واقعہ لکھا ہے جب ابو طالب مرضِ وفات میں مبتلا تھے۔ امام احمد، نسائی، ترمذی، بیہقی، ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم، اور ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں جو واقعہ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابو طالب بیمار ہوئے اور قریش کے سرداروں نے محسوس کیا کہ اب یہ ان کا آخری وقت ہے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چل کر شیخ سے بات کرنی چاہیے۔ وہ ہمارا اور اپنے بھتیجے کا جھگڑا چکا جائیں تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا انتقال ہو جائے اور ان کے بعد ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کریں اور عرب کے لوگ ہمیں طعنہ دیں کہ جب تک شیخ زندہ تھا، یہ لوگ اس کا لحاظ کرتے رہے اب اس کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کے بھتیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا اور تقریباً ۲۵ سردارانِ قریش، جن میں ابو جہل، ابو سفیان، اُمیّہ بن خلف، عاص بن وائل، اَسوَد بن المطّلِب، عُقبہ بن ابی مُعَیط، عُتبہ اور شیبہ شامل تھے، ابو طالب کے پاس پہنچے۔ ان لوگوں نے پہلے تو حسبِ معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی شکایات بیان کیں، پھر کہا ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرنے آئے ہیں۔ آپ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اسے اُس کے دین پر چھوڑے دیتے ہیں۔ وہ جس معبود کی عبادت کرنا چاہے کرے، ہمیں اس سے کوئی تعرّض نہیں۔ مگر وہ ہمارے معبودوں کی مذمّت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرتا پھرے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ اس شرط پر آپ ہم سے اُس کی صلح کرا دیں۔ ابو طالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپؐ سے کہا کہ بھتیجے، یہ تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تاکہ تمہارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ پھر انہوں نے وہ بات حضورؐ کو بتائی جو سردارانِ قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

نے جواب میں فرمایا، چچا جان، مَیں تو اُن کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب اِن کا تابع فرمان اور عجم ان کا باج گزار ہو جائے۔ یہ سُن کر پہلے تو وہ لوگ سنسٹ پٹا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا کہہ کر ایسے ایک مفید کلمے کو رد کر دیں۔ پھر کچھ سنبھل کر بولے، تم ایک کلمہ کہتے ہو، ہم ایسے دس کلمے کہنے کو تیار ہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ۔ اس پر وہ سب یک بارگی اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ باتیں کہتے ہوئے نکل گئے جو سورۂ صٓ کے ابتدائی حصہ میں (آیت ۴ سے ۸ تک) بیان ہوئی ہیں (۶)

چوتھا وفد

ابنِ ہشام، ابنِ جریر طبری، ابنِ سعد، بلاذری اور ابنِ کثیر نے لکھا ہے کہ قریش نے جب دیکھا کہ ابو طالب کسی طرح حضورؐ کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے اور وہ قوم کی عداوت اور اُس سے جدائی تک اپنے بھتیجے کی خاطر مول لینے پر تیار ہیں تو وہ ولید بن مُغیرہ کے بیٹے عُمارہ بن ولید کو اُن کے پاس لے گئے اور کہا کہ "اے ابو طالب یہ عُمارہ بن ولید قریش کا نہایت نام آور اور خوبصورت جوان ہے، اس کو لے کر بیٹا بنا لو اور اس کے بدلے اپنے اِس بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو جس نے تمہارے آبا و اجداد کے دین کی مخالفت کی اور تمہاری قوم میں پھوٹ ڈال دی اور ہم سب کو احمق قرار دیا۔ ہم ایک آدمی دے کر دوسرا لیتے ہیں تاکہ اسے قتل کر ڈالیں" ابو طالب نے جواب دیا "واللہ تم نے بدترین سودا مجھ سے کیا۔ اپنا بیٹا مجھے دیتے ہو کہ مَیں اُسے پالوں، اور میرا بیٹا مجھ سے مانگتے ہو کہ تم اسے قتل کر ڈالو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا" مُطعِم بن عَدی نے جو ہاشم کے بھائی نوفل کی اولاد

لے حضورؐ کے اِس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپؐ نے فرمایا أُرِيدُهُم عَلَى كَلِمَةٍ وَاحِدَةٍ يَقُولُونَهَا تَدِينُ لَهُم بِهَا الْعَرَبُ وَتُؤَدِّي إِلَيْهِم بِهَا الْعَجَمُ الْجِزْيَةَ۔ دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: أَدْعُوهُم إِلَى أَنْ يَتَكَلَّمُوا بِكَلِمَةٍ تَدِينُ لَهُم بِهَا الْعَرَبُ وَيَمْلِكُونَ بِهَا الْعَجَمَ۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے ابو طالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا كَلِمَةٌ وَاحِدَةٌ تُعْطُونِيهَا تَمْلِكُونَ بِهَا الْعَرَبَ وَتَدِينُ لَكُم بِهَا الْعَجَمُ۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: أَرَأَيْتُكُم إِنْ أَعْطَيْتُكُم كَلِمَةً تَكَلَّمْتُم بِهَا مَلَكْتُم بِهَا الْعَرَبَ وَدَانَتْ لَكُم بِهَا الْعَجَمُ۔ ان لفظی اختلافات کے باوجود مدعا سب کا یکساں ہے، یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمہاری بھلائی اِس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اِس میں کہ جس حالت میں تم پڑے ہو اُسی میں تم کو چھوڑ دیا جائے اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں؟ (۷)

سے تھا، کہا کہ "واللہ اے ابوطالب تمہاری قوم نے تو تمہارے ساتھ انصاف کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ جس مشکل میں تم پڑ گئے ہو اس سے تم نکل جاؤ، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم ان کی کوئی بات قبول نہیں کرتے۔" ابوطالب نے جواب دیا کہ "واللہ انہوں نے مجھ سے کوئی انصاف نہیں کیا، مگر تم مجھے چھوڑ کر میرے خلاف اِن کا ساتھ دیتے رہتے ہو اچھا کرو جو تمہارا جی چاہتا ہے۔" ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ اس پر بات بڑھ گئی، اور لڑائی ٹھن گئی اور لوگوں نے ایک دوسرے کے مقابلے کا فیصلہ کر لیا۔

ابوطالب کا بنی ہاشم اور بنی المطّلب کو جمع کرنا

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابوطالب نے بنی ہاشم اور بنی المطّلب کو جمع کیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ سب متفق ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت و حفاظت کریں گے۔ اس بات کو سب نے قبول کر لیا اور ابوطالب کا ساتھ دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ صرف ابولہب اس سے الگ رہا۔

قریش کو ابوطالب کی دھمکی

ابن سعد نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت زور و شور پر ہو رہی تھی اور ابھی ہجرت حبشہ واقع نہ ہوئی تھی، ایک روز ابوطالب اور دوسرے اہل خاندان حضورؐ کے مکان پر آئے اور آپ کو وہاں نہ پایا۔ ابوطالب کو شبہ ہوا کہ حضورؐ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے اسی وقت بنی ہاشم اور بنی المطّلب کے نوجوانوں کو جمع کیا اور اُن سے کہا کہ "ایک ایک خنجر یا کوئی اور ہتھیار لے کر کپڑوں میں چھپا لو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ، جب میں مسجد حرام میں داخل ہوں تو دیکھو کہ قریش کی کونسی مجلس میں ابن الحنظلیہ (یعنی ابوجہل) بیٹھا ہے۔ بس اُس مجلس کے کسی شخص کو جیتا نہ چھوڑنا کیونکہ لامحالہ اُسی پارٹی نے محمدؐ کو قتل کیا ہوگا۔" اس ارادہ سے ابوطالب چلے۔ اتنے میں حضرت زید بن حارثہؓ مل گئے اور ان سے معلوم ہوا کہ حضورؐ بخیریت ہیں۔ دوسرے روز ابوطالب صبح کے وقت حضورؐ کے مکان پر آئے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر بنی ہاشم اور بنی المطّلب کے نوجوانوں سمیت قریش کے سرداروں کی مجلس میں پہنچے اور اُن سے کہا کہ "اے قریش کے لوگو تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میں نے کیا ارادہ کیا تھا؟" انہوں نے کہا نہیں۔ ابوطالب نے سارا ماجرا بیان کیا اور اپنے نوجوانوں سے کہا کہ ذرا اپنی چادریں ہٹاؤ۔ جب انہوں نے چادریں ہٹائیں تو لوگوں نے دیکھا کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تیز ہتھیار ہے۔ پھر ابوطالب نے کہا "خدا کی قسم، اگر تم نے محمدؐ کو قتل کر دیا تو میں تم میں سے ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑوں گا یہاں تک کہ ہم لڑ لڑ کر ختم ہو جائیں۔" اس واقعہ نے قریش کو احساس دلا دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور سب سے زیادہ ابوجہل کے لیے یہ واقعہ سخت ہمت شکن تھا۔

۴۔ قریش کی چھچھوری اور ذلیل حرکات

حضورؐ کے خلاف قریش کے لوگ جو حرکات کر رہے تھے ان میں سے بعض نہایت اوچھی اور چھچھوری تھیں جن سے مقصود آپ کی دل شکنی کرنا اور آپ کو تنگ کرنا تھا۔

حضرت زینبؓ کو طلاق دلوانے کی کوشش

ان میں سے ایک حرکت یہ تھی کہ قریش کے لوگوں نے حضورؐ کے داماد ابوالعاص بن الرّبیع پر دباؤ ڈالا کہ وہ آپ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو بھی اُسی طرح طلاق دے دیں جس طرح ابولہب نے اپنے بیٹوں سے آپ کی صاحبزادیوں حضرت رُقیّہؓ اور اُمِّ کلثومؓ کو طلاق دلوائی تھی۔ یہ ابوالعاص بنی عبدالعُزّٰی بن عبدشمس میں سے تھے، ان کی ماں ہالہ بنت خُویلد حضرت خدیجہؓ کی بہن تھیں، مکّہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے، اپنے مال، اپنی تجارت اور اپنی امانت کے لحاظ سے ان کا شمار شہر کے گنے چنے لوگوں میں ہوتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کا نکاح ہو چکا تھا اور حضرت خدیجہؓ ان کو بالکل اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی تھیں۔ نبوت کے بعد اگرچہ یہ مسلمان نہ ہوئے اور اپنے شرک ہی پر قائم رہے لیکن انہوں نے قریش کے کسی دباؤ کو قبول نہ کیا اور حضرت زینبؓ کو طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔[1] بلاذری نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ سردارانِ قریش نے اُن سے کہا تم زینب کو طلاق دے دو، قریش کی جس عورت کو تم پسند کرو اس سے ہم تمہاری شادی کرائے دیتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا "خدا کی قسم میں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑوں گا، وہ بہترین بیوی ہے"۔ یہی بات طبری اور ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے لکھی ہے، اور مزید یہ بھی بیان کیا ہے کہ قریش کے لوگ ابولہب کے بیٹے عُتبہ کے پاس گئے اور کہا کہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو چھوڑ دے، قریش کی جس عورت سے تو چاہے گا ہم تیری شادی کر دیں گے۔ اس نے کہا کہ تم سعید بن عاص، یا اس کے بیٹے ابان کی لڑکی مجھے دلوا دو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔ چنانچہ اس کی مرضی کی لڑکی اسے دلوا دی گئی اور اس نے حضورؐ کی صاحبزادی کو طلاق دے دی قبل اس کے کہ رخصتی کی نوبت آتی۔

آپؐ کے صاحبزادے کی وفات پر اظہارِ مسرت

اس سے بھی زیادہ کمینہ حرکت یہ تھی کہ حضورؐ کے پہلے صاحبزادے القاسمؓ کے کمسنی میں وفات پا جانے کے بعد

---

[1] واضح رہے کہ حضرت زینبؓ اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ ہی مسلمان ہو چکی تھیں، لیکن چونکہ اُس زمانہ میں مشرک و مومن کے درمیان نکاح کی حُرمت کا کوئی حکم نہ آیا تھا اس لیے وہ ابوالعاص کے نکاح میں رہیں۔ (حاشیہ از مؤلف)

جب آپؐ کے دوسرے صاحبزادے عبداللہ کا بھی کمسنی ہی میں انتقال ہو گیا تو قریش کے لوگوں نے آپؐ کے ساتھ اس ہمدردی کا اظہار بھی نہ کیا جو شرافت و انسانیت کا کم سے کم تقاضا تھا بلکہ اُلٹی اس پر خوشیاں منائیں اور آپؐ کو ابتر کہنا شروع کر دیا یعنی جڑ کٹا آدمی جس کے بعد اس کا کوئی نام لیوا نہ ہو۔ (۸)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ابن سعد اور ابن عساکر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے صاحبزادے حضرت قاسمؓ تھے، ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں اُمّ کلثومؓ، فاطمہؓ اور رقیہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا پھر حضرت عبداللہؓ نے بھی وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا "ان کی نسل ختم ہو گئی، اب وہ ابتر ہیں" (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی ہے)۔ بعض روایات میں اس پر مزید اضافہ یہ ہے کہ عاص نے کہا ان محمداً ابتر، لا ابن لہ یقوم مقامہ بعدہ فاذا مات انقطع ذکرہ واسترحتم منہ "محمدؐ ابتر ہیں، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے جب وہ مر جائیں گے تو ان کا نام بھی ان کے ساتھ ختم ہو جائے گا اور تمہارا ان سے پیچھا چھوٹ جائے گا"۔ عبد بن حمید نے ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے صاحبزادے عبداللہؓ کی وفات پر ابوجہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شمر بن عطیہ سے ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضورؐ کے اس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی کمینہ پن کا مظاہرہ عقبہ بن ابی مُعیط نے بھی کیا تھا۔ عطاء کہتے ہیں کہ جب حضورؐ کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضورؐ کا اپنا چچا ابولہب (جس کا گھر بالکل حضورؐ کے گھر سے متصل تھا) دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ "خوشخبری" دی کہ بتر محمد اللیلۃ "آج رات محمدؐ لاولد ہو گئے یا ان کی جڑ کٹ گئی"۔

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضورؐ پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپؐ سے بگڑے تھے کہ آپؐ صرف اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرتے تھے اور ان کے شرک کو آپؐ نے عَلانیہ رد کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپؐ کو نبوّت سے پہلے حاصل تھا وہ آپؐ سے چھین لیا گیا اور آپؐ گویا برادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپؐ کے چند مٹھی بھر ساتھی بھی سب بے یار و مددگار تھے اور مارے کھدیڑے جا رہے تھے۔ اس پر مزید آپؐ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس موقع پر عزیز رشتہ داروں، قبیلے اور برادری کے لوگوں اور ہمسایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت کے بجائے وہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور وہ باتیں بنائی جا رہی تھیں جو ایک ایسے شریف انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنے تو اپنے، غیروں تک سے ہمیشہ انتہائی نیک سلوک کیا تھا۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ کوثر میں فرمایا: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ "اے نبیؐ، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے" یہ محض کوئی جوابی حملہ نہ تھا بلکہ درحقیقت یہ قرآن کی بڑی اہم پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی تھی جو حرف بحرف

صحیح ثابت ہوئی۔ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس وقت لوگ حضور ہی کو ابتر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے بڑے بڑے سردار کیسے ابتر ہو جائیں گے جو نہ صرف مکہ میں بلکہ پورے ملک عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ ان کے اعوان و انصار موجود تھے، تجارت کے اجارہ دار اور حج کے منتظم ہونے کی وجہ سے تمام قبائل عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے۔ لیکن چند سال نہ گزرنے پائے تھے کہ حالات بالکل پلٹ گئے۔ یا تو وہ وقت تھا کہ غزوہ احزاب ۵ھ ہجری کے موقع پر قریش بہت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے اور حضورؐ کو محصور ہو کر شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی۔ یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ ۸ھ ہجری میں جب آپ نے مکہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا اور انہیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ اس کے بعد ایک سال کے اندر پورا ملک عرب حضورؐ کے ہاتھ میں تھا، ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفود آکر بیعت کر رہے تھے، اور آپؐ کے دشمن بالکل بے بس اور بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ اُن کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی تو ان میں سے آج کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل یا عقبہ بن ابی معیط وغیرہ اعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اُس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔ اِس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر آج دنیا بھر میں درود بھیجا جا رہا ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپؐ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپؐ ہی سے نہیں بلکہ آپؐ کے خاندان اور آپؐ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے انتساب کو باعث عزت و فخر سمجھتے ہیں۔ کوئی سید ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زبیری اور کوئی انصاری۔ مگر نام کو بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضورؐ نہیں بلکہ آپؐ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔ (۹)

قرآن کی آواز سنتے ہی شور مچا دینا

ایک اور ذلیل حرکت جو انہوں نے اختیار کر رکھی تھی وہ یہ تھی کہ جب قرآن پڑھا جاتا تو وہ شور مچانے لگتے اور ہر طرف سے دوڑ پڑتے تھے تاکہ اسے نہ خود سنیں نہ دوسروں کو سننے دیں۔ ۱۱ اس کا ذکر قرآن میں کئی جگہ کیا گیا ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ۔

(حٰم السجدہ۔ آیت ۲۶)

یہ منکرین حق کہتے ہیں اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل

ڈالو، شاید کہ اس طرح تم غالب آجاؤ۔"

یہ کفارِ مکہ کے اُن منصوبوں میں سے ایک تھا جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کو ناکام کرنا چاہتے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ قرآن اپنے اندر کس بلا کی تاثیر رکھتا ہے، اور اس کو سنانے والا کس پائے کا انسان ہے، اور اس شخصیت کے ساتھ اُس کا طرزِ ادا کس درجہ مؤثر ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے عالی مرتبہ شخص کی زبان سے اِس دلکش انداز میں اِس بے نظیر کلام کو جو سُنے گا وہ آخرکار گھائل ہو کر رہے گا۔ اس لیے انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ اِس کلام کو نہ خود سنو، نہ کسی کو سننے دو۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی اُسے سنانا شروع کریں، شور مچاؤ، تالی پیٹ دو، آوازے کسو، اعتراضات کی بوچھاڑ کر دو، اور اتنی آواز بلند کرو کہ اُن کی آواز اس کے مقابلے میں دب جائے۔ اِس تدبیر سے وہ یہ اُمید رکھتے تھے کہ اللہ کے نبی کو شکست دیں گے۔ (۱۰)

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ (المعارج آیات ۳۶ - ۳۷)۔

"پس اے نبی کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے گروہ در گروہ تمہاری طرف دوڑے چلے آتے ہیں؟"

یہ اُن لوگوں کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ اور تلاوتِ قرآن کی آواز سُن کر مذاق اُڑانے اور آوازے کسنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے۔ (۱۱)

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل۔۱۱۰)

"اور اپنی نماز نہ بہت بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے۔ ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔"

مسند احمد میں ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں یا دارِ ارقم میں نماز پڑھتے وقت بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے تو کفار شور مچانے لگتے اور بسا اوقات گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ اس پر حکم ہوا کہ نہ تو اتنے زور سے پڑھو کہ کفار سُن کر ہجوم کر آئیں اور نہ اِس قدر آہستہ پڑھو کہ تمہارے اپنے ساتھی بھی نہ سُن سکیں۔ (۱۲)

قرآن کو اُلٹے معنی پہنا کر لوگوں کو بہکانا

کفارِ مکہ کی اِس تدبیر کا ذکر بھی قرآن میں کیا گیا ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۗ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ

يَأْتِيْ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ لا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ - (حٰمٓ السجدہ آیت ۴۰)

"جو لوگ ہماری آیات کو اُلٹے معنی پہناتے ہیں وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو، تمہاری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

اِلحاد کے معنی ہیں اِنحراف، سیدھی راہ سے ٹیڑھی راہ کی طرف مڑ جانا، کج رَوی اختیار کرنا۔ اللہ کی آیات میں الحاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرے۔ آیاتِ الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب تو نہ لے، باقی ہر طرح کے غلط معنی اُن کو پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے۔ کفارِ مکہ قرآنِ مجید کی دعوت کو زک دینے کے لیے جو چالیں چل رہے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرآن کی آیات سُن کر جاتے اور پھر کسی آیت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر، کسی آیت میں لفظی تحریف کرکے، کسی فقرے یا لفظ کو غلط معنی پہنا کر طرح طرح کے اعتراضات جڑتے اور لوگوں کو بہکاتے پھرتے تھے کہ لو سنو آج ان نبی صاحب نے کیا کہہ دیا ہے۔ (۱۳)

مسلمانوں کو فضول بحثوں میں اُلجھانا

قرآن مجید میں کفار کے اِس رویّہ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ - (الشوریٰ۔ آیت ۱۶)

"اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے دین کے معاملے میں جھگڑے کرتے ہیں اُن کی حجت بازی اُن کے رب کے نزدیک باطل ہے۔"

یہ اشارہ ہے اُس صورتِ حال کی طرف جو مکے میں اُس وقت آئے دن پیش آ رہی تھی۔ جہاں کسی کے متعلق لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے۔ مدتوں اس کی جان ضیق میں کیے رکھتے، نہ گھر میں اُسے چین لینے دیا جاتا نہ محلے اور برادری میں۔ جہاں بھی وہ جاتا ایک نہ ختم ہونے والی بحث چھڑ جاتی جس کا مدعا یہ ہوتا کہ کسی طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر اُسی جاہلیت کی طرف پلٹ آئے جس سے وہ نکلا ہے۔ (۱۴)

مسلمانوں کی تضحیک و تذلیل

قرآن مجید میں کفار کے اِس رویّے کا بھی ذکر کیا گیا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۝ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ (المطففین۔ آیات ۲۹ تا ۳۳)۔

"مجرم لوگ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے اور جب اُن کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے، اور جب اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے، اور جب انہیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں۔ حالانکہ وہ اُن پر نگراں بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔"

مزے لیتے ہوئے پلٹنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد جب وہ اپنے گھروں کی طرف جاتے تو یہ خیال کرتے ہوئے جاتے تھے کہ آج تو مزا آگیا، ہم نے فلاں مسلمان کا مذاق اڑا کر اور اس پر آوازے اور پھبتیاں کس کر خوب لطف اٹھایا اور لوگوں میں اس کی اچھی گت بنی۔ (۱۵)

بلاذری نے انساب الاشراف میں حضرت عروہ بن زبیرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمار بن یاسرؓ، خبابؓ بن الارت، صہیبؓ بن سنان، بلالؓ بن رباح، ابو فکیہہؓ اور عامرؓ بن فہیرہ جیسے لوگوں کو قریش کے سردار مسجد حرام میں بیٹھے دیکھتے تھے تو مذاق اڑاتے ہوئے کہتے تھے کہ یہ ہیں اس شخص کے ساتھی، کیا ہمارے درمیان صرف یہی لوگ اللہ کے فضل کے مستحق رہ گئے تھے؟

ناواقف لوگوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنا

اس کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ (النحل: آیت ۲۴)

"اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے، تو کہتے ہیں "اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں"۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا جب اطراف و اکناف میں پھیلا تو مکے کے لوگ جہاں کہیں جاتے تھے اُن سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارے ہاں جو صاحب نبی بن کر اُٹھے ہیں وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے مضامین کیا ہیں؟ وغیرہ۔ اس طرح کے سوالات کا جواب کفارِ مکہ ہمیشہ ایسے الفاظ میں دیتے تھے جن سے سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لائی ہوئی کتاب کے متعلق کوئی نہ کوئی شک بیٹھ جاتے، یا کم از کم اُس کو آپ سے اور آپ کی نبوت کے معاملے سے دلچسپی باقی نہ رہے۔

(۱۶)

۴۔ "ثقافتی" پروگرام

ان گھٹیا تدبیروں کے علاوہ ایک اور تدبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو زک دینے کے لیے یہ بھی سوچی گئی کہ لوگوں کو قصوں کہانیوں اور گانے بجانے اور عیش و عشرت میں غرق کر کے اس قابل ہی نہ رکھا جائے کہ وہ اُن سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کر سکیں جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے سامنے پیش فرما رہے تھے۔

ابن ہشام نے سیرت میں محمد بن اسحاق کی روایت نقل کی ہے کہ بنی عبدالدار کے نضر بن الحارث بن کلدہ نے قریش کے ایک مجمع میں کہا "تم لوگ محمدؐ کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تمہارے درمیان نوعمر جوان تھا تو تمہارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا، سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب جبکہ اس کے بال سفید ہونے کو آگئے اور وہ تمہارے پاس وہ چیزیں لے کر آیا جو وہ لایا ہے تو تم کہتے ہو یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ بخدا وہ ساحر نہیں ہے، ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھاڑ پھونک سے ہم واقف ہیں۔ بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کی تُک بندیاں سُنی ہیں اور جیسی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں اُن کا ہمیں علم ہے۔ بخدا وہ شاعر بھی نہیں ہے، شعر کی تمام اصناف سے ہم واقف ہیں اور اُس کا کلام ان میں سے کسی صنف میں نہیں آتا۔ بخدا وہ مجنوں بھی نہیں ہے، مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور جیسی بہکی بہکی وہ باتیں کرتا ہے کیا اس سے ہم بے خبر ہیں؟ اے سردارانِ قریش، کچھ اور بات سوچو، جس چیز کا مقابلہ تمہیں درپیش ہے وہ اِس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو"۔ اس کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی کہ عجم سے رستم و اسفندیار کے قصے لا کر پھیلائے جائیں تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ انہیں قرآن سے زیادہ عجیب معلوم ہوں۔ چنانچہ کچھ دنوں اس پر عمل کیا گیا اور خود نضر نے داستان گوئی شروع کر دی۔ (۱۷)

یہی روایت اسبابُ النزول میں واحدی نے کلبی اور مقاتل سے نقل کی ہے۔ اور ابن عباسؓ نے اس پر مزید اضافہ کیا ہے کہ نضر نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے اُس پر اپنی کوئی لونڈی مسلط کر دیتا اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گانا سنا تاکہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل اُدھر سے ہٹ جائے۔ (۱۸)

۵۔ جھوٹ کی مہم اور اُس کے اثرات

ان تدبیروں کے ساتھ قریش نے حضورؐ کی دعوتِ عام شروع ہوتے ہی ہر طرف آپ کے خلاف جھوٹ کی ایک مہم بھی چلا دی تاکہ لوگوں کو آپ سے بدگمان اور متنفر کیا جائے۔ اس مہم میں چونکہ صداقت کا کوئی سوال نہ تھا بلکہ

محض بدنام کرنا اور لوگوں کو آپ سے دُور بھگانا مقصود تھا اس لیے جس کے مُنہ میں جو آتا وہ کہتا پھرتا تھا کوئی کہتا کہ آپ شاعر ہیں۔ کوئی کہتا کہ آپ کاہن ہیں۔ کوئی کہتا ساحر (جادوگر) ہیں۔ کوئی کہتا سحر زدہ ہیں یعنی کسی نے آپ پر جادو کر دیا ہے۔ کوئی کہتا کہ آپ مجنون ہیں غرض کوئی ایک بات نہ تھی جو لوگ آپ کے متعلق کہتے ہوں۔ یہ چرچے صرف مکہ کے ہر گلی کوچے ہی میں کیے جاتے تھے بلکہ اِسی قسم کی باتیں ہر اُس شخص سے کی جاتی تھیں جو مکہ میں زیارت یا تجارت یا کسی اور غرض سے آتا تھا اور کوشش کی جاتی تھی کہ کوئی آپ کی بات کسی طرح سے سُننے ہی نہ پائے جس سے اس کے متاثر ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ (19)

پہلے حج کے موقع پر قریش کی مشاورت

چند مہینے اِس حال پر گزر رہے تھے کہ حج کا زمانہ آ گیا اور مکّے کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اِس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے اِن قافلوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر ان حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگہ جگہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بے نظیر اور مؤثر کلام سُنانا شروع کر دیا، تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اِس سے متاثر ہو جائے۔ ابنِ اسحاق، حاکم، اور بیہقی نے عمدہ سند کے ساتھ یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اِس موقع پر قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی اُن کے اندر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اِس پر اتفاق ہو جانے کے بعد وَلید بن مُغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لیجیے جسے سب بالاتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو کاہن کہیں گے ولید نے کہا نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہیں، ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے، جیسی باتیں وہ گنگناتے ہیں اور جس طرح کے فقرے وہ جوڑتے ہیں، قرآن کو اُس سے دُور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ اور لوگ بولے، انہیں مجنون کہا جائے۔ وَلید نے کہا وہ مجنون بھی نہیں ہیں ہم نے دیوانے اور پاگل دیکھے ہیں۔ اِس حالت میں آدمی جیسی بہکی بہکی باتیں اور اُلٹی سیدھی حرکات کرتا ہے وہ کسی سے چھپی ہُوئی نہیں ہیں۔ کون باور کرے گا کہ محمد جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانے کی بڑ ہے یا جنون کے دَورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے؟ لوگوں نے کہا اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ وَلید نے کہا وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے، تو پھر ان کو ساحر کہا جائے۔ وَلید نے کہا وہ ساحر بھی نہیں ہیں۔ جادوگروں کو ہم جانتے ہیں اور اپنے جادو کے لیے جو طریقے وہ اختیار کرتے ہیں ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی محمد پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر وَلید نے کہا تم اِن باتوں میں سے جو بات بھی کہو گے لوگ اس کو ناروا الزام سمجھیں گے۔

خدا کی قسم اِس کلام میں بڑی حلاوت ہے، اِس کی جڑ بڑی گہری اور اِس کی ڈالیاں بڑی ثمر دار ہیں۔ ابنِ جریر نے اپنی تفسیر میں عکرمہ کی روایت سے یہ اضافہ کیا ہے کہ اِس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اُس نے کہا تو تیری قوم تم سے راضی نہ ہو گی جب تک تم محمدؐ کے بارے میں کوئی بات نہ کہو۔ ولید نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے، یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اُس کے باپ، بھائی، بیوی بچوں اور سارے خاندان سے جُدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اِس بات کو سب نے قبول کر لیا پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اُٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے، اس سے ہوشیار رہنا۔ (۲۰)

اِس واقعہ پر قرآن کا تبصرہ

ولید بن مُغیرہ کی اِسی حرکت پر سُورہ مدثر آیات ۱۱ تا ۲۵ میں یہ تبصرہ فرمایا گیا ہے:

"چھوڑ دو مجھے اور اُس شخص کو" (یعنی اُس سے نپٹ لونگا، تمہیں اس کی فکر کی ضرورت نہیں) "جسے میں نے اکیلا پیدا کیا" (یعنی وہ کچھ ساتھ لے کر دُنیا میں نہیں آیا تھا) "بہت سا مال اس کو دیا اور اس کے ساتھ حاضر رہنے والے بیٹے دیئے" (یعنی اس کو دس بارہ جوان جوان لڑکے دیئے، جو سب نامور ہیں، مجلسوں میں اس کے ساتھ حاضر رہتے ہیں (خالدؓ بن ولید جیسے لائق فرزند بھی ان میں شامل تھے)) "اور اس کے لیے ریاست کی راہ ہموار کی، پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں اس کو اور زیادہ دُوں۔ ہرگز نہیں میں تو عنقریب اُسے ایک کٹھن چڑھائی چڑھواؤں گا۔ اس نے سوچا اور کچھ بات بنانے کی کوشش کی۔ تو خدا کی مار اُس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔

ہاں، خدا کی مار اُس پر کیسی بات بنانے کی کوشش کی۔ پھر لوگوں کی طرف دیکھا پھر پیشانی سکیڑی اور منہ بنایا پھر پلٹا اور تکبر میں پڑ گیا۔ آخر کار بولا تو یہ کہ یہ قرآن کچھ نہیں ہے مگر ایک جادو جو پہلے سے چلا آرہا ہے۔ یہ تو ایک انسانی کلام ہے۔"

اوپر جس واقعہ کا ہم ذکر چکے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ولید دل میں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا قائل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اپنی قوم میں اپنی ریاست و وجاہت کو بچانے کے لیے اپنے ضمیر سے جس طرح وہ لڑا، اور جس شدید ذہنی کشمکش میں کافی دیر تک مبتلا رہنے کے بعد آخر کار اس نے قرآن کے خلاف ایک بات بنائی اس کی تصویر اِن آیات میں کھینچ دی گئی ہے۔ (۲۱)

داعی اور وسیع پیمانے پر جھوٹ

یہ جھوٹ کی مہم صرف حج ہی کے موقع پر نہیں چلتی تھی بلکہ سال کے بارہ مہینے، اور مہینوں کے ۳۰ دن شب و روز

اِس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مکہ کے عوام کو بھی ہر وقت آپ کے خلاف بھڑکایا جاتا تھا۔ باہر سے آنے والوں کو بھی آپ سے خبردار رہنے اور آپ کے قریب نہ جانے کی تاکید کی جاتی تھی۔ عرب کے میلوں، عکاظ، مجنّہ اور ذوالمجاز میں بھی قریش کے وفد پھیل جاتے تھے اور آپ کے خلاف ہر طرح کے وسوسے لوگوں کے دلوں میں ڈالتے تھے۔ اور خاص طور سے ہر سال حج کے موقع پر تو اُن کے وفد حاجیوں کے ایک ایک پڑاؤ پر جاتے اور ہر وہ ممکن بات آپ کی مخالفت میں پھیلاتے تھے جس سے لوگ آپ کی بات سننے سے پرہیز کرنے لگیں اور آپ کی ذات کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھنے لگیں۔

مکہ سے باہر اسلام کی اشاعت

قریش اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کو زک دے دیں گے لیکن دراصل اِس طرح انہوں نے خود ہی عرب کے گوشے گوشے تک آپ کا اسم گرامی پہنچا دیا۔ آپ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی وہ قریش کی اس مہم سے تھوڑی مدت ہی میں ہو گئی۔ عام لوگ چاہے اس سے بدگمان ہی ہو گئے ہوں، مگر بہت سے دلوں میں آپ سے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو وہ کونسا ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہو رہا ہے، اور بہت سے لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ وہ بات سُنی تو جائے جس سے ہم کو اتنا خوف دلایا جا رہا ہے۔ اس طرح مکہ سے باہر عرب کے دوسرے علاقوں میں اسلام کے پہنچنے کا راستہ کھل گیا۔

طُفیل بن عمرو دَوسی کا اسلام

یہ قبیلہ دَوس کے ایک بڑے سردار اور اس کے اشراف میں سے تھے۔ ابن اسحاق اور ابن سعد نے ان کے اسلام لانے کا قصہ خود ان کی روایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلۂ دوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف خوب میرے کان بھرے۔ یہاں تک کہ میں آپ سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ آپ سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم میں حاضری دی تو آپ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو بڑا اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں ایک شاعر ہوں جوان مرد ہوں، عقل رکھتا ہوں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ صحیح اور غلط میں تمیز نہ کر سکوں، آخر کیوں نہ اِس شخص سے مل کر معلوم کروں کہ یہ کیا کہتا ہے چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر واپس چلے تو میں آپ کے پیچھے ہو لیا اور آپ کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے آپ کے متعلق مجھ سے یہ کچھ کہا تھا اور میں آپ سے اس قدر بدگمان ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی تھی تاکہ آپ کی آواز نہ سننے پاؤں لیکن ابھی

جو چند کلمے میں نے آپ کی زبان سے سنے ہیں وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیے، آپ کیا کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں مجھ کو قرآن کا ایک حصّہ سُنایا اور میں اس سے اِس قدر متأثر ہُوا کہ اُسی وقت ایمان لے آیا۔ پھر جب میں گھر واپس گیا تو میرے بوڑھے باپ آئے۔ میں نے کہا اَبّا جان مجھ سے دُور رہیے۔ نہ میں آپ کا کوئی ہوں نہ آپ میرے کوئی۔ انہوں نے پُوچھا کیوں؟ میں نے کہا میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میں نے دینِ محمدؐ کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ اُنہوں نے کہا بیٹا جو تیرا دین سو میرا دین۔ میں نے کہا جا کر غسل کیجیے اور کپڑے پاک کیجیے پھر میرے پاس آئیے تاکہ میں آپ کو اُس دین کی تعلیم دُوں جو میں سیکھ کر آیا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مسلمان ہو گئے۔ پھر میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے بھی وہی بات کہی جو اپنے باپ سے کہی تھی۔ اس نے کہا میرے ماں باپ تم پر قربان یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ میں نے کہا میرے اور تیرے درمیان اسلام نے تفریق کر دی ہے اور میں دینِ محمدؐ کا پیرو ہو گیا ہوں۔ اُس نے کہا تو مجھے اپنا دین بتا دو۔ میں نے کہا جا ذوالشّریٰ (قبیلہ دوس کے بُت) کے حِمیٰ* میں جا اور وہاں پہاڑ سے گرنے والے چشمے سے غسل کر۔ اُس نے کہا "ذوالشّریٰ سے میرے بچّوں کو تو کوئی خطرہ نہ ہوگا؟" میں نے کہا "نہیں میں اس کا ذمّہ لیتا ہوں"۔ وہ گئی اور غسل کر کے آ گئی۔ میں نے اُس کے سامنے اسلام پیش کیا اور وہ بھی مسلمان ہو گئی۔ پھر میں نے دَوس میں اسلام کی تبلیغ شروع کی مگر وہ قبول کرنے میں متأمل تھے۔ میں حضورؐ کے پاس پھر مکّہ واپس گیا اور عرض کیا کہ دَوس پر غفلت طاری ہے جو میری راہ میں حائل ہو رہی ہے۔ آپ ان کے حق میں دُعا فرمائیں حضورؐ نے دُعا فرمائی کہ خدایا دَوس کو ہدایت دے۔ اور مجھے ہدایت فرمائی کہ جا کر اپنی قوم میں تبلیغ کرو اور ان سے نرمی کے ساتھ برتاؤ کرو۔ چنانچہ میں دوس میں دعوت کا کام کرتا رہا یہاں تک کہ جنگِ خیبر کے موقع پر میں وہاں سے ۷۰۔۸۰ گھرانوں کو لے کر پہنچا۔

حضرت ابُوذر غِفاریؓ کا اِسلام

یہ قبیلہ بنی غفار سے تھے جو رہزنی کے لیے مشہور تھا۔ ابوذرؓ خود (حضرت ابوذرؓ) ایک زمانہ میں ایسے زبردست ڈاکو تھے کہ اکیلے کسی قافلے پر اس طرح جا پڑتے تھے جیسے کوئی درندہ ٹوٹ پڑتا ہے۔ مگر اسلام لانے سے تین سال پہلے ان کا دل پلٹ گیا تھا اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح کی نماز پڑھنی شروع کر دی تھی۔ مسند احمد اور ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ میں تین سال پہلے ہی سے اللہ کے لیے جس طرف بھی رُخ ہوتا تھا

---

* حِمیٰ اس رقبے کو کہتے ہیں جو کسی سردار، رئیس یا دیوتا کے لیے مخصوص ہو اور جس میں داخل ہونا گویا اس کے مالک کا غضب مول لینا ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

پڑھا کرتا تھا۔" اُن کا اصل نام جُندب بن جُنادہ تھا۔ بخاری کی روایت ہے کہ جب حضورؐ کی بعثت کی
خبر پہنچی تو اُنہوں نے اپنے بھائی کو (جن کا نام مُسند احمد میں اُنیس بیان کیا گیا ہے) بھیجا کہ مکہ جا کر اُس شخص
کے متعلق معلومات حاصل کریں جو کہتا ہے کہ میں نبی ہوں۔ وہ گیا اور واپس آ کر اُس نے اطلاع دی کہ وہ
مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں اور ایسا کلام پیش کرتے ہیں جو شعر نہیں ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے کہا میں جو
کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا وہ تم نہیں لائے۔ پھر وہ خود مکہ گئے اور مسجد حرام میں حضورؐ کو تلاش کرنے لگے مگر چونکہ
آپؐ کو پہچانتے نہ تھے اور کسی سے پوچھنا بھی نہ چاہتے تھے، اس لیے مل نہ سکے۔ حضرت علیؓ نے ان کو دیکھا کہ
یہ کوئی اجنبی مسافر ہیں، مگر ان سے کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ تیسرے دن حضرت علیؓ نے کہا کیا چیز تمہیں لائی
ہے؟ انہوں نے کہا اگر تم وعدہ کرو کہ مجھے میرے مقصود تک پہنچا دو گے تو میں تمہیں بتاؤں کہ کیوں آیا ہوں۔
حضرت علیؓ نے وعدہ کیا، تب انہوں نے اپنا مقصد بیان کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا وہ یقیناً حق پر ہیں اور اللہ کے
رسول ہیں۔ کل صبح تم میرے پیچھے پیچھے آنا۔ اگر میں چلتا رہوں تو تم بھی چلتے رہنا اور جہاں میں داخل ہوں وہاں
داخل ہو جانا۔ اور اگر میں نے کوئی ایسی بات دیکھی جس سے مجھے تمہارے حق میں خطرہ محسوس ہوا تو میں اس
طرح کھڑا ہو جاؤں گا جیسے پانی گرا رہا ہوں۔ یہ دیکھ کر تم رک جانا۔ غرض اس طرح حضرت ابوذرؓ حضورؐ کی خدمت
میں پہنچے، آپؐ کا کلام سُنا اور اُسی وقت مسلمان ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا "اب تم اپنی قوم میں واپس جاؤ
اور لوگوں کو دین سے باخبر کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہیں میرے حال کی اطلاع ملے"۔ حضرت ابوذرؓ نے
عرض کیا کہ جس خدا نے آپؐ کو بھیجا ہے اُس کی قسم میں اہلِ مکہ کے درمیان حق کا اظہار کر کے رہوں گا۔ چنانچہ وہ
مسجد حرام پہنچے اور پکار کر کہا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ یہ سُنتے ہی لوگ ان پر ٹوٹ
پڑے اور اتنا مارا کہ وہ گر پڑے۔ یہ حال دیکھ کر حضرت عباسؓ ان کے اور لوگوں کے درمیان حائل ہو گئے
اور کہا کم بختو، تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ یہ بنی غفار میں سے ہے جو تمہارے شام کے تجارتی راستے پر رہتے ہیں۔
اس طرح انہوں نے ابوذرؓ کو ان سے چھڑایا۔ دوسرے روز انہوں نے پھر یہی کیا۔ اور پھر لوگوں نے ان کو مارا
اور پھر حضرت عباسؓ نے ان کو چھڑایا۔

امام احمدؒ نے مُسند میں خود حضرت ابوذرؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں اور میرا بھائی اُنیس اور میری
ماں مکّے کے باہر ٹھیرے ہوئے تھے۔ اُنیس نے کہا میں ذرا مکّہ ہو کر آتا ہوں، تم میرا انتظار کرو۔ پھر وہ بڑی
دیر کے بعد آیا تو میں نے پوچھا اتنی دیر کہاں لگی؟ اُس نے کہا میں ایک شخص سے ملا جو کہتا ہے کہ میں اللہ کا
رسول ہوں اور اللہ نے اُسے اُسی دین پر بھیجا ہے جو تمہارا دین ہے (یعنی شرک کا انکار اور توحید کا اقرار)۔
میں نے پوچھا کہ لوگ اسے کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، کاہن ہے، ساحر ہے۔ اُنیس

خود شاعر تھا۔ اُس نے کہا میں نے کاہنوں کی باتیں بھی سُنی ہیں، شعر بھی جانتا ہوں۔ مگر اُس کی باتوں کا ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خدا کی قسم وہ سچا ہے اور لوگ جھوٹے ہیں۔ میں نے کہا تم میرے پیچھے دیکھ بھال کرتے رہنا تاکہ میں خود وہاں جاؤں؟ اُس نے کہا ہاں، مگر اہلِ مکّہ سے ہوشیار رہنا کیونکہ وہ اس کی مخالفت پر تُلے ہوئے ہیں۔ میں مکّہ پہنچا اور ایک شخص کو کمزور سا پاکر اس سے پُوچھا کہ وہ شخص کہاں ہے جسے لوگ صابی (دین سے پھرا ہوا) کہتے ہیں۔ اِس پر اُس شخص نے میری طرف اشارہ کر دیا اور لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور جو ہاتھ میں آیا مجھ پر دے مارا، یہاں تک کہ میں غش کھا کر گر پڑا۔ ہوش میں آکر حرم میں گیا۔ زمزم کا پانی پیا، زخم دھوئے، اور تیس دن تک کعبے کے پردوں کے پیچھے چھُپا رہا۔ اِس پُوری مدّت میں زمزم کے سوا میری کوئی غذا نہ تھی جس سے نہ صرف یہ کہ میری بھُوک مٹ جاتی تھی بلکہ میں پہلے سے کچھ زیادہ ہی موٹا ہو گیا۔

اس کے بعد حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ ایک روز رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت ابوبکرؓ حرم میں آئے، حجرِ اسود کو بوسہ دیا، طواف کیا اور نماز پڑھی۔ میں نے نکل کر پہلی مرتبہ اُن کو اسلامی طریقہ پر سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا علیک السّلام۔ پھر پوچھا تم کون ہو؟ میں نے کہا بنی غفار میں سے ہوں۔ پُوچھا یہاں کب سے ہو؟ میں نے کہا تیس شب و روز سے۔ پُوچھا تمہیں کھلاتا کون تھا؟ میں نے کہا زمزم کے سوا میری کوئی غذا نہ تھی، اُس سے نہ صرف میری بھُوک مٹی بلکہ میں کچھ موٹا ہی ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا وہ برکت والا پانی ہے اور پانی ہی نہیں غذا بھی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا مجھے اجازت دیجیے کہ آج رات یہ میرے ہاں کھانا کھائیں۔ حضورؐ نے اجازت دے دی۔ آپؐ تشریف لے گئے اور میں ابوبکرؓ کے ساتھ اُن کے ہاں گیا اور انہوں نے مجھے طائف کی کشمش کھلائی۔ پھر میں کچھ مدّت تک ٹھیرا رہا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا "مجھے ایک ایسی سرزمین کی طرف نشان دہی کی گئی ہے جہاں نخلستان ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ یثرب کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ کیا تم میرا پیغام اپنی قوم میں پہنچاؤ گے؟ شاید کہ وہ ان کو فائدہ بخشے اور تمہیں بھی اس کا اجر ملے" حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ پھر میں اپنے بھائی اُنیس کے پاس واپس پہنچا۔ انہوں نے پُوچھا کیا کر آئے؟ میں نے کہا اسلام لے آیا اور تصدیق کی۔ اُنیس نے کہا میں بھی تمہارے دین سے الگ نہیں رہنا چاہتا، میں نے بھی اسلام قبول کیا اور تصدیق کی۔ ہماری ماں بولیں میں بھی تم دونوں کے دین سے الگ نہیں رہنا چاہتی۔ میں نے بھی اسلام قبول کیا اور تصدیق کی۔ اس کے بعد ہم اپنی قوم غفار میں پہنچے اور ان میں سے کچھ لوگ حضورؐ کی مدینہ تشریف آوری سے پہلے ہی مسلمان ہو گئے۔ اُن کو خفاف بن ایماء بن رَحَضَۃ الغفاری نماز پڑھایا کرتے تھے کیونکہ وہی قوم کے سردار تھے۔ پھر ہجرت کے بعد باقی بنی غفار بھی مسلمان ہو گئے۔ (مُسلم نے بھی یہ قصّہ اسی طرح روایت کیا ہے۔ طبرانی نے اَوسط میں اس قصّے کی زیادہ تفصیلات نقل کی ہیں)۔

ابن سعد کی روایت میں بھی اگرچہ یہ قصہ اُسی طرح درج ہے جس طرح اُوپر گزرا، مگر اس کے بیچ میں حضرت ابوذرؓ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ جب میں کعبے کے پردوں کے پیچھے چھپا ہُوا تھا اور طواف میں دو عورتوں کے سوا کوئی نہ تھا تو میں نے سُنا کہ وہ اساف اور نائلہ کا ذکر کر رہی ہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا ان دونوں کا نکاح کرا دو۔ اس پر وہ بہت بگڑیں اور کہنے لگیں، کاش جا رہے آدمیوں میں سے کوئی یہاں ہوتا۔ اُدھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ پہاڑی سے اُترتے ہُوئے تشریف لا رہے تھے۔ یہ عورتیں شاید اُن کو جانتی نہ تھیں۔ انہوں نے پُوچھا تم کیوں ناراض ہو رہی ہو؟ وہ کہنے لگیں ایک صابی (یعنی بدمذہب) کعبے کے پردوں میں چھپا ہُوا ہے۔ حضورؐ نے پوچھا اُس نے تمہیں کیا کہا؟ کہنے لگیں ایسی بُری بات کہہ دی جو مُنہ سے نکالنے کے قابل نہیں۔

عَمْرو بن عَبَسَہ سُلَمی کا اسلام

یہ بنی سُلیم میں سے تھے۔ اِن کا خیال تھا کہ یہ چوتھے مسلمان ہیں۔ مگر جو واقعہ انہوں نے خود اپنے مسلمان ہونے کا بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی دعوتِ عام شروع ہونے کے بعد حضورؐ کا ذکر سُن کر مسلمان ہوئے تھے۔ ابن سعد کی ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ عکاظ کے بازار میں حضورؐ سے ملے اور وہیں مسلمان ہوئے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ اُس وقت تبلیغی دَورے شروع کر چکے تھے۔ دوسری روایت جو ابن سعد اور مسلم نے ابواُمامہ باہلی سے نقل کی ہے اس میں عَمْرو بن عبسہ خود کہتے ہیں کہ میں جاہلیت میں لوگوں کو گمراہی پر سمجھتا تھا اور بُتوں کو ہیچ خیال کرتا تھا پھر میں نے سُنا کہ مکہ میں ایک شخص ہے جو کچھ خبریں دیتا اور کچھ باتیں بیان کرتا ہے چنانچہ میں مکہ گیا اور میں نے دیکھا کہ حضورؐ چھپے ہُوئے ہیں اور قوم آپؐ کے معاملہ میں دو حصّوں پر منقسم ہے۔ میں احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ آپ تک پہنچا اور آپؐ سے پُوچھا آپ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا نبی۔ میں نے پُوچھا نبی کیا ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ کا رسُول۔ میں نے پوچھا کیا اللہ نے آپ کو بھیجا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں۔ میں نے پوچھا کس تعلیم کے ساتھ بھیجا ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ کہ صرف اللہ کو معبود مانا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ بُتوں کو توڑ دیا جائے۔ اور صلۂ رحمی کی جائے۔ میں نے آپؐ سے پُوچھا کہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا آزاد بھی ہیں اور غلام بھی۔ اس وقت ابوبکرؓ اور بلالؓ موجود تھے (اسی سے اُن کو غلط فہمی ہُوئی کہ چوتھے وہ ہیں)۔ میں نے عرض کیا میں آپ کے ساتھ رہُوں گا۔ آپؐ نے فرمایا اِس زمانے میں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ جب تم سنو کہ میں ظاہر ہو گیا ہُوں تو مجھ سے آملنا۔ چنانچہ میں اپنے لوگوں میں واپس چلا گیا۔

ضمادؓ الازدی کا اسلام

یہ ازد شنوأۃ یمن سے تھے اور جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ اور حافظ ابن حجرؒ اور حافظ ابن حبانؒ کا بیان ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں یہ حضورؐ کے دوست تھے۔ مسلم، نسائی، بیہقی اور ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ مکہ آئے تو یہاں کے اوباشوں نے ان سے کہا کہ محمدؐ مجنون ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے بتاؤ وہ کہاں ہیں، شاید اللہ میرے ہاتھ سے آپؐ کو شفا دے دے۔ چنانچہ وہ آپؐ کے پاس آئے اور کہا میں جھاڑ پھونک کا کام کرتا ہوں اور میرے ہاتھ سے اللہ جس کو چاہتا ہے شفا دے دیتا ہے۔ آئیے میں آپؐ کا علاج کر دوں۔ حضورؐ نے پہلے کلمہ شہادت ادا کیا پھر اللہ کی حمد کی اور اس کے بعد کچھ کلمات ارشاد فرمائے ضماد کو یہ باتیں بہت پسند آئیں اور انہوں نے کہا پھر فرمایئے۔ آپؐ نے تین مرتبہ ان کا اعادہ کیا۔ ضماد نے کہا میں نے ایسا کلام کبھی نہیں سنا۔ میں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے۔ شاعروں کا کلام سنا ہے۔ ساحروں کا کلام سنا ہے مگر ایسا کلام نہیں سنا۔ یہ تو سمندر کی تہ تک پہنچتا ہے۔ پھر انہوں نے اسلام قبول کیا اور اپنی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کا اسلام

یہ بھی یمن سے آکر مکہ میں اسلام لائے تھے۔ پھر واپس جاکر اپنے بھائیوں ابو بردہ اور ابو رہم اور تقریباً ۵۰ آدمیوں کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد یمن سے یہ سب مسلمان ایک کشتی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور ہوا نے ان کو حبش کے ساحل پر لا پھینکا جہاں یہ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور دوسرے مہاجرین سے مل گئے۔ یہ ابن سعد اور ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے۔ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ حبش نہیں گئے تھے بلکہ جب یہ مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے تو ان کی کشتی ان مہاجرین حبشہ کی کشتی کے ساتھ مل گئی جو مدینہ کی طرف جا رہے تھے اور ایک ساتھ حضورؐ کے پاس خیبر پہنچے۔

معیقیبؓ بن ابی فاطمہ الدوسی کا اسلام

ابن سعد کا بیان ہے کہ یہ بھی قبیلہ دوس کے تھے اور مکہ میں اسلام لائے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ مسلمان ہو کر یہ اپنے وطن واپس چلے گئے تھے اور دوسری روایت کے مطابق دوسری ہجرت حبشہ میں یہ بھی شامل تھے۔ ابن حجرؒ اور ابن عبدالبرؒ نے ان کا شمار ان لوگوں میں کیا ہے جو مکہ میں اسلام لائے تھے اور ہجرت حبشہ ثانیہ میں شریک ہوئے تھے۔

جعالؓ بن سراقہ

یہ بھی ضمرہ یمن سے تھے۔ ابن سعد اور ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ یہ بھی مکہ میں اسلام لائے۔

عبداللہؓ اور عبدالرحمٰنؓ کنانی

ابنِ سعد کا بیان ہے کہ یہ دونوں بھائی بنی کنانہ کے ایک شخص مُعتِّب کے بیٹے تھے اور انہوں نے بھی مکہ میں اسلام قبول کیا۔

بُریدہ بن الحُصَیبؓ کا اسلام

ابن سعد اور ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ یہ بنی خُزاعہ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے جو خزاعہ کے خاندانوں سے الگ ہو گئی تھی۔ ہجرت کے وقت جب حضورؐ مکہ سے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے اُس وقت غمیم کے مقام پر یہ آپؐ سے ملے اور ان کے ساتھ ۸۰ گھرانوں نے اسلام قبول کیا۔ یہی ابن حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلے سے یہ لوگ اسلام سے متأثر ہو چکے تھے، ورنہ ظاہر ہے کہ محض سفر میں چلتے چلتے ایک ہی ملاقات کا نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اتنے گھر مسلمان ہو جائیں۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش نے اگرچہ حضورؐ کے خلاف جھوٹ کی مہم چلا کر پورے عرب کے لوگوں کو آپؐ سے بدظن کر دینے کی کوشش میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی، لیکن اِسی ذریعہ سے نہ صرف یہ کہ انہوں نے خود ہی آپؐ کو عرب میں مشہور کر دیا، بلکہ بہت سی سعید رُوحوں کو آپؐ کی طرف متوجہ بھی کر دیا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ اِسی مہم کی وجہ سے جستجو کرتے تو ہیں آپؐ کی طرف راغب ہوتے تھے اور اس طرح مکہ سے باہر دوسرے قبائل میں اسلام پہنچ گیا۔ یہی بات ہے جس کے متعلق سورۂ الم نشرح میں فرمایا گیا ہے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ یعنی آپ اِس جھوٹے پروپیگنڈے سے دل شکستہ کیوں ہوتے ہیں؛ ہم نے تو آپ کے دشمنوں ہی کے ذریعہ سے آپ کا آوازہ بلند کر دیا ہے۔

۶۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم

مخالفت و مزاحمت کی دوسری تدبیروں کے ساتھ کفارِ قریش کی ایک نہایت سنگدلانہ تدبیر یہ تھی کہ جس جس کے متعلق اُن کو معلوم ہوتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، یا جس نے بھی کسی طرح اپنے اسلام کا اظہار کیا، اُس پر اُنہوں نے بے تحاشا ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا، اور اس کو اسلام سے پھیرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کا کوئی ممکن طریقہ استعمال کرنے سے ذرا دریغ نہ کیا۔ اوّل اوّل تو یہ طریقہ رہا کہ اسلام قبول کرنے والوں میں سے جو لوگ کچھ عزت اور خاندانی شرف و وجاہت رکھتے تھے ان سے مل کر ان کو ملامت کی جاتی کہ تم نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے حالانکہ وہ تم سے زیادہ بھلائی اور بُرائی کی سمجھ رکھنے والے تھے، اب اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ذلیل و خوار کریں گے، تمہیں احمق ٹھیرائیں گے اور تمہاری عزت خاک میں

ملا دیں گے۔ جو لوگ کوئی تجارتی کاروبار یا صنعتی پیشہ کرتے تھے ان کو دھمکیاں دی جاتیں کہ یا تو اسلام چھوڑ دو، ورنہ نہیں تو تمہاری تجارت برباد کر دی جائے گی اور تمہارے پیشے کو نہیں چلنے دیا جائے گا، یہاں تک کہ تم بھوکے مرنے لگو گے۔ رہے بے سہارا اور کمزور لوگ تو ان کو سخت عذاب دیے جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ نوبت یہ آگئی کہ عزت دار اور خاندانی لوگوں تک کو مارا پیٹا اور باندھا جانے لگا۔

خاندانی لوگوں پر مظالم

ابن اسحاق اور طبری نے حضرت عروہؓ بن زبیر کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ قریش کے سرداروں نے باہم طے کیا کہ اُن کے بیٹوں، بھائیوں اور قبیلے کے لوگوں میں سے جس جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی قبول کی ہے اس پر جبر و ظلم کر کے اُسے زبردستی اس دین سے پھیرنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد مکہ میں حضورؐ کے پیروؤں پر ایک فتنہ عظیم برپا ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ جیسے معزز آدمی کو نوفل بن خویلد بن العدویہ نے، جو اسد قریش (قریش کا شیر) کہلاتا تھا، پکڑ کر حضرت طلحہؓ کے ساتھ باندھ دیا، اور اُن کے خاندان بنو تیم نے اُن کو بچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس پر حضورؐ نے دُعا فرمائی کہ اللّٰھم اکفنا شر ابن العدویۃ "خدایا، ابن العدویہ کے شر سے ہم کو بچانے کا تو ہی ذمہ لے لے" (بیہقی۔ ابن سعد)۔ حضرت زبیرؓ بن العوام کو ان کا چچا ایک چٹائی میں لپیٹ کر لٹکا دیتا تھا اور نیچے سے دھونی دیتا اور کہتا جاتا تھا کہ اسلام سے رجوع کر، مگر وہ برابر یہی جواب دیئے جاتے کہ میں کبھی کفر نہ کروں گا۔ (ابن سعد، طبرانی)۔ حضرت عثمانؓ کو ان کے چچا حکم (مروان کے باپ) نے باندھ دیا اور کہا تم باپ دادا کا دین چھوڑ کر محمدؐ کا دین قبول کرتے ہو، میں تجھے نہیں کھولوں گا جب تک تو اس دین کو چھوڑ نہ دے۔ انہوں نے جواب دیا میں اسے نہیں چھوڑوں گا خواہ کچھ ہو جائے (ابن سعد)۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر کو ان کے چچا زاد بھائی عثمان بن طلحہ (کلید بردار کعبہ) نے سخت اذیتیں دیں، اور اُن کے اہل خاندان نے اُن کو قید کر دیا یہاں تک کہ وہ بھاگ نکلے اور پہلی ہجرت حبشہ کے موقع پر مہاجرین کے ساتھ چلے گئے (ابن سعد)۔ حضرت سعد بن ابی وقاص اور ان کے بھائی عامر کو ان کی ماں نے بے حد تنگ کیا، مگر وہ اپنے دین سے نہ ہٹے (ابن سعد)۔ انہی کے متعلق مسند احمد، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی میں آیا ہے کہ حضرت سعد کی ماں حمنہ بنت سفیان بن امیہ (ابوسفیان کی بھتیجی) نے ان سے کہا "جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤں گی، نہ پیوں گی، نہ سایہ میں بیٹھوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے۔ تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کرے گا"۔ وہ اس پر سخت پریشان ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیت اُتری وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا

فَلَا تُطِعْهُمَا (العنکبوت۔ ۸) "اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ہے لیکن اگر وہ تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات نہ مان"۔

حضرت خالد بن سعید کی سرگذشت

حضرت خالد بن سعید بن العاص کو جب پتہ چلا کہ ان کے باپ ابو اُحیحہ کو اُن کے مسلمان ہونے کا علم ہو گیا ہے تو وہ اُس کے ڈر سے چھپ گئے۔ مگر اُس نے ان کو تلاش کر کے پکڑوا بلایا اور سخت سست کہنے کے بعد ان کو اتنا مارا کہ وہ لکڑی ٹوٹ گئی جس سے وہ انہیں مار رہا تھا۔ پھر کہا کہ تو نے محمدؐ کی پیروی اختیار کر لی، حالانکہ تو دیکھ رہا ہے کہ وہ اپنی قوم کی مخالفت کر رہا ہے، دینِ آبائی میں عیب نکال رہا ہے اور اُن اسلاف کو گمراہ قرار دے رہا ہے جو اس دین کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ حضرت خالد نے کہا خدا کی قسم وہ سچے ہیں اور میں ان کا پیرو ہوں۔ ابو اُحیحہ نے ان کو پھر مارا اور گالیاں دیں اور کہا کہ نالائق، جہاں تیرا جی چاہے چلا جا، میرے گھر میں تجھے کھانا نہیں ملے گا۔ انہوں نے کہا آپ میرا رزق بند کر دیں گے تو اللہ مجھے رزق دے گا۔ پھر وہ حضورؐ کے پاس آئے اور آپ ہی کے ساتھ رہنے لگے۔ ایک روز مکہ کے نواح میں کسی سنسان جگہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابو اُحیحہ کو اس کی خبر پہنچ گئی۔ اُس نے بلا کر ان سے کہا دینِ محمدؐ چھوڑ دے۔ انہوں نے جواب دیا میں مرتے دم تک یہ دین نہیں چھوڑوں گا۔ یہ جواب سُن کر ابو اُحیحہ نے ان کے سر پر لکڑی ماری شروع کی یہاں تک کہ لکڑی ٹوٹ گئی۔ پھر انہیں قید کر دیا اور تین دن تک بھوکا پیاسا بند رکھا۔ مکہ کی گرمی میں حضرت خالد یہ عذاب بھگتتے رہے۔ آخر موقع پا کر گھر سے بھاگ نکلے اور مکہ کے نواح میں پھرتے رہے، یہاں تک کہ حبشہ کی طرف پہلی ہجرت ہوئی اور یہ اُن مہاجرین کے ساتھ چلے گئے (ابن سعد۔ بیہقی نے بھی مختصراً اس واقعہ کا ذکر کیا ہے)۔

حضرت ابو بکرؓ پر ظلم عظیم

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ دارِ ارقم سے نکل کر مسجد حرام تشریف لے گئے۔ وہاں یکایک حضرت ابو بکرؓ نے اٹھ کر تقریر شروع کر دی اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح کسی نے حرم میں علی الاعلان دعوتِ اسلام دی ہو۔ مشرکین یہ تقریر سنتے ہی حضرت ابو بکرؓ پر ٹوٹ پڑے اور ان کو گرا کر پاؤں سے روندا اور عُتبہ بن ربیعہ نے اُن کے منہ پر اتنے جوتے مارے کہ سارا منہ سوج گیا اور ناک اس میں چھپ گئی۔ یہ حال دیکھ کر ان کے قبیلے والے (بنو تیم) آگے بڑھے اور کفار سے ان کو چھڑا کر اُن کے گھر لے گئے۔ انہیں اس امر میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ یہ اب مر جائیں گے۔ اس لیے وہ پلٹ کر پھر مسجد میں گئے اور کہا کہ خدا کی قسم، اگر ابو بکرؓ مر گئے تو ہم عُتبہ کو جیتا نہ چھوڑیں گے۔ شام تک حضرت ابو بکرؓ بے سُدھ پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو اُن کا پہلا سوال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کا کیا حال ہے؟ اس پر عتبہ نے ان کو برا بھلا کہا، ملامت کی۔ اُٹھ کر چلے گئے تو اُن کی والدہ اُمّ الخیر
سے کہہ گئے کہ انہیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ماں بیٹے جب تنہا رہ گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی والدہ سے پھر وہی
سوال کیا۔ انہوں نے کہا بخدا مجھے تمہارے دوست کا کچھ حال معلوم نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا جا کر اُمّ جمیل
بنت خطاب (یعنی فاطمہؓ بنت خطاب، حضرت عمرؓ کی بہن)[1] سے جا کر پوچھو۔ وہ اُس وقت مسلمان ہو چکی تھیں مگر
انہوں نے اپنا اسلام چھپا رکھا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی والدہ نے جب جا کر ان سے کہا کہ ابوبکر محمدؐ بن عبداللہ کا
حال پوچھ رہے ہیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نہ محمدؐ بن عبداللہ کو جانتی ہوں نہ ابوبکرؓ کو، البتہ آپ
چاہیں تو میں ابوبکرؓ کے پاس چلتی ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں، چلو۔ وہاں پہنچ کر ابوبکرؓ کو یہ حال پڑے دیکھ کر
چیخ اٹھیں کہ خدا کی قسم، جن لوگوں نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے وہ کافر اور فاسق ہیں اور میں امید رکھتی
ہوں کہ اللہ ان سے تمہارا انتقام لے گا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا رسول اللہ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے چپکے
سے کہا آپ کی ماں سن رہی ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ان کی فکر نہ کرو، ان سے کوئی خوف نہیں ہے۔ تب
اُمّ جمیل نے کہا حضورؐ بالکل خیریت سے ہیں۔ پوچھا کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا دارِ ارقمؓ میں۔ حضرت ابوبکرؓ نے
کہا واللہ، میں نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا جب تک اُن کے پاس نہ جاؤں۔ اُمّ جمیل نے کہا ذرا ٹھیر جائیے۔
پھر جب شہر میں سکون ہو گیا تو وہ اور اُمّ الخیر ان کو سہارا دے کر دارِ ارقمؓ لے گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم پر ان کا حال دیکھ کر رقت طاری ہو گئی۔ آپؐ ان پر جھکے اور ان کو چوم لیا۔ دوسرے مسلمان بھی جو وہاں
موجود تھے ان پر جھکے اور ان کی حالت دیکھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپ پر قربان
مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہے سوائے اُس تکلیف کے جو اُس فاسق نے میرے منہ پر جوتے برسا کر
پہنچائی۔ یہ میری ماں اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ بابرکت ہیں۔ ان کو اللہ کی طرف دعوت دیجیے اور
دعا فرمائیے کہ اللہ ان کو آگ سے بچا لے۔ چنانچہ حضورؐ نے ان کے لیے دعا کی اور انہیں اللہ کی طرف
دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئیں۔ یہ واقعہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں حافظ ابوالحسن خیثمہ بن
سلیمان الاطرابلسی کی کتاب فضائل الصحابہؓ سے تفصیل نقل کیا ہے، اور حافظ ابن حجر نے اصابہ

---

[1] طبرانی نے تصریح کی ہے کہ حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہ بنت خطاب کی کنیت اُمّ جمیل تھی۔ عبدالرزاق نے المصنف میں امام
زہری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی بہن اُمّ جمیل کے گھر میں قرآن سن کر ایمان لائے تھے۔ اور دوسری روایات
میں ان خاتون کا نام فاطمہ بنت خطاب آیا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی اپنی بہن کا نام فاطمہؓ تھا
اور انہی کی کنیت اُمّ جمیل تھی۔ (حاشیہ از مؤلف)۔

میں اسے مختصراً ابن الخیر کے حالات میں بیان کیا ہے۔ (۴۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو بُری طرح مارا جاتا ہے

ابن اسحاق حضرت عروہ بن زبیر سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک روز صحابہ کرام نے آپس میں کہا کہ قریش نے کبھی کسی کو (یعنی ہم میں سے کسی کو) علانیہ بآواز بلند قرآن پڑھتے نہیں سُنا ہے، ہم میں کون ہے جو ایک دفعہ اُن کو یہ کلام پاک سُنا ڈالے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا میں یہ کام کرتا ہوں۔ صحابہؓ نے کہا ہمیں ڈر ہے کہ وہ تم پر زیادتی کریں گے۔ ہمارے خیال میں کسی ایسے شخص کو یہ کام کرنا چاہیے جس کا خاندان زبردست ہو تاکہ اگر قریش کے لوگ اس پر دست درازی کریں تو اس کے خاندان والے اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ حضرت عبداللہؓ نے فرمایا مجھے یہ کام کر ڈالنے دو، میرا حافظ اللہ ہے۔ پھر وہ دن چڑھے حرم میں پہنچے جبکہ قریش کے سردار بیان اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ حضرت عبداللہ نے مقام ابراہیم پر پہنچ کر پورے زور سے سُورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔ قریش کے لوگ پہلے تو سوچتے رہے کہ عبداللہ کیا کہہ رہے ہیں پھر جب انہیں پتہ چلا کہ یہ وہ کلام ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں تو وہ اُن پر ٹوٹ پڑے اور اُن کے مُنہ پر تھپڑ مارنے لگے۔ مگر حضرت عبداللہ نے پروا نہ کی۔ پِٹتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب تک اُن کے دم میں دم رہا قرآن سناتے چلے گئے۔ آخر کار جب وہ اپنا سُوجا ہُوا منہ لے کر پلٹے تو ساتھیوں نے کہا ہمیں اسی چیز کا ڈر تھا۔ انہوں نے جواب دیا آج سے بڑھ کر یہ خدا کے دشمن میرے لیے کبھی ہلکے نہ تھے، تم کہو تو کل پھر انہیں قرآن سناؤں۔ سب نے کہا۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ جو کچھ وہ نہیں سُننا چاہتے تھے وہ تم نے انہیں سنا دیا۔ (ابن ہشام۔ جلد اوّل، ص ۳۳۶) (۴۳)

بے کس غلاموں، لونڈیوں اور موالی پر ظلم

سب سے زیادہ دردناک مظالم اُن غلاموں، لونڈیوں اور موالی پر توڑے گئے جو اسلام لے آئے تھے اور جن کا مکہ میں کوئی پُشت پناہ نہ تھا۔ اس کی چند مثالیں حسبِ ذیل ہیں۔

حضرت بلالؓ

ان میں سے ایک حضرت بلالؓ بن رباح تھے جو بنی جُمح میں سے کسی کے غلام تھے اور غلامی کی حالت ہی میں اُن کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ مشہور یہ ہے کہ وہ حبشی تھے، جیسا کہ طبرانی وغیرہ نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے۔ ان کے اسلام لانے کا حال جب کھلا تو اُمیّہ بن خَلَف جُمَحی نے ان کو طرح طرح کے عذاب دیئے۔ ابن ہشام اور بلاذری نے لکھا ہے کہ وہ دوپہر کو سخت گرمی کے وقت انہیں نکال کر لے جاتا، مکّہ کی تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر ایک بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا اور کہتا کہ خدا کی قسم تو اسی طرح پڑا رہے گا

جب تک محمدؐ کا انکار کر کے لات اور عزّیٰ کی عبادت نہ کرے۔ مگر وہ جواب میں اَحَد اَحَد ہی کہے چلے جاتے۔ بلاذری نے حضرت عمرو بن العاص کی روایت نقل کی ہے کہ میں نے بلالؓ کو ایسی سخت تپتی ہوئی زمین پر بیٹھے دیکھا ہے جس پر اگر گوشت رکھ دیا جاتا تو وہ پک جاتا۔ مگر وہ اس حالت میں بھی صاف کہہ رہے تھے کہ میں لات اور عزّیٰ کا انکار کرتا ہوں۔ حضرت حسانؓ بن ثابت کا آنکھوں دیکھا حال بلاذری نے نقل کیا ہے کہ میں حج (یا عمرے) کے لیے مکہ گیا تو دیکھا کہ بلال ایک رسّی میں بندھے ہوئے ہیں اور لڑکے ان کو گھسیٹے پھر رہے ہیں۔ مگر وہ کہے جا رہے ہیں کہ میں لات اور عزّیٰ اور ہُبل اور اساف اور نائلہ اور بوانہ سب کا انکار کرتا ہوں۔ خود حضرت بلالؓ کا بیان بلاذری میں یہ ہے کہ مجھے ایک دفعہ ایک دن اور ایک رات پیاسا رکھا گیا اور پھر تپتی ہوئی ریت پر لے جا کر ڈال دیا گیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ گلے میں رسّی باندھ کر ان کو لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا اور وہ مکّے کی گھاٹیوں میں انہیں گھسیٹے لیے پھرتے، پھر تپتی ہوئی ریت پر لا کر اوندھے منہ لٹا دیتے اور ان پر پتھروں کا ڈھیر لگا دیتے۔ ایسے ہی اور سخت عذاب دے دے کر ان سے کہا جاتا کہ تمہارے رب لات اور عزّیٰ ہیں، مگر وہ اَحد اَحد ہی کہتے رہتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا گھر بنی جمح کے محلے ہی میں تھا۔ وہ یہ ظلم دیکھتے دیکھتے تنگ آ گئے۔ ابن اسحاق کی روایت ہشام بن عروہ سے یہ ہے کہ انہوں نے اپنا ایک تنومند حبشی غلام ان کے بدلے میں دے کر انہیں خرید لیا اور آزاد کر دیا۔ اور ابن ابی شیبہ نے قیس بن حازم کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے قیمت دے کر انہیں خریدا اور آزاد کیا تھا۔ اسی مضمون کی روایات ابن سعد نے بھی نقل کی ہیں۔ البتہ قیمت میں اختلاف ہے۔

حضرت عمّارؓ بن یاسر

ابن سعد کا بیان ہے کہ یاسر یمن کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے مکہ آئے اور ابو حذیفہ بن مغیرہ مخزومی سے حلیفانہ تعلق قائم کر لیا اور ابو حذیفہ نے اپنی لونڈی سُمَیَّہ سے ان کی شادی کر دی۔ جب اسلام آیا تو یاسرؓ، سمیہؓ، عمارؓ اور ان کے بھائی عبداللہ سب مسلمان ہو گئے۔ اس پر یہ پورا خاندان سخت مبتلائے عذاب کر دیا گیا۔ بلاذری نے اُمّ ہانیؓ سے اور طبرانی نے حضرت عثمانؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام سے گزر رہے تھے جہاں ان لوگوں کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ آپؐ کو اس پر سخت رنج ہوا اور آپؐ نے فرمایا: صبرًا آل یاسر فان موعدکم الجنۃ "صبر کرو، صبر کرو اے آلِ یاسر، تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔" امام احمد اور ابن سعد نے حضرت عثمانؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضورؐ کے ساتھ اس مقام سے گزرے جہاں اس خاندان کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ حضورؐ نے فرمایا "صبر کرو، یا اللہ آلِ یاسر کی مغفرت فرما دے" اور فرمایا "تو ان کی مغفرت کر ہی دی"۔ محمد بن کعب قرظی کا بیان ابن سعد نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت

عمارؓ کو ایک مرتبہ کرتا اتارے ہوئے دیکھا تو ان کی پیٹھ پر داغ ہی داغ نظر آئے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ انہی عذابوں کے نشانات ہیں جو مکہ کی تپتی ہوئی زمین پر مجھے دیے جاتے تھے۔ عمرو بن میمون کے حوالہ سے ابن سعد نے بیان کیا ہے کہ مشرکین نے حضرت عمارؓ کو آگ سے داغا اور حضورؐ نے فرمایا "اے آگ عمارؓ پر اسی طرح ٹھنڈی ہو جا جس طرح تو ابراہیم علیہ السلام پر ٹھنڈی ہوئی تھی۔" آخر کار ان کے والد یاسرؓ عذاب کی سختیاں سہتے سہتے انتقال کر گئے۔ پھر ابوجہل نے ان کی والدہ سمیہؓ کو قتل کر دیا۔ ان کے بھائی عبداللہؓ کو تیر مارا گیا اور وہ گر گئے۔ اب صرف حضرت عمارؓ رہ گئے تھے۔ ان کو پانی میں غوطے دیے گئے یہاں تک کہ ان سے برداشت نہ ہو سکا اور انہوں نے حضورؐ کا انکار اور ان کے معبودوں کی تعریف کر کے جان چھڑائی۔ پھر روتے ہوئے حضورؐ کے پاس آئے اور یہ حال بیان کیا۔ آپؐ نے پوچھا اپنے دل کی کیا کیفیت پاتے ہو؟ عرض کیا کہ بالکل ایمان پر مطمئن۔ آپؐ نے فرمایا اگر آئندہ ایسا موقع آئے تو پھر یہی کچھ کہہ دینا۔ بیہقی، ابن سعد، ابن جریر، بلاذری، عوفی وغیرہم نے یہ واقعہ نقل کر کے متعدد مفسرین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سورۂ نحل کی آیت ۱۰۶ اسی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے، وہ اگر مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو تب تو معاف ہے، البتہ جو شرحِ صدر کے ساتھ کفر اختیار کرے اس پر اللہ کا غضب ہے اور اس کے لیے سخت عذاب ہے۔

حضرت خبابؓ بن الارتؓ

یہ اصل میں عراقی تھے۔ قبیلۂ ربیعہ میں سے ایک گروہ نے ان کو پکڑ کر غلام بنا لیا اور مکہ لا کر بنی خزاعہ کے ایک خاندان آلِ سباع کے ہاتھ بیچ دیا جو بنی زہرہ کا حلیف تھا۔ یہ ایک کاریگر آدمی تھے۔ لوہاری کا پیشہ کرتے اور تلواریں بنایا کرتے تھے۔ مسلمان ہونے کے قصور میں پہلے تو انہیں پیٹ کی مار دی گئی۔ مسند احمد، بخاری اور مسلم میں خود ان کا بیان نقل ہوا ہے کہ میرا کچھ قرض عاص بن وائل سہمی پر آتا تھا۔ میں اس کے پاس تقاضے کے لیے جاتا تو وہ کہتا کہ میں تجھے کچھ نہ دوں گا جب تک تو محمدؐ کا انکار نہ کرے۔ میں اس کو جواب دیتا کہ میں ہرگز ان کا انکار نہ کروں گا خواہ تو مرے اور پھر زندہ ہو۔ ابن سعد میں ہے کہ اس پر عاص کہتا کہ "اچھا تو مرنے کے بعد پھر جب میں اپنے مال اور اولاد کی طرف پلٹوں گا تو ادا کر دوں گا۔" ابن ہشام نے یہ واقعہ اس طرح لکھا ہے کہ عاص نے ان سے بہت سی تلواریں بنوائیں اور قرض بڑھتا چلا گیا۔ انہوں نے جب تقاضا کیا تو اس نے کہا کہ "تیرا یہ صاحب" جس کے دین پر تو ہے، کہتا ہے کہ جنت میں بہت سونا چاندی کپڑا اور خدمت گار ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا تو پھر مجھے قیامت تک مہلت دے۔ وہاں میں ادا کر دوں گا کیونکہ وہاں تو اور تیرا صاحب محمدؐ مجھ سے زیادہ مقبول نہ ہوں گے۔ اس طرح پیٹ کی مار دینے سے بھی جب ظالموں کا دل نہ بھرا تو انہوں نے ان کو

سخت عذاب دینے شروع کیے۔ ابن سعد اور بلاذری نے شعبیؒ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانے میں انہوں نے اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی جو بالکل برص کے مریض کی کھال جیسی ہورہی تھی، اور حضرت عمرؓ سے کہا کہ مشرکین نے آگ جلا کر مجھے اس پر گھسیٹا، پھر ایک شخص میرے سینے پر کھڑا ہو گیا اور میری چربی کے پگھلنے سے آگ بجھ گئی۔ (۲۴)

حضورؐ سے حضرت خبابؓ کی فریاد اور آپؐ کا جواب

انہی مظالم کے زمانہ کا وہ واقعہ ہے جو امام احمد بن حنبل، بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے خود حضرت خبابؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جس زمانے میں مشرکین کی سختیوں سے ہم بُری طرح تنگ آئے ہوئے تھے، ایک روز میں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی دیوار کے سائے میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے حاضر ہو کر عرض کیا "یا رسول اللہ، اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپ ہمارے لیے دُعا نہیں فرماتے؟" یہ سُن کر آپ کا چہرہ مبارک تمتما اٹھا اور آپؐ نے فرمایا تم سے پہلے جو اہلِ ایمان گزر چکے ہیں اُن پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو گڑھا کھود کر بٹھایا جاتا اور اس کے سر پر آرہ چلا کر اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے جاتے، اور کسی کے جوڑوں پر لوہے کے کنگھے گھسے جاتے تھے تاکہ وہ ایمان سے باز آجائے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرتے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب ایک شخص صنعاء سے حضرموت تک بے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہوگا۔ مگر تم لوگ جلد بازی کرتے ہو۔ (۲۵)

حضرت ابوبکرؓ کا مظلوم غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا

اس ظلم و ستم کے دَور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بے تحاشا دولت خرچ کر کے متعدد مظلوم غلاموں اور لونڈیوں کو خرید خرید کر آزاد کر دیا۔ ابنِ ہشام نے ایسے سات افراد کے نام لیے ہیں لیکن بیہقی، ابنِ اسحاق، ابنِ عبدالبرّ اور ابنِ حجر وغیرہ نے جو نام گنائے ہیں ان کو جمع کرنے سے جملہ ۹ افراد کی تعداد بنتی ہے۔

(۱) حضرت بلالؓ جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

(۲) اُن کی والدہ حمامہ۔ ابن عبدالبرّ نے بیان کیا ہے کہ ان کو بھی راہِ خدا میں عذاب دیا جاتا تھا۔

(۳) عامر بن فُہَیرہ، ابن سعد، طبری اور بلاذری نے لکھا ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کے ماں جائے بھائی طفیل بن الحارث کے غلام تھے اور اُن مظلوموں میں شامل تھے جنہیں عذاب دیا جاتا تھا۔

(۴) ابوفُکَیہہ۔ ان کے متعلق ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اُمیّہ بن خلف ان کو سخت عذاب دیتا تھا۔ اور طبقات ابن سعد اور اُسُد الغابہ میں ہے کہ بنی عبدالدار کے کچھ لوگ، جن کی غلامی میں یہ تھے، انہیں

دوپہر کے وقت سخت گرمی میں نکالتے، لوہے کی بیڑیاں پہنا کر ان کو تپتی ہوئی زمین پر اوندھا لٹا دیتے اور ان کی پیٹھ پر بھاری پتھر رکھ دیتے، یہاں تک کہ یہ بیہوش ہو کر گر جاتے۔

(۵) لبینہ یا لبیبہ۔ بلاذری نے ان کا نام لکھا ہے اور ابن ہشام نے نام لیے بغیر ان کا ذکر بنی مؤمل (بنی عدی کی ایک شاخ) کی لونڈی کی حیثیت سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ عمر بن الخطاب اپنے زمانۂ کفر میں ان کو خوب مارتے اور جب مارتے مارتے تھک جاتے تھے تو کہتے کہ میں نے صرف تھک جانے کی وجہ سے تجھے چھوڑا ہے، اور یہ جواب دیتیں کہ اللہ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی کرے۔

(۶-۷) نہدیہ اور ان کی بیٹی۔ یہ دونوں بنی عبدالدار کی ایک عورت کی لونڈیاں تھیں۔ ان کی مالکہ بھی ان پر ظلم کرتی تھی۔

(۸) زِنّیرہ (استیعاب میں ان کا نام زنیرہ لکھا ہے)۔ ابن اثیر نے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ یہ بنی عدی کی لونڈی تھیں اور عمر بن خطاب ان کو عذاب دیتے تھے۔ اور دوسری روایت یہ کہ بنی مخزوم کی لونڈی تھیں اور ابوجہل ان کو عذاب دیتا تھا، یہاں تک کہ ان کی بینائی جاتی رہی۔ ابوجہل نے کہا لات اور عزّیٰ نے تجھے اندھا کر دیا۔ انہوں نے کہا لات اور عزّیٰ کو تو خبر بھی نہیں کہ انہیں کون پوج رہا ہے، یہ فیصلے تو آسمان سے ہوتے ہیں اور میرا رب اس پر قادر ہے کہ میری بینائی واپس دے دے۔ چنانچہ دوسرے روز وہ اٹھیں تو اللہ نے ان کی بینائی بحال کر دی تھی، یہی بلاذری کی روایت ہے۔ مگر ابن ہشام نے اس کے برعکس یہ لکھا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا تو ان کی بینائی جاتی رہی۔ قریش کے لوگوں نے اس پر کہنا شروع کیا کہ لات و عزّیٰ نے اسے اندھا کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ بیت اللہ کی قسم یہ لوگ جھوٹ کہتے ہیں۔ لات و عزّیٰ کسی کو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی بحال فرما دی۔

(۹) اُمّ عُبَیس (بعض نے عُنَیس اور بعض نے عُبَیس لکھا ہے)۔ بلاذری نے لکھا ہے کہ یہ بنی زہرہ کی لونڈی تھیں اور اسود بن عبد یغوث ان پر ظلم ڈھاتا تھا۔ (۲۹)

حضرت ابوبکرؓ کے والد کا اعتراض اور آپ کا ان کو جواب

ابن اسحاق، ابن جریر اور ابن عساکر نے حضرت عامر بن عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کو اس طرح ان غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر روپیہ خرچ کرتے دیکھ کر ان کے والد ابو قحافہ نے (جو اس وقت مشرک تھے) ان سے کہا کہ بیٹا، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کرا رہے ہو، اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہی روپیہ خرچ کرتے تو وہ تمہارے لیے قوتِ بازو بنتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ "ابا جان، میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے"۔ یہ واقعہ سورۂ لیل کی اس آیت کا بہترین

مصداق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "جہنم کی اس آگ سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار آدمی جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے، اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو۔ وہ تو صرف اپنے رب برتر کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے" (آیات ۱۷ تا ۲۰) یعنی وہ اپنا مال جن لوگوں پر صرف کرتا ہے ان کا کوئی احسان پہلے سے اس پر نہ تھا کہ وہ اس کا بدلہ چکانے کے لیے، یا آئندہ ان سے مزید فائدہ اٹھانے کے لیے ان کو ہدیے اور تحفے دے رہا ہو اور ان کی دعوتیں کر رہا ہو۔ بلکہ وہ اپنے رب برتر کی رضا جوئی کے لیے ایسے لوگوں کی مدد کر رہا ہے جن کا نہ پہلے اس پر کوئی احسان تھا، نہ آئندہ ان سے وہ کسی احسان کی توقع رکھتا ہے۔ (۲۷)

ظلم کے نتائج

قریش نے مسلمانوں پر ظلم ڈھا کر بظاہر یہ فائدہ اٹھانا چاہا تھا کہ لوگوں پر خوف طاری کر کے اسلام کے پھیلاؤ کو روک دیں لیکن اس کے جو نتائج فی الواقع نکلے وہ ان کی توقعات کے بالکل خلاف تھے۔ اول تو اس سے یہ بات بالکل کھل کر سامنے آگئی کہ اسلام جو اخلاق اور دلائل لے کر آیا ہے ان کا کوئی جواب کفر کے پاس ان خلاف انسانیت حربوں کے سوا نہیں ہے۔ دوسرے اس بے رحمی و سنگدلی کو دیکھ کر ہر نیک سرشت انسان کی فطرت کفر اور اس کے علمبرداروں سے نفرت کرنے لگی اور جس صبر و استقامت کے ساتھ مسلمانوں نے اس بے جا ظلم کو برداشت کیا اس کی وجہ سے تمام غیر متعصب دلوں میں ان کے لیے ہمدردی بھی پیدا ہوئی اور قدر و منزلت بھی۔ بلکہ درحقیقت اس نے اسلام کی دھاک بٹھا دی کہ یہی ہیں کے معاشرے میں سے اس کو ایسے پختہ، اولوالعزم اور زبردست قوت ایمانی رکھنے والے انسان مل گئے ہیں جو کسی دنیوی غرض کے لیے نہیں، صرف حق کی خاطر ہر بڑی سے بڑی مصیبت جھیل سکتے ہیں۔ پھر کفار کے یہ حربے اسلام کے پھیلاؤ کو بھی نہ روک سکے۔ اس ظلم کے باوجود ایسے اللہ کے بندے نکلتے ہی رہے جنہوں نے کفار کے علی الرغم اسلام قبول کیا اور بہت سے لوگ دل میں ایمان لے آئے مگر اس کا اظہار انہوں نے نہیں کیا جس کی وجہ سے آج دشمنان اسلام بھی یہ صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ ان کے درمیان اس دین کے کتنے حامی چھپے ہوئے ہیں جن کی پوشیدہ حمایت کفر کے حصار میں شگاف ڈالتی جا رہی ہے۔ سب سے بڑا فائدہ اس ظلم کا اسلام کو یہ پہنچا کہ اس بھٹی سے گزر کر جو لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آتے وہ نسل آدم کے بہترین انسان تھے۔ اس حالت میں کوئی کمزور سیرت و کردار کا آدمی اس طرف کا رخ بھی نہ کر سکتا تھا۔ (۲۸)

ایک اور نیا فتنہ

اللہ تعالیٰ کی حکمت کے کام بھی نرالے ہیں جنہیں عقل نارسا کبھی نہیں سمجھ سکتی جس وقت زمانہ جبکہ کفر و اسلام

کی باہمی کشمکش اِس شدت کو پہنچی ہوئی تھی، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر زندگی کا ایک ایک لمحہ سخت گزر رہا تھا بظاہر تو اِس بات کا مقتضی تھا کہ حضورؐ پر وحی کا نزول پیہم جاری رہتا جس میں ہر روز پیش آنے والے نت نئے حالات میں رہنمائی بھی ہوتی، نبیؐ و اصحابِ نبیؐ کے لیے تسلی اور ہمت افزائی بھی ہوتی، اور کفار کے لیے ان مظالم پر تہدید بھی۔ لیکن اسی زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یکایک نزولِ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا، جس پر حضورؐ بھی سخت پریشان ہوتے اور کفار کو بھی باتیں بنانے کا خوب موقع ملا۔

اِس فترۂ وحی کا زمانہ ٹھیک کتنا تھا، یہ تو معلوم نہیں ہے مگر اس سلسلہ میں جو روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں ان سے بھی، اور خود ان دو سورتوں کے مضمون سے بھی جو اِس فترہ کے خاتمہ پر نازل ہوئیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعوتِ عام شروع ہو جانے اور کارزارِ کفر و اسلام کا میدان گرم ہو جانے کے بعد پیش آیا تھا۔ مختلف روایات میں اِس فترہ کی مدت مختلف بیان کی گئی ہے۔ ابن جُرَیج نے ۱۲ روز، کلبی نے ۱۵ روز، ابن عباس نے ۲۵ روز، سُدّی اور مُقاتل نے ۴۰ روز اس کی مدت بیان کی ہے۔ بہرحال یہ زمانہ اتنا طویل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر سخت غمگین ہو گئے تھے، اور مخالفین بھی آپ کو طعنے دینے لگے تھے، کیونکہ حضورؐ پر جو نئی سورۃ نازل ہوتی تھی، اُسے آپؐ لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ اس لیے جب اچھی خاصی مدت تک آپؐ نے نئی وحی لوگوں کو نہ سنائی تو مخالفین نے سمجھ لیا کہ وہ سرچشمہ بند ہو گیا ہے جہاں سے یہ کلام آتا تھا۔ جُندُب بن عبداللہ البَجَلی کی روایت ہے کہ جب جبریل علیہ السلام کے آنے کا سلسلہ رک گیا تو مشرکین نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے رب نے چھوڑ دیا ہے (ابن جریر، طبرانی، عبد بن حمید، سعید بن منصور، ابن مردویہ)۔

دوسری روایات میں مذکور ہے کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل نے، جو حضورؐ کی چچی ہوتی تھی اور جس کا گھر حضورؐ کے مکان سے متصل تھا، آپؐ سے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے"۔ عوفی اور ابن جریر نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ کئی روز تک جبریل کی آمد رک جانے سے حضورؐ پریشان ہو گئے اور مشرکین کہنے لگے کہ ان کا رب ان سے ناراض ہو گیا ہے اور اس نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔ قتادہ اور ضحاک کی مرسل روایات میں بھی تقریباً یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ اس صورتِ حال میں حضورؐ کے شدید رنج و غم کا حال بھی متعدد روایات میں آیا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ محبوب کی طرف سے بظاہر عدمِ التفات، کفر و ایمان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد اُسی ذریعۂ طاقت سے بظاہر محرومی جو اِس جانگسل کشمکش کے منجدھار میں آپؐ کے لیے واحد سہارا تھا، اور اُس پر مزید دشمنوں کی شماتت، یہ ساری چیزیں مل جل کر لامحالہ حضورؐ کے لیے سخت پریشانی کی موجب ہو رہی ہوں گی اور آپؐ کو بار بار یہ شبہ گزرتا ہوگا کہ کہیں

مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا ہے کہ میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہو اور اس نے مجھے حق و باطل کی اس لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا ہو۔

سُورۂ ضحیٰ کا نزول

اس پر سورۂ ضحیٰ نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا:

وَالضُّحٰی ۝ وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی ۝ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی - (آیت ۱-۳)

"قسم ہے روز روشن کی اور رات کی جبکہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جاتی ہے۔ اے نبیؐ تمہارے رب نے تم کو ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔"

یعنی جس طرح دن کا روشن ہونا اور رات کا تاریکی اور سکون لیے ہوئے چھا جانا کچھ اس بنا پر نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ دن کے وقت لوگوں سے خوش اور رات کے وقت ان سے ناراض ہو جاتا ہے، بلکہ یہ دونوں حالتیں ایک عظیم حکمت و مصلحت کے تحت طاری ہوتی ہیں، اسی طرح کبھی تم پر وحی بھیجنا اور کبھی اس کو روک لینا بھی حکمت و مصلحت کی بنا پر ہے۔ اس کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ جب اللہ تم سے خوش ہو تو وحی بھیجے اور جب وہ وحی نہ بھیجے تو اس کے معنی یہ ہوں کہ وہ تم سے ناخوش ہے اور اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ دن کی روشنی اگر مسلسل آدمی پر طاری رہے تو وہ اسے تھکا دے، اس لیے مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ دن کے بعد رات آئے تاکہ اس میں انسان کو سکون ملے۔ اسی طرح وحی کی روشنی اگر تم پر پے درپے پڑتی رہے تو تمہارے اعصاب اس کو برداشت نہ کر سکیں گے، اس لیے وقتاً فوقتاً فترۃ (وحی بند رہنے کا ایک زمانہ) بھی اللہ تعالیٰ نے اس مصلحت کی بنا پر رکھا ہے کہ نزول وحی سے جو بار تم پر پڑتا ہے اس کے اثرات زائل ہو جائیں اور تمہیں سکون حاصل ہو جائے۔

۱؎ نزول وحی کا بار حضورؐ پر کس قدر شدید پڑتا تھا اس کا اندازہ ان روایات سے ہوتا ہے جو اس کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اس حالت میں نازل ہوئی کہ آپؐ اپنا زانو میرے زانو پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ میرے زانو پر اس وقت ایسا سخت بوجھ پڑا کہ معلوم ہوتا تھا اب ٹوٹ جائے گا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے سخت سردی کے زمانے میں حضورؐ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے، آپؐ کی پیشانی سے اس وقت پسینہ ٹپکنے لگتا تھا (بخاری، مسلم، مالک، ترمذی، نسائی)۔ ایک اور روایت میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی آپؐ پر اس حالت میں وحی نازل ہوتی کہ آپؐ اونٹنی پر بیٹھے ہوتے تو اونٹنی اپنا سینہ زمین پر ٹکا دیتی تھی اور اس وقت تک حرکت نہ کر سکتی تھی جب تک نزول وحی کا سلسلہ ختم نہ ہو جاتا (مسند احمد، حاکم، ابن جریر)۔

اس کے بعد فرمایا:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۔ (آیت ۴)

"اور یقیناً تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے"

یہ خوش خبری اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جبکہ چند مٹھی بھر آدمی آپؐ کے ساتھ تھے، ساری قوم مخالفت پر تُلی ہوئی تھی، بظاہر کامیابی کے آثار دُور دُور تک کہیں نظر نہ آ رہے تھے، اسلام کی شمع مکّے ہی میں ٹمٹما رہی تھی، اور اس کو بجھانے کے لیے ہر طرف طوفان اُٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ سے فرمایا کہ ابتدائی دَور کی مشکلات سے آپؐ ذرا پریشان نہ ہوں۔ ہر بعد کا دَور پہلے دَور سے آپؐ کے لیے بہتر ثابت ہوگا۔ آپؐ کی قوت، آپؐ کی عزت و شوکت اور آپؐ کی قدر و منزلت بڑھتی چلی جائے گی اور آپؐ کا نفوذ و اثر پھیلتا جائے گا۔ اور یہ وعدہ دنیا ہی تک کے لیے نہیں ہے بلکہ آخرت آپؐ کے لیے دنیا سے بھی بہتر ہوگی۔

پھر فرمایا:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۔ (آیت ۵)

"اور عنقریب تمہارا رب تم کو اتنا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے"

یعنی اگرچہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ وقت دُور نہیں ہے جب تم پر تمہارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضورؐ کی زندگی ہی میں اس طرح پورا ہوا کہ سارا ملکِ عرب جنوب کے سواحل سے لیکر شمال میں سلطنتِ روم کی شامی اور سلطنتِ فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر مغرب میں بحر احمر تک آپؐ کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور ضابطہ کی تابع ہو گئی۔ جو طاقت بھی اس سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو کر رہ گئی۔ کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ سے وہ پورا ملک گونج اٹھا جس کے مشرکین اور اہلِ کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دم تک ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے۔ لوگوں کے صرف سر ہی اطاعت میں نہیں جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مسخر ہو گئے اور عقائد، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ پوری انسانی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ایک قوم صرف ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اس کے بعد حضورؐ کی برپا کی ہوئی تحریک اس طاقت کے ساتھ اٹھی کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر چھا گئی اور دُنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے۔ یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دُنیا میں دیا، اور آخرت میں جو کچھ دے گا

اس کی عظمت کا تصوّر بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ (۳۰)

سُورۃ اَلَمْ نَشْرَحْ کا نزول

اسی کے قریب زمانے میں جبکہ دعوتِ اسلامی کے آغاز کی مشکلات حضورؐ کے لیے سخت پریشان کُن ثابت ہو رہی تھیں، آپؐ کی تسلی کے لیے سُورۃ اَلَمْ نَشْرَحْ نازل ہوئی جس کے بعض متعلقہ اجزاء یہاں مع تشریح نقل کیے جاتے ہیں۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (آیت ۱)

"(اے نبیؐ) کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لیے کھول نہیں دیا؟"

اس سوال سے کلام کا آغاز، اور پھر بعد کا مضمون خود صاف ظاہر کرتا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس زمانے میں اُن شدید مشکلات پر سخت پریشان تھے جو علی الاعلان دعوتِ اسلامی کا کام شروع کرنے کے بعد ابتدائی دور میں آپ کو پیش آ رہی تھیں۔ اِن حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مخاطب کر کے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اے نبی، کیا ہم نے یہ اور یہ عنایات تم پر نہیں کی ہیں؟ پھر اِن ابتدائی مشکلات پر تم پریشان کیوں ہوتے ہو؟

سینہ کھولنے کا لفظ قرآن مجید میں جن مواقع پر آیا ہے اُن پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو معنی ہیں:

(۱) سورۂ انعام آیت ۱۲۵ میں فرمایا فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ "پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت بخشنے کا ارادہ فرماتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔" اور سُورۂ زمر آیت ۲۲ میں فرمایا اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ "تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو پھر وہ اپنے رب کی طرف سے ایک روشنی پر چل رہا ہو۔۔۔" ان دونوں مقامات پر شرحِ صدر سے مراد ہر قسم کے ذہنی خلجان اور تردّد سے پاک ہو کر اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جانا ہے کہ اسلام کا راستہ ہی برحق ہے اور وہی عقائد، وہی اصُولِ اخلاق و تہذیب و تمدّن اور وہی احکام و ہدایات بالکل صحیح ہیں جو اسلام نے انسان کو دیے ہیں۔

(۲) سُورۂ شعراء آیت ۱۲-۱۳ میں ذکر آیا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو جب اللہ تعالیٰ نبوت کے منصب عظیم پر مامور کر کے فرعون اور اس کی عظیم سلطنت سے جا ٹکرانے کا حکم دے رہا تھا تو انہوں نے عرض کیا رَبِّ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ وَيَضِيْقُ صَدْرِیْ "میرے رب، میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے اور میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے۔" اور سُورۂ طٰہٰ آیات ۲۵-۲۶ میں بیان کیا گیا ہے کہ اسی موقع پر حضرت موسیٰؑ نے

اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي "میرے رب میرا سینہ میرے لیے کھول دے اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے"۔ یہاں سینے کی تنگی سے مُراد یہ ہے کہ نبوّت جیسے کارِ عظیم کا بار سنبھالنے اور تن تنہا کفر کی ایک جابر و قاہر طاقت سے ٹکر لینے کی آدمی کو ہمّت نہ پڑ رہی ہو۔ اور شرحِ صدر سے مُراد یہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بلند ہو جائے، کسی بڑی سے بڑی مُہم پر جانے اور کسی سخت سے سخت کام کو انجام دینے میں بھی اسے تامّل نہ ہو، اور نبوّت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کی اُس میں ہمّت پیدا ہو جائے۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اِس آیت میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ کھول دینے سے یہ دونوں ہی معنی مُراد ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت سے پہلے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکینِ عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اُس حنیفیت پر بھی مطمئن نہ تھے جو عرب کے بعض قائلینِ توحید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک مُبہم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی (اس کی تشریح ہم تفہیم القرآن، جلد چہارم، السجدہ، حاشیہ ۵ میں کر چکے ہیں)، لیکن آپؐ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہِ راست کیا ہے، اس لیے آپ سخت ذہنی خلجان میں مبتلا تھے۔ نبوّت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اِس خلجان کو دُور کر دیا اور وہ راہِ راست کھول کر آپ کے سامنے رکھ دی جس سے آپؐ کو کامل اطمینانِ قلب حاصل ہو گیا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوّت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وہ حوصلہ، وہ ہمّت، وہ اولوالعزمی اور وہ وسعتِ قلب عطا فرما دی جو اِس منصبِ عظیم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے درکار تھی۔ آپؐ اُس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپؐ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپؐ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بڑے سے بڑے بگاڑ کو دُور کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آپ اِس قابل ہو گئے کہ جاہلیت میں مستغرق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اکھڑ معاشرے میں کسی سروسامان اور ظاہر کسی پُشت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر اسلام کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جائیں، مخالفت اور دُشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے بھی نہ ہچکچائیں، اِس راہ میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پیش آئیں اُن کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں، اور کوئی طاقت آپؐ کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکے۔ پس اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ، یہ شرحِ صدر کی بے بہا دولت جب اللہ نے آپ کو عطا کر دی ہے تو آپ اُن مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغازِ کار کے اس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں؟[1]

---

[1] بعض مفسّرین نے شرحِ صدر کو شقِّ صدر کے معنی میں لیا ہے اور اس آیت کو اُس معجزۂ شقِّ صدر کا ثبوت قرار

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ (آیت ۴) -

"اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔"[1]

یہ بات اُس وقت فرمائی گئی تھی جب کہ قریش کے سارے دشمنانِ اسلام حضورؐ کو بدنام کرنے میں لگے ہوئے تھے اور خاص طور پر حج کے زمانہ میں ولید بن مغیرہ کی تجویز کردہ اسکیم کے مطابق (جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں) حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جا کر آپؐ کے خلاف ایسی باتیں پھیلائی جا رہی تھیں جن سے لوگ آپؐ سے بدگمان ہو کر آپؐ سے دُور بھاگنے لگیں۔ پھر اس حالت میں یہ آپؐ کے رفعِ ذکر کی خوشخبری کیسی تھی؟

سب سے پہلے آپؐ کے رفعِ ذکر کا کام اللہ تعالیٰ نے خود آپؐ کے دشمنوں ہی سے لیا۔ کفّارِ مکّہ نے آپؐ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار کیے تھے ان کی وجہ سے آپؐ کا اسمِ گرامی عرب کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا اور مکّہ کے گوشۂ گمنامی سے نکال کر خود دشمنوں ہی نے آپؐ کو تمام ملک کے قبائل سے متعارف کرا دیا۔ اس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کہتا ہے؟ کیسا آدمی ہے؟ اس کے "جادو" سے متاثر ہونے والے لوگ کیسے ہیں اور اُن پر اس کے "جادو" کا آخر کیا اثر پڑا ہے؟ کفّارِ مکّہ کا پروپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا لوگوں میں یہ جستجو بڑھتی چلی گئی۔ پھر جب اس جستجو کے نتیجے میں لوگوں کو آپؐ کے اخلاق اور آپؐ کی سیرت و کردار کا حال معلوم ہوا، جب لوگوں نے قرآن سُنا اور انہیں پتہ چلا کہ وہ تعلیمات کیا ہیں جو آپؐ پیش فرما رہے ہیں، اور جب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس چیز کو جادو کہا جا رہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیاں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر بلند اور پاکیزہ ہو گئی ہیں، تو وہی بدنامی نیک نامی سے بدلنی شروع ہو گئی، حتیٰ کہ ہجرتِ مدینہ کا زمانہ آنے تک نوبت یہ پہنچ گئی کہ دُور و نزدیک کے عرب قبائل میں شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص یا کنبے نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپؐ کی دعوت سے ہمدردی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ یہ حضورؐ کے رفعِ ذکر کا پہلا مرحلہ تھا جو اس سُورہ کے

دیا ہے جو احادیث کی روایات میں بیان ہوا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزے کے ثبوت کا مدار احادیث کی روایات ہی پر ہے، قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرحِ صدر کو کسی طرح بھی شقِّ صدر کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ حمل الشرح فی الآیۃ علی شق الصدر ضعیف عند المحققین۔ محققین کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شقِّ پر محمول کرنا ایک کمزور بات ہے۔

[1] اس سے پہلے آیات ۲-۳ کی تشریح گزر چکی ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

نزول کے وقت گزر رہا تھا اور سب اس کے اثرات دیکھ رہے تھے۔

اس کے چند ہی سال بعد اس کے وہ مراحل پیش آئے ہیں کہ اس وقت کوئی بھی نہ دیکھ سکتا تھا، نہ ان کا تصور کر سکتا تھا۔ پس اللہ ہی ان کا علم رکھتا تھا، اور اسی نے ان کی بشارت حضور کو دی۔ ہجرت کے بعد منافقین، یہود، اور عرب کے تمام اکابر مشرکین ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زہد و تقویٰ، طہارتِ اخلاق، حسنِ معاشرت، عدل و انصاف، انسانی مساوات، مالداروں کی فیاضی، غریبوں کی خبر گیری، عہد و پیمان کی پاسداری اور معاملات میں راستبازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتا چلا جا رہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے ذریعہ سے حضور کے اس بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی کوشش کی، مگر آپ کی قیادت میں اہلِ ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے نظم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی موت سے بے خوفی، اور حالتِ جنگ تک میں اخلاقی حدود کی پابندی سے اپنی برتری اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ ۱۰ سال کے اندر حضور کا رفعِ ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اس کا گوشہ گوشہ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی صدا سے گونج اٹھا۔ پھر خلافتِ راشدہ کے دور سے آپ کا نامِ مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بڑھتا چلا جائے گا۔ دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں بآوازِ بلند محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان نہ ہو رہا ہو، نمازوں میں حضور پر درود نہ بھیجا جا رہا ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپ کا ذکرِ خیر نہ کیا جا رہا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جب روئے زمین میں کسی نہ کسی جگہ حضور کا ذکرِ مبارک نہ ہو رہا ہو۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی، اس وقت کے شدائد و مصائب سے تم کیوں پریشان ہوتے ہو، تمہارے رفعِ ذکر کا تو ہم نے وہ انتظام کیا ہے جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ حدیث میں حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جبریل میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح تمہارا رفعِ ذکر کیا؟ میں نے عرض کیا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا" (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابو یعلیٰ، ابن المنذر، ابن حبان، ابن مردویہ، ابو نعیم)۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ - (آیات ۵:۶)

"در حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔"

اس بات کو دو مرتبہ دہرایا گیا ہے تاکہ حضورؐ کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپ اس وقت گزر رہے ہیں یہ زیادہ دیر رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ان کے بعد قریب ہی اچھے حالات چلے آ رہے ہیں۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو، کیونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں۔ لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کے بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی لگا چلا آ رہا ہے۔ (۳۲)

حوالہ جات باب (۸)

① اضافہ از مؤلف

② تفہیم القرآن، جلد سوم، الانبیاء، خلاصہ حاشیہ ۵ و جلد چہارم خلاصہ دیباچہ حٰم السجدہ۔

③ اضافہ از مؤلف

④ تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورہ الکافرون۔

⑤ اضافہ از مؤلف

⑥ تفہیم القرآن، جلد چہارم، خلاصہ دیباچہ سورہ صٓ

⑦ دیباچہ سورہ صٓ

⑧ اضافہ از مؤلف

⑨ تفہیم القرآن، جلد ششم، خلاصہ دیباچہ سورہ کوثر حاشیہ ۴

⑩ 〃 ، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ ۳۰

⑪ 〃 ، جلد ششم، المعارج، حاشیہ ۲۴

⑫ 〃 ، جلد دوم، بنی اسرائیل، حاشیہ ۱۲۴

⑬ 〃 ، جلد چہارم، حٰم السجدہ، حاشیہ ۴۹

⑭ 〃 ، 〃 ، الشوریٰ، حاشیہ ۳۱

⑮ 〃 ، جلد ششم، المطففین، حاشیہ ۱۲

⑯ 〃 ، جلد دوم، النحل، حاشیہ ۲۲

⑰ 〃 ، جلد سوم، الانبیاء، حاشیہ ۷

⑱ 〃 ، جلد چہارم، لقمان، حاشیہ ۶

⑲ اضافہ از مؤلف

⑳ تفہیم القرآن، جلد ششم، دیباچہ سورہ مدثر

(۲۱) تفہیم القرآن، جلد ششم، تفسیر سورۂ مدثر

(۲۲) اضافہ از مؤلف

(۲۳) تفہیم القرآن، جلد پنجم، دیباچہ الرحمٰن

(۲۴) اضافہ از مؤلف

(۲۵) تفہیم القرآن، جلد سوم، دیباچہ سورۂ مریم و سورۂ عنکبوت حاشیہ ۱

(۲۶) اضافہ از مؤلف

(۲۷) تفہیم القرآن، جلد ششم، اللیل، خلاصہ حاشیہ ۱۰

(۲۸) اضافہ از مؤلف

(۲۹) تفہیم القرآن، جلد ششم، المزمل، حاشیہ ۵

(۳۰) " " " ، الضحیٰ، حواشی ۳ تا ۵

(۳۱) " " " ، الم نشرح حاشیہ ۱

(۳۲) " " " ، حواشی ۱ - ۳ - ۴

باب (۹)

ہجرتِ حبشہ

دین میں ہجرت کی اہمیت

قرآن مجید میں جہاد کے بعد دوسری اہم ترین چیز جس کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ہجرت ہے۔ اس ہجرت کی اسلام میں کیوں اتنی اہمیت ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ اہم اگر کوئی چیز ہے تو وہ نہ اس کا اپنا وطن ہے، نہ اس کی قوم ہے، نہ اس کی روٹی ہے، نہ اس کا پیٹ ہے، بلکہ اس کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ جن اصولوں پر وہ ایمان لایا ہے ان کے مطابق وہ زندگی بسر کرکے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر سکے۔ اگر وہ اُن اصولوں کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکے تو اس کے لیے آزادی کیا خود زندگی ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خدا کی راہ میں قربان کر دینا زیادہ بہتر سمجھے گا بہ نسبت اس کے کہ اُن اصولوں کو قربان کر دے جن پر اس کے ایمان کا انحصار ہے اور جن کے متعلق وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اصول حق ہیں اور خدا اور رسول کے دیے ہوئے ہیں۔

عرب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن پیروؤں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی وہ اسی بنا پر کی تھی۔ عرب اور قریشی اور مکی ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنے ملک، اپنے قبیلے اور اپنے شہر میں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی، لیکن کوئی آزادی اگر حاصل نہیں تھی تو صرف مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے وطن کو چھوڑا اور ایک دوسرے ملک میں چلے گئے جہاں ایک دوسری قوم آباد تھی اور ایک دوسری قوم کے ہاتھ میں حکومت تھی۔ اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو کیوں کی؟ آپ مکہ کے باشندے تھے۔ مکہ میں آپ کو وہ تمام حقوق حاصل تھے جو مکہ کے کسی شہری کو حاصل ہو سکتے تھے۔ آپ کے ساتھیوں کو بھی وہ تمام حقوق حاصل تھے جو کسی قریشی کو قریشی ہونے کی بنا پر حاصل ہوتے تھے، لیکن جس چیز کی وجہ سے آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے گھر بار چھوڑا، رشتہ داروں کو چھوڑ دیا، جائدادیں چھوڑ دیں اور تن کے کپڑوں میں نکل کھڑے ہوئے وہ چیز یہ تھی کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے

ان کو آزادی میسّر نہیں تھی۔ اسی آزادی کے لیے انہوں نے وطن چھوڑ دیا اور ایک دوسرے شہر میں جاکر آباد ہو گئے۔ (۱)

قرآن میں مسلمانوں کو ہجرت کے لیے تیار کیا جاتا ہے

مکہ میں جب مسلمانوں پر ظلم کی حد ہو گئی تو قرآن مجید میں اُن کو ہجرت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا گیا۔ ارشاد ہوا:-

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۔ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۔ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۔ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۔ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (العنکبوت - ۵۶ تا ۶۰)

"اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی بجالاؤ۔ ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے، پھر تم سب ہماری طرف ہی پلٹا کر لائے جاؤ گے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کو ہم جنّت کی بلند و بالا عمارتوں میں رکھیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی عمدہ اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے ——— اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے صبر کیا ہے اور جو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اُٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی اُن کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی، اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

پہلی آیت میں اشارہ ہے ہجرت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مکے میں خدا کی بندگی کرنا مشکل ہو گئی ہے تو ملک چھوڑ کر نکل جاؤ، خدا کی زمین تنگ نہیں ہے، جہاں بھی تم خدا کے بندے بن کر رہ سکتے ہو وہاں چلے جاؤ۔ تم کو قوم و وطن کی نہیں بلکہ اپنے خدا کی بندگی کرنی چاہیے۔ اِس میں یہ تلقین کی گئی کہ اصل چیز قوم، وطن اور ملک نہیں ہے بلکہ اللہ کی بندگی ہے۔ اگر کسی وقت قوم و وطن اور ملک کی محبت کے تقاضے اللہ کی بندگی کے تقاضوں سے ٹکرا جائیں تو وہی وقت مومن کے ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے۔ جو سچا مومن ہے وہ اللہ کی بندگی کرے گا اور قوم، وطن اور ملک کو لات مار دے گا۔ جو جھوٹا مدعی ایمان ہے وہ ایمان کو چھوڑ دیگا اور اپنی قوم اور اپنے ملک و وطن سے چمٹا رہے گا۔ اِس میں صراحت کے ساتھ مسلمانوں کو بتا دیا گیا کہ ایک سچا خدا پرست انسان محبِّ قوم و وطن تو ہو سکتا ہے مگر قوم پرست اور وطن پرست

نہیں ہو سکتا۔ اُس کے لیے خدا کی بندگی ہر چیز سے عزیز تر ہے جس پر وہ دنیا کی ہر چیز کو قربان کر دے گا مگر اُسے دنیا کی کسی چیز پر بھی قربان نہ کرے گا۔

دوسری آیت میں فرمایا کہ تم جان کی فکر نہ کرو۔ یہ تو کبھی نہ کبھی جانی ہی ہے۔ ہمیشہ رہنے کے لیے تو کوئی بھی دنیا میں نہیں آیا ہے۔ لہٰذا تمہارے لیے فکر کے لائق مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس دنیا میں جان کیسے بچائی جائے، بلکہ اصل لائقِ فکر مسئلہ یہ ہے کہ ایمان کیسے بچایا جائے اور خدا پرستی کے تقاضے کس طرح پورے کیے جائیں۔ آخر کار تمہیں پلٹ کر ہماری طرف ہی آنا ہے۔ اگر دنیا میں جان بچانے کے لیے ایمان کھو کر آئے تو اس کا نتیجہ کچھ اور ہو گا اور ایمان بچانے کے لیے جان کھو کر آئے تو اس کا انجام کچھ دوسرا ہو گا۔ پس فکر جو کچھ بھی کرنی ہے اس بات کی کرو کہ ہماری طرف جب پلٹو گے تو کیا لے کر پلٹو گے، جان پر قربان کیا ہوا ایمان؟ یا ایمان پر قربان کی ہوئی جان؟

تیسری اور چوتھی آیت میں بتایا گیا کہ اگر تم ایمان اور نیکی کے راستے پر چل کر بالفرض دنیا کی ساری نعمتوں سے محروم بھی رہ گئے اور دنیوی نقطۂ نظر سے سراسر ناکام بھی رہے تو یقین رکھو کہ اس کی تلافی بہر حال ہو گی اور نری تلافی ہی نہ ہو گی بلکہ بہترین اجر نصیب ہو گا۔ جو لوگ ہر طرح کی مشکلات اور مصائب اور نقصانات اور اذیتوں کے مقابلے میں ایمان پر قائم رہے ہوں جنہوں نے ایمان لانے کے خطرات کو اپنی جان پر جھیلا ہو اور منہ نہ موڑا ہو، جنہوں نے ترکِ ایمان کے فائدوں اور منفعتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو اور ان کی طرف ذرہ برابر التفات نہ کیا ہو، جنہوں نے کفار و فساق کو اپنے سامنے پھلتے پھولتے دیکھا ہو اور ان کی دولت و حشمت پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالی ہو، جنہوں نے بھروسا اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار اور اپنے کنبے قبیلے پر نہیں بلکہ اپنے رب پر کیا ہو، جو اسبابِ دنیوی سے قطع نظر کر کے محض اپنے رب کے بھروسے پر ایمان کی خاطر ہر خطرہ سہنے اور ہر طاقت سے ٹکرا جانے کے لیے تیار ہو گئے ہوں اور وقت آیا تو گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے ہوں، ایسے مومن و صالح بندوں کا اجر ان کے رب کے ہاں ہرگز ضائع نہ ہو گا۔ وہ اس دنیا میں بھی ان کی دستگیری فرمائے گا اور آخرت میں بھی ان کے عمل کا بہترین اجر دے گا۔

آخر میں یہ تلقین کی گئی کہ ہجرت کرنے میں فکرِ جان کی طرح فکرِ روزگار سے بھی تمہیں پریشان نہ ہونا چاہیے۔ آخر یہ بے شمار چرند و پرند اور آبی حیوانات جو ہوا اور خشکی اور پانی میں پھر رہے ہیں، ان میں سے کون اپنا رزق اٹھائے پھرتا ہے؟ اللہ ہی تو ان سب کو پال رہا ہے۔ جہاں جاتے ہیں اللہ کے فضل سے ان کو کسی نہ کسی طرح رزق مل ہی جاتا ہے۔ لہٰذا اہلِ ایمان یہ سوچ سوچ کر ہمت نہ ہاریں کہ اگر ایمان کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل گئے تو کھائیں گے کہاں سے۔ اللہ جہاں سے اپنی بے شمار مخلوق کو رزق دے رہا ہے انہیں بھی دے گا۔

دعوتِ حق کی راہ میں ایک مرحلہ ایسا آجاتا ہے جس میں ایک حق پرست آدمی کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ عالمِ اسباب کے تمام سہاروں سے قطع نظر کرکے محض اللہ کے بھروسے پر جان جوکھوں کی بازی لگا دے۔ ان حالات میں وہ لوگ کچھ نہیں کر سکتے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور قدم اٹھانے سے پہلے جان کے تحفظ اور رزق کے حصول کی ضمانتیں تلاش کرتے ہیں۔ درحقیقت اس طرح کے حالات بدلتے ہی اُن لوگوں کی طاقت سے ہیں جو سر ہتھیلی پر لے کر اُٹھ کھڑے ہوں اور ہر خطرے کو انگیز کرنے کے لیے بے دھڑک تیار ہو جائیں۔ انہی کی قربانیاں آخرکار وہ وقت لاتی ہیں جب اللہ کا کلمہ بلند ہوتا ہے اور اُس کے مقابلے میں سارے کلمے پست ہو کر رہ جاتے ہیں۔ (۲)

دوسری جگہ فرمایا:

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۔ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۔ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ (الزمر۔ آیت ۱۰)

"(اے نبیؐ) کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔ جن لوگوں نے اس دُنیا میں نیک رویّہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے۔ اور خدا کی زمین وسیع ہے۔ صبر کرنے والوں کو تو اُن کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔"

یہاں بھی اہلِ ایمان کو ہدایت فرمائی گئی کہ اگر اللہ کی بندگی کے لیے ایک جگہ تنگ ہو گئی ہے تو اُس کی زمین وسیع ہے، اپنا دین بچانے کے لیے کسی اور طرف نکل کھڑے ہو۔ اِس کے ساتھ اُن کو یہ خوشخبری بھی دی گئی کہ ان کے لیے دُنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔ ان کی دُنیا بھی سُدھرے گی اور آخرت بھی، کیونکہ انہوں نے دین کو دُنیا اور اس کے عیش و آرام و آسائش پر ترجیح دی ہے۔ محض دین کی خاطر گھر سے بے گھر، در سے بے در، وطن سے بے وطن ہو کر دوسرے شہر یا علاقہ میں ہجرت کی ہے۔ ایک شہر یا علاقہ یا ملک جب اللہ کی بندگی کرنے کے لیے تنگ ہو گیا تو وہ دوسری جگہ چلے گئے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے لیے بے حساب اجر ہے جو خدا پرستی اور نیکی کے راستے پر چلنے میں ہر طرح کے مصائب و شدائد برداشت کریں اور راہِ حق سے نہ ہٹیں۔ یہ بے حساب اجر کا وعدہ صرف ہجرت کرنے والوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ اُن لوگوں کے لیے بھی ہے جو ظلم کی سرزمین میں جم کر ہر آفت کا سامنا کرتے چلے جائیں۔ (۳)

ہجرت کے موقع پر ہدایات

قرآن مجید میں مکّہ کے مظلوم مسلمانوں کو صرف ہجرت کی تلقین ہی نہیں کی گئی، بلکہ دو قسم کی ہدایات بھی دی گئیں:

چونکہ مسلمان ہجرت کر کے ایک عیسائی ملک کی طرف جا رہے تھے اس لیے اِس موقع پر سُورۂ مریم نازل کی گئی جس کے ابتدائی دو رکوعوں میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسٰی علیہما السّلام کا قصّہ بیان کیا گیا ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اگرچہ مسلمان ایک مظلوم پناہ گزیں گروہ کی حیثیت سے جا رہے تھے، مگر اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ نے اُن کو دین کے معاملہ میں ذرّہ برابر مُداہنَت کرنے کی تعلیم نہ دی بلکہ چلتے وقت زادِ راہ کے طور پر یہ سُورۃ ان کے ساتھ کی تاکہ عیسائیوں کے ملک میں عیسٰی علیہ السّلام کی بالکل صحیح حیثیت پیش کریں اور اُن کے ابنُ اللہ ہونے کا صاف صاف انکار کر دیں، خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو۔

دوسری ہدایت یہ کی گئی کہ

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ وَقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا وَاُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمۡ وَاحِدٌ وَّنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ۔ (العنکبوت)

”اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے، سوائے اُن لوگوں کے جو ظالم ہوں، اور اُن سے کہو کہ ہم ایمان لاتے ہیں اُس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اُس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔“

یعنی اہلِ کتاب (عیسائیوں) سے جب سابقہ پیش آئے تو اُن میں سے جو ظالم ہیں ان سے تو اُلجھنے کی ضرورت نہیں، مگر جو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے تیار ہوں اُن سے نہایت معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں اور افہام و تفہیم کے انداز میں بحث کرو۔ ان کو بتاؤ کہ ہم کوئی متعصب گروہ نہیں ہیں جو اپنے ہاں آئی ہوئی کتاب کو مانتے ہوں اور تمہارے ہاں آئی ہوئی کتابوں کو نہ مانتے ہوں۔ ہم تو حق کے پرستار ہیں۔ خدا کی طرف سے جو کچھ ہمارے ہاں آیا ہے اسے بھی برحق مانتے ہیں اور جو تمہارے ہاں آیا تھا اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارا خدا اور تمہارا خدا جُدا جُدا نہیں ہے بلکہ ایک ہی خدا ہے جس کے ہم بھی ماننے والے ہیں اور تم بھی۔ ہم نے اُسی ایک خدا کی بندگی و اطاعت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ (۴)

ہجرتِ حبشۂ اُولیٰ

حالات جب ناقابلِ برداشت حد تک پہنچ گئے تو رجب ۵ عام الفیل (۵ بعد بعثت) میں حضورؐ نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا کہ لَوْ خَرَجْتُمْ اِلٰى اَرْضِ الْحَبَشَةِ فَاِنَّ بِهَا مَلِكًا لَا يُظْلَمُ عِنْدَهٗ اَحَدٌ وَهِيَ اَرْضُ صِدْقٍ حَتّٰى يَجْعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ فَرَجًا مِمَّا اَنْتُمْ فِيْهِ ”اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبش چلے جاؤ، وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ

تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔" اس ارشاد کے مطابق حبشہ کی طرف پہلی ہجرت ہوئی جس میں ۱۱ مرد اور چار خواتین نے حبشہ کی راہ لی۔ قریش کے لوگوں نے ساحل تک ان کا پیچھا کیا مگر خوش قسمتی سے شعیبہ کے بندرگاہ پر ان کو بروقت حبشہ کے لیے کشتی مل گئی اور وہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔ (۵)

پہلی ہجرت کے مہاجرین

ابن ہشام نے ابن اسحاق کے حوالہ سے اس پہلی ہجرت کے مہاجرین کی جو فہرست دی ہے وہ یہ ہے:-

(۱) بنی اُمیہ میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان۔

(۲) ان کی بیوی حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ ان کے ساتھ اُمّ ایمنؓ بھی گئی تھیں)۔

(۳) بنی عبدشمس بن عبد مناف میں سے حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ۔

(۴) اُن کی بیوی حضرت سہلہ بنت سہیل بن عمرو (جو بنی عامر بن لوئی میں سے تھیں)۔

(۵) بنی اسد بن عبد العزّٰی بن قصی میں سے حضرت زبیرؓ بن العوام۔ (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی)

(۶) بنی عبدالدار بن قصی میں سے حضرت مصعبؓ بن عمیر۔

(۷) بنی زہرہ بن کلاب میں سے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔

(۸) بنی مخزوم میں سے حضرت ابو سلمہؓ بن عبدالاسد۔

(۹) اُن کی بیوی اُمّ سلمہ (یہ بھی بنی مخزوم میں سے تھیں اور ابو جہل کی سگی چچا زاد بہن تھیں)

(۱۰) بنی جمح میں سے حضرت عثمان بن مظعون (اُمّ المومنین حضرت حفصہؓ کے ماموں)

(۱۱) حلفائے بنی عدی میں سے عامرؓ بن ربیعۃ العنزی (حلیف آلِ خطّاب)

(۱۲) اُن کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ۔ (یہ خود بنی عدی میں سے تھیں)۔

(۱۳) بنی عامر بن لوئی میں سے ابو سبرہؓ بن ابی رُہم۔

(۱۴) بنی الحارث بن فہر میں سے سہیل بن بیضاء۔

ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے ان پندرہ ناموں کا اضافہ کیا ہے۔ حاطبؓ بن عمرو بن عبد شمس اور عبداللہ بن مسعودؓ حلیف بنی زہرہ۔ ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ بعد میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب بھی اُن سے جا ملے تھے۔ مگر موسیٰ بن عقبہ نے مغازی میں بیان کیا ہے کہ وہ پہلی ہجرت میں نہیں بلکہ

دوسری ہجرت میں ساتھ گئے تھے۔ اور ابن اسحٰق نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود پہلی ہجرت کے مہاجرین میں سے نہیں بلکہ دوسری ہجرت کے مہاجرین میں سے تھے۔ نیز زرقانی نے بعض سیرت نگاروں کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ ابو سبرہ کے ساتھ ان کی بیوی ام کلثوم بھی گئی تھیں جو سہیل بن عمرو کی دوسری بیٹی تھیں۔ بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ان میں سب سے پہلے نکلنے والے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تھے اور ان کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے بعد عثمانؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے گھر والوں کے ساتھ ہجرت کی ہے۔

مہاجرین کے ساتھ حبشہ میں سلوک

ابن جریر طبری کہتے ہیں کہ حبشہ قریش کی پرانی تجارت گاہ تھی جہاں وہ خوب رزق کماتے اور تجارت میں اچھے فائدے اٹھاتے تھے۔ اسی وجہ سے مہاجرین کو وہاں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ مہاجرین کا اپنا قول یہ ہے کہ ہم وہاں بہت اچھی طرح رہے، اپنے دین کے معاملہ میں پورے امن سے تھے، اللہ کی عبادت کرتے تھے، کوئی اذیت ہم کو نہ دی جاتی تھی اور نہ کوئی بات ہمیں ایسی سننی پڑتی تھی جو ہمیں ناگوار ہو۔

قریش کا وفد ان کے پیچھے جاتا ہے

قریش نے جب دیکھا کہ یہ لوگ حبشہ میں امن کے ساتھ ٹک گئے ہیں تو انہوں نے عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ابی ربیعہ کو ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ نجاشیؒ کے پاس (جس کا نام بخاری میں اَصْحَمَہ لکھا ہے) بھیجا تاکہ انہیں واپس لائیں لیکن نجاشی نے ان کی بات نہ مانی اور انہیں ناکام واپس کر دیا۔ اس وفد کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ ان دونوں کے ساتھ عمارہ بن ولید بن مغیرہ بھی بھیجا گیا تھا اور بعض میں یہ ہے کہ عمرو بن العاص تو پہلی اور دوسری ہجرت، دونوں کے موقع پر نجاشی کے پاس بھیجے گئے تھے، مگر پہلے وفد میں ان کے ساتھ عمارہ تھا اور دوسرے وفد میں عبداللہ۔ مگر ابن اسحاق نے دونوں موقعوں پر عبداللہ ہی کا نام لیا ہے۔ (۶)

مہاجرین کی واپسی اور اس کا سبب

اسی سال رمضان میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی خبر حبش میں مہاجرین کو اس شکل میں پہنچی کہ کفار مکہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حرم پاک میں، جہاں قریش کے لوگوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا، یکایک تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی زبان مبارک

؎ نجاشی (Negus) شاہانِ حبشہ کا لقب تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

پر سورۂ نجم جاری فرمادی۔ کلام کی شدتِ تاثیر کا حال یہ تھا جب آپؐ نے اسے سُنانا شروع کیا تو مخالفین کو اس
پُرشور مچانے کا ہوش تک نہ رہا، اور خاتمہ پر جب آپؐ نے سجدہ فرمایا تو سب حاضرین سجدہ میں گر گئے۔ بخاری،
مسلم، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ "یہ قرآن مجید کی پہلی سُورۃ تھی جسے حضورؐ
نے قریش کے مجمع عام میں (اور ابن مَردُویہ کی روایت کے مطابق حرم میں) سُنایا تھا۔ مجمع میں کافر و مومن سب
موجود تھے۔ آخر میں جب آپؐ نے آیتِ سجدہ پڑھ کر سجدہ فرمایا تو تمام حاضرین آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر
گئے اور مشرکین کے وہ بڑے بڑے سردار تک، جو مخالفت میں پیش پیش تھے سجدہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ میں نے
کفار میں سے صرف ایک شخص اُمیّہ بن خَلَف کو دیکھا کہ اُس نے سجدہ کرنے کے بجائے کچھ مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی سے
لگالی اور کہا میرے لیے بس یہی کافی ہے۔" اِس واقعہ کے دوسرے عینی شاہد حضرت مطّلبؓ بن ابی وداعہ
ہیں جو اُس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ نسائی اور مُسند احمد میں اُن کا اپنا بیان یہ نقل ہُوا ہے کہ "جب
حضورؐ نے سُورۂ نجم پڑھ کر سجدہ کیا اور سب حاضرین آپؐ کے ساتھ سجدے میں گر گئے تو میں نے سجدہ نہ کیا اور
اُسی کی تلافی اب میں اِس طرح کرتا ہوں کہ اس سُورہ کی تلاوت کے وقت سجدہ کبھی نہیں چھوڑتا۔" ابن سعد نے
واقدی کی سند سے بیان کیا ہے کہ ولید بن مُغیرہ نے بھی مُٹھی بھر مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی پر لگالی تھی، کیونکہ بڑھاپے
کی وجہ سے وہ سجدہ نہ کرسکتا تھا۔ اور ابواُحَیحہ سعید بن العاص نے بھی اسی طرح مٹی اپنی پیشانی پر لگالی تھی کیونکہ
وہ بھی بوڑھا تھا۔

اسی سے یہ خبر مشہور ہوکر حبشہ تک اِس شکل میں پہنچی کہ مشرکین قریش مسلمان ہوگئے ہیں مگر اصل صورت
حال دوسری ہی تھی۔ قرآن کی شدتِ تاثیر سے متاثر ہوکر سجدہ کرنے والے اُس وقت تو سجدہ کر بیٹھے مگر بعد
میں اُنہیں سخت پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ ہم سے کیا کمزوری سرزد ہوگئی۔ اور لوگوں نے بھی ان کو مطعون کرنا شروع
کیا کہ دوسروں کو تو یہ کلام سُننے سے منع کرتے تھے، آج خود اسے کان لگا کر سُنا ہی نہیں بلکہ محمد (صلی اللہ علیہ
وسلم) کے ساتھ سجدہ بھی کرلیا۔ آخرکار انہوں نے یہ بات بنا کر اپنا پیچھا چھڑایا کہ صاحب ہم نے تو اَفَرَءَیْتُمُ
اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی کے بعد محمدؐ کی زبان سے یہ الفاظ سُنے تھے کہ تلک الغرانقۃ
العلیٰ وانّ شفاعتھن لترتجیٰ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)، اس لیے ہم نے
سمجھا کہ محمدؐ ہمارے طریقے پر آگئے ہیں۔ حالانکہ کوئی پاگل آدمی ہی یہ سوچ سکتا تھا کہ سورۂ نجم کے اِس سیاق و
سباق میں اُن فقروں کی بھی کوئی جگہ ہوسکتی ہے جو اُن کا دعویٰ تھا کہ اُن کے کانوں نے حضورؐ کی زبان سے
سُنے ہیں۔ (۴)

قصۂ غرانیق کی حقیقت

لیکن افسوس یہ ہے کہ خود ہمارے ہاں کے مفسرین و محدثین میں بعض ایسی روایات مشہور ہو گئی ہیں جن سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کفار نے حضورؐ کی زبانِ مبارک سے جو فقرے سننے کا دعویٰ کیا تھا وہ فی الواقع حضورؐ کی زبان سے نکلے تھے، اور اس تمنا کی وجہ سے نکلے تھے کہ کسی طرح آپؐ کے اور کفار کے درمیان منافرت دُور ہو، اور شیطان نے آپؐ کی اس تمنا سے فائدہ اُٹھا کر یہ کلمات آپؐ کی زبان پر جاری کرا دیے تھے۔

قصہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ کاش قرآن میں کوئی ایسی بات نازل ہو جائے جس سے اسلام کے خلاف کفارِ قریش کی نفرت دُور ہو اور وہ کچھ قریب آ جائیں۔ یا کم از کم ان کے دین کے خلاف ایسی سخت تنقید نہ ہو جو انہیں بھڑکا دینے والی ہو۔ یہ تمنا آپؐ کے دل ہی میں تھی کہ ایک روز قریش کی ایک بڑی مجلس میں بیٹھے ہوئے آپؐ پر سورۂ نجم نازل ہوئی اور آپؐ نے اسے پڑھنا شروع کیا جب آپؐ اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی پر پہنچے تو یکایک آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے تلک الغرانیق العُلیٰ وان شفاعتهن لترتجیٰ (یہ بلند مرتبہ دیویاں ہیں۔ ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے)۔ اس کے آگے پھر آپ سورۃ کی آیات پڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ جب اختتامِ سورہ پر آپؐ نے سجدہ کیا تو مشرک اور مسلمان سب سجدے میں گر گئے۔ کفارِ قریش نے کہا کہ اب ہمارا محمدؐ سے کیا اختلاف باقی رہ گیا۔ ہم بھی تو یہی کہتے تھے کہ خالق و رازق اللہ ہی ہے، البتہ ہمارے یہ معبود اُس کے حضور میں ہمارے شفیع ہیں۔ شام کو جبریلؑ آئے اور انہوں نے کہا یہ آپؐ نے کیا کیا؟ یہ دونوں فقرے تو میں نہیں لایا تھا۔ اس پر آپؐ سخت مغموم ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے وہ آیت نازل کی جو سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۸ میں ہے کہ وَاِنْ کَادُوْا لَیَفْتِنُوْنَکَ عَنِ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْکَ لِتَفْتَرِیَ عَلَیْنَا غَیْرَہٗ ...... ثُمَّ لَا تَجِدُ لَکَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا۔ یعنی "اے نبیؐ، ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اُس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو ...... پھر ہمارے مقابلہ میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔" یہ چیز برابر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج و غم میں مبتلا کیے رہی یہاں تک کہ سورۂ حج کی آیت ۵۲ نازل ہوئی جس میں آنحضرتؐ

---

[1] ایک مغربی مستشرق نے کمال بددیانتی کے ساتھ یہ بات اپنی طرف سے گھڑ کر لکھ دی ہے کہ "وہ شیطانی آیتیں منسوخ کر کے ان کی جگہ سورۂ نجم کی آیات ۲۱ تا ۲۳ نازل کر دیں" حالانکہ یہ قطعی بلا ثبوت بات ہے جس کے لیے کوئی حوالہ نہ اس مستشرق نے دیا ہے، نہ وہ دے سکتا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کو تسلی دی گئی کہ تم سے پہلے بھی انبیاء کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے کہ جب کسی نبی نے کوئی تمنّا کی تو شیطان اس کی تمنّا میں خلل انداز ہو گیا۔ اِس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل اندازیاں کرتا ہے اللہ اُن کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔

اُدھر یہ واقعہ کہ قرآن سُن کر آنحضرتؐ کے ساتھ قریش کے لوگوں نے بھی سجدہ کیا، مہاجرین حبشہ تک اِس رنگ میں پہنچا کہ آنحضرتؐ اور کفارِ مکّہ کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے مہاجرین مکّہ واپس آ گئے۔ مگر یہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہُوا کہ صلح کی خبر غلط تھی، اسلام اور کُفر کی دشمنی جوں کی توں قائم ہے۔

یہ قصّہ ابنِ جریر اور بہت سے مُفسّرین نے اپنی تفسیروں میں، ابن سعد نے طبقات میں، الواحدی نے اسبابُ النّزول میں، مُوسیٰ بن عُقبہ نے مَغازی میں، ابنِ اسحاق نے سیرت میں اور ابن ابی حاتم، ابن المُنذِر، بزّار، ابنِ مَرْدُوْیَہ اور طَبَرانی نے اپنے احادیث کے مجموعوں میں نقل کیا ہے۔ جن سندوں سے یہ نقل ہُوا ہے وہ محمد بن قیس، محمد بن کعب قُرظی، عُروَہ بن زُبیر، ابو صالح، ابو العالیہ، سعید بن جُبیر، ضَحّاک، ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارث، قتادہ، مجاہد، سُدّی، ابن شہاب زُہری، اور ابن عباسؓ پر ختم ہوتی ہیں (ابن عباسؓ کے سوا ان میں سے کوئی صحابی نہیں ہے)۔ قصّے کی تفصیلات میں چھوٹے چھوٹے اختلافات کو چھوڑ کر دو بہت بڑے اختلافات ہیں۔ ایک یہ کہ بُتوں کی تعریف میں جو کلمات نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف منسوب کیے گئے ہیں وہ قریب قریب ہر روایت میں دوسری روایت سے مختلف ہیں۔ ہم نے اُن کا استقصاء کرنے کی کوشش کی تو دس عبارتیں الگ الگ الفاظ میں پائیں۔ دوسرا بڑا اختلاف یہ ہے کہ کسی روایت کی رُو سے یہ الفاظ دورانِ وحی میں شیطان نے آپؐ پر القا کر دیے اور آپؐ سمجھے کہ یہ بھی جبریلؑ لائے ہیں۔ کسی روایت میں ہے کہ یہ الفاظ اپنی اُسی خواہش کے زیرِ اثر سہوًا آپؐ کی زبان سے نکل گئے۔ کسی میں ہے کہ اُس وقت آپؐ کو اُونگھ آ گئی تھی اور اِس حالت میں یہ الفاظ نکلے۔ کسی کا بیان ہے کہ آپؐ نے یہ قصداً کہے مگر استفہامِ انکاری کے طور پر کہے۔ کسی کا قول ہے کہ شیطان نے آپؐ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے اور سمجھا یہ گیا کہ آپؐ نے کہے ہیں۔ اور کسی کے نزدیک کہنے والا مشرکین میں سے کوئی شخص تھا۔

ابن کثیر، بَیہقی، قاضی عیاض، ابن خُزَیمہ، قاضی ابوبکر ابن العربی، امام رازی، قُرطبی، بدرالدین عینی، شَوکانی، آلوسی وغیرہ حضرات اس قصّے کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں۔ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ جتنی سندوں سے یہ روایت ہُوا ہے، سب مُرسَل اور مُنقطع ہیں، مجھے کسی صحیح مُتّصل سند سے یہ نہیں ملا۔ بَیہقی کہتے ہیں کہ "از رُوئے نقل یہ قصّہ ثابت نہیں ہے"۔ ابن خُزیمہ سے اس کے متعلق پُوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ "یہ زنادقہ کا گھڑا ہُوا ہے"۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ "اس کی کمزوری اِسی سے ظاہر ہے کہ صحاحِ ستّہ کے مؤلّفین میں سے کسی نے بھی اس کو اپنے

ہاں نقل نہیں کیا اور نہ یہ کسی صحیح متصل بے عیب سند کے ساتھ ثقہ راویوں سے منقول ہوا ہے۔" امام رازی، قاضی ابو بکر اور آلوسی نے اس پر مفصل بحث کر کے اسے بڑے پُر زور طریقے سے رد کیا ہے لیکن دوسری طرف حافظ ابن حجر جیسے بلند پایہ محدث اور ابو بکر جصاص جیسے نامور فقیہ اور زمخشری جیسے عقلیت پسند مفسر اور ابن جریر جیسے امامِ تفسیر و تاریخ و فقہ اس کو صحیح مانتے ہیں اور اسی کو سورۂ حج کی آیت ۵۲ کی تفسیر قرار دیتے ہیں۔ ابن حجر کا محدثانہ استدلال یہ ہے کہ:

"سعید بن جبیر کے طریق کے سوا باقی جن طریقوں سے یہ روایت آئی ہے وہ یا تو ضعیف ہیں یا منقطع، مگر طریقوں کی کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس کی کوئی اصل ہے ضرور۔ علاوہ بریں یہ ایک طریقہ سے متصلاً بسند صحیح بھی نقل ہوا ہے جسے بزّار نے نکالا ہے (مراد ہے یوسف بن حماد عن امیہ بن خالد عن شعبہ عن ابی بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباس) اور دو طریقوں سے یہ اگرچہ مرسل ہے مگر اس کے راوی صحیحین کی شرط کے مطابق ہیں۔ یہ دونوں روایتیں طبری نے نقل کی ہیں۔ ایک بطریق یونس بن یزید عن ابن شہاب۔ دوسری بطریق معتمر بن سلیمان و حماد بن سلمہ عن داؤد بن ابی ہند عن ابی العالیہ۔"

جہاں تک موافقین کا تعلق ہے، وہ تو اسے صحیح مان ہی بیٹھے ہیں۔ لیکن مخالفین نے بھی بالعموم اس پر تنقید کا حق ادا نہیں کیا ہے۔ ایک گروہ اسے اس لیے رد کرتا ہے کہ اس کی سند اس کے نزدیک قوی نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر سند قوی ہوتی تو یہ حضرات اس قصّے کو مان لیتے۔ دوسرا گروہ اسے اس لیے رد کرتا ہے کہ اس سے تو سارا دین ہی مشتبہ ہوا جاتا ہے اور دین کی ہر بات کے متعلق شک پیدا ہو جاتا ہے کہ نہ معلوم اور کہاں کہاں شیطانی اغوا یا نفسانی آمیزشوں کا دخل ہو گیا ہو۔ حالانکہ اس نوعیت کا استدلال اُن لوگوں کو تو مطمئن کر سکتا ہے جو ایمان لانے کے عزم پر قائم ہوں، مگر دوسرے لوگ جو پہلے ہی شکوک میں مبتلا ہیں یا جو اب تحقیق کر کے فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں، ان کے دل میں تو یہ جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا کہ جن جن چیزوں سے یہ دین مشتبہ قرار پاتا ہو انہیں رد کر دیں۔ وہ تو کہیں گے کہ جب کم از کم ایک نامور صحابی اور بکثرت تابعین و تبع تابعین، اور متعدد معتبر راویانِ حدیث کی روایت سے ایک واقعہ ثابت ہو رہا ہے تو اسے صرف اس بنا پر کیوں رد کر دیا جائے کہ ان سے آپ کا دین مشتبہ ہُوا جاتا ہے؟ اس کے بجائے آپ کے دین کو مشتبہ کیوں نہ سمجھا جائے جبکہ یہ واقعہ اسے مشتبہ ثابت کر ہی رہا ہے؟

اب دیکھنا چاہیے کہ تنقید کا وہ صحیح طریقہ کیا ہے جس سے اگر اس قصّے کو پرکھ کر دیکھا جائے تو یہ

ناقابلِ قبول قرار پاتا ہے، چاہے اس کی سند کتنی ہی قوی ہو، یا قوی ہوتی۔
پہلی چیز خود اس کی اندرونی شہادت ہے جو اسے غلط ثابت کرتی ہے۔ قصّے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ہجرتِ حبشہ اُولیٰ واقع ہو چکی تھی اور اس واقعے کی خبر پا کر مہاجرین میں سے ایک گروہ مکّہ واپس آ گیا۔ اب ذرا تاریخوں کا فرق ملاحظہ کیجیے۔
___ ہجرتِ حبشہ معتبر تاریخی روایتوں کی رُو سے رجب ۵ھ بعد بعثت میں واقع ہوئی اور مہاجرینِ حبشہ کا ایک گروہ مصالحت کی غلط خبر سُن کر تین مہینے بعد (یعنی اسی سال تقریباً شوال کے مہینے میں) مکّے واپس آ گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ لامحالہ ۵ھ بعد بعثت کا ہے۔
___ سورۂ بنی اسرائیل جس کی ایک آیت کے متعلق بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل پر بطورِ عتاب نازل ہوئی تھی معراج کے بعد اُتری ہے اور معراج کا زمانہ معتبر ترین روایات کی رُو سے ۱۱ھ یا ۱۲ھ بعد بعثت ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس فعل پر پانچ چھ سال جب گزر چکے تب اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا۔
___ اور سورۂ حج کی آیت ۵۲، جیسا کہ اس کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے، ۱ھ ہجری میں نازل ہوئی ہے یعنی عتاب پر بھی جب مزید دو ڈھائی سال گزر لیے تب اعلان کیا گیا کہ یہ آمیزش تو القائے شیطانی سے ہو گئی تھی، اللہ نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔
کیا کوئی صاحبِ عقل آدمی باور کر سکتا ہے کہ آمیزش کا فعل آج ہو، عتاب چھ سال بعد، اور آمیزش کی تنسیخ کا اعلان ۹ سال بعد؟
پھر اس قصّے میں بیان کیا گیا ہے کہ یہ آمیزش سورۂ نجم میں ہوئی تھی اور اس طرح ہوئی کہ ابتدا سے آپ اصل سورہ کے الفاظ پڑھتے چلے آ رہے تھے، یکایک مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی پر پہنچ کر آپ نے بطورِ خود یا شیطانی اغوا سے یہ فقرہ ملا دیا، اور آگے پھر سورۂ نجم کی اصل آیات پڑھتے چلے گئے۔ اس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ کفارِ مکّہ اسے سُن کر خوش ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ اب ہمارا اور محمدؐ کا اختلاف ختم ہو گیا۔ مگر سورۂ نجم کے سلسلۂ کلام میں ذرا اس الحاقی فقرے کو شامل کر کے تو دیکھیے:
"پھر تم نے کچھ غور بھی کیا، اِن لات اور عُزّیٰ پر اور تیسری ایک اور دیوی منات پر؟ یہ بلند پایہ دیویاں ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے۔ کیا تمہارے لیے تو ہوں بیٹے اور اس (یعنی اللہ) کے لیے ہوں بیٹیاں؟ یہ تو بڑی بے انصافی کی تقسیم ہے۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل

نہیں کی۔ لوگ محض گمان اور من مانے خیالات کی پیروی کر رہے ہیں حالانکہ اُن کے رب کی طرف سے صحیح رہنمائی آگئی ہے۔"

دیکھیے، اِس عبارت میں خط کشیدہ فقرے نے کیسا صریح تضاد پیدا کر دیا ہے۔ ایک سانس میں کہا جاتا ہے کہ "واقعی تمہاری یہ دیویاں بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے"۔ دوسرے ہی سانس میں پلٹ کر اُن پر چوٹ کی جاتی ہے کہ "بے وقوفو، یہ تم نے خدا کے لیے بیٹیاں کیسی تجویز کر رکھی ہیں؟ اچھی دھاندلی ہے کہ تمہیں تو ملیں بیٹے اور خدا کے حصے میں آئیں بیٹیاں۔ یہ سب تمہارا من گھڑت ہے جسے خدا کی طرف سے کوئی سند اعتبار حاصل نہیں ہے"۔ تھوڑی دیر کے لیے اِس سوال کو جانے دیجیے کہ یہ صریح بے تکی باتیں کسی مرد عاقل کی زبان سے نکل بھی سکتی ہیں یا نہیں۔ مان لیجیے کہ شیطان نے غلبہ پا کر یہ الفاظ زبان سے نکلوا دیے تھے۔ مگر کیا قریش کا وہ سارا مجمع جو اسے سُن رہا تھا، بالکل ہی پاگل ہو گیا تھا کہ بعد کے فقروں میں اُن تعریفی کلمات کی کھلی کھلی تردید سُن کر بھی وہ یہی سمجھتا رہا کہ ہماری دیویوں کی واقعی تعریف کی گئی ہے؟ سورۂ نجم کے آخر تک کا پورا مضمون اِس ایک تعریفی فقرے کے بالکل خلاف ہے۔ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ اسے آخر تک سُننے کے بعد یکبارگی پکار اُٹھے ہوں گے کہ بس آج ہمارا اور محمد کا اختلاف ختم ہو گیا؟

یہ تو ہے اِس قصے کی اندرونی شہادت جو اس کے سراسر لغو اور مہمل ہونے کی گواہی دے رہی ہے۔ اس کے بعد دوسری چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ اس میں تین آیتوں کی جو شانِ نزول بیان کی جا رہی ہے آیا قرآن کی ترتیب بھی اس کو قبول کرتی ہے؟ قصے میں بیان یہ کیا جا رہا ہے کہ آمیزش سورۂ نجم میں کی گئی تھی، جو سنہ ۵ بعد بعثت میں نازل ہوئی۔ اس آمیزش پر سورۂ بنی اسرائیل والی آیت میں عتاب فرمایا گیا، اور پھر اس کی تنسیخ اور واقعہ کی توجیہ سورۂ حج کی آیت میں کی گئی۔ اب لامحالہ دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت پیش آئی ہو گی۔ یا تو عتاب اور تنسیخ والی آیتیں بھی اُسی زمانے میں نازل ہوئی ہوں جبکہ آمیزش کا واقعہ پیش آیا، یا پھر عتاب والی آیت سورۂ بنی اسرائیل کے ساتھ اور تنسیخ والی آیت سورۂ حج کے ساتھ نازل ہوئی ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں آیتیں سورۂ نجم ہی میں نہ شامل کی گئیں بلکہ عتاب والی آیت کو چھ سال تک یونہی ڈالے رکھا گیا اور سورۂ بنی اسرائیل جب نازل ہوئی تب کہیں اُس میں لا کر چپکا دیا گیا، پھر تنسیخ والی آیت مزید دو ڈھائی برس تک پڑی رہی اور سورۂ حج کے نزول تک اُسے کہیں نہ چسپاں کیا گیا۔ کیا قرآن کی ترتیب اِسی طرح ہوئی ہے کہ ایک موقع کی نازل شدہ آیتیں الگ الگ بکھری پڑی رہتی تھیں اور برسوں کے بعد کسی کو کسی سورت میں اور کسی کو کسی دوسری سورت میں ٹانک دیا

جاتا تھا؟ لیکن اگر دوسری صورت ہے کہ عتاب والی آیت واقعہ کے ۹ سال بعد اور تنسیخ والی آیت آٹھ نو سال بعد نازل ہوئی تو علاوہ اُس بے تکے پن کے جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سُورۂ بنی اسرائیل اور سُورۂ حج میں ان کے نزول کا موقع کیا ہے؟

یہاں پہنچ کر نقدِ صحیح کا تیسرا قاعدہ ہمارے سامنے آتا ہے، یعنی یہ کہ کسی آیت کی جو تفسیر بیان کی جا رہی ہو اسے دیکھا جائے کہ آیا قرآن کا سیاق و سباق بھی اسے قبول کرتا ہے یا نہیں۔ سُورۂ بنی اسرائیل کا آٹھواں رکوع پڑھ کر دیکھیے اور اُس سے پہلے اور بعد کے مضمون پر بھی نگاہ ڈال لیجیے۔ اِس سلسلۂ کلام میں آخر کیا موقع اِس بات کا نظر آتا ہے کہ چھ سال پہلے کے ایک واقعہ پر نبی کو ڈانٹ بتائی جائے؟ قطع نظر اس سے کہ آیت وَإِنْ كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ میں نبی پر کوئی ڈانٹ ہے بھی یا نہیں اور آیت کے الفاظ کُفّار کے فتنے میں نبی کے مبتلا ہو جانے کی تردید کر رہے ہیں یا تصدیق؟ اسی طرح سُورۂ حج پڑھ کر دیکھیے۔ آیت ۵۲ سے پہلے کا مضمون پڑھیے اور بعد کا بھی دیکھیے۔ کیا کوئی معقول وجہ آپ کی سمجھ میں آتی ہے کہ اِس سیاق و سباق میں یکایک یہ مضمون کیسے آ گیا کہ "اے نبی ۹ سال پہلے قرآن میں آمیزش کر بیٹھنے کی جو حرکت تم سے ہو گئی تھی اس پر گھبراؤ نہیں، پہلے انبیاء سے بھی شیطان یہ حرکتیں کراتا رہا ہے، اور جب کبھی انبیاء اس طرح کا فعل کر جاتے ہیں تو اللہ اس کو منسوخ کر کے اپنی آیات کو پھر پختہ کر دیتا ہے"۔

ہم اِس سے پہلے بھی بارہا کہہ چکے ہیں، اور یہاں پھر اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ کوئی روایت، خواہ اس کی سند آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہو، ایسی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جبکہ اس کا متن اُس کے غلط ہونے کی کھلی کھلی شہادت دے رہا ہو اور قرآن کے الفاظ، سیاق و سباق، ترتیب، ہر چیز اُسے قبول کرنے سے انکار کر رہی ہو۔ یہ دلائل تو ایک مُتشکّک اور بے لاگ محقق کو بھی مطمئن کر دیں گے کہ یہ قصہ قطعی غلط ہے۔ رہا مومن، تو وہ اسے ہرگز نہیں مان سکتا جبکہ وہ علانیہ یہ دیکھ رہا ہے کہ یہ روایت قرآن کی ایک نہیں بیسیوں آیتوں سے ٹکراتی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ مان لینا بہت آسان ہے کہ خود اس روایت کے راویوں کو شیطان نے بہکا دیا، بہ نسبت اس کے کہ وہ یہ مان لے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اپنی خواہشِ نفس سے قرآن میں ایک لفظ بھی ملا سکتے تھے، یا حضورؐ کے دل میں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال آ سکتا تھا کہ توحید کے ساتھ شرک کی کچھ آمیزش کر کے کفار کو راضی کیا جائے، یا آپ اللہ تعالیٰ کے فرامین کے بارے میں کبھی یہ آرزو کر سکتے تھے کہ کاش اللہ میاں ایسی کوئی بات نہ فرمائیں جس سے کفار ناراض ہو جائیں، یا یہ کہ آپؐ پر وحی کسی ایسے غیر محفوظ اور مشتبہ طریقے سے آتی تھی کہ جبریلؑ کے ساتھ شیطان بھی آپ پر کوئی لفظ اِلقا کر جائے

اور آپ اس غلط فہمی میں رہیں کہ یہ بھی جبریلؑ ہی لاتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات قرآن کی کھلی کھلی تصریحات کے خلاف ہے اور اُن ثابت شدہ عقائد کے خلاف ہے جو ہم قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رکھتے ہیں۔ خدا کی پناہ اس روایت پرستی سے جو محض سند کا اتصال یا راویوں کی ثقاہت یا طرق روایت کی کثرت دیکھ کر کسی مسلمان کو خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کے بارے میں ایسی سخت باتیں بھی تسلیم کرنے پر آمادہ کر دے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں اُس شک کو بھی دُور کر دیا جائے جو راویانِ حدیث کی اتنی بڑی تعداد کو اس قصّے کی روایت میں مبتلا ہوتے دیکھ کر دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک شخص سوال کر سکتا ہے کہ اگر اس قصّے کی کوئی اصلیت ہی نہیں ہے تو حدیث اور قرآن پر اتنا بڑا بہتان حدیث کے اتنے راویوں کے ذریعہ سے جن میں بعض بڑے نامور ثقہ بزرگ ہیں، اشاعت کیسے پا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے اسباب کا سراغ ہم کو خود حدیث ہی کے ذخیرے میں مل جاتا ہے۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، اور مسند احمد میں اصل واقعہ اس طرح آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی، اور خاتمے پر جب آپؐ نے سجدہ کیا تو تمام حاضرین، مسلم اور مشرک سب، سجدے میں گر گئے۔ واقعہ بس اتنا ہی تھا، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ اوّل تو قرآن کا زورِ کلام اور انتہائی پُر تاثیر اندازِ بیان، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کا ایک خاص شان کے ساتھ ادا ہونا، اُس کو سن کر اگر پڑھنے والے پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہو، اور آپؐ کے ساتھ سارا مجمع سجدے میں گر گیا ہو تو کچھ بعید نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز تھی جس پر قریش کے لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ البتہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں قریش کے لوگ اپنے اس وقتی تاثر پر کچھ پشیمان سے ہونے لگے اور ان میں سے کسی نے یا بعض لوگوں نے اپنے اس فعل کی یہ توجیہ کی ہو گی کہ صاحب ہمارے کانوں نے تو محمدؐ کی زبان سے اپنے معبودوں کی تعریف میں کچھ کلمات سُنے تھے اس لیے ہم بھی ان کے ساتھ سجدے میں گر گئے۔[1] دوسری طرف یہی واقعہ مہاجرینِ حبشہ تک اس شکل میں پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح ہو گئی ہے کیونکہ دیکھنے والے نے آپؐ کو اور مشرکین و مومنین سب کو ایک ساتھ سجدہ کرتے دیکھا تھا۔ یہ افواہ ایسی گرم ہوئی کہ مہاجرینِ حبشہ یا اُن میں سے اکثر مکّے واپس آ گئے۔ ایک صدی کے اندر

---

[1] یاقوت نے مُعجم البلدان میں لفظ عُزّیٰ کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ قریش کے لوگ کعبے کا طواف کرتے ہوئے یہ الفاظ کہا کرتے تھے: وَاللّات والعُزّی، ومَناۃ الثالثۃ الاُخریٰ، فانھنّ الغرانیق العُلیٰ، وان شفاعتھن لتُرتجیٰ۔ اس سے یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ حضورؐ کی زبان سے لات و عزّیٰ کا ذکر سُنتے ہی کسی شخص نے آپؐ کی آواز میں آواز ملا کر یہ الفاظ کہہ دیے ہوں اور دُور سے سُننے والوں کو اس سے غلط فہمی لاحق ہوئی ہو۔ (حاشیہ از مؤلف)

یہ تینوں باتیں، یعنی قریش کا سجدہ، اُس سجدے کی یہ توجیہ، اور مہاجرین حبشہ کی واپسی، مل جل کر ایک قصے کی شکل اختیار کر گئیں اور بعض ثقہ لوگ تک اس کی روایت میں مبتلا ہو گئے۔ انسان آخر انسان ہے۔ بڑے سے بڑے نیک اور ذی فہم آدمی سے بھی بسا اوقات لغزش ہو جاتی ہے اور اس کی لغزش عام لوگوں کی لغزش سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ عقیدت میں بے جا غلو رکھنے والے ان بزرگوں کی صحیح باتوں کے ساتھ ان کی غلط باتوں کو بھی آنکھیں بند کر کے ہضم کر جاتے ہیں، اور بدطینت لوگ چھانٹ چھانٹ کر ان کی غلطیاں جمع کرتے ہیں اور انہیں اس بات کے لیے دلیل بناتے ہیں کہ سب کچھ جو ان کے ذریعے سے ہمیں پہنچا ہے، نذر آتش کر دینے کے لائق ہے۔ (۹)

واپس آنے والے مہاجرین پر کیا گذری

اہل مکہ کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر شوال ۵ ھ بعد بعثت میں مہاجرین حبش سے مکہ کی طرف واپس ہو گئے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ سب واپس آ گئے، اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ بعض واپس آئے اور بعض وہیں ٹھیرے رہے۔ بلاذری نے نہ صرف یہ کہ پہلی ہجرت حبشہ کے تمام مہاجرین کی واپسی کا ذکر کیا ہے، بلکہ ان کی پوری فہرست دے کر یہ بھی بتایا ہے کہ کون کس کی پناہ میں داخل ہوا۔ مکہ کے قریب پہنچے تو بنی کنانہ کا ایک شخص ملا جس سے انہوں نے قریش کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ "محمدؐ نے ان کے معبودوں کا بھلائی کے ساتھ ذکر کیا تو لوگ ان کے ساتھ ہو گئے، پھر وہ ان کے معبودوں کی حسب سابق برائی کرنے لگے تو لوگ بھی پہلے کی طرح ان کے ساتھ سختی سے پیش آنے لگے، اور ہم نے اسی حال پر ان کو چھوڑا ہے۔" اس پر مہاجرین نے باہم مشورہ کیا کہ حبش واپس چلے جائیں یا اب واپس آ ہی گئے ہیں تو کیوں نہ مکہ میں داخل ہو جائیں پھر دیکھیں کیا گزرتا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کی پناہ لے کر شہر میں داخل ہوا، سوائے ابن مسعودؓ کے، کہ وہ بلا پناہ داخل ہوئے اور کچھ مدت ٹھیر کر حبش واپس چلے گئے۔ ابن مسعودؓ کے متعلق یہ بات ابن سعد اور بلاذری اور بعض دوسرے لوگوں نے لکھی ہے، مگر ابن القیمؒ نے زاد المعاد میں کہا ہے کہ وہ مکہ ہی میں ٹھیرے رہے، اور ابن اسحاق کا یہ قول ہم پہلے نقل کر چکے ہیں کہ وہ اس ہجرت میں گئے ہی نہ تھے۔

بلاذری نے تفصیل بیان کی ہے کہ مکہ میں داخل ہوتے وقت واپس آنے والے مہاجرین میں سے کس نے قریش کے سرداروں میں سے کس کی پناہ حاصل کی تھی:

(۱) حضرت عثمانؓ کو پناہ دینے والا ابو اُحیحہ سعید بن العاص۔

(۲) حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ " " اُمیّہ بن خلف

(۳) حضرت زبیرؓ بن العوام کو پناہ دینے والا زمعہ بن الاسود۔

(۴) حضرت مصعبؓ بن عمیر " " نضر بن الحارث بن کلدہ (یا ابوعزیز بن عمیر)

(۵) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف " " اسود بن عبد یغوث

(۶) حضرت عامرؓ بن ربیعہ " " عاص بن وائل سہمی

(۷) حضرت ابوسبرہؓ بن ابی رُہم " " اخنس بن شریق

(۸) حضرت حاطبؓ بن عمرو " " حویطب بن عبدالعزّٰی

(۹) حضرت سہیل بن بیضاء " " ان کے قبیلے کا کوئی شخص (اور یہ روایت بھی ہے کہ وہ کچھ دن مکے میں چھپے رہے، پھر حبش واپس چلے گئے)

بلاذری نے واقدی کے حوالے سے اور کچھ اختلافات کے ساتھ ابن ہشام نے ابن اسحٰق کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ بن مظعون نے ولید بن مغیرہ کی پناہ لی تھی، مگر جب انہوں نے دیکھا کہ دوسرے مسلمانوں پر سخت ظلم ہو رہے ہیں اور وہ ولید کی پناہ میں آرام سے چل پھر رہے ہیں تو انہیں اس پر شرم محسوس ہوتی اور وہ اپنے دل میں سوچنے لگے کہ میرا ایک مشرک کی پناہ میں رہنا، جبکہ میرے ساتھی اہلِ دین مصائب میں مبتلا ہیں، میرے نفس کی بڑی کمزوری ہے۔ چنانچہ ولید کے پاس جا کر انہوں نے کہا" آپ مجھے اپنی پناہ سے بری کر دیجیے"۔ اس نے کہا" بیٹا کیا تم نے میری پناہ میں بھلائی کے سوا کچھ اور دیکھا ہے؟ کیا کسی نے تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک کیا ہے؟" حضرت عثمانؓ نے اس کے جواب میں کوئی شکایت نہیں بیان کی، بس یہ کہا کہ "میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، اُس کے سوا کسی دوسرے کی پناہ میں رہنا مجھے پسند نہیں ہے"۔ ولید نے کہا" تو پھر حرم میں چل کر اسی طرح میری پناہ سے براءت کا اعلان کرو جس طرح میں نے اپنی پناہ کا اعلان کیا تھا"۔ حضرت عثمانؓ بخوشی اس کے لیے تیار ہو گئے۔ ولید اور وہ ایک ساتھ حرم میں گئے۔ ولید نے کہا" یہ عثمانؓ میری پناہ واپس کرنے کے لیے آئے ہیں"۔ حضرت عثمانؓ نے کہا" ٹھیک ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک شریف اور باوفا آدمی کی پناہ پایا ہے، مگر میں اب اللہ کے سوا کسی کی پناہ میں نہیں رہنا چاہتا، اس لیے ان کی پناہ میں نے واپس کر دی ہے"۔ اُسی زمانہ میں عرب کا مشہور شاعر لبید بن ربیعہ مکہ آیا اور اپنے اشعار سناتے ہوئے اس نے یہ مصرع پڑھا:

الا کل شیء ما خلا اللہ باطلٌ

خبردار رہو، اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے

حضرت عثمانؓ بن مظعون پکار اُٹھے،" تم نے سچ کہا"۔ پھر اس نے جب دوسرا مصرع پڑھا:

و کل نعیم لا محالۃ زائل

اور ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے

تو انہوں نے کہا "یہ جھوٹی بات ہے، جنت کی نعمت زائل ہونے والی نہیں ہے۔" لبید اس پر بگڑ بیٹھا اور قریش کے لوگوں سے کہنے لگا "خدا کی قسم، آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھنا کبھی موجب ننگ و عار نہیں رہا ہے، اور نہ بدتمیزی کبھی آپ لوگوں کی شان رہی ہے۔" اس پر بنی مغیرہ میں سے ایک شخص نے اٹھ کر حضرت عثمان کے منہ پر ایک زور کا تھپڑ مارا جس سے ان کی آنکھ نیل ہو گئی۔ ولید نے طنز کے انداز میں ہنس کر ان سے کہا "بیٹے، اس سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟" انہوں نے جواب دیا "میری دوسری آنکھ بھی اسی چوٹ کی محتاج ہے جو اس کی ساتھی کو لگی ہے۔" ولید نے کہا "تم ایسے ذمہ میں تھے جو تمہاری حفاظت کرنے والا تھا۔" انہوں نے کہا "خدا کی قسم، اب میں اللہ کی پناہ کے سوا اور کسی کی پناہ نہ چاہوں گا۔" اسی گفتگو کے دوران میں عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ نے اس شخص کی ناک توڑ دی جس نے حضرت عثمانؓ بن مظعون کو تھپڑ مارا تھا۔

ابن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ نے اپنے ماموں ابو طالب کی پناہ لی کیونکہ وہ ان کی بہن برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔ اس پر بنی مخزوم نے جا کر ابو طالب سے کہا "اپنے بھتیجے کو تو آپ نے اپنی پناہ میں لے رکھا ہے، مگر ہمارے آدمی سے آپ کا کیا واسطہ کہ اسے آپ پناہ دے رہے ہیں؟" انہوں نے جواب میں کہا "محمدؐ میرا بھتیجا ہے تو ابو سلمہ میرا بھانجا ہے۔ اگر میں اپنے بھتیجے کو پناہ دے سکتا ہوں تو اپنے بھانجے کو کیوں نہیں دے سکتا؟" بنی مخزوم نے کچھ جھگڑا کرنا چاہا تو ابو لہب نے اٹھ کر کہا کہ "اے اہل قریش، تم نے اس شیخ کے ساتھ بہت کچھ کر لیا، اور تم برابر ان پر دباؤ ڈالتے چلے جا رہے ہو کہ اپنی قوم میں جس کو وہ پناہ دیں اس کو ان کی پناہ سے نکالو۔ خدا کی قسم، یا تو تم ان کو تنگ کرنے سے باز آ جاؤ، نہیں تو میں بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں گا۔" بنی مخزوم ابو لہب کی یہ بات سن کر گھبرا گئے لہٰذا انہوں نے کہا کہ اے ابوعتبہ، ہم تم کو ناراض نہیں کرنا چاہتے۔

طبری نے لکھا ہے کہ واپس آنے والوں میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان اور ان کی بیوی حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرت ابو حذیفہؓ اور ان کی بیوی سہلہؓ بنت سہیل بن عمرو مکہ ہی میں رہ گئے اور مدینہ کی طرف ہجرت تک وہیں رہے۔ لیکن یہ بیان مشتبہ ہے، کیونکہ ابن اسحاق نے دوسری ہجرت حبشہ میں بھی ان کا ذکر کیا ہے اور ان کا نام ۳۳ مردوں اور آٹھ عورتوں کی اس جماعت میں بھی شامل کیا ہے جو حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے حبش سے مکہ آ گئے تھے، جن میں سے دو کا انتقال ہو گیا، سات قید کر لیے گئے اور ۲۴ نے جنگ بدر میں حصہ لیا۔

دوسری ہجرتِ حبشہ

جب مکہ میں ظلم شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حبش مسلمانوں کے لیے امن کی جگہ ثابت ہوا ہے، تو آپ نے پھر ہدایت فرمائی کہ یہ مظلوم لوگ حبش ہی کی طرف ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ سنہ ۶ بعد بعثت کے آغاز (سنہ ۶۱۵ء) میں دوسری ہجرت واقع ہوئی۔ اگرچہ قریش نے اس ہجرت کو روکنے کی پوری کوشش کی، نکلنے والوں کو بہت تنگ کیا اور ان کے راستے میں سخت مشکلات پیدا کیں، لیکن اس کے باوجود اس موقع پر ۸۰ سے زیادہ مردوں اور ۱۸-۱۹ عورتوں نے حبش کی راہ لی اور وہاں یہ لوگ بخیریت پہنچ گئے۔ ابن سعد نے مردوں کی تعداد ۸۳ بیان کی ہے، اور عورتوں میں ۱۱ قرشی اور سات غیر قریشی خواتین کا ذکر کیا ہے۔ ۸۲ مردوں میں حضرت عمار بن یاسرؓ کا نام لیا گیا ہے، مگر ابن اسحاق نے ان کے شریک ہونے میں شک کیا ہے اور واقدی و ابن عقبہ وغیرہ نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ وہ ان میں شامل نہ تھے۔ اس کے برعکس ابن عبد البر نے جزم کے ساتھ کہا ہے کہ وہ ان میں شامل تھے۔ اسی طرح ان مہاجرین میں حضرت ابوموسیٰؓ اشعری کا نام بھی لیا گیا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ انہوں نے مکہ سے ہجرت نہیں کی تھی بلکہ پہلے وہ مکہ میں آ کر مسلمان ہوئے تھے، پھر یمن واپس جا کر اسلام کی اشاعت کی، اس کے بعد اپنی قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ (جن کی تعداد ۵۲ یا ۵۳ بتائی جاتی ہے) ایک کشتی میں یمن سے روانہ ہوئے، مگر ہواؤں نے ان کی کشتی کو حبش کے ساحل پر لا ڈالا، اس طرح وہ مہاجرین حبشہ سے جا ملے۔ صحیحین میں خود حضرت ابوموسیٰؓ کی اپنی روایت یہی ہے اور اس میں وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کی خبر ملی، اور ہم یمن میں تھے، تو ہم کشتی میں روانہ ہوئے، مگر ہماری کشتی نے ہمیں حبشہ پہنچا دیا اور وہاں ہم جعفرؓ بن ابی طالب کے ساتھ مل گئے، پھر فتح خیبر کے موقع پر ان کے ساتھ خیبر پہنچے۔ ابن سعد نے حضرت ابوموسیٰؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہم یمن سے اپنی قوم کے پچاس سے زائد آدمیوں کے ساتھ نکلے اور کشتی نے ہمیں نجاشی کے علاقے میں پہنچا دیا جہاں جعفر بن ابی طالبؓ پہلے سے موجود تھے۔

مہاجرین کی فہرست

اس ہجرت کی اہمیت کا پورا اندازہ مہاجرین کی اُس فہرست سے ہوتا ہے جو ابن ہشام نے سیرت میں ابن اسحاق کے حوالے سے درج کی ہے:-

بنی ہاشم میں سے — (۱) جعفرؓ بن ابی طالب

(۲) ان کی بیوی اسماءؓ بنت عُمَیس خثعمیہ

بنی اُمیّہ میں سے — (۳) عثمانؓ بن عفان۔

(۴) اُن کی بیوی رُقیہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۵) عَمروؓ بن سعید بن العاص (ان کے باپ سعید بن العاص کی کنیت ابواُحیحہ تھی)۔

(۶) اُن کی بیوی فاطمہؓ بنت صفوان (یہ بنی کنانہ میں سے تھیں)۔

(۷) اُن کے بھائی خالدؓ بن سعید بن العاص۔

(۸) اُن کی بیوی اُمَینہؓ بنت خلف (بعض لوگوں نے ان کا نام ہمینہ لکھا ہے۔ یہ بنی خزاعہ میں سے تھیں)

حلفائے بنی اُمیہ میں سے (۹) عبداللہؓ بن جحش (یہ بنی غنم بن دودان میں سے تھے اور امّ المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی تھے)

(۱۰) اُن کا بھائی عبیداللہ بن جحش (یہ شخص حبش میں عیسائی ہو کر مرا)

(۱۱) اُن کی بیوی اُمّ حبیبہؓ (یہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں حبش ہی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے توسط سے ان کو اپنی زوجیت میں لے لیا)۔

(۱۲) قیسؓ بن عبداللہ (یہ بنی اسد بن خزیمہ میں سے تھے)۔

(۱۳) ان کی بیوی بَرکہؓ بنت یسار (ابوسفیان کی آزاد کردہ لونڈی)۔

(۱۴) مُعَیقیبؓ بن ابی فاطمہ (یہ قبیلہ دوس میں سے تھے)۔

بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے (۱۵) ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ

حلفائے بنی نوفل بن عبد مناف میں سے (۱۶) عتبہؓ بن غزوان (یہ بنی قیس بن عیلان میں سے تھے)

بنی اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی میں سے (۱۷) زبیرؓ بن العوام بن خویلد۔ } یہ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔

(۱۸) اسودؓ بن نوفل بن خویلد

(۱۹) یزیدؓ بن زمعہ بن اسود بن مطلب

(۲۰) عمروؓ بن اُمیہ بن حارث بن اسد۔

بنی عبد بن قصی میں سے (۲۱) طُلَیبؓ بن عُمیر بن وہب (یہ حضورؐ کی پھوپھی اَروٰی بنت عبدالمطلب کے صاحبزادے تھے)

بنی عبدالدار بن قصی میں سے (۲۲) مُصعبؓ بن عُمیر بن ہاشم۔

(۲۳) سُوَیبطؓ بن سعد۔

(۲۴) جہمؓ بن قیس

(۲۵) اُن کی بیوی اُمّ حرملہؓ بنت عبدالاسود (یہ بنی خزاعہ میں سے تھیں)۔

(۲۶) اُن کے بیٹے عَمروؓ بن جَہم

(۲۷) ان کے دوسرے بیٹے خُزیمہؓ بن جَہم

(۲۸) ابوالرُّومؓ بن عُمَیر بن ہاشم (حضرت مُصعبؓ کے بھائی)۔

(۲۹) فراسؓ بن نَضر بن حارث بن کَلَدہ (یہ اُسی شخص کے بیٹے تھے جس نے اسلام کو زک دینے کے لیے ثقافتی پروگرام شروع کیا تھا)۔

بنی زُہرہ میں سے

(۳۰) عبدالرحمٰنؓ بن عوف

(۳۱) عامرؓ بن ابی وقّاص (حضرت سعدؓ بن ابی وقّاص کے بھائی)۔

(۳۲) مُطّلِبؓ بن اَزہر

(۳۳) اُن کی بیوی رَملہؓ بنت ابی عوف (یہ بنی جَہم میں سے تھیں)۔

خلفائے بنی زہرہ میں سے

(۳۴) عبداللہؓ بن مسعود (یہ قبیلۂ ھُذَیل میں سے تھے)۔

(۳۵) اُن کے بھائی عُتبہؓ بن مسعود۔

(۳۶) مِقدادؓ بن عَمرو (یہ مقداد بن اَسود کہلاتے تھے کیونکہ اَسود بن عبد یغوث نے ان کو بیٹا بنا لیا تھا)۔

بنی تَیم میں سے

(۳۷) حارثؓ بن خالد۔ (یہ حضرت ابوبکرؓ کے ماموں زاد بھائی تھے)۔

(۳۸) ان کی بیوی رَیطہؓ بنت الحارث بن جَبَلہ یا جُبَیلہ (یہ بھی بنی تَیم میں سے تھیں)۔

(۳۹) عَمروؓ بن عثمان۔ (یہ حضرت طلحہؓ کے چچا تھے)۔

بنی مخزوم میں سے

(۴۰) ابو سَلَمہؓ بن عبدالاسد۔ (حضورؐ کے دودھ شریک اور پھوپھی زاد بھائی)۔

(۴۱) ان کی بیوی اُمّ سَلَمہؓ (یہ بھی بنی مخزوم میں سے تھیں اور بعد میں ان کو اُمّ المومنین ہونے کا شرف نصیب ہوا)۔

(۴۲) شَمّاسؓ بن عثمان (یہ عُتبہ بن رَبیعہ کے بھانجے تھے)۔

(۴۳) ہَبّارؓ بن سُفیان۔

(۴۴) ان کے بھائی عبداللہؓ بن سفیان۔ (بعض لوگوں نے ان کا نام عُبَید اللہ لکھا ہے)۔

(۴۵) ہشامؓ بن ابی حُذَیفہ بن مُغیرہ۔ (بعض لوگوں نے ان کا نام ہاشم لکھا ہے)

(۴۶) سَلَمہؓ بن ہشام بن مُغیرہ۔ (ابوجہل کے بھائی)

(۴۷) عیاشؓ بن ابی ربیعہ ۔ (ابوجہل کے بھائی)

حلفائے بنی مخزوم میں سے (۴۸) معتقبؓ بن عوف (یہ بنی خزاعہ میں سے تھے)۔

بنی جمح میں سے (۴۹) عثمانؓ بن مظعون ۔ (حضرت عمرؓ کے برادرِ نسبتی)

(۵۰) ان کے بیٹے سائبؓ بن عثمان ۔

(۵۱) ان کے بھائی قدامہؓ بن مظعون ۔

(۵۲) ان کے دوسرے بھائی عبداللہؓ بن مظعون ۔

(۵۳) حاطبؓ بن الحارث

(۵۴) ان کی بیوی فاطمہؓ بنت مجلل عامریہ ۔

(۵۵) ان کے بیٹے محمدؓ بن حاطب ۔

(۵۶) ان کے دوسرے بیٹے حارثؓ بن حاطب

(۵۷) ان کے بھائی خطابؓ بن الحارث

(۵۸) ان کی بیوی فکیہہؓ بنت یسار

(۵۹) سفیانؓ بن معمر

(۶۰) ان کے بیٹے جابرؓ بن سفیان ۔

(۶۱) ان کے دوسرے بیٹے جنادہؓ بن سفیان ۔

(۶۲) ان کی بیوی حسنہؓ ۔ (جابر و جنادہ کی ماں) ۔

(۶۳) حسنہؓ کے دوسرے شوہر سے بیٹے شرحبیلؓ بن حسنہ (یہ بنی غوث بن مر میں سے تھے) ۔

(۶۴) عثمانؓ بن ربیعہ بن اُھبان ۔

بنی سہم میں سے (۶۵) خنیسؓ بن حذافہ ۔ (حضرت عمرؓ کے داماد ۔ حضرت حفصہؓ ام المومنین کے پہلے شوہر)

(۶۶) عبداللہؓ بن حارث ۔

(۶۷) ہشامؓ بن عاص بن وائل ۔ (عمروؓ بن العاص کے بھائی)

(۶۸) قیسؓ بن حذافہ ۔

(۶۹) ابوقیسؓ بن حارث ۔

(۷۰) عبداللہؓ بن حذافہ

(۷۱) حارثؓ بن حارث بن قیس

(۷۲) معمرؓ بن حارث بن قیس

(۷۳) بشرؓ بن حارث بن قیس

(۷۴) اُن کے ماں جائے بھائی سعیدؓ بن عمرو (یہ بنی تمیم میں سے تھے)۔

(۷۵) سعیدؓ بن حارث بن قیس

(۷۶) سائبؓ بن حارث بن قیس

(۷۷) عُمیرؓ بن رِئاب

حلفائے بنی سہم میں سے — (۷۸) محمیہؓ بن الجزء (یہ بنی زبید میں سے تھے)۔

بنی عدی میں سے — (۷۹) معمرؓ بن عبداللہ بن نضلہ

(۸۰) عُروہؓ بن عبدالعُزیٰ۔ (بعض لوگوں نے عُروہ بن ابی اثاثہ بن عبدالعُزیٰ لکھا ہے)۔

(۸۱) عدیؓ بن نضلہ

(۸۲) ان کے بیٹے نعمانؓ بن عدی

حلفائے بنی عدی میں سے — (۸۳) عامرؓ بن ربیعۃ العنزی (بنی عنز بن وائل میں سے تھے اور خطاب نے ان کو بیٹا بنا رکھا تھا)۔

(۸۴) ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ (یہ بنی عدی میں سے تھیں)۔

بنی عامر بن لوی میں سے — (۸۵) ابوسبرہؓ بن ابی رہم۔ (حضورؐ کی پھوپھی برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے)

(۸۶) ان کی بیوی اُمّ کلثومؓ بنت سُہیل بن عمرو۔

(۸۷) عبداللہؓ بن مخرمہ

(۸۸) عبداللہؓ بن سُہیل بن عمرو۔

(۸۹) سَلیطؓ بن عمرو۔

(۹۰) ان کے بھائی سکرانؓ بن عمرو۔ } یہ دونوں سُہیل بن عمرو کے بھائی تھے

(۹۱) ان کی بیوی سَودہؓ بنت زمعہ (جنہیں بعد میں اُمّ المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا)

(۹۲) مالکؓ بن زمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی) -
(۹۳) ان کی بیوی عمرہؓ بنت السعدی (بعض لوگوں نے ان کا نام عمیرہ لکھا ہے) -
(۹۴) حاطبؓ (یا ابوحاطب) بن عمرو -

خلفائے بنی عامر میں سے (۹۵) سعدؓ بن خولہ یا خولہ - (یہ یمنی تھے) -

بنی الحارث بن فہر میں سے (۹۶) ابوعبیدہؓ بن الجراح -
(۹۷) سہیلؓ بن بیضاء
(۹۸) عمروؓ ابن ابی سرح
(۹۹) عیاضؓ ابن زہیر (بعض نے ان کی جگہ ربیعہ بن ہلال کا نام لکھا ہے) -
(۱۰۰) عمروؓ ابن الحارث بن زہیر
(۱۰۱) عثمانؓ بن عبدغنم بن زہیر
(۱۰۲) سعدؓ (یا سعید) بن عبدقیس
(۱۰۳) حارثؓ بن عبدقیس

(۹)

مکّہ میں اس ہجرت کا ردِعمل

اس ہجرت سے مکّے کے گھر گھر میں کہرام مچ گیا، کیونکہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابوجہل کے بھائی سلمہؓ بن ہشام، اس کے چچا زاد بھائی ہشامؓ بن ابی حذیفہ اور عیاشؓ بن ابی ربیعہ، اور اس کی چچا زاد بہن حضرت اُمّ سلمہؓ، ابوسفیان کی بیٹی اُمّ حبیبہؓ، عتبہ بن ربیعہ کے بیٹے اور ہند جگر خوار کے سگے بھائی ابوحذیفہؓ، سہیل بن عمرو کے بھائی بیٹے، بیٹیاں اور داماد، اسی طرح دوسرے سرداران قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے کوئی گھر نہ تھا جو اس واقعہ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے، اور بعض کے دلوں پر اس کا اثر ایسا ہوا کہ آخرکار وہ مسلمان ہو کر رہے۔ (۱۰)

حضرت ابوبکرؓ کا ارادۂ ہجرت

اس پر قریش کو ایک چرکا اور لگا اور وہ یہ تھا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے بلند مرتبہ شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر مکّہ سے نکل کھڑے ہوئے تاکہ دوسرے مہاجرین سے جا ملیں۔ بخاری میں

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ جب وہ بَرکُ الغِمادؔ[1] پہنچے (جو مکہ سے یمن کی جانب پانچ دن کی راہ پر ہے) تو قبیلۂ قارہ کا سردار ابن الدُّغُنّہ (یا ابن الدَّغِنہ) ان کو ملا۔ ابنِ اسحاق نے زُہری عن عُروہ عن عائشہؓ کی سند سے بیان کیا ہے کہ مکہ سے ایک یا دو دن کی راہ گئے تھے کہ ابن الدغنہ ان کو ملا جو اس زمانے میں احابیش کا سردار تھا۔ اس نے کہا کہ ابوبکر کدھر کا ارادہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ "میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے، سخت اذیتیں دی ہیں، اور زندگی تنگ کر دی ہے۔" اس نے کہا "کیوں؟ ابوبکر، تم جیسا آدمی نہیں نکل سکتا اور نہیں نکالا جا سکتا۔ خدا کی قسم، تم تو معاشرے کی زینت ہو، ناداروں کو کما کر دیتے ہو، صلۂ رحمی کرتے ہو، عاجز و درماندہ کا بار اٹھاتے ہو، مہمان نوازی کرتے ہو اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہو۔ واپس چلو، میں تمہیں اپنی پناہ میں لیتا ہوں، اپنے شہر ہی میں اپنے رب کی عبادت کرو۔" پھر وہ حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مکہ آیا اور اشرافِ قریش کے پاس جا جا کر اس نے کہا "ابوبکرؓ جیسا آدمی نہیں نکل سکتا اور نہیں نکالا جا سکتا۔ کیا تم ایسے آدمی کو نکالتے ہو جس میں یہ یہ خوبیاں ہیں؟" ابنِ اسحاق کی روایت میں ہے کہ اس نے مکہ میں اعلان کیا کہ میں نے ابوقحافہ کے بیٹے کو پناہ دی ہے، اب کوئی اُن کے ساتھ بھلائی کے سوا کچھ اور سلوک نہ کرنے پائے۔ قریش نے اس کی پناہ رد نہ کی، مگر یہ شرط لگائی کہ ابوبکرؓ اپنے گھر میں جس طرح چاہیں اپنے رب کی عبادت کریں اور جو چاہیں پڑھیں، لیکن ہمیں اذیت نہ دیں کہ علانیہ نماز پڑھنے لگیں یا اپنے گھر کے باہر پڑھنا شروع کر دیں، کیونکہ اس سے ہمیں خطرہ ہے کہ ہماری عورتیں اور بچے فتنے میں پڑ جائیں گے۔ (حافظ ابنِ حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ حضرت ابوبکرؓ کتنی مدت تک اس طرح رہے)۔ پھر انہوں نے اپنے گھر کے احاطے میں ایک مسجد بنا لی اور اس میں نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی قراءت میں ایسا سوز تھا، ایسی کشش تھی کہ مشرکین کی عورتیں اور ان کے بچے اور نوجوان ہجوم کر کے آتے اور قرآن سننے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ قرآن پڑھتے پڑھتے رونے لگتے اور سننے والوں پر اس کا اور زیادہ اثر ہوتا۔ اس پر مشرکین قریش کے سردار گھبرا اٹھے۔ انہوں نے ابن الدغنہ کو بلا بھیجا اور اس سے کہا کہ "ہم نے تمہاری خاطر ابوبکرؓ کو پناہ دی تھی تاکہ یہ اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کریں، مگر انہوں نے اپنے گھر کے احاطے میں مسجد بنا کر علی الاعلان نماز اور قرآن پڑھنا شروع کر دیا ہے جس سے ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ ہماری عورتوں اور بچوں کو فتنے میں ڈال دیں گے۔ ان کو اس سے روکو۔ یا تو یہ خاموشی سے اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کریں، یا پھر اگر انہیں علانیہ ہی یہ کام

---

[1] اس مقام کے تلفظ میں اختلاف ہے۔ ہم نے جو تلفظ لکھا ہے وہ فتح الباری سے ماخوذ ہے۔ معجم البلدان میں بُرکُ الغِماد لکھا ہے۔ ایک اور تلفظ بِرکُ الغُماد بھی منقول ہوا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کرنے پر اصرار ہے تو اس سے کہو کہ تمہارا ذمّہ واپس کر دیں، کیونکہ ہم تمہارے ذمّہ کو توڑنا نہیں چاہتے۔ ابن الدغنہ نے جا کر حضرت ابوبکرؓ سے یہی بات کہی اور کہا میں نہیں چاہتا کہ عرب میں یہ بات مشہور ہو کہ میں نے ایک شخص کو پناہ دی تھی اور میری پناہ کو توڑ ڈالا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا، اچھا تو میں تمہارا ذمّہ تمہیں واپس کرتا ہوں اور اللہ کے ذمّے پر راضی ہوں۔ ابن الدغنہ اٹھا اور اس نے قریش کے لوگوں سے جا کر کہہ دیا کہ ابوبکرؓ نے میرا ذمّہ واپس کر دیا ہے، اب تم جانو اور تمہارا آدمی۔ (H)

مہاجرین کو واپس لانے کے لیے نجاشی کے پاس مشرکین کا وفد

ہجرت کے بعد قریش کے سردار سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے طے کیا کہ عبداللہ بن ابی ربیعہؓ (ابوجہل کے ماں جائے بھائی) اور عَمرو بن عاص کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ حَبَش بھیجا جائے اور یہ لوگ کسی نہ کسی طرح نجاشی (شاہِ حبش) کو اس بات پر راضی کریں کہ وہ ان مہاجرین کو مکّہ واپس بھیج دے۔

حضرت اُمِّ سلمہؓ کی روایت

اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ، جو خود مہاجرینِ حبشہ میں شامل تھیں، یہ واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرماتی ہیں، جسے ابن اسحٰق اور امام احمدؒ نے ان سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ قریش کے یہ دونوں ماہر سیاست سفیر ہمارے تعاقب میں حَبَش پہنچے پہلے انہوں نے نجاشی کے اعیانِ سلطنت میں خوب خوب ہدیے تقسیم کر کے سب کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ مہاجرین کو واپس کرنے کے لیے بادشاہ پر بالاتفاق زور دیں گے۔ پھر نجاشی سے ملے اور اس کو بیش قیمت نذرانہ دینے کے بعد کہا کہ "ہمارے شہر کے چند نادان لونڈے بھاگ کر آپ کے ہاں آگئے ہیں اور قوم کے اشراف نے ہمیں آپ کے پاس ان کی واپسی کی درخواست کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ لڑکے ہمارے دین سے بھی نکل گئے ہیں اور آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ انہوں نے ایک نرالا دین نکال لیا ہے"۔ ان کا کلام ختم ہوتے ہی اہلِ دربار ہر طرف سے بولنے لگے کہ "ایسے لوگوں کو ضرور واپس کر دینا چاہیے۔ ان کی قوم کے لوگ زیادہ جانتے ہیں کہ ان میں کیا عیب ہے۔ انہیں رکھنا ٹھیک نہیں ہے"۔ مگر نجاشی نے بگڑ کر کہا کہ اس طرح تو میں انہیں حوالے نہیں کروں گا۔ جن لوگوں نے دوسرے ملک کو چھوڑ کر میرے ملک پر اعتماد کیا ہے اور یہاں پناہ لینے کے لیے آئے ہیں ان سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔ پہلے میں انہیں بلا کر تحقیق کروں گا کہ یہ لوگ ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس کی حقیقت

لہ بہت سے لوگوں نے عبداللہ بن ربیعہ لکھا ہے لیکن ابن ہشام نے بن ابی ربیعہ لکھا ہے۔ یہ حضرت عیاشؓ بن ابی ربیعہ کا سگا بھائی تھا۔ (حاشیہ از مؤلف)

کیا ہے۔" چنانچہ نجاشی نے اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے دربار میں بُلا بھیجا۔

نجاشی کا پیغام پا کر سب مہاجرین جمع ہوئے اور اُنھوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا کہنا ہے۔ آخر سب نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو تعلیم ہمیں دی ہے ہم تو وہی بے کم و کاست پیش کریں گے، خواہ نجاشی ہمیں رکھے یا نکال دے۔ دربار میں پہنچے تو چھوٹتے ہی نجاشی نے سوال کیا کہ "یہ تم نے کیا کیا کہ اپنی قوم کا دین بھی چھوڑا اور میرے دین میں بھی داخل نہ ہوئے۔ نہ دُنیا کے دیگر ادیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا؟ آخر یہ تمہارا نیا دین ہے کیا؟" اس پر مہاجرین کی طرف سے جعفرؓ بن ابی طالب نے ایک برجستہ تقریر کی جس میں پہلے عرب جاہلیت کی دینی، اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بیان کیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا ذکر کر کے بتایا کہ آپؐ کیا تعلیمات پیش فرماتے ہیں، پھر اُن مظالم کا ذکر کیا جو آنحضورؐ کی پیروی اختیار کرنے والوں پر قریش کے لوگ ڈھا رہے تھے، اور اپنا کلام اِس بات پر ختم کیا کہ دوسرے ملکوں کے بجائے ہم نے آپ کے ملک کا رُخ اِس اُمید پر کیا ہے کہ یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔[1] نجاشی نے یہ تقریر سُن کر کہا کہ ذرا مجھے وہ کلام تو سُناؤ جو تم کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے

---

[1] حضرت جعفرؓ کی تقریر کے جو الفاظ ابن اسحاق نے حضرت اُمّ سلمہؓ کی روایت سے نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں: "اے بادشاہ، ہم ایک جاہلیت میں پڑی ہوئی قوم تھے، بُت پوجتے تھے، مُردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، ہمسائگی اور عہد و امان کا پاس کرنے میں بُرا رویّہ رکھتے تھے، اور ہم میں سے طاقتور کمزور کو کھائے جاتا تھا۔ ہم اسی حال پر تھے کہ اللہ نے ہماری طرف خود ہم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جس کے نسب، جس کی صداقت، جس کی امانت اور جس کی پاک دامنی کو ہم جانتے تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بُلایا کہ ہم اس کی توحید کے قائل ہوں، اور اسی کی عبادت کریں اور اُن پتھروں اور بُتوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہم اور ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اُس نے ہمیں راست گوئی، امانت داری، صلۂ رحمی، ہمسائگی اور عہد و امان کی پاسداری کا اور حرام افعال اور خونریزی سے باز رہنے کا حکم دیا۔ ہم کو فواحش سے، جھوٹ سے، مالِ یتیم کھانے سے، پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے روکا۔ ہمیں صرف اللہ واحد کی عبادت کرنے اور کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہ کرنے کی تلقین کی۔ اور ہمیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ لینے اور روزہ رکھنے کی ہدایت کی (اُمّ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ اسی طرح جعفرؓ نے اسلام کے دوسرے احکام اس کو بتائے)۔ پس ہم نے اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لائے، اور جو کچھ وہ اللہ کی طرف سے لایا تھا اُس میں اُس کی پیروی کی۔ ہم نے صرف اللہ کی عبادت کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا۔ جس چیز کو اس نے ہم پر حرام کر دیا اسے ہم نے حرام کیا اور جس کو اس نے ہمارے لیے حلال کر دیا اسے ہم نے حلال کیا۔ اِس پر ہماری قوم ہم پر ٹوٹ پڑی، اُس نے ہم کو

تمہارے نبی پر اترا ہے۔ حضرت جعفرؓ نے جواب میں سورۂ مریم کا وہ ابتدائی حصہ سنایا جو حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام سے متعلق ہے۔ نجاشی اس کو سنتا رہا اور روتا رہا یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہو گئی۔ اُس کے پادری بھی رو دیے اور ان کے مصاحف بھی آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ جب حضرت جعفرؓ نے تلاوت ختم کی تو اس نے کہا کہ یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں۔ خدا کی قسم میں تمہیں ان لوگوں کے حوالے نہ کروں گا۔ اور قریش کے سفیروں سے کہا، واپس جاؤ، بخدا میں ان لوگوں کو تمہارے سپرد ہرگز نہ کروں گا، یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

پھر حضرت اُمّ سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ عبداللہ بن ابی ربیعہ ہمارے معاملہ میں کچھ نرم تھا اور چاہتا تھا کہ ہم بچ جائیں۔ مگر عمرو بن عاص نے کہا کہ خدا کی قسم، میں کل وہ بات پیش کروں گا جو ان لوگوں کی جڑ کاٹ دے گی۔ میں نجاشی کو بتاؤں گا کہ یہ عیسیٰ بن مریمؑ کو محض بندہ قرار دیتے ہیں۔ عبداللہ نے کہا ایسا نہ کرو، یہ ہمارے مخالف ہی سہی، مگر ہیں تو ہمارے ہی بھائی بند اور ان کا کچھ حق ہم پر ہے۔ عمرو بن عاص نے اس کی ایک نہ سُنی اور دوسرے روز نجاشی سے کہا کہ "ذرا ان لوگوں کو بُلا کر ان سے یہ تو پوچھیے کہ عیسیٰؑ بن مریمؑ کے بارے میں ان کا عقیدہ کیا ہے۔ یہ لوگ ان کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں" نجاشی نے پھر مہاجرین کو بُلا بھیجا۔ مہاجرین کو پہلے ہی عمرو بن عاص کی چال کا علم ہو چکا تھا۔ انہوں نے جمع ہو کر پھر مشورہ کیا کہ اگر نجاشی نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دو گے؟ موقع بڑا نازک تھا اور سب اس سے پریشان تھے۔ مگر پھر بھی اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ہونا ہے ہو جائے، ہم تو وہی بات کہیں گے جو اللہ نے فرمائی اور اللہ کے رسول نے سکھائی ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ دربار میں گئے اور نجاشی نے عمرو بن العاص کا پیش کردہ سوال ان کے سامنے دُہرایا تو جعفر بن ابی طالب نے اُٹھ کر بلا تامّل کہا کہ هو عبد الله و رسوله و روحه و كلمته القاها الى مريم العذراء البتول "وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک رُوح اور ایک کلمہ ہیں

عذاب دیے، اور دین کے معاملہ میں ہم پر ظلم توڑے تاکہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بتوں کی طرف پھیر دے، اور ہم اُن تمام خبائث کو پھر سے حلال کر لیں جنہیں پہلے حلال کیے ہوئے تھے۔ آخر کار جب انہوں نے ہم پر سختی کی انتہا کر دی، ظلم ڈھایا اور ہماری زندگی تنگ کر دی اور ہمارے دین کے راستے میں حائل ہو گئے تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکل آئے اور دوسروں کے بجائے آپ کے ہاں آنا پسند کیا اور آپ کی پناہ لینی چاہی، اس اُمید پر کہ اے بادشاہ! آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا"۔ (حاشیہ از مؤلف)

جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا تھا" نجاشی نے سُن کر ایک تنکا زمین سے اُٹھایا اور کہا "خدا کی قسم جو کچھ تم نے کہا ہے عیسیٰ اُس سے اِس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں تھے"۔ اِس پر وہ پادری جو گرد و پیش بیٹھے تھے پُھنکارنے لگے۔ مگر نجاشی نے کہا واللہ بات یہی ہے خواہ تم کتنا ہی پُھنکارو۔ پھر اُس نے ہم سے کہا کہ جاؤ، تم میری زمین میں امن سے رہو۔ جو تمہیں بُرا کہے گا وہ سزا پائے گا۔ اگر مجھے سونے کا پہاڑ بھی ملے تو اُس کے عوض میں تمہیں ستانا پسند نہ کروں گا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ ان دونوں سفیروں کو ان کے ہدیے واپس کر دو، مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ نے جب میرا ملک مجھے واپس دلوایا تھا تو مجھ سے کوئی رشوت نہ لی تھی کہ میں اللہ کے معاملہ میں رشوت لوں۔ (۱۲)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت

اِس واقعہ کے ایک دوسرے عینی شاہد حضرت عبداللہ بن مسعود ہیں جو اِس مجلس میں موجود تھے۔ مُسند احمد اور طبرانی میں ان کی روایت یہ ہے کہ مہاجرینِ حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بُلایا اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات سُنیں تو کہا "واللہ یہ لوگ اُس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے جو ہم عیسیٰ علیہ السّلام کے متعلق کہتے ہیں۔ مرحبا تم کو اور اُس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسُول ہیں، اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں، اور وہ وہی رسُول ہیں جن کی بشارت عیسیٰ ابن مریم نے دی تھی"۔ (۱۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت میں یہ ذکر بھی ہے کہ قریش کے دونوں سفیروں نے نجاشی کے دربار میں حاضر ہو کر پہلے اس کو سجدہ کیا، پھر اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے اور کہا کہ ہمارے بنی عم میں سے کچھ لوگ آپ کے ہاں آئے ہیں اور ہم سے اور ہمارے دین سے الگ ہو گئے ہیں۔ اس پر نجاشی نے مہاجرین کو بلا بھیجا۔ حضرت جعفرؓ نے کہا آج میں تم سب کی طرف سے بولوں گا۔ چنانچہ سب ان کے پیچھے چلے۔ دربار میں داخل ہو کر حضرت جعفرؓ نے سلام کیا۔ درباریوں نے کہا سجدہ کیوں نہیں کرتے؟ حضرت جعفرؓ نے کہا ہم خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ اس کے بعد بات رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کی تعلیمات تک پہنچی، اور پھر حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کے متعلق مسلمانوں کے عقیدے کا ذکر آیا۔ اس روایت میں نجاشی کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ اس نے حضورؐ کی تصدیق کرنے کے بعد کہا "خدا کی قسم اگر میں بادشاہی کی ذمہ داریوں میں پھنسا ہُوا نہ ہوتا تو اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا، ان کی جوتیاں اُٹھاتا اور ان کو وضو کراتا"۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت

اسی سے ملتی جلتی روایت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے حافظ ابونُعیم اور بیہقی نے نقل کی ہے۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ مہاجرین کے پہنچنے سے پہلے قریش کے وفد نے نجاشی کو بھڑکانے کے لیے کہا کہ دیکھ لیجیے گا، یہ لوگ آپ کو سجدہ نہ کریں گے جب ہم دربار میں پہنچے تو پادریوں اور راہبوں نے کہا بادشاہ کو سجدہ کرو۔ حضرت جعفرؓ نے فرمایا، ہم اللہ عزّوجلّ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ آگے بڑھ کر جب ہم نجاشی کے سامنے پہنچے تو اس نے حضرت جعفر سے کہا تمہیں کس چیز نے مجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا؟ انہوں نے پھر وہی جواب دیا کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ آگے وہی قصہ ہے جو حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے بیان کیا ہے اور آخر میں یہ اضافہ ہے کہ نجاشی نے ہم لوگوں سے کہا کہ میری زمین میں تم جب تک چاہو رہو اور ہمارے لیے کھانے اور کپڑے کا حکم دیا۔

خود حضرت جعفرؓ کی روایت

حافظ ابن عساکر اور طبرانی نے خود حضرت جعفرؓ کا بیان اُن کے صاحبزادے عبداللہؓ بن جعفر کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ اضافہ ہے کہ قریش کے وفد کی شکایت کے جواب میں جب ہم نے اپنے اور ان کے دینی اختلاف کی وضاحت کی، تو نجاشی نے قریش کے سفیروں سے پوچھا کیا یہ تمہارے غلام ہیں؟ انہوں نے کہا نہیں۔ اس نے پوچھا کیا تمہارا ان پر کوئی قرض آتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ اس نے کہا تو پھر چھوڑ دو انہیں۔ پھر حضرت جعفرؓ بھی وہی قصہ بیان کرتے ہیں جو دوسرے حضرات نے بیان کیا ہے کہ عمرو بن العاص نے نجاشی کے سامنے حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کے متعلق ہمارے عقیدے کا قصہ چھیڑا اور جب ہم نے اپنا عقیدہ بیان کیا تو اس نے اس کی تصدیق کی۔ پھر اس نے ہم سے پوچھا کہ یہاں کوئی تمہیں تکلیف تو نہیں دیتا؟ ہم نے کہا ہاں۔ اس پر منادی کرا دی گئی کہ جو کوئی ان لوگوں میں سے کسی کو ستائے گا اسے چار درہم جرمانہ کیا جائے گا۔ نجاشی نے ہم سے پوچھا کیا یہ کافی ہے؟ ہم نے کہا نہیں۔ تب اس نے جرمانہ دوگنا کر دیا۔ (۱۴)

مہاجرین کا راستبازانہ کردار

اس طرح مہاجرین حبشہ نے نہ صرف یہ ثابت کر دیا کہ جس حق پر وہ ایمان لاتے ہیں اس پر ایمان رکھنے میں وہ اتنے مخلص ہیں کہ اس کی خاطر گھر بار، اعزّہ و اقربا، کاروبار اور جائدادیں، اور ملک و وطن سب کو چھوڑ کر جلاوطنی کے مصائب برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے، بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ اس جلاوطنی کی حالت میں بھی جبکہ اُن کا کوئی سہارا نہ تھا، وہ حق کے معاملہ میں کوئی مداہنت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کی یہ جرأت ایمانی حیرت انگیز تھی کہ انہوں نے عین دربارِ شاہی میں ایسے نازک موقع پر اُٹھ کر حضرت عیسیٰ کے متعلق اپنا عقیدہ

صاف صاف بیان کر دیا جبکہ نجاشی کے تمام اہلِ دربار رشوت کھا کر انہیں اُن کے دشمنوں کے سپرد کر دینے پر تُل گئے تھے۔ اُس وقت اِس امر کا پورا خطرہ تھا کہ مسیحیت کے بنیادی عقائد پر اسلام کا بے لاگ تبصرہ سُن کر نجاشی بھی بگڑ جاتے گا اور ان مظلوم مسلمانوں کو قریش کے قصائیوں کے حوالے کر دے گا۔ مگر اس کے باوجود اُنہوں نے کلمۂ حق پیش کرنے میں ذرّہ برابر تامل نہ کیا۔ اسی چیز نے دُنیا کو یہ دکھا دیا کہ اسلام کی دعوت کو کیسے مضبوط کردار کے سر فروش پیرو بہم پہنچے ہیں۔ (۱۵)

حبش سے عیسائیوں کے وفد کی آمد

مہاجرین کے اخلاق و کردار اور ان کی دعوت کا جو اثر اہلِ حبش پر پڑا اس کا اندازہ اِس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ وہاں سے ۲۰ عیسائیوں کا ایک وفد مکہ آ کر حضورؐ سے ملا۔

اس واقعہ کو ابن ہشام اور بیہقی وغیرہ نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ ہجرتِ حبشہ کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دعوت کی خبریں حبش کے ملک میں پھیلیں تو وہاں سے ۲۰ کے قریب عیسائیوں کا ایک وفد تحقیقِ حال کے لیے مکہ معظمہ آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد حرام میں ملا۔ (ایک روایت میں یہ ہے کہ ایک مجلس میں ملا اور کچھ سوالات کیے) قریش کے بہت سے لوگ بھی یہ ماجرا دیکھ کر گرد و پیش کھڑے ہو گئے۔ وفد کے لوگوں نے حضورؐ سے کچھ سوالات کیے جن کا آپؐ نے جواب دیا۔ پھر آپؐ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور قرآن مجید کی آیات اُن کے سامنے پڑھیں۔ قرآن سُن کر اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انہوں نے اس کے کلام اللہ ہونے کی تصدیق کی اور حضورؐ پر ایمان لے آئے۔ جب مجلس برخاست ہوئی تو ابو جہل اور اُس کے چند ساتھیوں نے ان لوگوں کو راستہ میں جا لیا اور انہیں سخت ملامت کی کہ "بڑے نامُراد ہو تم لوگ، تمہارے ہم مذہب لوگوں نے تم کو اس لیے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اُس پر ایمان لے آئے۔ تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔" اس پر انہوں نے جواب دیا "سلام ہے بھائیو تم کو۔ ہم تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو، ہم اپنے آپ کو جان بوجھ کر بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔" اسی واقعہ کا ذکر سورۂ قصص میں آیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ (آیات ۵۲-۵۳)

"جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی تھی وہ اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں۔ اور

جب وہ انہیں سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے ہمارے رب کی طرف سے۔ ہم اس سے پہلے بھی اسی دینِ اسلام پر تھے۔"

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ، سَلَامٌ عَلَيْكُمْ، لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ۝ (آیت ۵۵)

"اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہوگئے کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔" (۱۶)

حبشہ سے واپس آنے والے مہاجرین کی پہلی قسط

اس مقام پر یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مہاجرینِ حبشہ میں سے ایک گروہ تو حضرت جعفرؓ کے ساتھ حبشہ ہی میں رہا اور جنگِ خیبر کے موقع پر واپس آیا۔ اور حسبِ ذیل حضرات ابنِ اسحاق کی روایت کے مطابق مختلف اوقات میں حضورؐ کی ہجرت الی المدینہ سے پہلے واپس آگئے:

حضرت عثمانؓ اور ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہ۔ حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ اور ان کی اہلیہ سہلہؓ بنت سہیل بن عمرو۔ حضرت عبداللہ بن جحش۔ حضرت عتبہؓ بن غزوان۔ حضرت زبیرؓ بن العوام۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر۔ حضرت سویبطؓ بن سعد بن حرملہ۔ حضرت طلیبؓ بن عمیر۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ حضرت مقدادؓ بن عمرو۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود۔ حضرت ابوسلمہؓ اور ان کی بیوی حضرت اُم سلمہؓ۔ حضرت شماسؓ بن عثمان۔ حضرت سلمہؓ بن ہشام (ان کو مکہ میں قید کر لیا گیا)۔ حضرت عیاشؓ بن ابی ربیعہ (یہ مدینہ کی طرف ہجرت کے لیے نکلے تھے مگر ان کے ماں جائے بھائی ابوجہل اور حارث بن ہشام دھوکہ دے کر انہیں پکڑ لائے)۔ حضرت معتبؓ بن عوف۔ حضرت عثمانؓ بن مظعون اور ان کے بیٹے حضرت سائبؓ اور ان کے دونوں بھائی قدامہؓ اور عبداللہؓ۔ حضرت خنیسؓ بن حذافہ۔ حضرت ہشامؓ بن عاص بن وائل (یہ بھی مکہ میں قید کر لیے گئے)۔ حضرت عامرؓ بن ربیعہ اور ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ۔ حضرت عبداللہ بن مخرمہ۔ حضرت عبداللہؓ بن سہیل بن عمرو (انہیں مکہ میں قید کر کے ان کے باپ نے ان پر اتنا ظلم کیا کہ یہ بظاہر کافر بن گئے اور دل میں مسلمان رہے۔ جنگ بدر کے موقع پر کفار کے ساتھ گئے اور عین حالتِ جنگ میں مسلمانوں سے جا ملے)۔ حضرت ابوسبرہؓ بن ابی رہم اور ان کی بیوی اُم کلثومؓ بنت سہیل بن عمرو۔ حضرت سکرانؓ بن عمرو (ابن اسحاق اور واقدی کا بیان ہے کہ ان کا انتقال مکہ آکر ہوا، اور موسیٰ بن عقبہ اور ابومعشر کہتے ہیں کہ یہ حبش ہی میں انتقال کر چکے تھے)۔ حضرت سودہؓ بنت زمعہ۔ حضرت سعدؓ

بن خولہ ۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح ۔ حضرت عمروؓ بن الحارث ۔ حضرت شرحبیلؓ بن حسنہ ۔ حضرت عمروؓ بن ابی سرح ۔ (۱۴)

سورۃ رُوم کی پیشین گوئی

ہجرتِ حبشہ ہی کے زمانے میں ایک بڑا اہم واقعہ پیش آیا جو آخرکار رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کا ناقابلِ انکار ثبوت بن گیا، اور کسی کے پاس اُس کی کوئی توجیہ اِس کے سوا ممکن نہ رہی کہ قرآن فی الواقع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو بذریعۂ وحی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے۔ یہ سُورۂ رُوم کی ابتدائی آیات کا نزول تھا جن میں فرمایا گیا تھا کہ "رُومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے ہیں اور اپنی اِس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ اور وہ دن وہ ہوگا جبکہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے" (آیات ۲ تا ۴)۔ اِس کا مختصر قصّہ ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے ۸ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصرِ روم ماریس (Maurice) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (Phocas) تختِ سلطنت پر قابض ہو گیا۔ اس نے پہلے تو قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کرایا، پھر خود قیصر کو قتل کرا کے باپ بیٹوں کے سر قسطنطنیہ میں برسرِعام لٹکوا دیے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اِس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو رُومی سلطنت پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک بہترین اخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اُس کا محسن تھا۔ اسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہُوا تھا اور اسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اِس بنا پر اُس نے اعلان کیا کہ میں غاصب فوکاس سے اِس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔ ۶۰۳ء میں اس نے سلطنتِ رُوم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا ہُوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں اڈیسا (موجودہ اُرفا) تک اور دوسری طرف شام میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ رُوم کے اعیانِ سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے۔ اُس نے اپنے بیٹے ہرقل (Heraclius) کو ایک طاقتور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہرقل قیصر بنایا گیا، اور اس نے برسرِاقتدار آ کر فوکاس کے ساتھ وہی کچھ کیا جو اُس نے ماریس کے ساتھ کیا تھا۔ یہ ۶۱۰ء کا واقعہ ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصبِ نبوّت پر سرفراز ہوئے۔

خسرو پرویز نے جس اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور قتل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا۔ اگر واقعی اُس کی جنگ کا مقصد غاصب فوکاس سے اُس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے پر اُسے نئے قیصر سے صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اِس جنگ کو اس نے مجوسیت اور مسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ عیسائیوں کے جن فرقوں کو رُومی سلطنت کے سرکاری کلیسا نے مُلحد قرار دے کر سالہا سال سے تختۂ مشقِ ستم بنا رکھا تھا (یعنی نسطوری اور یعقوبی وغیرہ) ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں۔ اور یہودیوں نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا، حتّٰی کہ خسرو پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔

ہرقل آ کر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اِطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہُوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے، ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا، کنیسۃ القیامہ (Holy Sepulchre) برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب، جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اُسی پر مسیحؑ نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن (ایران کے دارالسلطنت) پہنچا دی، لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ لے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انہوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بُری طرح خسرو پرویز پر چڑھا تھا اس کا اندازہ اُس خط سے ہوتا ہے جو اُس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

> "سب خداؤں سے بڑے، تمام روئے زمین کے مالک، خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام،
>
> تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے۔ کیوں نہ تیرے رب نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا؟"

اِس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اُردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مکّہ معظمہ میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرِ جنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ۶۱۵ء (۵ ء بعد بعثت) میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں (جو رُوم کی حلیف تھی) پناہ لینی پڑی۔ اُس وقت سلطنتِ رُوم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان

پر تھا۔ مکے کے مشرکین اس پر بغلیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران کے آتش پرست مشرکین فتح پا رہے ہیں اور وحی و رسالت کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح ہم عرب کے بت پرست بھی تمہیں اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآن مجید کی یہ سورہ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے، اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہلِ ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔" اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہوگا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بظاہر دُور دُور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو مکے میں مارے اور کھدیڑے جا رہے تھے اور اس پیشینگوئی کے بعد بھی آٹھ سال تک اُن کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف رُوم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ سنہ ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضہ میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور سنہ ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون (Chalcedon) (موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایلچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر قیمت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پابہ زنجیر میرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مصلوب کو چھوڑ کر خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کر لے۔" آخرکار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (Carthage) (موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض، انگریز مؤرخ گبن کے بقول، "قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار، اس وقت تو کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔"[1]

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفارِ مکہ نے ان کا خوب مذاق اڑایا اور اُبی بن خلف نے حضرت

---

[1] Gibbon, Decline and Fall of the Roman Empire Vol. II. P. 788. Modern Library, New York.

ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر تین سال کے اندر رومی غالب آگئے تو دس اونٹ میں دوں گا ورنہ دس اونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہُوا تو آپؐ نے فرمایا کہ قرآن میں فِی بِضْعِ سِنِیْنَ کے الفاظ آتے ہیں، اور عربی زبان میں بِضْع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اُبَی سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہُوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ سو اونٹ دے گا۔

۶۲۲ء میں ادھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے، اور اُدھر قیصر ہرقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحر اسود کے راستے طرابزون کی طرف روانہ ہُوا جہاں اس نے ایران پر پُشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اِس جوابی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور مسیحی کلیسا کے اُسقف اعظم سَرجیس (Sargius) نے مسیحیت کو مجوسیت سے بچانے کے لیے گرجاؤں کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سُود پر قرض دی۔ ہرقل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں آرمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے آذربیجان میں گھس کر زرتشت کے مقام پیدائش اُرمیاہ (Ohromia) کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سورۂ روم میں کی گئی تھیں دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہوگئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوی کی فیصلہ کن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنتِ ایران کی کمر توڑ دی، اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرد (دسکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا اور آگے بڑھ کر روم کے لشکر عین طیسفون (Ctesipon) (مدائن) کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف خود اس کے گھر میں بغاوت رونما ہوئی۔ وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیے گئے، اور اس کا بیٹا شیرویہ اسے قتل کر کے تخت پر قابض ہوگیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی جسے قرآن فتح عظیم کے نام سے تعبیر کرتا ہے، اور یہی سال تھا جس میں شاہ ایران نے تمام رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۹ء میں قیصر مقدس صلیب کو اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المقدس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضا ادا کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی۔ عرب کے بکثرت مشرکین اس پر ایمان لے آئے، اُبَی بن خلف کے وارثوں کو ہار مان کر شرط کے اونٹ ابوبکر صدیق کے حوالے کرنے پڑے، اور وہ انہیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ شرط اُس وقت ہوئی تھی جب شریعت میں جوئے کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا، مگر اب حرمت کا حکم آ چکا تھا۔ اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی، مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔

(۱۸)

حوالہ جات باب (۹)

1. پمفلٹ "آزادی" از مؤلف صفحہ ۱۱-۱۲ ۔
2. تفہیم القرآن، جلد سوم ۔ العنکبوت، حواشی ۹۴ تا ۹۹ ۔
3. " " ، جلد چہارم ، الزمر، دیباچہ و حواشی ۳۰ تا ۳۲ ۔
4. اضافہ از مؤلف
5. تفہیم القرآن ، جلد سوم ، دیباچہ سورۃ مریم
6. اضافہ از مؤلف
7. تفہیم القرآن، جلد پنجم، خلاصہ دیباچہ النجم
8. " " ، جلد سوم ، الحج ، حاشیہ ۹۹
9. اضافہ از مؤلف
10. تفہیم القرآن، جلد سوم ، مریم ۔ دیباچہ سورۃ مریم
11. اضافہ از مؤلف
12. تفہیم القرآن، جلد سوم ، دیباچہ سورۃ مریم ۔
13. " " ، جلد پنجم، الصفت ، ماخوذ از حاشیہ ۸ ۔
14. اضافہ از مؤلف
15. تفہیم القرآن ، جلد سوم ، مریم ، خلاصہ حاشیہ ۲۵ ۔
16. " " " " ، القصص ، حاشیہ ۴۲ ۔
17. اضافہ از مؤلف
18. تفہیم القرآن ، جلد سوم ، دیباچہ سورۃ روم ۔

باب (۱۰)

سنہ ۶ بعد بعثت سے سنہ ۱۰ بعد بعثت تک

ہجرتِ حبشہ کے بعد مکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے جن میں چند خواتین بھی تھیں۔ دشمنانِ اسلام پر اس وقت ایک تو ہجرت کی جھنجھلاہٹ طاری تھی، اور اس پر مزید غصے کا اضافہ اِس بات سے ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو حبش میں اچھی پناہ گاہ مل گئی تھی، اور مشرکین کا وفد وہاں سے ناکام و نامراد واپس آیا تھا۔ اس حالت میں وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دست درازیاں کرنے سے بھی نہ چوکے۔ (۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کی دست درازیاں

بخاری میں حضرت عروہ بن زبیر کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے پوچھا کہ آپ نے مشرکین کا سب سے زیادہ سخت برتاؤ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا دیکھا ہے۔ انہوں نے کہا ایک روز آپ کعبہ کے صحن میں (اور ایک روایت میں ہے کہ حجر کعبہ میں) نماز پڑھ رہے تھے۔ یکایک عقبہ بن ابی معیط آگے بڑھا اور اس نے آپ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اسے بل دینا شروع کر دیا تاکہ گلا گھونٹ کر آپ کو مار ڈالے۔ مگر عین وقت پر حضرت ابوبکر پہنچ گئے اور انہوں نے دھکا دے کر اسے ہٹا دیا۔ حضرت عبداللہ کا بیان ہے کہ جس وقت ابوبکر صدیق اُس ظالم سے کشمکش کر رہے تھے اس وقت اُن کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ؟ کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟۔ ابن جریر نے اپنی تاریخ میں بھی یہ واقعہ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کے حوالہ سے روایت کیا ہے۔ لیکن نسائی اور ابن ابی حاتم نے اسے حضرت عبداللہ کے بجائے اُن کے والد حضرت عمرو بن عاص سے کچھ لفظی اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے اور اس میں عقبہ بن ابی معیط کے بجائے یہ ذکر ہے کہ قریش کے لوگوں نے یہ حرکت کی تھی، اور حضرت ابوبکر روتے ہوئے حضور کو بچاتے جاتے تھے اور یہ الفاظ کہتے جاتے تھے۔ (۲)

امام بخاری نے یہ قصہ کئی جگہ اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ کسی جگہ روایت حضرت عمرو بن العاص سے

ہے اور کسی جگہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ۔ ایک جگہ حضرت عمروؓ ابن العاص کی روایت یہ ہے کہ میں نے کبھی قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرتے نہیں دیکھا، سوائے ایک مرتبہ کے ۔ وہ لوگ کعبے کے سائے میں بیٹھے تھے اور حضورؐ مقام ابراہیم پر نماز پڑھ رہے تھے ۔ اتنے میں اُنہوں نے ایک دوسرے کو آپؐ کے خلاف بھڑکایا ۔ آخر عقبہ بن ابی مُعیط اُٹھا اور اُس نے اپنی چادر آپؐ کے گلے میں ڈال کر کھینچنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ گھٹنوں کے بل ٹیک گئے اور لوگوں میں شور مچ گیا ۔ اُس وقت حضرت ابوبکرؓ دوڑتے ہوئے آئے اور آپ کا بازو پیچھے سے تھام لیا اور کہنے لگے کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے"؟ پھر لوگ آپؐ کے پاس سے ہٹ گئے ۔ نماز سے فارغ ہو کر جب آپؐ قریش کے اُن لوگوں کے پاس سے گزرے تو فرمایا "قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمہاری طرف ذبح کے ساتھ بھیجا گیا ہوں" ۔ اس پر ابوجہل بولا "اے محمدؐ، تم کبھی نادان نہ تھے" ۔ حضورؐ نے فرمایا "اور تم انہی میں سے ہو" ۔ (ابو یعلیٰ، ابن حبان، طبرانی اور بیہقی نے بھی یہ قصہ حضرت عمرو بن العاص کی روایت سے نقل کیا ہے) ۔

صحیح بخاری کی دوسری روایت میں یہ ہے کہ مشرکین نے حضورؐ کی ڈاڑھی اور سر کے بال نوچ ڈالے اور اکثر بال اُکھڑ گئے ۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کی حمایت کے لیے اُٹھے اور وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے" ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے کہا "چھوڑ دو انہیں اے ابوبکر، قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں اِن کی طرف ذبح کے ساتھ ہی بھیجا گیا ہوں" ۔ یہ سُن کر ساری بھیڑ آپ کے پاس سے چھٹ گئی ۔

ابن ہشام، ابن جریر طبری اور بیہقی نے ابن اسحاق کی سند سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ عُروہ بن زُبیر نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے پُوچھا کہ قریش رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت کا جو اظہار کرتے تھے اُس میں سے شدید ترین واقعہ آپ نے کیا دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا میں ایک روز قریش کی مجلس میں گیا اور ان کے سردار حجر میں جمع تھے ۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا کہ اِس شخص کے معاملہ میں ہم نے جتنا صبر کیا ہے اتنا صبر کرتے ہوئے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا ۔ اِس نے ہماری عقلوں کو حماقت ٹھیرایا،

---

[1] صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل روایت حضرت عمرو بن عاص کی ہے، اور حضرت عبداللہ بن عمرو نے غالباً اپنے والد سے سنی ہوئی روایت بیان کی ہے ۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے ۶۵ھ میں وفات پائی ۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۷۲ سال تھی ۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو وہ اِس واقعہ کے عینی شاہد نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ ان کی پیدائش ہجرت سے سات سال پہلے یعنی سنہ ۶ بعد بعثت میں ہوئی تھی ۔ (حاشیہ از مؤلف)

ہمارے باپ دادا کی برائی کی، ہمارے دین کی عیب جوئی کی اور ہماری جماعت میں تفرقہ ڈال دیا حقیقت میں ہم نے بہت بڑی بات پر صبر کیا ہے۔ اِس اثنا میں کہ وہ یہ باتیں کہہ رہے تھے، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نمودار ہوئے چلتے ہوئے آگے بڑھ کر آپؐ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا، پھر کعبہ کا طواف کرتے ہوئے ان کے پاس سے گزرے۔ انہوں نے آپ پر ایک چبھتا ہوا فقرہ کسا اور مَیں نے حضورؐ کے چہرے پر اس کا ناگوار اثر محسوس کیا۔ پھر دوسری مرتبہ آپؐ گزرے۔ انہوں نے پھر آوازہ چست کیا اور مَیں نے محسوس کیا کہ آپ کو وہ ناگوار گزرا ہے۔ تیسری مرتبہ جب آپؐ گزرے اور انہوں نے یہی حرکت کی تو آپؐ رُک کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا "قریش کے لوگو، سُنتے ہو؟ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمہارے پاس ذبح لے کر آیا ہوں۔" عبداللہؓ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کی اس بات پر سارے لوگ سُن ہو کر رہ گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ پھر ان میں سے جو سب سے زیادہ بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا اس نے آپؐ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایسی باتیں کرنی شروع کر دیں جو وہ اپنے نزدیک بہتر سے بہتر پا رہا تھا، یہاں تک کہ اس نے کہا "اے ابوالقاسم، اچھی طرح گزر جاؤ، خدا کی قسم تم تو کبھی نادان نہ تھے۔" چنانچہ حضورؐ وہاں سے پلٹ گئے۔ دوسرے روز پھر یہ لوگ حِجر میں جمع ہوئے اور میں ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے آپس میں کہا "کچھ یاد ہے کہ یہ شخص تمہارے معاملے میں کہاں تک بڑھ گیا ہے حتیٰ کہ اس نے وہ بات تک کھُل کر کہہ دی جو کل کہی تھی اور پھر تم نے اسے چھوڑ دیا۔" اتنے میں حضورؐ سامنے سے آتے نظر آئے۔ آپؐ کے آتے ہی سب یکبارگی آپ پر جھپٹے اور آپ کو گھیر کر کہنے لگے "تم ہی ہو جو یہ اور یہ کہتے ہو؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں میں ہی ہوں جو یہ کہتا ہوں۔" اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک شخص نے آپؐ کی چادر کو گریبان کے پاس سے پکڑ کر مٹھی میں لے لیا۔ اس پر ابوبکر رضی اللہ عنہ آپؐ کی حمایت کے لیے اٹھے وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ "کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟" اس کے بعد لوگ آپؐ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ سب سے شدید ترین معاملہ جو میں نے قریش کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے دیکھا ہے۔ (مسند احمد) میں بھی یہ قصّہ اسی طرح درج ہے۔

حضرت حمزہؓ کا اسلام

اِسی زمانے میں ایک روز ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو اسلام کے دائرے میں داخل کر دیا۔ مؤرخین کے درمیان اُن کے مسلمان ہونے کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ ابنِ حجرؒ نے اِصابہ میں سنہ ۲ بعد بعثت تاریخ لکھی ہے۔ ابن عبدالبرؒ نے پہلے سنہ ۲ لکھنے کے بعد پھر لکھا ہے کہ کہا گیا ہے

کہ وہ ۶ھ میں بعثت میں حضورؐ کے دارالارقم میں داخل ہونے کے بعد مسلمان ہوگئے تھے۔ مگر ابن سعد، ابن الجوزی اور العقیلی نے اس کا زمانہ قطعیت کے ساتھ ۶ھ بعد بعثت ہی بتایا ہے۔ ابن القیم نے بھی زادالمعاد میں اس کا ذکر ہجرتِ حبشۂ ثانیہ کے بعد کیا ہے، اور یہی ابن اثیر کی تاریخ الکامل میں ہے۔ علاوہ بریں جو واقعہ حضرت حمزہؓ کے اسلام کا موجب بنا وہ بھی بجائے خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ۲ھ بعد بعثت میں پیش نہیں آسکتا تھا، بلکہ قریش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کشمکش بہت زیادہ بڑھ جانے کے بعد ہی اس کا پیش آنا ممکن تھا۔ ۲ھ میں ابوجہل کی کیا مجال تھی کہ وہ آپؐ کو گالیاں دیتا تو درکنار آپ سے آنکھ بھی ملا سکتا۔

قصہ یہ ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقول ابن اسحاق صفا کے پاس سے، اور بعض دوسرے اقوال کے مطابق حجون کے پاس سے گزر رہے تھے کہ ابوجہل نے آپؐ کو بے تحاشا گالیاں دیں اور آپ کی اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کی شان میں بہت بُرے الفاظ استعمال کیے۔ مگر آپؐ نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی خبر ابنِ اسحاق کے بیان کے مطابق عبداللہ بن جُدعان (بنی تیم کے ایک رئیس) کی آزاد کردہ لونڈی نے، اور بقول بعض حضرت حمزہؓ کی بہن حضرت صفیہؓ نے، اور بروایت ابن ابی حاتم دو عورتوں نے حضرت حمزہؓ کو پہنچا دی۔ وہ قریش کے نہایت بہادر، طاقت ور، اور خود دار آدمی تھے۔ حضورؐ کے چچا بھی تھے، دودھ شریک بھائی بھی، اور ان کی والدہ بی بی آمنہ کی چچازاد بہن بھی تھیں۔ عمر بھی ان کی حضورؐ سے دو چار سال ہی زیادہ تھی۔ آپؐ سے ان کو بے حد محبت تھی۔ شکار کے شوقین تھے تیر کمان لیے ہوئے واپس آرہے تھے کہ یہ قصہ سُنا۔ غصہ میں بھرے ہوئے حرم پہنچے جہاں ابوجہل بیٹھا تھا اور جاتے ہی کمان اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا، پھر کہا "تو اُن کو گالیاں دیتا ہے، میں بھی اُنہی کے دین پر ہوں اور وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں، مجھ میں ہمت ہے تو وہی گالیاں ذرا مجھے دے کر دیکھ۔" اس پر بنی مخزوم کے کچھ لوگ ابوجہل کی حمایت کے لیے اُٹھے، مگر اس نے کہا "ابو عمارہ کو چھوڑ دو، میں نے واقعی اُن کے بھتیجے کو بُری طرح گالیاں دی تھیں۔" طبرانی اور ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت حمزہؓ نے فرمایا "میرا دین بھی محمدؐ کا دین ہے، مجھے اس سے روک لو اگر تم سچے ہو۔"

یونس بن بُکیر صاحبُ المغازی نے ابن اسحاق کی سند سے اس قصے کی مزید تفصیل یہ دی ہے کہ حضرت حمزہؓ جھپٹ میں آکر یہ کام کر تو گئے مگر جب اپنے گھر پہنچے تو دل میں کہا "تُو قریش کا سردار ہے، دین سے پھرے ہوئے اِس شخص کا پیرو بن گیا اور اپنے آبائی دین کو چھوڑ گیا۔ تیرے لیے موت اُس کام سے بہتر ہے جو تُو نے کیا ہے۔" پھر اللہ سے دُعا کی کہ "خدایا، اگر یہ صحیح راستہ ہے تو اس کی تصدیق میرے دل میں

ڈال دے، ورنہ میرے لیے اس سے نکلنے کی کوئی راہ پیدا فرما دے"۔ اس رات وسوسۂ شیطانی سے سخت بے چین رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ پھر حضورؐ کے پاس پہنچے اور کہا "بھتیجے، میں ایک ایسے معاملہ میں پڑ گیا ہوں جس سے نکلنے کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی، اور مجھ جیسے آدمی کا کسی ایسی چیز پر قائم رہنا جس کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ راستی ہے یا گمراہی، ایک شدید بات ہے"۔ حضورؐ نے ان کی یہ بات سن کر ان کو نصیحت کی، خدا کا خوف دلایا اور ایمان لانے پر بشارت دی، یہاں تک کہ اللہ نے ان کے دل میں ایمان ڈال دیا اور انہوں نے کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صادق ہیں" (اس واقعہ کو بیہقی نے بھی بحوالۂ یونس بن بکیر ابن اسحاق سے نقل کیا ہے)۔

حضرت عمرؓ کا اسلام

اس کے بعد دوسری اور زیادہ زبردست چوٹ قریش کو یہ لگی کہ ایک روز یکایک انہیں معلوم ہوا کہ عمرؓ بن خطاب بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔ وہ قریش کی مخالفتِ اسلام کے ستونوں میں سے ایک اہم ستون تھے۔ ایمان لانے والوں پر ظلم و ستم کرنے میں پیش پیش تھے۔ قریش میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ انسابِ عرب کے علم میں ان کی شہرت تھی۔ قریش کی طرف سے سفارت کے منصب پر بھی وہ بھیجے جاتے تھے۔ قبائل کے درمیان منافرت اور مفاخرت کی نوبت آتی تو ان کو حکم بنایا جاتا اور ان کا فیصلہ قبول کیا جاتا۔ قریش سے کوئی مفاخرت کرتا تو انہی کو جواب دینے کے لیے بھیجا جاتا۔ بہادر تھے۔ طاقت ور تھے۔ شہسوار تھے۔ زبان آور تھے اور ان کی قوتِ بیان کا لوہا مانا جاتا تھا۔ قریش کو یہ تصور بھی نہ تھا کہ ان جیسا آدمی بھی ایک روز ان کے مقابلہ میں اسلام کی علمبرداری کے لیے اٹھ کھڑا ہوگا۔ لیکن ایک تدریجی عمل ان کے اندر ایسا ہو رہا تھا جو بالآخر انہیں اسلام کی طرف کھینچ لے گیا۔ (۴)

اُن کا اوّلین تأثّر

ان کا پہلا تأثر وہ تھا جسے مسند احمد اور طبرانی میں خود اُن کی روایت سے نقل کیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کے لیے گھر سے نکلا، مگر آپ مجھ سے پہلے حرم میں داخل ہو چکے تھے۔ میں پہنچا تو آپ نماز میں سورۂ الحاقّہ پڑھ رہے تھے۔ میں آپؐ کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور سننے لگا۔ قرآن کی شانِ کلام پر میں حیران ہو رہا تھا کہ میرے دل میں یکایک یہ خیال آیا کہ یہ شخص ضرور شاعر ہے جیسا کہ قریش کہتے ہیں۔ فوراً ہی حضورؐ کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے کہ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ "یہ ایک رسولِ کریم کا قول ہے کسی شاعر کا قول نہیں ہے، تم لوگ کم ہی ایمان لاتے ہو" (آیات ۴۰-۴۱)۔ میں نے اپنے دل میں کہا

شاعر نہیں تو پھر کاہن ہے۔ اسی وقت زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہوئے وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ
"اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم لوگ کم ہی غور کرتے ہو" تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ "یہ رب العٰلمین کی طرف سے نازل ہوا ہے" (آیات ۴۲-۴۳) یہ سن کر اسلام میرے دل میں گہرا اتر گیا۔[1]

اُن پر ہجرتِ حبشہ کا اثر

ان کا دوسرا تاثر وہ تھا جسے ابن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے سیرت میں، طبری نے تاریخ میں اور ابن اثیر نے اُسد الغابہ میں حضرت لیلیٰ بنتِ ابی حَثمہ کی روایت سے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت عمرؓ کی قریبی رشتہ دار تھیں اور اپنے شوہر حضرت عامر بن ربیعہ العنزی کے ساتھ حبش کی طرف ہجرت کر گئی تھیں۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ میں ہجرت کے لیے اپنا سامان باندھ رہی تھی اور میرے شوہر عامرؓ بن ربیعہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں عمر آ گئے جبکہ وہ اپنے شرک پر قائم تھے اور ہم ان کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اُٹھا چکے تھے۔ مگر اُس وقت وہ کھڑے ہو کر میری مشغولیت دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے "عبداللہ کی ماں، کیا بس اب روانگی ہے؟" میں نے کہا "ہاں جب تم لوگوں نے ہمیں بہت ستایا اور ہم پر ظلم کیا، تو اب ہم خدا کی زمین میں کہیں نکل جائیں گے جہاں خدا ہمارے لیے اِس مصیبت سے بچنے کی کوئی راہ نکال دے"۔ اس پر عمرؓ نے کہا "اللہ تمہارے ساتھ ہو"۔ اُس وقت میں نے اُن پر وہ رقت دیکھی جو کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہمارے وطن چھوڑنے پر وہ غمگین ہو کر واپس چلے گئے۔ اس کے بعد جب عامر ہمارا سفر کا سامان لے کر واپس آئے تو میں نے کہا "عبداللہ کے ابا، کاش تم اِس وقت عمرؓ کو اور ہمارے حال پر اُن کی رقت اور رنج کو دیکھتے۔ ابھی ابھی وہ یہاں سے ہو کر گئے ہیں"۔ عامر نے کہا کیا تمہیں اُس کے مسلمان ہونے کی اُمید ہو گئی ہے؟ میں نے کہا ہاں۔ انہوں نے کہا جس شخص کو تم نے ابھی دیکھا ہے وہ اُس وقت تک مسلمان نہ ہوگا جب تک خطّاب کا گدھا مسلمان نہ ہو جائے۔

ان کے اسلام لانے کا قصّہ

اِس ذہنی کشمکش نے آخر کار ایک روز اُنہیں اِس بات پر آمادہ کر دیا کہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں تاکہ یہ قضیہ ہی ختم ہو جائے جس نے ان کو اُلجھن میں ڈال رکھا ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ وہ تلوار لے کر اسی غرض سے نکلے۔ مگر راستے میں ان کو حضرت نُعیم بن عبداللہ النحّام مل گئے جو خود حضرت عمرؓ ہی کے قبیلے کے اشراف میں سے تھے اور خفیہ طور پر مسلمان ہو چکے تھے۔[2] انہوں نے پوچھا کدھر کا ارادہ ہے؟ کہنے لگے

---

[1] اس واقعہ کو ابن حنبل نے بھی اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ (حاشیہ از مولف)

[2] اسد الغابہ اور اصابہ میں ہے کہ یہ اپنے باپ ... جب انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کی قوم نے کہا تم جس دین کو چاہو اختیار کرو مگر خدا کی قسم تم سے کوئی تعرض نہ کرے گا، ہم تمہاری حمایت میں اپنی جانیں لڑا دیں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے قبیلے (بنی عدی) کی یتیموں اور بیواؤں کی مدد بڑی فیاضی کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ (حاشیہ از مولف)

ہیں ایک صابی کو قتل کر دینا چاہتا ہوں جس نے قریش میں تفرقہ ڈال دیا ہے، ہم سب کو احمق ٹھیرایا ہے، ہمارے دین میں عیب نکالا ہے، اور ہمارے معبودوں کی برائی کی ہے۔" نعیم نے کہا "واللہ، اے عمرؓ تمہارے نفس نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ محمدؐ کے قتل کے بعد بنی عبد مناف تمہیں زمین پر چلنے پھرنے کے لیے جیتا چھوڑ دیں گے؟ تم ذرا پہلے اپنے گھر والوں کی تو خبر لو۔" حضرت عمرؓ نے کہا "میرے کون سے گھر والے؟" نعیم نے کہا "تمہارے بہنوئی اور چچازاد بھائی سعید بن زیدؓ اور تمہاری بہن فاطمہؓ۔ وہ دونوں مسلمان ہوگئے ہیں اور انہوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کر لی ہے۔" حضرت عمرؓ پلٹ کر سیدھے بہن کے ہاں پہنچے۔ وہاں حضرت خبابؓ بن الارتؓ موجود تھے اور ان کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی وہ حضرت فاطمہؓ کو اس کی تعلیم دے رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کی آہٹ جب محسوس ہوئی تو حضرت خبابؓ گھر کے ایک حصہ میں چھپ گئے اور حضرت فاطمہؓ نے صحیفے کو ران کے نیچے دبا لیا۔ لیکن حضرت عمرؓ پہلے ہی دروازے میں سے حضرت خبابؓ کی قرات سن چکے تھے۔ انہوں نے اندر پہنچ کر کہا "یہ کیسی گنگناہٹ تھی جو ابھی میں نے سنی ہے؟" حضرت فاطمہؓ اور حضرت سعیدؓ نے کہا کہ تم نے کچھ نہیں سنا۔ انہوں نے کہا نہیں، میں نے سنا ہے واللہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم دونوں محمدؐ کے دین کی پیروی اختیار کر چکے ہو۔ پھر انہوں نے اپنے بہنوئی سعیدؓ کو مارا۔ حضرت فاطمہؓ شوہر کو بچانے کے لیے اٹھیں تو انہوں نے ان کو بھی مارا جس سے ان کا سر پھٹ گیا۔

تب دونوں میاں بیوی نے کہا کہ ہاں، ہم مسلمان ہوگئے ہیں اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے ہیں، اب تمہارا جو جی چاہے کر لو۔ حضرت عمرؓ نے جب بہن کا خون بہتے دیکھا تو اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے اور اپنی جہالت سے رجوع کیا اور بہن سے کہا وہ صحیفہ مجھے دکھاؤ جسے ابھی ابھی تم لوگ پڑھ رہے تھے۔ دیکھوں تو وہ چیز کیا ہے جو محمدؐ لاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ پڑھے لکھے آدمی تھے اس لیے اسے پڑھنا چاہتے تھے۔ ان کی بہن نے کہا ہمیں اندیشہ ہے کہ تم اسے کہیں ضائع نہ کر دو۔ انہوں نے کہا اس کا اندیشہ نہ کرو اور اپنے معبودوں کی قسم کھائی کہ پڑھ کر اسے واپس کر دیں گے۔ اب ان کی بہن کو کچھ امید بندھی کہ یہ مسلمان ہو جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ بھائی، تم اپنے شرک کی وجہ سے نجس ہو اور اس صحیفے کو صرف پاک آدمی ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں۔" اس پر حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا اور حضرت فاطمہؓ نے صحیفہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب انہوں نے سورۂ طٰہٰ کا ابتدائی حصہ پڑھا تو کہنے لگے کیسا عمدہ اور بلند پایہ کلام ہے یہ۔ حضرت خبابؓ بن الارتؓ ان کی یہ بات سنتے ہی باہر نکل آئے اور کہا اے عمرؓ، مجھے امید ہے کہ اللہ نے تم کو اپنے نبی کی دعا کا مصداق بننے کے لیے چن لیا ہے۔ میں نے کل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ خدایا! ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) یا عمرؓ بن خطاب کے ذریعہ سے اسلام کی تائید فرما۔ پس اے عمرؓ اللہ کی طرف آؤ، اللہ

کی طرف آؤ۔ حضرت عمرؓ نے کہا "مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس لے چلو تاکہ میں مسلمان ہو جاؤں"۔ حضرت خبابؓ نے کہا وہ صفا کے قریب ایک مکان (دار ارقم) میں اپنے چند اصحاب کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ تلوار کمر سے باندھے ہوئے حضورؐ اور آپؐ کے اصحاب کی قیام گاہ پر پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضورؐ کے اصحاب میں سے ایک صاحب نے اٹھ کر دروازے کی جھری سے باہر جھانکا تو دیکھا کہ عمرؓ تلوار باندھے کھڑے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہو کر پلٹے اور حضورؐ کو اس کی خبر دی۔ حضرت حمزہؓ بولے اسے آنے دو، اگر نیک ارادے سے آیا ہے تو ہم بھی نیک معاملہ کریں گے، ورنہ اسی کی تلوار سے اسے ختم کر دیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا اُسے آنے دو۔ حکم کے مطابق عمل کیا گیا اور حضرت عمرؓ کو اندر آنے کا اِذن دے دیا گیا۔ ان کے آتے ہی حضورؐ اُن کی طرف آگے بڑھے، ان کی چادر کو مٹھی میں دبا کر شدت سے کھینچا اور فرمایا "ابن خطاب، تمہیں کیا چیز یہاں لائی ہے؟ واللہ، میں سمجھتا ہوں کہ تم باز نہ آؤ گے جب تک اللہ تم پر کوئی سخت آفت نازل نہ کر دے"۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ، میں اللہ اور اس کے رسول پر اور رسول کی لائی ہوئی تعلیم پر ایمان لانے کے لیے حاضر ہوا ہوں"۔ اس پر حضورؐ نے زور سے اللہ اکبر فرمایا جس سے مکان کے سب لوگ جان گئے کہ عمرؓ مسلمان ہو گئے ہیں۔ اس سے مسلمانوں کی بڑی ہمت بندھی کہ حضرت حمزہؓ کے بعد حضرت عمرؓ بھی مسلمان ہو گئے اور اب یہ دونوں اہلِ اسلام کے لیے تقویت کے موجب بنیں گے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کے متعلق یہ اہلِ مدینہ کے راویوں کا بیان ہے۔ حافظ ابویعلیٰ نے اسے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کیا ہے اور بزار نے خود حضرت عمرؓ سے۔

حضرت عمرؓ کا اپنا بیان

بزار، طبرانی، بیہقی، ابن عساکر، ابونعیم اور دارقطنی وغیرہ نے حضرات ابن عباسؓ، انسؓ بن مالک اور اسلمؓ مولیٰ عمر وغیرہم سے خود حضرت عمرؓ کا اپنا بیان بھی اپنے اسلام قبول کرنے کے متعلق نقل کیا ہے جو تفصیلات میں تھوڑے تھوڑے اختلافات کے ساتھ ابن اسحاق کی مذکورۂ بالا روایت سے بڑی حد تک ملتا جلتا ہے۔ البتہ ابونعیم اور ابن عساکر نے حضرت عمرؓ کے بیان کی جو روایت حضرت عبداللہؓ بن عباس سے نقل کی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں خواہ جئیں یا مریں؟" آپؐ نے فرمایا "اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم لوگ حق پر ہو، خواہ جیو یا مرو"۔ میں نے عرض کیا "پھر یا رسول اللہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب ہم حق پر ہیں اور وہ باطل پر، تو ہم اپنا دین کیوں چھپائیں؟" حضورؐ نے فرمایا "اے عمرؓ، ہم قلیل التعداد ہیں اور تم دیکھ رہے ہو کہ ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں"۔ میں نے عرض کیا "اُس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر بھیجا ہے، میں

کوئی ایسی مجلس نہ چھوڑوں گا جہاں میں پہلے کفر کے ساتھ بیٹھا تھا اور اب اسلام کے ساتھ نہ بیٹھوں"۔ پھر ہم لوگ دو صفوں میں نکلے۔ ایک میں مَیں تھا اور دوسرے میں حمزہؓ۔ یہاں تک کہ ہم مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ قریش نے جب ہم کو دیکھا تو ان کو اس قدر شدید دھچکا لگا کہ پہلے کبھی نہ لگا تھا۔ اس واقعہ کو ابن ماجہ، حاکم اور ابن سعد نے ذرا مختلف طریقہ سے نقل کیا ہے۔ ابن ہشام نے حضرت عمرؓ کا یہ بیان بھی روایت کیا ہے کہ جس روز مَیں نے اسلام قبول کیا اسی رات مجھے خیال آیا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شدید ترین دشمن ہو اس کو مجھے اپنے اسلام کی اطلاع دینی چاہیے۔ چنانچہ میں سیدھا ابوجہل کے ہاں گیا اور اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ نکلا تو مجھے دیکھ کر کہا خوش آمدید، میرے بھانجے، کیسے آئے۔ مَیں نے کہا میں یہ خبر دینے آیا ہوں کہ مَیں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اُس نے کہا "بُرا ہو تیرا اور اُس چیز کا جسے تو لے کر آیا ہے" اور دروازہ بند کر لیا۔

ابن عمرؓ کی روایت

ابن اسحاق نے نافع کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عمرؓ[1] کی روایت بیان کی ہے کہ اسلام لانے کے بعد حضرت عمرؓ نے پوچھا قریش میں کون آدمی سب سے زیادہ خبریں پھیلانے والا ہے؟ بتایا گیا کہ جمیل بن مَعْمَر بن حبیب الجُمَحِی۔ حضرت عمرؓ اس کی تلاش میں نکلے اور مَیں بھی ان کے پیچھے چلا۔ اُس وقت مَیں اس عمر کا لڑکا تھا کہ جو کچھ دیکھتا اسے سمجھتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جا کر اس سے کہا کہ مَیں مسلمان ہو گیا ہوں اور مَیں نے دینِ محمدؐ قبول کر لیا ہے۔ پھر خدا کہ اُس نے پلٹ کر کوئی بات نہ کی اور اپنی چادر گھسیٹتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔ حضرت عمرؓ اس کے پیچھے چلے اور مَیں ان کے پیچھے۔ جب وہ مسجد حرام کے دروازے پر پہنچا تو بلند آواز سے چِلّایا "قریش کے لوگو" سرداران قریش اس وقت کعبہ کے گرد اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ اس کی آواز سُن کر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس نے کہا "سنو، عمر دین سے پھر گیا"۔ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے پکار کر کہا "جھوٹ کہتا ہے، مَیں مسلمان ہوا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں"۔ اس پر لوگ انہیں مارنے لگے اور وہ بھی لوگوں کو مارنے لگے یہاں تک کہ سورج سر پر آ گیا۔ حضرت عمرؓ تھک کے بیٹھ گئے۔ لوگ ان کے گرد کھڑے تھے اور حضرت عمرؓ کہہ رہے تھے کہ تمہارا جی چاہے کر لو۔ اتنے میں قریش کا ایک شیخ آگے بڑھا اور اس نے مجمع سے پوچھا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے کہا عمرؓ دین سے پھر گیا ہے۔ اس نے کہا "تو

---

[1] ابن سعد نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ میں اس وقت ۶ برس کا تھا۔ اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ اس وقت ۵ برس کے تھے (حاشیہ از مؤلف)

پھر کیا ہوا؟ ایک آدمی نے اپنے لیے جو کچھ چاہا اختیار کر لیا۔ اب تم کیا چاہتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنی عدی اس طرح اپنے آدمی کو تمہارے حوالے کر دیں گے؟ ہٹ جاؤ اس کے پاس سے"۔ اس پر لوگ اس طرح ہٹ گئے جیسے کسی پر سے کپڑا کھینچ لیا جاتا ہے۔ میں نے بعد میں اپنے والد سے پوچھا وہ شخص کون تھا۔ انہوں نے فرمایا "بیٹے، وہ عاص بن وائل سہمی تھا" (یعنی عمرو بن العاص کا باپ)۔ طبرانی اور بزار نے ابن عمرؓ کی اس روایت کو مختصراً نقل کیا ہے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ اپنے گھر میں خوف زدہ بیٹھے ہوئے تھے تو عاص بن وائل جو جاہلیت کے زمانہ میں ہمارا حلیف تھا، اُن کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کیوں اس طرح بیٹھے ہو؟ انہوں نے کہا تمہاری قوم مجھے قتل کرنا چاہتی ہے، کیونکہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا کوئی تم پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا جبکہ مجھ سے تمہیں امان مل چکی ہے۔ پھر عاص باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ وادی میں آدمیوں کا سیلاب امڈا ہوا ہے۔ اُس نے پوچھا کیا چاہتے ہو؟ لوگوں نے کہا ہم ابن خطاب کی خبر لینا چاہتے ہیں جو دین سے پھر گیا ہے۔ اس نے کہا کہ عمرؓ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ اس پر سب واپس چلے گئے۔

اسلام عمرؓ کی تاریخ

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ سنہ ۶ بعد بعثت کا ہے جیسا کہ امام نووی نے تہذیب الاسماء و اللغات میں اور ملا علی قاری نے اربعین نووی کی شرح میں لکھا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ حضرت حمزہؓ کے تین دن بعد ایمان لائے اور بعض ۳ ماہ بعد کہتے ہیں۔ مگر ابو نعیم اصفہانی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں نے خود حضرت عمرؓ سے اُن کے اسلام لانے کا واقعہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ میں حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے کے تین دن بعد نکلا تھا۔ ابن سعد نے اسلم مولی عمرؓ کے حوالے سے ذی الحجہ سنہ ۶ بعد بعثت کا واقعہ لکھا ہے لیکن غالباً یہ اس سے اچھی خاصی مدت پہلے کا واقعہ ہے۔ سہیلی نے لکھا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۴۰ سے کچھ زیادہ آدمی تھے۔ واقدی نے اس پر دس عورتوں کا اضافہ کیا ہے لیکن حافظ ابن حجر نے مناقب عمرؓ میں ابن ابی خیثمہ کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ۳۹ آدمی تھے اور میں نے شامل ہو کر ان کو ۴۰ کر دیا۔ ممکن ہے کہ اُس وقت حضرت عمرؓ کو اتنے ہی آدمیوں کا علم ہو، کیونکہ بہت سے مسلمان اپنا ایمان چھپائے ہوئے بھی تھے۔

شعب ابی طالب میں محصوری

اس زمانے میں قریش کا غصہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف روز بروز زیادہ بھڑکتا چلا

جا رہا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کی ساری کوششوں کے باوجود مکّے میں بھی اسلام اندر ہی اندر پھیلتا جا رہا ہے اور بیرونی قبائل کے لوگ بھی پے در پے مسلمان ہو رہے ہیں۔ پھر یہ معاملہ صرف عرب تک ہی محدود نہیں رہ گیا ہے بلکہ حبش تک اس کی خبریں پھیل گئی ہیں، نجاشی کھلم کھلا مسلمانوں کا حامی بن گیا ہے، اور وہاں سے اسلام قبول کرنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وفد آنے لگے ہیں۔ اس پر مزید ان کی آتشِ غضب کو یہ چیز بھڑکا رہی تھی کہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے بہادر اور بااثر سرداروں کی شمولیت سے اُن مسلمانوں کی ہمتیں بڑھ گئی ہیں جو ہجرتِ حبشہ کے بعد مکّہ میں رہ گئے تھے۔ ابن ابی شیبہ اور طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "واللہ، ہم بیت اللہ کے گرد نماز نہ پڑھ سکتے تھے جب تک کہ عمرؓ اسلام نہ لے آتے"۔ بخاری میں انہی حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول بھی منقول ہے کہ مازلنا اعزة منذ اسلم عمر۔ "عمرؓ کے مسلمان ہونے کے بعد سے ہم برابر زور آور ہی رہے"۔

ان اسباب نے مل جل کر آخرکار قریش کی جاہلیت کو اس قدر برافروختہ کر دیا کہ انہوں نے بالاتفاق ایک دستاویز لکھی جس میں اللہ کی قسم کھا کر یہ عہد کیا گیا تھا کہ جب تک بنی ہاشم اور بنی المطلب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اُن کے حوالہ نہ کر دیں اُس وقت تک اُن سے میل جول، شادی بیاہ، بول چال اور خرید و فروخت کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے گا۔ قریش کے تمام خاندانوں کے سربراہوں نے اس دستاویز کی توثیق کی اور اسے خانہ کعبہ میں لٹکا دیا گیا۔ ابن سعد اور ابن عبد البرؒ کا بیان ہے کہ یہ محرم ۷ بعد بعثت کا واقعہ ہے۔

موسیٰ بن عقبہ نے امام زُہری کے حوالہ سے اپنی مغازی میں لکھا ہے[1] کہ ابو طالب کو جب معلوم ہوا کہ قریش کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہیں، تو انہوں نے بنی ہاشم اور بنی المطلب کو بلایا اور اُن سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساتھ لے کر سب کے سب شعبِ ابی طالب[2] میں جمع ہو جائیں اور آخر وقت تک آپ کی حفاظت کریں۔ اس تجویز کو دونوں خاندانوں نے قبول کیا اور اُن کے کافر و مسلمان سب شعبِ ابی طالب میں سمٹ آئے۔ اس کے بعد قریش کے باقی خاندانوں نے آپس میں وہ معاہدہ کیا جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے[3]۔

---

[1] ابن عبد البرؒ نے سیرت میں اس روایت کو موسیٰ بن عقبہ کے علاوہ محمد بن عبدالرحمٰن ابوالاسود اور یعقوب بن حمید بن کاسب کے حوالہ سے بھی نقل کیا ہے (حاشیہ از مؤلف)

[2] شعب کے معنی گھاٹی کے ہیں۔ شعبِ ابی طالب کوہِ ابو قبیس کی گھاٹیوں میں سے ایک تھی جس میں ابو طالب رہتے تھے۔ اب اس کا نام شعبِ علی ہے، اور اسے سُوق اللیل بھی کہا جاتا ہے (حاشیہ از مؤلف)

[3] ابن عبد البرؒ نے موسیٰ بن عقبہ کے حوالہ سے امام زُہری کی یہ عجیب روایت نقل کی ہے کہ شعبِ ابی طالب

اس کے برعکس ابن سعد نے واقدی کا اور ابن سعد نے ابن اسحاق کا بیان نقل کیا ہے کہ پہلے قریش کے لوگوں نے بنی ہاشم اور بنی المطلب کے مقاطعہ کا عہد نامہ لکھا، اور اس کے بعد یہ دونوں خاندان ابوطالب کی ہدایت پر شعب ابی طالب میں محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ یہی بات ابن عبدالبر نے بھی سیرت میں لکھی ہے۔ ابولہب اس موقع پر اپنے خاندان سے الگ رہا اور اس نے مقاطعہ کرنے والوں کا ساتھ دیا۔ بنی عبدِ مناف کے باقی دو خاندان، بنی عبدِ شمس اور بنی نوفل بھی اپنے ہم جد رشتہ داروں کو چھوڑ کر مقاطعہ کرنے والے دشمنوں کے ساتھ رہے۔

ابن اسحٰق کے حوالہ سے ابن ہشام نے محصوری کا زمانہ دو یا تین سال لکھا ہے۔ مگر ابن سعد اور موسیٰ بن عقبہ نے تعیّن کے ساتھ اس کی مدت تین سال بیان کی ہے۔ اس پورے زمانے میں قریش کا محاصرہ بڑی سختی کے ساتھ جاری رہا۔ محصورین کی ایسی ناکہ بندی کر دی گئی تھی کہ اُن کو کھانے پینے کی چیزیں پہنچنے کے تمام راستے بند ہو گئے۔ موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے کہ باہر کے تاجر اگر مکے آتے تو قریش کے لوگ جلدی کر کے ان کا سب سامان خرید لیتے تاکہ محصورین ان سے کوئی چیز نہ خرید سکیں۔ ابولہب کے متعلق ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہ محصورین کو کوئی چیز خریدتے دیکھتا تو پکار کر تاجر سے کہتا کہ ان سے اتنی زیادہ قیمت مانگو کہ یہ خرید نہ سکیں، پھر میں وہی چیز تم سے خرید لوں گا اور تمہارا نقصان نہ ہونے دوں گا۔ ابن سعد اور بیہقی کی روایت ہے کہ محصورین کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ اُن کے بھوکے بچوں کے رونے بلکنے کی آوازیں شعب ابی طالب کے باہر سنی جاتی تھیں۔ یہ لوگ صرف حج کے زمانے میں نکلتے تھے اور دوسرا حج آنے تک اپنے محلّے میں بند رہتے تھے۔

اس زمانے میں صرف حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام، اور نَضلہ بن ہاشم بن عبدِ مناف کے بھتیجے (یعنی اُس کے ماں جائے بھائی کے بیٹے) ہشام بن عَمرو العامری، چوری چھپے صلۂ رحمی کا حق ادا کرتے رہے۔ ابن اسحاق کے حوالہ سے ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل نے حکیم بن حزام کو اپنی پھوپھی صاحبہ کے لیے غلّہ لے جاتے ہوئے پکڑ لیا اور کہا "تم بنی ہاشم کے لیے خوراک کا سامان لے جا رہے ہو؟ اچھا، میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا جب تک مکہ بھر میں تم کو رسوا نہ کر دوں"۔ اتنے میں ابوالبختری بن ہشام، جو بنی اَسد بن عبدالعزّیٰ بن قصیّ میں سے تھا اور حضرت خدیجہؓ کا قریبی رشتہ دار ہوتا تھا، وہاں پہنچ گیا اور اس نے پوچھا

۲۔ کی محصوری کے بعد حضورؐ نے مکہ کے مظلوم مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ یہ بات معلوم و معروف روایات کے خلاف ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

کیا معاملہ ہے؟ ابوجہل نے کہا یہ بنی ہاشم کے لیے غلہ لے جا رہا ہے۔ وہ بولا چھوڑ دے اس کو۔ یہ اس کی پھوپھی کا غلہ ہے جو وہ ان کے پاس لے جا رہا ہے۔ کیا تو ان کی اپنی چیز ان کے پاس نہیں لے جانے دیگا؟ ابوجہل نے انکار کیا۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہو گئی اور ابوالبختری نے اسے بُری طرح رگیدا حتیٰ کہ اُونٹ کے جبڑے کی ہڈی اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اس سارے معاملے کو حضرت حمزہؓ دیکھ رہے تھے، اس لیے دونوں کافروں نے ٹھہر کر اپنا جھگڑا ختم کر دیا تاکہ بنی ہاشم اس پر خوش نہ ہوں۔ ہشام بن عمرو العامری کے متعلق بھی ابن اسحاق کی روایت ابن ہشام نے نقل کی ہے کہ وہ بھی خفیہ طریقہ سے بنی ہاشم اور بنی المطّلب کے ساتھ صلۂ رحمی کرتا رہتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ اونٹ پر غلہ لاد کر رات کے وقت شعب ابی طالب کے سرے پر لاتا اور اس کو شعب کے اندر دھکیل دیتا جسے محصورین پکڑ لیتے اور غلّہ اُتار کر اُونٹ کو واپس چھوڑ دیتے۔ قریش والوں نے اس کو بھی دھمکیاں دیں، مگر ابوسفیان نے کہا چھوڑو اس کو۔ ایک آدمی ہے جو رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کر رہا ہے۔

شق القمر کا واقعہ

یہ مقاطعہ پوری شدّومد کے ساتھ جاری تھا، مگر جیسا کہ ہم دعوتِ عام کے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس کے باوجود علی الاعلان اسلام کی تبلیغ سے ایک دن بھی باز نہ رہے، اور کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ آپ کو اس سے روک دیتا۔ مقاطعے پر ابھی دو ہی برس گزرے تھے کہ شق القمر کا عظیم الشان واقعہ پیش آ گیا، جسے کفارِ مکّہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ محدثین اور مفسّرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سنہ قبلِ ہجرت (یعنی سنہ ۸ بعدِ بعثت) کا واقعہ ہے اور یہ منیٰ کے مقام پر پیش آیا تھا۔ خود قرآن مجید میں اس کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۔ (القمر۔ آیت ۱-۲)

"قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا۔ مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ یہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں، مُنہ موڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو چلتا ہوا جادو ہے۔"

بعض عقلیت پرستوں نے چاند جیسے عظیم کرّے کے پھٹنے کو بعید از امکان سمجھ کر اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کا مطلب یہ لے لیا ہے کہ "چاند پھٹ جائے گا" حالانکہ اگر اس کا ترجمہ "پھٹ گیا" کے بجائے "پھٹ جائے گا" کیا جائے تو دونوں آیتوں کا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ پہلی آیت میں چاند کے پھٹنے کو قیامت کی گھڑی قریب آنے کی علامت بتایا گیا ہے۔ اگر اسے آئندہ ہونے والا واقعہ قرار دیا جائے

تو چاند کے پھٹنے کو قیامت کے قریب ہونے کی علامت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے ؟ پھر یہ معنی لینے کی صورت میں آگے کی آیت تو بالکل ہی بے معنی ہو جاتی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ ایسے ہٹ دھرم ہیں کہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں ، اس سے مُنہ موڑ جاتے ہیں اور اسے جادُو کا کرشمہ قرار دے دیتے ہیں۔ یہ سیاق و سباق تو اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے یہ معنی قطعی طور پر متعین کر دیتا ہے کہ اُس وقت چاند فی الواقع پھٹ گیا تھا۔ اِسی معنی کی تصدیق حدیث کی معتبر روایات کرتی ہیں۔ (۵)

یہ روایات بخاری، مسلم، ترمذی، احمد، ابو عوانہ، ابو داؤد طیالسی، عبدالرزاق، ابن جریر، بیہقی، طبرانی، ابن مردویہ اور ابُو نُعیم اصفہانی نے بکثرت سندوں کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت حُذیفہؓ بن الیمان، حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت جُبیرؓ بن مُطعم سے نقل کی ہیں۔ ان میں سے تین بزرگ یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حُذیفہؓ اور حضرت جُبیرؓ بن مُطعم تصریح کرتے ہیں کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں اور دو بزرگ ایسے ہیں جو اس کے عینی شاہد تو نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہ اُن میں سے ایک (یعنی عبداللہ بن عباس) کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے ، اور دوسرے (یعنی انسؓ بن مالک) اُس وقت بچے تھے ، لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات صحابی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ انہوں نے ایسے سن رسیدہ صحابیوں سے سُن کر ہی اسے روایت کیا ہو گا جو اس واقعہ کا براہِ راست علم رکھتے تھے۔

تمام روایات کو جمع کرنے سے اس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً ۵ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری مہینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہُوا تھا۔ یکا یک وہ پھٹا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جُڑ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے لوگوں سے فرمایا دیکھو اور گواہ رہو۔ کفّار نے کہا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم پر جادُو کر دیا تھا اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکا کھایا۔ دوسرے لوگ بولے کہ محمدؐ ہم پر جادُو کر سکتے تھے ، تمام لوگوں پر تو نہیں کر سکتے تھے۔ باہر کے لوگوں کو آنے دو۔ اُن سے پوچھیں گے کہ یہ واقعہ انہوں نے بھی دیکھا ہے یا نہیں۔ باہر سے جب کچھ لوگ آئے تو انہوں نے شہادت دی کہ وہ بھی یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔

بعض روایات جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں اُن کی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شق القمر کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ پیش آیا تھا۔ لیکن اوّل تو صحابہ میں سے کسی اور نے یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ دوسرے خود حضرت انسؓ کی بھی بعض روایات میں مَرَّتَین (دو مرتبہ) کے الفاظ ہیں اور بعض میں فِرقَتَین اور شِقَّتَین (دو ٹکڑے) کے الفاظ۔ تیسرے یہ کہ قرآن مجید صرف ایک انشقاق کا ذکر کرتا ہے۔ اس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا۔ رہے وہ قصّے جو عوام میں مشہور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے انگلی سے چاند کی طرف اشارہ کیا اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا، اور یہ کہ چاند کا ایک ٹکڑا حضورؐ کے گریبان میں داخل ہو کر آپ کی کسی آستین سے نکل گیا، سب بالکل ہی بے اصل ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی حقیقی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا جو کفارِ مکہ کے مطالبے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک حادثہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس کی طرف توجہ صرف اس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکانِ قیامت اور قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے؟ علماء کرام کا ایک بڑا گروہ اسے حضورؐ کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ کفار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا۔ لیکن اس رائے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے جو حضرت انسؓ سے مروی ہیں۔ ان کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ فتح الباری میں ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ "یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے ان میں سے کسی میں بھی حضرت انسؓ کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شق القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبہ پر ہوا تھا" (باب انشقاق القمر)۔ ایک روایت ابو نعیم اصفہانی نے دلائل النبوۃ میں حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی اس مضمون کی نقل کی ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے جتنی روایات کتبِ حدیث میں ابن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عباس، دونوں اس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بخلاف اس کے جو صحابہؓ اُس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبداللہؓ بن مسعود، حضرت حذیفہؓ، حضرت جبیرؓ بن مطعم، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے حضورؐ کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اس پر شق القمر کا یہ معجزہ ان کو دکھایا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن مجید خود بھی اس واقعہ کو رسالتِ محمدیؐ کی نہیں بلکہ قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ البتہ یہ اس لحاظ سے حضورؐ کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپؐ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ ان کی تصدیق کر رہا تھا۔

معترضین اس پر دو طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اول ان کے نزدیک ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کہ چاند جیسے عظیم کُرّے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سینکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دُور جانے کے بعد پھر باہم جُڑ جائیں۔ دوسرے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہُوا ہوتا تو یہ واقعہ دنیا بھر میں مشہور ہو جاتا، تاریخوں میں اس کا ذکر آتا، اور علمِ نجوم کی کتابوں میں اسے

بیان کیا جاتا لیکن درحقیقت یہ دونوں اعتراضات بے وزن ہیں۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے، قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی، لیکن موجودہ دور میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دُور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ آملیں۔ رہا دوسرا اعتراض تو وہ اس لیے بے وزن ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لحظہ کے لیے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوئی ہوں۔ اس سے کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف منعطف ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔ اور پوری رُوئے زمین پر اُسے دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا، بلکہ صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اُس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اُس وقت تک اتنا ترقی یافتہ نہ تھا کہ مشرقی ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا وہ اسے ثبت کر لیتے اور کسی مؤرخ کے پاس یہ شہادتیں جمع ہوتیں اور وہ تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا۔ تاہم مالا بار کی تاریخوں میں یہ ذکر آیا ہے کہ اس رات وہاں کے ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ رہیں علم نجوم کی کتابیں اور جنتریاں تو ان میں اس کا ذکر آنا صرف اس حالت میں ضروری تھا جبکہ چاند کی رفتار، اور اس کی گردش کے راستے، اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات میں اس سے کوئی فرق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چونکہ پیش نہیں آئی اس لیے قدیم زمانے کے اہلِ تنجیم کی توجہ اس کی طرف منعطف نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں رصد گاہیں اس حد تک ترقی یافتہ نہ تھیں کہ افلاک میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا نوٹس لیتیں اور اس کو ریکارڈ پر محفوظ کر لیتیں۔ (۴)

مقاطعہ کا کس طرح خاتمہ ہوا

کفارِ مکّہ کے سرپھرے اور متشدّد سرداروں نے اگرچہ وقتی طور پر غصہ میں آ کر اپنے شہر کے دو بڑے خاندانوں کا مقاطعہ باقی سب خاندانوں سے کرا لیا تھا، مگر مکہ میں کوئی خاندان بھی ایسا نہ تھا جس کی رشتہ داریاں بنی ہاشم اور بنی المطلب کے ساتھ نہ ہوں۔ اس لیے ابتدا ہی سے متعدد لوگوں کو اپنے بھائی بندوں کا یہ مقاطعہ ناگوار تھا، اور جوں جوں یہ طویل ہوتا گیا، اس کے خلاف جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا، کیونکہ بنی ہاشم اور بنی المطلب پر فاقہ کشی کی نوبت آگئی تھی، ان کے بچوں کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آس پاس کے محلّوں تک پہنچ رہی تھیں، اور دوسرے خاندانوں میں ان کے رشتہ دار، جو پڑوس ہی میں رہتے تھے، ان آوازوں کو سُن سُن کر

بے تاب ہوتے جاتے تھے۔ موسیٰ بن عقبہ کا بیان ہے کہ تیسرے سال کے اختتام پر بنی عبد مناف، بنی قصی اور دوسرے اُن لوگوں نے جن کے شادی بیاہ کے رشتے بنی ہاشم سے تھے، ایک دوسرے کو ملامت کی اور صاف صاف کہنا شروع کر دیا کہ یہ قطع رحمی ہے جو ہم نے کی ہے حرکت کر کے ہم نے خاندانی حقوق کا استخفاف کیا ہے۔

طبری اور ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالے سے اور بلاذری نے واقدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ آخر کار ہشام بن عمرو العامری اس کام کا بیڑا اُٹھایا کہ وہ اِس مقاطعے کا خاتمہ کرا کے چھوڑے گا۔ سب سے پہلے وہ بنی مخزوم کے رئیس، زُہیر بن ابی اُمیہ سے ملا جو حضرت اُم سلمہؓ کا بھائی اور حضورؐ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبد المطلب کا بیٹا تھا۔ اُس نے کہا، اے زُہیر، کیا تم اِس سے خوش ہو کہ اطمینان سے کھاؤ، پیو، شادیاں کرو، اور تمہاری ننہیال کے لوگ بھوکے مریں، اُن سے لین دین کا مقاطعہ کیا جائے، اور ان کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے بھی توڑ لیے جائیں؟ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر معاملہ ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) کا ہوتا، اور تم نے اس کی ننہیال کے ساتھ وہ معاملہ کرنے کی دعوت دی ہوتی جو اس نے تمہاری ننہیال کے ساتھ کرنے کی دعوت دی ہے تو وہ ہرگز نہ مانتا۔ زُہیر نے کہا، ہشام، میں اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی اور بھی ساتھ دینے والا ہوتا تو میں مقاطعہ کی دستاویز کو پھڑوائے بغیر نہ چھوڑتا۔ ہشام نے کہا ایک آدمی ساتھ دینے والا تو میں موجود ہوں۔ زُہیر نے کہا ایک اور آدمی تلاش کرو۔

پھر ہشام بنی نوفل بن عبد مناف کے سردار مُطعِم بن عدی کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ اے مُطعِم کیا تم راضی ہو کہ بنی عبد مناف کے دو خانوادے ہلاک ہو جائیں اور تم تماشا دیکھتے رہو؟ اگر اس معاملہ میں تم نے قریش کا ساتھ دیا اور قریش کو اس طرح اُن کا خاتمہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا تو جلدی ہی ایک دن یہی کچھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ اس نے کہا میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ کسی اور کو ساتھ ملاؤ۔ ہشام نے کہا، ایک میں ہوں اور دوسرا زُہیر بن ابی اُمیہ۔ مُطعِم نے کہا ایک اور ساتھی ڈھونڈ لو۔

اس کے بعد ہشام بنی اسد بن عبد العزیٰ کے سردار ابوالبختری عاص بن ہاشم سے ملا اور اس سے بھی وہی باتیں کہیں جو مُطعِم سے کہی تھیں۔ اس نے پوچھا کوئی اور بھی ساتھ دینے والا ہے؟ ہشام نے کہا میں ہوں، زُہیر بن ابی اُمیہ ہے، اور مُطعِم بن عدی ہے۔ اس نے کہا بس ایک اور آدمی کو ساتھ ملا لو۔ چنانچہ ہشام نے زمعہ بن الاسود بن مطلب سے بات کی جو بنی اسد بن عبد العزیٰ ہی کے سرداروں میں سے ایک تھا، اور اسے بھی اس کام کے لیے ہموار کر لیا۔

پھر یہ پانچوں آدمی رات کے وقت مکہ کے بالائی مقام حجون پر ملے اور آپس میں طے کیا کہ کس طرح

مقاطعہ کی دستاویز کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ زہیر نے کہا کہ میں بات کی ابتدا کروں گا اور تم لوگ میرا ساتھ دینا۔ دوسرے روز صبح کو یہ لوگ قریش کی مجلسوں کی طرف گئے اور زہیر نے کعبہ کے سات طواف کرنے کے بعد سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "اے اہلِ مکہ، کیا ہم کھائیں پییں اور کپڑے پہنیں اس حال میں کہ بنی ہاشم ہلاک ہو رہے ہیں؟ نہ اُن سے کچھ خریدا جاتا ہے اور نہ اُن کے ہاتھ کچھ فروخت کیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم میں ہرگز نہ بیٹھوں گا جب تک اس ظالمانہ مقاطعہ کی دستاویز پھاڑ نہ دی جائیگی۔ ابوجہل پکار کر کہا تم نے جھوٹ کہا، وہ ہرگز پھاڑی نہ جائیگی۔ زمعہ بولا "واللہ تم سب سے بڑھ کر جھوٹے ہو، ہم اس وقت بھی راضی نہ تھے جب یہ دستاویز لکھی گئی تھی"۔ ابوالبختری نے تائید کی "زمعہ سچ کہتے ہیں، اس دستاویز میں جو کچھ لکھا گیا ہے، ہم اس پر ہرگز راضی نہیں ہیں اور نہ اس کا اقرار کرتے ہیں"۔ مطعم بن عدی نے کہا "تم دونوں سچے ہو اور جھوٹا ہے وہ جو اس کے سوا کچھ کہتا ہے۔ ہم اللہ کے سامنے اس دستاویز سے، اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اُس سے برأت کا اظہار کرتے ہیں"۔ ہشام بن عمرو نے بھی اس کی تائید کی۔ اس پر ابوجہل نے کہا کہ "یہ ایک سازش ہے جو رات کو کسی اور جگہ بیٹھ کر تیار کی گئی ہے"۔

قدرتِ الٰہی کا ایک عجیب کرشمہ

ابن سعد اور ابنِ ہشام اور بلاذری نے لکھا ہے کہ اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کی طرف سے خبر دی گئی کہ مقاطعہ کی دستاویز میں جو ظلم اور قطع رحمی کا جو مضمون لکھا گیا تھا اُس سب کو دیمک چاٹ گئی ہے اور صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے (ابن اسحٰق، موسیٰ بن عقبہ اور عُروہ کا بیان اس کے برعکس یہ ہے کہ اللہ کا نام جہاں تھا اس جگہ کو دیمک نے چاٹ لیا ہے اور صرف ظلم اور قطع رحمی کا مضمون باقی رہ گیا ہے لیکن یہ بات قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی اور صحیح بات وہی ہے جو ابن سعد، بلاذری اور ابنِ ہشام نے لکھی ہے)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر اپنے چچا ابوطالب سے کیا۔ انہوں نے پوچھا "کیا تمہارے رب نے تمہیں اس کی خبر دی ہے؟" حضورؐ نے فرمایا "جی ہاں"۔ ابوطالب نے اس کا ذکر اپنے بھائیوں سے کیا۔ انہوں نے کہا آپ کا کیا خیال ہے؟ ابوطالب نے کہا واللہ محمدؐ نے کبھی مجھ سے کوئی بات جھوٹی نہیں کہی ہے۔ پھر ابوطالب نے پوچھا اب کیا کرنا چاہیے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری رائے یہ ہے کہ آپ لوگ اپنے بہترین کپڑے پہن کر قریش کی طرف نکلیں اور ان کو یہ بات بتائیں۔ چنانچہ سب نکلے اور حِجر میں گئے جہاں قریش کے بڑے اور دانا لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو آتے دیکھ کر سب حاضرین کی نگاہیں ان کی طرف اُٹھ گئیں اور وہ سوچنے لگے کہ آخر یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

اگرچہ مؤرخین نے اس بات کی تصریح نہیں کی ہے، لیکن پچھلی روایت اور اس دوسری روایت کو

ملا کر دیکھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ ابو طالب اور ان کے ساتھی عین اُس وقت حرم میں پہنچے ہونگے جب زُہیر اور اس کے ساتھیوں کا ابو جہل سے جھگڑا ہو رہا تھا اور قریش کے سردار ملا کا مجمع اِس قضیے پر غور کرنے میں لگا ہُوا تھا۔ ابو طالب نے وہاں پہنچتے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے کہا "ہم ایک بات لیکر آئے ہیں، اس کا وہ جواب دو جو تمہارے نزدیک درست ہو"۔ سرداران قریش نے کہا "خوش آمدید، اہلاً و سہلاً، ہمارے پاس وہ بات ہے جو آپ کو خوش کرنے والی ہو۔ آپ کیا چاہتے ہیں"۔ ابو طالب نے کہا "میرے بھتیجے نے مجھے یہ خبر دی ہے، اور خدا کی قسم وہ کبھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ اب تم وہ صحیفہ منگوا کر دیکھو۔ اگر میرے بھتیجے کی بات سچی ہے تو ہمارے ساتھ اپنی قطع رحمی سے باز آ جاؤ اور جو کچھ اِس صحیفہ میں تم نے لکھا تھا اسے ختم کر دو۔ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو میں اسے تمہارے حوالے کر دونگا، پھر تمہیں اختیار ہے، چاہو قتل کر دو، چاہو زندہ رہنے دو"۔ انہوں نے کہا "آپ نے یہ انصاف کی بات کہی ہے"۔ پھر وہ صحیفہ منگوایا گیا۔ کھول کر دیکھا تو بات وہی سچی نکلی جس کی خبر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ اس پر کفارِ قریش کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور ان کے سر جھک گئے۔ ابو طالب نے کہا "اب تم پر واضح ہو گیا کہ ظلم اور قطع رحمی اور بدسلوکی کے مرتکب تم ہی ہو رہے تھے۔ پھر ہم کس قصور میں محبوس رکھے جائیں؟" پھر ابو طالب اپنے ساتھیوں سمیت کعبہ کے پردوں کے پیچھے گئے اور بیت اللہ کی دیواروں سے لپٹ کر انہوں نے دعا مانگی کہ "خدایا اُن لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما جنہوں نے ہم پر ظلم کیا، ہم سے قطع رحمی کی اور جو کچھ اپنے لیے حلال کر لیا جو ہمارے معاملے میں اُن پر حرام تھا"۔ یہ کہہ کر وہ اپنے ہمراہیوں کو لیے ہوئے اپنی شعب کی طرف روانہ ہو گئے۔ اِن کے اٹھتے ہی قریش کے بہت سے لوگوں نے اُس ظلم پر سخت ملامت کی جو بنی ہاشم پر کیا گیا تھا۔ اُن میں مُطعِم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن اسود، ابو البختری بن ہاشم اور زُہیر بن ابی اُمیہ پیش پیش تھے۔ پھر یہ لوگ ہتھیار بند ہو کر شعب ابی طالب میں گئے اور بنی ہاشم اور بنی المطلب سے کہا کہ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھروں میں جا کر آباد ہوں۔

ابن سعد، بلاذری اور ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے کہ مقاطعہ کا خاتمہ ۱۰ نبوت میں ہُوا۔

حضرت خدیجہؓ اور جناب ابُو طالب کی وفات

مقاطعہ اور محصُوری کے خاتمے سے حضورؐ کو جو اطمینان نصیب ہُوا تھا وہ بہت جلدی پے در پے صدموں سے رنج و غم میں تبدیل ہو گیا۔ یہ صدمے حضورؐ کے زبردست حامی و مددگار چچا ابو طالب اور آپ کی انتہائی وفادار و غمگسار بیوی حضرت خدیجہؓ کی وفات کے تھے۔ اور یہ دونوں صدمے آپ کو اسی سال یعنی ۱۰ بعد بعثت میں پیش آئے تھے جس میں مقاطعہ کا خاتمہ ہُوا تھا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات ابوطالب سے پہلے ہوئی (واقدی کی روایت ۳۵ دن پہلے کی ہے)، مگر مشہور اور معتبر بات یہی ہے کہ ابوطالب کا انتقال پہلے ہوا اور اس کے تھوڑی ہی مدت بعد حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ بیہقی اور ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کا یہ مجمل بیان نقل کیا ہے کہ ان دونوں کی وفات ہجرت سے تین سال پہلے ایک ہی سال میں ہوئی۔ ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ ابوطالب کی وفات شعب سے نکلنے کے ۸ مہینے بعد ہوئی اور ان کے تین دن بعد حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوا۔ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ۱۵ شوال سنہ ۱۰ بعد بعثت میں ابوطالب کی وفات ہوئی اور اس وقت ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔ اس کے ایک مہینہ پانچ دن بعد حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی، اور اس وقت ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ ابن اثیر نے ابوطالب کی وفات کو شوال یا ذی القعدہ سنہ ۱۰ بعد بعثت کا واقعہ بیان کیا ہے، اور مختلف اقوال میں سے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ ان کی اور حضرت خدیجہؓ کی وفات میں ۳۵ دن کا فصل تھا۔ حافظ ابوالفرج ابن الجوزی دونوں کی وفات کے درمیان صرف ۵ دن کا اور ابن قتیبہ تین دن کا فصل بتاتے ہیں۔ مواہب اللدنیہ میں قسطلانی نے لکھا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات رمضان سنہ ۱۰ بعد بعثت میں ہوئی۔ اور بلاذری نے حکیم بن حزام کے حوالہ سے تاریخ وفات ۱۰ رمضان سنہ ۱۰ بعد بعثت لکھی ہے۔

کفار کی اذیت رسانیاں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) فرمایا کرتے تھے۔ ان دونوں حادثوں کے بعد ایک طرف آنحضورؐ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، اور دوسری طرف یکایک قریش کے لوگ یہ دیکھ کر کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پشتیبان اب کوئی نہیں رہا ہے، آپ کے مقابلے میں بہت جری ہو گئے تھے۔ ابوطالب کی زندگی میں جو اذیتیں وہ آپ کو نہ پہنچا سکتے تھے، وہ اب انہوں نے پہنچانی شروع کر دیں۔ بیہقی نے عروہ بن زبیر کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قریش ابوطالب کی وفات تک بزدل بنے رہے"۔ حاکم نے عروہ بن زبیر کی یہی روایت انہی الفاظ میں حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔

ابن اسحاق نے قریش کی بڑھتی ہوئی جسارتوں کی ایک مثال عروہ بن زبیر کے حوالہ سے بیان کی ہے کہ ایک روز قریش کے ایک اوباش نے سر بازار حضورؐ کے سر مبارک پر مٹی ڈال دی۔ آپ اسی حال میں گھر تشریف لے گئے۔ صاحبزادیوں میں سے ایک آپ کا سر دھوتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں، اور حضورؐ انہیں تسلی دینے کے لیے یہ فرماتے جاتے تھے کہ "رو نہیں میری بیٹی، اللہ تیرے باپ کا حامی ہے"۔

امام بخاری نے کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ، کتاب الجزیۃ، کتاب الجہاد اور کتاب المغازی میں متعدد جگہ یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کی ہے کہ حضورؐ ایک روز کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور قریش کے لوگ اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے (مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ ابوجہل نے) کہا تم میں سے کون ہے جو جا کر فلاں شخص کے گھر سے ذبح کی ہوئی اونٹنی (مسلم کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جو ایک دن پہلے ذبح کی گئی تھی) کے پیٹ کی آلائش اور اس کا اوجھ اور خون سے لتھڑی ہوئی بچہ دانی اٹھا لائے اور اس شخص کی پیٹھ پر سجدے کی حالت میں رکھ دے؟ اس پر اُن کا سب سے زیادہ شقی آدمی (عقبہ بن ابی مُعیط) اٹھا اور یہ گندگی لا کر اس نے سجدے کی حالت میں حضورؐ کی پیٹھ پر یا دونوں کندھوں کے درمیان رکھ دی۔ اس کے بوجھ کی وجہ سے حضورؐ سجدے ہی میں پڑے رہے، سر نہ اٹھا سکے۔ قریش کے لوگ یہ منظر دیکھ دیکھ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتے جا رہے تھے اور ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ اتنے میں کسی نے جا کر آپ کے گھر میں یہ خبر پہنچا دی۔ حضرت فاطمہؓ سُن کر دوڑی ہوئی آئیں، اور انہوں نے یہ گندگی کا انبار آپؐ کے اوپر سے کھینچ کھینچ کر پھینکا، اور پھر قریش کے لوگوں کو مخاطب کر کے انہیں بہت بُری طرح ڈانٹا اور ان لوگوں کو بد دعائیں دیں جنہوں نے یہ حرکت کی تھی (یہ الفاظ بزّار نے یہ اضافہ کیا ہے کہ کفار میں سے کسی نے حضرت فاطمہؓ کو کچھ نہ کہا) نماز ختم کرنے کے بعد حضورؐ نے فرمایا، خدایا! قریش سے نمٹ لے۔ (کسی روایت میں یہ ہے کہ حضورؐ نے یہ بات دو مرتبہ فرمائی اور کسی میں ہے کہ تین مرتبہ فرمائی۔ بخاری کی روایت ہے کہ حضورؐ کی یہ بد دعا قریش کو بہت شاق گزری، اور مسلم کی روایت ہے کہ حضورؐ کی آواز سُن کر اُن لوگوں کی ساری ہنسی رخصت ہو گئی اور وہ آپ کی بد دعا سے خوف زدہ ہو گئے۔ ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضورؐ نے نام لے لے کر ابوجہل، عُتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عُتبہ بن ربیعہ، اُمیہ بن خَلَف، عُقبہ بن ابی مُعیط، اور عُمارہ بن ولید کو بد دعا دی۔ (اس حدیث کو بخاری و مسلم کے علاوہ امام احمد، نسائی، بزّار، طبرانی اور ابوداؤد طیالسی وغیرہم نے بھی نقل کیا ہے۔ طیالسی کی روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول بھی منقول ہوا ہے کہ میں نے حضورؐ کو اُس دن کے سوا کبھی ان لوگوں کے حق میں بد دعا کرتے نہیں سُنا)۔

اگرچہ اس حدیث کے روایت کرنے والے محدثین نے یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ واقعہ کس زمانے میں پیش آیا تھا۔ لیکن ایک بات اس میں ایسی ہے جو اس کا زمانہ قریب قریب متعین کر دیتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ پر بحالت سجدہ اونٹنی کا اوجھ ڈالے جانے کی اطلاع جب حضورؐ کے گھر پہنچی تو حضرت فاطمہؓ دوڑی ہوئی آئیں اور انہیں نے اسے کھینچ کر حضورؐ کے شانوں پر سے اُتارا۔ حضرت فاطمہؓ کے متعلق ابن عبدالبرّ نے استیعاب میں

لکھا ہے کہ وہ اُس وقت پیدا ہُوئی تھیں جب حضورؐ کا سنِ شریف ۴۱ سال تھا۔ زرقانی نے شرح مواہب میں اِسی کو صحیح کہا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس واقعہ کے وقت حضرت فاطمہؓ کی عمر کم از کم ۹ سال کی تو ہونی چاہیے تھی، کیونکہ اس سے کم عمر کی لڑکی کے لیے یہ مشکل تھا کہ آلائش سے بھرا ہُوا اونٹنی کا اوجھا دُور ان کھینچ کر اُتار سکتی۔ اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ کفار نے یہ بیہودگی اُسی زمانے میں کی تھی جب حضرت خدیجہؓ اور جناب ابوطالب کا انتقال ہو چکا تھا۔

ابوطالب کی وصیتیں

علامہ قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں اور علامہ زرقانی نے اُس کی شرح میں ہشام بن محمد بن السائب کلبی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ابوطالب کے آخری وقت میں قریش کے سردار اُن سے ملنے کے لیے آئے تو انہوں نے قریش کی خوبیاں اور ان کے فضائل بیان کرنے کے بعد اُن سے کہا کہ دیکھو، اس خانۂ کعبہ کی تعظیم ملحوظ رکھنا کہ اسی میں رب کی خوشنودی ہے۔ صلہ رحمی کرنا۔ ایک دوسرے پر زیادتی اور حق ماری نہ کرنا۔ دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرنا۔ سائل کی حاجت روائی کرنا۔ صداقت اور ادائے امانت کے پابند رہنا۔ پھر اسی سلسلے میں انہوں نے کہا کہ ”میں تمہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا، کیونکہ وہ قریش میں امین اور تمام عرب میں صادق ترین آدمی ہے، اور وہ ان تمام خوبیوں کا جامع ہے جو میں نے تم سے بیان کی ہیں۔ وہ ایسی بات لایا ہے جسے دل مانتا ہے اور زبان لوگوں کی دشمنی کے خوف سے اس کا انکار کرتی ہے۔ مگر خدا کی قسم، میں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے کنگال اور اطراف و نواح کے لوگ اور کمزور لوگ آگے بڑھ کر اُس کی دعوت قبول کر لیں گے، اس کے کلمہ کی تصدیق کریں گے، اُس کے کام کو بڑھائیں گے، اور وہ انہیں لے کر خطرات کے میدان میں کود پڑے گا، اور قریش کے سردار اور اکابر دُم چھلے بن کر رہ جائیں گے۔“

ابن سعد نے لکھا ہے کہ مرتے وقت ابوطالب نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ ”تم ہمیشہ بخیر رہو گے جب تک (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات سُنتے رہو گے اور اُس کے حکم کی پیروی کرتے رہو گے۔ لہٰذا اُس کا اتباع کرو اور اس کی مدد کرو، راہِ راست پر رہو گے۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ”چچا جان، آپ ان لوگوں کو تو نصیحت کرتے ہیں مگر خود اپنے آپ کو کیوں چھوڑے دے رہے ہیں؟“ انہوں نے جواب دیا: ”مگر میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں موت کے وقت گھبرا کر اکھڑ جانے والا قرار دیا جاؤں، اور قریش یہ رائے قائم کریں کہ میں نے صحت کی حالت میں تو اس چیز کو رد کیا اور اب گھبراہٹ میں اسے اختیار کر لیا۔“

ابن سعد نے امام محمد بن سیرین کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ابوطالب کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر کہا "بھتیجے، جب میں مر جاؤں تو تم اپنے اخوال (یعنی اپنے دادا کی ننھیال) بنی نجار کے پاس مدینے چلے جانا، کیونکہ وہ اپنے گھر والوں کی حفاظت میں سب لوگوں سے بڑھ کر سخت ہیں"۔

ان وصیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب کیسے دانا اور صاحبِ بصیرت آدمی تھے اور ان کی نگاہ کتنی دُور رس تھی۔ خصوصاً مدینہ کے معاملے میں انہوں نے ہجرت سے تین سال پہلے جو رائے دی تھی وہ بالآخر بعاینت صحیح ثابت ہوئی، حالانکہ اُس وقت کسی کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ مدینہ ہی اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جاں نثار بستی بنے گا اور وہیں سے حضورؐ کو وہ طاقت فراہم ہوگی جو تمام عرب کو مسخر کرے گی۔ اسی طرح قریش کے سرداروں سے جو کچھ انہوں نے اُس وقت کہا تھا وہ بھی چند ہی سال بعد حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ دوسرے لوگ حضورؐ کا ساتھ دے کر بازی لے گئے، اور یہ سردارانِ قریش پیچھے کی صفوں میں پھینک دیئے گئے۔ ابن عبدالبرّ نے استیعاب میں حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز قریش کے شیوخ، جن میں سُہیل بن عمروؓ اور ابوسفیانؓ جیسے لوگ شامل تھے امیرالمومنین سے ملنے کے لیے آئے اور وہ اجازت کے انتظار میں باہر بیٹھے رہے۔ اس دوران میں بلالؓ اور صہیبؓ اور بعض دوسرے اہلِ بدر کو اندر بلایا جاتا رہا۔ ابوسفیان نے شکایتہً اپنے ساتھیوں سے کہا کیا وقت آ گیا ہے کہ ہم جیسے لوگ باہر بیٹھے ہیں اور ان غلاموں کو اندر بلایا جا رہا ہے۔ اس پر سُہیل بن عمرو نے کہا کہ آپ حضرات اس کا شکوہ تو اپنے آپ سے کریں۔ جب اسلام کی دعوت دی گئی تھی تو ان لوگوں نے سبقت کی اور آپ لوگ پیچھے بیٹھے رہ گئے۔

ابولہب حضورؐ کی حمایت کے لیے اُٹھتا ہے اور پھر پلٹ جاتا ہے

ابن سعد نے لکھا ہے کہ مکے میں جب حضورؐ کے ساتھ لوگوں کی بدسلوکیاں حد سے بڑھ گئیں تو ایک روز ابولہب آپؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا "اے محمدؐ، جو کچھ تم کرنا چاہتے ہو کرتے رہو۔ ابوطالب کی زندگی میں جو کام تم کرتے تھے اسے جاری رکھو۔ لات اور عُزّیٰ کی قسم، میرے جیتے جی کوئی تم پر ہاتھ نہ ڈال سکے گا۔" اس کے بعد جب حضورؐ گھر سے باہر نکلے اور ابن الغیطلۃ[1] نے سرِ بازار آپؐ کے اوپر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی تو ابولہب اپنے گھر سے نکل آیا اور اس نے ابن الغیطلۃ کی بُری طرح خبر لی۔ اس پر وہ شور مچاتا ہوا بھاگا اور بولا اے قریش کے لوگو، سنو، ابوعُتبہ بھی دینِ آبائی سے پھر گیا"۔ یہ ہنگامہ سُن کر لوگ ابولہب کے پاس آتے

---

[1] اس شخص کا اصل نام حارث بن قیس بن عَدِیّ السَّہمی تھا۔ قیس بن عدی کی بیوی بنی مُرّہ کی ایک کاہنہ غیطلۃ نامی تھی۔ اس کی ساری اولاد اسی عورت کی نسبت سے غیاطلہ کہلاتی تھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

اور ماجرا پوچھا۔ اُس نے کہا، مَیں نے عبدالمطّلب کا دین نہیں چھوڑا ہے۔ مگر مَیں اب اپنے بھتیجے کی حمایت کروں گا کیونکہ اس کا کوئی سرپرست باقی نہیں رہا ہے۔ قریش کے سرداروں نے کہا "یہ تو تم نے بہت اچھا کیا کہ صلۂ رحمی کا حق ادا کرنے کے لیے تیار ہو گئے"۔ اس کے بعد کچھ روز تک نبی صلی اللہ علیہ وسلّم امن میں رہے اور ابولہب کا لحاظ کر کے لوگوں نے آپ کو ستانا چھوڑ دیا۔ آخرکار ایک دن ابوجہل اور عُقبہ بن ابی مُعیط باہم صلاح مشورہ کر کے ابولہب کے پاس آئے اور اس سے کہا "ذرا اپنے بھتیجے سے یہ تو پوچھو کہ اُس کا دادا اور تمہارا باپ عبدالمطّلب کہاں جائے گا؟" ابولہب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے یہ سوال کیا۔ آپؐ نے جواب دیا "جہاں اُن کی قوم جائے گی وہیں وہ بھی جائیں گے"۔ ابولہب نے اپنے دوستوں کو حضورؐ کا یہ جواب سُنا دیا۔ انہوں نے کہا "ابھی کچھ سمجھے بھی؟ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا باپ جہنّم میں جائے گا"۔ ابولہب نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہا "اے محمدؐ، کیا عبدالمطّلب جہنّم میں جائیں گے؟" آپؐ نے فرمایا "ہاں، اور جو شخص بھی اُس دین پر مرے جس پر عبدالمطّلب مرے ہیں وہ جہنّم میں جائے گا"۔ یہ سُنتے ہی ابولہب بِھنّا گیا اور تڑخ کر بولا "خدا کی قسم، مَیں ہمیشہ تیرا دشمن رہوں گا۔ تو سمجھتا ہے کہ عبدالمطّلب جہنّمی ہیں"۔ اِس طرح چند روز کے لیے جو دشمنِ خدا حق کا حامی بنا تھا وہ اپنی اصلیت کی طرف پلٹ گیا۔

حضرت سَودہؓ سے نکاح

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضورؐ کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ گھر میں صرف دو کم سن صاحبزادیاں، حضرت اُمِّ کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ رہ گئی تھیں جن کی خبرگیری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ آپؐ اُس خطرناک زمانے میں فرائضِ رسالت ادا کرنے کے لیے باہر تشریف لے جاتے تو یہ صاحبزادیاں گھر میں بے سہارا رہ جاتیں۔ اس لیے آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات کے چند روز بعد حضرت سَودہ بنتِ زَمعہ سے، جو ایک سن رسیدہ خاتون تھیں اور لڑکیوں کی دیکھ بھال کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتی تھیں، نکاح کر لیا۔[1]
یہ خاتون بنی عامر بن لُؤیّ میں سے تھیں اور اِن کے سابق شوہر سَکران بن عَمرو اِن کے ابنِ عم اور سُہَیل بن عَمرو کے بھائی تھے۔ دونوں میاں بیوی قدیم الاسلام تھے اور حَبشہ کی دوسری ہجرت میں شریک ہوئے تھے۔ موسیٰ بن عُقبہ اور ابو مَعشر کا قول ہے کہ حضرت سَکران کا انتقال حبشہ ہی میں ہو گیا تھا۔ مگر محمد بن اسحاق اور واقدی

---

[1] ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ نکاح رمضان سنہ ۱۰ بعد بعثت میں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ اور قسطلانی نے مواہب اللدنیہ میں کہا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات ۱۰ نبوی میں ہوئی اور حضرت سَودہؓ سے نکاح شوال میں ہوا۔ (حاشیہ از مؤلف)

کہتے ہیں کہ وہ حبش سے مکہ واپس آگئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا[1]۔ ابن سعد نے واقدی سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ مذکور ہے کہ حضورؐ نے جب ان کو نکاح کا پیغام بھیجا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے معاملہ میں آپ کو ہر فیصلے کا اختیار ہے۔ آپؐ نے کہلا بھیجا کہ کسی کو اپنی طرف سے مقرر کر دو کہ وہ میرے ساتھ تمہارا نکاح کر دے۔ انہوں نے حضرت حاطبؓ بن عَمرو بن عبد شمس کو، جو سُہَیل بن عَمرو کے بھائی اور قدیمُ الاسلام تھے، اس غرض کے لیے مقرر کر دیا اور انہوں نے حضورؐ سے ان کا نکاح کر دیا۔

اکثر و بیشتر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد پہلی خاتون یہی تھیں جو حضورؐ کی زوجیت میں داخل ہوئیں اور ان کا نکاح حضرت عائشہؓ سے پہلے ہوا۔ ابن عبدالبَرّ نے قَتادہ اور ابو عُبَید اور امام زُہری کے حوالہ سے یہی بات لکھی ہے۔ ابن سعد نے بھی اسی کی تصریح کی ہے اور ابن اسحاق نے حضرت علی بن حسینؓ (امام زین العابدین) کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ پہلی عورت جن سے حضرت خدیجہؓ بنت خُوَیلد کے بعد حضورؐ نے نکاح کیا وہ سَودہؓ بنت زَمعہ تھیں۔

حضرت عائشہؓ سے نکاح

لیکن امام احمد، طَبَرانی، ابن جریر طَبَری اور بَیہَقی نے ایک مفصل روایت اس سے بالکل مختلف نقل کی ہے۔ اس میں یہ ذکر ہے کہ جب حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت عثمانؓ بن مظعون کی بیوی خَولہؓ[2] بنت حکیم السُّلَمِیّہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسُول اللہ آپ شادی کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا کس سے کروں؟ انہوں نے کہا آپ کنواری چاہیں تو وہ بھی موجود ہے، بیوہ چاہیں تو وہ بھی حاضر ہے۔ حضورؐ نے پوچھا کنواری کون؟ انہوں نے کہا تمام خلق میں جو شخص آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اُس کی بیٹی یعنی عائشہؓ بنت ابی بکرؓ۔ پھر آپؐ نے پوچھا اور بیوہ کون؟ انہوں نے عرض کیا سَودہؓ بنت زَمعہ[3] جو آپ پر ایمان لائیں اور جنہوں نے آپؐ کی پیروی کی۔ آپؐ نے فرمایا دونوں جگہ جا کر بات کرو۔

پہلے تو وہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاں گئیں اور ان کی اہلیہ اُمّ رُومانؓ سے کہا کیسی خیر و برکت ہے اللہ نے

---

[1] طَبَری اور ابن اثیر نے اپنی تاریخوں میں لکھا ہے کہ یہ مکہ سے پھر حبش واپس چلے گئے اور عیسائی ہو کر مرے لیکن بَلاذُری نے ابن اسحاق اور واقدی کے قول کی توثیق کی ہے، اور خود ابن اثیر نے اپنی کتاب اُسُد الغابہ میں تصریح کی ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت تک مسلمان تھے۔ حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں ان کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف) [2] یہ نام زَمعہ بھی لکھا جاتا ہے اور زَمَعَہ بھی۔ (حاشیہ از مؤلف)

[3] ابن ہشام اور بعض دوسرے مؤرخین نے ان کا نام خُوَیلَہ لکھا ہے۔ (حاشیہ از مؤلف)

تمہیں نواز دیا ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ حضرت خولہؓ نے کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عائشہؓ کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ اُمِ رُومان نے کہا ابوبکرؓ کو آ جانے دو۔ وہ تشریف لائے تو اُمِ رُومان نے ان سے کہا اللہ نے کیسی خیر و برکت سے آپ کو نواز دیا ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پاس عائشہؓ کے لیے پیغام بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا کیا وہ اُن کے لیے جائز ہے؟ وہ تو اُن کی بھتیجی ہے۔ خولہؓ حضورؐ کے پاس گئیں اور یہ بات آپؐ سے عرض کی۔ آپؐ نے فرمایا ان سے کہو تم میرے دینی بھائی ہو۔ تمہاری بیٹی میرے لیے جائز ہے۔ خولہ نے یہی جواب حضرت ابوبکرؓ کو پہنچا دیا۔ انہوں نے کہا ذرا انتظار کرو۔ یہ کہہ کر حضرت ابوبکرؓ چلے گئے۔ اُمِ رُومان نے خولہ سے کہا مُطعِم بن عدی نے اپنے بیٹے کے لیے عائشہؓ کو مانگا تھا۔ اور خدا کی قسم ابوبکرؓ نے کبھی کسی سے وعدہ کر کے اس کے خلاف نہیں کیا۔ اُدھر حضرت ابوبکرؓ مُطعِم کے پاس گئے۔ اُس کے پاس اس کی بیوی، جو اُس لڑکے کی ماں تھی جس کے لیے مُطعِم نے پیغام دیا تھا، بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بولی اَے ابوبکرؓ ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر ہم اپنے لڑکے کا بیاہ تمہارے ہاں کر دیں تو تم ہمارے لڑکے کو بھی دین سے پھیر دو گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مُطعِم سے پوچھا "جو کچھ یہ کہہ رہی ہے یہی تمہارا قول بھی ہے"؟ اُس نے کہا وہ یہی کہتی ہے۔ یہ جواب سُن کر حضرت ابوبکرؓ اس کے ہاں سے نکل آئے اور اللہ نے اُس مخمصے سے ان کو نکال دیا جس میں وہ مُطعِم سے وعدہ کر کے پھنس گئے تھے۔ پھر انہوں نے خولہ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے ہاں بلا لاؤ۔ وہ حضورؐ کو بلا لائیں اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہؓ کا نکاح آپؐ سے کر دیا۔ اس وقت وہ ۶ برس کی تھیں۔

اس کے بعد خولہ وہاں سے نکل کر حضرت سَودہؓ بنتِ زَمعہ کے ہاں گئیں اور کہا کیسی خیر و برکت ہے جس سے اللہ نے تم کو نواز دیا ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ خولہؓ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کا پیغام دے کر مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا میرے باپ سے اس کا ذکر کرو۔ وہ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ خولہ اس کے پاس گئیں اور جاہلیت کے طریقے پر اسے سلام کر کے پہلے اپنا تعارف کرایا، اور پھر کہا مجھے محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سَودہ کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ اس نے کہا جوڑ تو بہت اچھا ہے، مگر تمہاری سہیلی کیا کہتی ہے؟ خولہ نے کہا وہ بھی اس رشتے کو پسند کرتی ہیں۔ اُس نے حضرت سَودہؓ کو بلا کر ان کی مرضی پوچھی، اور جب انہوں نے رضامندی کا اظہار کیا تو اس نے حضورؐ کو اپنے ہاں بُلا کر آپؐ سے اُن کا نکاح کر دیا۔ بعد میں حضرت سَودہ کا بھائی عَبد بن زَمعہ حج کر کے آیا تو یہ سُن کر کہ اس کی بہن کی شادی حضورؐ سے ہو گئی ہے، اس نے اپنے سر پر خاک ڈالنی شروع کر دی۔ پھر جب یہ صاحب خود مسلمان ہو گئے تو کہتے تھے کہ میں اُس وقت کیسا بیوقوف تھا کہ اپنی بہن سے حضورؐ کے نکاح پر میں نے

اپنے سر پر خاک ڈالی۔

حضرت عائشہؓ کے نکاح کی تاریخ

اس روایت سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح حضرت سودہؓ سے پہلے ہوا تھا، بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے سنہ ۱۰ بعد بعثت کے ماہ شوال میں جب حضورؐ کے ساتھ حضرت عائشہؓ کا نکاح ہوا اُس وقت وہ ۶ برس کی تھیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت عائشہؓ شوال سنہ ۱۰ بعد بعثت میں ۶ سال کی تھیں، تو ہجرت کے وقت ان کی عمر ۹ سال ہونی چاہیے، اور معتبر روایات کی رُو سے جب شوال سنہ ۱ ہجری میں ان کی رخصتی ہوئی تو وہ گیارہ سال کی ہونی چاہییں، حالانکہ تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا نکاح ۶ سال کی عمر میں ہوا اور رخصتی ۹ سال کی عمر میں ہوئی۔

اس سوال کا جواب بعض علماء نے یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہجرت کے سات مہینے بعد ہوئی، اور حافظ ابن حجرؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ لیکن امام نوویؒ نے تہذیب الاسماء واللغات میں اور حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں اور علامہ قسطلانیؒ نے مواہب اللدنیہ میں قطعیت کے ساتھ کہا ہے کہ رخصتی سنہ ۲ھ میں ہوئی تھی۔ حافظ بدرالدین عینیؒ نے عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوۂ بدر سے واپس تشریف لانے کے بعد شوال سنہ ۲ھ میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہوئی۔ امام نوویؒ اور علامہ عینیؒ، دونوں نے اس قول کو واہی قرار دیا ہے کہ یہ رخصتی ہجرت کے سات مہینے بعد ہوئی۔ اس کے بعد لازماً دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رخصتی سنہ ۲ھ میں ہوئی تو پھر نکاح کی تاریخ کونسی تھی جو حضرت عائشہؓ کی عمر بوقت نکاح ۶ سال اور بوقت زفاف ۹ سال سے مطابقت رکھتی ہو۔ اس کا جواب ہم کو بخاری کی اُس حدیث سے ملتا ہے جو انہوں نے عُروہ بن زُبیر کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ اس میں حضرت عُروہؒ کہتے ہیں کہ ہجرت سے تین سال پہلے حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی، دو سال یا اس کے قریب توقف کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا جبکہ وہ ۶ سال کی تھیں، پھر ۹ سال کی عمر میں ان کی رخصتی ہوئی۔ اس حساب سے بالکل یہ صحیح نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا نکاح ۶ سال کی عمر میں ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے ہوا اور زفاف سنہ ۲ ہجری میں ہوا۔ حضرت عُروہ کی یہ روایت اگرچہ مُرسل ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ عُروہ چونکہ اس طرح کی روایات حضرت عائشہؓ سے سن کر ہی بیان[1]

---

[1] واضح رہے کہ حضرت عُروہ بن زُبیر حضرت عائشہؓ کے بھانجے تھے، اس لیے اپنی خالہ صاحبہ کے متعلق جو بات وہ بیان کرتے تھے وہ ان سے سن کر ہی بیان کرتے تھے، خواہ روایت میں ان کا حوالہ انہوں نے دیا ہو یا نہ دیا ہو (حاشیہ از مؤلف)

کرتے ہیں، اس لیے اسے متّصل کے حکم میں سمجھنا چاہیے۔

نکاحِ عائشہؓ پر اعتراضات

چونکہ یہاں حضرت عائشہؓ کے نکاح کا ذکر آ گیا ہے اس لیے آگے پڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی جگہ اُن اعتراضات کا جواب بھی دے دیا جائے جو حضورؐ کے اس نکاح پر کیے جاتے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ۵۰۔۵۵ سال کی عمر میں ۹ سال کی ایک لڑکی سے شادی کرنا، اور ۶۳ سال کی عمر میں اسے بیوہ چھوڑ جانا، جبکہ قرآن کی رُو سے اُس کا نکاحِ ثانی بھی کسی شخص سے نہ ہو سکتا ہو، کیا یہ (معاذ اللہ) ظلم نہیں ہے؟ اور کیا اتنے سن رسیدہ آدمی کے لیے اتنی کم سن لڑکی کا نکاح (معاذ اللہ) نفس پرستی کی تعریف میں نہیں آتا؟ اور کیا ۹ سال کی عمر ایسی ہوتی ہے کہ اس میں کسی لڑکی پر ازدواجی زندگی کا بار ڈال دیا جائے؟

دراصل اس قسم کے اعتراضات صرف اُس صورت میں پیدا ہوتے ہیں جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہؓ کے نکاح کو ایک عام مرد اور ایک عام لڑکی کا نکاح سمجھ لیا جائے۔ حالانکہ حضورؐ اللہ کے رسول تھے جن کے سپرد انسانی زندگی میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کرنا اور معاشرے کو اس انقلاب کے لیے تیار کرنا تھا۔ اور حضرت عائشہؓ ایک غیر معمولی قسم کی لڑکی تھیں جنہیں اپنی عظیم ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر اس انقلابی معاشرے کی تعمیر میں حضورؐ کے ساتھ مل کر اتنا بڑا کام کرنا تھا جتنا دوسری تمام ازواجِ مطہّرات سمیت اُس وقت کی کسی عورت نے نہیں کیا، بلکہ یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے کسی رہنما کی بیوی بھی اپنے شوہر کے کام کی تکمیل میں ایسی زبردست مددگار نہیں بنی جیسی حضرت عائشہؓ حضورؐ کی مددگار ثابت ہوئیں۔ اُن کے بچپن میں اُن کی اِن صلاحیتوں کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اسی بنا پر اپنے رسول کی رفاقت کے لیے اُن کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا۔ بخاری، باب تزویج عائشہؓ میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ مجھے خواب میں تم کو دو دفعہ دکھایا گیا اور کہا گیا کہ یہ آپ کی بیوی ہے۔ ترمذی، ابواب المناقب میں ہے کہ جبریل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت عائشہؓ کی تصویر سبز ریشم میں لائے اور آپؐ سے کہا کہ یہ دنیا اور آخرت میں آپ کی بیوی ہیں۔ پس یہ انتخاب حضورؐ کا اپنا نہ تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کا تھا، اور اللہ ہی کو یہ معلوم تھا کہ ۹ سال کی اس کم سن لڑکی کو اُس کے رسولِ پاک کے فیض تعلیم و تربیت سے سیراب ہو کر اسلامی معاشرے کی تعمیر میں کس قدر عظیم خدمت انجام دینی ہے۔

جو لوگ اس معاملہ میں حضورؐ پر نفس پرستی کا الزام لگاتے ہیں وہ خود اپنے ضمیر سے پوچھ کر بتائیں، کیا ایسا شخص نفس پرست ہو سکتا ہے جو پچیس سال کی عمر سے پچاس سال کی عمر تک صرف ایک ایسی بیوی پر قانع رہے جو عمر میں اُس سے ۱۵ برس بڑی ہو؟ جو پہلی بیوی کی وفات کے بعد ایک سن رسیدہ

بیوہ سے نکاح کرے اور چار پانچ برس تک صرف اسی پر قناعت کیے رہے؟ جو اگر نفس پرستی کی خاطر شادیاں کرنے والا ہوتا تو معاشرے میں اُسے اتنی زبردست محبوبیت حاصل تھی کہ وہ جتنی اور جیسی خوبصورت باکرہ لڑکیوں سے بیاہ کرنا چاہتا ان کے والدین اپنے لیے فخر و عزت سمجھ کر اس کے حضور پیش کرنے کے لیے تیار ہو جاتے؟ جو اس کے باوجود صرف ایک باکرہ لڑکی کے سوا بعد میں جتنی شادیاں بھی کرے بیوہ یا شوہر دیدہ (ثیبہ) عورتوں ہی سے کرے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس نوعیت کے اعتراضات کرنے والے اپنے ذہن میں ازدواجی زندگی کا صرف شہوانی تعلق ہی رکھتے ہیں۔ ان کے پست ذہن اتنی بلندی تک جا ہی نہیں سکتے کہ اُس عظیم انسان کے مقاصدِ ازدواج کو سمجھ سکیں جو ایک اعلیٰ و ارفع کام کی مصلحتیں مدِ نظر رکھ کر کچھ خواتین کو اپنی شریکِ زندگی اور شریکِ کار بناتے۔

رہا ظلم کا الزام، تو اس معاملہ میں بھی معترضین بس یہ ایک سادہ سی صورتِ واقعہ پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ ایک سن رسیدہ آدمی نے ۹ سال کی لڑکی سے شادی کر کے ۱۸ سال کی عمر میں اسے بیوہ چھوڑ دیا، جبکہ اس کے لیے نکاحِ ثانی کا بھی کوئی امکان نہ تھا اور اسے ساری جوانی بیوگی کے عالم ہی میں گزارنی تھی۔ اس عام سطح سے بلند تر ہو کر یہ لوگ کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اور نہیں کرنا چاہتے کہ جس کارِ عظیم کا فائدہ خلقِ خدا کو کسی محدود زمانے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، اور کسی محدود علاقے میں بھی نہیں بلکہ دنیا بھر میں پہنچنے والا ہو، اُس کام میں ہزار ہا نہیں لاکھوں انسانوں کی جانیں اور اُن کے مال کھپ جانا بھی کوئی مہنگا سودا نہیں ہے کجا کہ صرف ایک خاتون کی جوانی اس میں کھپ جانے کو قربانی کے بجائے ظلم سے تعبیر کیا جائے، اور وہ جوانی بھی اگر قربان ہوئی تو صرف اس معنی میں کہ اس کو ازدواجی زندگی کے لطف سے محروم ہونا پڑا۔ اس کے ماسوا کسی اور نقصان کی وہ لوگ نشان دہی نہیں کر سکتے جو اس بلند پایہ خاتون کی ذات کو پہنچا ہو۔ لیکن دوسری طرف دیکھیے کہ گھریلو زندگی کے تمام خرخشوں اور مشغولیتوں سے فارغ ہو کر اپنی پوری بقیہ زندگی کو عورتوں اور مردوں میں اسلام اور اس کے احکام و قوانین اور اس کے اخلاق و آداب کی تعلیم دینے میں صرف کر کے اُس عظیم ہستی نے کتنی بے بہا خدمات انجام دیں۔ علمِ حدیث کا جس شخص نے بھی مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ذریعہ سے جتنا علمِ دین مسلمانوں کو پہنچا اور فقہِ اسلامی کی معلومات حاصل ہوئیں، اس کے مقابلہ میں عہدِ نبوت کی عورتیں تو درکنار، مرد بھی کم ہی ایسے ہیں جن کی علمی خدمات کو پیش کیا جا سکے۔ اگر حضرت عائشہؓ حضورؐ کے نکاح میں نہ آتیں اور آپؐ سے تعلیم و تربیت پانے کا ان کو موقع نہ ملتا، تو اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام کے علم کا کتنا بڑا حصہ اُمتِ مسلمہ تک پہنچنے سے رہ جاتا۔ ان سے ۲۲۱۰ حدیثیں مروی ہیں۔ اور وہ صرف احادیث روایت کرنے والی ہی نہ تھیں بلکہ فقیہ اور مفسر اور مجتہد

اور مُفتی بھی تھیں۔ انہیں بالاتفاق مسلمان عورتوں میں سب سے زیادہ فقیہ مانا جاتا ہے۔ اکابر صحابہؓ ان سے مسائل پوچھتے تھے، حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی بعض مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کا شمار مدینۂ طیبہ کے اُن چند فقہاء میں ہوتا تھا جن کے فتوے پر لوگوں کو اعتماد تھا۔ اس بیش بہا اجتماعی فائدے کے مقابلے میں وہ تھوڑا سا ذاتی نقصان کیا حیثیت رکھتا ہے جو حضرت عائشہؓ کو جوانی میں بیوہ ہو جانے سے پہنچا۔ اور تعجب تو یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں یہ اعتراض وہ عیسائی حضرات کرتے ہیں جن کے ہاں کسی اجتماعی سعادت کے بغیر محض بے مقصد تجرد کی زندگی بسر کرنا راہبوں اور راہبات کے لیے صرف قابلِ تعریف ہی نہیں ہے بلکہ مذہبی خدمات بجا لانے والوں کے لیے لازم بھی ہے۔

پھر جن لوگوں کو ۹ برس کی عمر میں حضرت عائشہؓ کے زفاف پر اعتراض ہے وہ نہیں جانتے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اور فطری حیثیت سے جب ایک لڑکی کا نشوونما اتنا اچھا ہو کہ وہ اس عمر میں جسمانی طور پر بالغ ہو چکی ہو تو اس کا شوہر کے پاس جانا بالکل جائز و معقول ہے۔ صرف ایک غیر فطری اور غیر اخلاقی قانون ہی نکاح کے لیے لڑکی اور لڑکے کی ایک خاص عمر مقرر کر سکتا ہے کیونکہ یہ قید صرف جائز ازدواجی تعلق ہی پر پابندی عائد کرتی ہے، خارج از نکاح تعلقاتِ زن و مرد پر کوئی پابندی نہیں لگاتی۔ اور یہ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ ایسے قوانین بنانے والوں کو عمرِ نکاح سے پہلے زنا کے ارتکاب پر کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ عملاً ان کے ہاں ۹۔۱۰ سال کی لڑکیاں اور لڑکے آزادانہ جنسی عمل کرتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں اگر کوئی لڑکی کنواری ماں بن جاتی ہے تو ان کی ساری ہمدردیاں اُسی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اُس وقت کوئی اعتراض نہ اُس لڑکی پر ہوتا ہے جو عمرِ نکاح سے پہلے ماں بنی، اور نہ اُس لڑکے پر ہوتا ہے جس نے عمرِ نکاح سے پہلے ایک لڑکی کو ماں بنایا۔ ایسی گھٹیا اخلاقی اقدار رکھنے والے آخر کیا منہ لے کر اسلام کے اس قانون پر اعتراض کرتے ہیں کہ جسمانی طور پر جو لڑکے اور لڑکیاں بالغ ہو جائیں ان کا نکاح جائز ہے اور اس کے لیے کسی خاص عمر کی شرط نہیں ہے۔ شادی کے لیے قانوناً ایک عمر مقرر کر دینے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اس عمر کو پہنچنے سے پہلے عقدِ حلال بہرحال نہیں ہو سکتا، خواہ فعلِ حرام کتنا ہی ہوتا رہے۔

سفرِ طائف

اس ضمنی مگر موقع کے لحاظ سے ضروری بحث کے بعد اب ہم پھر سلسلۂ واقعات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اپنے خانگی معاملات سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بروایت ابن سعد و بلاذری شوال ۱۰ بعد بعثت کے آخر میں طائف کا رُخ کیا جو مکہ سے ۵۰ میل شرقاً واقع ہے۔ اس سفر کا سبب یہ تھا کہ قریش کی اذیت رسانیوں سے آپ تنگ آگئے تھے۔ اُن کی شدید مخالفت و مزاحمت دیکھ کر یہ

امید نہیں رہی تھی کہ یہ لوگ دعوتِ حق کو قبول کرنا تو درکنار، اُسے جاری رکھنے کی بھی کوئی گنجائش آپ کے لیے باقی رہنے دیں گے۔ اس لیے آپ چاہتے تھے کہ طائف کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں، اور وہاں کے طاقت ور قبیلے، بنی ثقیف کو کم از کم اس بات پر آمادہ کر لیں کہ وہ آپ کو اپنے ہاں پناہ دے اور تحریک اسلامی کے کام میں آپ کی مدد اور حمایت کرے۔ ابن سعد نے جُبَیر بن مُطعِم بن عَدِی کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ اس سفر میں آپ کے ساتھ حضرت زیدؓ بن حارثہ گئے تھے۔ یہی ابنِ قُتیبہ اور بلاذُری کا بھی بیان ہے لیکن مُوسیٰ بن عُقبہ اور ابن اسحاق کہتے ہیں کہ آپ تنہا تشریف لے گئے تھے۔ یہ سفر آپ نے پیدل کیا، کوئی سواری آپ کو میسّر نہ تھی۔ ابنِ سعد کا بیان ہے کہ وہاں آپ دس دن ٹھیرے۔ مگر حافظ مُغلطائی کہتے ہیں کہ ۲۰ دن تک آپؐ طائف کے لوگوں سے ملتے رہے، اور ۱۰ دن عبدیالیل سے ملنے کے بعد ٹھیرے۔ ابنِ قُتیبہ نے بھی طائف کے قیام کی مدت ایک مہینہ بتائی ہے۔

اہلِ طائف کا حضورؐ پر ظلمِ عظیم

ابن اسحاق اور واقدی وغیرہ کا بیان ہے کہ طائف کی سرداری اُس وقت عَمرو بن عُمیر بن عَوف کے تین لڑکوں، عبدیالیل، مسعود اور حَبیب کے ہاتھ میں تھی، جن میں سے ایک کے گھر میں قریش کی ایک عورت صفیہ بنت مَعمر بیاہی ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ملے، ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور اُن سے فرمایا کہ میں آپ لوگوں کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ آپ اسلام کے کام میں میری مدد کریں اور میری قوم کے جو لوگ میری مخالفت کر رہے ہیں ان کے مقابلے میں آپ لوگ میری حمایت کریں۔ اس پر ان میں سے ایک نے کہا کہ "میں کعبے کے پردے نوچ ڈالوں گا اگر اللہ نے تم کو رسول بنایا ہے۔" دوسرے نے کہا "کیا خدا کو تمہارے سوا کوئی رسول بنانے کے لیے نہیں ملا؟" تیسرے نے کہا "میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا، کیونکہ اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو تم اس سے بزرگ تر ہو کہ میں تمہاری بات کا جواب دوں، اور اگر تم اللہ کا نام لے کر جھوٹ بول رہے ہو تو اس قابل نہیں ہو کہ تم سے بات کی جائے۔" یہ سن کر حضورؐ اٹھ گئے اور آپ کو ان سے کسی بھلائی کی توقع باقی نہیں رہی۔ چلتے ہوئے آپ نے اُن سے کہا کہ "خیر، جو کچھ بھی تم نے مجھ سے کیا سو کیا، مگر کم از کم اتنا کرو کہ میری بات کو مخفی رکھو۔" یہ بات آپؐ نے اس لیے فرمائی کہ آپؐ کو اندیشہ تھا کہ اگر قریش تک یہ خبر پہنچے گی تو وہ اور جری ہو جائیں گے۔ مگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور اپنے چھوٹی لفنگوں اور غلاموں کو آپ کے خلاف ہُشکار دیا اور وہ آپ کو گالیاں دیتے اور آپ پر آوازے کستے لگے، یہاں تک کہ لوگ اکٹھے ہو گئے اور آپ کو ایک باغ کی دیوار تک پہنچا کر چھوڑا جو عُتبہ بن ربیعہ اور شَیبہ بن ربیعہ کا تھا۔

واقدی سے ابنِ سعد کی روایت میں یہ ہے کہ آپ ثقیف کے اشراف و رؤسا میں سے ایک ایک کے پاس گئے، مگر کسی نے آپ کی بات نہ مانی بلکہ انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ ان کے نوجوانوں کو نہ بگاڑ دیں، اس لیے انہوں نے کہا "اے محمدؐ، تم ہمارے شہر سے نکل جاؤ اور زمین میں تمہارے جو دوست بھی ہوں اُن سے جا ملو۔" پھر انہوں نے اپنے اوباشوں اور غلاموں کو آپ کے خلاف اُکسایا اور انہوں نے آپ کو گالیاں دیں، اور شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کر لیا۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے تاک تاک کر آپ کے ٹخنوں اور ایڑیوں پر پتھر مارے۔ راستے کے دونوں جانب وہ صفیں بنائے کھڑے تھے، اور جیسے جیسے آپ قدم اٹھا کر چلتے جاتے تھے، وہ سنگباری کیے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ آپ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ سلیمان التیمی کا بیان ہے کہ چوٹوں کی تکلیف سے جب آپ بیٹھ جاتے تو وہ آپ کو پکڑ کر کھڑا کر دیتے تاکہ آپ پر پھر پتھر برسائیں۔ چنانچہ جب آپ مجبوراً چلنا شروع کرتے تو وہ پتھر مارتے اور ٹھٹھے لگاتے چلے جاتے تھے۔ واقدی کی روایت ابنِ سعد نے نقل کی ہے کہ اس موقع پر حضرت زیدؓ بن حارثہ آپ کو پتھروں سے بچانے کے لیے خود پتھروں کی بارش اپنے اوپر لیتے رہے یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔

حضورؐ کی رقت انگیز دعا

آخر کار حضورؐ جب طائف سے نکل گئے، اور وہ بدمعاش لوگ جو آپ کا تعاقب کر رہے تھے واپس ہو گئے تو آپ زخموں سے چُور عُتبہ اور شیبہ کے باغ کی دیوار سے لگ کر انگور کی ایک بیل کے سائے میں بیٹھ گئے۔ اس موقع پر آپ کا دل بھر آیا اور آپ نے اپنے رب کی طرف رجوع کر کے دعا کی جس کے یہ رقت انگیز الفاظ طبرانی نے کتاب الدعاء اور معجم کبیر میں، ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے سیرت میں، طبری نے تاریخ میں، ابن القیم نے زاد المعاد میں اور حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں نقل کیے ہیں:

"خداوندا، میں تیرے ہی حضور اپنی بے بسی و بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین، تو سارے ہی کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے درشتی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تو نے مجھ پر قابو پا لینے کا یارا دے دیا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں، مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اُس نور کی جو اندھیرے میں اُجالا کرتا اور دنیا و آخرت کے معاملات کو درست کرتا ہے۔ مجھے اس سے بچا لے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عتاب کا مستحق ہو

جاؤں تیری مرضی پر راضی ہوں یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کوئی زور اور طاقت تیرے بغیر نہیں۔"

حضورؐ کی شانِ رحمۃ للعالمینی

بخاری نے بدء الخلق، ذکر الملائکہ میں، مسلم نے مغازی میں اور نسائی نے بعوث میں حضرت عائشہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ انہوں نے حضورؐ سے پوچھا "کیا آپ پر اُحد کے معرکے سے بھی زیادہ سخت وقت کوئی آیا ہے؟" آپؐ نے جواب میں طائف کے واقعہ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ میں غم زدہ حالت میں جدھر منہ اُٹھا اُدھر چل پڑا (یعنی حیران تھا کہ کدھر جاؤں)۔ ابھی میں نے اپنی اِس حالت سے اِفاقہ بھی نہ پایا تھا کہ یکایک میں نے دیکھا کہ میں قرن الثعالب[1] کے مقام پر ہوں۔ اُوپر نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک ابر میرے اُوپر سایہ کیے ہوئے ہے۔ پھر دیکھا کہ اس میں جبریلؑ ہیں۔ انہوں نے پکار کر مجھ سے کہا کہ "اللہ نے وہ سب کچھ سن لیا ہے جو آپ کی قوم نے آپؐ سے کہا اور آپؐ کی دعوت کا جو جواب آپ کو دیا۔ یہ پہاڑوں کا فرشتہ اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں اسے حکم دیں۔" پھر پہاڑوں کے فرشتے نے پکار کر مجھے سلام کیا، اور اس کے بعد مجھ سے کہا کہ "اے محمدؐ، اللہ نے آپؐ کی قوم کا قول اور آپ کی دعوت پر اُس کا جواب سُن لیا ہے۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں مجھے آپؐ کے رب نے آپؐ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپؐ اپنا حکم مجھے دیں (یہ مسلم کی روایت کے الفاظ ہیں۔ طبرانی میں ہے جو حکم آپؐ چاہیں دیں، اور بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر اُس نے کہا اے محمدؐ، آپ کو اختیار ہے جو کچھ بھی آپ چاہیں)۔ اگر آپ چاہیں تو میں اِن پر (یعنی قریش پر) مکّہ کے دو طرفہ پہاڑوں (یعنی ابو قبیس اور قعیقعان) کو ایک ساتھ ملا کر ڈھانک دوں[2]۔" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب یہ دیا کہ "نہیں، میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہٗ لا شریک کی عبادت کریں گے۔"

عدّاس نصرانی کا قبولِ اسلام

ابن ہشام نے ابن اسحاق کا بیان نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زخموں سے چُور ہو کر عتبہ

---

[1] اس مقام کو قرن المنازل بھی کہتے ہیں۔ یہ اہلِ نجد کی میقات ہے جہاں سے ان کو احرام باندھنا ہوتا ہے اور یہ مکّہ سے اُونٹ کی سواری پر ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے (حاشیہ از مرتب)

[2] قریش پر پہاڑوں کو ڈھانک دینے کے لیے فرشتے نے اس وجہ سے آپ کا اذن طلب کیا کہ طائف میں جو مصیبت آپ پر پیش آئی وہ انہی کے ظلم و عناد کے باعث ہی پیش آئی تھی۔ اگر وہ آپ کو مکے سے نکلنے پر مجبور نہ کرتے تو آپ کے طائف تشریف لے جانے کی نوبت ہی کیوں آتی۔ (حاشیہ از مرتب)

بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کے باغ کی دیوار سے لگ کر انگور کی بیل کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے، تو قریش کے ان معززین سرداروں نے آپؐ کو اس حالت میں دیکھا اور ان کی رگِ حمیت کو اس پر کچھ جوش آیا۔ یہ بھی مذکور ہوا ہے کہ بنی جمح کی جو عورت طائف کے سرداروں میں سے ایک کے گھر میں تھی وہ بھی حضورؐ سے ملی اور آپؐ نے اس سے فرمایا کہ "تمہاری سسرال والوں نے یہ کیسا سلوک ہمارے ساتھ کیا۔" عتبہ اور شیبہ نے اپنے ایک عیسائی غلام عداس کو بلایا اور اس سے کہا کہ "انگوروں کا ایک خوشہ طباق میں رکھ کر اس شخص کے پاس لے جا اور اس سے کہہ کہ اسے کھائے۔" اس نے جب طباق لے جا کر آپؐ کے سامنے رکھا اور آپؐ سے تناول فرمانے کے لیے کہا تو آپؐ نے بسم اللہ کہہ کر (ایک روایت میں ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر) اس میں ہاتھ ڈالا۔ عداس بولا "خدا کی قسم اس ملک میں تو کوئی یہ کلمہ کہنے والا نہیں ہے۔" حضورؐ نے پوچھا "تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا دین کیا ہے؟" اس نے کہا "میں عیسائی ہوں، نینویٰ کا رہنے والا ہوں۔" آپؐ نے فرمایا "مردِ صالح یونس بن متّیٰ کی بستی کے ہو؟" اس نے پوچھا "آپ ان کو کیسے جانتے ہیں؟" فرمایا "وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔" یہ سنتے ہی عداس آپؐ پر جھکا اور آپؐ کے سر اور ہاتھوں اور قدموں کو چومنے لگا (سلیمان التیمی نے اپنی کتاب سیرت میں لکھا ہے کہ عداس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)۔ ربیعہ کے بیٹوں نے جب یہ منظر دیکھا تو ایک نے دوسرے سے کہا "لو بھئی تمہارے غلام کو بھی اس شخص نے بگاڑ دیا۔" عداس واپس آیا تو انہوں نے کہا "یہ تجھے کیا ہو گیا کہ اس شخص کا سر اور ہاتھ اور پاؤں چومنے لگا؟" اس نے جواب دیا "میرے آقا، زمین میں ان سے بہتر کوئی نہیں ہے، انہوں نے مجھے ایک ایسی چیز کی خبر دی جس کو نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" انہوں نے کہا "عداس، اپنے دین سے نہ پھر۔ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔" (۱)

جنوں کا قرآن سننا

طائف سے واپسی پر آپ چند روز نخلہ کے مقام پر جا کر ٹھہر گئے۔ پریشان تھے کہ اب کیسے مکہ واپس جائیں۔ طائف میں جو کچھ گزری ہے اس کی خبریں وہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ اس کے بعد تو کفار پہلے سے بھی زیادہ دلیر ہو جائیں گے۔ انہی ایام میں ایک روز رات کو آپؐ نماز میں قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے

---

۱ سہیلی نے التیمی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے حضرت یونسؑ کا ذکر سن کر عداس نے کہا "خدا کی قسم میں نے جب نینویٰ چھوڑا تھا اس وقت وہاں دس آدمی بھی یہ جاننے والے نہ تھے کہ متّیٰ کیا تھے۔ پھر آپ ان کو کیسے جانتے ہیں، حالانکہ آپ اُمّی ہیں اور اُمّی قوم میں پیدا ہوئے ہیں۔" (حاشیہ از مؤلف)